

# عکس

پاکیزہ کے لیے میرا پہلا سلسلہ وار ناول اور مجموعی طور پر میری تیسری تحریر ہے۔ تقریباً چار سال بعد میں کسی بھی ڈائجسٹ کے لیے کوئی ناول لکھ رہی ہوں۔ قارئین سے زیادہ میں خود ایکساٹنڈ ہوں۔ آپ کی توقعات سے واقف ہوں لیکن اب اس کی عادی ہو چکی ہوں۔

اپنے کیرئیر کی ایک اسٹیج پر آ کر میں ڈائجسٹ کے لیے مزید نہ لکھنے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن میں اس فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی۔ پڑھنے والوں کے اصرار، دباؤ، تنقید اور بہت سی دوسری وجوہات نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کروں اور اس نظر ثانی کا نتیجہ عکس کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

آئندہ آنے والے سالوں میں اگر زندگی رہی تو میں پاکیزہ کے لیے انشاء اللہ تعالیٰ ہر سال باقاعدگی سے کچھ نہ کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے ڈائجسٹ کے ذریعے مزید شہرت، شناخت یا پیسے کی ضرورت ہے بلکہ صرف اس لیے کہ پاکستان کے بہت سے علاقوں میں لوگ میری تحریریں کتاب کی شکل میں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اس کا ادراک مجھے پہلے نہیں تھا۔ ڈائجسٹ کی دنیا میں واپسی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ میں اپنے پڑھنے والوں کا وہ قرض لوٹانا چاہتی ہوں جو انہوں نے عزت، پسندیدگی، ستائش اور نام کی صورت میں مجھے دیا۔

میرے تحریری سفر میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں ایک وقت میں دو مکمل ناولز پر کام کر رہی ہوں۔ درنجات اور عکس..... ورنہ اس سے پہلے میں نے ہمیشہ ایک وقت میں ایک مکمل ناول پر کام کیا ہے۔ درنجات کو میں پہلے شائع کروانا چاہتی تھی لیکن پھر بالکل آخری لحاظ میں، میں نے عکس کو پہلے شائع کروانے کا فیصلہ کیا۔

درنجات اپنے موضوعات کے اعتبار سے زیادہ complex اور hard hitting ہے۔ کہانی کا کینوس بھی بڑا ہے تو میں نے سوچا درنجات کی صورت میں seven course meal دینے سے پہلے آپ کو عکس کی صورت میں ایک appetizer دے دیا جائے۔

پاکیزہ کے قارئین کے لیے میرا کام ویسے بھی نسبتاً نیا ہوگا، میرے طرز تحریر سے زیادہ متعارف نہیں ہوں گے تو بھر یہ اور بھی بہتر تھا کہ میں آسان سے مشکل کی طرف جاؤں۔ عکس آسان ہے، درنجات مشکل ہے۔

اور اب کچھ عکس کے بارے میں جو آپ انشاء اللہ تقریباً ایک سال پاکیزہ میں دیکھتے رہیں گے۔ عکس میرے مخصوص طرز تحریر کی کہانی نہیں ہے۔ آج تک لکھی ہوئی میری تحریروں میں سے میرا سب سے پسندیدہ کردار آپ کو عکس میں ملے گا۔ میں ان رائٹرز میں سے ہوں جنہیں اپنے تخلیق کردہ کردار متاثر نہیں کرتے لیکن یہ پہلا موقع ہے جب مجھے اپنے ایک کردار نے متاثر نہیں اتار کیا۔

عکس میں آپ کو اور کیا ملے گا.....؟ آپ دیکھیں..... کہانی کیا ہے؟ آپ جو جیس مقصد کیا ہے؟ آپ طے کریں۔ دیکھنا، بوجھنا، بتانا سب آپ پر چھوڑی ہوں..... ایک پہیلی کی طرح اور میرا دعویٰ ہے آپ اس پہیلی کو نہیں بوجھ سکیں گے جو بوجھ لیں گے وہ ہل نہیں سکیں گے..... تو آئیں عکس کے ونڈر لینڈ میں چلیں اور محبت اور تعلق کی کچھ نئی بنیادیں، نئی جہتیں کھوجیں۔

اس کائناتِ محبت میں ہم مثل شمس و قمر مسلسل کے ہیں  
اک رابطہ مسلسل ہے اک فاصلہ مسلسل ہے

عمیرہ احمد



عکس

عمیر احمد

قسط 01

آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے کرداروں کے نئے رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار زندگی میں چونکا دینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور پراسراریت بھی... کہیں کرداروں کے حوالے سے تو کبھی ماحول کے حوالے سے... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ صرف آپ تیز ترین، سنسنی خیز اور چونکا دینے والے موڑ دیکھیں گے بلکہ ان کی مہارانہ چابک دستی کے ساتھ ان کے کرداروں کی تہ داری کے بھی قائل ہو جائیں گے... یوں بھی اپنا عکس اور اپنا سایہ ہر شخص کے ساتھ رہتا ہے... مگر ان کی کہانیاں جدا جدا ہوتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں... ہماری یہ مایہ ناز مصنفہ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی ہیں... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو... بقول شاعر...

کہاں کے عکس کیسے عکس اور کیا ان کی قیمت  
اے میرے شیشہ گر یہ سب تماشا چل رہا ہے  
یہ سب کردار اصلی ہیں اور ان کا ناجرا بھی  
جو باقی ہے مگر یہ سب تماشا چل رہا ہے

وہ کھلے داخلی دروازے سے اندر جانے کے بجائے وہیں برآمدے میں ہی رک گئی تھی۔ داخلی دروازے کے دائیں طرف یہ ایک Cheval Standing Floor Mirror تھا جس نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی۔ Oak Tree سے بنا ہوا لیکن آبنوسی رنگت کا وکٹورین اسٹائل کا ایک بہت پرانا Cheval Mirror جس کے ساتھ دونوں اطراف میں ہک تھے۔ اچھی پالش نہ ہونے کے باوجود بے حد اچھی حالت میں تھا۔ فرنیچر میں تھوڑی سی دلچسپی اور پہچان رکھنے والا بھی ایک نظر میں ہی لکڑی کی عہدگی اور اس پر بنے ہوئے ڈیزائن کی نفاست کو جانچ لیتا وہ ایک اینٹک پیس تھا اور کم از کم شہر بانو کی نظر سے چوک نہیں سکتا تھا۔ وہ کچھ تجسس اور دلچسپی کے عالم میں فریم کے پاس آئی تھی۔ اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس نے لکڑی پر بنے ڈیزائن کے نشیب و فراز کو جیسے محسوس کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی پوریں گزرد آلود ہوئی تھیں۔ فریم کو یقیناً باقاعدگی سے صرف سرسری انداز میں جھاڑا جاتا تھا۔ اول شکل کا آئینہ اب شفاف نہیں رہا تھا، اس میں ہلکے ہلکے نشان نظر آ رہے تھے یقیناً دوسری طرف موجود کدوم اب اپنی مدت پوری کرنے کے بعد فنا پزیر تھا لیکن اپنے وجود پر زمانے کے تغیر و تبدل کے تمام نشانات رکھنے کے باوجود وہ Cheval Mirror کسی بھی آرٹ لور کو حیرت زدہ کر سکتا تھا جیسے اس وقت وہ ہو رہی تھی۔

اس نے Cheval Mirror میں اپنے عکس کو دیکھا۔ غیر محسوس طور پر سر پر نکائے گلاسز کو ٹھیک کرتے ہوئے اس نے ماتھے پر آئے ہوئے اپنے کچھ بالوں کو دوبارہ سن گلاسز کی مدد سے قابو کرنے کی کوشش کی تھی اور مرر کے سامنے سے ذرا سا ہٹتے ہی اس نے آئینے میں اپنے عقب میں ابھی تک ڈرائیو دے میں کھڑے اپنے عملے کے افراد سے باتیں کرتے شیردل کو دیکھا تھا۔ وہ رہائش گاہ کے سامنے موجود لان کے حوالے سے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پی اے سے کچھ کہہ رہا تھا شہر بانو کے برعکس اس کے گلاسز اس کی آنکھوں پر تھے۔ سیاہ ٹراؤزر کے اوپر سفید شرٹ اور سیاہ ہی جیکٹ پہنے وہ casual ڈریس میں ہونے کے باوجود بے حد فارل حلیے میں لگ رہا تھا۔ چھ فٹ سے نکلنے قد کے ساتھ اپنے تیکھے نقوش اور کسرتی جسم کے ساتھ وہ اب بھی ہمیشہ کی طرح picture perfect لگ رہا تھا۔ ڈرائیو دے کی آرج میں سامنے لان کے داخلی راستے میں کھڑے اس کے چہرے پر دھوپ پڑ رہی تھی۔ شہر بانو کے چہرے پر مسکراہٹ ریگ گئی۔ ایک عجیب سے استحقاق نے اسے سرشار کیا تھا۔ آئینے میں نظر آنے والا قابل رشک مرد اس کا تھا یا شاید وہ اس کی تھی۔ نہیں..... وہ دونوں ایک دوسرے کے تھے۔ ایک دوسرے کے لیے تھے۔ وہ عکس جو کسی بھی عورت کی نظر کو بھٹکانے کا باعث بن سکتا تھا صرف اس کا تھا..... شہر بانو کا شیردل۔

اسے یاد نہیں وہ زندگی میں کتنی بار اسے دیکھ کر فریز ہوئی تھی۔ کتنی بار اس پر فدا ہوئی تھی۔ کتنی بار اسے اپنے آپ پر رشک آیا تھا کہ شیردل کا نام اس کے نام کا حصہ تھا۔ آئینے میں نظر آنے والا مرد اس کے وجود کو اتنے سالوں سے اسی طرح اپنی انگلی کے گرد لپیٹے ہوئے تھا۔

شیردل بالآخر مرکزی لان اور وہاں موجود flag pole کے بارے میں ہدایات سے فارغ ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑی تین سالہ مثال نے اس کی انگلی دوبارہ پکڑ لی تھی۔ شیردل نے ذرا سا جھک کر بڑی سہولت کے ساتھ مثال کو اٹھالیا پھر اپنے عملے کے افراد کے ساتھ برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اس

cheval mirror کے سامنے کھڑی شہر بانو کو دیکھا۔ شہر بانو تب تک آئینے میں نظر آنے والے اس کے عکس سے نظریں ہٹا چکی تھی۔ اس نے آئینے میں شیردل کو اندرونی دروازے کی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ ذرا سا پلٹ کر وہ شیردل کے انتظار میں رکی، ایک لمحے کے لیے دونوں کی نظریں ملیں۔ شیردل اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ اس گھر میں پہلے آچکا تھا اور وہ جانتا تھا داخلی دروازے کے قریب رکھا یہ آئینہ اس کی بیوی کے قدموں کی زنجیر بننے والا تھا۔ شہر بانو وہاں نہ رکتی تو وہ حیرت سے مرجاتا۔ وہ اپنی بیوی کی پسند نا پسند سے کسی psychic کی طرح واقف تھا۔ اس حد تک کہ وہ اس گھر میں موجود ان تمام چیزوں کی لسٹ بنا کر دے سکتا تھا جن کے سامنے شہر بانو آج رکنے والی تھی..... اور قیام لمبا ہوتا یا چھوٹا وہ یہ بھی بتا سکتا تھا..... نہ صرف یہ بلکہ وہ یہ بھی بتا سکتا تھا کہ اس گھر کی کون کون سی چیز اسے پسند نہیں آنے والی تھی اور وہ ان تمام چیزوں کی تبدیلی کے انتظامات کر کے آیا تھا۔

”Isn't it beautiful“ اس نے شیردل کے قریب آتے ہی اس کے بازو پر غیر محسوس انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے اس تک اپنی ستائش پہنچائی تھی۔

”It is“ شیردل نے تائید کی۔ اس نے بھی اپنے سن گلاسز اب..... سر پر لٹکالیے، وہ دونوں اب اس اسٹینڈنگ مرر کے بالکل سامنے ایک دوسرے کے برابر کھڑے تھے۔ مثال کو گود میں لیے وہ ایک خوش و خرم خاندان کا عکس تھا۔ اول مرر میں ان کا عکس گلے میں پہنے جانے والی کسی لاکٹ میں لگی تصویر کی طرح دکھ رہا تھا۔ مثال نے شیردل کی گود سے اترنے کے لیے جدوجہد کی۔ شیردل نے اسے جھک کر نیچے اتار دیا۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ٹیڈی بیئر کے ساتھ داخلی دروازے سے اندر بھاگ گئی تھی۔

”بہت پرانا لگتا ہے؟“ شہر بانو اب اس مرر پر تبصرہ کر رہی تھی۔

”150 سال پرانا تو یہ گھر ہے اور یہاں موجود بہت سا فرنیچر انگریزوں کے زمانے کا ہی ہے۔ استعمال سے زیادہ ڈیکوریشن اور maintainance budget خراب کرنے کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا ہے تب سے شاید.....“ شیردل اندر جاتے ہوئے بڑبڑایا تھا۔ عملے کے افراد نے ایک خوشامدی مسکراہٹ دی تھی صاحب کے اس تبصرے پر..... شیردل اب اندر چلا گیا تھا۔ شہر بانو بھی اندر داخل ہو گئی۔ داخلی دروازے کو ان کے لیے کھول کر پکڑے ہوئے ملازم نے جیسے سکون کی سانس لی تھی۔ وہ دروازہ پکڑے پچھلے پندرہ منٹ میں وہاں اکڑ گیا تھا۔

وہ ایک راہداری نما کمان کی شکل کا برآمدہ تھا جس میں وہ داخل ہوئے تھے۔ وہ راہداری دونوں اطراف سے آگے گھر کے ان کمروں تک جاتی تھی جن کے دروازے فی الحال ان کی نظروں سے اوجھل تھے۔ پوری راہداری میں قید آدم کھڑکیاں تھیں جن کے اوپر پڑی ہوئی آرائشی چھتیاں اس وقت اٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں اطراف میں مختلف جگہوں پر کرسیاں، تپائیاں اور دیوان پڑے ہوئے تھے۔ وہ راہداری اس ٹیپیکل انگلش آرکیٹیکچر کی ایک شاندار مثال تھا جو انگریزوں نے برصغیر میں یہاں کے موسمی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے استعمال کیا تھا۔ اس راہداری کی قید آدم کھڑکیوں سے برصغیر کی مون سون اور یورپ کے سن باتھ دونوں سے لطف اندوز ہوا جاسکتا تھا۔

دیواروں پر اب اکثر جگہوں پر سٹین نظر آرہی تھی، باہر کھڑکیوں اور دیواروں پر چڑھی بلیں اس کی بنیادی وجہ تھی شاید۔

شہر بانو نے وہاں کھڑے کھڑے ایک ہی نظر میں اس پوری راہداری کا جائزہ لے لیا تھا۔ شہر دل اب داخلی دروازے کے بالکل سامنے اندر میں ہال میں گھلنے والے دروازے کی طرف جارہا تھا جس کے دونوں پٹ پہلے ہی کھلے تھے اور اس ہال میں دور مثال مٹر گشت کرتی نظر آرہی تھی۔ اس ہال نما کمرے کے آدھے حصے میں ڈاننگ ایریا تھا اور باقی کا آدھا حصہ سٹنگ ایریا کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔

شیر دل نے ٹھیک کہا تھا وہاں اندر واقعی بہت سے ایسے فرنیچر آٹمز تھے جو استعمال کرنے سے زیادہ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ شہر بانو اب مکمل طور پر awe میں تھی۔ وہ جیسے کسی ایفک گیلری میں آگئی تھی۔ ”کیا فرنیچر ہے!“ وہ داد دیے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ اب ایک ایک چیز کے پاس جا کر جیسے اسے چھو کر اسے اپنا خراج پیش کر رہی تھی۔

چھت کے درمیان میں ایک فانوس بھی لٹکا ہوا تھا اور سٹنگ ایریا کا فرش کارپٹ اور covered rugs تھا۔ وہاں معمولی اضافوں کے باوجود سب کچھ اسی طرح رکھنے کی کوشش کی گئی تھی جیسے وہ کسی زمانے میں ہوتا ہوگا..... آتش دان تھا جہاں اب گیس ہیٹر نظر آرہا تھا۔ بڑے بڑے روشن دان جو کبھی کھلے رہتے ہوں گے اب بند تھے اور ایک بہت بھاری بھر کم اسپٹ یونٹ نے ان کے فرائض اپنے ذمے لے لیے تھے سب سے آگے چیز اس ہال کمرے کا ٹائل فلور تھا جو اس کمرے میں داخل ہوتے ہی شہر بانو کی نظر میں آگیا تھا اور جسے تبدیل کروانے کے لیے شیر دل کے عملے کا ایک آدمی ایک کیناگ لیے وہاں کھڑا تھا۔ ہال کے بالکل سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک بے حد کشادہ سیڑھی اوپر والی منزل پر جارہی تھی۔

”I hate the floor“ شہر بانو نے جیسے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔  
”And I have the alteenative“ شیر دل نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ”کیناگ ہے پی اے کے پاس اس میں سے ابھی ٹائل سلیکٹ کر لیتے ہیں..... وہ کچن ہے۔“ شیر دل نے اس سے کہتے کہتے دائیں طرف کمرے کے آخری کونے میں موجود ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اب ساتھ ساتھ چلتے کچن میں آگئے تھے جہاں کام کرنے والا عملہ اب بے حد مستعد کھڑا تھا۔  
”اور وہ دروازہ کچن گارڈن اور سرونٹ کو آرٹریک جاتا ہے۔“ شیر دل اسے مزید بتا رہا تھا۔ وہ دونوں اب ساتھ ساتھ عملے کو کچن کے حوالے سے ہدایات بھی دے رہے تھے۔

ڈی سی آفیسر کے طور پر شیر دل کی وہ پہلی پوسٹنگ تھی..... اس صوبے کے قابل ترین نوجوان آفیسرز میں وہ اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ایک بے حد ممتاز مقام رکھتا تھا۔

شہر بانو ابھی تک کچن کا جائزہ لے رہی تھی جو نئے اور پرانے طرز تعمیر کا ایک funny display تھا وہ اس گھر کا واحد حصہ تھا جہاں ضرورت تخلیقی ذوق پر حاوی نظر آرہی تھی۔ بڑے بڑے ڈھنگے انداز میں کچن اور pantry میں کیمینٹس اور ریکس کا اضافہ کیا گیا تھا اور مناسب صفائی نہ ہونے کی وجہ سے ان کیمینٹس اور ریکس کے ساتھ دیواروں اور فرش کا حلیہ بھی خراب تھا۔ بڑے بڑے روشن دان وہاں بھی تھے اور کھانا پکانے والی جگہ

برایک بے حد شاندار چینی بھی..... لیکن شہر بانو کو یقین تھا کہ وہ چینی صفائی نہ ہونے کی وجہ سے مکمل طور پر نہ سہی لیکن بڑی حد تک بلا کڈ ہوگی۔ مکڑی کے جالوں، گرد وغبار اور شاید پرندوں وغیرہ کے گھونسلوں کی وجہ سے بھی جو کچن کے عقب میں دیواروں پر چڑھی بلیوں اور سبزے کی بہتات کی وجہ سے اگر روشن دانوں اور چینی تک پہنچ گئے ہوں تو یہ ناممکنات میں سے نہیں تھا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ چینی میں چڑیوں کے نہیں چوگا ڈروں کے ٹھکانے تھے جن کا سامنا اسے بعد میں ہونے والا تھا۔

چینی ہی کے حصے میں چولہا رکھنے کی جگہ سے کچھ اوپر دیوار میں ایک ایگزاسٹ فین لگایا گیا تھا جس کی باہر والی جالی چکنائی سے آئی ہوئی تھی اور دھوئیں سے سیاہ تھی۔ نیچے موجود کوکنگ رینج بہت پرانا تو نہیں تھا لیکن کثرت استعمال اور ناقص صفائی سے وہ بھی اس وقت کم سے کم سو سال پرانا لگ رہا تھا۔ سنک کے پاس ایک جگہ وائر فلٹر لگا ہوا تھا اور وہ اندر اور باہر سے جتنا گندا لگ رہا تھا اگر کوئی دیکھنے والا فلٹر کا نہیں بلکہ نلکے کا پانی پینے پر اصرار کرتا تو یہ سمجھداری سمجھی جاتی۔ ایسی ہی کچھ حالت پاس موجود سنک کی تھی۔

کچن میں جو تھوڑی بہت صفائی فی الحال موجود تھی اس کی وجہ یہی تھی کہ وہاں پچھلے کئی دنوں سے کچھ نہیں پک رہا تھا۔ کم از کم اس کے علاوہ شیر دل کو اور کوئی وجہ نظر نہیں آئی تھی اگر اس کے وزٹ کو anticipate کرتے ہوئے کچھ صاف کرنے کی کوشش کی گئی تھی تو وہ بھی اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے ایسے متوقع اور یقینی وزٹ پر سرکاری عملے کی لیپا پوتی کی اس سے کئی بہتر کوششیں دیکھی تھیں..... ملامت اور ڈانٹ پھٹکار کافی فی الحال کوئی فائدہ نہیں تھا۔ یہ پروگرام بعد میں بھی متعقد کیا جاسکتا تھا فی الحال ضروری تھا کہ کچن میں جو تبدیلیاں مطلوب تھی، ان کے پارے میں ہدایات دی جائیں سو شیر دل وہی کرتا رہا اور شہر بانو خاموشی سے کچن کا جائزہ لیتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ ہدایات کی صرف یہ پہلی قسط تھی۔ ایسی کئی اقتضا آگے چل کر بھی آکرنی تھیں اسے اور شیر دل کو..... کیونکہ وہ گھر بلاشبہ شاندار تھا لیکن فرنیچر کے علاوہ وہاں مرمت کے کافی ایڈوز تھے۔

”مجھے یہ تو نہیں پتا کہ شہر کی ایڈمنسٹریشن کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں لیکن مجھے یہ ضرور پتا ہے کہ اس شہر میں پیمانٹس سی کا وائرس پھیلا تو اس کی وجہ سے ڈی سی ہاؤس میں اس کچن میں پکا ہوا کھانا کھا کر جانے والے گیسٹ ہوں گے۔“ شہر بانو نے کچن سے نکلتے ہوئے اپنے عقب میں شیر دل کو کہتے سنا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ وہ شیر دل کے ان ٹنک ان چیکس ریمارکس کی عادی تھی۔

”ماسٹر بیڈروم کہاں ہے؟“ واپس ہال میں آتے ہوئے اس نے شیر دل سے پوچھا۔  
”اوپر.....“ اس نے سیڑھی کی طرف اشارہ کیا۔ شہر بانو حیران ہوئی وہ پہلا سرکاری گھر تھا جس کا ماسٹر بیڈروم اوپر تھا۔

”نیچے کیا بیڈروم ہی نہیں ہیں؟“ اس نے شیر دل سے پوچھا۔  
”تین بیڈروم ہیں نیچے لیکن ماسٹر بیڈروم اوپر ہے۔“ وہ ایک بار پھر مثال کو گود میں لیے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ماسٹر بیڈروم ایک وسیع و عریض کمرہ تھا لیکن شہر بانو کو اس کی حالت دیکھ کر حیرت ہوئی۔ واضح طور پر وہ



بہت عرصے سے زیر استعمال نہیں تھا۔ فرش، دیواریں، کھڑکیاں، دروازے ہر چیز اتر حالت میں تھی۔  
 ”یہ کوئی استعمال نہیں کر رہا تھا؟“ شہر بانو نے جیسے کچھ حیرانی سے کمرے میں گھومتے ہوئے شیردل سے پوچھا۔ کمرے میں برائے نام فرنیچر تھا اور وہ بھی خاصا خستہ حالت میں۔  
 ”نہیں، برہان صاحب صرف نیچے کا فلور ہی استعمال کر رہے تھے۔ وہیں کا ایک بیڈروم ماسٹر بیڈروم کے طور پر ان کے استعمال میں تھا۔“ شیردل نے اسے بتایا۔  
 ”یہ ماسٹر بیڈروم تو بہت عرصے سے کوئی بھی ڈی سی صاحب استعمال نہیں کر رہے۔ بند ہی رہتا ہے۔ یہ سب لوگ نیچے ہی رہتے رہے ہیں۔“ پی اے نے شیردل کی بات میں اضافہ کیا۔  
 ”نیچے والے کمرے کیا زیادہ اچھے ہیں؟“ شہر بانو نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے پوچھا۔ وہاں سے وہ آس پاس پھیلے وسیع و عریض لان اور لان سے دور سڑک تک دیکھ سکتی تھی۔ ویوز بردست تھا۔  
 ”نہیں میڈم، وہ زیادہ اچھے تو نہیں ہیں لیکن شروع سے وہی استعمال ہوتے آ رہے ہیں۔ وہاں ساری سہولیات ہیں۔ اس کمرے کے ہاتھ روم میں بھی ابھی پرانے fixtures ہی ہیں۔ پھر چھت بھی کبھی کبھار ٹیکنے لگتی ہے اگر زیادہ بارش ہو جائے۔“ شہر بانو اور شیردل نے پی اے کی بات پر بے اختیار سراٹھا کر چھت کو دیکھا۔ چھت کی حالت واقعی کافی خراب تھی اور وہ کبھی کبھار نہیں یقیناً باقاعدگی سے ٹیکتی تھی اور ایک جگہ سے نہیں بلکہ دو تین جگہ سے۔  
 ”اور بھی کچھ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے یہ کمرہ استعمال نہیں ہوتا۔“ پی اے نے بات جاری رکھتے ہوئے آخری جملہ کچھ ہچکچا کر کہا۔ شیردل نے چونک کر اسے دیکھا۔  
 ”اور کیا وجوہات ہیں؟“ پی اے چند لمحے جیسے کچھ تامل کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔  
 ”اس کمرے میں کچھ اثرات ہیں۔“ شیردل اور شہر بانو بیک وقت اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔  
 ”کیسے اثرات؟“ شیردل نے ماتھے پر چند بلوں کے ساتھ کہا۔ پی اے نے سر ہلایا۔  
 ”آپ کا مطلب ہے جن بھوت؟“ اس نے پی اے کے جواب سے پہلے ہی کہا۔ پی اے نے سر ہلایا۔ شیردل نے اور شہر بانو نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔  
 ”مجھے تو پہلے نہیں بتایا تم نے یہ؟“ شیردل نے کچھ تجسس کے عالم میں کہا۔  
 ”میں نے سوچا آپ کو پتا ہی ہوگا۔“ پی اے نے کہا شہر بانو اب جیسے از سر نو اس کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔  
 ”مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے۔ اور کیا بیک گراؤنڈ ہے ان جن صاحبان کا۔ تنگ کرتے ہیں یا صرف رہائش پزیر ہیں؟“ شیردل بھی اب اس کمرے کو ایک نئی نظر سے دیکھ رہا تھا۔  
 ”جن نہیں ہیں وہ۔“ پی اے کچھ ہچکچایا۔ شیردل اور شہر بانو نے ایک بار پھر اسے دیکھا۔ ”وہ بونے ہیں۔“ پی اے نے بات مکمل کی۔  
 ”بونے؟“ شہر بانو نے شیردل کو دیکھا۔  
 ”Dwarfs“ اس نے جواب دیا اور ہنسا۔

”انٹرنٹنگ!“ وہ جیسے اس انکشاف سے لطف اندوز ہوا تھا۔  
 ”تو بونے ہیں اس کمرے میں۔“ اب وہ مسکراتی نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ پی اے زیادہ سنجیدہ ہوا، اس کی ہنسی پر اسے لگا شیردل کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔  
 ”کتنے بونے صاحبان ہیں یہاں؟“ شیردل نے کچھ دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔  
 ”یہ مجھے تو نہیں پتا۔ کتنے بونے ہیں یہاں؟“ پی اے نے وہاں کھڑے گھر کے ایک ملازم سے پوچھا۔  
 ”ٹھیک سے تو نہیں پتا لیکن کہتے ہیں چار پانچ ہیں۔“ اس ملازم نے اس اچانک آنے والے سوال پر کچھ گڑبڑا کر جواب دیا۔  
 ”اور کب سے ہیں یہ یہاں؟“ شیردل نے اب براہ راست اس ملازم سے سوال جواب شروع کر دیے۔  
 ”یہ بھی ٹھیک سے نہیں پتا سر جی۔ کہتے ہیں ہمیشہ سے ہیں۔“ آخر، شیردل کے براہ راست سوال سے کچھ اور گڑبڑا دیا تھا۔  
 ”ہمیشہ سے کب سے؟ جب سے گھر بنا ہے؟“ شیردل نے بے ساختہ مسکرا کر شہر بانو کو دیکھا، وہ نہیں مسکرائی وہ کچھ متوجش تھی وہ وہی نہیں تھی لیکن وہ بہر حال ان چیزوں پر یقین رکھتی تھی۔  
 ”جن بھوتوں کا تو میں نے سنا ہے لیکن یہ بونوں کے بارے میں میں پہلی بار سن رہا ہوں۔ تمہارا کوئی ایکسپیرٹس یا انفارمیشن ہے؟ شہر بانو نے شیردل کے سوال کو مکمل طور پر نظر انداز کیا۔ وہ جانتی تھی وہ سوال نہیں تھا وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ اسے ہورر اسٹوریز پڑھنے کا شوق تھا اور خاص طور پر supernatural چیزوں کے حوالے سے۔  
 ”تنگ کرتے ہیں؟“ شیردل نے دوبارہ اختر سے پوچھا۔  
 ”جی کبھی کبھی۔“  
 ”مثلاً کیا کرتے ہیں؟“ شیردل نے مزید دلچسپی لی۔  
 ”چیزیں چھپا دیتے ہیں۔ آوازیں دیتے ہیں۔ اسی طرح کے کام کرتے ہیں۔“ اختر کچھ ہچکچا رہا تھا اس کمرے میں کھڑے ہو کر بونوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ جیسے کچھ پریشان تھا۔  
 ”آوازیں دیتے ہیں؟ اچھا۔“ شیردل کو مزید تجسس ہوا۔ ”کسی نے دیکھا ہے انہیں؟“  
 ”بہت دفعہ۔“ اختر نے بے ساختہ کہا۔  
 ”کس نے؟“ شیردل سنجیدہ ہوا۔  
 ”گھر میں جو ملازم ہیں انہوں نے دیکھے ہیں کئی بار۔“  
 ”بس اس کمرے میں رہتے ہیں؟“ شیردل اب جیسے تفتیش کرنے کے موڈ میں تھا۔  
 ”نہیں، صرف اس کمرے تک نہیں رہتے۔ گھر میں گھومتے پھرتے ہیں خاص طور پر کچن میں۔“ شیردل، اختر کی سنجیدگی سے کبھی بات پر بے اختیار ہنسا۔

نے بے حد سنجیدگی سے اس بار انگریزی میں تبصرہ کیا تھا جو صرف شہر بانوسن اور سمجھ سکی لیکن وہ بالکل محظوظ نہیں ہوئی تھی۔

”اس نے خودکشی کر لی۔“ اختر پیچھے آتے ہوئے بولا۔

”بتا نہیں سراسر اس کا تو مجھے بتا نہیں۔“ اختر گڑبڑایا۔ ”مجھے بس اتنی ہی کہانی آتی ہے۔“

”نہیں پتا تو پتا کر کے پتانا مجھے۔“

"Myths and fabrication" شہر باتوں نے کہا۔

”ذرا چھت پر بھی لے جاؤ..... دیکھیں ڈی سی صاحب کہاں سے گرائے گئے تھے۔“ شیردل نے شہربانو

چھت کے دروازے کی چابی ان کے پاس نہیں تھی۔ انہیں تو قلع نہیں تھی کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی مسٹر اور

یہاں مسز ڈی سی او کو تو چھت دیکھنے کا کوئی اشتیاق نہیں تھا لیکن ڈی سی او صاحب اگر چھت دیکھنے کے لیے

تھی اگر اوپر والی منزل کی چھت پچھلے کئی سالوں سے اس لیے ٹپک رہی تھی کیونکہ وہاں کوئی رہائش پذیر نہیں تھا تو

heavy چھت پورے مون سون میں زمین بوس بھی ہو سکتی تھی۔

دل کا چھت دیکھے بغیر ٹٹنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا تو بالآخر چابی برآمد ہو گئی۔ شیر دل اس دوران بڑے اطمینان

رہا، شہر بانویری طرح بیزار بیٹھی رہی لیکن اس نے شیر ولی کو وہاں سے چلنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اس کا فائدہ بھی

شیردل اپنے پروفیشنل معاملات میں اس کی رائے کو نہ تو اہمیت دیتا تھا اور نہ ہی پسند کرتا تھا۔ شہر بانو نے کبھی اس

کر سکتی تھی جو شیر دل کو ناپسند ہوتا۔ وہ اس سے ڈرتی نہیں تھی، وہ صرف پاگل پن کی حد تک اس کے عشق میں

عملے کے افراد نے چابی کی تلاش کے دوران چند بار شیر دل کو باقی گھر دکھانے کے لیے آمادہ کرنے کی

حد معنی خیز انداز میں شہر بانو کو دیکھ کر مسکرایا پھر اس نے اختر سے کہا۔

پھر اس نے کہا۔

”اچھا ابھی کچھ اور باقی ہے..... فرمائیں اور کیا مسئلہ ہے اس کمرے کا۔“ شیردل نے ایک گہری سانس

کے موڈ میں نہیں تھا خاص طور پر شہر بانو کے سامنے۔

بانو کو جیسے کرنٹ لگا۔۔۔ شیر دل اپنے سوال پر اب بچھتا یا۔۔۔ تجسس یقیناً ایک انتہائی مضر چیز ثابت ہوئی تھی اس

”اس کمرے میں قتل کیا تھا.....؟“ شیردل نے اب سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

سانس لیتے ہوئے کہا۔

لیکن اس کا جملہ اس کے منہ میں ہی رہ گیا۔

چہرہ اسے جو کچھ بتا رہا تھا اس کے بعد اس کمرے کو بے حد پسند کرنے کے باوجود شیردل کو اندازہ ہو گیا تھا کہ

کے بعد اگر اس گھر میں رہائش اختیار کرنے پر تیار ہو جاتی تو یہ بھی بہت بڑی فیور ہوتی اس کے لیے، وہ کمرابھی

جان گیا تھا۔

پہلے اس گھر کا ایک سرسری جائزہ لینے کے لیے یہاں ہو کر گیا تھا اور یہ ماسٹر بیڈروم اس نے تب بھی دیکھا تھا

”اس افسر کا کسی عورت کے ساتھ چکر تھا..... اس کی بیوی نے دونوں کو دیکھ لیا تھا پھر اس کے بعد ہی اس

”اس کہانی سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ اگر کوئی چکر ہو تو کم از کم بیوی کے ہاتھوں پکڑے نہیں جانا

Muhammad Nadeem 2011

کوشش کی تھی۔

”باقی گھر چھت کے بعد۔“ شیردل کا جواب دو ٹوک تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک بار وہ اسے اوپر والی منزل سے نیچے لے گئے تو پھر وہ نیچے اس کا اتنا وقت ضائع کرائیں گے کہ وہ یاد رہنے کے باوجود اوپر نہیں آپائے گا۔ اپنی سرکاری ملازمت کے دوران وہ ماتحت عملے کے سارے پینتروں اور حریوں سے واقف ہو چکا تھا۔

جس چابی کی تلاش میں آدھا گھنٹا لگا تھا چھت کا تالا اس سے نہیں کھلا تھا۔ وہ زنگ آلود ہونے کے باعث توڑ کر کھولا گیا اور چھت پر پہلا قدم رکھتے ہی شیردل کو پتا چل گیا تھا کہ عملہ چھت کو اس سے چھپانے کی کوشش میں کیوں مصروف رہا تھا۔ وہ چھت نہیں تھی جڑی بوٹیوں، جھاڑیوں، گھاس پھوس کا ایک جزیرہ نما جنگل تھا سردیوں کے موسم کے باوجود چھت پر کافی کی تھیں کئی جگہوں پر وہ کافی جیسے دلدل جیسی شکل اختیار کر گئی تھی اور کافی سے بھری ہوئی چھت پر جگہ جگہ مختلف جھاڑیوں نما پودے اگے ہوئے تھے۔ وہ کس طرح وہاں آگے آئے تھے اس کا جواب سائنس دے سکتی تھی یا وہ سرکاری عملہ جن کے تعاون سے وہ نہایتائی گارڈن وہاں معرض وجود میں آیا تھا۔

شیردل دو قدم سے آگے نہیں بڑھا۔ وہ اپنے جوتوں کا ستیاناس نہیں مار سکتا تھا اور اسے یقین تھا کہ کافی اور گھاس پھوس کے اس جزیرے میں ہر طرح کے حشرات الارض بھی ہوں گے اگر سانپ وغیرہ پائے جاتے تو بھی اسے حیرت نہیں ہوتی۔

”اگلی بار جب میں اس گھر میں آؤں گا تو سب سے پہلے چھت پر آؤں گا۔“ اس کے اعلان میں کیا تنبیہ تھی اس کا ماتحت عملہ جانتا تھا۔

”ماسٹر بیڈروم میں استعمال کروں گا اور چھت اب لاک نہیں ہوگی۔“ وہ یہ کہتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ شہر بانو اس سے پہلے ہی نیچے اتر رہی تھی اور اس نے سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کا جملہ سن لیا تھا۔ وہ کسی صورت اس بیڈروم میں رہنے کو تیار نہیں تھی۔ وہاں بونے ہوتے نہ ہوتے لیکن یہ دوسرا قصہ اس کا دل اٹھانے کے لیے کافی تھا۔

بی اے نے ٹھیک کہا تھا نیچے والے بیڈروم بے حد اچھی حالت میں تھے۔ وہاں تمام جدید سہولیات میسر تھیں اور شہر بانو نے بھی وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس نے فی الحال شیردل سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے شہر بانو اتنی خوش نہیں تھی جتنی وہ اندر جاتے ہوئے ہوئی تھی۔ بلاشبہ وہ گھر بہت شاندار طرز تعمیر کا حامل تھا اور آریٹیکچر شہر بانو کا میجر رہا تھا۔ وہ آریٹیکچر نہ بھی پڑھتی تب بھی اسے جنون کی حد تک اس سبجیکٹ میں دلچسپی تھی خاص طور پر راج کے زمانے میں بنائی جانے والی برصغیر کی پرانی عمارتوں میں۔

”بابا میرا ٹیڈی۔۔۔۔۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے مثال نے یک دم شیردل سے کہا وہ چونکا۔

”ٹیڈی کہاں چھوڑ دیا تم نے؟“ اس نے مثال سے پوچھا۔

”آئی ڈونٹ نو۔“ جواب آیا تھا۔ عملے کے چند ارکان اندر دوڑے گئے تھے اور پندرہ منٹ ہر جگہ تلاش

کے باوجود وہ ٹیڈی کہیں نہیں ملا تھا۔

”Leave it miso ... baba will get you another teddy“ شہر بانو نے

بالآخر اس تلاش سے کچھ بیزار ہوتے ہوئے کہا۔ مثال بڑی آسانی سے راضی ہو گئی تھی۔

ریسٹ ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے شیردل نے مثال کو بہلاتے ہوئے کہا۔ ”Miso is a

good girl“ شہر بانو نے مسکرا کر مثال کو دیکھا جو شیردل کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ”Yes Miso is

a very good girl“ کوئی ضد نہیں کرتی اب۔“ شہر بانو نے کہا۔

”Baba I think I know who took my toy“ مثال نے ان کے جملوں کے

جواب میں یک دم بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”who?“ شیردل نے پوچھا۔

”There was a boy there, he was asking for my teddy. he

wanted to play with it“

”I didn't see any boy there“ تم نے کہاں دیکھا؟“ شیردل نے کچھ حیران ہو کر کہا۔

”In the kitchen“ مثال نے کہا۔

”When?“ شیردل حیران ہوا۔

”When I went in to that small room next to the kitchen“

مثال نے ہاتھ کے اشارے سے لوکیشن سمجھانے کی۔ کوشش کی شہر بانو سمجھ گئی وہ pantry کا ذکر کر رہی تھی۔

یقیناً وہ وہیں ٹیڈی بھول آئی تھی۔

”شاید کسی سرونٹ کا کوئی بچہ ہوگا۔“ شہر بانو نے شیردل سے کہا۔

”سرونٹ کے بیوی بچے کہاں سے آگئے، مشکل سے ملازموں کو ہی اکا موڈیٹ کیا ہوتا ہے۔ دیکھوں گا

میں۔“ شیردل نے شہر بانو کو جواب دیا۔

”He was very ugly“ مثال اب بھی بول رہی تھی۔

”who?“ شیردل پھر چونکا۔

”That boy“ مثال نے سنجیدگی سے کہا۔

”No, that's not nice“ شہر بانو نے اسے ٹوکا۔

”Mummy he was really ugly“ مثال نے جیسے احتجاج کیا۔ ”And very Small“ مثال

نے اضافہ کیا۔

”How small?“ شیردل نے پوچھا۔

”Only this much“ مثال نے دونوں ہاتھوں کے اشارے سے جیسے اس لڑکے کی جسامت

بتائی۔ وہ تقریباً ایک فٹ کا سا بچہ تھا ہی تھی۔ شہر بانو ہنس دی۔

”تمہاری بیٹی اور اس کی Fairy tales۔“ شہر بانو نے شیردل پر طنز کیا۔ مثال کہانیاں سنانے کی

عادی تھی اور شیردل اس کی کہانیاں شوق سے سنتا تھا۔ شیردل مسکرایا۔

"And then he disappeared" شیردل نے مثال کے اگلے جملے پر دھیان دینے کے

بجائے شہر بانو سے کہا۔

"تمہیں گھر کیسا لگا ہے؟"

"میرا خیال ہے ریسٹ ہاؤس پہنچ کر بات کرتے ہیں۔" شہر بانو نے جیسے شیردل کو ڈرائیور کی موجودگی کا احساس دلایا۔ شیردل کو اسی جواب کی توقع تھی۔ یعنی شہر بانو کو اعتراضات تھے شیردل نے بے اختیار گہری سانس لی۔

☆☆☆

کاؤنٹر پر پڑا شیشے کا گلاس بہت آہستگی سے کاؤنٹر پر سرک رہا تھا۔ سبزی والی ٹوکری میں سے ٹماٹر اٹھاتے ہوئے وہ ٹھٹکی تھی۔ شیشے کے اس گلاس میں پانی پی کر تھوڑی دیر پہلے اسی نے ہی اسے کاؤنٹر پر رکھا تھا۔ گلاس ابھی بھی آدھا پانی سے بھرا ہوا تھا اور کاؤنٹر پر حرکت کرنے سے وہ پانی مسلسل ہل رہا تھا۔ خیر دین آنا گوندھتے ہوئے ابھی بھی اسے قصہ سنانے میں مشغول تھا۔

"تو پھر صاحب نے مجھے کہا خیر دین میں نے تم سے اچھا خانساں آج تک نہیں دیکھا۔ حالانکہ میں آٹھ شہروں میں پوسٹ رہا ہوں۔ لیکن جیسی دال تم بناتے ہو میں نے آج تک کہیں اور نہیں کھائی۔ اگر پورے پاکستان میں بیسٹ دال پکانے کا مقابلہ ہو جائے تو تم کو پہلا انعام ملے گا۔ تمہاری دال کے سامنے کسی کی دال نہیں گلے گی۔" وہ قصہ سنا تے ہوئے آٹے کی پرات پر مکمل طور پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے اپنی بات پر خود ہی ہنسا۔ اس نے ٹولس نہیں کیا تھا کہ چڑیا نہ تو اس کی طرف متوجہ تھی نہ ہی اس کی بات سن رہی تھی۔

وہ اچھنبے کے عالم میں بس اس گلاس کو دیکھ رہی تھی جو کاؤنٹر پر خود ہی حرکت کر رہا تھا۔ یا شاید چل رہا تھا۔ اس کے ننھے ذہن نے اس کی حرکت کو نام دینے کی کوشش کی۔ اس دن اس کی ٹیپرنے اسکول میں یہی سکھایا تھا ہر ایکشن کے لیے درست لفظ کا استعمال کرنے کی کوشش۔ ہر حرکت کا ایک حاس نام بھی ہوتا ہے۔

"The glass is moving" اس کے ننھے ذہن نے اس حرکت کرتے ہوئے گلاس پر پہلی نظر ڈالتے ہوئے بے اختیار سوچا تھا اور پھر وہ اس مومنٹ کے لیے لفظ کی تلاش میں مشغول ہو گئی۔

"The glass is walking" اپنے محدود علم اور ذخیرہ الفاظ کا استعمال اس نے گلاس کی حرکت کو نام دینے کے لیے کیا اور اس کے دماغ نے جیسے اسے ریڈیو سگنل دیا۔

"واک تو زندہ چیزیں کرتی ہیں۔" اس وقت پہلی بار اس کا ذہن گلاس کی حرکت کو نام دینے کی جدوجہد سے ہٹ کر اس بات پر اٹکا کہ ایک بے جان چیز "واک" بھی کیسے کر رہی تھی۔ وہ اب بے جان اور جان دار چیزوں کی خصوصیات کو Skim کر رہی تھی۔ چند سیکنڈز میں اس کے ذہن نے Skinning اور screening کے بعد گلاس کو بے جان کی کیٹگری میں ہی ڈالا۔ اور تب اس نے اپنے ذہن کو جیسے اس اچھنبے کا شکار ہونے کی اجازت دی جس کا شکار وہ اس وقت تھی۔

"گلاس تو بے جان ہے پھر یہ حرکت کیسے کر رہا ہے؟" یہ سوال تھا جو اس وقت اسے کنفیوز کر رہا تھا اور کنفیوز کرنے سے زیادہ اسے متحس کر رہا تھا۔ "کیا کوئی ایسی حالت ہوتی ہے جس میں بے جان گلاس بھی حرکت کر سکتا ہے؟" اس کا ذہن اب جیسے کوئی نئی دریافت کرنا چاہ رہا تھا۔ اور وہاں کھڑے اس پراسرار انداز میں حرکت کرنے والے گلاس اور اس کے اندر تھرکتے پانی کو دیکھتے ہوئے چڑیا کو خوف یا دہشت نام کی کوئی چیز محسوس نہیں ہوئی تھی۔ محسوس ہونا تو دور کی بات تھی اس نے خوف نامی عنصر کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کی جگہ کوئی بڑا اچانک ایک گلاس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھ لیتا تو یا تو چیخیں مارتے ہوئے اس کچن سے بھاگ جاتا یا پھر پورے گھر کو وہاں اکٹھا کر لیتا مگر کوئی بھی اس کی طرح وہاں کھڑے اپنے آج کے سبق کو اس گلاس پر اپلائی کرنے کی کوشش نہ کر رہا ہوتا۔

"صاحب نے جب کمشنر صاحب کو کھانے پر بلایا تھا تب بھی انہوں نے خاص طور پر مجھ سے وہ دال پکوائی۔ کمشنر صاحب کو اتنی پسند آئی کہ وہ پچاس روپے انعام دے کر گئے مجھے، ان کی جو بیگم صاحبہ تھیں انہوں نے تو باقاعدہ ترکیب لکھوائی مجھ سے۔" خیر دین اب بھی مگن انداز میں آنا گوندھتے ہوئے دال نامہ سن رہا تھا۔ "کہہ رہی تھیں کہ کسی رسالے میں بھی بھیجیں گی وہ اس دال کی ترکیب کو۔ میں نے بھی کہا بیگم صاحبہ جہاں مرضی چھپوائیں جو ذائقہ خیر دین کے ہاتھ کا ہے وہ خیر دین کی کچی ہوئی دال میں ہی ملے گا اور۔۔۔۔۔"

"نانا کوئی گلاس چل سکتا ہے کیا خود ہی؟" چڑیا نے ایک دم خیر دین کو ٹوکا، وہ اب اپنے ایک ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن کو دانتوں سے کترتے ہوئے بے حد اچھے انداز میں گلاس پر نظریں مرکوز کیے ہوئے تھی۔ یوں جیسے وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

"ہیں!۔۔۔!" خیر دین آنا گوندھتے گوندھتے گڑ بڑایا۔ اس نے چڑیا کو دیکھا اس کو لگا اس نے سنے میں کوئی غلطی کی تھی۔

"کیا پوچھ رہی تھیں تم؟" اس نے چڑیا کی نظروں کا تعاقب کیے بغیر صرف ایک نظر اسے دیکھ کر پوچھا۔ "کیا کوئی گلاس چل سکتا ہے؟" چڑیا نے اسی سنجیدگی کے ساتھ گلاس پر نظریں جمائے سوال دہرایا۔ خیر دین بے اختیار ہنسیوں جیسے وہ چڑیا کے سوال سے بے حد محظوظ ہوا ہو۔

"لو بھلا، گلاس کیسے چل سکتا ہے؟ گلاس کوئی زندہ تھوڑی ہوتا ہے۔" وہ دوبارہ آنا گوندھنے لگا۔

"ہو سکتا ہے کوئی گلاس زندہ ہوتا ہو۔" اس بار خیر دین اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنسا تھا لیکن آنا گوندھتا رہا۔

"نہیں بیٹا، کوئی بھی گلاس زندہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی چل سکتا ہے۔" اس نے بڑی محبت سے چڑیا کے

سوال کا جواب دیا وہ سارا دن یہی ایک کام کرتا تھا۔ صبح سے لے کر رات تک چڑیا کے سوالوں کا جواب دیتا رہتا تھا اور یہ اس کی زندگی کا پسندیدہ ترین کام تھا اس سے وہ کئی گنا زیادہ شوق سے اس کے سوالوں کا جواب دیتا تھا جتنے شوق سے وہ اپنی مشہور زمانہ دال بناتا تھا۔

وہ اس کی اکلوتی نواسی تھی۔ اس کی اکلوتی بیٹی کی اکلوتی اولادِ حلیمہ کے دوسرے شوہر سے زندہ بچ جانے

والی واحد اولادِ حلیمہ اور خیر دین کی متاعِ حیات۔

پنجاب کا ایک پسماندہ گاؤں خیر دین کا آبائی علاقہ تھا اور وہ اس علاقے سے دس جماعتیں پڑھنے والا تو

پہلا لڑکا نہیں تھا لیکن سرکاری ملازمت میں آنے والا پہلا آدمی ضرور تھا اور وہ سرکاری ملازمت بھی ڈپٹی کمشنر کے گھر کا مالی..... تقریر نامہ ملے ہی گاؤں میں خیر دین کے گھر کا اسٹیشن ہی بدل گیا تھا۔ وہ ذات کا لوہا تھا اور گاؤں کا کی کمین اور سارا بچپن اور نو عمری اس نے گاؤں کے کی کمین کی حیثیت سے چوہدری، نمبردار، پٹواری اور اونچی ذات اور زمینوں والوں کی رعایا کے طور پر ان کی جی حضور یوں ہی میں گزاری تھی گاؤں میں تھانے دار نہیں تھا اور نہ ان کے آقاؤں میں ایک اور اضافہ ہو جاتا اور ویسی زندگی اس نے اپنے ماں باپ اور دھیال ننھیال کے لوگوں کو گزارتے دیکھی تھی۔ ان کے گھر کا راشن فصلوں کی کٹائی سے ملنے والے دانوں سے نکلتا تھا اور اس گاؤں میں ان کی زمین بس ایک کنال کا وہ احاطہ تھا جس کے ایک کونے میں اس کے باپ نے لوہے کے اوزار بنانے اور مرمت کرنے کی بھٹی لگا رکھی تھی اور دوسرے کونے میں ماں نے دانے بھوننے کی اور تیسرے کونے میں ایک گدھے، دو بھینسوں، چار بکریوں، پچیس مرغیوں، تین کتوں، چار بلیوں، آٹھ بطنوں اور خرگوشوں کے تین جوڑوں کا ایک خاندان آباد کیا گیا تھا اور احاطے کے چوتھے کونے میں چار کمروں، برآمدے اور دالان پر مشتمل ان کا گھر 21 افراد کے زیر پرہائش تھا جن میں خیر دین کے دس بہن بھائیوں کے علاوہ دادا دادی اور کچھ دھھیالی رشتے دار بھی شامل تھے اور انہیں افراد کے اس کنبے کو رزق فراہم کرنے کی مستقل ذمہ داری صرف خیر دین کے ماں باپ پر تھی۔

ان انیس افراد میں خیر دین واحد خواندہ تھا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور خیر دین کے ماں باپ کی دوسری اولاد سات سال بعد ہوئی تھی تو وہ سات سال اپنے محدود وسائل اور غربت کے باوجود خیر دین نے بادشاہ کی طرح گزارے تھے۔ اس کے ماں باپ کو اسے پڑھانے کا شوق گاؤں میں انگریزوں اور ان کے ساتھ آنے والے سوٹ بوٹ میں ملبوس ان ہی کی طرح گٹ پٹ کرنے والے ہندوستانیوں، کاٹھے انگریزوں اور ان کے ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھ کر ہوا تھا۔

”میں نے تو اپنے خیر دین کو پڑھا لکھا کر افسر بنانا ہے۔“ خیر دین ابھی دو سال کا تھا جب اس کی ماں نے ایک دن ڈپٹی کمشنر کے دورے کے بعد خیر دین کے باپ کے سامنے اعلان کیا تھا۔

”یہ تیری میری طرح بھٹی میں نہیں جھونکے گا اپنی زندگی... افسر بنے گا، جیب میں آیا کرے گا..... اس کے ساتھ بندوقوں والے سنتری ہوں گے اور جو بھی اس سے ملے آئے گا وہ پہلے کئی کئی گھنٹے انتظار کرے گا پھر لائن میں لگے گا پھر میرے بیٹے کو ملے گا۔“ خیر دین کا باپ حقے کی نے اپنے منہ میں دبائے بیوی کے خیالی پلاؤ سن سن کر ہنستا رہا۔ ان کے گاؤں کے پاس سے نہر گزاری جا رہی تھی اور اس کی تعمیر و توسیع کے سلسلے میں ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی سرکاری افسر اپنے چھتے کے ساتھ وہاں آن موجود ہوتا تھا۔ گاؤں کے لوگ ان دوروں کے عادی ہو گئے تھے۔ انگریز کا زمانہ تھا اس لیے افسروں کی بڑی تعداد انگریزوں ہی کی تھی۔ ہندوستانی صرف ان کے ماتحت کے طور پر دم ہلاتے ان کے ساتھ چلتے پھرتے رہتے صرف ایک بار ایک ہندوستانی افسر وہاں آیا تھا اور گاؤں میں دھوم مچ گئی تھی۔ اس ہندوستانی افسر کے پاس ہاجرہ بی بی بھی پہنچی تھی اور واپس آتے ہوئے دو سال کے خیر دین کو اٹھائے وہ طے کر چکی تھی کہ خیر دین نھو لوہار کی بھٹی نہیں سنبھالے گا بلکہ وہ دفتر میں کام کرے گا۔ گدھے اور ریزھے پر سفر کرتے اپنی زندگی نہیں گزارے گا بلکہ اس ہندوستانی افسر

کی شاعر جیب میں بیٹھ کر کہیں بھی آیا جایا کرے گا۔

سات سال تک نھو لوہار اور ہاجرہ بی بی یہ خواب پالتے رہے ایک ایک لڑکا بچا کر خیر دین کو تعلیم دلوانے کی کوشش کرتے رہے پھر ساتویں سال دوسرے بچے اور اس کے بعد ہر سال ایک بچے کی پیدائش نے ہاجرہ اور نھو کے ذہن سے اسٹیشن تبدیل کرنے کے بھوت کو نکال کر بھوک کے جن کو ان کے پیٹ میں قید کر دیا تھا لیکن خیر دین جب تک بگڑ چکا تھا..... ماں باپ کے دھکے، گالیاں، گھونسنے کھانے کے باوجود وہ بستہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا لیکن دس دس میل دور پیدل اسکول جانے کے لیے تیار تھا۔

ملازمت کی تلاش اس نے دفتر میں شروع کی تھی اور یقیناً اسے مل جاتی لیکن ڈپٹی کمشنر کے گھر میں مالی کی نوکری کے لیے اس نے دفتر میں کلر کی چھوڑ دی تھی۔ یہ اس کی ماں کا خواب تھا اور وہ جیسے اپنی ماں کے خواب کی تعبیر کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اگر انگریزی زبان اس کے پاؤں کی زنجیر نہ بنتی تو وہ مالی کے بجائے اس گھر کا صاحب بننے کی کوشش بھی کرتا لیکن انگریز نے برصغیر کے عوام کو پورا اور اتھارٹی سے دور رکھنے کے لیے انگریزی زبان کی باڑ رعایا اور حاکم کے درمیان لگائی تھی۔ کسی زمین پر نہیں لگائی تھی، ذہن میں لگا دی تھی یہ جیسے پول والٹ کا پول تھا بلندی تک پہنچنے کا واحد ذریعہ۔

اور خیر دین کے ساتھ وہی ہوا تھا جو ہو سکتا تھا..... ڈپٹی کمشنر کے گھر ہیڈ مالی کے ساتھ کام کا آغاز کرنے میں اس کی دس جماعتوں سے زیادہ اس کی گاؤں میں کھیتی باڑی کا تجربہ کام آیا تھا۔ وہ اس ضلع کا پہلا اور واحد فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس مالی تھا اور چند مہینوں میں اس نے اپنی محنت اور ذہانت سے صاحب کا اعتماد جیت لیا تھا۔ مالی کا کام کرتے کرتے وہ صاحب کے کچن میں پارٹ ٹائم خانساہاں کے فرائض بھی انجام دینے لگا..... شروع میں اس نے بیرا گیری کی اور خانساہاں کے معاون کے طور پر کام کرتا رہا لیکن پھر ایک وقت آیا کہ جس دن خانساہاں چھٹی پر ہوتا اور خیر دین کھانا بنا کر ٹیبل سجاتا..... کھانے کی میز کی شکل ہی کچھ اور ہوتی، کھانے کے ذائقے کی تو خیر بات ہی الگ تھی..... صاحب نے اس کو پھر آؤٹ آف داوے پر مشن دینے میں دیر نہیں کی تھی۔

خیر دین گھر کے باہر سے گھر کے اندر آ گیا تھا..... وہ گاؤں میں فخر یہ سب کو بتاتا تھا کہ وہ سارا دن ڈپٹی کمشنر ہاؤس میں گزارتا ہے..... اتنا وقت جتنا صاحب بھی نہیں گزارتا..... چند اور مہینوں میں خیر دین نے جیسے ڈپٹی کمشنر ہاؤس کا حلیہ بدل کر رکھ دیا۔ وہ صاحب اور بیگم صاحبہ کا رائٹ ہینڈ بن گیا تھا جس پر اب وہ اندھا اعتماد کرتے تھے..... خیر دین اب خانساہاں نہیں بلکہ تھا..... وہ انگریزی زبان جو وہ تعلیم حاصل کرنے کے دوران کہیں سے نہیں سیکھ سکا تھا وہ اس نے ایک انگریز ڈپٹی کمشنر اور اس کی میم صاحب سے سیکھی تھی اور دو سال کے دوران وہ انگریزی اس لہجے میں بولنے لگا تھا جس میں صرف لندن کے west end میں رہنے والے بولتے۔ وہ کوئٹ لرنز تھا اور اپنی اس کوالٹی کی وجہ سے اپنے صاحب کا چہیتا تھا کیونکہ یہ خصوصیت ہندوستانیوں میں بہت کم پائی جاتی تھی۔

گاؤں میں اب خیر دین کے گھر کے باہر اس کی نیم پلیٹ تھی جس پر خیر دین کے نام کے نیچے اس کی designation اور اس کی مختصر سی designation کے نیچے اس کے صاحب کا نام اور صاحب کی designation کی تفصیلات مع صاحب کے سرکاری گھر اور سرکاری دفتر کے موجود تھیں اور اس نیم



پلیٹ نے خیر دین کے خاندان کو کی کمین نہیں رہنے دیا تھا۔ وہ اب انگریز کا ملازم تھا۔ اسے گاؤں کے ہر اونچی ذات کے چوہدری، برہمن، پیسے، پنواری کے سامنے جھکنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

وہ اس گاؤں کا پہلا اور خاص طور پر اپنی برادری کا پہلا رول ماڈل تھا۔ بد قسمتی سے اور روایتی طور پر اس کے اپنے بہن بھائیوں میں سے کوئی اور ایک بھی اس رول ماڈل سے انسپائر ہو کر اس کے نقش قدم پر چلنے کو تیار نہیں ہوا تھا۔ ان کے بڑا لکھنے کو بڑے بھائی کا اسٹیٹس کافی تھا۔ اس کے چھ کے چھ بھائی پہلی دوسری جماعت سے ہی اسکول چھوڑ آئے تھے اور بہنوں کو تو خیر اس زمانے میں تعلیم دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خیر دین کے بھائیوں کے لیے یہ بہت کافی تھا کہ بڑا بھائی کچھ بن گیا تھا اور وہ اس کے فخر کو اپنے سینے پر میڈل کی طرح لگا کر پھرتے رہتے تھے۔ خیر دین اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ گھر ہی بھیجتا تھا اور اس آمدنی نے اس کے گھر کی حالت تو بہتر کرنا شروع کر دی لیکن خود اس کے خاندان میں سے بہت سوں نے کمانا چھوڑ دیا۔ خیر دین کو بہت جلد اندازہ ہو گیا تھا کہ ماں باپ کی بھٹیوں پر نہ بیٹھنے کے باوجود بھی اسے اپنی زندگی کو محنت کی بھٹی میں جھونکنا ہی تھا۔

سترہ سال کی عمر میں صاحب روزگار ہوتے ہی اس کی شادی ہو گئی تھی۔ خیر دین کو اسی مالی نے اپنا داماد بنا لیا تھا جس کے ساتھ خیر دین نے کمشنر کے گھر میں نوکری شروع کی تھی۔ اس کا سسرالی گاؤں اس کے شہر سے قریب تھا اور طور طریقوں کے اعتبار سے اس کے اپنے گاؤں سے زیادہ بہتر حالت میں تھا۔ اس کی بیوی اختر بی بی بھی کئی حوالوں سے اس کے لیے بے حد خوش قسمتی اور ترقی کا باعث بنی تھی۔ شہر میں آتے جاتے رہنے کی وجہ سے پڑھا لکھا نہ ہونے کے باوجود اختر کی کو اوڑھنے پہننے کا سلیقہ تھا اور وہ خیر دین آگے بڑھنے کے لیے ایک جیسا passion رکھتے تھے۔ ان کی صرف ایک بیٹی ہوتی تھی حلیمہ اور خیر دین نے اپنے خاندان کے دباؤ کے باوجود مزید اولاد نہ ہونے پر دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اس نے حلیمہ کو دسویں تک تعلیم دی..... خیر دین کی طرح وہ بھی اپنی برادری میں دس پاس کرنے والی پہلی لڑکی تھی اور پھر خیر دین نے اس کی شادی اپنے خاندان سے آنے والے تمام رشتوں کو چھوڑ کر ایک سرکاری دفتر کے اردلی سے کی تھی۔ چھ ماہ میں وہ سرکاری اردلی طاعون کی وبا کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو گیا اور تب خیر دین کے ہی ایک اور اچھے صاحب نے اپنی کوشش سے حلیمہ کی دوسری شادی اپنے ڈرائیور سے کر دالی تھی۔ خیر دین کو اپنی طرح اپنی بیٹی کی قسمت پر بھی رشک آتا تھا۔ وہ ایک ڈپٹی کمشنر کے ذاتی ڈرائیور کی بیوی تھی اور اس کا شوہر شادی کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد اسے بھی اپنے سرکاری کوارٹر میں لے آیا تھا۔

چڑیا کی پیدائش ایک ڈپٹی کمشنر ہاؤس کے کوارٹر میں ہوئی تھی جہاں اس کا باپ ڈرائیور اور اس کی ماں ڈپٹی کمشنر کے بچوں کی آیا تھی۔ شادی کے چار سالوں میں چڑیا کے بعد حلیمہ کے ہاں وقفے وقفے سے دوسرے اولادوں کی ولادت ہوئی اور دونوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکا۔ شادی کے چوتھے سال اس کا شوہر نہر میں نہاتے ہوئے ڈوب گیا..... حلیمہ کا گھر دوسری بار اجڑ گیا تھا۔ دو بیٹوں کی موت نے جو زخم لگائے تھے شوہر کی موت نے انہیں امنٹ کر دیا تھا لیکن بہر حال حلیمہ کا شوہر کوئی بہت آئیڈل شوہر نہیں تھا اس کے رزق کا وسیلہ اور سائبان اس کی وفات کے فوراً بعد اس ڈپٹی کمشنر کی بیرون ملک ڈیپوشن آگئی تھی۔ حلیمہ باپ کے کوارٹر میں نہیں رہ سکتی تھی۔ شاید صاحب اور ان کی بیوی اسے رہنے کی اجازت دے ہی دیتے لیکن اب وہ

## روزہ کس چیز سے کھولنا مستحب ہے

حضرت سلمان بن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”جب کوئی روزہ کھولے تو اسے چاہیے کہ خشک کھجور سے روزہ کھولے اگر (کھجور) نہ ملے تو پانی سے روزہ کھول لے کیونکہ وہ پاک کرنے والا ہے۔“  
(ترمذی)  
مرسلہ: تاہید بنت نور، واہیمنت ورکس

## اعتکاف کی حالت میں

سنن ابو داؤد میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ”معتکف کے لیے سنت ہے کہ وہ کسی مریض کی عیادت کے لیے نہ جائے اور نہ کسی جنازے پر حاضر ہو اور نہ اپنی عورت کے قریب جائے اور کسی حاجت کے لیے اپنی جگہ سے باہر نہ نکلے مگر جس کے لیے نکلنا بے حد ضروری ہو جیسا کہ کھانا پینا یا قضاے حاجات کے لیے جائے۔ اگر معتکف ایسے کاموں کے لیے نکلا اور مسجد سے خارج ہی وضو کر کے واپس آ گیا تو اس کے اعتکاف میں کوئی خلل نہ ہوگا۔“

مرسلہ: ابنہ عند لیب، سلا نوالی

سرکاری رہائش گاہ کسی اور کے زیر استعمال آگئی تھی۔ حلیمہ، چڑیا کو لے کر مجبوراً گاؤں چلی گئی۔ چڑیا اب خیر دین اور حلیمہ کی زندگی کا محور تھی اور خیر دین کے لیے اس سے الگ رہنا بے حد مشکل تھا۔ نیا صاحب اور اس کی بیوی نوکروں سے بہت فاصلہ رکھتے تھے اور خیر دین کسی بھی طرح اپنے سرکاری کوارٹر میں حلیمہ اور چڑیا کو لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

بھی خیر دین اور حلیمہ کی قسمت کے ستارے ایک بار پھر گردش سے باہر آئے۔ خیر دین نے کسی زمانے میں ایک ڈپٹی کمشنر کے ساتھ کام کیا تھا جو بعد میں دوسرے صوبے میں چلا گیا تھا لیکن اسی دوران وہ دوبارہ پوسٹ ہو کر اسی ڈویژن میں آ گیا اور اس نے وہاں پوسٹ ہوتے ہی خیر دین کی اپنی سرکاری رہائش میں ٹرانسفر کروالی تھی نہ صرف یہ بلکہ ان میاں بیوی نے حلیمہ کو بھی ایک بار پھر بچوں کی آیا کے طور پر رکھ لیا تھا۔

وہ تین سال چڑیا کی زندگی کے سب سے اہم سال ثابت ہوئے تھے۔ چڑیا نے اپنی ابتدائی تعلیم ماں اور نانا سے حاصل کی تھی۔ وہ خیر دین کی طرح بے حد ذہین اور کونک لرنر تھی۔ اپنی عمر کے دوسرے بچوں کے مقابلے میں اس کا کونسنٹریشن اسپین بہت زیادہ تھا۔ وہ ایک کام کو شروع سے آخر تک ایک جیسے اٹھاک اور لگن سے کرتی تھی۔

گاؤں میں حلیمہ اسے سختی لکھوایا کرتی تھی اور سختی پر الف سے بے تک لکھے کسی حرف میں فرق نہیں ہوتا تھا۔ کہیں لکھنے والے کی اکٹاہٹ، تھکاوٹ یا عدم دلچسپی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ اس کی ہاتھ کی لکھائی بعد میں خیر دین کی لکھائی کی طرح ہوتی گئی تھی۔ الف ب خیر دین کا چیلنج نہیں تھا۔ خیر دین کا چیلنج abc تھا اور چڑیا کے لیے وہ دونوں تفریح تھے۔ وہ ماں سے جوڑ توڑ سیکھتی اور نانا کے آنے پر ان سے اسپیلنگ..... اس کا ذہن جیسے ایک اسٹیج تھا جو سب کچھ چوس رہا تھا اور اپنے اندر اسٹور کرتا جا رہا تھا۔ ساری زندگی چڑیا کا ذہن اسٹیج کی طرح

سے ہی کام کرتا رہا تھا۔ صرف علم نہیں تھا جو وہ چوس کر اپنے اندر رکھتی تھی..... اپنے خیالات، مشاہدات، تکلیف، خوشی..... اور بہت کچھ وہ اپنے اندر ہی سمیٹے رکھنے کی عادی تھی۔

وہ ساڑھے تین سال کی عمر میں حلیمہ کے ساتھ گاؤں کے اسکول گئی تھی اور وہاں جا کر حلیمہ کو پتا چلا کہ گاؤں کا وہ پرائمری اسکول چڑیا کے ایک ہاتھ کی مار تھا۔ وہاں کوئی بچہ نہ علم میں چڑیا کے سامنے ٹھہر سکتا تھا نہ اپنی میز میں۔ وہ اسکول میں آنے والی واحد بچی تھی جو پورے یونیفارم میں آئی تھی اور وہ بھی صاف ستھرے..... اور وہ تقریباً ایسا ہی صاف ستھرا یونیفارم لے کر جاتی اگر کئی بار اسے اسکول کے صحن میں درخت کے کچے کھلے میدان میں زمین پر نہ بٹھنا پڑتا۔ چھٹی کے وقت تک بھی اس کی چھوٹی سی چٹیا اور سر پر لگی ہنیر ہنریوں ہوتے جیسے اس نے ابھی کنگھی کر کے بال بنائے ہوں، اس کی قمیص کی فرنٹ پاکٹ میں ایک رومال ہوتا تھا جس سے چڑیا وقتاً فوقتاً اپنا پسینہ صاف کرتی رہتی یا قلو ہو جانے پر چھینکنے پر ناک سے بہنے والا پانی..... وہ واحد چیز تھی جو وہ دانستہ گندہ کرتی ہوگی۔ شروع شروع میں اسکول میں اس کا وہ رومال استانیوں کے لیے مذاق اور تفریح کا باعث بنا تھا۔ وہ اسکول جہاں سب کچھ ہاتھوں، آستینوں، دوپٹوں اور قمیص کے دامن سے صاف کرنے کا رواج تھا وہاں ساڑھے تین سال کی ایک بچی جس کی عمر داخلے سے بھی کم تھی بلو پھولوں والے ایک سفید رومال کو اتنے طریقے اور سلیقے سے کھولتی استعمال کرتی اور پھرتہ کر کے رکھتی کہ استانیوں کے لیے یہ جیسے ہنسی کا سامان ہوتا۔ چڑیا کی سنجیدگی اور سلیقے پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ استانیوں کے جملوں پر سرخ ہوتی مسکراتی، شرماتی لیکن رومال کو اسی طرح استعمال کرتی اور رکھتی جیسے خیر دین نے اسے سکھایا تھا۔

اس کے بستے میں موجود نوٹ بکس اور کتابیں اگر کبھی خراب ہوتی ہوں گی تو استانیوں کے ہاتھوں سے ہوتی ہوں گی ورنہ چڑیا خود انہیں ایک خزانے کی طرح سنبھال کر طریقے اور احتیاط سے رکھتی تھی۔ کوئی اس کا بستہ کھول کر دیکھتا تو نوٹ بکس اور کتابوں کی ترتیب دیکھ کر بھی حیران رہ جاتا۔ اس کے بستے میں ہر چیز اس کی پراپر جگہ پر تھی اور ہمیشہ پراپر جگہ پر ہی رہتی تھی۔ چڑیا اگر پچاس دفعہ پینسل نکالتی تو ہر بار اسے واپس رکھتے ہوئے جیومیٹری باکس میں ہی رکھتی۔ اسی ترتیب سے جس ترتیب میں اس کے جیومیٹری باکس میں چیزیں تھیں۔

چھ ماہ چڑیا اس اسکول جاتی رہی اور چھ ماہ اس کی استانیوں کو اسے کچھ پڑھانا نہیں پڑا وہ جیسے ایک ritual تھی جو پوری ہو رہی تھی۔ چھ ماہ بعد حلیمہ اور چڑیا دوبارہ نئے شہر میں خیر دین کے پاس آگئے تھے اور یہاں جیسے چڑیا کا ایک نیا جنم ہوا تھا۔

ڈپٹی کمشنر کی بیوی ڈاکٹر فرح ایک بے حد رحم دل عورت تھی۔ حلیمہ اس کے تین بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھی اور حلیمہ کی وجہ سے چڑیا بھی دین میں کئی بار ماں کے پیچھے گھر میں جاتی۔ ڈاکٹر فرح کو چڑیا اپنی عادتوں اور ذہانت کی وجہ سے بے حد اچھی لگتی تھی۔ ایک گورنمنٹ کے سرکاری اسکول سے ایک انگلش میڈیم اسکول تک چڑیا کو لے جانے والی وہی تھیں اور اس انگلش میڈیم اسکول کے سلیپس کو چڑیا کے لیے آسان بنانے والی بھی وہی تھیں جو اکثر اوقات اپنے بچوں کو پڑھاتے ہوئے چڑیا کو بھی پاس بٹھالیتی تھیں۔

چڑیا اردو میڈیم نصاب سے انگلش میڈیم نصاب میں جتنی آسانی اور سہولت سے ایڈجسٹ ہوئی تھی اس نے ڈاکٹر فرح کو حیرانی سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ چڑیا gifted تھی اور اس کا اظہار سب سے پہلے انہوں نے ہی خیر دین اور حلیمہ سے کیا تھا۔ چڑیا پر انہیں محنت نہیں صرف کچھ توجہ دینی پڑی تھی اور اس توجہ کا ثمر چڑیا نے

ایک کے بعد ایک کلاس میں ٹاپ کر کے دیا تھا۔

مناسب سے نقش و نگار اور بے حد سیاہ گہری چمکتی آنکھوں اور سانولی رنگت والی چڑیا ایک چڑیا ہی کی طرح دہلی پتلی لیکن پھرتلی تھی۔ اس کی سیاہ چمکتی آنکھوں سے جھلکتی ذہانت اور اس کی بے حد ملائم میٹھی سریلی آواز اس کی دو امتیازی خصوصیات تھیں۔ جو اگر نہ ہوتیں تو چڑیا کو بچوں کے ہجوم میں پہچاننا مشکل ہوتا..... لیکن وہ عجیب طریقے سے نوٹس ہوتی تھی۔

ڈاکٹر فرح کے بچوں کو ہفتے میں ایک بار میوزک ٹیچر موسیقی سکھانے آتے تھے اور وہ سارا وقت چڑیا کو سرگم سکھاتے رہتے۔ چڑیا کوئل کی طرح گاتی تھی اور فرح اور اس کا شوہر عابد مسعود اگر گھر پر ہوتا تو چڑیا کے گیت سننے کے لیے خود بھی آکر اپنے بچوں کے پاس بیٹھ جاتا۔

”کیا بونگی تم چڑیا بڑی ہو کر؟“ ڈاکٹر فرح کو اس سے گپ شپ لگانے میں مزہ آتا تھا۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے اکثر اس سے بھی بات چیت کرتی رہتی تھی۔

”میں ڈاکٹر بنوں گی۔“ چڑیا بے حد اعتماد سے اسے بتاتی۔

”پھر کیا کرو گی؟“ وہ اسے مسکراتے ہوئے مزید کریدتی۔

”پھر میں علاج کروں گی۔“ کھٹاک سے جواب آتا۔

”کس کا علاج کرو گی؟“

”جو بیمار ہوگا۔“

”اور اگر کوئی بیمار نہ ہو تو؟“ فرح اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اس سے کہتی۔

”پھر ریسٹ کروں گی۔“ بلا توقف جواب آتا۔

”لیکن ڈاکٹر تو ریسٹ نہیں کرتے۔“

”پھر آپ کیوں کرتی ہیں۔“ ڈی سی کی بیوی بے اختیار ہنستی، وہ لا جواب ہو جاتی اور یہ اکثر ہوتا تھا۔

اس بچی کی زبان بے حد صاف تھی اعتماد بلا کا تھا۔ لب و لہجہ بے حد شستہ اور آواز میٹھی۔

”حلیمہ تمہاری بیٹی بڑی ترقی کرے گی۔ ماشاء اللہ بہت ذہین ہے۔ اسے بہت پڑھانا۔“ وہ ہر بار چڑیا سے ایسے کسی مباحثے کے بعد کہتی۔ حلیمہ کا سیروں خون بڑھتا یہ سن کر باپ بیٹی چڑیا کی تعریفیں اگلے کئی دن

ایک دوسرے کو ڈھرا کر سنا تے اور ہر بار یوں سنتے اور سنا تے جیسے پہلی بار ہو۔

بٹی کو ڈاکٹر بنانے کا خواب حلیمہ نے ڈی سی کی اس بیوی کو دیکھ دیکھ کر ہی کیا تھا چڑیا کی جگہ اس کا بیٹا ہوتا تو وہ اسے ڈپٹی کمشنر بنانے کا خواب دیکھتی جیسے اس کی دادی نے خیر دین کے بارے میں دیکھا تھا مگر چڑیا لڑکی تھی اور وہ لیڈی ڈاکٹر ہی بن جاتی تو بھی بہت بڑی بات ہوتی۔ وہ ان کے گاؤں اور برادری کی پہلی ڈاکٹر ہوتی..... جیسے خیر دین پہلا سرکاری ملازم..... حلیمہ دسویں جماعت پاس کرنے والی پہلی لڑکی..... اور چڑیا.....

☆☆☆

خیر دین نے چڑیا کی بات پر چونک کر کاؤنٹر پر دیکھا جہاں وہ اشارہ کر رہی تھی۔ گلاس ابھی بھی اسی طرح ادھر سے ادھر جا رہا تھا..... خیر دین نے بے اختیار آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔ چڑیا نے الجھے انداز میں خیر دین کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نانا اگر یہ گلاس زندہ نہیں ہے تو پھر یہ گلاس کیوں چل رہا ہے؟“

”بیٹا آیت الکرسی پڑھو۔“ خیر دین نے جواباً اسے کہا۔ چڑیا کچھ حیران ہوئی لیکن پھر اس نے آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ چند منٹوں بعد گلاس کی حرکت رک گئی خیر دین اطمینان سے دوبارہ آٹا گھوندھنے میں مصروف ہو گیا یوں جیسے چند لمحے پہلے وہاں کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔

”اب صاحب نے کہا ہے کہ مونگ کی بھنی ہوئی دال اور.....“ اس نے دوبارہ قصہ شروع کیا۔ چڑیا نے اسے ٹوکا۔

”نانا یہ گلاس کیوں چل رہا تھا؟“ اگر خیر دین کی یہ کوشش تھی کہ چڑیا کا دھیان اس گلاس کی طرف سے ہٹ جائے تو وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ وہ ٹماٹر چھوڑ کر خیر دین کے پاس آگئی تھی۔ یہ جیسے اس بات کا اعلان تھا کہ اسے دال کی فتوحات سے زیادہ اس چلتے ہوئے گلاس میں زیادہ دلچسپی تھی۔ خیر دین نے گہری سانس لی۔ ”یہ جو دنیا ہے نانا اس میں ہمارے علاوہ اور بھی بہت ساری چیزیں رہتی ہیں۔“ خیر دین نے اسے سمجھانا شروع کیا۔

”اور کون سی چیزیں.....؟“ چڑیا نے ٹوکا۔

”کچھ ایسی چیزیں جو نظر نہیں آتیں۔“ خیر دین نے کہا۔

”جیسے ہوا، حرارت۔“ چڑیا نے بے ساختہ جواب دیا۔ ایک لمحے کے لیے خیر دین لا جواب ہوا۔

”اس کے علاوہ بھی کچھ چیزیں ہوتی ہیں جو نظر نہیں آتیں..... جیسے جن بھوت، پریاں اور بو۔ وغیرہ.....“ خیر دین نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ جن بھوت، پریوں پر نہیں انگلی تھی یونوں کے لفظ پر انگلی تھی۔ جن بھوتوں اور پریوں سے تو وہ ماں اور نانا کی سنائی ہوئی کہانیوں کے ذریعے پہلے ہی متعارف تھی لیکن یونوں کا لفظ اس کے لیے نیا تھا۔

”یہ بونے کیا ہوتے ہیں؟“ اس نے کچھ الجھ کر خیر دین سے پوچھا۔

”یہ ہماری طرح بہت چھوٹے چھوٹے لوگ ہوتے ہیں۔“

”کتنے چھوٹے؟“ خیر دین نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتایا۔

”اتنے چھوٹے۔“ چڑیا کی آنکھیں اور ہونٹ اکٹھے پھیلے تھے۔

”سچی میں نانا.....؟“ تجسس، اشتیاق اور ایک عجیب سی خوشی کے ساتھ اس نے خیر دین سے پوچھا۔

”جیسے snow white dwarfs کے دوست تھے۔“ برق رفتاری سے اس کے ذہن نے

اسے ایک illustrated اسٹوری بک کی یاد دلانی۔ خیر دین کو سنو وائٹ کا پتا تھا نہ اس کے دوست سیون ڈارف کا..... لیکن اس نے سر ہلا دیا تھا۔ چڑیا کا دل جیسے بلیوں اچھلا تھا۔

”نانا یہاں ڈارفس ہیں کیا؟“ اس نے بے حد جوش سے خیر دین سے پوچھا۔

”بیٹا آہستہ، اتنی اونچی آواز سے ان کا نام نہیں لو، وہ ناراض ہو جائیں گے۔“ خیر دین نے اسے ٹوکا۔

”نانا آپ مجھے دکھا سکتے ہیں، وہ کہاں ہیں؟“ اس بار چڑیا نے خیر دین کے ساتھ چپک کر سرگوشی کے انداز میں پوچھا تھا۔ اس کے ذہن میں اس فیری ٹیل کی رنگین illustration گھوم رہی تھیں۔ خوب صورت ٹوپیوں اور لباس میں ملبوس کیوٹ، موٹے اور شرارتی ہنس مکھ بونے جو سنو وائٹ کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے اور سنو وائٹ کے سو جانے پر غم سے بے حال ہو گئے تھے۔

”نہیں، میں نہیں دکھا سکتا لیکن جب بھی تمہیں گھر میں کوئی عجیب چیز ہوتی نظر آئے تو تم بس کلمہ پڑھنا، الحمد شریف پڑھنا، قل ہواللہ پڑھنا، آیت الکرسی پڑھنا..... اور ڈرنا نہیں.....“ خیر دین اسے سمجھا رہا تھا۔

وہ کئی سالوں سے اس گھر کے بارے میں بہت کچھ سنتا آرہا تھا اور وہاں کام کرنے کے دوران اس نے بہت سارے عجیب و غریب واقعات ہوتے دیکھے تھے۔ وہ شروع میں خوفزدہ ہوا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کا خوف ختم ہوتا گیا۔ وہ سب کچھ جیسے معمول کی بات تھی اس کے لیے بلکہ گھر میں کام کرنے والے دوسرے نوکروں کے لیے بھی..... گھر میں موجود ان یونوں نے آج تک کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

”لیکن میں یہ سب کیوں پڑھوں؟“ چڑیا الجھی۔

”نانا کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں وہ..... ابھی تم نے دیکھا گلاس چلنا بند ہو گیا۔“ خیر دین نے اسے رسائی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ چڑیا نے کچھ مایوسی سے اس ساکت گلاس کو دیکھا وہ خیر دین کو بتا نہیں سکی کہ گلاس کی حرکت بند ہو جانے پر وہ مایوس ہوئی تھی مطمئن نہیں، وہ اب ہر قیمت پر ان یونوں کو دیکھنا چاہتی تھی۔

سنووائٹ کے ساتھیوں جیسے نٹ کھٹ تیز و طرار اور کیوٹ ڈارف۔

اپنی زندگی کے چھٹے سال میں یہ اس گھر میں ہونے والا پہلا غیر معمولی واقعہ تھا جو چڑیا نے دیکھا۔ اگر اس سے پہلے اس نے کچھ دیکھا تھا تو اس کا ذہن اسے مافوق الفطرت سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ وہ اب خیر دین کی وجہ سے اس گھر کے اندر باقاعدگی سے آرہی تھی اور ڈی سی کی بیوی کی نرم مزاجی اور رحم دلی کی وجہ سے گھر کے ان حصوں میں بھی آ جا رہی تھی جہاں عام طور پر نوکریاں نوکروں کے اہل خانہ میں سے کبھی کوئی نہیں جاتا تھا۔ اس سرکاری رہائش گاہ میں ویسے بھی حلیمہ اور چڑیا کسی نوکر کے واحد اہل خانہ تھے جنہیں رہائش کی اجازت دی گئی تھی ورنہ ان کے علاوہ وہاں موجود تمام نوکریاں بیوی کو ساتھ نہیں رکھ سکتے تھے۔

وہ چلنے والا گلاس اور وہ بونے چڑیا کے ذہن پر سوار ہو گئے تھے۔ اگلے دن اسکول جا کر اس نے ریڈنگ روم میں پڑی اسٹوری بکس میں سے سنووائٹ کی اسٹوری بک دوبارہ نکال لی تھی۔ کتاب کے صفحات پر ڈارف کی illustration سے مکمل طور پر مسحور کیے رہیں۔ پورا دن وہ ڈارف اس کے سر پر ناچتے رہے وہ جیسے سنووائٹ بنی ہوئی تھی۔

وہ چڑیا کی زندگی کا جیسے ایک نیا باب تھا۔ وہ گھر پہلے اس کے لیے گھومنے پھرنے کی جگہ تھا اب ایک دریافت گاہ تھا۔ وہ ان ڈارف سے دوستی کرنا چاہتی تھی ویسی دوستی جیسی سنووائٹ نے کی تھی اور وہ اس فرینڈ شپ کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔ بالکل سنووائٹ کی طرح جو ان بونوں کے لیے کھانا بناتی، ان کے کپڑے دھوتی، ان کا گھر صاف کرتی۔

خیر دین نے اسے یہ نہیں کہا تھا کہ گھر میں سات بونے ہیں کیونکہ گھر میں کتنے بونے تھے یہ مکمل یقین کے ساتھ کوئی بھی نہیں جانتا تھا لیکن چڑیا نے خود ہی اپنے ذہن میں ان بونوں کی تعداد متعین کر لی تھی..... وہ بھی سات تھے..... اور اس نے ان کے نام بھی رکھ لیے تھے..... انہیں دیکھے بغیر صرف اسٹوری بک کی illustrations کو دیکھ کر اس کے ذہن میں سات بونوں کی شکلیں اور حلیمہ بیٹھ گئے تھے۔

سب سے بڑا بونا بہت موٹا تھا اور اس کی اس کے پیروں جتنی دائرہ سی تھی اس کا نام ٹوکو تھا، دوسرا بونا بہت ہی پتلا اور بے حد چالاک لگتا تھا اس کی آنکھیں بٹن کی طرح گھومتی رہتی تھیں اس کا نام کٹو تھا، تیسرا بونا جو کر جیسی گول اور موٹی ٹانگ والا تھا جو ہر وقت چھینکتا رہتا تھا اس کا نام ٹٹو تھا، چوتھا بونا گنجا تھا اور اس کا موٹا سا پیٹ تھا وہ دونوں پاؤں پورے کھول کر بہ مشکل چلتا تھا۔ اس کا نام ٹوفو تھا، پانچواں بونا عینک لگائے رہتا تھا اور پھر بھی چیزوں سے ٹکراتا پھرتا تھا اس کا نام منفا تھا، چھٹا بونا لمبے لمبے بالوں والا تھا اور چلتے ہوئے بے مقصد ہانپتا تھا، اس کا نام کنفا تھا اور ساتواں بونا سب سے چھوٹا اور سب سے شرارتی تھا اس کا نام ڈیڈو تھا اور ڈیڈو چڑیا کا فیورٹ بونا بھی تھا۔

چڑیا کی زندگی میں یک دم جیسے بہت سارے رنگ بھر دیے تھے ان سات تصوراتی بونوں نے..... جو اس گھر میں کہیں رہتے تھے لیکن کہاں رہتے تھے یہ کوئی یقینی طور پر نہیں جانتا تھا اور نہ ہی کسی کو یہ اشتیاق تھا کہ ان کا جدو دو اربعہ دریافت کرے ماسوائے چڑیا کہ جو اس گھر کے ہر کونے کھد رے میں اب ٹوکو، کٹو، کنفا، منفا، ڈیڈو، ٹوفو اور ڈیڈو کو ڈھونڈتی رہتی تھی۔

اسکول سے واپسی کے بعد وہ ہمیشہ اس وقت خیر دین اور حلیمہ کے پاس ضرور جا کر کچھ وقت گزارتی تھی جب وہ گھر میں کچن کا کام کرتے یا ڈاکٹر فرح کے بچوں کو سنبھال رہے ہوتے تھے لیکن اب وہ بے مقصد ایک چکر گھر میں ان بونوں کی تلاش میں ضرور لگاتی تھی۔ یہ اس کا وہ راز تھا جس کے بارے میں خیر دین اور حلیمہ نہیں جانتے تھے۔

چڑیا نے دوبارہ ان بونوں سے متعلقہ کوئی چیز چند مہینوں بعد ایک دن بیچ کے لیے ڈاکٹنگ ٹیبل اریج کرتے دیکھی تھی۔ ٹیبل کے سینٹر میں ایک vase میں کچھ پھول شاخوں سمیت رکھے ہوئے تھے۔ چڑیا ہمیشہ خیر دین کی ٹیبل سیٹ کرنے میں مدد کرتی تھی اور اس وقت بھی وہ ٹیبل پر میٹس رکھنے میں مصروف تھی جب اس نے ان پھولوں میں سے ایک کی پتیاں نیچے گرتے ہوئے دیکھی تھیں، وہ ٹھٹک گئی، پتیاں یوں نیچے گر رہی تھیں جیسے کوئی انہیں نوچ نوچ کر پھینک رہا تھا۔ چڑیا کے دل کے دھڑکن تیز ہو گئی۔۔۔۔ اس نے ایک نظر خیر دین کو دیکھا، وہ اپنے کام میں مصروف تھا اس کا دھیان پھولوں کی طرف نہیں تھا۔ چڑیا نے اس دن خیر دین کی توجہ ان گرتی پتیوں کی طرف نہیں کرائی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ سب کچھ پہلے کی طرح رک جائے اس کے آیت الکرسی پڑھنے پر۔۔۔۔ وہ کن اکھیوں سے گرتی پتیوں کو دیکھتے ہوئے ٹیبل پر کانٹے چھریاں لگاتی رہی۔

ایک کے بعد ایک پھول کی پتیاں گرتی گئی تھیں چند منٹوں میں ٹیبل کے درمیان۔۔۔ ایک vase میں صرف پتوں والی کچھ ڈنڈیاں پڑی تھیں، ان کی تمام پتیاں vase کے ارد گرد ایک سرکل کی شکل میں بکھری ہوئی تھیں۔ خیر دین نے اپنے دوسرے چکر میں وہ پتیاں اور پھولوں کی خالی ڈنڈیاں ٹوٹس کر لی تھیں۔ وہ ٹھٹکا تھا۔

”یہ تم نے کیا ہے چڑیا؟“ اسے یقین نہیں تھا کہ چڑیا ایسا کام کر سکتی ہے لیکن اس نے پھر بھی پوچھا۔ چڑیا خیر دین کے سوال پر چونکی پھر اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”نہیں مانا۔۔۔۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا، یہ خود بخود گر گئیں۔“ خیر دین اس کی بات پر ایک دم پھر کچھ گھبرائے انداز میں اسی طرح لا حول اور آیت الکرسی پڑھنے لگا چڑیا نے بے اختیار گہری سانس لی۔ مانا اب پھر ان بونوں کو بھگا رہا تھا۔ وہ آج بھی ان کو نہیں دیکھ سکتی تھی وہ بری طرح مایوس ہوئی تھی۔

اور پھر اکثر ایسی بہت ساری چیزیں وہ دیکھنے لگی تھی جس پر دوسرے آیت الکرسی پڑھتے اور چڑیا دعا کرتی۔۔۔۔ کہ وہ کسی نہ کسی طرح کوئی بونا دیکھ لے۔

گھر کا ایک صرف اوپر والا حصہ تھا جہاں چڑیا کبھی نہیں گئی تھی اور جہاں جانے کا اسے بے حد اشتیاق تھا۔ ایک آدھ بار وہ اوپر گھوم پھر کر آئی تھی مگر اوپر کے سارے کمرے بند تھے اور چھت بھی۔۔۔ اور اوپر والے حصے میں ایک عجیب سی خاموشی اور ویرانی کا راج تھا۔ اسے وہاں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس کے لیے وہ دوبارہ اوپر والی منزل پر جاتی۔

اس ڈپٹی کمشنر ہاؤس میں یہ چڑیا کی زندگی تھی۔ اسکول جانا۔۔۔ اور اسکول کے بعد ڈاکٹر فرح کے پاس پڑھنا۔۔۔ اس کے بچوں کو کھلانا۔۔۔ خیر دین کے ساتھ کچن میں چھوٹے موٹے کام کرنا۔۔۔ کچن گارڈن میں لگی سبزیوں کی دیکھ بھال کرنا۔۔۔ اور گھر میں بونوں کی تلاش کرنا۔۔۔ ٹوکو، کٹو، منفا، کنفا، شنفو، ڈیڈو، ٹوفو سے خود ہی باتیں کرتے رہنا وہ اس کے ساتھ اس کے کچن گارڈن کی سبزیاں اتار تے تھے، پچھلے لان میں لگے آم کے درخت پر جھوٹا جھولتے اور اسے جھلاتے تھے۔ اس کے ساتھ جاسن اور لوکاٹ اور انکوڑ توڑ کر کھاتے تھے اور



اسے پتا نہیں کن کن دنیاؤں کے قصے سناتے تھے..... یا پھر آپس میں جھگڑا کرتے رہتے تھے..... اس کے ساتھ شرارتیں کرتے تھے، اس کی پوٹی کھینچ لیتے..... جوتا لے کر بھاگ جاتے..... اس کی کتابیں چھپا دیتے..... اس کے کھلونوں سے کھیلتے..... اس کی قمیص کھینچتے..... اس کی جرابیں پہن لیتے، وہ ہنستی بھی غصہ کرتی کبھی ڈانٹتی کبھی ان کی پٹائی کر دیتی۔

چڑیا کو گھر میں بونے نظر نہیں آتے تھے لیکن اس نے اپنے تصوراتی سات بونوں کو اس گھر میں جگہ دے دی تھی، وہ ان بونوں کی سنووائس تھی اور وہ اس کے loyal friends جو اس پر جان دیتے تھے..... اور یہ وہ راز تھا جو صرف چڑیا کو پتا تھا۔ خیر دین اور حلیمہ کو بھی نہیں۔

خیر دین اور حلیمہ اسے کئی بار اکیلے میں کھیلتے، پڑھتے، کام کرتے اپنے آپ سے باتیں کرتے دیکھتے تھے..... یہ ایک نئی عادت تھی جو چڑیا میں آئی تھی لیکن انہوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا۔ بچے اس عمر میں یہی سب کرتے تھے..... کتنا، منھا، شنٹو، ٹوٹو، ڈیڈو، کوٹو، کوٹو کے نام بھی انہوں نے کئی بار سنے تھے۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ یہ چڑیا مختلف چیزوں کے لیے یہ نام استعمال کرتی ہے۔ کسی بونے تک ان کا ذہن بھی نہیں گیا تھا لیکن چڑیا اب بہت خوش رہنے لگی تھی ان دونوں نے صرف یہ ٹوٹس کیا تھا۔

انہی دنوں ڈاکٹر فرح کے شوہر کی پوسٹنگ آگئی تھی۔ یہ خیر دین اور حلیمہ کے لیے پریشانی کی چیز تھی۔ اس بار وہ کوشش کے باوجود خیر دین اور حلیمہ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ البتہ انہوں نے اپنے والے ڈپٹی کمشنر سے بات کر کے خیر دین اور حلیمہ اور چڑیا کو سرکاری کوارٹر میں ساتھ رکھنے کی اجازت لے لی تھی نہ صرف یہ بلکہ ڈاکٹر فرح نے اس نئے ڈپٹی کمشنر کی بیوی سے حلیمہ کو اپنی بچی کی آیا کے طور پر رکھنے کے لیے بھی بات کی، وہ حلیمہ کے لیے ایک مستقل آمدنی کا سلسلہ برقرار رکھ کر جانا چاہتی تھی تاکہ حلیمہ کو چڑیا کے تعلیمی اخراجات کے لیے دقت نہ ہو۔ نیا ڈپٹی کمشنر اس کے شوہر کا بیٹا تھا اور اس حوالے سے ڈاکٹر فرح اس کی بیوی کو بھی اچھی طرح جانتی تھی۔

”آپ لوگ فکر نہ کریں..... وہ دنوں میاں بیوی بہت اچھے ہیں، بہت اچھے خاندان کے ہیں دونوں اور نوکروں اور عملے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔“ ڈاکٹر فرح نے جانے سے پہلے خیر دین اور حلیمہ کو تسلی دی تھی۔

”میں نے ان سے چڑیا کی تعلیم کے حوالے سے بھی بات کی ہے..... آیا کے طور پر حلیمہ کو تو شاید وہ نہ رکھیں کیونکہ ان کی ابھی ایک ہی بیٹی ہے اور وہ بھی چھوٹی ہے لیکن ڈی سی کی بیوی نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ چڑیا کی تعلیم کا خیال رکھیں گے۔ تعلیم کے اخراجات اٹھانے پڑے تو وہ بھی اٹھائیں گے لیکن چڑیا کی اسکول فیس تو میں ہی بھجواتی رہوں گی۔ اس لیے اس کے بارے میں تو آپ پریشان نہ ہوں۔“

چڑیا نے اس گھر میں بونے تو نہیں دیکھے تھے لیکن خیر دین اور حلیمہ کو ڈاکٹر فرح کی شکل میں ایک پری ضرور ملی تھی۔ جس کے چلے جانے پر خیر دین اور حلیمہ ہی نہیں چڑیا بھی بے حد رنجیدہ تھی۔

ڈپٹی کمشنر ہاؤس میں نیا ڈپٹی کمشنر اپنی بیوی اور تین سالہ بیٹی کے ساتھ آنے والا تھا..... اور چڑیا اپنی ندگی کا پہلا حقیقی، بد صورت اور خوفناک بونا دیکھنے والی تھی۔



سب سنی سنائی باتیں اور قہقہے تھے اور ان میں کوئی صداقت ہوتی تو وہ ڈی سی ہاؤس اس وقت HAUNTED قرار دیا جا چکا ہوتا اور اس شہر میں ڈی سی کی سرکاری رہائش گاہ کہیں اور منتقل ہو چکی ہوتی۔ ایک ہفتہ وہاں قیام کے دوران شہر بانو کا اطمینان اور اعتماد آہستہ آہستہ بحال ہونے لگا تھا اور مزید ایک آدھ ہفتے میں یہ مکمل طور پر بحال ہو جاتا اگر آج وہ اختر درانی کے ڈرنیبل پر اس گھر کے بارے میں وہ سب کچھ نہ سنتی جو اس نے سنا تھا۔

ڈرنی بڑے خوشگوار ماحول میں شروع ہوا تھا۔ اختر درانی، شیردل سے پانچ کا من سینئر تھا۔ شیردل اور شہر بانو، اختر درانی اور اس کی بیوی تزئین سے بہت کم عمر تھے لیکن اس کے باوجود ان کے دوستانہ رویے کی وجہ سے شیردل اور شہر بانو کو ان سے مل کر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ شیردل، اختر سے پہلے بھی چند بار مل چکا تھا لیکن اس کی بیوی سے ان کے گھر پر یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ ڈرنی کے آغاز سے پہلے ڈرنکس سروہونے کے دوران تزئین اور اس کے درمیان گپ شپ ہونے لگی، دونوں ایک دوسرے کی فیملیز کا تعارف حاصل کر رہی تھیں۔ شیردل اور اختر درانی کمرے کے دوسرے کونے میں صوفوں پر بیٹھے کسی انتظامی معاملے کو ڈسکس کر رہے تھے۔

”ماشاء اللہ بڑا گڈ لکنگ پل ہے آپ دونوں کا۔“ تزئین نے اپنا پہلا سانس جملہ اس تک پہنچایا۔ شہر بانو مسکرا دی۔ یہ کمپیوٹ ان کو اب اتنی بار مل چکا تھا کہ اس کے لیے یہ ایک روٹین کی بات ہو گئی تھی۔

”میاں اتنا ہنڈسم اور اتنی اچھی پوسٹ پر ہو تو بیوی کی تو راتوں کی نیند بھی اڑ جاتی ہے۔“ تزئین نے مشروب کا گلاس بانس ہاتھ سے دائیں ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ شہر بانو نے دور اختر درانی کے ساتھ باتوں میں مصروف شیردل کی جانب دیکھا اور مسکراتے ہوئے تزئین سے کہا۔

”نہیں، مجھے بڑی گہری نیند آتی ہے۔“

”یہ سمجھداری کا کام نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ رسیاں وغیرہ ڈال کر رکھنا چاہیے شوہروں کو۔۔۔۔۔۔ خاص طور پر اتنے خوش شکل شوہروں کو۔“ شہر بانو اس بار اس کی بات پر ہنس دی پھر اس نے کہا۔

”یہ رسیوں سے قابو آنے والا مرد نہیں ہے، اعتماد کے دھاگے سے جکڑا ہوا ہے اسے۔“ شہر بانو نے سہ لیتے ہوئے جیسے فخر یہ انداز میں اس سے کہا۔

”لو میرج ہے کیا۔۔۔۔۔۔؟“ تزئین نے یک دم جیسے کچھ اور دلچسپی لیتے ہوئے تجسس سے کہا۔

”لو میرج۔۔۔۔۔۔؟“ شہر بانو نے ایک لمحے کے لیے سہ لیتے ہوئے رک کر سوچا پھر وہ شیردل کو تیسری بار دیکھتے ہوئے مسکرائی اور اس نے سرائبات میں بلایا۔

”ہاں، اس طرح کی باتیں تبھی کرتا ہے بندہ۔“ تزئین اس بار ہنسی تھی۔

”کیسے اور کہاں ملے تھے تم دونوں پہلی بار۔۔۔۔۔۔؟“ اس نے اگلا سوال کیا۔

☆☆☆

شہر بانو نے شیردل کو پہلی بار ہارورڈ یونیورسٹی کے Winthrop House کی ویب سائٹ پر دیکھا تھا۔ یونیورسٹی میں Freshman کے طور پر ابھی اسے چند دن ہوئے تھے، وہ Winthrop House میں تھی اور ویب سائٹ پر اسپورٹس کی ایکٹیویٹیز کو چیک کرتے ہوئے اس نے شیردل کی ایک تصویر دیکھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ اس تصویر پر رک گئی تھی۔ تصویر میں نظر آنے والے مرد کی ٹیشلی کا اندازہ لگانا

لیے جیسے حیران ہوئی۔۔۔۔۔۔ پھر اس نے اس آدمی کے پیچھے خیر دین اور دوسرے لوگوں کا عکس دیکھا اور وہ جیسے کرنٹ کھا کر حال میں واپس آئی تھی، وہ نیا ڈپٹی کمشنر تھا۔

”سریہ میری تو اسی ہے۔“ چڑیا نے پلٹ کر دیکھا۔ نیا ڈپٹی کمشنر اور باقی تمام لوگ اب اس کے سامنے تھے اور خیر دین بڑے عاجزانہ انداز میں ڈپٹی کمشنر سے اس کا تعارف کروا رہا تھا جو پہلے ہی اسے دیکھ رہا تھا۔ چڑیا نے خیر دین کے تعارف پر سلام کرتے ہوئے پُر اعتماد انداز میں اپنا ہاتھ اس ڈپٹی کمشنر کی طرف بڑھایا تھا جس نے کچھ دلچسپی سے اسے دیکھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے ہاتھ ملا یا پھر خیر دین سے کہا۔

”ہاں، عابد نے بتایا تھا مجھے۔“ وہ کہتے ہوئے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چڑیا نے ایک لمحے کے لیے ان تمام لوگوں کو اندر جاتے ہوئے دیکھا پھر وہ دوبارہ پلٹ کر اس آئینے کو دیکھنے لگی جس میں اس نے آج ایک بونا دیکھا تھا لیکن وہ اسے پہچان نہیں پائی تھی۔

☆☆☆

”میں یہاں نہیں رہوں گی۔“ اعلان دونوک تھا۔ شیردل نے ایک لمحے کے لیے پلٹ کر ہاتھ کے اشارے سے شہر بانو کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنے کندھے سے لگی مثال کو بیڈ پر لٹا رہا تھا جو راستے میں گاڑی میں ہی سو گئی تھی۔ وہ دونوں ابھی DPO ہاؤس میں ڈرنی سے واپس آئے تھے جو ان کے اعزاز میں تھا اور ڈرنی سے واپسی پر شہر بانو کا موڈ بُری طرح آف تھا۔ وہ اس کے پیچھے اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئی تھی اور اس نے اپنے کانوں سے ایئر رنکز اتارتے ہوئے شیردل کو بتا دیا۔ شیردل نے مثال کو توجہ سے بیڈ پر لٹاتے ہوئے بڑی بے پروائی سے شہر بانو کا اعلان سنا تھا۔ اسے DPO ہاؤس میں ڈرنیبل پر ہی آنے والے طوفان کا اندازہ ہو گیا تھا۔ شہر بانو اس کے اشارے پر خاموش ہو گئی تھی۔ کرسی پر بیٹھ کر سینڈلز کے اسٹریپس کھولتے ہوئے وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ شیردل کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ شیردل نے مثال کو بستر پر لٹانے کے بعد اس کو گمبل سے ڈھانپا پھر اس نے اپنا کوٹ اتار کر بیڈ پر پھینکا۔ بیڈ سائڈ ٹیبل سے سگریٹ کا پیکیٹ اور لائٹر اٹھاتے ہوئے وہ بڑی نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساتھ والے بیڈ روم میں لے آیا۔

”کہا ہو گیا شہی۔۔۔۔۔۔؟“ دونوں بیڈ رومز کا درمیانی دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے شہر بانو کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ وہ دونوں اب مثال کے بیڈ روم میں تھے، وہ الگ بیڈ روم ہونے کے باوجود اس گھر کے بونوں کے قصے سننے کے بعد شہر بانو نے اسے کبھی رات کو اس کے بیڈ روم میں اکیلا سلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ تین ہفتوں کی تزئین و آرائش کے بعد ایک ہفتہ پہلے ہی اس گھر میں شفٹ ہوئے تھے۔ اور اب مختلف انتظامی افسران کی طرف سے استقبال لیے اینڈ کرتے پھر رہے تھے۔ اپنے تمام تر خدشات اور تحفظات کے باوجود شہر بانو، شیردل کے اصرار اور سمجھانے بچھانے کے بعد اس گھر میں رہائش اختیار کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ وہ شیردل کی سرکاری رہائش گاہ تھی وہاں رہائش نہ رکھنے کے لیے شیردل کے پاس کوئی بہت بڑی وجہ ہونی چاہیے تھی خاص طور پر اس صورت میں جب اس سے پہلے آنے والے تمام افسران اس عمارت کو استعمال کرتے آ رہے تھے اور یہ بات شہر بانو کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ ایک ہفتے کے قیام میں وہاں ایسی کوئی چیز رونما نہیں ہوئی تھی جس سے شہر بانو کے خدشات کی تصدیق ہوتی۔ اسے یقین ہونے لگا تھا کہ شیردل ٹھیک کہتا ہے۔ وہ

مشکل تھا..... وہ اپنے رنگ اور نقوش کے لحاظ سے عرب، ایرانی، افغانی، پاکستانی کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ بیس لائن پر پوری قوت سے کسی شاٹ کو ریٹرن کرتے ہوئے اس مرد کی شرٹ پسینے سے تر ہونے کے باوجود ناف سے اوپر تک اٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں پاؤں کورٹ سے چند انچ اوپر ہوا میں تھے، ہارورڈ یونیورسٹی کے Go Crimson کی تحریر والا ایک یونیورسٹی کلر کا Wrist Band اس کے دائیں بازو کے ابھرے ہوئے مسلز کو جیسے کلائی پر قید کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہونٹوں کو پوری قوت سے بھیجنے..... بیس لائن کے اندر پڑ کر باہر جانے والی گیند کو پوری طاقت اور مہارت سے سنگل Handed شاٹ کے ساتھ کھلاڑی ریٹرن کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ کوشش اور جنون کسی پروفیشنل فوٹو گرافر کے لینز نے اسی مہارت کے ساتھ محفوظ کر لی تھی۔ وہ ایک بے حد Unusual شاٹ تھا اور شاید کھلاڑی کی غیر معمولی Looks اس تصویر کے وہاں موجود ہونے کی وجہ بھی بنی تھی۔ یہ شہر بانو کا تجربہ تھا۔

وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ Ivy league میں ہونے والے Straus cup کے فائنل کا ونگ شاٹ تھا اور وہ کھلاڑی Crimson Tennis Team کا کیپٹن تھا۔

شہر بانو کوئی منٹ تک اس ایک تصویر کو دیکھتی رہی..... پھر وہ اپنے ہاؤس کی اسپورٹس Facilities میں ٹینس کو دیکھنے لگی تھی۔ جن چند اسپورٹس میں اسے بچپن سے دلچسپی رہی تھی، ان میں سے ایک ٹینس بھی تھا اور وہ ہائی اسکول میں جن دو گیمز کو باقاعدگی کے ساتھ کھیلتی رہی تھی، اس میں سے وہ ایک تھا۔ اس وقت بھی وہ یونیورسٹی میں ٹینس کھیلنے کے طریقہ کار کو جاننا چاہتی تھی۔ ٹینس کے Link پر ٹینس ٹیم کے کیپٹن اور کوچ کا نام دیکھتے ہوئے اس نے کیپٹن کے نام کی جگہ شیردل کا نام دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ متحکمی تھی۔ ہارورڈ ٹینس ٹیم کے کیپٹن کے طور پر کسی مسلمان کا نام دیکھنا اور جو ساؤتھ ایشین بھی لگتا ہو، غیر معمولی تھا۔ اس وقت پہلی بار اسے خیال آیا کہ شاید وہ پاکستانی بھی ہو..... کم از کم نام کے اس ایک حصے سے یہ ممکن تھا جو اس کے سامنے تھا۔ کوچ اور شیردل کا ای میل ایڈریس نوٹ کرنے کے بعد وہ اب اس شش و پنج میں تھی کہ ٹینس کیمپس کو اینڈ کرنے اور یونیورسٹی ٹینس ٹیم کو جوائن کرنے کا طریقہ کار جاننے کے لیے وہ کسے ای میل کرے۔ اس نے بالآخر کوچ سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا، ایڈریس یوزر کا آئیڈر سپانس فوراً آیا تھا، وہ چھٹی پر تھا اس نے اسٹنٹ کوچ اور شیردل کا ای میل ایڈریس مزید معلومات کا بھیجے تھے۔ اس بار شہر بانو نے شیردل کو ہی ای میل کی تھی۔ وہ ابھی اپنی دوسری ای میلز چیک ہی کر رہی تھی جب شیردل کی ای میل آ گئی۔ ایک فارل ای میل میں رسمی علیک سلیک کے ساتھ اس نے شہر بانو کو ایک ایچمنٹ بھیجی تھی جس میں وہ تمام معلومات تھیں جو شہر بانو کو درکار تھیں۔ ای میل میں اس نے مزید کسی رہنمائی یا معلومات کے لیے اپنا فون نمبر بھی دیا تھا۔

شہر بانو نے اس کی ای میل کے نیچے Signatures میں اس کا ڈیپارٹمنٹ اور سال دیکھا۔ وہ فنانس اور مینجمنٹ میں اپنی پچھڑ گری کے آخری سال میں تھا اور یقیناً پاس آؤٹ ہونے والا تھا۔ ایک سرسری نظر اس کے نام پر ڈالتے ہوئے وہ یہ تو جان گئی تھی کہ وہ واقعی پاکستانی تھا۔ ای میل کا جواب بھی چند منٹوں کے اندر ہی آیا تھا۔ وہ شیردل سے اس کا پہلا عاںانہ تعارف تھا۔

☆☆☆

شیردل سے اس کا دوسرا تعارف چند دنوں کے بعد Intramural ٹینس میچز کے دوران ہوا تھا۔ وہ

Adams House کے خلاف اپنے ہاؤس کے دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنی ٹیم کو سپورٹ کرنے گئی تھی اور کورٹ میں اترنے والے پہلے کھلاڑی کو وہ پہلی ہی نظر میں پہچان گئی تھی۔ وہ ویب سائٹ پر اس تصویر والا کھلاڑی تھا..... اور وہ شیردل تھا..... اور وہ حقیقی زندگی میں صنف تازک کے لیے اس سے کئی گنا زیادہ پُرشش تھا جتنا وہ اس ویب سائٹ کے فوٹو شاٹ میں لگ رہا تھا۔ وہ شہر بانو کا ساتواں Crush تھا اس سے پہلے تین فلم ایکٹرز، دو ٹینس اسٹارز، ایک رنگی پلیئر اس فہرست میں تھے..... شیردل کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ ان سات میں سے پہلا تھا جسے وہ اصلی زندگی میں دیکھ بھی رہی تھی اور کوشش کر کے مل بھی سکتی تھی۔

شیردل وہ میچ اسٹریٹ Sets میں جیتا تھا اور میچ کے دوران ہی شہر بانو کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کم از کم یونیورسٹی کی ٹینس کھیلنے اور دیکھنے والی خواتین میں انتہائی پاپولر تھا۔ Winthrop House کی ٹینس ٹیم کی سپورٹ کے لیے GTTC پہنچنے والوں کی آدمی سے زیادہ تعداد شیردل کا حلقہ احباب تھا..... حلقہ احباب شاید کچھ زیادہ موزوں لفظ نہیں تھا اس گید رنگ کے تعارف کے لیے جو شیردل کی وجہ سے وہاں اکٹھا تھا کیونکہ ان میں سے بہت سے شہر بانو ہی کی طرح صرف اس کی Looks کی وجہ سے اس کے مداحوں میں شامل ہو گئے تھے۔ مداح بھی شاید ایک موزوں لفظ نہیں تھا ان سب کے لیے..... کیونکہ ان میں سے کوئی بھی شیردل کے کھیل کے لیے وہاں نہیں آتا تھا، وہ سب شیردل کے کھیلنے کی وجہ سے وہاں آئے یا آئی تھیں۔

شہر بانو نے Intramural میچز میں سے شیردل کا کوئی ایک میچ Miss نہیں کیا تھا۔ Winthrop House ایونٹ جیت گیا تھا اور ایونٹ کا اختتام شہر بانو کے لیے جیسے مایوسی لایا تھا۔ شیردل کو دیکھنے کا اب اور کوئی موقع اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ شیردل کے ہر میچ کے بعد شیردل کو ایک تہنیتی ای میل بھیجتی تھی۔ جواب چند گھنٹوں میں نہیں تو دوسرے دن ضرور آ جاتا تھا اور شہر بانو چند لائنز کی اس شکریہ کی ای میل کو گھنٹوں پڑھتی رہتی تھی۔ شیردل جیسے اس کے اعصاب پر سوار ہونے لگا تھا۔ اس کے لیپ ٹاپ میں میچز کے دوران شیردل کی لی ہوئی سیکڑوں تصویروں اور ویڈیو کلپس تھے۔ ان تصویروں کو دیکھنا اس کا پسندیدہ ٹائم پاس تھا۔ ٹورنامنٹ کے اختتام پر اس نے کچھ ڈرتے جھجکتے شیردل کو فون کیا۔ بے حد نروس انداز میں اپنا تعارف کروایا۔ "I know you Shahar Bano" اس نے جواباً اسے کہا تھا اور چند لمحوں کے لیے شہر بانو ہکا بکار رہ گئی تھی۔

”آپ کیسے جانتے ہیں مجھے؟“ اس نے اسی حیرت کے عالم میں اس سے پوچھا۔

”آپ بہت باقاعدگی کے ساتھ میرے میچز دیکھنے آتی رہی ہیں۔“ شہر بانو اب جیسے بالکل فریز ہو گئی تھی۔ شیردل کو یہ کیسے پتا چلا کہ میں اس کی ہر گیم دیکھنے جاتی رہی ہوں۔

”آ..... آ..... یہ کیسے پتا چلا آپ کو؟“ اس نے کچھ انک کر ہلکی خوش فہمی کے ساتھ کہا۔

”آپ ہر میچ کے بعد ایک ای میل بھیجتی تھیں..... Full of Compliments بعض دفعہ برے میچز کھیل کر آنے کے بعد بھی صرف آپ کی ای میل میں میری گیم کی تعریف ہوتی تھی..... حالانکہ کوچ سے گالیاں پڑی ہوتی تھیں۔“ دوسری طرف سے بے حد اطمینان کے ساتھ کہا گیا۔ شہر بانو پر گھڑوں پانی پڑا..... اس تبصرے کے بعد کسی پر بھی پڑ جاتا۔ شیردل سے مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی اس کی..... چند

اگر اتنی لڑکیاں شیردل کو ای میل کا جواب نہ دے رہی ہوتیں تو شہر بانو یقیناً اسے اس الوداعی پیغام کا جواب ضرور دے دیتی لیکن ان ای میلز کو پڑھ پڑھ کر شہر بانو کا دل شیردل سے اٹھتا گیا تھا..... یا کم از کم اب اسے ہیر دے ولن بنانا ضروری تھا تا کہ وہ اپنی اسٹڈیز، یونیورسٹی اور زندگی پر توجہ کر سکے۔

شیردل آہستہ آہستہ اس کے ذہن سے محو ہوتا گیا۔ ویب سائٹ پر دوسری تصویریں آگئی تھیں اور اس کی زندگی میں بھی بہت کچھ بدلتا جا رہا تھا۔ تھرڈ ایئر میں اسے اپنی مہی کی بیماری کی وجہ سے U-Pen میں مانیٹریشن کروانی پڑی تھی۔ اپنی گریجویٹیشن مکمل کرنے کے بعد اسے خوش قسمتی سے ایک بار پھر ہارورڈ میں ماسٹرز کے لیے ایڈمیشن مل گیا تھا۔ اس بار وہ Dudley House میں تھی اور یونیورسٹی میں آنے کے چوتھے دن اس نے اپنے اپارٹمنٹ کے لاؤنج میں شیردل کو دیکھا تھا، وہ پانچ دوسرے لوگوں کے ساتھ اس چار بیڈروم اپارٹمنٹ کو شیئر کر رہی تھی اور اس وقت یونیورسٹی سے واپس آئی تھی جب سیدھے اپنے بیڈروم کی طرف جانے کے بجائے وہ بانی پینے کے لیے کچن میں آئی تھی اور لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اس نے جس شخص کو وہاں مارٹن کے ساتھ محو گفتگو دیکھا تھا اس نے شہر بانو کے ہوش اڑا دیے تھے۔ سیاہ جینز اور سیاہ ٹی شرٹ پہنے وہ شیردل تھا جو بڑے ریلیکس انداز میں اپنی ٹانگیں سینٹر نیبل پر ٹکائے صوفے پر نیم دراز کسی ڈرنک کا کین ہاتھ میں لیے برابر بیٹھے مارٹن کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ شہر بانو کی ہیلو کے جواب میں مارٹن کے ساتھ اس نے بھی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ ہیلو سے آگے کچھ نہیں کہہ سکی۔ وہ اسی طرح فریز ہوئی تھی۔ شیردل نے سینٹر نیبل سے اپنی ٹانگیں ہٹاتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھے ہوئے اس کی ہیلو کا جواب ایک خیر مقدمی مسکراہٹ سے دیا۔ شہر بانو کی بھوک پیاس لحوں میں غائب ہو گئی تھی۔ اس اپارٹمنٹ کے ایک بیڈروم کو ہائر کرتے ہوئے اس نے سنا تھا کہ اس اپارٹمنٹ کے پانچ مکینوں میں سے ایک پاکستانی بھی تھا لیکن وہ اس ”پاکستانی“ کو آج پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ وہ ساڑھے پانچ سال پہلے کی طرح ایک ٹین ایج، بے وقوف نہیں تھی پھر بھی شیردل کو دیکھ کر اس کے طوطے، کیوتر اسی طرح اڑے تھے۔ شیردل نے اپنا تعارف کروایا اور اس سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ فل برائٹ اسکالر تھا اور ہارورڈ کینڈی اسکول میں ماسٹرز کے لیے زیر تعلیم تھا۔ شہر بانو ہارورڈ کے آرٹیکلر اسکول میں ماسٹرز کے لیے Enrolled تھی۔ اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے اسے بار بار گریجویٹیشن کے دوران اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع نہ کرنا پڑتا تو وہ اس وقت فائنل سسٹر میں ہوتی اور پھر شاید شیردل سے اس کی ملاقات نہ ہوتی۔ بعض دفعہ تاخیر بھی زندگی بدل دیتی ہے جیسے اس سال اس کی بدلی تھی۔

شیردل اور اس کے درمیان صرف چند رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا تھا وہاں لاؤنج میں کھڑے کھڑے..... پھر وہ کچن ایریا میں گئے بغیر وہیں سے واپس اپنے بیڈروم میں آگئی تھی لیکن اپنا دل و دماغ سب کچھ باہر لاؤنج میں بیٹھے شیردل کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں ایک جن کی طرح آیا تھا۔

☆☆☆

”تم نے بتایا نہیں؟“ شہر بانو چوکی۔ ترمین کی آواز اس کو ماضی سے واپس کھینچ لائی۔ ترمین اپنا سوال دہرا رہی تھی۔ شہر بانو نے ایک نظر پھر شیردل کو دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

”ہم لوگ کزن ہیں۔“

رسمی کلمات کے ساتھ اس نے سیکنڈز کے اندر فون بند کیا۔ شرمندگی کی انتہا سی انتہا تھی جو اگلے کئی دن اسے گھیرے رہی، وہ چاہتی تھی شیردل اس کو نوٹس کرتا اور یاد رکھتا لیکن وہ اس طرح نوٹس ہونا اور یاد رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا اندازہ تھا شیردل کو سیکڑوں نہیں تو درجنوں لڑکیاں تو ای میلز ضرور کرتی ہوں گی، اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اسے باقاعدگی سے ای میلز کرنے والی درجنوں لڑکیاں اپنی درجنوں ای میلز کو صرف ٹینس پر فوکس نہیں رکھتی تھیں..... دو نہیں تو تین اور تین نہیں تو چار پانچ ای میلز کے بعد ای میل کا سیاق و سباق بدلنا شروع ہو جاتا تھا۔ لڑکیاں شیردل سے اسی طرح دوستی کا آغاز کرتی تھیں وہ جو اس سے کھیل کے ذریعے متعارف ہوتیں لیکن شہر بانو کی صورت میں شیردل کو پہلی بار ایک انتہائی مستقل مزاج مداح ملا تھا۔ جس کی پوری ای میل صرف ٹینس کے گرد گھومتی تھی..... اور اگر وہ واقعی صرف شیردل کے کھیل میں ہی دلچسپی رکھتی تھی تو یہ اس کے حلقہ احباب میں ایک انوکھا اضافہ تھا۔ شیردل اس کو نوٹس نہ کرتا تو کیسے نہ کرتا.....

شہر بانو نے اس کے بعد دوبارہ شیردل کو ای میل نہیں کی، شرمندگی کچھ اس حد تک ہوئی تھی اسے لیکن شیردل اس کے دل و دماغ سے کوشش کے باوجود محو نہیں ہو سکا۔ وہ چند ہفتوں میں اپنا سسٹر ختم کرنے والا تھا اور شہر بانو کو ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ ماسٹرز کے لیے وہاں رکے۔ وہ برائٹ اسٹوڈنٹس میں سے تھا یہ وہ جانتی تھی اس لیے ایڈمیشن اس کے لیے زیادہ مسئلہ نہیں تھا لیکن اس وقت شہر بانو کو شدید دھچکا پہنچا۔ جب پاکستان جانے سے پہلے اس نے شہر بانو کو ایک ای میل کی تھی۔ اپنے In-box میں شیردل کا نام دیکھ کر شہر بانو کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا کہ شیردل نے اسے ای میل کی تھی..... کانتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے ای میل کھولی تھی اور اس کے حواس اسی برق رفتاری سے بحال ہو گئے تھے۔ وہ ایک گروپ ای میل تھی۔ شیردل کی طرف سے ہارورڈ میں گزارے ہوئے یادگار وقت کے حوالے سے ایک الوداعی پیغام جو اس کی ایڈریس بک میں موجود تمام Contacts کو بھیجا گیا تھا۔ شہر بانو نے See more کے Option کو دبا کر Hidden Contacts کو دیکھا چاہا اور اس پر جیسے منوں کے حساب سے برف پڑی تھی۔ کم سے کم تین صفحات پر پھیلی ہوئی Contact list میں سیکڑوں ایڈریس تھے اور اگر ان میں سے ایک شہر بانو بھی ہو گئی تھی تو کون سی خاص بات ہو گئی تھی۔ مایوسی کچھ اتنی زیادہ تھی کہ اس نے شیردل کے Contacts میں موجود ایک ایک نام کو پڑھا، حسب توقع 70 فیصد خواتین ہی تھیں اس فہرست میں۔

شہر بانو کا دل نہیں چاہا کہ وہ اس ای میل کا جواب دے اور اسے الوداع کہے اسے یقین تھا کہ سیکڑوں Contacts میں اگر ایک کی طرف سے اسے جواب نہ بھی ملا تو کیا فرق پڑے گا لیکن اگلے کئی دن ان Contacts سے Reply to all کے آپشن کے ساتھ آنے والے جوابات اور پیغامات ایک طرف اس کو بار بار ریمائنڈ دیتے رہے اور دوسری طرف بہت سی ای میلز میں شیردل کے لیے خواتین کی طرف سے دکھائی جانے والی بے تکلفی اور اپنائیت اسے بے چین کرتی رہی اور کسی حد تک اسے ان لڑکیوں پر رشک بھی آتا رہا کہ وہ شیردل کے ساتھ اس طرح بات کر سکتی تھیں..... وہ کتنا پاپولر تھا، پہلے اسے صرف اندازہ تھا لیکن ان میسجز سے اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ وہاں Heart Throb تھا اور کتنوں کے دل توڑ کر جا رہا تھا اور نہ ماننے کے باوجود شہر بانو جانتی تھی کہ وہ بھی کسی نہ کسی حد تک ان کتنوں میں شامل تھی جن کا Crush شیردل پر تھا۔



”اوہ، اچھا..... یعنی خاندان میں ہی شادی ہوئی ہے۔“ تزئین نے دلچسپی لی۔

”جی۔“ شہر بانو مسکرائی۔

”فرسٹ کزن؟“

”جی، فرسٹ کزن۔“ اس سے پہلے کہ تزئین کچھ اور کہتی ملازم نے آکر ڈنر لگنے کی اطلاع دی۔

اور سارے مسئلے کا آغاز ڈنر ٹیبل پر تزئین کی گفتگو سے ہوا تھا۔

”بھائی آپ نے اس گھر کے بارے میں کچھ سنا ہے؟“ شیردل اور شہر بانو بیک وقت چونکے۔ ان کا

ذہن ڈی پی او ہاؤس کی طرف گیا تھا۔

”اس گھر کے بارے میں بھائی؟“ شیردل نے کچھ حیرانی سے تزئین سے کہا۔

”ارے نہیں، میں آپ لوگوں کے گھر کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔“

”چلیں شکر ہے، میں سمجھا تھا یہاں کا ہر سرکاری گھر Haunted ہے۔“ اختر، شیردل کے تبصرے پر ہنسا۔

”اس اعتبار سے تو پاکستان کا ہر سرکاری گھر Haunted ہے۔ Ask a common man.....“

اختر نے برجستہ کہا۔ اس بار وہ سب اس تبصرے سے محظوظ ہوئے تھے۔ ملازم کھانا سرو کر رہا تھا جب شہر بانو،

تزئین کے جملے پر اپنی پلیٹ میں کھانا نکالتے ہوئے ٹھکی۔

”تو تم لوگوں نے اپنے گھر کے قصے سن لیے؟“ تب ہی شیردل نے کچھ استہزاء سے انداز میں مسکرا کر ایک

نظر شہر بانو کو دیکھتے ہوئے تزئین سے کہا۔

”وہ تو آتے ہی سن لیے تھے۔ بونے اور افسیر اور مرڈر اور Suicide..... اور What not.....“

شیردل کا انداز بے پروائی لیے ہوئے تھا۔

”اور یہ بھی سنا کہ اس گھر میں رہنے والا ہر جوڑا الگ ہو جاتا ہے؟“ تزئین نے سنجیدگی سے کہا۔ شیردل

اور شہر بانو نے بیک وقت تزئین کو دیکھا۔ ان کے انداز میں حیرانی نے تزئین کو حیران کیا۔

”یعنی تم لوگوں نے یہ قصہ نہیں سنا؟“

”جھوٹی باتیں ہیں ساری..... میری بیگم کو ایسے قصوں میں بڑی دلچسپی رہتی ہے..... تم سنجیدگی سے مت

لینا۔“ اختر درانی نے مداخلت کرتے ہوئے شیردل کو خبردار کیا۔ شیردل نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔

”Unfortunately“ میری بیوی کو بھی ان قصوں میں بھابی جیسی ہی دلچسپی ہے اس لیے میں سنجیدہ

لوں نہ لوں، وہ سنجیدگی سے ہی لے گی۔“

”آپ کیا کہہ رہی تھیں بھابی؟“ شہر بانو نے شیردل کے تبصرے کو نظر انداز کیا۔

”آپ کو پتا ہے اختر میں کوئی غلط بات نہیں کر رہی..... ہسٹری اٹھا کر دیکھ لیں ان تمام آفیسرز کی..... آج

تک کوئی ایک کیل یہاں پوسٹ ہونے کے بعد اکٹھا نہیں رہ سکا..... یا میاں نے دوسری شادی کر لی یا بیوی

نے..... یا دونوں میں سے کسی کی ڈیجھ ہو گئی۔“ تزئین نے جیسے اپنے میاں کی بات کا برا منایا تھا۔ شہر بانو کے

چہرے کی رنگت فق ہوئی تھی۔

”تو اس میں اس گھر کا کیا رول ہے..... قسمت کی بات ہے۔“ اختر نے صورت حال سنبھالنے کی کوشش

کی۔ شیردل اب بھی اسی بے پروائی سے کھانا کھا رہا تھا لیکن شہر بانو کی بھوک غائب ہوئی تھی۔

”گھر کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے..... اب کچھ ہے اس گھر میں تو ایسی بات مشہور ہے اگر گھر کا کوئی عمل دخل نہ

ہوتا تو.....“ اختر نے مداخلت کی۔

”میرا خیال ہے کھانے پر دھیان دینا چاہیے۔“

”اتنا پیارا کیل ہے آپ دونوں کا..... بھائی میں تو کہہ رہی ہوں آپ لوگ ریسٹ ہاؤس میں ہی رہ لیں یا

کوئی اور انتظام کر لیں۔ وہ گھر ٹھیک نہیں ہے۔“ تزئین نے اختر کی بات کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”بھابی میری Official Residence ہے وہ..... اور میں بزدل تو نہیں ہوں کہ صرف قصے

کہانیاں سن کر گھر ہی نہ جاؤں..... اللہ مالک ہے۔“ شیردل نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ لیکن بے حد دو ٹوک

انداز میں تزئین سے کہا۔

”میں نے کہا تھا شیردل میری بیگم کچھ وہمی ہیں بالکل یہی اسپرٹ ہونی چاہیے۔ ہم لوگ ایک بار ایبٹ

آباد میں پوسٹڈ تھے اور وہاں مشہور تھا کہ ہماری سرکاری رہائش گاہ.....“ اختر درانی کوئی اور قصہ سناتے لگا۔

بات موضوع سے ہٹ گئی تھی لیکن شہر بانو کے ذہن میں اب کچھ اور نہیں بچا تھا۔

☆☆☆

”میں تم کو اس قدر احمق نہیں سمجھتا تھا شعی۔“ شیردل نے کچھ خفگی کے عالم میں اس سے کہا وہ اب مثال

کے بیڈروم میں بیٹھے بات کر رہے تھے۔ شیردل لائٹ سے سگریٹ ساگرا رہا تھا۔

”اس میں حماقت والی کیا بات ہے؟“ شہر بانو نے بھی جواباً اتنی ہی خفگی سے کہا۔

”تم نے کہا کہ اوپر والے ماسٹر بیڈروم میں نہیں رہنا..... میں نے کہا ٹھیک ہے..... تم نے کہا چھت کو بند

کر دو..... میں نے وہ بھی کروا دیا..... پورے گھر پر چڑھی ہوئی بلیں کٹوا دیں تم نے..... جو درخت کھڑے کیوں

تک آرہے تھے وہ بھی کٹوا دیے تم نے..... میں نے ہر بات مانی تمہاری..... But this is Just

ridiculous۔“ شیردل کچھ خفگی کے عالم میں اس سے کہہ رہا تھا۔

”میں Superstitious نہیں ہوں شیردل لیکن میں رسک بھی نہیں لے سکتی۔“ شہر بانو نے اس

کی بات کا ٹ دی۔

”یہ Myths ہیں اور کچھ نہیں..... تم نے ایک Myth اس گھر کے بارے میں یہ سنی تھی کہ یہ

Haunted ہے اب کتنے دنوں سے ہم لوگ یہاں رہ رہے ہیں کچھ ہوا کیا؟“ شیردل نے جواباً اس سے

پوچھا۔ وہ اب سگریٹ پیتے ہوئے کمرے میں ٹھلنے لگا تھا۔

”نہیں ہوا..... ہو تو سکتا ہے۔“ شہر بانو نے کچھ Irritate ہو کر کہا۔

”مثلاً کیا ہوگا؟“ شیردل چلتے چلتے بالکل اس کے بالمقابل رک گیا۔

”اب مجھے کیا پتا کہ کیا ہوگا۔“ شہر بانو اس کے اس انداز پر کچھ اور خفا ہوئی۔

”کچھ نہیں ہوگا یا۔ Trust me۔“ وہ اس کے قریب صوفے پر آ کر بیٹھ گیا اس نے شہر بانو کے

گرد ایک بازو پھیلا یا تھا یوں جیسے اسے کسی چھوٹے بچے کی طرح سہلانے اور بہلانے کی کوشش کر رہا ہو۔

”مجھے یہاں نہیں رہنا شیردل۔“ شہر بانو نے اس کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ وہ جانتی تھی وہ اب اس کی توجہ اس ایٹو سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں تمہارا ہوں شی، میں ہمیشہ تمہارا ہی رہوں گا۔۔۔۔۔ تم کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔۔۔ کوئی مجھے تم سے چھین نہیں سکتا۔“ سگریٹ کی راکھ الیش ٹرے میں جھٹکتے ہوئے شیردل نے نرم گہری آواز میں اس کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شہر بانو ننھے بچوں کی طرح شیردل سے لپٹ جاتی۔ وہ شخص اس کے لیے صرف شو ہر نہیں تھا۔ سب کچھ تھا۔۔۔۔۔ اور ”سب کچھ“ میں شیردل کے ساتھ اس کے کتنے رشتے تھے، وہ کم از کم انگلیوں کی پوروں پر نہیں گن سکتی تھی۔

”میں جانتی ہوں تم میرے ہو۔۔۔۔۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ کوئی تمہیں مجھ سے چھین نہیں سکتا۔۔۔۔۔ مجھے تم پر اندھا اعتماد ہے شیردل۔“ اس نے جواباً شیردل سے کہا۔

”پھر؟“ وہ مسکرایا۔

”لیکن وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔“ شہر بانو نے کچھ کمزور آواز میں کہا۔

”یہ آسب، بھوت پریت اور بونے بکواس چیزیں ہیں، میں ان کو نہیں مانتا۔“ شیردل نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔۔۔۔۔ کسی گھر کسی جگہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ میری آفیشل ریڈیٹس ہے اور میں یہیں رہوں گا۔ میں یہاں سے بھاگ کر اپنے اسٹاف کو خود پرہنے کا موقع نہیں دوں گا۔“ وہ اب اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ گرفت نرم تھی، لہجہ سخت تھا۔

”لیکن۔۔۔۔۔“ شیردل نے اس کی بات کاٹ دی۔

”مجھ سے پہلے جتنے آفیسرز یہاں آئے وہ اسی گھر میں رہے۔۔۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے انہوں نے یہ سب قصے کہانیاں نہیں سنی ہوں گی؟“ وہ اب اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ وہ شیردل سے ہر بات نہیں منوا سکتی تھی یہ اس نے اپنی اور شیردل کی کورٹ شپ کے دوران ہی جان لیا تھا لیکن وہ اس کے باوجود بہت سارے معاملات پر ضد کرتی تھی اور شیردل اسے ضد کرنے دیتا تھا۔ اس میں وقت کے علاوہ دونوں کا کچھ نہیں جاتا تھا۔

”تو سویٹ ہارٹ ہم یہیں رہیں گے۔“ شیردل نے اس کو خاموش دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس کے ہاتھ کی پشت پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

”یہ ونڈوز مجھ کو زہر لگتی ہیں۔“ شہر بانو نے اپنی جھنجھلاہٹ اس کھڑکی پر اتاری جس کے سامنے اس وقت وہ صوفہ تھا جس پر وہ دونوں بیٹھے تھے۔ شیردل نے بے اختیار اپنی مسکراہٹ روکی۔

”بدلو دیتے ہیں سچ ہی۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ وہ جانتا تھا وہ اپنا عصہ اب کسی اور چیز پر اتارے گی۔

”تم کبھی میری کوئی بات نہیں مانتے۔“ اس نے اپنے عقب میں شہر بانو کو کہتے سنا۔ وہ اپنے بیدروم کی طرف جاتے ہوئے رکا پھر بڑے اطمینان سے بولا۔

”یہ تو ہے۔۔۔۔۔ But I Love You Shaib۔۔۔۔۔“ صوفے پر بیٹھی ہوئی شہر بانو نے بے حد خفا انداز میں اسے دیکھا۔ وہ کمرے کے دروازے میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”Smile Please۔“ وہ اب ایک بار پھر اس کو بچوں کی طرح پچکار رہا تھا۔

”No۔“ شہر بانو نے بے حد فحشی سے کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس مرد سے اسی طرح لاڈ کروانے، بازار اٹھوانے کی عادی تھی اور اسی لیے اس پر مرتی تھی۔

”Honey۔“

”No۔“

”Sweet Heart۔“

”No۔“

”Darling۔“

”No۔“

وہ اسے منارہا تھا، وہ صوفے پر آنکھیں بند کیے اسی انداز میں انکار کر رہی تھی مگر اس کا ہر اندازِ مخاطب اسے موم کی طرح پگھلا رہا تھا۔ اس کے ماتھے کے بل، ہونٹوں کے تبسم میں بدل رہے تھے۔ شیردل کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی تھی۔ وہ ہنوز آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی لیکن اس کے ہونٹ اب مسکرا رہے تھے۔ بعض دفعہ مثال شہر بانو سے یا شہر بانو مثال سے اس قدر مشابہ لگتی کہ اس کے لیے یہ تشخیص کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ اس وقت کس کو دیکھ رہا ہے جیسے اس وقت شہر بانو کو دیکھتے ہوئے اسے مثال کا خیال آ رہا تھا۔

”میں سونے کے لیے جا رہا ہوں۔“ شیردل نے جہاں ہی لیتے ہوئے اس کی مسکراہٹ سے جیسے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ ان کی ازدواجی زندگی میں کبھی ایک رات بھی ایسی نہیں گزری تھی جب شیردل نے اسے خفا ہو کر سونے یا روتے دیا ہو۔ وہ اپنے معاملات میں اپنی مرضی کرتا تھا لیکن وہ اسے ناراض بھی نہیں رہنے دیتا تھا۔

شہر بانو نے آنکھیں کھول دیں۔ شیردل وہاں سے جا چکا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے کمرے میں پڑی چیزیں سمیٹنے لگی۔ وہ اس وقت ٹیبل پر پڑا شیردل کا سگریٹ پیک اور لائٹراٹھار ہی تھی جب اس نے کسی کو اپنا نام پکارتے سنا۔

”شہر بانو۔“ وہ ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی، ایک لمحے کے لیے اسے لگا شیردل نے اسے پکارا تھا مگر شیردل وہاں نہیں تھا۔

”شاید دوسرے کمرے سے پکار رہا ہے۔“ شہر بانو نے سوچا اور اس کا لائٹرا اور سگریٹ پیک اٹھا کر دوسرے کمرے میں آگئی۔ شیردل وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ کپڑے تبدیل کرنے واش روم میں تھا۔ اس کے سائڈ ٹیبل پر اس کا لائٹرا اور پیک رکھتے ہوئے شہر بانو نے اس آواز کو اپنا وہم سمجھ کر جھٹکا۔ اس وقت اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ رات کے اس پہر اسے پکارنے والا شیردل کے علاوہ کوئی دوسرا ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

”میں نے ایک جن دیکھا نا نا۔“ اس رات چڑیا نے خیردین کو آئینے میں نظر آنے والے عکس کے بارے میں بتایا۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ وہ بونا ہو سکتا تھا اور کنفیوژن اسے یہ تھی کہ اگر وہ بونا نہیں تھا تو پھر کیا تھا۔۔۔۔۔ بد صورتی اور خوف ناکی نے اسے اس دیکھی جانے والی چیز کے لیے جن کا لفظ استعمال کرنے پر اکسایا تھا لیکن اس کے تصور میں جن ایک Huge جسم کا مالک ہونا چاہیے تھا اور یہاں۔۔۔۔۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اس عکس کے لینے جن کا لفظ ہی استعمال کیا تھا۔

خیر دین اس کے انکشاف پر چونکا تھا۔ ”کہاں دیکھا؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”اس آئینے میں جو ہر برآمدے میں لگا ہے۔“ چڑیا نے بے حد سنجیدگی کے عالم میں کہا۔ خیر دین نے  
 چڑیا کو گود میں لیتے ہوئے جیسے تحفظ دینے والے انداز میں اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔  
 ”تم کو منع کرتا ہوں نا میں کہ مت جایا کرو شام کے بعد آئینوں کے پاس۔“  
 ”لیکن نانا وہ جن بہت چھوٹا سا تھا..... اتنا..... نہیں..... اتنا۔“ چڑیا نے خیر دین سے الگ ہوتے ہوئے  
 ہاتھ کے اشارے سے کچھ الجھے انداز میں جن کے سائز کا تعین کرنے کی کوشش کی۔  
 ”بیٹا جن نہیں ہے وہ..... بونا ہے۔“ خیر دین نے اسے ٹوکا۔  
 ”نہیں نانا..... وہ بونا نہیں تھا..... وہ بد صورت تھا..... اتنا ڈروٹا..... اور کالا سیاہ۔“ چڑیا یہ ماننے کو تیار  
 نہیں تھی کہ اس کے تصوراتی یونوں میں سے کوئی بھی اس حلیے کا ہو سکتا ہے جو اس نے دیکھا تھا۔  
 ”وہ بونا ہی تھا بیٹا..... بونے بھی اتنے ہی خوف ناک ہوتے ہیں دیکھنے میں جتنے جن، بھوت..... بلکہ  
 بعض تو جن بھوتوں سے بھی زیادہ ڈراؤنے ہوتے ہیں..... بس جسم اور قد کا فرق ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔“ خیر دین  
 نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ چڑیا کی تصوراتی دنیا کو ڈھانے کی جیسے پہلی کوشش تھی لیکن وہ بچی تھی اتنی آسانی  
 سے کیسے مان جاتی، چنٹو، منٹو، ٹوکو اور دوسرے یونوں کو کیسے منٹوں میں ہوا میں تحلیل ہونے دیتی۔ خیر دین کے علم کو  
 اس نے اس سے پہلے کبھی چیلنج نہیں کیا تھا۔ وہ نانا کے علم پر اندھا ایمان رکھتی تھی۔ خیر دین کا وجود وہ آنکھیں نہیں  
 جس سے وہ دنیا دیکھتی تھی۔ وہ اس کو اپنے بچپن کے انگریزوں کے قصے سناتا..... وہ پلیس جھپکائے بغیر سنتی.....  
 انگریز اس نے ٹی وی پر دیکھے تھے۔ کتابوں میں یا پھر خیالوں میں..... لیکن اس کے لیے یہ سوچنا مشکل تھا کہ وہ  
 بھی وہاں تھے ان کے ملک میں..... حاکم کے طور پر..... اس کے لیے انگریز بھی ایک خلائی مخلوق جیسے تھے اور ان  
 کا دیس کوہ قاف جیسا..... اور خیر دین اس خلائی مخلوق کی عجیب عجیب باتیں سناتا تھا..... ان کی اصول پرستی  
 کی..... ان کی دیانتداری کی..... ان کی محنت اور جانفشانی کی..... ان کی خوب صورتی اور ذہانت کی..... اور ان  
 کی زبان کی..... وہ زبان جو خیر دین کے منہ سے سنتی تو متاثر ہوتی اور خود بولتی تو فخر کے احساس کے ساتھ۔  
 مگر آج وہ پہلی بار خیر دین کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ کتابوں میں دیکھا جانے والا خوب  
 صورت Image خیر دین کے بتائے ہوئے سچ اور حقیقت سے زیادہ طاقتور اور زیادہ پُراثر تھا۔ اس نے..۔  
 خیر دین سے نہیں کہا تھا لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ غلط تھا اس گھر میں کہیں نہ کہیں چنٹو، منٹو،  
 ٹوکو وغیرہ ہی تھے..... وہ بد صورت شے نہیں جسے اس نے آئینے میں دیکھا تھا۔  
 وہ خیر دین اور حلیمہ کے ساتھ نئے ڈپٹی کمشنر کی بیوی کو سلام کرنے گئی تھی اور وہ پہلی نظر میں ہی اس ڈپٹی  
 کمشنر کی بیوی پر بری طرح فریفتہ ہوئی تھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ اسے انگریز لگی تھی وہی انگریز جسے اس نے ٹی  
 وی پر دیکھا تھا اور جن کے ہزاروں قصے اس نے خیر دین سے سنے تھے۔ دراز قد، بے حد دلمی، تکی اور بے حد  
 حسین..... جس کا لب و لہجہ بھی انگریزوں جیسا تھا..... حالانکہ وہ ان لوگوں کے ساتھ اردو میں بات کر رہی تھی۔  
 اس نے چڑیا سے چند رسمی سوال جواب کیے اور پھر خیر دین اور حلیمہ سے گفتگو کرنے لگی تھی۔ چڑیا کی توجہ اس تین  
 سالہ، ماں ہی کی طرح خوب صورت، بچی نے کھینچ لی تھی جو اس وقت بھی اس کمرے میں ایک کھلونا پکڑے

ادھر سے ادھر بھاگتی پھر رہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی حلیمہ اور خیر دین کے ساتھ بات چیت کے دوران وقت  
 و تھ سے اپنی بیٹی کو ہدایت بھی دے رہی تھی۔  
 چڑیا کا دل بار بار چاہ رہا تھا کہ وہ بچی اس کی طرف متوجہ ہو اور وہ اس سے بات کر سکے لیکن وہ بچی اپنے  
 کھلونے اور بھاگ دوڑ میں اس قدر مگن تھی کہ اس نے حلیمہ اور خیر دین کے پاس کھڑی چڑیا کو دیکھا تک نہیں۔  
 چڑیا وہاں سے واپس جاتے ہوئے بھی بار بار پلٹ کر اس بچی کو دیکھتی رہی جس کے گھٹنے سیاہ ریشمی خوب  
 صورت بالوں کو وہ چھوٹا چاہتی تھی..... اور جس کے گالوں پر ہاتھ لگا کر وہ جیسے ان کی نرمی محسوس کرنا چاہتی تھی  
 اور جس کے فرائ کی مڑی ہوئی فرل کو سیدھا کرنا چاہتی تھی لیکن وہ ان میں سے کوئی کام بھی نہیں کر سکی۔

نئے ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیوی فرح اور عابد کی طرح فریٹڈ لی نہیں تھے۔ وہ دونوں بے حد ریزروڈ تھے۔  
 ڈپٹی کمشنر کی بیوی ہاؤس وائف تھی اور وہ گھر کے نوکروں کو ایک فاصلے پر رکھتی تھی۔ وہ ہر جگہ نوکروں کا آنا جانا پسند  
 نہیں کرتی تھی۔ چڑیا کا گھر میں آنا جانا بھی بے حد محدود ہو گیا تھا اور وہ اس بچی کے ساتھ کھیلنے کی بے انتہا خواہش  
 کے باوجود بھی اس کے قریب نہیں جا پائی تھی۔ وہ کبھی کبھار اسے اپنے ماں باپ کے ساتھ لان میں کھیلتے ہوئے  
 دیکھتی لیکن وہ اس وقت بھی وہاں اس کے پاس نہیں جاسکتی تھی۔ نئے صاحب کا حکم تھا کہ ملازم صرف اس وقت  
 وہاں آئیں جب بلائے جائیں اور صاحب کی بیٹی جب لان میں ہو تو کوئی ملازم وہاں نہیں آئے گا اور چڑیا ایک  
 ملازم کی نواسی تھی۔ طبقاتی تقسیم کو چڑیا نے تب پہلی بار محسوس کیا تھا۔ اس سے پہلے صرف کوارٹر نہیں وہ پورا ڈی سی  
 ہاؤس اس کا تھا۔ وہ اپنے ونڈر لینڈ میں گھومتی رہتی تھی اور وہاں کی ہر جگہ کو Own کرتی تھی۔

جس دن خیر دین نے چڑیا کو نئے صاحب اور ان کی بیوی کی ہدایات پہنچائیں وہ حیران رہ گئی تھی۔  
 ”کیوں نانا.....؟ وہ تو میرا بھی گھر ہے، میں وہاں کیوں نہ جاؤں؟“ اس نے خیر دین سے سوال کیا۔  
 ”نہیں بیٹا، وہ ہمارا گھر نہیں ہے..... وہ بڑے صاحب کا گھر ہے..... ہمارا گھر تو یہ کوارٹر ہے۔“ خیر دین  
 نے چڑیا کو سمجھایا تھا۔

”لیکن صاحب کا گھر اتنا بڑا اور ہمارا اتنا چھوٹا کیوں ہے؟“ چڑیا نے اعتراض کیا۔  
 ”کیونکہ صاحب زیادہ پڑھا لکھا ہے، اس نے زیادہ محنت کی ہے اس لیے اس کو بڑا گھر ملا۔“ خیر دین  
 نے اپنی طرف سے ایک آسان جواب دینے کی کوشش کی۔

”پر نانا محنت تو آپ زیادہ کرتے ہیں..... آپ صبح جلدی اٹھتے ہیں..... کھانا بناتے ہیں..... سارا دن  
 صاحب کے گھر میں کام کرتے ہیں..... رات تک..... صاحب تو صبح بھی دیر سے اٹھتا ہے، دیر سے آفس جاتا  
 ہے..... آپ جتنی محنت تو نہیں کرتا۔“ سات سال کی وہ بچی اپنے نانا کو کام چور اور کم محنتی سمجھنے پر تیار نہیں تھی۔  
 خیر دین نے گہری سانس لی۔

”ہاں بیٹا..... پر میرا سارا کام ہاتھوں کا کام ہے..... صاحب کا کام دماغ کا کام ہے دماغ کے کام کی ویلیو  
 ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے..... اب اس گھر میں دیکھو میری طرح محنت کرنے والے کتنے ہوں گے..... دروازوں پر  
 کھڑے گارڈز..... لان میں کام کرنے والے مالی..... غسل خانہ صاف کرنے والے جمعدار..... صفائی کرنے  
 والے..... اور میرے ساتھ بچن میں کام کرنے والے ملازم..... فون والے آپریٹر..... لیکن اس گھر میں صاحب

صرف ایک ہے..... اور اس میں اور ہم سب میں فرق صرف یہ ہے کہ وہ بہت بڑھا لکھا ہے اور اس کا سارا کام ذہن سے ہوتا ہے..... خیر دین اس بچی کو گردے رہا تھا جو اس بچی کے ذہن پر نقش ہو رہا تھا۔

”پورے جسم میں دماغ چھوٹا سا ہوتا ہے لیکن یہ جسم میں سب سے اوپر ہوتا ہے سر میں..... اور پورا جسم اس کے کنٹرول میں ہوتا ہے جیسے صاحب یہاں بیٹھا اس پورے شہر کو کنٹرول کرتا ہے۔ وہ بادشاہ ہے، جیسے King کا Chess ہوتا ہے نا۔“ خیر دین نے اسے شطرنج کی مثال دی۔ وہ چڑیا کے ساتھ شطرنج کھیلتا تھا اور چڑیا Chess Board اس کے Pieces سے ہی نہیں بلکہ کھیل سے بھی اچھی طرح واقف تھی۔

”پر کنگ تو بڑا کمزور ہوتا ہے وہ تو بس ایک خانے تک چلتا ہے۔“ چڑیا نے جیسے اس کے Metaphor پر اعتراض کیا۔

”ہاں پر ہوتا تو وہ بادشاہ ہی ہے نا اور صرف بادشاہ ہے جو ایک ہوتا ہے..... باقی سارے Pieces بادشاہ کے لیے کام کرتے ہیں..... اس کو بچانے اور جتوانے کے لیے..... تو بادشاہ اس لیے سب سے طاقتور ہوتا ہے کیونکہ وہ ایک ہوتا ہے..... Horse, Bishop, Pawn اور Rook سب ایک سے زیادہ ہوتے ہیں۔“ خیر دین نے اسے سمجھایا۔

”Queen بھی تو ایک ہوتی ہے۔“ خیر دین بے اختیار ہنسا..... اس نے کونین کو جان بوجھ کر چھوڑا تھا لیکن اسے اندازہ ہونا چاہیے تھا کہ سب مہروں کے نام گناتے ہوئے کونین کو چھوڑنے پر چڑیا اسے نوٹس ضرور کرے گی۔

”اور کونین تو بہت پاورفل ہوتی ہے..... آپ نے ہی کہا تھا چیس بورڈ پر کونین ہی سب سے زیادہ پاورفل اور ڈیجیٹل ہے..... کیونکہ وہ دائیں بائیں آگے پیچھے، ترچھا ہر طرف موڑ سکتی ہے اور جتنے مرضی خانے۔“

چڑیا نے خیر دین کا دیا ہوا علم اس کے سر پر لٹا، خیر دین ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ وہ چڑیا کے ہاتھوں لا جواب ہوا تھا وہ اس کے جوابوں سے اسی کو باندھنے میں استاد تھی..... اور خیر دین کو اس کی ذہانت اس کے علم اور اس کے ہاتھوں لا جواب ہونے پر بھی فخر ہوتا تھا..... وہ اس کی اگلی نسل تھی..... اس کا اثاثہ تھی..... اکلوتا، قیمتی، واحد اثاثہ..... وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔

”ہاں، ہوتی تو کونین ہی سب سے طاقتور ہے لیکن چیس بورڈ پر کونین بھی بادشاہ کے لیے لڑتی ہے بادشاہ سے نہیں لڑتی۔“ خیر دین نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”کونین بادشاہ کیوں نہیں ہو سکتی نا.....؟“ خیر دین کو ہنسی کا ایک اور دورہ پڑا۔ لا جواب وہ اس سوال پر بھی ہوا تھا۔ اس چھوٹی سی بچی کو وہ کیا سمجھاتا کہ Gender Issue صرف Gender کا تھا اور تفریق Man-Made تھی۔

”چیس میں تو کونین کا کونین ہی رہنا ضروری ہے ورنہ کھیل بدل جائے گا چڑیا..... لیکن دنیا میں تو کونین بھی بادشاہ ہو سکتی ہے..... میں نے تمہیں انگریزوں کی کونین کا بتایا تھا نا..... وہاں کونین ہی بادشاہ ہے۔“ خیر دین نے اسے یاد دلایا۔

”اور کونین ہی بادشاہ ہوگی..... جب سب سے زیادہ پاورفل کونین ہے تو پھر بورڈ کونین کا ہونا چاہیے بادشاہ کا نہیں نا نا۔“ چڑیا نے چند لمحوں بعد بے حد سنجیدگی سے خیر دین کو مطلع کیا۔ ”اور نا اس کھیل میں بادشاہ بھی کونین ہی کے لیے لڑے گا۔“ اس نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ خیر دین کو بتایا۔ خیر دین ایک گہری سانس لیتے ہوئے مسکرایا۔

”ہم تو پیادے ہیں چڑیا..... نہ بادشاہ..... نہ ملکہ.....“ اس بار خیر دین نے اسے سمجھانے کے لیے Metaphor بدل لیا۔ ”سب سے چھوٹا مہرہ.....“

”پر نا جب Pawn چیس بورڈ پر مخالف کی آخری رو تک پہنچ جاتا ہے تو وہ بھی بڑا پاورفل ہو جاتا ہے۔ وہ جو چاہے بن سکتا ہے۔“ چڑیا نے ترکی بہ ترکی خیر دین سے کہا۔ اس کا اشارہ چیس کی اس مشہور مود کی طرف تھا جس میں اگر ایک طرف کا پیادہ مخالف کی آخری Row تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کی پروموشن ہو جاتی اور وہ Horse, Bishop, Rook, Queen میں سے جو چاہے بن جاتا اور تب زیادہ تر وہ پیادہ کونین بننا ہی منتخب کرتا تھا۔ خیر دین کے ساتھ چیس کھیل کھیل کر چیس کی کم از کم ساری مشہور مود چڑیا کو مکمل طور پر ازبر تھیں۔

”پر چڑیا تم کو پتا ہے ایک Pawn کا دوسری طرف آخری رو تک جا پہنچنا کتنا مشکل ہے؟“ خیر دین نے گفتگو کو چڑیا کو زندگی کا ایک اور سبق دینے کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔

”پورا بورڈ پار کر کے مخالف کی آخری رو تک جاتا ہے وہ..... ان کے سارے Pawns, Horses, Rooks, Bishops اور Queen اور King سے لڑتا ہوا..... بیٹا یہ بہت مشکل کام ہوتا ہے..... بہت ہی مشکل..... Pawn سے Queen بننا۔“ وہ خیر دین کے چہرے پر نظریں جمائے خیر دین کی بات سن رہی تھی۔

”لیکن نا نا یہ ہو سکتا ہے؟“ سات آٹھ سالہ اس بچی نے اپنی چمکتی نظریں خیر دین کے چہرے پر جماتے ہوئے پوچھا۔

”بہت محنت سے..... ذہانت سے..... اور قسمت سے۔“ خیر دین نے جواب دیا۔ چڑیا ان تین اجزا میں سے صرف قسمت پر انگلی تھی۔

”قسمت.....؟ نا نا قسمت کیا ہوتی ہے؟“

”اللہ کی مدد اور مرضی۔“ خیر دین نے کہا۔ بات سمجھ میں آئی نہ آئی لیکن بات چڑیا کے ذہن میں رہی..... دوسری بہت سی باتوں کی طرح۔

”قسمت بڑی چیز ہوتی ہے چڑیا.....“ خیر دین نے مزید کہا۔

”کتنی بڑی؟“ چڑیا نے تجسس سے پوچھا، وہ اس کو بھی کوئی مادی وجود رکھنے والی مافوق الفطرت چیز سمجھتی تھی۔

”بہت بڑی۔“ خیر دین نے سنجیدگی سے کہا۔

”نظر آتی ہے؟“

”ہمیشہ۔“

”ہر ایک کو؟“

”تقریباً.....“ خیر دین نے مسکرا کر کہا۔

سات بونوں کے علاوہ اب چڑیا کو قسمت سے ملنے اور اسے دیکھنے کا شوق بھی ہو گیا تھا۔

اسے دوبارہ کسی نقصان سے بچانے کی کوشش تھی۔ شہر بانو اس کے اس فیصلے پر ہنستی رہی تھی۔  
 ”کوئی ہمارے بیڈروم میں آکر دیکھے تو کیا کہے گا۔ بیڈ کے ایک طرف سائنڈ ٹیبل ہی نہیں۔“ اس نے  
 جیسے شیردل کو اس کے اس فیصلے کے مضمرات سمجھانے کی کوشش کی۔  
 ”کون آئے گا بیڈروم میں.....؟“ شیردل نے جواباً پوچھا۔  
 ”کوئی بھی آسکتا ہے۔“ شہر بانو نے کہا۔

”جو آئے اسے بتا دینا کہ کیوں ایک طرف سائنڈ ٹیبل نہیں ہے۔“ شیردل نے کہا۔  
 ”میں اتنا زیادہ تو نہیں گرتی شیردل۔“ شہر بانو نے جیسے وضاحت دینے کی کوشش کی۔  
 ”I can't take risk“ کچھلی بار بہت چوٹ لگی تھی..... میں دوبارہ تمہیں تکلیف میں دیکھنا  
 نہیں چاہتا۔“ شیردل نے اسے کہا وہ اب اسے اپنے بہت قریب سلانا تھا اور رات کو وقتاً فوقتاً اسے دیکھتا رہتا  
 تھا اس کے باوجود شہر بانو صبح تک اسے ہمیشہ بیڈ کے دوسرے سرے پر ہی ملتی تھی۔ جیسے اسے اس وقت ملی تھی۔  
 مثال کی پیدائش کے تو مہینے شہر بانو نے نہیں شیردل نے تقریباً جاگ کر گزارے تھے..... شہر بانو کے بیڈ کی سائنڈ  
 پرفلور کشنز کا ڈھیر لگا دینے کے باوجود اسے یہی خدشہ رہتا تھا کہ وہ بستر سے گر نہ جائے۔

شہر بانو نیند میں اس کے ہاتھ لگانے پر کسمپاشی تھی۔ شیردل نے بڑی احتیاط کے ساتھ اسے بیڈ کے  
 سرے سے دوسری طرف مثال کے قریب کیا پھر کمبل اس کے گرد اچھی طرح لپیٹتے ہوئے خود بیڈروم سے باہر  
 آگیا۔ اس کا جسم بے حد تھکا ہوا تھا لیکن ذہن مکمل طور پر تروتازہ تھا اور یہ ایک بے حد عجیب کیفیت تھی۔ وہ  
 کمرے سے نکلتے ہوئے ایک جری پہن آیا تھا۔ کمرے کے باہر کارڈ در کی بند لائٹس آن کرتے ہوئے وہ ہال  
 کی طرف جانے لگا۔ وہ اسٹڈی میں جا کر کچھ دیر کام کرنا چاہتا تھا۔ اسٹڈی کی طرف جاتے جاتے گھر کے  
 مرکزی دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ بری طرح ٹھٹکا۔ بیرونی دروازے کی چٹخنی اتری ہوئی تھی۔  
 وہ پرانی طرز کا ڈبل دروازہ تھا۔ اندرونی طرف لکڑی کا دروازہ اور بیرونی طرف جالی کے دروازے اور اس  
 وقت اندرونی دروازے کی چٹخنیاں نیچے تھیں۔ شیردل رات کو سونے سے پہلے کچن کے عقبی دروازے سے اور  
 مرکزی دروازے کو خود اندر سے بند کیا کرتا تھا اور یہ عادت اسے ہمیشہ سے تھی۔ وہ صبح سویرے جاگنگ کے  
 لیے نکلتے ہوئے مرکزی دروازہ کھولتا تھا۔ خانساہاں یا گھر کا کوئی دوسرا ملازم رات کو دروازے بند ہو جانے کے  
 بعد اندر نہیں آسکتے تھے جب تک وہ اندر سے دروازہ نہ کھول دیتا..... اور اب وہ دروازے کھلے تھے۔ اس نے  
 اندرونی دروازہ کھولا، جالی کے دروازے کی دونوں چٹخنیاں بھی کھلی تھیں، وہ کچھ اضطراب کے عالم میں باہر  
 نکلا۔ باہر بالکی دھند اور شدید سردی تھی لیکن راؤنڈ لیتے ہوئے گارڈ نے گھر کے اندر جلنے والی لائٹس دیکھی تھیں  
 اور وہ چونکا ہوا گیا تھا۔ شیردل جب تک باہر نکلا، ایک گارڈ اسے ڈرائیوے کے پاس ہی مل گیا تھا۔

”سرخیریت ہے؟“ رات کے پونے تین بجے اس طرح باہر نکلنے پر شیردل اس سے یہی سوال کی توقع کر سکتا  
 تھا۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ گارڈ کو کیا کہے یا اس سے کیا پوچھے۔ وہ سب جانتے تھے کہ شیردل پہلے  
 آفیسرز کے برعکس کچن کے عقبی دروازے کو ملازموں کے لیے کھلا نہیں چھوڑتا تھا اور رات کو عقبی اور مرکزی دروازہ  
 خود بند کر کے سوتا تھا اگر وہ گھر سے کسی ملازم کو رات کو نکلتے دیکھے تو یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اسے نظر انداز کر دیتے۔

شیردل کی آنکھ کس وجہ سے کھلی تھی، اسے فوری طور پر اندازہ نہیں ہوا۔ کمرے میں زیر و واٹ کی روشنی تھی  
 اور یہ یقیناً اس کی صبح خیزی نہیں تھی جو رات کے پچھلے پہر اس کو یوں جگانے کا باعث بنی تھی۔ اپنے ساتھ لیٹی  
 ہوئی مثال کو بہت آہستگی سے ہٹاتے ہوئے اس نے بایاں ہاتھ بڑھا کر بیڈ سائنڈ ٹیبل پر پڑا الارم کلاک اٹھا کر  
 دیکھا۔ آج پھر 2:30 کا وقت تھا۔ اس نے الارم کلاک واپس رکھ دیا۔ یہ پچھلے کئی دن سے ہو رہا تھا۔ وہ کئی  
 دن سے رات کے اس پہر بالکل اس وقت بغیر کسی وجہ کے جاگ جاتا اور پھر اسے کوشش کے باوجود نیند نہیں آتی  
 تھی۔ آج رات وہ ایک ٹور سے واپس آیا تھا اور رات کو تقریباً ایک بجے سویا تھا۔ بے حد تھکاوٹ کے باوجود وہ  
 صرف ڈیڑھ گھنٹے کے بعد دوبارہ اسی مقررہ وقت پر جاگ گیا تھا۔ چند لمحے اس نے دوبارہ سونے کی کوشش کی  
 لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ برابر میں لیٹی مثال کا چہرہ کمبل سے ڈھکتے ہوئے اس نے بیڈ سائنڈ ٹیبل  
 لپٹ کر آن کیا اور پھر اپنے بیڈ پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح شہر بانو کو دیکھا۔ وہ آج پھر بیڈ کے  
 دوسری طرف بالکل بیڈ کے آخری سرے پر تھی۔ ایک کروٹ لینے پر وہ بستر سے نیچے گر جاتی۔ وہ آج بھی کمبل  
 سے باہر تھی ٹائٹ شرٹ اور پاجامے میں ایک ننھے نیچے کی طرح سکڑی مٹی ہوئی۔

شیردل اپنے بستر سے اٹھ گیا، یہ جیسے اس کی زندگی کا معمول تھا۔ رات کو کبھی بھی جاگنے پر وہ لاشعوری طور  
 پر سب سے پہلے شہر بانو کو چیک کیا کرتا تھا اور اس کا یہ معمول ان کی شادی کے چوتھے دن سے شروع ہوا تھا  
 جب وہ رات کے وقت بستر سے گر کر بیڈ سائنڈ ٹیبل کے دراز کی تاب سے اپنا سر زخمی کروا بیٹھی تھی، شیردل اس  
 کے گرنے کی آواز پر ہڑبڑا کر اٹھا تھا اور کچھ دیر کے لیے اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ ہوا کیا تھا پھر شہر بانو کو  
 بیڈ کی دوسری طرف فرش پر بیٹھا دیکھ کر اسے پلک جھپکتے میں سمجھ آ گیا تھا کہ کیا ہوا تھا۔ بیڈ کے دوسری طرف پہنچنے  
 پر اس نے سب سے پہلے شہر بانو کا خون آلود چہرہ دیکھا تھا، وہ تکلیف میں تھی لیکن ابھی بھی جیسے آدھی نیند کی  
 حالت میں اپنے سر کی داہنی طرف ہاتھ رکھے جیسے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہوا کیا تھا۔ چوٹ داہنی کنپٹی سے  
 کچھ اوپر سر میں لگی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سر پر چوٹ کی جگہ پر رکھے ہوئے تھی اور دوسرے ہاتھ سے گال پر پھیلے  
 خون کو چھوتے ہوئے بے یقینی سے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔

”فارگا ڈسک..... کیا کر لیا شہی؟“ شیردل بے اختیار اس کے پاس بچوں کے بل بیٹھ گیا، شہر بانو کچھ  
 بول نہیں سکی۔ شیردل نے اس کا ہاتھ ہٹا کر اس کے زخم کا جائزہ لیا پھر وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ زخم گہرا  
 نہیں تھا اور شہر بانو زخم سے زیادہ اس طرح بستر سے گر جانے پر شرمندہ تھی۔

”لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ تم مجھ سے اتنی دور چلی کیسے گئیں؟“ شیردل کو یہ بات واقعی سمجھ نہیں  
 آرہی تھی۔ وہ رات کو اس کے سینے پر سر رکھے اس سے باتیں کرتے کرتے سوئی تھی اور پھر صرف گھنٹے ڈیڑھ  
 گھنٹے میں بستر کے دوسری طرف جا کر..... شہر بانو اسے یہ نہیں بتا سکی تھی کہ وہ پہلی بار بستر سے اس طرح گر کر  
 زخمی نہیں ہوئی تھی، وہ بچپن سے بستر سے گرتی آرہی تھی..... شیردل کا افسوس کئی دن تک باقی رہا لیکن یہ راز  
 زیادہ دیر تک اس کے لیے راز نہیں رہا تھا کہ شہر بانو اکثر بستر سے گرنے کی عادی تھی۔

پہلا کام جو شیردل نے اس کی اس عادت کو جاننے کے بعد کیا تھا وہ اس کی سائنڈ ٹیبل ہٹانے کا تھا یہ جیسے



”گھر سے آج کوئی باہر تو نہیں نکلا؟“ شیردل نے لہجہ تارل رکتے ہوئے گاڑ سے پوچھا۔

”کس وقت سر.....؟“ گاڑ نے کچھ حیران ہو کر پوچھا۔

”ابھی رات کو۔“

”نہیں سر..... میں نے تو کسی کو نکلتے نہیں دیکھا..... خیریت تو ہے سر؟“

”کچھ نہیں..... دروازہ کھلا تھا ابھی جب میں نے دیکھا..... اور میں رات کو دروازہ بند کر کے سویا تھا۔“

شیردل نے اس سے کہا۔

”سر میں اندر چیک کرتا ہوں۔“ گاڑ ایک دم مستعد ہو گیا۔

”نہیں، میں خود دیکھ لیتا ہوں شاید میں ہی رات کو دروازے بند کرنا بھول گیا۔“ شیردل نے اسے روک دیا۔

گاڑ کو کچھ دوسری ہدایات دے کر شیردل واپس پلٹ آیا تھا۔ اس نے اندر آ کر باری باری تمام کمرے بڑی احتیاط سے چیک کیے تھے۔ اندر کوئی نہیں تھا اور بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا۔ شیردل کچھ الجھ کر ہال میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خود کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ دروازے بند کرنا وہ شاید بھول گیا تھا اور یہ ایک اتفاق تھا لیکن اس کا لاشعور یہ ماننے پر تیار نہیں تھا۔

اسے بہت اچھی طرح دروازے بند کرنا یاد تھا کیونکہ وہ رات کو کسی ٹور سے بہت لیٹ واپس آیا تھا، اس کی آمد پر شہر بانو نے اندرونی دروازہ کھولا تھا۔ شیردل اگر خود کبھی گھر پر نہ ہوتا یا اسے لیٹ واپس آتا ہوتا تو شہر بانو ڈنر کے بعد ملازمین کے کچن صاف ہو جانے کے بعد گھر اندر سے بند کر لیتی تھی۔ یہ شیردل کی ہدایات تھیں اور شیردل کیوں اس معاملے میں اس قدر احتیاط پسند تھا یہ شہر بانو کو کبھی سمجھ نہیں آیا لیکن وہ اس کی ہدایات پر عمل کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔

دروازے میں کھڑے ہو کر شیردل نے ڈرائیور کو اپنے کھل کے کسی وزٹ کے لیے ہدایات دی تھیں اور اس کے جانے کے بعد اس نے دروازے بند کیے تھے۔ شہر بانو اس سے باتیں کر رہی تھی جب شیردل نے اس سے پوچھا تھا۔

”کچن کا دروازہ بند کر لیا؟“

”ہاں، ڈنر کے بعد ہی کر لیا تھا۔“ شہر بانو نے اس سے کہا تھا لیکن شیردل پھر بھی اس کو وہیں چھوڑ کر خود اندر ایک بار دروازہ دیکھنے گیا تھا تو کم از کم یہ سوال کہیں نہیں پیدا ہوتا تھا کہ وہ دروازہ خود بند کرنا بھول گیا تھا اور اب حیرانی کی بات یہ بھی تھی کہ کچن کا دروازہ بند تھا لیکن گھر کا مرکزی دروازہ کھلا تھا۔

ہال میں کھڑے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش میں شیردل کو ایک سگریٹ کی طلب ہوئی۔ وہ ہال سے اپنے بیڈروم میں چلا آیا۔ مثال اور شہر بانو دونوں اسی طرح گہری نیند سو رہی تھیں۔ شیردل نے اپنا سگریٹ کا پیک اور لائٹراٹھایا اور وہاں سے دوبارہ ہال میں واپس آ گیا اور بھی اسے پہلی بار یاد آیا کہ اس نے صرف گھر کے گراؤنڈ فلور کو چیک کیا تھا۔ وہ اوپر والی منزل پر نہیں گیا تھا۔ ایک سگریٹ سلگا کر پیک اور لائٹروہیں میز پر چھوڑتے ہوئے شیردل میٹریاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔ اس نے اوپر والے فلور کی لائٹس آن کرنا شروع کر دی تھیں۔ تمام دروازوں کے باہر اسی طرح تالے موجود تھے۔ جس طرح وہ ہمیشہ دیکھتا تھا۔ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے وہ کچھ مطمئن انداز میں دروازوں کو دیکھتے ہوئے ماسٹر بیڈروم کے سامنے سے گزرا اور پھر وہ چھت کے دروازے کو دیکھنے اس سے اوپر والی میٹریاں چڑھنے لگا اور آدھی میٹریوں میں ہی وہ جیسے کرنٹ کھا کر رکا تھا۔

چھت کا دروازہ مکمل طور پر کھلا تھا۔ شیردل کے کسی بدترین جیسے کی جیسے لہجہ میں ہونی نظر آرہی تھی۔ اس کے چھت کو صاف بھی کروالیا تھا اور اس کی مرمت بھی کروائی تھی شفٹ ہونے سے پہلے۔ چھت پر اب وہ لاک نہیں لگایا جاتا تھا کیونکہ شیردل کبھی کبھار چھت کا چکر لگایا کرتا تھا۔ سردیوں میں وہاں دھوپ ہی نہیں بلکہ وہاں سے شہر کا View بھی بہت شاندار ہوتا تھا لیکن شہر بانو کی ناپسندیدگی کی وجہ سے یہ کام کبھی کبھار ہی ہو پاتا تھا۔ وہ اس چھت سے خوف کھاتی تھی اور چھت عام طور پر بند رہتی تھی۔ لاک نہ ہونے کے باوجود یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی ملازم چھت پر جاتا اور پھر دروازہ اس طرح چوٹ کھلا چھوڑ آتا۔

شیردل برق رفتاری سے آدھے رات سے نیچے آ گیا تھا۔ ہال کمرے کے انٹرکام سے اس نے گیٹ پر موجود گاڑز کو اندر آنے کی ہدایت دی۔ ان کے آنے تک وہ اپنے بیڈروم میں آ کر سائنڈ ٹیبل کی دراز میں رکھا اپنا ریو لور نکال لایا تھا۔ بیڈروم سے نکلتے ہوئے اس نے بیڈروم کے دروازے کا بولٹ باہر سے چڑھا دیا۔

اندر آنے والے گاڑز میں سے ایک کو وہ وہیں چھوڑتے ہوئے دوسروں کے ساتھ اوپر چلا آیا تھا۔ چھت کا کھلا دروازہ دیکھ کر گاڑز بھی اسی کی طرح متوحش ہوئے تھے، شیردل ان کے ساتھ بڑی احتیاط کے عالم میں چھت پر نکلا۔ دھند میں لپٹی ہوئی وہ وسیع و عریض چھت بالکل خالی تھی۔ گاڑز نے نارچ کے ساتھ چھت کا ایک ایک حصہ چیک کر لیا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا اور چھت پر کھڑا شیردل خود کو جیسے اس وقت دنیا کا احمق ترین انسان محسوس کر رہا تھا۔ ایک گاڑز نے چھت کا دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ سوال و جواب کے کسی تبادلے کے بغیر شیردل واپس نیچے آیا۔ نیچے والا گاڑز برآمدے نما محرابی کاریڈور میں اسی طرح چکر کاٹ رہا تھا۔ چند رسمی ہدایات کے بعد انہیں بھیج کر شیردل دروازے بند کرنا ہوا ریو لور رکھنے اپنے بیڈروم کی طرف آیا اور کچھ دیر پہلے ہی کی طرح وہ ایک بار پھر شکوہ ہوا۔ بیڈروم کے دروازے کا بولٹ اتر ا ہوا تھا۔ وہ سوچے سمجھے بغیر دیوانہ وار کمرے میں داخل ہوا..... مثال اور شہر بانو اسی طرح بستر پر پرسکون سو رہی تھیں۔

شیردل کی جیسے جان میں جان آئی تھی، چند لمحوں کے لیے بے مقصد کمرے میں کھڑے وہ بستر پر لیٹی مثال اور شہر بانو کو دیکھتا رہا پھر اس نے ہاتھ روم اور برابر والا کمرہ چیک کیا۔ ریو لور واپس سائنڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ کر شیردل کمرے میں رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

یورے گھر میں سب کچھ ٹھیک تھا اس کے باوجود شیردل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اسے دو دروازوں پر لگی ہوئی

چٹخنیوں کے بارے میں غلط فہمی ہو سکتی تھی خاص طور پر اپنے بیڈروم کے دروازے کے بولٹ کے بارے میں۔  
اس رات پہلی بار وہاں بیٹھ کر اس نے اس گھر کے بارے میں سنے ہوئے تمام قصے ذہن میں دہرائے  
تھے اور گھر کی تاریخ یاد کی پھر بتائیں کیا خیال آنے پر وہ دوبارہ کمرے سے نکل آیا۔ ہال میں آ کر اس نے اوپر  
جانے والے کمروں کی چابیاں نکالیں اور دوبارہ اوپر کے فلور پر آ گیا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس طرح کے  
واقعات کے بعد رات کے اس وقت دوبارہ اوپر والی منزل پر اکیلا موجود نہ ہوتا لیکن وہ اپنے نام کا ایک تھا۔  
اس نے ماسٹر بیڈروم کے تالے کو ساری چابیاں لگا لگا کر دیکھنا شروع کیا، ایک چابی سے دروازہ کھل گیا۔  
شیردل نے دروازہ کھول دیا۔ تاریک کمرے میں اسے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ یوں جیسے بہت سی  
آنکھیں اسے دیکھ رہی ہوں۔ دروازے کے پیچھے سوئچ بورڈ کو ٹوٹ کر اس نے کمرے کی لائٹس آن کر دیں،  
کمرے کو بند رکھنے کے باوجود اب باقاعدگی سے صاف کیا جا رہا تھا تو دروازہ کھلنے پر بھی اسے وہ وحشت نہیں  
ہوئی تھی جو پہلی بار اس کمرے کا دروازہ کھلنے پر اندر کا ہتر حال دیکھ کر ہوئی تھی۔ کمرے میں اب بھی بہت پرانا  
فرنیچر تھا اور وہ بھی نہ ہونے کے باوجود..... شیردل آگے بڑھ آیا۔ وہ وہاں کیا دیکھنے آیا تھا، وہ نہیں جانتا تھا  
لیکن اس کے باوجود وہ وہاں موجود تھا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا تھا جب یک دم اپنے قدموں کے قریب پڑی  
کسی چیز نے اسے روک دیا۔ پہلی بار خوف کی لہر اسے سُن کر گئی تھی۔

☆☆☆

شہر بانو کی آنکھ انٹرکام کے مسلسل بجنے کی آواز پر کھلی تھی۔ مندرجہ ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس نے سر اٹھا  
کر دیکھا۔ اس کے برابر میں مثال سورہی تھی اور شیردل کا بستر خالی تھا۔ بیڈروم نیبل لیمپ آن تھا اور نیبل پر پڑا  
انٹرکام بج رہا تھا۔ کسلندی کے عالم میں اس نے لیٹے لیٹے شیردل کو آواز دی۔  
”شیردل..... شیردل۔“ پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ باتھ روم میں نہیں ہو سکتا۔ باتھ روم کی لائٹ  
آف تھی۔ کچھ الجھ کر اس نے باتھ روم کے دروازے کو دیکھتے ہوئے کہنی کے بل اٹھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر انٹر  
کام کا ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو!“ دوسری طرف گیٹ پر موجود چوکی میں تعینات سکیورٹی انچارج تھا۔

”میڈم سر سے بات کروادیں۔“ اس نے شہر بانو کی آواز سننے ہی کہا۔

”وہ کمرے میں نہیں ہیں، ابھی آتے ہیں تو بات کرواتی ہوں۔“

”اوپر والے کمرے کی لائٹ آن کی ہوئی ہے کسی نے..... کوئی وہاں ہے؟“ سکیورٹی انچارج نے کچھ

ہڑبڑائے ہوئے انداز میں کہا۔

”کہاں.....؟“ وہ نیند میں الجھی تھی۔

”اوپر والے بڑے کمرے میں۔“

”ماسٹر بیڈروم میں۔“ شہر بانو کی نیند پہلی بار اڑی۔

”جی..... سر کو بتادیں اور دروازہ کھول دیں، ہم اوپر جا کر چیک کرتے ہیں۔“ سکیورٹی انچارج نے اس

سے کہا۔ چند لمحوں کے لیے شہر بانو کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

”میں تھوڑی دیر میں بتاتی ہوں۔“ اس نے انٹرکام رکھتے ہوئے کہا تھا۔ اسے یک دم یہ احساس ہوا تھا

کہ ماسٹر بیڈروم میں اس وقت شیردل بھی ہو سکتا تھا۔ وہ اس طرح کے ایڈوچر کا شوقین تھا، بے حد خواہش باختہ وہ  
صوفے پر پڑی مثال کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے ننگے پاؤں بیڈروم سے باہر نکل آئی۔ باہر راہداری کی کھڑکیوں  
سے اس نے سکیورٹی گارڈز دیکھ لیے تھے۔ وہ لوگ اب مرکزی دروازے کے بالکل باہر الرٹ کھڑے  
تھے۔ شہر بانو بیرونی دروازہ کھولنے کے بجائے ہال کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

”شیردل..... شیردل..... تم اوپر ہو کیا؟“ اس نے اوپر والے فلور کی لائٹس آن دیکھ کر شیردل کو آواز  
دی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ شہر بانو کی حواس باختگی میں اضافہ ہو گیا۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھی  
تھی۔ اس وقت اسے یہ بھول گیا تھا کہ اوپر والا حصہ آسیب زدہ سمجھا جاتا تھا اور اس وقت اس ماسٹر بیڈروم کی  
لائٹس آن تھیں جہاں کسی زمانے میں کوئی خودکشی کر چکا تھا اس کو حواس باختہ کرنے کے لیے یہ کافی تھا کہ اس  
نے شیردل کو آواز دی تھی اور اس کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

عقبی لان کے درخت میں پڑا جھولا جھولتے ہوئے اس دن چڑیا نے گھر کی داخلی طرف والے لان میں  
ٹینس کورٹ بننے دیکھا۔ چند آدمی بڑی جانفشانی کے عالم میں گھاس کی تراش تراش کرنے کے بعد پیمائشی ٹیپ  
کے ساتھ پیمائش کرتے ہوئے سفید مینٹ سے زمین پر لکیروں کا ایک جال سا بنا رہے تھے پھر اس نے ان لکیروں  
کے بیچ میں ایک نیٹ کو استادہ ہوتے دیکھا۔ وہ بے حد دلچسپی سے اپنے تمام کام چھوڑ کر بار بار وہاں آ کر اس  
ٹینس کورٹ کی تیاری کے مراحل دیکھتی رہی۔ نئے ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیوی کے آنے کے بعد اس گھر میں بہت  
سی نئی نئی چیزیں ہو رہی تھیں۔

پکن گارڈن میں مقامی سبزیوں کے علاوہ چائیز سبزیوں کی کاشت شروع ہو گئی تھی۔ لان کی از سرنو  
ترمیم و آرائش کی گئی تھی۔ گلاب کی نئی کیاریاں بنائی گئی تھیں اور سامنے والے لان میں ایک روکری کا اضافہ  
بھی ہو گیا تھا۔ بچوں کے چند جھولے بھی نصب کیے گئے تھے۔ چڑیا اندازہ نہیں کر سکتی تھی کہ ان میں سے کون سا  
کام کس کی فرمائش پر ہو رہا تھا لیکن وہ بیگم صاحبہ کو ہر جگہ موجود پارہی تھی۔ ٹینس کورٹ وہ واحد جگہ تھی جہاں اس  
نے صاحب کو بار بار آتے دیکھا تھا۔ دو دن میں وہ ٹینس کورٹ تیار ہو گیا تھا۔ اور تیسرے دن چھٹی والے دن  
اس نے صاحب اور بیگم صاحبہ کو اس ٹینس کورٹ پر ٹینس کھیلتے ہوئے دیکھا۔ چڑیا جیسے مسمرائزڈ ہو گئی تھی۔ اس

نے یہ کھیل پہلے کتابوں میں اور ٹی وی کی جھلکیوں میں دیکھا تھا، آج پہلی بار آنکھوں کے سامنے دیکھ رہی تھی اور وہ Fascinated صاحب اور بیگم صاحبہ کے جانے کے بعد لان کی ان تمام کیاریوں میں جا جا کر وہ گیند ڈھونڈتی رہی تھی جو صاحب اور ان کی بیوی کھیل کے دوران شاٹ کے کورٹ سے باہر چلے جانے کے بعد نہیں ڈھونڈ سکے تھے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ڈیڑھ گھنٹے کے کھیل کے دوران چھ گیندیں جو گم ہوئی تھیں اور اسے جیسے کسی مشین کی طرح ازبر تھا کہ وہ چھ گیند کن اطراف میں گئی تھیں، پانچ گیندیں اس نے بے حد آسانی سے ڈھونڈ لی تھیں۔ چھٹی گیند وہ کنفا، منفا، ٹوکو، ٹوفو، ٹیڈو، ٹشو، ٹکو کے ساتھ وہ نہیں ڈھونڈ سکی تھی اس نے وہ پانچوں گیند کورٹ کے باہر رکھی کرسیوں اور میز کے اوپر رکھ دی تھیں۔ اس کے سات کے سات دوست بونے مل کر بھی اس چھٹی گیند کو نہیں ڈھونڈ سکے تھے۔

اسے اگر صاحب اور ان کی بیوی سے اپنی اس کارکردگی کے بدلے میں کسی داد یا ستائش کی توقع تھی تو وہ اسے نہیں ملی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی نے اگلے دن وہاں دوبارہ ٹینس کھیلتے ہوئے شاید غور تک نہیں کیا تھا کہ ٹینس کی وہ گمشدہ گیند کون وہاں میز پر رکھ گیا تھا لیکن چڑیا کے لیے یہ جیسے ایک اور نیا دلچسپ مشغلہ تھا۔ وہ اپنے کوارٹر میں پڑھتے ہوئے یا کوئی کام کرتے ہوئے شام کے اوقات میں ٹینس شائس کی آواز سنتی اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر باہر بھاگ جاتی۔ پھر عقبی لان کے کسی درخت یا پودے کے پیچھے دبک کر وہ صاحب کو اپنی بیوی یا کبھی کبھار کسی دوسرے آفیسر کے ساتھ ٹینس کھیلتا دیکھتی رہتی اور صاحب کے جانے کے بعد وہ گیند تلاش کرتی رہتی۔ اس نے کبھی کوئی گیند گھرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تمام گیندیں ڈھونڈ کر کبھی ان کے ساتھ تھوڑا بہت کھیل کر انہیں وہیں میز پر ایک رو میں سجا کر چلی آتی تھی۔ خیر دین نے زندگی میں اسے بہت سی چیزیں سکھائی تھیں اور ان میں سے ایک چیز ایمانداری بھی تھی۔

”وہ انگریز صاحب اور ان کی میم صاحب میرے لیے پورا گھر کھلا چھوڑ کر جاتے تھے..... کئی بار میں صاحب کا والٹ اور میم صاحب کی جیولری بھی ادھر ادھر سے اٹھا کر انہیں دیتا تھا۔“ وہ چڑیا کو بڑے فخریہ انداز میں بتایا کرتا تھا۔

”تو صاحب اسی لیے مجھ پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔“ چڑیا نے خیر دین سے دیانتداری سیکھی تھی اور قناعت لی تھی اور محنت کرنا پایا تھا۔ ایک بچے کی معصوم فطرت اور ناگہمی کے باوجود اس نے بھی ڈی سی ہاؤس میں موجود ان چیزوں کو اپنے کوارٹر میں لے جانے کی کوشش نہیں کی تھی جو اسے فیسٹیٹ کرتی تھیں۔ اور ایسی ہی ایک فیسٹیٹ کرنے والی چیز اس کے لیے ٹینس ریکٹ تھا جس کو کبھی چھوئے اور اس سے کھیلنے کی شدید خواہش رکھنے کے باوجود وہ کبھی صاحب یا بیگم صاحبہ کے ریکٹس کو ہاتھ نہیں لگا سکی تھی۔ ان کا کھیل ختم ہوتے ہی ایک ملازم دونوں ریکٹس اور گیند کا ڈبا اٹھا کر اندر کہیں لے جاتا تھا اور چڑیا ہر بار کچھ مایوس سی ہو کر رہ جاتی تھی۔ اسے انتظار تھا کسی ایسے دن کا جب صاحب یا وہ ملازم ریکٹ اٹھانا بھول جاتے لیکن وہ دن کبھی نہیں آیا البتہ ایک آگیا تھا..... چڑیا نے سات بونے نہیں دیکھے لیکن اس نے وہ قسمت دیکھ لی تھی جسے خیر دین بہت بڑی شے کہتا تھا۔ ایک اس کی زندگی کا سیاہ ترین اور خوب صورت ترین باب تھا۔

(باقی آئندہ ماہ)

کھیل تھا، ان کی انھیالی اور دھیالی فیملی میں کوئی ایسا نہیں تھا جو ٹینس نہ کھیلتا ہو..... مگر ان میں سے کسی میں بھی ٹینس کے لیے ایک جیسا پیش نہیں تھا..... وہ سوئمنگ کرتا تھا یا پھر ٹینس کھیلتا تھا اور اس گھر میں آنے کے ایک ہفتے میں ہی چڑیا یہ جان چکی تھی۔

ایک کے آنے کے بعد صاحب باقاعدگی سے شام کے وقت اس کے ساتھ لان میں ٹینس کھیلا کرتے کبھی کبھار ایک کی مٹی، بہن، بھائی اور صاحب کی بیوی اور بیٹی بھی وہاں موجود ہوتے لیکن عام طور پر صرف صاحب اور ایک ہی کھیل رہے ہوتے اور صاحب مسلسل ایک کو ہدایات دے رہے ہوتے۔ ایک صاحب سے کبھی جیت نہیں پاتا تھا لیکن کبھی کبھار وہ کوئی اچھا شاٹ مار دیتا اور صاحب اس شاٹ کو Miss کر دیتے اور تب کورٹ میں فاتحانہ انداز میں چلانے والا صرف ایک نہیں ہوتا تھا کسی پودے یا درخت کے پیچھے چھپی ہوئی چیز یا بھی اتنی ہی سرور ہوتی تھی اور اس کے ساتھ بونے بھی..... وہ آٹھوں اس کے اس اتفاقی شاٹ کو بھی اس طرح سیلیبرٹ کرتے جیسے وہ ایک پوائنٹ نہیں میچ جیت گیا ہو۔ ایک چڑیا کو کیوں اچھا لگا تھا؟ اس وقت اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ Awe میں تھی۔ اس وقت تک وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کا ہم عمر تھا..... اس کے لیے متاثر ہونے کے لیے یہ کافی تھا کہ وہ ٹینس کھیلتا تھا اور بہت اچھی کھیلتا تھا اور جب وہ فری زلی پھینکتا تھا تو کوئی نوکر بھی اس کو نہیں پکڑ پاتا تھا۔ وہ ان تین بچوں کا سردار تھا جو اس وقت اس گھر میں تھے اور وہ جس طرح ان تینوں بچوں کو کنٹرول کرتا تھا۔ وہ کہیں سے بھی ایک آٹھ سالہ بچہ نہیں لگتا تھا۔

چڑیا، صاحب کے ریکٹ کو دیکھ کر ہمیشہ فیسینٹ ہوتی تھی لیکن وہ کبھی خواہش کے باوجود اس ریکٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکی۔ اس کے ساتھ کھیلنا تو خیر بہت دور کی بات تھی۔ اس وقت تک اسے وہ ٹینس ریکٹ بہت ہلکی پھلکی کوئی چیز لگتا تھا کیونکہ اس نے صاحب کو اسے ایک ہلکی پھلکی چیز ہی کی طرح اٹھائے اور کھیلے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے اندازہ تک نہیں تھا کہ وہ اس ریکٹ کو موقع مل جانے پر اٹھا کر گھما بھی نہیں سکے گی۔

ایک اپنا ریکٹ اکثر لان میں چھوڑ کر چلا جاتا تھا اور موقع ہونے کے باوجود چڑیا اس ریکٹ کے قریب جانے کی ہمت بھی نہیں کر پاتی تھی، اسے خوف ہوتا تھا کہ ایک کسی بھی وقت دوبارہ نمودار ہو سکتا تھا اور چند بار واقعی ایسا ہوا تھا کہ وہ ہمت کر کے اس ٹیبل کے پاس جانے کی تیاری کر رہی ہوتی جہاں ایک اپنا ریکٹ چھوڑ کر گیا تھا اور ایک کھانے پینے کی کوئی چیز لیے یک دم دوبارہ لان میں آ جاتا۔ وہ ہمیشہ اتنے بے قدموں آتا تھا کہ چڑیا اس سے خائف رہنے لگی تھی اسے لاشعوری طور پر یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ جب بھی اس کے ریکٹ کو پکڑنے کے لیے اس ٹیبل کے پاس جائے گی۔ ایک وہاں آ جائے گا۔

وہ اب پہلے کی طرح کیاریوں میں سے ٹینس بالز بھی نہیں نکال پاتی تھی کیونکہ ایک کھیل ختم ہونے کے بعد تمام بالز خود ڈھونڈ کر ٹینس بالز کے ڈبے میں بالز پوری کر کے ہی لان سے روانہ ہوتا۔ اس نے چڑیا کی زندگی کی ایک سب سے پسندیدہ سرگرمی چھین لی تھی لیکن اس کے باوجود چڑیا کو ایک اچھا لگتا تھا۔ وہ اکیلے ٹینس شائٹس کی پریکٹس کرتے ہوئے کورٹ پر خود ہی اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا..... چڑیا اور اس کے ساتھ بونے اس کی ان خود کلامیوں سے محفوظ ہوتے رہتے۔ چڑیا نے پہلی بار اپنے علاوہ کسی دوسرے کو خود سے گفتگو کا شوقین پایا تھا اور ایک کے لیے اس کی پسندیدگی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کبھی کبھار اس کی باتیں سنتے

شیردل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بونے مقیم ہیں۔ شیردل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ایک دن شیردل اپنے سینئر اختر درانی کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ اختر درانی کی بیوی ترین، شہر بانو کو بتاتی ہے کہ پہلے کسی آفیسر کی بیوی نے اس گھر میں اپنے شوہر کو مار کر خود کشی کر لی تھی اس لیے وہاں رہنے والوں کی ازدواجی زندگی مشکلات کی زد میں آ جاتی ہے۔ ترین کے پوچھنے پر کہ ان کی شادی نو میرج کا نتیجہ ہے..... یہ بات سن کر شہر بانو ماضی کی خوب صورت یادوں میں کھو جاتی ہے..... جہاں صرف وہ اور شیردل ہوتے ہیں..... دونوں کی ذہنی ہم آہنگی انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ ہاجرہ اور اس کے شوہر..... نے اپنے بیٹے کو بڑھا لکھا کر ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا۔ خیر دین میٹرک کے بعد کوئی اور نوکری تو نہ کر سکا لیکن ڈی سی ہاؤس میں کلک کی نوکری کرنے لگا۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کر دیتا ہے جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے..... لیکن کچھ ہی عرصے بعد حلیمہ کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے..... یوں حلیمہ اور چڑیا خیر دین کے ساتھ اس ڈی سی ہاؤس میں رہنے لگتی ہیں۔ چڑیا کو جب اس گھر میں بونوں کے بارے میں پتا چلتا ہے تو وہ اپنی خیالی دنیا میں ان کے خاکے بناتی ہے، ان سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس نے ان بونوں کو مختلف نام بھی دیے، وہ ہر وقت ان کی کھوج میں رہتی ہے تاکہ وہ ان سے دوستی کر سکے۔ نئے صاحب یعنی شیردل کو یہ پسند نہیں ہوتا کہ ملازم کی فیملی ان کی فیملی کے ساتھ ربط و ضبط رکھے۔ وہ جب ٹینس کورٹ بناتے ہیں اور وہاں کھیلتے ہیں تو چڑیا پودوں کے پیچھے سے چھپ کر انہیں دیکھتی ہے۔ وہ ہر روز شام کو ان آئینوں کو دیکھنا بھی نہیں بھولتی کیونکہ خیر دین نے اس سے کہا تھا کہ شام کے وقت بونے اس میں نظر آتے ہیں لیکن چڑیا کو جو بونا نظر آتا ہے وہ بہت خوفناک ہوتا ہے اس لیے وہ اسے بونا نہیں مانتی پھر اسے اس میں ایک نظر آتا ہے۔

اب آگے پڑھیں۔

### قسط نمبر 3

ایک اس شیول مرر کے سامنے کھڑا اپنا ریکٹ گھماتے گھماتے رک گیا تھا۔ یہ آئینے میں ابھرنے والا ایک عکس تھا جس نے اسے روکا تھا اور وہ یہ نہیں جانتا تھا وہ چہرہ ساری عمر ہر بار سامنے آنے پر اسی طرح فریز کر دیا کرے گا۔ اس نے چڑیا کو پہلی بار اسی آئینے میں دیکھا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ چڑیا پچھلے کئی دنوں سے اسے کئی بار دیکھ چکی تھی..... ٹینس کورٹ پر صاحب کے ساتھ ٹینس کھیلتے..... لان میں صاحب کی بیٹی اور اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ کھیلتے..... Frisbee پکڑنے میں ناکامی پر اپنے چھوٹے بہن بھائی پر چلاتے اور خفا ہوتے ہوئے..... وہ صاحب کے گھر آئے ہوئے مہمان تھے اور صاحب کے گھر ویک اینڈ پر مہمانوں اور ان کے ساتھ ان کے بچوں کا آنا کوئی انوکھی بات نہیں تھی مگر یہ صاحب کے ہاں لمبی چھٹیاں گزارنے کے لیے آئے ہوئے مہمان تھے۔

صاحب کے گھر کا سناٹا ان تین بہن بھائیوں کی سرگرمیوں سے ٹوٹنے لگا تھا جن میں سے ایک سب سے بڑا تھا..... آٹھ سالہ وہ بچہ اپنے قد و قامت سے دس سال کا لگتا تھا..... وہ جب بھی گھر سے باہر نظر آتا اس کے ہاتھ میں زیادہ تر ٹینس ریکٹ ہی ہوتا جسے وہ بے مقصد گھماتا، ٹینس شائٹس کی پریکٹس کرتا رہتا..... کبھی کبھار اس کی چھ سالہ بہن اس کے ساتھ ٹینس کھیلتی لیکن وہ کسی بھی اعتبار سے ایک کا مقابلہ نہیں کر پاتی تھی۔ وہ جسمانی طور پر بہت مضبوط تھا..... لڑکا تھا..... بہن سے عمر میں دو سال بڑا تھا..... اور ٹکنیک کے اعتبار سے بہت Sound تھا..... اور پانچ سال کی عمر سے ٹینس ریکٹ اٹھائے ہوئے تھا۔ ٹینس جیسے ان کا خاندانی

ہوئے اس کا دل چاہتا وہ ان کی باتوں کا جواب دے اور وہ دیتی بھی لیکن سرگوشی میں اپنے بونوں کو۔ لیکن ایک کی وہ ساری باتیں، جھلاہٹیں، خود کلامیاں چڑیا کے لیے جیسے ایک شاندار تفریح تھی۔ وہ اس کی Vocabulary بڑھاتا تھا۔ ایک کے منہ سے سننے والا ہر نیا لفظ وہ خیر دین کے سامنے رکھ دیتی تھی اور ان میں سے زیادہ تر لفظ خیر دین کے لیے بھی سننے تھے۔ چڑیا خیر دین کو یہ نہیں بتاتی تھی کہ اس نے وہ لفظ کہاں سنا تھا لیکن وہ خیر دین کی لالچی اور کم علمی کو کسی اعتراض کے بغیر قبول کر لیتی تھی۔

بعض دفعہ ایک کو اپنے بہن بھائیوں یا اکیلے کھیلنے ہوئے دیکھ کر چڑیا کا بے تحاشا دل چاہتا تھا کہ وہ خود بھی اس کے ساتھ جا کر کھیلنے لگے۔ ایک کی اچھالی ہوئی ہوا میں اڑتی اس فریابی کو جسے کوئی پکڑ نہیں پاتا وہ پکڑ لے۔ ایک کی ٹینس Serve کو وہ دوسرے کورٹ سے اتنی ہی طاقت کے ساتھ Return کرے جس قوت سے وہ پھینکی گئی تھی اور اسے یقین تھا وہ ایسا کر سکتی تھی۔ ایک بچے کی معصومیت اور خوش فہمی اسے یہ بتا ہی نہیں پار ہے تھے کہ کھیل کھیلنے اور اچھا کھیلنے کے لیے صرف خواہش اور موقع نہیں Skill کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ٹینس کا وہ ریکٹ جسے ایک بڑی آسانی سے گھماتا اور ہلاتا نظر آتا تھا اس کے پیچھے Will نہیں Skill ہی اس کے تین سالوں کا تجربہ تھا۔ فریابی کی وہ ڈسک تھی جو ہوا میں تیرتی کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ سے بھی اسی طرح چھوٹ کر گرتی جس طرح دوسروں کے ہاتھوں سے۔ لیکن بچے آدمی زندگی اور آدمی خواہشات خواہوں اور فینٹسی میں پوری کرتے ہیں۔ نہ پولیس کی ڈکسٹری میں ناممکن کا لفظ تھا نہ اس کی زندگی میں ہوتا ہے۔ اور چڑیا کے ساتھ تو سات دوست بولنے بھی تھے۔

”نانا جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو میں ٹینس کی پلیئر بنوں گی۔“ ایک کے آنے کے چند دنوں کے بعد ایک دن چڑیا نے خیر دین سے ریکٹ کی فرمائش کرتے ہوئے اسے اپنے کیرئیر میں تبدیلی کا عندیہ دیا۔

”ٹینس بیٹا، لڑکیاں ٹینس نہیں کھیلتی۔“ خیر دین نے فوراً اسے ٹوکا۔

”نی وی پر تو کھیلتی ہیں۔۔۔۔۔ وہ جو مبلڈن ہوتا ہے۔“ چڑیا نے پی ٹی وی پر دیکھے جانے والے کسی میچ اور ٹورنامنٹ کی اسے یاد دلانی۔

”ہاں پر وہ تو انگریزوں کے ملک میں ہوتا ہے اور انگریز عورتیں کھیلتی ہیں۔“ خیر دین جواب دیتے ہوئے صاحب کی بیوی اور اب ایک کی مٹی کو بھول گیا تھا چڑیا نہیں، اس نے خیر دین کو یاد دلانے میں دیر نہیں کی۔

”بیٹا وہ صاحب لوگ ہیں، وہ کھیل سکتے ہیں ہم نہیں کھیل سکتے۔“ خیر دین نے بے اختیار گہری سانس لیتے ہوئے اس سے کہا۔ چڑیا کو اب بار بار صاحب اور اپنی کلاس کا فرق سمجھانا اور بتانا خیر دین کو بڑا مشکل لگتا تھا۔ خاص طور پر اس لیے کیونکہ ساری عمر وہ چڑیا کے سامنے ایک ”بڑا آدمی“ بنا رہا تھا اور اب اس بڑے آدمی کو اس بچی کے سامنے یہ خول اتارنا پڑ رہا تھا اور یہ آسان نہیں تھا مگر اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ اسے اپنی استطاعت سے بڑھ کر کھلا پلا رہا تھا۔ اسے انگلش میڈیم اسکول بھیج رہا تھا۔ اس انگلش میڈیم اسکول میں جہاں اس جیسا آدمی اپنی اولاد کو بھیجنے کے صرف خواب دیکھ سکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ چڑیا کے پاؤں زمین پر بھی رکھنا چاہتا تھا۔ اس کو پرواز سے روکنا چاہتا تھا۔

”بہت سارے کام صاحب لوگ کر سکتے ہیں لیکن ہم نہیں۔۔۔۔۔ نہیں چڑیا کو اس فلاسفی کی سمجھ آتی تھی یا

نہیں لیکن یہ ایک جملہ اس نے کسی طوطے کی طرح اپنے سسٹم میں بغیر بحث کے فیڈ کیا تھا۔

خیر دین نے اسے کیرئیر بدلنے کی اجازت تو نہیں دی تھی لیکن اگلے دن اس کو ایک ریکٹ لا دیا تھا۔ وہ بیڈمنٹن ریکٹ تھا۔ لکڑی کا ایک معمولی سا۔۔۔۔۔ کم قیمت۔۔۔۔۔ پہلی نظر میں ہی چڑیا نے اس ریکٹ کو ناپسند کر دیا تھا۔ لیکن اس نے اپنی ناپسندیدگی خیر دین تک نہیں پہنچائی تھی۔۔۔۔۔ بھاری دل کے ساتھ اس نے وہ ریکٹ اٹھالیا تھا اور اس نے اس کے ساتھ چند بار اس گیند کو ہٹ کرنے کی کوشش کی تھی جو خیر دین ریکٹ کے ساتھ لے کر آیا تھا۔ تیسرے یا چوتھے شاٹ پر ریکٹ کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ چڑیا نے بو جھل دل کے ساتھ وہ ریکٹ اٹھا کر کمرے میں پڑی اکلوتی سیف کے اوپر رکھ دیا۔ اسے سمجھ میں آ گیا تھا کہ بعض چیزیں صرف صاحب لوگ کیوں کر سکتے ہیں وہ کیوں نہیں۔

اس شام اس آئینے میں دیکھے جانے سے پہلے ایک نے کبھی چڑیا کو اس گھر میں نہیں دیکھا تھا اور اب ایک دم اس آئینے میں ابھر آنے والے ایک ہم عمر کے عکس نے اسے حیران کیا تھا۔ اس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ریکٹ کے ساتھ ٹینس شائٹس کی پریکٹس کرنا اس کا روز کا معمول تھا اور اسے پریکٹس کرتے دیکھنا چڑیا کا۔ پہلی بار اس نے اتفاقی طور پر ایک کو اس وقت شام کو اس آئینے کے سامنے موجود پایا تھا جب وہ ہمیشہ کے اپنے معمول کے مطابق شام کے وقت اس آئینے میں ”کچھ“ دیکھنے آئی تھی اور جو کچھ اسے نظر آیا تھا اس نے چڑیا کو بے حد محظوظ کیا تھا۔ ایک آئینے کے سامنے کھڑا اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا ریکٹ کو گھماتا پھر رہا تھا۔ وہ آئینے میں کسی کھلاڑی کے کھیل کے انداز کی نقل اتار رہا تھا، نہ صرف کھیل کے انداز کی بلکہ اس کھلاڑی کے کھڑے ہونے، سر جھٹک کر اور کندھے اچکا کر بات کرنے کی بھی۔ وہ ریکٹ کو ایک کپ کی طرح پکڑے جیسے وہ مبلڈن سینٹر کورٹ پر کھڑا چیمپئن شپ جیتنے کے بعد تقریر کر رہا تھا۔ وہ کس کھلاڑی سے متاثر تھا اور کس کی نقل کر رہا تھا چڑیا کو کچھ اندازہ نہیں تھا لیکن ایک کے اس چارمنٹ کے ”Skit“ یا ”رول ملے“ کو دیکھتے ہوئے اسے اپنی ٹی بی پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا اور ایک کو اگر یہ پتا چل جاتا کہ اس کی وہ وزز اسپیج کسی کو اس طرح گدگداری بھی تو وہ شرم سے ڈوب کر مر جاتا، بونوں کو دیکھنے کی خواہش کے علاوہ اب چڑیا اس آئینے کے سامنے ایک کے ”Acts“ دیکھنے بھی آتی تھی۔ وہ ہر روز وہاں نہیں ملتا تھا لیکن اکثر وہاں مل جاتا تھا۔

اور آج اس آئینے میں پہلی بار ایک نے چڑیا کو دیکھ لیا تھا۔ برآمدے میں رکھے گئے اس آئینے کی پوزیشن صفائی کے دوران کچھ تبدیل ہوئی تھی اور برآمدے کے ایک ستون پر چڑھی بوگن ویلیا کے ساتھ چپکی اندر جھانکتی چڑیا جو آئینے کی پہلی پوزیشن میں نظر نہیں آ سکتی تھی اب بڑی آسانی سے نظر آ گئی تھی۔ اس نے بے ساختہ پلٹ کر اپنے عقب میں اس ستون کو دیکھا تھا۔ ستون اور اس آئینے میں فاصلہ بے حد کم تھا۔ چڑیا کچھ دیر کے لیے جیسے ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح رنگے ہاتھوں پکڑی جاسکتی ہے اور پکڑی گئی کیسے تھی وہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک اب اس پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ پُر تحس۔۔۔۔۔ حیران۔۔۔۔۔ مسکراتی ہوئی نظریں۔۔۔۔۔ چڑیا کی سمجھ میں نہیں آیا وہ فوری طور پر کیا کرے۔۔۔۔۔ برآمدے کے ستونوں کی آڑ میں بھاگتی ہوئی فرار ہو جائے۔ ایک کے سامنے آجائے یا آہستہ سے اپنی کسی چڑیا کی طرح نکلی ہوئی گردن کو اسی آہستگی کے ساتھ واپس کھینچ کر ستون کے عقب میں چھپ جائے۔ یہاں تک کہ ایک وہاں سے چلا جاتا۔ اسے

میڈیم کی تفریق اور ریٹنگ سے بخوبی واقف تھا۔

”میں بھی 4th میں ہوں..... اپچی سن میں۔“ اس نے اب اپنے بارے میں چڑیا کو بتایا۔  
 ”ادہ.....“ چڑیا حیران ہوئی۔ ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ بھی کلاس فور کا اسٹوڈنٹ ہوگا اور اس نے یہ کہنے میں تامل بھی نہیں کیا۔ ایک پہلے جمل ہوا پھر بلش۔

”کتنا بڑا لگتا ہوں میں؟“ اس نے جیسے اپنے کسی خدشے کو جھٹلانے کے لیے چڑیا سے پوچھا۔  
 ”پتا نہیں لیکن تم مجھ سے بڑے لگتے ہو..... جیسے 5th، 6th اسٹینڈرڈ میں ہو۔“ چڑیا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”That,s because I,m a boy“۔ ایک نے اپنی خفت مٹانے کی کوشش میں بڑی رکھائی سے کہا۔ وہ اب چڑیا کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے پلٹ کر دوبارہ آئینے کے سامنے جا کر اپنے شینس شائس کی پریکٹس کرنے لگا تھا۔ چڑیا کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے..... لیکن اس کی موجودگی سے پوری طرح باخبر..... چڑیا دونوں ہاتھ پشت کے پیچھے باندھے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی..... اب چھپنے کی ضرورت نہیں رہی تھی..... اور کیا طمانیت محسوس کی تھی اس نے۔

”You Play Very Well۔“ چند منٹ کی خاموشی کے بعد چڑیا نے اس تک اپنی ستائش پہنچانا ضروری سمجھا۔ ریکٹ گھماتا ایک کا ہاتھ چند لمحوں کے لیے رکا۔

”Thank You“ وہ دوبارہ پریکٹس کرنے لگا۔ وہ چڑیا کی نظریں آئینے میں بھی خود پر جمی نوٹس کر رہا تھا اور اس احساس نے جیسے اس کی پریکٹس کے انہماک کو بڑھا دیا تھا۔ بیٹھے بٹھائے ایک فین مل گیا تھا۔ ..... اور یہ اپنے خاندان سے یا ہر ملنے والا اس کا پہلا فین تھا۔ اس آٹھ سالہ بچے کے لیے فوری طور پر یہ تحریف ہضم کرنا تھوڑا مشکل ہو گیا تھا۔

”تم نے کبھی کورٹ میں دیکھا ہے مجھے؟“ اس نے ایک دم چڑیا کے ساتھ گفتگو جاری رکھنا ضروری سمجھا۔  
”بڑا نظر آنے“ کا غم تھوڑی دیر کے لیے ہلکا پڑ گیا تھا۔

”روز دیکھتی ہوں جب تم کورٹ میں کھیلنے کے لیے جاتے ہو۔“ چڑیا نے روانی سے کہا۔ ایک کے سر پر چانک نمودار ہونے والے سرخاب کے یروں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا تھا۔

”میں نے کورٹ میں کبھی نہیں دیکھا تمہیں..... تم کہاں سے دیکھتی ہو مجھے کھیلتے ہوئے۔“ ایک نے بے حد لوجیکل سوال پوچھا تھا۔ اس نے واقعی اتنے دنوں میں ایک بار بھی چڑیا کو نہیں دیکھا تھا۔ اس بار بارش ہونے کی باری چڑیا کی تھی۔

”ہمارا کوارٹر ہے پیچھے..... میں وہاں سے دیکھتی ہوں۔“ وہ پہلے ہکلائی پھر اس نے گول مول انداز میں کہا۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ جھاڑیوں اور پودوں میں اپنے ساتھی بونوں کے ساتھ چھپ کر وہ سارے میچز اور بیک کی سرگرمیاں دیکھتی تھی۔

”سروئنٹ کو ارٹرز تو پیچھے ہیں اور بہت دور..... وہاں سے کیسے نظر آ جاتا ہے؟“ ایک نے حیران ہو کر کہا تھا۔ اس بار چڑیا جواب نہیں دے سکی۔

فیصلہ نہیں کرنا پڑا تھا۔ یہ کام ایک نے کیا تھا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھ آیا تھا۔ اب وہ بالکل اس کے سامنے کھڑا تھا۔ چڑیا اپنے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اپنی گردن ستون کے پیچھے سے نکالے ہوئے تھی۔ اب ایک کے بالکل سامنے آ جانے پر وہ گھٹنوں سے ہاتھ اٹھا کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ شرمندگی سی شرمندگی تھی اور کٹھا، منٹا منٹوں میں کہیں غائب ہو گئے تھے۔ .... حد تھی ویسے یہ بھی۔

”ہیلو۔“ ایک نے دوستانہ انداز میں اس کو مخاطب کرنے میں پہل کی اور چڑیا کو اس سے ہیلو سننے کی توقع نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے حیران ہو کر ایک کودیکھا پھر اس نے جواباً ہیلو کہا۔ بھاگنے کا ارادہ اس نے فی الفور ترک کر دیا تھا۔

”تم کون ہو؟“ ایک نے فوراً سے بیشتر کہا۔ چڑیا کے حلیے سے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ وہ کسی نوکر کی بیٹی ہو سکتی ہے اور کسی ملازم کے بچے میں ایک دلچسپی نہیں لے سکتا تھا۔ یہ اس کے پیرنٹس کی ہدایات تھیں۔ اس کے پیرنٹس ملازمین کو ہی فاصلے پر نہیں رکھتے تھے، ان کی فیملیز کو بھی اپنی فیملیز سے فاصلے پر رکھنے میں یقین رکھتے تھے اور ایک اسی طرح کی ویلیوز کے ساتھ پروان چڑھاتا تھا۔

چڑیا کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اپنا تعارف کیسے کروائے۔ ”میرے نانا لگ ہیں۔“ چند لمحے الجھ کر اس نے بالآخر کہا۔  
 ”اوہ خیر دین۔“ ایک نے بے ساختہ کہا۔ چڑیا کو اس کے منہ سے یوں اپنے نانا کا نام اچھا نہیں لگا تھا۔  
 خیر دین کو دوسرے ملازمین چاچا کہتے تھے اور آفیسر زمام سے پکارتے تھے لیکن اس نے آج تک کسی بچے کو  
 خیر دین کا نام لیتے نہیں سنا تھا۔

”چا چا خیر دین۔“ اس نے جیسے برا منا کر ایک کو جتنا نے والے انداز میں بتایا۔ ایک نے اس کی ہنسی نوٹس نہیں کی تھی۔ چڑیا میں اس کی دلچسپی فوری طور پر کم ہوئی تھی۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ ایک نے ریکٹ کھماتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ وہاں کیا کر رہی تھی، یہ تو چڑیا ایک کو مر کر بھی نہیں بتا سکتی تھی۔ وہ خاموش نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے؟“ ایک نے اسے ڈانٹا۔  
 ”میں یہ مرد دیکھنے آئی تھی۔“ چڑبانے لے ساختہ کہا۔ ایک نے حیرانی سے ہلٹ کر مرر کو دیکھا۔

”سہ پسند ہے مجھے۔“ جواب سادہ تھا لیکن اسے ایک پھر بھی حیران ہوا تھا۔

”کیا کرتی ہو تم؟“ ایک نے جواباً اس سے پوچھا۔  
 ”پڑھتی ہوں۔“

”نکس کلاس میں؟“  
 ”4th“

”کس اسکول میں؟“ اور اسکول کے نام نے ایک کو چند لمحوں کے لیے کچھ سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ نوکروں کے بچے کانونٹ میں نہیں پڑھتے تھے اور چڑیا پڑھ رہی تھی۔ اس کی اپنی بہن بھی ایک کانونٹ اسکول میں ہی تھی۔ ایک بچہ ہونے کے باوجود وہ ایک ”اچھے“ اور ”برے“ اسکول کا فرق جانتا تھا۔۔۔ اردو مسٹیم اور انگلش

”تم کہیں اور سے دیکھتی ہو۔“ ایک نے پورے یقین سے کہا۔ ”اور چھپ کر۔“ چڑیا کا چہرہ رنگین ہو گیا۔۔۔۔۔ اسے اندازہ نہیں تھا ایک کا اگلا اندازہ یہ ہو گا۔ وہ چیس کے Knight کی چال تھی۔۔۔۔۔ سیدھے سے ایسی۔۔۔۔۔ بے حد اچانک۔۔۔۔۔ اور بظاہر سادہ پر انتہائی کاری۔۔۔۔۔ اور چیس کا Knight چڑیا کا پسندیدہ ترین مہرہ تھا۔۔۔۔۔ کوئین کے بعد۔۔۔۔۔ خیر دین کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ سب سے پہلے خیر دین کے Knight پکڑنے کی کوشش کرتی تھی۔۔۔۔۔ باقی مہروں سے اس کو نہ اتنا شغف تھا نہ خوف۔۔۔۔۔ لیکن Knight سے اس کی عجیب۔۔۔۔۔ Love - Hate Relationship تھی۔۔۔۔۔ تو اس دن چڑیا نے ایک کو چیس کا Knight بنا لیا تھا۔

”کہاں سے چھپ کر دیکھتی ہو؟“ Knight نے ایک اور مہلک چال چلی۔

”تمہیں دیکھ کر۔“ چڑیا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔



وہ اب پلٹ کر اس دروازے کے باہر لگے ہوئے بولٹ کو چڑھا کر تالا بند کر رہا تھا۔  
”مجھے آپ ریٹر نے جگا یا ہے..... اس کمرے میں لائٹ دیکھ کر انٹرکام کر رہے تھے وہ تمہیں۔“ شہر بانو نے اسے اطلاع دی۔

”اوہ..... مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ اوپر والے فلور پر چانک لائٹس دیکھ کر.....“ شیردل بات کرتے کرتے رک گیا۔ وہ شہر بانو کو اس کی نیند کے دوران ہونے والے کسی واقعے کے بارے میں کوئی کلیو نہیں دینا چاہتا تھا۔  
”ایسی کسی پجوشن میں تمہیں گارڈ کو بلا کر اسے اوپر بھیجنا چاہیے تھا، تم بے وقوفوں کی طرح خود اوپر آ گئیں۔“ اس کے ساتھ میٹریاں اترتے ہوئے شیردل نے اسے ڈانٹا۔  
”لیکن تم اوپر آئے کیوں تھے؟“ شہر بانو نے اس کی ڈانٹ کا برا منائے بغیر کہا۔

”کام تھا کوئی یار۔“ شیردل نے اس کے ماتھے، چہرے پر بکھرے بالوں کو ہٹاتے ہوئے اسے ایک بار پھر ڈالا۔  
ہال کمرے سے باہر نکلتے ہی شیردل نے بھی برآمدے نما کاریڈور کی کھڑکیوں سے باہر اکٹھے ہوئے گارڈز کو دیکھ لیا تھا۔

”تم بیڈروم میں جاؤ، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“ وہ شہر بانو سے کہتے ہوئے خود بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شہر بانو اپنے بیڈروم میں آ گئی۔ مثال اسی طرح اپنے بستر میں گہری نیند سو رہی تھی۔ شہر بانو کو بیڈروم میں آ کر پہلی بار سردی کا احساس ہوا تھا۔ وہ ننگے پاؤں اوپر تک پھر آئی تھی۔ وہ کبل ہٹاتے ہوئے دوبارہ بستر میں گھس گئی۔ بستر میں چپتے لیٹے وہ کچھ دیر تک شیردل کا انتظار کرتی رہی..... اسے نیند آرہی تھی لیکن وہ شیردل کو واپس کمرے میں موجود دیکھے بغیر سونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ شیردل تقریباً پندرہ بیس منٹ کے بعد واپس آیا..... اور وہ تب بھی جاگ رہی تھی۔

”سو جاؤ یار..... کیوں جاگ رہی ہو؟“ شیردل نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اسے جاگتے دیکھ کر کہا۔  
”تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“ شہر بانو نے کچھ مطمئن انداز میں جما ہی لیتے ہوئے کہا۔

”میں واپس آ گیا ہوں..... تم سو جاؤ۔“ شیردل نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ وہ اب سائڈ ٹیبل پر پڑا اپنا لائٹر اور سگریٹ پیک اٹھا رہا تھا۔ شہر بانو آنکھیں بند کیے چند لمحے جیسے اس کے بستر پر لیٹنے کا انتظار کرتی رہی پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ بیڈ سائڈ ٹیبل لیمپ کو آف کر رہا تھا لیکن بستر میں نہیں تھا۔  
”تم کہاں جا رہے ہو اب؟“ شہر بانو نے کچھ ہڑبڑا کر کہا۔

”میں مثال کے بیڈروم میں ہوں ایک دو سگریٹ پی کر واپس آ جاؤں گا۔“ شیردل نے دھیمی آواز میں اس سے کہا اور برابر والے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شہر بانو نے کچھ الجھ کر کمرے کی نیم تاریکی میں اس کے ہیولے کو برابر والے کمرے میں غائب ہوتے دیکھا۔ وہ کیوں سو نہیں پارہا تھا، وہ سمجھ نہیں پائی تھی اور وہ آدھی رات کو کس کام سے اوپر والی منزل پر گیا تھا وہ اس سے یہ بھی پوچھ نہیں پائی تھی..... وہ بہت دیر تک آنکھیں کھلی نہیں رکھ پائی۔

برابر والے کمرے میں شیردل بیٹھا ایک کے بعد ایک سگریٹ پی رہا تھا۔ بہت زیادہ تھکن ہونے کے باوجود نیند اب بھی اس سے کوسوں دور تھی اور جو کچھ وہ اوپر والے بیڈروم میں دیکھ آیا تھا اس کے بعد اسے نیند

آ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ گھر کسی نہ کسی حد تک Haunted تھا اسے اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا لیکن وہ صرف یہ جانتا چاہتا تھا کہ یہ اثرات کس حد تک تھے..... اور کیا اس سے اس کی فیملی کے متاثر ہونے کے امکانات تھے؟ کسی آسیب زدہ گھر میں اپنی بیوی اور کم سن بیٹی کورات کے وقت اکیلے چھوڑنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا..... اس کی فرض شناسی اور دلیری اس ایک چیز پر آخر ختم ہو جاتی تھی اور صرف اسی کی نہیں کسی بھی آفسر کی ہو جاتی..... وہ یہ نہیں کر سکتا تھا کہ شام ہوتے ہی ہر روز گھر بھاگ آتا۔ کئی بار اسے گھر آ کر رات کو پھر آفس جانا پڑتا تھا..... اور کئی بار وہ آج رات کی طرح کسی وزٹ سے رات گئے واپس آتا..... اور کئی بار وہ چند دنوں کے لیے کسی نہ کسی کام سے گھر سے غیر حاضر بھی ہوتا۔ وہ اس غیر حاضری کے دوران اپنی فیملی کو لاہور اپنے پیرنٹس کے پاس بھجوا سکتا تھا لیکن وہ روزمرہ امور کی انجام دہی کے دوران ہونے والی تاخیر کا کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن اب سوال یہ تھا کہ وہ کرے کیا۔ اس کا سر بری طرح چکرایا ہوا تھا۔

☆☆☆

”سر، آپ پریشان نہ ہوں۔“ خانساں نے شیردل کو تسلی دی۔ اگلے دن ایک اینڈ تھا اور شیردل نے کچھ دیر پہلے ناشتے کے بعد خانساں کو اپنی اسٹڈی میں بلوایا تھا۔ وہ اب اس گھر کے بارے میں اس سے تفصیلی بات چیت کرنا چاہتا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ گفتگو کا آغاز کرنا خانساں نے خود ہی بات کا آغاز کر دیا تھا۔ رات کے واقعات صبح ہونے تک تمام ملازمین کے علم میں آ چکے تھے اور شیردل کو اس پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ کیئر ٹیکر اور لوئر اسٹاف کی نیٹ ورکنگ آفسرز کی نیٹ ورکنگ سے کہیں زیادہ موثر اور تیز ہوتی ہے۔

”یہ دروازے وغیرہ کھل جانا تو عام چیز ہے اس گھر میں اور آج تک اس سے کبھی کوئی نقصان نہیں ہوا۔“ وہ اب شیردل کو بتا رہا تھا۔ ”بلکہ آج تک اس گھر میں کبھی کوئی نقصان نہیں ہوا کسی بھی صاحب کا، بس چھوٹی موٹی چیزیں غائب ہو جاتی ہیں..... کبھی کبھار کچھ آوازیں آنے لگتی ہیں۔ دروازے خود ہی بند اور کھلتے رہتے ہیں اور کبھی کبھار گھر میں پڑی مشینیں خود ہی چل پڑتی ہیں بس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔“ خانساں اسے تفصیل سے بتا رہا تھا۔

”ابھی “یہ” بس ہے؟“ شیردل نے ڈپٹے والے انداز میں کہا۔ ”میری بیوی نے اگر ایک بھی چیز دیکھ لی ان میں سے ہوتے ہوئے تو وہ زندگی میں دوبارہ اس گھر میں قدم نہیں رکھے گی۔“ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھ سے پہلے والے آفسر کے ساتھ بھی ہوا تھا یہ سب کچھ؟“ شیردل نے اچانک پوچھا۔

”سب کے ساتھ ہوتا ہے جو بھی آ کر یہاں رہتا ہے لیکن آہستہ آہستہ سب کو عادت ہو جاتی ہے، میں نے آپ کو بتایا کہ یہاں آج تک کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔“ خانساں نے اس کو تسلی دینے کی کوشش کی۔  
”شہر بانو کو کل رات کے واقعات کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔“ شیردل نے اسے تحکمانہ انداز میں کہا۔

”جی سر۔“

”اور گھر میں قرآن خوانی کا انتظام کرواؤ..... کسی مسجد یا مدرسے سے مولوی صاحب اور طلبہ کو بلواؤ ختم قرآن کے لیے۔“ شیردل نے مزید ہدایات دیں۔ اسے یہ ہدایت دیتے ہوئے حیرانی ہوئی کہ اسے پہلے اس

چیز کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ خانساں کو ہدایات دے کر فارغ کرنے کے بعد اس نے آپریٹر سے اس گھر سے پوسٹ آؤٹ ہونے والے آفیسر سے رابطہ کر دینے کا کہا تھا۔ وہ خانساں کی تسلیوں سے مطمئن نہیں ہوا تھا لیکن وہاں اس سے پہلے پوسٹر رہنے والے آفیسر کا بیان بھی خانساں کے بیان سے مختلف نہیں تھا۔ اس گھر میں کچھ اثرات تھے لیکن وہاں رہنے والے ہر آفیسر کے لیے وہ قابل قبول تھے۔ شیردل کچھ مطمئن ہونے لگا۔ اس نے ایک کے بعد ایک کتنے ہی آفیسرز کو کال کی تھی۔ ان سے سوال و جواب کرتے ہوئے اسے ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہیں آیا کہ وہ ان سے یہ پوچھتا کہ اس گھر میں رہائش کا ان کی ازدواجی زندگی پر کیا اثر پڑا تھا۔ نہ ہی اس نے یہ چیک کرنے کی کوشش کی کہ ان میں سے کتنے ابھی تک اپنی پہلی شادی نبھارہے ہیں اور کتنے لائف پارٹنر تبدیل کرچکے ہیں اگر وہ یہ تحقیق کر لیتا تو اسے پتا چل جاتا کہ اس گھر میں رہنے والے تمام آفیسرز.....

”شیردل تم ویک اینڈ بھی کام کرتے گزارو گے؟“ شہر بانو نے اسٹڈی میں داخل ہو کر شیردل کا انہماک توڑا۔ شیردل نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریسیور واپس رکھ دیا۔ وہ آپریٹر کو ایک اور آفیسر سے رابطے کا کہتے کہتے رک گیا تھا۔

”بس ختم ہو گیا ہے کام۔“ اس نے مسکراتے ہوئے شہر بانو سے کہا۔ یہ اس کے گھر کا ایک Unsaid rule تھا کہ ویک اینڈ پر کام نہیں ہوتا تھا لیکن وہ کئی بار یہ Rule توڑتا آ رہا تھا اور اس میں اس کی اپنی نیت سے زیادہ ملکی حالات کا قصور تھا۔ شہر بانو اس کی پروفیشنل مجبوریوں اور مصروفیات سے واقف ہونے کے باوجود اس ایک چیز کو بے حد ناپسند کرتی تھی۔ وہ خود حتی المقدور اس لائف اسٹائل سے بچتی آرہی تھی جو ایک انتظامی آفیسر کی بیوی کا ہو جاتا تھا۔ ڈپٹی کمشنر کے طور پر یہ شیردل کی پہلی پوسٹنگ تھی اور شہر بانو اب بھی بڑی محدود سوشل سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھی۔ اسے ایک عام ڈپٹی کمشنر کی بیوی کی طرح اسکولز اور کالجز کے فنکشنز میں مہمان خصوصی بن کر جانے، فیتے کاٹنے اور بے مقصد تقریریں کرنے میں دلچسپی نہیں تھی۔ نہ وہ مزاج ایسی بھی نہ شیردل اس کا ایسا سوشل پروفائل چاہتا تھا کہ جس میں گھر آنے پر اسے وہ نظر نہ آتی۔ اس کے باوجود پہلے کی نسبت اب شہر بانو کو بہت سے ایسے فنکشنز میں جانا پڑتا تھا جہاں پر انتظامی آفیسر کی بیوی کی موجودگی ناگزیر تھی۔

”کیا پروگرام ہے آج کے لیے؟“ شیردل نے اس سے پوچھا۔ پچھلے تین ویک اینڈز سے وہ اتنا مصروف تھا کہ کسی ذاتی سیر و تفریح کے پروگرام پر عملی جامہ پہنانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ایک آدھ بار ویک اینڈ پر انہوں نے باہر کھانا کھایا تھا اور شہر بانو کے لیے شیردل کے ساتھ اتنا وقت گزارنا بھی غنیمت تھا۔ آج تین ہفتوں کے بعد شہر بانو نے کہیں جا کر دن گزارنے کا پروگرام بنایا تھا اور شیردل پھر صبح سے اسٹڈی میں بند تھا۔

”تم فارغ ہوئے تو کوئی پروگرام بنے گا۔“ شہر بانو نے شکایت کیا۔

”Im totally free now۔“ شیردل نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کرسی کھسکاتے ہوئے کہا۔ وہ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ”مثال کہاں ہے؟“

”باہر Swings پر ہے۔“ شیردل رات کو کیا ہوا تھا؟“ شہر بانو نے اسے بتاتے ہوئے سوال کیا۔

”کیا ہوا تھا؟“ شیردل نے جواباً پوچھا۔

”تم اوپر اس کمرے میں کیوں گئے تھے؟“ شہر بانو نے گفتگو کا سلسلہ پچھلی رات سے جوڑنے کی کوشش کی۔

”میں سوچ رہا ہوں اس کمرے کو بند نہ رکھا جائے، میں اپنی اسٹڈی وہاں شفٹ کرنے کا سوچ رہا

ہوں۔“ شیردل نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے کہا۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے، تم اب روزرات کو اس کمرے میں جا کر بیٹھا کرو گے۔“ شہر بانو نے بے اختیار تلملا کر کہا۔

”کیا حرج ہے؟“ وہ مسکرایا۔

”تم نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کمرہ بند ہی رہے گا۔“ شہر بانو نے جیسے اسے یاد دلایا۔

”میں نے کل کہیں پڑھا ہے کہ جن جگہوں پر اثرات ہوں انہیں دیران اور غیر آباد نہیں رکھنا چاہیے۔“ شیردل نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”اوہ، ریکلی.....“ شہر بانو نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”اور اس کمرے کو آباد کرنے کے لیے تم اپنی خدمات پیش کر رہے ہو..... واہ کیا بات ہے، اس سے وہاں اثرات ختم ہو جائیں گے؟ شیردل تم واقعی احمق ہو یا اس گھر میں آ کر ہو گئے ہو؟“ شیردل کا دل بے ساختہ چاہتا تھا وہ کہے کہ اس گھر میں آ کر ہو گیا ہوں۔ پچھلی رات اگلی کئی راتوں تک اسے یاد رہنے والی تھی۔ خاص طور پر اس کمرے میں دیکھا جانے والا مثال کا وہ ٹیڈی جسے بری طرح ادھیڑ دیا گیا تھا۔

☆☆☆

”کیا کر رہی ہو چڑیا؟“ خیر دین سوتے سے اٹھ کر باہر آ گیا تھا۔ چڑیا نے اسے باہر آتے نہیں دیکھا وہ ایک دم اس کی آواز سن کر ڈر گئی تھی۔

”کچھ نہیں نانا، میں ٹینس کی پریکٹس کر رہی ہوں۔“ چڑیا نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ تختی کے ساتھ گیند کو ارٹر کی بیرونی دیوار پر مار مار کر ٹینس کھیلنے کی کوشش کر رہی تھی اور خیر دین اسی آواز سے جاگا تھا۔

”تم نے وقت دیکھا ہے؟“ خیر دین نے تختی کے ساتھ اس سے کہا۔ آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ پتا نہیں چڑیا کب اٹھی تھی اور کب گیند اور تختی لے کر باہر آ گئی تھی۔ کو ارٹر کے سامنے دس فٹ لمبا ایک ٹھن تھا جس کے ایک حصے میں ایک بچن ہاتھ روم اور دوسرے میں ایک چار پائی بڑی رہتی تھی۔ اس ٹھن کے گرد چھ فٹ اونچی چار دیواری تھی اور اب اسی چار دیواری کے اندر ٹھن میں جلتے بلب کی روشنی میں چڑیا پریکٹس میں مصروف تھی۔ وہ اگلے دن ایک کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ اسے کھیل کی الف بے بھی نہیں آتی..... وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے بچوں کی جس دنیا میں والٹڈ کارڈ انٹری ملی تھی، وہ موقع اس سے چھن جائے۔ بچکانا سوچ تھی اور بچکانا ہی کوشش تھی لیکن صرف لگن تھی جو بچکانا نہیں تھی۔

”نانا ابا آپ سو جائیں میں ابھی آ کر سو جاؤں گی۔“ اس نے گیند کو ایک اور ہٹ کرتے ہوئے خیر دین سے کہا۔ تختی کے ساتھ ٹینس بال کو ہٹ کر نائے حد مشکل کام تھا۔ نہ وہ ہموار طریقے سے تختی پر لگ کر اچھل رہی تھی اور نہ ہی دیوار سے لگنے کے بعد ٹھیک سے تختی پر آرہی تھی لیکن چڑیا کوشش ترک کرنے پر تیار نہیں تھی.....

یہ ایک کے ساتھ پہلے پریکٹس سیشن کی تیاری تھی۔

”بیٹا صبح کھیلنا..... ابھی بہت رات ہوگئی ہے۔“ خیر دین نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”نہیں نانا مجھے ابھی کھیلنا ہے۔“ وہ نہیں مانتی تھی۔ خیر دین چند لمحوں میں ہی ہار مان کر اندر واپس سونے چلا گیا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد بالآخر تختی ٹوٹ گئی تھی۔ مایوسی اور صدمے سے چڑیا کا برا حال ہو گیا..... کھیلنے

چلا گیا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد بالآخر تختی ٹوٹ گئی تھی۔ مایوسی اور صدمے سے چڑیا کا برا حال ہو گیا..... کھیلنے

کے لیے اب اور کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ وہ بے حد رنجیدہ کوارٹر میں سونے لگی اور نیند کی وادی میں بھی وہ اس رات ٹینس ہی کھیلتی رہی تھی۔

”ریکٹ پکڑنا آتا ہے نا؟“ اگلی سہ پہر ایک نے کورٹ پر اسے ریکٹ پکڑاتے ہوئے پوچھا۔  
 ”ہاں۔“ چڑیا نے بڑے اعتماد سے ریکٹ پکڑ لیا۔

”تو پھر ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں تمہارے؟“ ایک نے اس کے ہاتھوں کی Grip کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ چڑیا اسے کیا بتاتی کہ وہ ایکساٹمنٹ کی وجہ سے تھا۔ وہ ریکٹ جسے ہاتھ لگانے کے لیے وہ کئی مہینوں سے ترس رہی تھی اب اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس سے کھیلنے جا رہی تھی۔

”اس طرح نہیں..... یہاں سے پکڑتے ہیں۔“ ایک نے ریکٹ پر اس کے ہاتھوں کی پوزیشن کو ٹھیک کیا۔ چڑیا نے میکینیکل انداز میں اس کی ہدایات کے مطابق اپنے ہاتھ کی پوزیشن تبدیل کی۔

اس دن وہ دونوں ایک گھنٹے کھیلتے رہے اور ایک گھنٹے کے اختتام پر چڑیا کی Serve جو شروع میں Net کے دوسری طرف جا ہی نہیں رہی تھی وہ اب دوسرے کورٹ تک پہنچنے لگی تھی۔ ایک کسی ایکسپرٹ کوچ کی طرح اسے ٹینس سکھا اور کھلا رہا تھا، یہ اندازہ تو اسے بھی بخوبی ہو گیا تھا کہ چڑیا کی ٹینس پریکٹس اور ٹالج واقعی صرف دیکھنے تک ہی محدود تھی لیکن وہ بہت اسمارٹ تھی اس کا اندازہ ایک کو ہو گیا تھا۔

”you are a quick learner“ اس نے اپنی ستائش کھیل کے دوران ہی چڑیا تک پہنچا دی تھی۔ ایک کی ستائش چڑیا کے لیے بہت معنی رکھتی تھی۔ کھیل میں اس کی لگن اور انہماک کچھ اور بڑھ گیا تھا، ایک گھنٹے میں انہوں نے صرف ٹینس نہیں کھیلی تھی انہوں نے بہت ساری باتیں بھی کی تھیں۔ ایک اس کی کمپنی انجوائے کر رہا تھا۔ وہ باتوں کا اور وہ بہت اچھی سمجھتی تھی۔ عام بچوں کے برعکس وہ زیادہ باتیں نہیں کرتی تھی لیکن دلچسپ باتیں کرتی تھی اور ایک کو وہ ”لڑکی“ نہیں لگی تھی۔ وہ Silly Loud, Talkative, Goofy گریز جن سے اس کی جان جاتی تھی جو ہر بات میں رونے بیٹھ جاتی تھیں یا پھر جھگڑا کرنے..... چڑیا کے ساتھ وہ اس طرح اور اسی قسم کی باتیں کر رہا تھا جو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کرتا تھا..... All the boy talk اور چڑیا اس کی باتوں کو سمجھ رہی تھی جواب دے رہی تھی۔ تبصرہ کر رہی تھی اور اختلاف کر رہی تھی..... اور یہ صرف آغاز تھا..... ان کی دوستی کا، ان کی پارٹنرشپ کا..... ان کی Compatability اور Understanding کا۔ وہ دونوں عجیب طریقے سے ایک دوسرے کے قریب ہوئے تھے۔

ایک گھنٹا آنے والے دنوں میں کئی گھنٹوں میں بدلتا چلا گیا اور ٹینس کورٹ کے علاوہ بھی اب وہ دونوں بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے تھے۔ ایک نے اسے بتایا تھا کہ وہ ٹینس پلیئر بننا چاہتا ہے لیکن ساتھ سول سروس بھی جوائن کرے گا کیونکہ اس کے فادر سول سرونٹ تھے اور اسے یہی بننا چاہتے تھے اور وہ باہر جا کر Plane اڑانا بھی سیکھے گا اور کسی باہر کی یونیورسٹی سے پڑھے گا..... Most probably harvard کیونکہ اس کے فادر بھی وہاں سے پڑھے تھے..... اس نے اس کے علاوہ بھی اپنے تمام عزائم اور ارادے چڑیا کو بتائے تھے۔ جن میں ایک پولو پلیئر بننا، پیانو سیکھنا اور نو بل پرائز جیتنا بھی شامل تھا لیکن وہ کس فیلڈ میں نو بل پرائز جیتنا چاہتا تھا یہ بھی اس نے طے نہیں کیا تھا۔

چڑیا نے اسے بتایا تھا کہ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے اور ڈاکٹر ہی بنے گی۔  
 ”اور؟“ ایک نے اسے خاموش ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

”اور کچھ بھی نہیں بس ڈاکٹر۔“ چڑیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بس صرف ڈاکٹر بنو گی تم..... اور کچھ بھی نہیں..... کوئی اور کام نہیں کرو گی..... کوئی اور پلان نہیں تمہارا۔“ ایک کو جیسے یقین نہیں آیا تھا کہ چڑیا ایسی بات کر سکتی تھی۔ وہ پہلی لڑکیوں والی بات تھی جو اس نے چڑیا کے منہ سے سنی تھی۔ Typical پروفیشن اور بس ایک ہی کام۔

”اتنی لمبی زندگی میں تم بس ایک کام کرو گی؟“ ایک نے جیسے اس کا مذاق اڑا کر اسے Motivate کرنے کی کوشش کی۔

”میرے نانا کہتے ہیں ایک وقت میں ایک ہی کام کرنا چاہیے۔ اس طرح کام آسان بھی ہو جاتا ہے اور اچھا بھی ہوتا ہے۔“ چڑیا نے خیر دین کا گرا ایک کو کسی طوطے کی طرح سادہ لہجے میں بتایا۔

”I don't agree with your nana“ ایک نے سر جھٹک کر کہا۔ ”زندگی تو بڑی چھوٹی ہوتی ہے ایک وقت میں ایک کام کریں گے تو پھر تو زندگی میں تھوڑے سے کام ہوں گے بس۔“ چڑیا نے بغور اس کی بات سنی۔ ”تم بس ڈاکٹر بننے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرنا چاہتیں؟“ ایک نے اس سے پوچھا۔

”کرنا چاہتی ہوں۔“ چڑیا نے کہا۔  
 ”کیا کرنا چاہتی ہو اور؟“ ایک نے دلچسپی لی۔

”میں دنیا کی سیر کرنا چاہتی ہوں۔“  
 ”Me too۔“ ایک بے اختیار چلایا۔ ”یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا تھا۔“ چڑیا مسکرائی۔

”اور میں امی اور نانا کے لیے ایک گھر بنانا چاہتی ہوں..... بڑا اور خوب صورت۔“  
 ”اور؟“

”اور میں ایک سنگر بھی بننا چاہتی ہوں۔“  
 ”تمہیں گانا آتا ہے؟“ ایک نے یک دم اس سے پوچھا۔ چڑیا ہنسنے لگی لیکن اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ریلی؟“ ایک کو جیسے یقین نہیں آیا۔  
 ”لیں۔“

”اچھا، کل میں اپنا کی بورڈ لاؤں گا تم گانا۔“ وہ خوش ہوا۔  
 ”اوکے۔“ چڑیا نے بھی ایکساٹنڈ انداز میں سر ہلایا۔

”اور کیا کرنا چاہتی ہو تم؟“ ایک نے مزید پوچھا۔  
 ”اور میں ایک کھیل بنانا چاہتی ہوں چیس کی طرح کا۔ جس میں کوئین ہی کنگ ہو۔“ ایک اس بار پھر چونکا۔

”یہ کیا بات ہوئی“  
 ”ہاں تو جب کنگ اتنا ایک ہے تو پھر وہ کنگ کیسے ہو سکتا ہے..... کوئین پاؤنٹل ہے تو کوئین کو کنگ بنا دینا چاہیے۔“ چڑیا نے اپنا Argument پیش کیا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“ ایک بالکل متفق نہیں ہوا۔ ”کنگ، کنگ ہوتا ہے اور کونین، کونین۔“  
 ”لیکن کونین بھی تو کنگ بن سکتی ہے نا!“

”At least not in chess“ ایک نے حتی انداز میں کہا۔ ”تمہیں کوچیس کھیلنا آتا ہے؟“  
 ایک نے ساتھ ہی اس سے اگلا سوال کیا۔ چڑیا نے سر ہلا دیا۔  
 ”جیسے تم کوٹینس کھیلنا آتا تھا۔“ ایک نے اس کا مذاق اڑایا۔ چڑیا سرخ ہو گئی۔  
 ”نہیں، چوس واقعی کھیلنا آتا ہے۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔  
 ”Favourite piece کون سا ہے تمہارا؟“ ایک نے پوچھا۔  
 ”کونین کے بعد Horse۔“ چڑیا نے بے ساختہ کہا۔

”ہیں، یہ Horse کون سا Piece ہے؟“ ایک ایک لمحے کے لیے ہکا بکا رہ گیا۔ ”تم Knight کو horse کہہ رہی ہو۔“ اس نے چڑیا کو تقریباً ڈانٹ دیا۔  
 ”میں Horse ہی کہتی ہوں ہمیشہ۔“ چڑیا نے کچھ شرمندگی سے کہا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس چیس Piece کا نام نہیں جانتی تھی لیکن وہ اس Horse Piece کہنے کی عادی تھی۔  
 ”لیکن نہیں کہنا چاہیے نا Horse اور Knight میں تو بڑا ڈیفرنس ہوتا ہے۔“  
 ”کیا ڈیفرنس ہوتا ہے؟“ چڑیا نے دلچسپی سے پوچھا۔

”Horse تو ایک Animal ہوتا ہے لیکن Knight تو ایک Soldier ہوتا ہے۔ Daring، Powerful، Strong، Brave..... وہ سنگل Handedly wars لڑا اور Win کر سکتا ہے کنگ کے لیے اور گھوڑا تو بس گھوڑا ہوتا ہے۔“ ایک نے اپنے لحاظ سے دونوں مہروں کی تعریف کی۔  
 ”میرا فورٹ چیس میں ویسے صرف کونین ہے۔“ ایک نے بے ساختہ کہا۔  
 ”Knight بھی کونین کی طرح پاورفل ہے۔“ چڑیا نے اس کی تشریح سننے کے بعد تبصرہ کیا۔  
 ”کونین کی طرح کوئی نہیں۔ کونین، کونین ہوتی ہے۔“ ایک نے اپنا فیصلہ دیا۔ ”اور اس کو Knight کی طرح کا کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ نہ Wars لڑنی پڑتی ہیں۔ نہ Sword سے Fight کرنی پڑتی ہے۔ نہ ہارس رائڈنگ کرنی پڑتی ہے۔“ But she is still powerful ایک اسے سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔

”اور ایسا کیوں ہے؟“ چڑیا نے بے ساختہ پوچھا۔ ایک ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑا۔

”Because she is the king's wife and king loves her“ ایک نے روانی میں کہا۔ چڑیا حیرانی سے ایک کا منہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔ Love کا لفظ اس کی Vocabulary میں موجود تھا لیکن ایک دوسرے مفہوم کے ساتھ..... جو فیملنگز وہ اپنے نانا، ماں، لونوں اور کتا بولوں اور اسکول اور کھلونوں کے لیے رکھتی تھی۔ وہ اس کے نزدیک Love تھا۔ اس نے فیری ٹیلز میں بھی شہزادوں اور شہزادیوں، بادشاہوں اور ملکاؤں کے درمیان محبت کا لفظ پڑھا اور سنا تھا مگر وہاں بھی اس لفظ نے اس سے کوئی مفہوم کوئی چہرہ نہیں دکھایا تھا۔ ایک کی Interpretation نے پہلی بار اسے اس لفظ کی طرف متوجہ کیا

تھا۔ کونین پاورفل اس لیے ہوتی ہے کیونکہ وہ King کی وائف ہوتی ہے اور کنگ اس سے محبت کرتا ہے۔ اس نے چند لمحوں کے لیے ایک کے بیان کو اپنے لفظوں میں ڈھراتے ہوئے اس پر غور کیا لیکن سوال اب بھی یہ تھا کہ King خود کیوں اتنا ویک تھا اور اس نے یہ بات ایک سے پوچھ بھی لی تھی۔ ایک خود بھی چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ چیس کھیلتے ہوئے آج تک اس نے ان مہروں اور ان کی پاورز کے بارے میں اتنا تھوڑی سوچا تھا جتنا چڑیا سوچتی رہتی تھی۔  
 ”مجھے لگتا ہے کنگ نے اپنی ساری پاورز کونین کو دے دیں اس لیے وہ پھر خود ویک ہو گیا۔“ ایک نے چند لمحوں کے غور و خوض کے بعد نتیجہ نکالا۔

”ہاں، پر کیوں دیں پاورز۔“ چڑیا نے اعتراض کیا۔  
 ”مجھے لگتا ہے وہ کونین سے بہت پیار کرنا ہوگا..... اس لیے دی ہوں گی۔ جیسے میرے پاپا میری مٹی سے بہت پیار کرتے ہیں تو سارا گھر مٹی چلاتی ہیں..... سارے پیسے بھی ان کے پاس ہوتے ہیں..... ساری چیزیں بھی وہ لاتی ہیں..... سارے سرڈنس سے بھی وہی بات کرتی ہیں۔“ ایک اپنی طرف سے بڑی دور کی کوڑی لایا تھا..... چڑیا اس لو جیک کو نہیں سمجھ سکتی تھی اس نے باپ نہیں دیکھا تھا نہ ماں کو ایک کونین کی طرح پاورفل دیکھا تھا، اس نے صرف خیر دین دیکھا تھا ہر ذمے داری نبھاتا ہوا..... اس نے ایک سے مزید سوال جواب نہیں کیے تھے۔ اس کا عزم برقرار تھا۔ اگر کونین سب سے پاورفل تو پھر بورڈ کونین کا..... لیکن ایسا کون سا کھیل بن سکتا تھا جس میں یہ ہو پاتا یہ اس نے سنے نہیں کیا تھا۔

”کسی دن کھیلیں گے چیس بھی..... میرے پاس بورڈ ہے نہیں..... لیکن انکل کے پاس ہے ایک Magnetic chess..... انکل سے مانگوں گا۔“ ایک نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔  
 ”میرے پاس ہے ایک چیس بورڈ۔“ چڑیا نے جلدی سے بے حد ایکساٹنڈ انداز میں کہا۔ کم از کم اس کے پاس کچھ تو تھا جو وہ ایک کو آفر کر سکتی تھی۔  
 ”اچھا، پھر کل لے کر آنا۔“ ایک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

کم از کم چیس وہ کھیل نہیں تھا جس میں ایک کے ساتھ کھیلنے سے پہلے چڑیا کو پریکٹس کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اگر ایک پانچ سال کی عمر سے ٹینس کھیل رہا تھا تو چڑیا اسی عمر سے خیر دین کے ساتھ چیس بورڈ پر مہروں کو اکھاڑتی، پچھاڑتی آرہی تھی۔ خیر دین نے کئی سالوں سے اکیلے کھیلتے کھیلتے پچھلے تین سالوں سے اکیلے کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ جب بھی بورڈ لے کر بیٹھتا..... چڑیا میکا کی انداز میں آکر پاس بیٹھ جاتی۔ بورڈ پر مہرے سجانا اس کی پسندیدہ سرگرمیوں میں سے ایک تھا اور مہرے سجاتے سجاتے وہ ان مہروں کی اکھاڑ پچھاڑ میں بھی شریک ہو گئی تھی۔ اس نے خیر دین کو پہلی بازی ایک سال کھیلتے رہنے کے بعد ہرائی تھی۔ خیر دین اسے اتفاق سمجھا تھا اور ہار کا سبب اس نے اپنی بے دھیانی کو قرار دیا تھا لیکن پھر ہر تیسرے چوتھے دن ایسا ہونے لگا تھا کہ چڑیا چیک میٹ کی پوزیشن میں آ جاتی اور خیر دین کو اپنا بادشاہ بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا پڑتے..... اور اب تین سال بعد خیر دین اس کے ساتھ کھیلتے ہوئے اسی طرح محتاط اور مستعد رہتا تھا جس طرح اپنے کسی ہم عمر کے ساتھ کھیلتے ہوئے۔ جیت کا تناسب اب بھی خیر دین کے حق میں تھا لیکن ایک آٹھ سال کی بچی سے بھی

کھار ہارنا بھی بڑا کٹھن کام تھا اور خاص طور پر اس بچی سے جس کو آپ نے خود کھیل سکھایا ہو۔ چڑیا سے ہار کے سارے لمحات خیر دین کے لیے فخر کے لمحات تھے، اپنی اگلی نسل سے ہارنا ہر ایک کو اچھا لگتا ہے۔  
چڑیا اگلے دن اپنا وہ ڈبائے کرایک کے پاس پہنچ گئی تھی جس میں ایک سستا پلاسٹک کے مہروں والا چیس بورڈ تھا۔

”You know chirya“ چیس مجھ کو کیوں زیادہ اچھی نہیں لگتی۔“ ایک نے اسے بورڈ پر مہرے سجاتے دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”کیوں؟“ چڑیا ٹھنکی تھی۔ اسے یہ اندازہ تو تھا ہی نہیں کہ ایک کو چیس زیادہ پسند نہیں تھی۔  
”اس میں وقت بڑا لگتا ہے۔ بیٹھے رہو۔۔۔ سوچتے رہو۔۔۔ مجھے جلدی ہونے والے کام پسند ہیں۔“ ایک نے کہا۔

”نانا کہتے ہیں جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔“ ایک لا جواب ہو کر گڑبڑایا۔  
”نہیں، اتنی جلدی کی بات نہیں کر رہا میں۔“ اس کو محاورے کی سمجھ آئی ہو نہ آئی ہو شیطان سے وہ اچھی طرح متعارف تھا۔

”پہلی بازی کا فیصلہ سات منٹ میں ہو گیا۔ دوسری کا آدھے گھنٹے میں تیسری کا 20 منٹ میں۔ چوتھی Stalemate تھی۔ 45 منٹ جاری رہی۔۔۔ اور پانچویں کا فیصلہ ایک بار پھر 20 منٹ میں ہوا تھا۔۔۔ اور یہ تمام بازیاں چڑیا نے جیتی تھیں۔ ایک اس دن ٹینس کھیلتا بھول گیا تھا۔ وہ ایک ہفتے سے چڑیا کا گاؤں فادر بنا بیٹھا تھا۔ وہ Instruct کر رہا تھا، وہ Direct کر رہا تھا اور اب وہ ایک ایسے کھیل میں آگیا تھا جہاں وہ اسی چڑیا کے ہاتھوں منٹوں میں چپت ہوا تھا۔۔۔ شکست کا وارکاری پڑ رہا تھا پر بورڈ پر نہیں ایک کے ذہن پر۔۔۔ وہ ایک نرم اور ہمدرد طبیعت والا باتونی لیکن مدد کرنے والا بچہ تھا۔۔۔ خاندان کا بڑا اور فیورٹ بچہ تھا۔ لائٹ لائٹ میں رہنے والا اور فیورٹ ملنے کا عادی۔ اس یقین اعتماد کے ساتھ پرورش پانے والا بچہ کہ وہ جو بھی کرے گا ہمیشہ اچھا اور Above average ہی کرے گا کوئی کسی چیز میں اس سے بہتر نہیں ہو سکتا، اس کو Beat نہیں کر سکتا۔ وہ کھیل میں ہارنے والے کو جا کر خود گلے لگا سکتا تھا۔ اپنی ٹرائی اس کو تھا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ رو بھی سکتا تھا لیکن وہ جیتنے والے کے گلے میں ہار نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کے لیے تالیاں نہیں بجا سکتا تھا اور اس کے ساتھ کھڑے ہو کر فونو نہیں کھنچوا سکتا تھا۔ اس میں اسپورٹس مین اسپرٹ تھی لیکن وہ ایک بچہ تھا۔ ایک ایسا بچہ جو ہر چیز میں جیتتا تھا۔

”اب ہم کل کھیلیں گے۔“ مسلسل پانچویں بازی میں سردھڑ لگا دینے کے باوجود بھی ہارنے پر اس نے بالآخر کہا۔

”اوکے۔“ چڑیا فوراً مان گئی، اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ کھیلتے کھیلتے اس دن انہیں بہت دیر ہو گئی تھی ابھی اسے ہوم ورک کرنا تھا اور ایک کو بھی۔

وہ پہلا دن تھا جب ایک کے سر پر چڑیا سوار رہی تھی۔ وہ باقی کا سارا دن بھی چڑیا اور چیس کے علاوہ اور کسی چیز کے بارے میں سوچ نہیں سکا۔ شام کو اس نے اس دن ٹینس کے بجائے اپنے انکل کے ساتھ چیس کی

پریکٹس کی تھی۔

”یہ چیس میں بیٹھے بٹھائے تمہیں کیسے دلچسپی ہو گئی؟“ اس کے انکل کو حیرت اور تجسس ساتھ ساتھ ہوا تھا۔  
”بس ایسے ہی۔۔۔۔۔ دل چاہ رہا تھا کھیلنے کو۔“ ایک نے اگلی چال سوچتے ہوئے بورڈ پر نظریں جمائے گول مول جواب دیا۔ وہ اپنے انکل کو جو اس کے آئیڈیل تھے، یہ کیسے بتا دیتا کہ وہ ایک لڑکی سے ہارنا تھا چیس میں۔ ایک بار نہیں کئی بار۔ ایک بچے کے طور پر بھی اس کی Ego بری طرح ہرٹ ہوئی تھی۔  
اگلے دن چڑیا سے مقابلے کے لیے وہ اگر چیس کی پریکٹس کرتا رہا تھا تو چڑیا اپنی نئی سختی سے ٹینس کی پریکٹس کرتی رہی تھی۔

”چیس ہی کھیلیں گے آج بھی۔“ ایک نے اس سے کہا۔  
”ٹینس کیوں نہیں؟“ چڑیا کچھ جزبہ ہوئی۔۔۔۔۔ دو دن ٹینس نہ کھیلنے کا مطلب تھا کہ اس کے بہتر ہوتے ہوئے شائس پھر پہلے جیسے ہونے لگتے۔۔۔۔۔ Weak and wayward

”بس چیس کھیلنے کو دل چاہ رہا ہے۔“ ایک نے اس سے یہ نہیں کہا کہ اس کی سوئی اب تب تک چیس میں ہی اٹکنے والی تھی جب تک وہ اس کھیل میں اسے کم از کم ایک بار ہر نہیں لیتا۔ چڑیا کو زیادہ اعتراض نہیں ہوا تھا۔ پاپ کارن کھاتے ہوئے وہ اس دن بھی چڑیا سے سات بازیاں ہارنا تھا۔۔۔۔۔ اور سات ہی کھیلی گئی تھیں۔ چڑیا نے ایک کی الجھن اور ٹینشن نوٹس نہیں کی تھی۔ نہ ہی اسے یہ اندازہ ہو پایا تھا کہ مسلسل شکست ایک کو کسی حد تک خفا کر رہی تھی۔ وہ دوسرے دن بھی رات گئے تک اپنے انکل کو مجبور کر کے ان کے ساتھ چیس کھیلتا رہا تھا لیکن تیسرے دن بھی ایک کے بعد ایک بازی ہارنے کے بعد اس نے بالآخر ذہنی طور پر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ چڑیا چیس میں اس سے بہت بہتر تھی اور اس اعتراف نے چڑیا سے اس کی مرغوبیت کا آغاز کیا تھا۔

”چڑیا تم بہت اچھا کھیلتی ہو۔“ ایک نے آخری بازی ہارنے کے بعد ایک گہری سانس لیتے ہوئے چڑیا سے کہا۔ تین دنوں میں یہ پہلی بار تھا کہ چڑیا کو ایک سے داؤ ملی ہو۔ وہ بے حد خوش ہوئی تھی۔ ”اگر تم کھیلتی رہو گی تو اور بھی اچھا کھیلو گی۔“ ایک نے تین دن کے بعد بالآخر ٹینس ریکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”But I promise میں Next year جب Summers میں آؤں گا تو تم سے زیادہ اچھا کھیلوں گا۔“ ایک نے اعلان کیا۔ چیس اس کے Work Sheet کا حصہ بن گئی تھی۔

”تم اگلے سال پھر آؤ گے؟“ چڑیا نے بہت خوش ہو کر پوچھا۔  
”ہاں، ہم ہر سال Summers میں انکل کے پاس ضرور آتے ہیں لیکن اتنا لمبا Stay شاید نہ کریں۔

اس بار تو پاپا کورس کے لیے امریکا میں ہیں اس لیے ہم ساری Vacations ادھر ہی گزار رہے ہیں۔“ ایک نے تفصیل سے بتایا۔ ”ویسے تم اگر میرے انکل کے ساتھ کھیلو تو مجھے لگتا ہے You will beat him too“ ایک نے بات کرتے کرتے پھر موضوع بدلا۔ چڑیا مسکرا کر چیس بورڈ اور مہرے سمیٹنے لگی تھی۔ اس نے دانستہ اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کے انکل اپنی بیٹی کے آس پاس بھی اس کی موجودگی پسند نہیں کرتے۔

”نانا، ایک کہتا ہے میں بہت اچھا کھیلتی ہوں۔“ اس شام چڑیا نے بے حد خوشی کے عالم میں خیر دین کے ساتھ ایک کی سٹائنش شیر کی تھی۔

”وہ تو تم کھیلتی ہو..... میں تو ہمیشہ بتاتا ہوں تمہیں۔“ خیر دین نے مسکرا کر اس کی بات سنتے ہوئے کہا۔  
”اور ایک کہتا ہے اگر میں صاحب کے ساتھ کھیلوں تو ان کو بھی Beat کر سکتی ہوں۔“ چڑیا نے فخر پر انداز میں ایک کا اگلا جملہ دہرایا۔

”نہیں..... نہیں چڑیا۔ ہمیں صاحب کو ہرانے کا نہیں سوچنا چاہیے..... صاحب تو بڑا لائق ہے..... بہت بڑا افسر ہے..... اس کو ہرانا آسان تھوڑی ہوتا ہے..... اور پھر کیوں ہرائیں.....“ خیر دین نے فوراً چڑیا کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”جی نانا۔“ وہ کچھ بھگ گئی۔ اس کا خیال تھا خیر دین ایک کی اس تعریف پر بہت خوش ہوگا۔  
اس دن ایک نے بھی گھر میں چڑیا کا ذکر کیا تھا۔ اپنے انکل کے ساتھ چیس کھیلتے ہوئے اور وہی لفظ دہرائے تھے جو اس نے چڑیا سے کہے تھے۔

”انکل! وہ اتنا اچھا کھیلتی ہے کہ آپ کو بھی Beat کر سکتی ہے۔“ اس کے انکل اس کی بات پر ہنس دیے۔ وہ بچوں کی تعریفوں اور دعوؤں پر غور کرنے کے عادی نہیں تھے۔  
”میں سچ کہہ رہا ہوں انکل۔“ ایک کو جیسے ان کا ہنسنا یا دوسرے الفاظ میں اس کا مذاق اڑانا اچھا نہیں لگا تھا۔  
”وہ تم کو ہرا سکتی ہوگی لیکن مجھے نہیں ہرا سکتی..... سمجھے تم..... انا طولی کار پوف نہیں ہے وہ..... اور نہ تم۔“ اس کے انکل نے استہزاء سے انداز میں کہا۔

”اچھا تو پھر آپ اس کے ساتھ کھیل کر دیکھیں۔“ ایک نے جیسے چیلنج کیا۔  
”اور مجھے انا طولی پسند نہیں ہے۔ کیسپر وف پسند ہے۔“ اس نے اس پلیئر پر اعتراض کیا جس کے ساتھ اس کے انکل اسے اور چڑیا کو ملتا رہے تھے۔

”چلو دیکھوں گا کسی دن فی الحال تو تمہارے لیے چیک میٹ ہے۔“ اس کے انکل نے اپنا مہرہ اس کے بادشاہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے لگتا ہے وہ اس لیے نہیں جیتی کہ وہ اچھا کھیلتی ہے، تم اس لیے ہارتے ہو کیونکہ تم اس سے زیادہ برا کھیلتے ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ کر ٹیبل چھوڑ گئے۔

☆☆☆

عقبی لان میں پڑی ایزی چیئرز کے درمیان پڑے ریڈیو پر برائن ایڈمز کا Summer of 69 بج رہا تھا جب شہر بانو باہر نکلی تھی۔ شیردل کچھ دیر پہلے وہیں ایک ایزی چیئر پر برمودا شارٹس میں نیم دراز آج کے نیوز پیپر ز دیکھتے ہوئے چائے پی رہا تھا۔ صبح ہلکی بارش ہوئی تھی اور آسمان پر ابھی بھی ہلکے بادل تھے اور ان دونوں چیزوں نے اس وقت باہر کے موسم کو بے حد خوشگوار کر دیا تھا اور اس موسم میں برائن ایڈمز کے اس Song نے شہر بانو کو بہت کچھ یاد دلایا تھا..... بہت سے خاص..... خوش گوار..... زندگی بھر نہ بھولنے والے لمحے..... یادیں..... جو برائن ایڈمز کے اس Song کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں۔ اس کے قدموں کو باہر کھینچ لانے والی چیز بھی اس گانے کی آواز ہی تھی..... موسم نہیں..... وہ ویک اینڈ تھا اور وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی جاگی تھی اور اب انٹرکام کے کام نہ کرنے کی وجہ سے لیکن میں ملازم کو ناشتے کے لیے ہدایات دے کر آئی تھی جب کارڈور سے

گزر رہے ہوئے اس نے لان میں بجتا ہوا یہ Song سنا تھا۔ شیردل میوزک کا شوقین تھا اور ویک اینڈ پر فرصت میں پرانے انگلش Songs سنا اس کی ہائیز میں سے تھا۔ اس وقت بھی لان میں وہی ہوسکتا تھا۔

شہر بانو ایک ایزی چیئر پر بیٹھ گئی..... سامنے ٹیبل پر پڑے چائے کے کپ کو اس نے ہاتھ بڑھا کر چھوا، وہ ہلکا سا گرم تھا۔ کپ میں ہمیشہ کی طرح چائے کی کچھ مقدار موجود تھی۔ وہ یقیناً ابھی ابھی وہاں سے اٹھ کر گیا تھا۔ شیردل کو عادت تھی ہمیشہ چائے کے کپ میں چائے چھوڑنے کی..... وہ چائے بہت پیتا تھا لیکن وہ چائے اسی طرح پیتا تھا۔ برائن ایڈمز کی آواز اور گٹار ماحول کی خاموشی کو عجیب انداز میں رومینگ کر رہے تھے یا یہ ہمارے اپنے دل کی کیفیت ہوتی ہے جو ایک عام گانے کو ہر بار بجنے پر یا کسی خاص گانے کو کسی خاص لمحے میں بجنے پر یادگار بنا دیتی ہے۔ شہر بانو نے زیر لب گانے کے پل گنگنا تے ہوئے چائے کے گنگ میں کچھ اور چائے بنائی۔ شیردل کو اپنی چائے کپ میں چھوڑنے کی عادت تھی اور اگر وہ اکیلا چائے پی رہا ہوتا اور شہر بانو پاس ہوتی تو وہ ہمیشہ اس کے چھوڑے ہوئے وہ تین چار گھنٹہ خود بی لیتی تھی۔ یہ عجیب سی عادت تھی اور اس کا آغاز ان کے بچپن میں ہی ہوا تھا۔ وہ چائے کی شوقین نہیں تھی اور امریکا میں اس کے کچھ تعلیم حاصل کرنے کے دوران وہ شیردل کی اس عادت سے واقف تھی کہ وہ کپ میں بہت سی چائے چھوڑ دیتا تھا اور وہ جتنی چائے چھوڑتا تھا وہ چائے کی وہ مقدار تھی جو شہر بانو عام طور پر ایک وقت میں پی پاتی تھی اور بچپن میں ان کے دوران ایسا ہونے لگا تھا کہ وہ کہیں باہر گھومتے پھرتے چائے کا ایک کپ لیتے۔ شیردل عادتاً چائے چھوڑتا اور شہر بانو وہ چائے پی لیتی۔ اس عادت پر سب سے پہلا اعتراض شیردل کو ہی ہوا تھا۔

”تم کیوں پی رہی ہو یا..... Leave it..... مجھے تو عادت ہے۔“ اس نے پہلی بار اس کی بقیہ چائے پینے کی کوشش پر کپ اس کے ہاتھ سے لے کر خفگی کے عالم میں پھینک دیا تھا۔  
”کیا ہو گیا..... ویسے ایک دوسرے کی جھوٹی چیزیں نہیں کھا رہے کیا؟“ شہر بانو بھی جواباً بھٹائی۔  
”پر یہ تو میری بچی ہوئی چائے ہے۔“ شیردل نے اسے جتایا۔  
”تو؟“

”یار میں عورتوں کی Equality پر Believe کرتا ہوں..... یہ شوہروں کا جھوٹا کھانے والی بات میں

Digest نہیں کر سکتا "You don't have to do this" شیردل نے دلوک انداز میں کہا تھا۔

"تم میرے شوہر نہیں ہو شیردل..... اور میں اپنے شوہر کا جھوٹا نہیں کھا رہی۔ نہ میرا جھوٹا کھانے والی لڑکی ہوں..... تم بس وہ مرد ہو جس سے میں دنیا میں سب سے زیادہ پیار کرتی ہوں..... ٹرسٹ کرتی ہوں....."

"And I find it very romantic to sip your tea" شہر بانو نے جواباً اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"تو یار تم پہلے پی لیا کرو نا۔" شیردل نے آفر کی۔

"تم پھر بھی کپ میں چائے چھوڑ دو گے۔" شہر بانو نے چیلنج کیا۔

"تو یہ کہ مجھے پینے دیا کرو اگر میں پینا چاہتی ہوں۔" شیردل کچھ دیر ابھی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"شعی لڑکیوں کے دماغ میں کسی نہ کسی حد تک خرابی ضرور ہوتی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے..... خرابی نہ ہو تو ہم شادی کیوں کریں؟" اس نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"On the way you held my hand

I knew that it was now or never

Those were the best days of my life

Back in the summer of 69"

چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے وہ بے اختیار مسکرائی۔ وہ اب بھی ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔

شیردل ارد گرد کہیں نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ بجتا ہوا ریڈیو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ آس پاس ہی کہیں تھا اور تھوڑی دیر میں واپس وہاں آ جاتا۔

دور مالی لان میں پودوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھے۔ شہر بانو کی طرح متوجہ نہ ہونے کے باوجود وہ اس کی یا شاید شیردل کی باہر موجودگی کی وجہ سے بڑی مستعدی سے کام کر رہے تھے۔

انگریزوں کے زمانے کی ہر سرکاری رہائش گاہ کی طرح وہ ڈی سی ہاؤس بھی وسیع و عریض رقبے پر شہر کی ایک پرائم لوکیشن پر تھا جو یقیناً انگریزوں کے زمانے میں شہر سے بہت ہٹ کر واقع ہو گا۔ عمارت کے چاروں طرف لان کے لیے جگہ چھوڑی گئی تھی اور عمارت کے عقب میں سروٹ کوارٹرز کے لیے کچھ حصہ مختص تھا۔

شیردل اور وہ کچھ مہینوں پہلے جب یہاں منتقل ہوئے تھے تو گھر کے سامنے والے لان اور عقب میں موجود کچن گارڈن کے علاوہ گھر کے چاروں اطراف میں موجود لان گھاس پھوس اور جھاڑ جھنکاڑ سے بھرا ہوا تھا۔ سالوں پرانے درخت اور پودے تراش خراش سے محروم چلے آ رہے تھے۔ بیرونی دیواروں پر چڑھی بیلوں کے نیچے موجود دیواروں نے شاید صدیوں سے سورج کی روشنی نہیں دیکھی تھی اور کی دیواروں کا جو حال کر سکتی تھی اس نے وہی کیا تھا۔ بہت سے پودے مناسب نگہداشت نہ ہونے کی وجہ سے سوکھ چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ عدم توجہ کی بنا پر اپنی جگہ پر اسی حالت میں موجود تھے۔ انہیں زمین سے اکھاڑ نکالنے کے لیے جس دقت اور محنت کی ضرورت تھی وہ گھر کے مالک کی ہدایات اور دلچسپی کے بغیر کسی مالی کی طرف سے ملنا مشکل تھا۔ عمارت کے

عقب میں موجود کوارٹرز کے ساتھ ایک حصے میں پھل دار درختوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جن میں سے کچھ درخت اب اپنی مدت پوری کر چکے تھے اور پتوں کے ڈھیر سے زمین بھر دینے کے علاوہ کوئی اور خدمت کرنے سے قاصر تھے۔ اگر ان پھل دار درختوں سے گھر کے مکین مستفید ہو رہے ہوتے اور مسلسل لان کا جائزہ لیتے رہے ہوتے تو وہ درخت مناسب وقت پر Replace ہو جاتے مگر اتنے وسیع و عریض لان میں ہر طرف جانا اور خاص طور پر سروٹ کوارٹرز والے حصے میں کبھی بھی کسی آفیسر یا اس کی فیملی کے لیے دلچسپی کا کام نہیں تھا۔ ان درختوں سے اترنے والا پھل وہیں سروٹ کوارٹرز میں موجود ملازم استعمال کرتے یا پھر صاحب کے بچن میں اس کی تھوڑی بہت سپلائی جاری رکھتے۔ سروٹ کوارٹرز کی اپنی حالت ان کے شفٹ ہونے پر بے حد مخدوش تھی۔ سفیدی یا رنگ روغن نام کی کوئی شے وہاں مستقبل قریب میں تو ایک طرف ماضی بعید میں بھی نہیں ہوئی تھی۔ کوارٹرز کی سیلن زدہ دیواریں کئی جگہوں پر کائی اور بے ہنگم چڑھی ہوئی بیلوں سے بھری ہوئی تھیں جو ان سروٹ کوارٹرز میں مقیم ملازمین کی کانٹ چھانٹ کے باوجود بار بار پھیل جاتی تھیں..... عمارت کے عقب میں کچن گارڈن وہ واحد جگہ تھی جہاں بے حد منظم انداز میں باغبانی ہو رہی تھی اور اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ کچن گارڈن اس عمارت میں مقیم تمام سروٹس کے کھانے کی ضروریات پوری کر رہا تھا ورنہ شاید وہاں بھی موسمی سبزیوں کے بجائے وہی جھاڑ جھنکاڑ ہوتا جو عمارت کے باقی دو اطراف کے لان میں تھا۔

عمارت کے دہنی طرف کے لان میں کسی زمانے میں شاید ٹینس کورٹ بنایا گیا ہو گا۔ اس کا اندازہ شیردل اور شہر بانو کبھی نہ کر پاتے اگر وہ خود ٹینس پلیئر نہ ہوتے اور گھاس پھوس کے اس جنگل سے گھاس کے نشیب و فراز کو جانچتے ہوئے ایک عدد گراس کورٹ کے Fossils نہ دریافت کر لیتے۔

عمارت اور اس سے ملحقہ لانز کی زبوں حالی کی اگر ایک وجہ اس میں رہائش پذیر آفیسر کی اس کی تزئین و آرائش میں عدم دلچسپی تھی تو دوسری وجہ مینینٹنس کے لیے مناسب فنڈز کی عدم دستیابی بھی تھی۔ اتنی بڑی عمارت کا انتظام و انصرام کسی کے لیے بھی خالہ جی کا گھر نہیں تھا خاص طور پر ایک ایمان دار آفیسر کے لیے اور وہ بھی ایسا آفیسر جو خاندانی اعتبار سے بھی خاصا سفید پوش ہو..... سرکاری خزانے کو ایک خاص حد اور بجٹ سے زیادہ ڈی سی ماؤس خرچ کرنے کے لیے جس جرأت، جالا کی اور ہاتھ کی صفائی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ شہر دل کے پیش رو



میں نہیں تھی، شیردل میں تھی۔ اس لیے عمارت اور اس کے لانز کے ساتھ ساتھ سرونٹ کوارٹرز کی حالت بھی دنوں میں بدلتی تھی۔ شیردل ہارڈ ٹاسک ماسٹر تھا اور اس کے ساتھ ساتھ Workaholic بھی..... دوسرے آفیسرز کی طرح وہ صرف عمارت کے اس حصے تک خود کو محدود نہیں رکھتا تھا جو اس کی رہائش گاہ تھی۔ وہ کسی بھی وقت عمارت کے کسی بھی حصے میں پہنچ جاتا اور اس کی اس عادت نے جہاں عملے کو بے حد مستعد اور پریشان کر رکھا تھا وہاں دوسری طرف ڈی سی ہاؤس کے دن واقعی پھر گئے تھے۔ سرونٹ کوارٹرز میں تقریباً پندرہ سالوں بعد بڑے پیمانے پر مرمت کا کام ہوا تھا۔ ڈی سی کی اپنی رہائش تو خیر ہر سال ہی Renovate ہوتی تھی۔ شیردل اپنے ماتحت عملے کے حوالے سے خاصا فیاضانہ رویہ رکھتا تھا اور وہ جہاں بھی پوسٹڈ رہا تھا اس نے اس معاملے میں اپنے لیے خاصی پسندیدگی اور نیک نامی کمائی تھی۔ جب تک سرونٹ کوارٹرز میں کام ہوتا رہا وہ تقریباً ہر روز آفس جانے سے پہلے یا واپس آنے کے بعد پیچھے کا ایک چکر ضرور لگا کر آتا۔ عمارت کے عقب میں وہ تمام پھل دار درخت کاٹ دے گئے تھے جو اب اپنی مدت پوری کر چکے تھے اور بہار کے موسم میں کچھ نئے پودوں کی قلمیں بھی لگائی گئی تھیں۔ صرف سرونٹ کوارٹرز اور عمارت کی ہی کا یا کلپ نہیں ہوئی، لانز کی شکل صورت بھی بدل گئی تھی۔ چند مہینے پہلے بہار کے موسم میں لگائے ہوئے بیجوں کی پیڑی اب ہر جگہ کو سرسبز اور رنگین کیے ہوئے تھی۔ گرمیوں کا موسم آ جانے کے باوجود لان میں پھولوں کی ایک بڑی تعداد مختلف کیاریوں میں کسی نہ کسی حالت میں تھی۔ بہت سارے نئے دیسی اور بدیسی پودوں اور پھولوں کا اس ڈی سی ہاؤس میں اضافہ ہو گیا تھا اور ٹینس کورٹ ایک بار پھر ”معرض وجود“ میں آ گیا اور تمام تبدیلیوں میں شیردل کے ساتھ شہر بانو کا بھی کلیدی کردار تھا۔ Horticulture اس کا سبکیٹ نہیں تھا لیکن اسے اس میں دلچسپی تھی۔

وہ اب تک جہاں بھی پوسٹڈ رہے تھے شہر بانو گھر کی Renovation ضرور کرتی تھی اور جب تک اس کی Renovation ختم ہوتی ان کی اگلی پوسٹنگ کے آرڈرز آ جاتے۔ اسے یقین تھا کہ ان کے بعد آنے والوں کو اس سے Well maintained گھر زندگی میں نہیں ملے ہوں گے۔ شہر بانو کے لیے یہ ایکٹیوٹی جیسے اپنے پروفیشن کے ساتھ کسی نہ کسی طریقے سے جڑے رہنے کی ایک کوشش بھی تھی جس کو وہ شیردل کی جانب کی وجہ سے بالائے طاق رکھے ہوئے تھی۔ اس گھر میں آنے کے بعد ابتدائی طور پر چھوٹے موٹے پراہمز ہونے کے بعد سب کچھ آہستہ آہستہ سیٹ ہوتا گیا تھا۔ وہ خوف اور عدم تحفظ کا احساس جس کا شکار شہر بانو وہاں آتے ہی ہو گئی تھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتا گیا۔ شیردل نے اگرچہ اسے پہلی بار خود بخود دروازے کھلنے کے بارے میں نہیں بتایا لیکن اس کے بعد اوپر نیچے ایسے کئی واقعات ہوئے کہ شیردل کو ہر بات شہر بانو سے چھپانی مشکل ہو گئی تھی۔ شہر بانو نے بھی آہستہ آہستہ وہاں ایسی کئی چیزیں محسوس کی تھیں جنہیں وہ انور نہیں کر پائی لیکن کمروں کے دروازے خود بخود بند ہونا اور کھل جانا جیسے اب ایک معمول کی بات تھی..... اس کے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی چیزیں خود بخود غائب ہوتیں پھر کچھ دنوں بعد واپس آ جاتیں۔ استری کے لیے نکالے ہوئے کپڑے غائب ہو جاتے اور ایک بار تو استری ہی تین دن غائب رہی۔ مثال کے گم ہونے والے کھلونے واحد چیز تھی جو دوبارہ نہیں ملتے تھے۔ شہر بانو اور شیردل شروع کے شکس اور Set backs کے بعد آہستہ آہستہ ان تمام Experiences اور واقعات کے عادی ہوتے چلے گئے۔ خوف کی وہ کیفیت جو

شروع میں شہر بانو کے سر پر سوار رہتی تھی اب ختم ہو چکی تھی۔ وہ لوگ وہاں باقاعدگی سے قرآن خوانی کروانے کے عادی تھے، ہفتے میں ایک بار ہونے والی قرآن خوانی کے اثرات چند ہی ہفتوں میں نظر آنا شروع ہو گئے۔ پہلے کی نسبت ان غیر معمولی واقعات کا تناسب بہت کم ہو گیا تھا خاص طور پر گھر میں کبھی کبھار رات کو آنے والی آوازوں کا، اوپر والا ماسٹر بیڈ روم اب شیردل کے زیر تصرف ایک اسٹڈی روم کی شکل اختیار کر چکا تھا اور جب سے وہ کمر آباد ہوا تھا اس گھر میں پیش آنے والے عجیب و غریب واقعات بڑی تیز رفتاری سے کم ہوئے تھے۔ شہر بانو نے اسٹڈی بننے کے بعد شروع میں بہت عرصے تک شیردل کو رات کو اکیلے اس اسٹڈی میں کام کرنے نہیں دیا۔ وہ خود بھی کام کے دوران اس کے پاس کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتی تھی اور تب تک وہیں موجود رہتی جب تک شیردل کام کر رہا ہوتا لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ مطمئن ہوتی چلی گئی کہ اس گھر اور خاص طور پر اس کمرے میں ایسی کوئی چیز نہیں جس سے شیردل کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا۔

گرمیوں کا سیزن شروع ہو چکا تھا اور اب اس سیزن کے آغاز کے ساتھ ہی ان کے گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ شہر بانو کے اپنے ننھیالی رشتے دار زیادہ تر ملک سے باہر تھے۔ اس کے والدین اور دونوں بھائی بھی امریکا میں ہی تھے۔ شیردل سے شادی کے بعد اتنے سالوں میں وہ بہت کم امریکا گئی تھی اور اس کی فیملی میں سے کوئی ایک بار بھی اس سے ملنے پاکستان نہیں آ سکا تھا لیکن شیردل کی اپنی فیملی بہت لمبی چوڑی تھی۔ فرسٹ اور سیکنڈ کزنز کی ایک بڑی تعداد جن میں سے زیادہ تر سول سروس سے ہی منسلک تھے یا پھر مختلف انٹرنیشنل آرگنائزیشنز اور باڈیز کے ساتھ اور وہ سب آپس میں بہت میل جول رکھے ہوئے تھے۔ خود شیردل کو بھی اپنے گھر میں مہمانوں کا آنا جانا بہت پسند تھا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور فیملی کے پسندیدہ ترین انکمز اور بچوں میں سے تھا اور اتنا پاپور ہونے کا مطلب یہ تھا کہ یا وہ ہر وقت کہیں نہ کہیں انوائٹ ہوتے یا پھر کوئی نہ کوئی ان کو وزٹ کر رہا ہوتا۔ اس کے دوستوں کا حلقہ بھی اس کے رشتے داروں ہی کی طرح وسیع تھا۔ شہر بانو، شیردل کے برعکس زندگی کا بڑا حصہ امریکا میں گزارنے کی وجہ سے بے حد محدود میل جول کی عادی تھی۔ اس کی فیملی زیادہ سوشل نہیں تھی اور وہ ان سے زیادہ Aloof..... اس کے گھنٹی کے چند دوست تھے اور شیردل سے شادی کے بعد ان سے بھی اس کا رابطہ بہت محدود ہو گیا تھا..... تہواروں اور برتھ ڈے Greetings کے علاوہ وہ کم ہی کسی سے رابطہ رکھ پاتی تھی۔ اس کی زندگی شیردل اور مثال سے شروع ہو کر انہی پر ختم ہو جاتی تھی اور بیرونی دنیا سے اس کا رابطہ بھی شیردل کے ذریعے اور اس کے ساتھ ہی

تھا۔ شیردل کے لائف اسٹائل اور فطرت کے مطابق خود کو ایڈجسٹ کرنے میں شہر بانو کو وقت لگا تھا لیکن یہ تبدیلی اسے اچھی لگی تھی۔ سالوں لوگوں سے نہ ملنے کے بعد آہستہ آہستہ لوگوں سے ملنا اور ان سے تعلقات بنانا مشکل نہیں لیکن دلچسپ تھا۔

شیردل کی بہن ان دنوں اپنی فیملی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے ان کے ہاں آئی ہوئی تھی، آئزہ شیردل سے بہت کلوڑ بھی اور اس کے بچے بھی۔۔۔ ہر سال Summers میں وہ ضرور کچھ دنوں کے لیے شیردل کے پاس آتی تھی۔ آئزہ اور اس کے بچوں کی وجہ سے شہر بانو کے پاس ایک دم جیسے ایک نئی مصروفیت آگئی تھی۔ وہ دونوں تقریباً روز ہی شہر کو Explore کرنے لگی ہوتیں۔ وہ کام جو شہر بانو امریکا میں اکیلے کر سکتی تھی لیکن پاکستان میں نہیں خاص طور پر شیردل کی بیوی ہونے کی وجہ سے۔۔۔۔۔

ریڈیو پر اب کوئی اور Song چلنے لگا تھا جب شیردل اور اس کا ناشتا ایک ہی وقت میں آئے تھے۔ ملازم ٹیبل پر ناشتا لگا رہا تھا جب شیردل اس کے پاس آ کر بیٹھا، اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیل فون ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ ”مجھے بھی ایک کپ چائے بنا دو۔“ شیردل نے ملازم کو ہدایت دی اور ساتھ ہی ریڈیو اٹھا کر اس نے اس کی ٹیوننگ شروع کر دی۔

”Summer Of 69“ چل رہا تھا ابھی۔ ”شہر بانو نے مسکراتے ہوئے شیردل سے کہا۔  
 ”اوہ۔۔۔۔۔ اچھا۔“ وہ بھی چونک کر مسکرایا اپنی چیل اتار کر اس نے سینئر ٹیبل کے ایک کونے میں اپنی ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے لگائی تھیں۔ ریڈیو پر دوبارہ وہی چینل ٹیون کرنے کے بعد اس نے ریڈیو ٹیبل پر رکھا اور ملازم سے چائے کا کپ تھام لیا۔ ملازم چائے کے پہلے برتن سمیٹ کر لے گیا تھا۔  
 ”آئزہ سو رہی ہے ابھی؟“ شیردل نے اپنی بہن کے بارے میں پوچھا۔

”ہاں، میرا خیال ہے۔۔۔۔۔ نوریہ کو بخار تھا کل رات اس کی وجہ سے کافی لیٹ ہی سوئی۔۔۔۔۔ تم کہاں تھے، میں بہت دیر سے یہاں آ کر بیٹھی ہوں۔“ شہر بانو نے دلیے کا جج منہ میں ڈالتے ہوئے شیردل سے پوچھا۔  
 ”گیٹ تک گیا تھا یا ر۔۔۔۔۔ اب مجھے پتا تھوڑی تھا کہ تم بھی باہر آ جاؤ گی۔“ شیردل نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ شہر بانو کچھ کہتی ٹیبل پر پڑا شیردل کا فون بجنے لگا۔ شیردل چونک کر فون کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ فون اٹھانے کے لیے سیدھا ہوتا شہر بانو نے فون اٹھا کر اسے پکڑا دیا۔

”اب کوئی لمبی کال کرنے مت بیٹھ جانا۔“ اس نے ساتھ ہی شیردل کو وارننگ دی۔ وہ کچھ کہنے کے بجائے مسکرا دیا۔ پھر اس نے فون پکڑتے ہوئے چائے کا کپ واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ علیکم السلام فیاض۔۔۔۔۔ کیسے ہو یا ر؟“ وہ اب کسی سے بات کرنے لگا تھا۔ شہر بانو نے پیالے میں موجود دلیہ تقریباً ختم کر لیا تھا جب اس نے شیردل کو کہتے سنا۔

”اچھا، پوسٹنگ آرڈر آگئے ہیں تمہارے۔۔۔۔۔ کہاں پوسٹنگ آئی ہے۔۔۔۔۔ Great۔۔۔۔۔ تو تمہاری جگہ کون آ رہا ہے؟۔۔۔۔۔ عکس؟۔۔۔۔۔ Is she back?“ شیردل کے انداز میں کچھ تھا کہ وہ بے ساختہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ اس نے شیردل کو ٹیبل سے بے اختیار اپنی ٹانگیں ہٹاتے اور سیدھے ہو کر بیٹھتے دیکھا تھا۔ شہر بانو نے یہ بھی نوٹس کیا تھا۔

(جاری ہے)

شیردل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بوسے تنہا ہیں۔ شیردل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ایک دن شیردل اپنے سینئر اختر درانی کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ اختر درانی کی بیوی ترین، شہر بانو کو بتاتی ہے کہ پہلے کسی آفیسر کی بیوی نے اس گھر میں اپنے شوہر کو مار کر خودکشی کر لی تھی اس لیے وہاں رہنے والوں کی ازدواجی زندگی مشکلات کی زد میں آ جاتی ہے۔ ترین کے پوچھنے پر کہ ان کی شادی لومیرج کا نتیجہ ہے۔ یہ بات سن کر شہر بانو ماضی کی خوب صورت یادوں میں کھو جاتی ہے۔ جہاں صرف وہ اور شیردل ہوتے ہیں۔ دونوں کی ذہنی ہم آہنگی انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ ہاجرہ اور اس کے شوہر خیر دین نے اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا۔ خیر دین میسرک کے بعد کوئی اور نوکری تو نہ کر سکا لیکن ڈی سی ہاؤس میں تنگ کی نوکری کرنے لگا۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کر دیتا ہے جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوئی ہے۔ لیکن پچھلے عرصے بعد حلیمہ کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے۔ یوں حلیمہ اور خیر دین کے ساتھ اس ڈی سی ہاؤس میں رہنے لگتی ہیں۔ چڑیا کو جب اس گھر میں یونوں کے بارے میں پتا چلتا ہے تو وہ اپنی خیالی دنیا میں ان کے خاکے بناتی ہے، ان سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس نے ان یونوں کو مختلف نام بھی دیے، وہ ہر وقت ان کی کھوج میں رہتی ہے تاکہ وہ ان سے دوستی کر سکے۔ نئے صاحب یعنی شیردل کو یہ پسند نہیں ہوتا کہ ملازم کی بیٹی ان کی بیٹی کے ساتھ ربط و ضبط رکھے۔ وہ جب ٹینس کورٹ بناتے ہیں اور وہاں کھیلتے ہیں تو چڑیا یونوں کے پیچھے سے چھپ کر انہیں دیکھتی ہے۔ وہ ہر روز شام کو ان آئینوں کو دیکھتا بھی نہیں بھولتی کیونکہ خیر دین نے اس سے کہا تھا کہ شام کے وقت یونے اس میں نظر آتے ہیں لیکن چڑیا کو جو یونے نظر آتا ہے وہ بہت خوفناک ہوتا ہے اس لیے وہ اسے ہونا نہیں مانتی پھر اسے اس میں ایک نظر آتا ہے۔ ایک شیردل کی چھوٹی بہن آنرہ کا بیٹا ہے وہ لوگ چھٹیاں گزارنے شیردل کے گھر آتے ہیں ایک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایک سے ٹینس کھیلتا کھیلتی ہے اور ایک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو شیردل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ شیردل گھر میں قرآن خوانی کا اہتمام کر دیتا ہے اسے اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کام اس نے پہلے کیوں نہیں کیا۔ شیردل کے کوئی فیاض کا ٹرانسفر ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ٹینس کی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ (اب آگے پڑھیں)

اس نے اسٹینڈنگ مرمر میں اپنے آپ کو دیکھا، اپنے خوب صورت بالوں کو دیکھا۔ اپنے بے حد نازک گولائی میں پھولے ہوئے پنک فراک کو ذرا سا گھوم کر دیکھا پھر اس نے بے حد فخر یہ انداز میں چند قدم پیچھے کھڑی چڑیا کو دیکھا جو بے حد ستائشی نظروں سے اس ساڑھے تین سالہ باربی ڈول کو دیکھ رہی تھی۔ یہ وہ نام تھا جس سے وہ اس کو پکارتی تھی اور یہی وہ نام تھا جو اس نے پہلی بار اسے دیکھتے ہی دے دیا تھا۔ اس کے تمام ساتھی یونوں کو بھی باربی ڈول سے اتنا ہی عشق تھا جتنا چڑیا کو اور وہ بھی اس کو پہلی بار دیکھتے ہی اس پر اسی طرح فریفتہ ہوئے تھے جس طرح چڑیا دیکھ کر ہوتی تھی۔

”میں اچھی لگ رہی ہوں؟“ اب باربی ڈول چڑیا سے پوچھ رہی تھی۔

”بہت، بہت، بہت، بہت اچھی اور پیاری۔“ چڑیا نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی خوب صورتی اور ستائش کی جیسے پیمائش پیش کی۔ باربی ڈول کا رنگ سرخ ہوا، اس نے ناک کو ہلکا سا دائیں طرف سکیڑ کر اپنے ہونٹوں کو بھیج کر جیسے اپنی خوشی اور مسکراہٹ کو ایک ساتھ چھپانے کی کوشش کی۔

”میں تمہاری پونی کردوں؟“ چڑیا نے باربی ڈول کے بکھرے ہوئے سیاہ ریشمی بالوں کو نرمی سے چھوتے ہوئے پوچھا۔ باربی ڈول سر ہلاتی فوراً پونی بنوانے پر تیار ہو گئی تھی۔ چڑیا نے اپنے بالوں سے ربر بزنڈ اتارا اور آئینے کے سامنے باربی ڈول کے عقب میں جا کر بڑے انہماک سے اس کی پونی بنانے لگی۔ ان دونوں کے اس تعلق کا آغاز باربی ڈول کے اس کے اسکول میں ایڈمیشن کے ساتھ ہوا تھا۔

چڑیا کلاس مانیٹر تھی اور وہ اس دن اپنی کلاس سے کسی کام سے باہر نکلتی تھی جب اس نے مانیٹوری کے لچ بریک کے دوران پلے ایریا کے سامنے سے گزرتے ہوئے باربی ڈول کو وہاں لچ باکس ہاتھ میں پکڑے see

saw پر جھولتے دو بچوں کے پاس کھڑے دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے چڑیا کو جیسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔ وہ باربی ڈول جس کے بالوں کو چھونے اور جس کے ساتھ بات کرنے اور کھیلنے کی خواہش میں وہ کئی بار ڈی سی ہاؤس میں لان کے اس حصے میں منع کرنے کے باوجود جاتی رہتی تھی جہاں وہ اپنی ماں اور کبھی کبھار باپ کے ساتھ بھی شام کو کھیلنے کے لیے نکلتی تھی۔ باربی ڈول کے قریب جا کر اس سے کچھ کہنے کی ہمت اسے بھی نہیں ہوئی تھی لیکن دور سے بہت بار ان دونوں کے درمیان خاموش نظروں اور مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ وہ اس گھر کے مستقل رہائشی دو واحد بچے تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں تجسس کا شکار نہ ہوتے اور ایک دوسرے کو مستقل طور پر ان گور کر پاتے۔ چڑیا فرینڈلی تھی، باربی ڈول نہیں تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کی طرح بہت مہذب اور سلجھی ہوئی ہونے کے باوجود بے حد ریزورڈ تھی۔ پتا نہیں یہ طبعاً تھا یا پھر اس کے ماں باپ نے اسے بھی کچھ ہدایات دی تھیں۔ چڑیا سوچتی رہتی تھی لیکن کبھی اندازہ نہیں کر سکتی تھی اور اب وہی باربی ڈول اس سے چند گز کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ چڑیا کے لیے کیسے یہ ممکن تھا کہ وہ اسے ان گور کر کے گزر جاتی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ شاید باربی ڈول کو بھی اپنے ہی اسکول میں دیکھ کر خوشی سے چھلانگیں لگاتی۔

”ہیلو۔“ وہ ایکساٹمنٹ کے باوجود کچھ ڈرتی جھجکتی باربی ڈول کے پاس گئی تھی اور جیلو کا چھوٹا سا لفظ کہنے کے لیے بھی اسے پتا نہیں کتنی ہمت کرنی پڑی تھی۔ باربی ڈول نے چونک کر گردن گھما کر اسے دیکھا اور پھر اس نے بھی اسی برقی رفتار سے چڑیا کا چہرہ پہچانا تھا جس طرح چڑیا نے اس کا۔۔۔۔۔ وہ چڑیا کو فراموش کر بھی کیسے سکتی تھی۔ وہ گھر میں اس کے لیے دلچسپ چیزوں میں سے ایک تھی۔ لان میں کھیلتے کھیلتے اچانک کسی پھولدار جھاڑی یا پودے کی شاخ کے درمیان سے جھانکتا ہوا تجسس آنکھوں والا ایک معصوم چہرہ، کبھی راہداری کی کھڑکیوں میں یک دم نمودار ہونے والی وہ روشن شرارتی آنکھیں جو باربی ڈول کے ساتھ اس کی ماں یا باپ کو دیکھ کر اسی طرح جھپکے سے غائب ہو جاتی تھیں۔ بہت دفعہ پودوں سے جھانکتی چڑیا کو دیکھ کر وہ ہنسی لگتی تھی۔ اپنے کھلونوں کے ساتھ لان میں کھیلتے یا سائیکل چلاتے ہوئے اور شروع شروع میں وہ اپنی مٹی کو چڑیا کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش بھی کرتی تھی لیکن وہ اس کوشش میں ہمیشہ ناکام رہی۔ وہ جب تک اپنی مٹی کو اس پودے یا جھاڑی کی طرف متوجہ کر پاتی جہاں اس نے چڑیا کو دیکھا تھا چڑیا وہاں سے غائب ہو چکی ہوتی۔

”مٹی وہاں ایک Girl ہے۔“ اس نے پہلی بار چڑیا کو دیکھنے پر نٹ بال کو کلک لگاتے لگاتے رک کر اپنی ماں کو اشارے سے بتایا تھا لیکن جب تک وہ اس پودے کی ان شاخوں کو دوبارہ نوکس کر پاتی جن میں سے اسے چڑیا کا چہرہ نظر آیا تھا، چڑیا غائب ہو چکی تھی۔ اس کی ماں نے چند لمحوں کے لیے چونک کر اس پودے کو دیکھا پھر پوچھا۔

”کہاں؟“

”وہاں۔۔۔۔۔ پودہ اب نہیں ہے۔“ وہ اب فٹ بال کھیلتا بھول گئی تھی۔

”ہاں وہی بچی ہوگی جو اس دن ملنے آئی تھی۔۔۔۔۔ وہی بچی تھی کیا؟“ اس کی مٹی نے کسی خاص حیرت اور تعجب کے اظہار کے بغیر کہا۔ ”وہ جو ہمارے کلک کے ساتھ آئی تھی۔“ باربی ڈول نے ماں کے سوال پر اتنا غور نہیں کیا تھا نہ ہی اس نے اس بچی کے خدو خال کو ذہن میں لانے کی کوشش کی جسے اس نے کلک کے ساتھ ملاقات میں دیکھا تھا۔ اسے زیادہ تجسس اس بات پر تھا کہ وہ اس پودے کے پیچھے سے اچانک کیسے غائب ہو گئی تھی اور

کہاں غائب ہوگئی تھی۔ یہ چڑیا سے اس کے تعارف کا آغاز تھا اور پھر جیسے یہ ایک معمول ہو گیا تھا۔ اس نے کئی بار چڑیا کو پودوں کے پیچھے چھپے ہوئے دیکھا تھا۔ شروع شروع میں وہ ایکسٹنڈ ہو کر اپنی می کو بتانے کی کوشش کرتی تھی لیکن آہستہ آہستہ اسے اندازہ ہوتا گیا کہ اس کی ایسی ہر کوشش کے دوران چڑیا غائب ہو جاتی تھی اور اس کی می کو بھی لان کی جھاڑیوں اور پودوں میں چھپی کسی بچی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پھر اس نے اپنا یہ معمول بہت جلد بدل لیا تھا اب وہ لان میں کھیلنے کے لیے داخل ہوتے ہی دور تک پھیلے ہوئے پودوں اور جھاڑیوں میں چڑیا کی تلاش شروع کر دیتی تھی اور اکثر بڑی آسانی سے اسے ڈھونڈ لیتی تھی پھر وہ اپنی ماں کو کچھ بھی کہے بغیر اسی طرح کھیل میں مصروف رہتی اور وقتاً فوقتاً کھیل سے دھیان بٹا کر چڑیا کو بھی دیکھتی رہتی۔

چڑیا نے اب پہلے کی طرح غائب ہونا بند کر دیا تھا۔ خاموش نظروں کا تبادلہ آہستہ آہستہ مسکراہٹوں کے تبادلے میں بدلنے لگا تھا۔ اگرچہ کچھ نہیں لونا تھا تو ان دونوں کے بیچ خاموشی نہیں ٹوٹی تھی۔ ڈی سی کی بیوی لان میں کرسی پر بیٹھی یا تو کوئی کتاب پڑھتی رہتی یا پھر پینٹنگ کرتی رہتی اور وہ لان میں سائیکل چلاتے یا فٹ بال کھیلے ہوئے دور پودوں میں چھپی چڑیا کو دیکھ کر مسکراتی رہتی۔ کبھی کبھار وہ سائیکل چلاتے چلاتے جان بوجھ کر چڑیا کے بہت قریب سے ہو کر گزرتی اور کبھی وہ کھیلے ہوئے جان بوجھ کر اس پودے کے قریب فٹ بال پھینک دیتی جہاں چڑیا چھپی ہوتی یہ جیسے چڑیا کو کھیل کی دعوت دینے کی ایک غیر ارادی کوشش تھی جسے چڑیا نے کبھی قبول نہیں کیا تھا، وہ یہ جرات کر ہی نہیں سکتی تھی کہ لان میں صاحب یا ان کی بیوی کی موجودگی میں وہ باہر نکل آتی۔ خیر دین نے اسے سختی سے منع کیا تھا، وہ ایک بچکانہ تجسس کی وجہ سے وہاں آتو جاتی تھی لیکن وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے کبھی اس کے نانا کو ڈانٹ پڑے۔ اس نے بہت بار مختلف آفیسرز کے ہاتھوں اپنے نانا کو ڈانٹ کھاتے دیکھا تھا اور یہ اسے کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا اگرچہ خیر دین ہر بار ایسے کسی موقع پر اس کی موجودگی پر بعد میں اسے بٹھا کر اپنے صاحب کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

”دیکھو چڑیا جب غلطی ہوئی ہے تو ڈانٹ پڑتی ہے اور نہ ہر ڈانٹنے والا برا ہوتا ہے نہ ہی ہر ڈانٹ۔“

”نانا..... آپ کی زیادہ غلطی تو نہیں تھی۔“ وہ اس نے نانا کا دفاع کرتی۔

”ٹھوڑی تھی پر تھی تو سہی نانا..... اب اگر صاحب غلطی پر کسی کو بھی نہ ڈانٹا کرے تو ہر ایک کام خراب کرنا شروع کر دے گا۔“ چڑیا خیر دین کی بات پر سر ہلا دیتی لیکن اس کے باوجود خیر دین جانتا تھا کہ وہ خیر دین کو پڑنے والی کسی ڈانٹ پر بہت ناخوش ہوتی تھی۔

”ہیلو!“ باربی ڈول نے جواباً مسکرا کر کہا تھا۔ اسکول میں پہلے دن وہ پہلا شناسا چہرہ تھا جو اسے نظر آیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ چڑیا سے لپٹ ہی جاتی۔

”تم یہاں اسٹڈی کے لیے آئی ہو؟“ چڑیا اس کے ہیلو پر مسکراتی تھی، باربی ڈول نے سر ہلایا۔

”می پاپا کے ساتھ آئی ہو؟“ باربی ڈول کا سر ایک بار پھر ہلا لیکن ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آئے تھے۔ اسے یک دم یاد آ گیا تھا کہ اس کے می پاپا اسے صبح وہاں چھوڑ گئے تھے اور وہ وہاں اکیلی تھی۔ چڑیا اس کے آنسو دیکھ کر جیسے تڑپ اٹھی تھی۔

”رونا نہیں باربی ڈول، اچھے بچے تو نہیں روتے نا؟“ اس نے آگے بڑھ کر باربی ڈول کے گالوں پر لڑھکتے آنسو پہلے اپنے ہاتھوں سے پونچھے پھر اپنے فرائد کی جیب سے رومال نکال کر اس سے باربی ڈول کا چہرہ صاف کیا۔

”دیکھو سارے بچے پڑھنے آتے ہیں۔“ چڑیا اب اسے سمجھا رہی تھی، باربی ڈول کے آنسو یک دم ختم گئے تھے۔ یہ چڑیا کی باتوں کا اثر نہیں تھا اس نام کا اثر تھا جس سے وہ اس کو پکار رہی تھی۔

”اور اسکول میں تو کتنا مزہ آتا ہے..... اتنی اچھی اچھی ٹیچرز ہوتی ہیں، ٹیکس ہوتی ہیں..... پھر فرینڈز بھی تو ہیں گے نا تمہارے؟“ چڑیا اب وہ کام بھول چکی تھی جس کام سے وہ کلاس سے باہر آئی تھی اسے کچھ یاد تھا تو بس باربی ڈول یاد تھی۔ اپنی جیب میں رومال واپس رکھتے ہوئے اس نے جیب سے باربی ڈول کو ایک ٹافی نکال کر دی۔ باربی ڈول ایک لمحے کے لیے جھنجکی پھر اس نے ٹافی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ ٹھیک ہے می اور پاپا تو یاد آ رہے تھے لیکن ٹافی کھانے میں تو کوئی حرج نہیں تھا۔ چڑیا مسکراتی پھر اس نے باربی ڈول کی دونوں پونیوں کو پیار سے چھوا۔

یہ ان کے تعارف کا آغاز تھا لیکن تعارف، تعارف تک ہی رہا تھا ویسی دوستی نہیں ہو سکی تھی جو چڑیا اور باربی ڈول دونوں کی خواہش تھی۔ دونوں کے سیکشنز الگ الگ تھے اور باربی ڈول کی بہت جلد اسکول سے چھٹی ہو جاتی تھی۔ مائیسوری ونگ کی لٹچ بریک کا وقت بھی جو نیئر ونگ سے مختلف تھا۔ اس کے باوجود چڑیا کو جب موقع ملتا وہ زسری ریڈ کے سامنے سے صرف باربی ڈول کے لیے ضرور گزرتی یا لٹچ بریک کے دوران واش روم جانے کے بہانے ایک بار مائیسوری کے پلے ایریا میں آ کر باربی ڈول سے ضرور ملتی۔ باربی ڈول کو ٹافیاں اور لالی پاپ پسند تھے اور چڑیا جب بھی وہاں آتی اس کے لیے ان دونوں میں سے کوئی نہ کوئی چیز ضرور لے کر آتی۔ وہ خود ٹافیاں وغیرہ کھانے کی بہت شوقین نہیں تھی۔ خیر دین کی دی ہوئی پاکٹ منی وہ سنبھال کر رکھ لیتی تھی۔ اسکول میں وہ گھر سے لایا ہوا کھانا ہی کھایا کرتی تھی۔ انڈیا پراٹھا، بیٹھے توست، جیم یا مکھن لگے سلاسر یا خیر دین کی اپنی بیک کی ہوئی کوکیز اور پین کیک یا کپ کیک، ٹافی اور چھوٹے کبھی اتفاقاً ہی کھاتی تھی، وہ اور لالی پاپ تو کبھی بھی نہیں لیکن باربی ڈول کی وجہ سے اس نے یا قاعدگی سے اسکول کینٹین پر جانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی ان عنایات کی وجہ سے باربی ڈول بھی اس کے انتظار میں رہتی تھی۔

اسکول ڈی سی ہاؤس سے بہت دور نہیں تھا۔ خیر دین صبح جس وقت چڑیا کو سائیکل پر چھوڑنے جایا کرتا تھا اسی وقت باربی ڈول بھی اپنی می کے ساتھ گاڑی میں اسکول کے لیے نکلتی تھی۔ کبھی خیر دین پہلے اسے سائیکل پر بٹھا کر گھر کے فرنٹ گیٹ سے نکلتا اور پھر چند ہی منٹوں میں ڈی سی کی گاڑی ان کو اوور ٹیک کرتے ہوئے ان کے قریب سے گزرتی۔ چڑیا سائیکل پر اور باربی ڈول گاڑی کی کھڑکی کے شیشے سے چپک کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے مسکراتیں اور ہاتھ ہلاتی جاتیں۔ تب تک جب تک گاڑی اگلا موڑ نہ مڑ جاتی اور کبھی ڈی سی کی گاڑی ان سے پہلے گھر کے فرنٹ گیٹ سے نکل رہی ہوتی اور تب باربی ڈول پچھلی ونڈ اسکرین پر تقریباً چڑھی ہوئی چڑیا کو خیر دین کے آگے سائیکل پر بیٹھے دیکھتی رہتی..... اور کبھی ان دونوں کے اسکول جانے کی ٹانگ میں چند منٹوں کا فرق پڑ جاتا یا خیر دین پہلے چلا جاتا یا باربی ڈول پہلے اسکول چلی جاتی اور اس دن وہ دونوں سڑک پر ایک دوسرے کو بے چینی کے عالم میں ڈھونڈتی رہتیں۔

”نانا آپ سائیکل تیز کیوں نہیں چلاتے؟“ چڑیا کو ان حالات میں ڈی سی ہاؤس کی بیرونی روڈ پر ڈی سی کی گاڑی نہ دیکھ کر سائیکل کی رفتار پر اعتراض ہوتا۔ اسے یقین تھا کہ رفتار ڈی سی بھی تیز ہوتی تو موٹر پر لگے ٹرنک سگنل پر وہ اس گاڑی اور گاڑی کے اندر موجود باربی ڈول کو ضرور دیکھ لیتی۔

”بیٹا تیز تو چلا رہا ہوں۔“ خیر دین سائیکل کی رفتار کچھ مزید تیز کرتے ہوئے اس سے کہتا۔

”ہاں پر گاڑی جتنی تیز تو نہیں ہے نا؟“ وہ بے ساختہ شکایت کرتی۔ خیر دین ہنستا۔

”یہ سائیکل ہے بیٹا، وہ گاڑی ہے، یہ ٹانگوں سے چلتی ہے وہ پٹرول سے۔ اب سائیکل گاڑی کی طرح تو نہیں بھاگ سکتی نا۔“ چڑیا، خیر دین کی بات تو سمجھتی تھی پر مسئلہ یہ تھا کہ وہ کسی صورت بھی ہرج ہرج بار بی ڈول کو ایک بار ضرور دیکھ لینا چاہتی تھی۔

وہ ایک ایسے اسکول میں پڑھتی تھی جہاں صبح بچوں کو چھوڑنے کے لیے شاندار گاڑیوں کی قطاریں ہوتی تھیں یا پھر کچھ اسکول وینز اور مسرودہ سائیکل پر وہاں آنے والی واحد اسٹوڈنٹ تھی۔ ان شاندار گاڑیوں کے ہجوم میں خیر دین بڑی مشکل سے اپنی سائیکل کے لیے رستہ بناتا۔ گاڑیوں سے بچتا بچتا اسے اسکول کے مین گیٹ پر چھوڑنا تھا اور پھر اسی طرح چھٹی کے وقت اسے لینے کے لیے موجود ہوتا۔ یہ ڈی سی اور اس کی بیوی کی طرف سے ایک فیور تھی اور گاڑیوں کے اس ہجوم میں سائیکل پر سفر کرتے ہوئے چڑیا کا دل کبھی ویسی گاڑی میں بیٹھنے کو تو چاہتا تھا جو وہ اپنے اسکول کے باہر دیکھتی تھی جس میں اس کے کلاس فیلو اور اسکول فیلو آتے تھے لیکن اسے کبھی اس سائیکل پر شرمندگی نہیں ہوتی تھی جس کے پیڈل گھماتا اس کا نانا اسے سال کے ہر موسم میں وقت کی پابندی کے ساتھ وہاں لا کر چھوڑتا اور وہاں سے لے کر جاتا تھا۔ سائیکل کے اس دن منٹ صبح اور دن منٹ دوپہر کے سفر میں وہ اور خیر دین بہت ساری باتیں کرتے تھے۔ وہ خیر دین کو سڑک پر اور اسکول کے باہر نظر آنے والی کوئی نئی گاڑی دکھاتی، خیر دین اسے ماڈل بتاتا۔ وہ اسے کوئی سرکاری جیب یا سرکاری نمبر پلیٹ والی اسٹاف کار دکھاتی تو وہ اسے اس آفیسر کا عہدہ بتاتا۔ وہ اسے اپنے اسکول میں ہونے والے قصے سناتی اور وہ اسے گھر میں اپنی نوکری کی اس دن کی مصروفیات بتاتا۔ اور ان ساری باتوں کے درمیان چڑیا ایک دم عجیب و غریب سوال کرتی یا اپنے کسی مستقبل کے منصوبے سے خیر دین کو آگاہ کرتی۔

”نانا میں جب بڑی ہوں گی تو ایک کار بناؤں گی۔“ دوسرے بچوں کے ارادے خریداری سے شروع ہوتے تھے چڑیا کے ایجادات سے۔ ”اچھی بڑی سی کار جیسے صاحب کی اسٹاف کار ہے نا ویسی کار۔“ وہ خیر دین کو بتاتی، وہ ہنستا ہنستا ہوتا۔ ”لیکن چڑیا تم تو ڈاکٹر بنو گی..... ڈاکٹر تو علاج کرتے ہیں گاڑیاں تھوڑی بناتے ہیں۔“ خیر دین لقمہ دیتا۔ چڑیا سوچ میں پڑ جاتی۔

”اچھا نانا پھر میں ایک کار خرید لوں گی۔“ وہ چند لمحوں بعد اپنا ترمیم شدہ منصوبہ پیش کرتی۔ ”پر گاڑی تو بہت مہنگی ہوتی ہے اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے؟“ خیر دین ہنستے ہوئے کہتا۔ ”میں جب ڈاکٹر بنوں گی تو اسپتال میں جاب کروں گی اس سے جتنے پیسے ملیں گے میں سب جمع کر لوں گی پھر گاڑی خرید لوں گی۔“ وہ اپنا طویل المدتی پلان بتاتی۔

”اچھا پھر گاڑی خرید کر کیا کرو گی؟“ خیر دین اگلا سوال کرتا۔ ”پھر ہم اس میں جایا کریں گے۔ آپ، امی اور میں..... تینوں اس میں بیٹھیں گے۔“ ”تم ایسا کرنا مجھے ڈرائیور رکھ لینا اس گاڑی کا۔“ خیر دین ہنس کر کہتا۔ ”نہیں نانا، ایک ڈرائیور بھی رکھ لیں گے بس ہم سب پیچھے بیٹھ کر جایا کریں گے مزے مزے سے۔“ وہ مسکراتے ہوئے خیر دین کو بتاتی۔

”چلو ٹھیک ہے چڑیا لیکن بیٹا یہ بات ضرور یاد رکھنا کہ تمہیں لوگوں کا علاج کرنے کے لیے ڈاکٹر بننا ہے، بڑی گاڑیوں کے لیے نہیں۔“ خیر دین اسے نصیحت کرنا نہ بھولتا۔

”جی نانا۔“ وہ فرمانبرداری سے سر ہلاتی۔

”شاباش! خیر دین اسے سراہتا۔

”اور نانا جو غریب اور بوڑھے لوگ ہوں گے میں ان سے پیسے نہیں لوں گی، فری میں علاج کیا کروں گی۔“ چڑیا چند لمحوں بعد ایک دم سنجیدگی سے کہتی اور خیر دین خوش ہو جاتا۔

☆☆☆

شیردل اب کرسی پر سیدھا بیٹھا فیاض سے بات کر رہا تھا۔ ”کب آئی ہے واپس؟“

”اچھا اور چارج کب سے لے رہی ہے؟“

”ہاں دے دو نمبر۔“

شہر بانو سانس کھاتے ہوئے شیردل کو فون پر بات کرتے دیکھتی رہی۔ کوئی چیز تھی جو شیردل کے انداز میں منتوں میں تبدیل ہوئی تھی اس کی باڈی لینگویج میں اس کے لب و لہجے میں اس کی آنکھوں میں اور اس میں اور وہ ہمیشہ سے ہوتے دیکھتی آتی تھی۔ ہمیشہ عکس مراد علی کے نام پر وہ شیردل پر ایسے ہی اثرات دیکھتی تھی۔ وہ تبدیلی پہچان لیتی تھی لیکن وہ اس تبدیلی کو کبھی کوئی نام نہیں دے سکتی تھی کیونکہ وہ یہ سمجھ نہیں پاتی تھی کہ عکس کے نام پر شیردل میں جو جھلکتا تھا وہ کیا تھا۔

اس نے پہلی بار عکس مراد علی کا نام اپنی انگیجمنٹ (Engagement) کے ایک ہفتے کے بعد سنا تھا۔ شیردل کا کوئی بیچ میٹ اور دوست اپنی بیوی کے ساتھ بوسٹن آیا ہوا تھا۔ شیردل نے انہیں شہر بانو سے ملوانے کے لیے ڈنبر پر انوائٹ کیا تھا اور ڈنبر کے دوران ہی نافع نے شیردل سے کہا۔

”اور ہاں..... عکس بھی مبارک باد دے رہی تھی تمہیں۔“ شیردل فوراً سے مچھلی کا ٹکڑا اٹھاتے اٹھاتے ٹھٹھکا تھا۔ ”تم کب ملے ہو اس سے؟“ شیردل اب نافع سے پوچھ رہا تھا۔

”یہاں امریکا آنے سے پہلے۔“ نافع بتا رہا تھا۔ ڈی ایم جی والوں کی گیٹ ٹو گیدر تھی وہیں ملا ہوں۔ وہاں تمہارا ذکر ہوا تمہاری انگیجمنٹ منٹ کا ذکر ہوا تو اس نے مبارک باد دینے کے لیے کہا۔“ نافع بتا رہا تھا۔

”کیسی ہے وہ؟“ شیردل پوچھ رہا تھا۔

”پشاور میں رہ رہ کر پشتون ہو گئی ہے آدھی..... مذکر موٹ خراب ہو گئے ہیں اس کے۔“ نافع، شیردل کے سوال پر ہنسا تھا۔

”میرا خیال ہے وہ پشتونوں کے اس کو دیکھ کر صبح ہو گئے ہوں گے۔“ شیردل نے بے ساختہ بے حد سنجیدگی سے تبصرہ کیا۔ دونوں اپنی بات پر قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔ شہر بانو گفتگو سنتے ہوئے چپ چاپ ڈنر کرتی رہی۔

وہ پہلا موقع نہیں تھا جب اس نے شیردل کو کسی لڑکی کے بارے میں بات کرتے یا اس کا حال احوال پوچھتے دیکھا تھا۔ اس کے حلقہ احباب میں لڑکیوں کی لمبی چوڑی تعداد تھی اور ان میں سے بہت سی اس کی بہت پرانی اور کلوز فرینڈز تھیں۔ وہ ان سب سے رابطے میں رہتا تھا اور گرم جوشی کا یہی عالم دوسری طرف سے بھی تھا اور اگر میل ملاپ والیاں فرینڈز نہیں تھیں تو پھر بیچ میٹس تھیں۔ شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گیا تھا جب وہ شیردل کی کسی نئی دوست سے متعارف نہ ہوئی ہو اور اس بار یہ نیا نام عکس مراد علی کا تھا۔ ڈنر ٹیبل پر نافع کی بیوی تاباں سے باتیں کرتے شہر بانو نے سوچا تھا۔

”Still Single?“ تاباں کی کوئی بات سنتے ہوئے اس نے کچھ حیران ہو کر شیردل کا چہرہ دیکھا تھا اور اس

وقت پہلی بار اس نے شیردل کے چہرے اور آنکھوں میں وہ چیز دیکھی تھی جو پھر ہمیشہ اسے اس نام پر نظر آتی تھی۔  
 ”بتایا تو نہیں اس نے کچھ..... اگر Status تبدیل ہوا ہوتا تو بتاتی تو سہی لیکن میں نے سنا ہے کہ غنی اور وہ کافی قریب ہیں آج کل۔“ شہر بانو نے ڈرنک کاسپ لیتے ہوئے شیردل کو بے اختیار اپنی کرسی پر پہلو بدلتے دیکھا۔  
 ”غنی حمید؟“ شیردل کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ ”Don't tell me“ تاہاں کی باتوں میں شہر بانو کی دلچسپی ایک دم کم ہوتی شروع ہو گئی تھی۔ کوئی چیز تھی شیردل کے انداز میں جس نے اسے مضطرب کیا تھا۔ ہاتھ میں پہنی منگنی کی پیش قیمت انگلی کے باوجود، اپنے بیڈروم کی بیڈ سائڈ ٹیبل پر پڑے اس کارڈ کے باوجود جو شیردل نے اسے منگنی پر دیا تھا اور جس میں اس نے شہر بانو کے ساتھ زندگی بھر ساتھ بھانے کا وعدہ کیا تھا۔ شیردل کے والٹ اور اپنے والٹ میں رکھی ایک دوسرے کی تصویروں کے باوجود..... کچھ تھا جس نے شہر بانو کو ہلایا تھا۔  
 ”تکس اور غنی..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ اب شیردل کو دو ٹوک انداز میں کہتے دیکھ رہی تھی۔  
 Roasted Salmon کو بھول کر اس وقت نیپکن سے اپنا منہ پونچھتے ہوئے نافع سے کہہ رہا تھا۔

”لیکن میں نے فی الحال کافی لوگوں سے یہی سنا ہے۔ میرا خیال ہے دو چار مہینوں میں شادی کرنے والے ہیں وہ دونوں۔“ کچھ لوگوں کا تو خیال ہے کہ شاید منگنی ہو چکی ہے دونوں کی۔“ شہر بانو نے شیردل کو ایک دم چپ ہوتے دیکھا تھا اس نے نافع سے دوبارہ عکس کے حوالے سے کچھ نہیں پوچھا تھا لیکن شہر بانو کو یوں لگا تھا جیسے وقتی طور پر وہ دہنی طور پر مکمل طور پر غائب دماغ ہو گیا تھا۔ وہ اب اتنے عرصے سے اس کے ساتھ تھی اور اس کے اتنے قریب تھی کہ شیردل کے ماتھے پر آنے والی شکن کو بھی کتاب کے صفحے کی طرح پڑھ لیتی تھی یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کی اس اچانک خاموشی اور آف ہو جانے والے موڈ کو نہ محسوس کرتی، عکس مراد علی کا نام بہت بری طرح رجسٹر ہوا تھا۔ اس رات ڈنر سے ان کی واپسی بہت دیر سے ہوئی تھی اور واپسی کے پورے راستے شیردل اس سے گفتگو کے دوران مکمل طور پر عدم توجہی کا شکار تھا۔  
 اگلے دن وہ نارمل تھا جیسے وہ ہمیشہ ہوتا تھا اور اسے نارمل دیکھ کر ساری رات بستر میں کروٹیں لے لے کر جاگتے رہنے والی شہر بانو بھی نارمل ہو گئی تھی لیکن عکس کا نام ایک عجیب سی بازگشت بن گیا تھا جو رہ کر گونجتی تھی۔  
 ”تم نے کبھی کسی سے محبت کی مجھ سے پہلے؟“ اس ڈنر کے ایک ہفتے کے بعد شہر بانو نے شیردل سے وہ سوال کیا تھا جو عکس کا نام اسے بار بار پوچھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہ سوال کر کے کیا چاہتی تھی۔ کوئی تصدیق یا کوئی تسلی.....؟

”یہ ایک انتہائی احمقانہ سوال ہے۔“ جواب تڑاق سے آیا تھا۔ وہ رات کے وقت بے مقصد سڑک پر ٹہلتے ہوئے روٹنڈ کا جو کھارے تھے۔

”خیر احمقانہ والی تو کوئی بات نہیں۔“ شہر بانو نے مدافعتیہ انداز میں کہا۔  
 ”کسی بھی مرد سے یہ سوال احمقانہ ہی ہوتا ہے۔“ شیردل نے شہر بانو کے ہاتھ میں پکڑے کا جو کے لفافے سے چند کاغذ نکال کر انہیں پھاٹکتے ہوئے اطمینان سے کہا۔  
 ”احمقانہ کیوں؟“ شہر بانو کو اعتراض ہوا۔

”پار مرد شادی کے بعد بیوی بچوں کی موجودگی میں محبت کر سکتا ہے تو منگنی کی آمد سے پہلے مہاتما بدھ بن کر کیوں رہے گا۔“

”ہاں تو یہی پوچھ رہی ہوں کہ تم نے کسی سے محبت کی ہے؟“  
 ”کسی سے.....؟ کیوں سے۔“ شیردل نے کچھ اور کا جو پھاٹکے۔  
 ”محبت کا پوچھ رہی ہوں فلرٹ کا نہیں پوچھ رہی۔“ شہر بانو نے اسے ٹوکا۔  
 ”دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا.....“ وہ اسی انداز میں بولا تھا۔  
 ”تم میرے ساتھ محبت کر رہے ہو یا فلرٹ؟“ شہر بانو نے ایک دم اس سے پوچھا وہ بے ساختہ ہنسا۔  
 شہر بانو کو بھی ہنسی آئی تھی..... حالانکہ آنا غصہ چاہیے تھا۔  
 ”پھر بتاؤ نا.....“ شہر بانو نے دوبارہ پوچھا۔  
 ”بار بتایا تو ہے..... بہت محبتیں کی ہیں۔“ شیردل نے بے پروائی سے کہا۔  
 ”تبھی کسی سے شادی کرنے کا کیوں نہیں سوچا۔“ شہر بانو نے کہا۔  
 ”کس سے شادی؟“ وہ چونکا۔  
 ”کسی بیج میٹ یا گرل فرینڈ سے؟“

اس بار شہر بانو نے بڑے بے تامل انداز میں مچھلی کو چار اچھینکا تھا۔ اس نے عکس کا نام لیے بغیر عکس کا ذکر کیا تھا۔  
 ”تم اپنی تعریف سننا چاہتی ہو تو میں ویسے ہی کر دیتا ہوں۔ تم ماضی کی کسی محبوبہ کا نام اگلوانا چاہتی ہو تو اس کے لیے تم مجھے 60 سال کا ہونے دو۔“ مچھلی نے چارے کو کانٹے اور چھری کی مدد سے ہب سے اتار کر کھایا تھا۔ وہ شیردل سے بھی کچھ اگلو نہیں سکتی تھی، اسے جوابات نہیں بتانی ہوتی تھی وہ نہیں بتاتا تھا۔ شہر بانو نے بے اختیار گہری سانس لی تھی۔  
 ”آہیں بھرنے والی کیا بات ہے؟“ شیردل ساتھ چلتے چلتے ایک دم چونکا۔  
 ”تم سوال کا جواب نہیں دو گے تو اور کیا کروں گی؟“ شہر بانو نے کہا۔

”چلو پھر دے دیتا ہوں..... کم از کم ماضی میں 10 لڑکیاں ایسی ضرور ہوں گی جن سے میں نے سنجیدگی سے شادی کے بارے میں سوچا ہوگا..... لیکن میں خوش ہوں کہ میں نے صرف سوچا اس پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کی۔“  
 ”کیوں؟“ شہر بانو کی سنجیدگی ختم ہونے پر نہیں آرہی تھی۔

”کیونکہ اپنی زندگی کے سنہری دن تباہ کرنے کے شادی کے علاوہ بھی اور بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔“ وہ بے حد سنجیدگی سے غیر سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شہر بانو نے بات ختم کر دی تھی۔

عکس کا ذکر پھر اس کے بعد کئی بار ان کی زندگی میں سامنے آتا رہا تھا۔ ہر بار اگر شیردل اس پر ٹھکتا تھا تو شہر بانو بھی چونکتی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ زندگی اتنی مصروف ہونے لگی تھی کہ اسے شیردل کے حوالے سے جو تھوڑے بہت خدشات تھے وہ جاتے رہے تھے۔ وہ ایک Exceptional شوہر تھا۔ محبت کرنے والا۔ خیال رکھنے والا، وفادار..... شہر بانو کو یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ اپنے حلقہ احباب میں خواتین کی لمبی چوڑی تعداد رکھنے اور ہر عورت سے بے تکلفی سے بات کر لینے کے باوجود شیردل جہاں گئے داستانیں چھوڑ آئے والے مردوں میں سے نہیں تھا۔ وہ اگر کسی عورت سے بے تکلف ہو سکتا تھا تو اس بے تکلفی کو حدود و قیود میں رکھنا بھی اسے آتا تھا اور اس میں شادی شدہ ہونے کے لیبل سے زیادہ شیردل کے اپنے مزاج کا دخل تھا۔ شہر بانو نے شیردل کے حوالے سے سارے تنقیدات اپنے ذہن سے نکال دیے تھے، وہ بھی جو ایک بیوی کے طور پر فطری



طور پر ہر بیوی کے ہوتے تھے..... لیکن اس کے باوجود صرف عکس مراد علی ایک ایسا نام تھا جس پر شہر بانو کبھی بھی شیردل کا چہرہ دیکھنا نہیں بھولتی تھی اور اتنے سالوں میں بھی اس کے چہرے پر آنے والا تاثر ایک جیسا ہی ہوتا تھا۔  
”عکس مراد علی آرہی ہے فیاض کی جگہ پر؟“ شیردل کے فون بند کرنے پر شہر بانو نے چائے پیتے ہوئے اس سے پوچھا۔  
”ہاں، فیاض نے ہی ابھی بتایا ہے مجھے..... چائے کا ایک کپ بنا دو مجھے۔“ شیردل نے فون نیبل پر رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

”ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر یہ پہلی دو من آفیسر ہے شاید؟“ شہر بانو نے چائے بناتے ہوئے شیردل سے پوچھا۔  
”اس وقت تو ہاں..... پنجاب میں کوئی اور دو من آفیسر اس پوسٹ پر کام نہیں کر رہی لیکن پہلے چند خواتین ڈپٹی کمشنر کے طور پر Serve کر چکی ہیں۔“ شیردل نے دوران میں کام کرتے مایوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ اب کسی سوچ میں ڈوبا لگ رہا تھا۔ چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے شہر بانو نے پوچھا۔  
”کیا سوچ رہے ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ شیردل نے مسکرا کر اسے ٹالا تھا وہ اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ عکس مراد علی کے ایک ہی ڈویژن میں ہونے کا مطلب اس کے لیے ایک نہ ختم ہونے والا Stress تھا۔ وہ خاتون آفیسر 24 گھنٹے کو 48 گھنٹے سمجھ کر کام کرنے والوں میں سے تھی اور وہ جہاں بھی کام کرتی تھی، اس کی Competence وہاں پر دوسرے مرد آفیسرز کے لیے بہت مسائل پیدا کر دیتی تھی۔

وہ ڈی ایم جی کی ان چند خاتون آفیسرز میں سے ایک تھی جن سے پروفیشنل جیسی رکھنے کے باوجود ان کے کولیکز ان سے مرعوب ہونے پر مجبور تھے۔ وہ واحد نو جوان آفیسر جس کی قابلیت کو ماننے اور سرانے میں اس کے میل کولیکز کا شاؤ و نزم آڑے نہیں آتا تھا اور اس میں اس کی قابلیت کے ساتھ ساتھ اس کی پرسنالٹی کا بہت زیادہ دخل تھا اور اس قابلیت اور ٹریک ریکارڈ کے ساتھ اس کا کسی بھی جگہ پر ہونے کا مطلب تھا کہ انہیں عکس مراد علی کے سامنے Over shadow ہو جانے سے بچنے کے لیے اس سے کہیں زیادہ لگن اور مستعدی کے ساتھ کام کرنا پڑتا تھا جتنا کسی دوسرے مرد آفیسر کے ساتھ کام کرنے میں۔

”وہ تو فل براٹ اسکالرشپ پر امریکا گئی ہوئی تھی؟“ شہر بانو کو یک دم یاد آیا۔ آخری بار ان کے گھر پر کسی گیٹ ٹو گیدر پر عکس اور شیردل کے کسی بیچ میٹ نے اس کا ذکر اسی حوالے سے کیا تھا۔  
”واپس آگئی ہے۔“ شیردل نے چائے کا سپ لیتے ہوئے مختصر کہا۔

”Isshesingle“ شہر بانو نے اچانک پوچھا۔ چائے پیتے ہوئے شیردل ایک لمحے کے لیے ٹھکا تھا۔  
”I don,t know..... مثال کو لے کر آؤ ذرا!“ شیردل نے جواب دیا پھر اسی سرعت سے سوال بدلا۔ عکس منٹوں میں شہر بانو کے ذہن سے غائب ہوئی تھی۔

”میں دیکھتی ہوں اسے..... اسے آج ویسے بھی بابا سے بہت سی شکایتیں کرنی ہیں۔“ شہر بانو نے جاتے ہوئے جیسے اسے وارن کیا تھا۔ شیردل مسکرا دیا۔ چائے کا ایک اور سپ لیتے ہوئے اس نے سیل فون نکال کر وہ بزنس کارڈ دیکھا تھا جو فیاض نے اسے ٹیکسٹ کیا تھا۔ وہ، وہ نمبر نہیں تھا جو شیردل کے پاس تھا یقیناً اس نے نمبر تبدیل کر لیا تھا۔ چند لمحے وہ نمبر اور نام دیکھتا رہا پھر اس نے نمبر پر کال کرنا شروع کی۔

☆☆☆

عکس کا نام اس نے پہلی بار اپنے باپ سے سنا تھا۔ بختیار فون پر پبلک سروس کمیشن کے کسی ممبر سے بات کر رہا تھا جو اس کا دوست تھا۔ سی ایس ایس کے تحریری امتحان کا نتیجہ ایک ڈیڑھ ہفتے میں آنے والا تھا اور بختیار کے کسی دوست نے اسے شیردل کے رزلٹ کے بارے میں آگاہ کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ وہ تحریری امتحان میں دوسرے نمبر پر تھا کہ شیردل بختیار اور بختی سلیسی کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کے دوران کمرے میں ہی تھا۔  
”اوہ، اچھا دوسری پوزیشن ہے.....“ بختیار نے مسکراتے ہوئے شیردل کو دیکھا تھا وہ بھی جواباً مسکرایا تھا۔  
”تھینک یو..... اور پہلی پوزیشن پر کون ہے؟“ شیردل باپ کے سوال پر بے اختیار مسکرایا۔ اس کے ذہن میں بھی اسی وقت یہی سوال آ رہا تھا۔

”وہ کون ہے؟“ اس نے بختیار کے ماتھے پر چند سوالیہ بل دیکھے۔ وہ یقیناً پہلے نمبر پر آنے والے امیدوار کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ شیردل نے اندازہ لگایا۔  
”Ok...oh...hmm“ اس نے بختیار کو وقفے وقفے سے کہتے سنا..... پھر چند اور رسمی جملوں کے بعد انہوں نے فون رکھ دیا۔ شیردل نے تب ان سے پوچھا تھا۔  
”فرسٹ پوزیشن پر کون ہے؟“ اور اس وقت شیردل نے پہلی بار عکس کا نام سنا تھا۔

چند ہفتوں بعد شروع ہونے والے انٹرویوز Intelligence اور سائیکلو جیکل ٹیسٹ کے دوران وہ جیسے لاشعوری طور پر..... پہلے نمبر پر براجمان اس خاتون امیدوار سے کہیں نہ کہیں ٹکرانے کا منتظر رہا تھا، وہ آمنا سامنا کہیں نہیں ہو سکا تھا۔

عکس کا نام اس نے دوسری بار ایک بار پھر اپنے باپ سے ہی سنا تھا..... سر توڑ کوشش کے باوجود شیردل تحریری امتحان کے رزلٹ کو تبدیل نہیں کر سکا تھا۔ فائنل رزلٹ میں پہلے دس امیدواروں کی فہرست میں صرف پہلی دو پوزیشنز پر موجود امیدوار تھے جنہوں نے تحریری امتحان کے رزلٹ کو برقرار رکھا تھا باقی آٹھ امیدواروں کی پوزیشن میں تبدیلی ہوئی تھی اور ان میں سے کوئی بھی لڑکی نہیں تھی اور دراصل پہلی بیس پوزیشنز میں صرف پہلی پوزیشن کے علاوہ باقی تمام لڑکوں کے پاس تھیں۔ ہیڈ آف ڈائمنل پر کسی لڑکی کو دیکھ کر پاکستان میں کسی مرد کی انا کو جتنا جھکا لگتا ہے، وہ جھکا شیردل کو بھی لگا تھا اور اسے یقین تھا تین سے دس نمبر تک موجود باقی تمام لڑکوں کو بھی پہلی پوزیشن پر آنے والا صرف اگر کسی کو دیکھتا ہے تو دوسری پوزیشن پر آنے والے کو..... یہ جیسے فاصلہ چیک کرنے کی ایک محتاط کوشش ہوتی ہے لیکن پہلی پوزیشن پر آنے والے کو سب دیکھتے ہیں باقی ساری پوزیشنز پر موجود لوگ بیچ کی کسی پوزیشن سے اپنا فاصلہ نہیں ناپتے وہ ٹاپ پر موجود شخص سے ہی کمپیرزن کرتے ہیں..... اور یہ فرق شیردل سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا تھا جو ہمیشہ top ladder پر بیٹھتا آیا تھا۔

اس کا خیال تھا اس کے اور عکس کے درمیان Neck toneck فاسٹ ہوئی ہوگی، مارکس اور پرسنل ایجنسی کی..... لیکن ایک اور کاری ضرب اسے اس وقت لگی تھی جب بختیار نے اس کی یہ خوش فہمی بھی دور کر دی تھی۔ عکس اور اس کی پرسنل ایجنسی میں بہت فرق تھا اور پہلی پوزیشن سے ہاتھ دھونے کے بعد یہ دوسری ہزیمت تھی جو شیردل نے اٹھائی تھی۔  
عکس سے اس کا تیسرا تعارف نیوز پیپر میں ٹاپ کرنے والے امیدوار کے انٹرویو کے ذریعے ہوا تھا۔ شیردل،

بختیار کی وجہ سے عکس کے فیملی بیک گراؤنڈ سے تحریری امتحان کے بعد ہی واقف ہو گیا تھا۔ اب اگر اسے دلچسپی باقی تھی تو وہ چہرے کے حوالے سے شناسائی تھی۔ وہ ایک انگلش نیوز پیپر کا یوتھ ایڈیشن تھا جس میں اس نے پہلی بار عکس کی شکل دیکھی تھی۔ بندھے بالوں، دھلے چہرے اور جدید تراش خراش کے سوٹ میں ملبوس ایک نوجوان اٹریکٹو لڑکی جو خوب صورتی کے بہر حال اس معیار پر نہیں آتی تھی جس پر شیردل رکھ کر کسی بھی لڑکی کو خوب صورت قرار دیتا تھا۔ وہ اس کے باوجود اس کی تصویر کو بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ یہ جیسے اکیڈمی میں اپنے rival سے ملاقات سے پہلے اس کو Judge کرنے کی ایک کوشش تھی۔ شیردل نے عکس کے انٹرویو کے ہر جواب کو بہت غور سے پڑھا تھا۔ ان جوابوں کے بغیر بھی اسے اس لڑکی کی ذہانت اور قابلیت پر شبہ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود شیردل نے بہت وقت صرف کیا تھا ان سوالات اور ان کے جوابات پر۔ وہ ڈی ایم جی کی ایلوکیشن میں ایک بار پھر پہلے نمبر پر تھی۔ شیردل کے کامن کے 18 لوگ ڈی ایم جی میں جاپائے تھے اور Elite 18 کے اس گروپ میں صرف ایک لڑکی تھی۔ اور یہ تیسری بار تھا جب نیوز پیپر میں شیردل نے اپنا نام اس کے نام کے نیچے دیکھا تھا۔ چٹک سی چٹک تھی۔

☆☆☆

”تیری ہے زمیں، تیرا آسمان  
تو بڑا مہرباں، تو بخشش کر  
سبھی کا ہے تو، سبھی تیرے  
خدا میرے تو بخشش کر“

اسمبلی کا وسیع و عریض ایریا صبح کے اس وقت صرف ایک آواز سے گونج رہا تھا۔ چڑیا کی آواز سے جو اس اسمبلی کے سامنے ایک Cemented پلیٹ فارم پر مائیک کے سامنے بے حد جذب سے یہ دعائیہ کلام پڑھ رہی تھی۔ اسمبلی ایریا میں موجود تمام لوگ جیسے کسی ٹرائس میں تھے۔ اور یہ مہینے میں ایک بار ضرور ہوتا تھا جب چڑیا کو سسٹر ایکنس خاص طور پر اسمبلی میں یہ دعائیہ کلام پڑھنے کے لیے بلوائی تھی۔ اسکول میں ہونے والی تقریبات میں بھی چڑیا کو اسی دعائیہ کلام کے لیے بلوایا جاتا تھا۔ مسلمان ہونے کے باوجود۔

”تیری مرضی سے اے مالک  
ہم اس دنیا میں آئے ہیں  
تیری رحمت سے ہم سب نے  
یہ جسم و جاں پائے ہیں“

سماں باندھنا شاید چڑیا کے اس دعائیہ کلام کے لیے بہت چھوٹا لفظ تھا۔ اس کی آواز میٹھی اور ملائم تو تھی ہی لیکن اس میں ایک عجیب سا سوز تھا۔ وہ وہاں موجود سسٹر اور فار پیتھر پر رقت طاری کر دیتی تھی۔ ان کا اگر بس چلتا تو وہ غیر مسلم ہونے کے باوجود اسے اسکول Choir کا حصہ بنا دیتے اور انہیں یقین تھا کہ اگر چڑیا اس Choir کا حصہ ہوتی تو وہ کیتھولک بورڈ آف ایجوکیشن کے زیر اہتمام ہونے والے تمام Regional مقابلے جیت آتی۔

”تیری ہے زمیں، تیرا آسمان  
تو بڑا مہرباں، تو بخشش کر

سبھی کا ہے تو سبھی تیرے  
خدا میرے تو بخشش کر“

میوزک ٹیچر سر جیمز کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے لاشعوری طور پر اسے ہدایات دے رہے تھے لیکن وہ جانتے تھے چڑیا کو ان کی ہدایات کی ضرورت نہیں ہے، وہ اس کلام کو گانے میں استاد تھی۔ تمام اسمبلی اب چڑیا کے ساتھ اس Devotional Song کو گارہی تھی۔

”خدا میرے تو بخشش کر“

پہلی تین لائنز کورس کی شکل میں گانے کے بعد آخری لائن پھر صرف چڑیا نے گائی تھی۔ وہ ایک Ritual تھی۔ وہ میٹھی ملائم، مدھر آواز اب کی بورڈ کے C-Major نوٹس پر high notes سے Low میں آتے ہوئے اس Song کا اختتام کر رہی تھی۔ اسمبلی میں گونجتی تالیوں کے درمیان چڑیا ایک اور Flawless rendition کے بعد اسٹیج سے اترتی تھی اور اس وقت اس نے باربی ڈول کو بھی دائیں جانب بنی لائنز میں کھڑے دیکھا تھا جو اس کے لیے جوش کے عالم میں تالیاں بجا رہی تھی۔ مانیٹوری ونگ ہفتے میں ایک بار کمانڈر اسمبلی انڈکٹر کرتا تھا اور آج بھی ایسا ہی ایک دن تھا۔ باربی ڈول اس دن مکمل طور پر چڑیا کے عشق میں گرفتار ہو گئی تھی۔ اس کی آواز کے عشق میں، اس کے اشاروں کے عشق میں جو اس کا اسکول میں تھا۔ اور اس Red sach کے عشق میں جو اس کے کندھے پر بچی ہوئی تھی۔

اس دن سہ پہر کو ہوم ورک کرتے ہوئے باربی ڈول لاشعوری طور پر وہی Devotional Song گاتی رہی جو اس نے اسمبلی میں چڑیا سے سنا تھا اور اس کی ماں نے یہ نوٹس کیا تھا۔ اس کے پوچھنے پر باربی ڈول نے اسے چڑیا کے Heroics کے بارے میں بتایا تھا۔ اس کی ممی مسکراتے ہوئے اس سے یہ سب سنتی رہی تھیں پھر انہوں نے باربی ڈول سے کہا تھا۔

”اچھا چلو سنو گی میں بھی اس سے کسی دن کچھ۔۔۔۔۔“ لیکن اس کی ممی نے چڑیا سے کچھ سننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گھر میں ایڈ جسٹ ہو جانے کے بعد وہاں ان کی نئی مصروفیات شروع ہو چکی تھیں اور ان مصروفیات میں نوکر کی ایک نو اسی سے کوئی Devotional Song سننے میں کس کو دلچسپی ہو سکتی تھی۔

البتہ چڑیا اور باربی ڈول اب اسکول میں ایک دوسرے کے کچھ زیادہ کلوز ہو گئی تھیں لیکن گھر میں یہ دوری اب تک برقرار تھی لیکن ایک کی آمد نے جہاں اور بہت سی جگہوں سے برف بگھلائی تھی وہاں یہ برف بھی بگھلا دی تھی۔ چڑیا اب آہستہ آہستہ اس وقت وہاں آنے لگی تھی جب گھر میں موجود نیچے کھیل رہے ہوتے ہاں البتہ بڑوں کی موجودگی میں وہ ایک بار پھر اسی طرح چھپ کر سب کچھ دیکھنے کی کوشش کرتی تھی۔

ایک کے بعد باربی ڈول اس گھر کا دوسرا فرد تھی۔ آٹھ سالہ وہ بچی غیر معمولی حد تک دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور ایک بے حد Likable پرسنالٹی کی مالک تھی۔ اس کے نام اور کام کی بازگشت صرف باربی ڈول اور ایک تک ہی محدود نہیں رہی تھی وہ آہستہ آہستہ گھر کے دوسرے افراد تک بھی پہنچنے لگی تھی۔

ایک نے ایک دن اپنے انکل کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے کہا۔ ”انکل جب شطرنج بورڈ پر کوئین سب سے پاورفل ہے تو پھر بورڈ تو کوئین کا ہونا چاہیے۔۔۔۔۔ کوئین ہی کو کنگ ہونا چاہیے۔“ ایک نے چڑیا کی زبان سے سنی ہوئی

لا جگ اپنے انکل کے سامنے پیش کر دی تھی۔ ایک کی ممی بھی اس وقت کوئی میگزین دیکھتے ہوئے وہیں موجود تھیں۔  
 "انٹرٹیننگ!" انکل نے چال چلتے ہوئے بے اختیار ایک مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہونا چاہیے نا؟" ایک نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"ہونا چاہیے لیکن ہونے نہیں سکتا۔" اس کے انکل نے مسکراتے ہوئے لیکن دو ٹوک انداز میں اس سے کہا۔

"لیکن کیوں؟" ایک نے جواب کے لیے اصرار کیا۔ وہ جیسے چڑیا کے لیے اس جواب کو کھوج رہا تھا جو چڑیا کی اس لا جگ کو غلط ثابت کر دیتا۔

"کیونکہ یہ رول ہے..... لیکن تمہیں یہ کہا کس نے ہے؟" سوال کا جواب دیتے ہوئے اس کے انکل کو جیسے اچانک خیال آیا تھا کہ یہ سوال ایک کا اپنا نہیں ہو سکتا تھا۔

"چڑیا نے کہا۔" ایک نے مدہم آواز میں کہا اور پھر اس نے سوچ سوچ کر چڑیا کی لا جگ بتائی تھی۔ ایک کی ممی میگزین ہاتھ میں لیے بے حد سنجیدگی سے اس کی گفتگو سنتی رہی تھیں پھر بات ختم کرنے پر انہوں نے اسی سنجیدگی کے عالم میں اپنے بھائی سے کہا تھا۔

"Over-ambitious۔" انہوں نے جیسے ایک لفظ میں چڑیا کو Describe کیا۔

"تم ذرا دیکھو، آج کل نوکروں کے بچے اگر اچھے اسکول میں پڑھنا شروع ہو جائیں تو وہ بیٹھ کر کیا کیا خیالی پلاؤ بنانا شروع ہو جاتے ہیں اور اپنے بچوں کو کیا کیا باتیں سکھانا شروع ہو جاتے ہیں۔ عمر سے پہلے میچور اور چالاک بنا دیتے ہیں انہیں اب تم اس لڑکی کی باتیں سنو، لگتا ہے یہ کہیں آٹھ، نو سال کی بچی کی باتیں ہیں۔ یقیناً یہ سب خیر دین اور اس کی بیٹی کی باتیں ہیں جو یہ بچی سن کر اپنی Interpretations کے ساتھ دیتی پھر رہی ہے۔" ایک کی ممی اب بے حد خفا انداز میں بات کر رہی تھیں۔ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ اس گفتگو میں ایسا تھا جو انہیں بری طرح چبھا تھا۔ ایک کے انکل جو اب صرف مسکراتے ہوئے ایک کے ساتھ جیسے بورڈ پر جیسے کے مہرے آگے پیچھے کرتے رہے۔

"تم دیکھو ڈی سی ہاؤس کے سرونٹ کوارٹرز میں بیٹھ کر یہ نوکر کیسی باتیں کرتے رہتے ہیں..... یہ یہاں بادشاہ کے محل میں بیٹھ کر بغاوت کی تیاری کی کوششیں ہیں۔" انہوں نے جیسے بے حد خفگی کے عالم میں اپنے بھائی سے کہا تھا۔ "اور اس بچی کو کاؤنٹ میں ایڈمیشن دلوانے کا کارنامہ یقیناً تمہاری بیوی کا ہوگا۔ یہ مدرٹریا بننے کے دورے اسی کو پڑتے ہیں، پوچھوں گی میں اس سے۔" ایک کی ممی کو چڑیا کی وہ باتیں واقعی میں ہی بری لگ گئی تھیں ورنہ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر اس طرح ری ایکٹ کرنے والی خاتون نہیں تھیں اور خاص طور پر کسی بچے کی بات پر ری ایکٹ کرنے والی وہ ریزروڈ طبیعت کی مالک تھیں مگر بہر حال خوف خدا رکھنے والی خاتون تھیں۔

"نہیں، یہ ہمارا کارنامہ نہیں ہے۔" ایک کے انکل نے اپنا اگلا مہرہ آگے بڑھاتے ہوئے بے ساختہ بہن کی خفگی دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ "یہ ہم سے پہلے یہاں Serve کر کے جانے والے آفیسر اور اس کی بیوی کا کمال ہے۔ اس بچی کی فیس وغیرہ بھی وہی ہے... کرتے ہیں۔ ہم لوگوں نے تو صرف کوارٹرز میں رکھنے کی اجازت دی ہوئی ہے خیر دین کو۔ But she is a bright girl میں جب بھی اسکول جاتا ہوں، سسٹرائیکٹس اس کی بہت تعریف کرتی ہیں....." انہوں نے تفصیل سے بہن کو بتایا تھا۔

"Whatever..... ذرا دیکھو تو سہی کیسی باتیں کر رہی ہے وہ....." ان کے بھائی نے ایک بار پھر

چڑیا کا دفاع کیا تھا۔

"آج کل کے بچے ویسے ہی ضرورت سے زیادہ اسمارٹ ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک نے بتایا تھا کہ وہ شطرنج وغیرہ بھی کھیلتی ہے تو Definitely وہ Exceptional ہی ہوگی..... اس لیے ضروری نہیں کہ خیر دین اور اس کی بیٹی ہی ایسی باتیں کرتے ہوں اس کے ساتھ خیر دین اچھا سمجھدار شریف آدمی ہے۔"

"انکل صرف کھیلتی نہیں ہے..... وہ بہت اچھا کھیلتی ہے۔ I beat me everytime I played with her اور اس نے مجھے بتایا وہ اپنے نانا کو بھی ہرا دیتی ہے جیسے میں اور انکل وہ آپ کو بھی ہرا سکتی ہے۔" ایک نے چڑیا کی حمایت کرتے کرتے ایک دم اپنے انکل کو یاد دلایا۔

"یہ اس نے کہا تھا؟" ایک کی ممی نے کچھ مزید خفا ہو کر اس سے کہا، ان کا بھائی بے اختیار ہنسا اور اس نے ایک کے بولنے سے پہلے کہا۔

"یہ میرے Nephew کی assesment ہے کہ وہ اتنا اچھا کھیلتی ہے کہ وہ مجھے بھی ہرا سکتی ہے۔" ایک کی ممی نے اس بار ایک سے کہا۔

"ایک تم اب اس کے ساتھ نہیں کھیلو گے۔" ایک ماں کی تنبیہ پر حیران ہوا۔ "لیکن ممی..... کیوں؟" اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتیں اس کے انکل کسی وزیٹر سے ملنے کے لیے اٹھ کر چلے گئے تھے۔

"کیونکہ یہ مجھے پسند نہیں ہے۔" ایک کی ممی نے بے حد مستحکم آواز میں اس سے کہا۔

"But she is a good girl" ایک نے اس کا دفاع کیا۔

"I am sure she is a good girl" لیکن بیٹا وہ ایک سرونٹ کی بچی ہے اور میں آپ کو ہمیشہ سے کیا سمجھاتی آئی ہوں..... ان کے اور ہمارے سیٹ اپ میں بہت فرق ہوتا ہے، ہمیں ان سے تھوڑا فاصلے پر رہنا چاہیے۔" اس بار اس کی ممی نے اس کو بڑے پیار سے اور رسائی سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ "اور پھر وہ تو ہے بھی ایک لڑکی..... آپ کو لڑکیوں کے ساتھ فرینڈ شپ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ بھائی کے ساتھ دوستی کریں، بہن کے ساتھ دوستی کریں Stay away from her ایک نے ایک لمحے کے لیے جیسے بورڈ کو دیکھا پھر ممی کو پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"لیکن ممی میں تو اس کو ٹینس کھیلنا سکھا رہا ہوں اگر میں اس کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دوں گا تو پھر اس کو ٹینس کھیلنا نہیں آئے گا۔" اس نے جیسے اپنے لیے چڑیا کے ساتھ رہنے کا کوئی بہانہ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی یہ جانے بغیر کہ وہ کتنا بچکانہ بہانہ تھا۔

"اس کو ٹینس سکھانا تمہاری ذمے داری تو نہیں ہے، وہ کہیں سے بھی سیکھ سکتی ہے۔" ایک کی ممی نے ذرا سا جھنجھلا کر کہا۔

"لیکن ممی وہ انورڈ نہیں کر سکتی..... آپ کو پتا ہے اس کے پاس ریکٹ بھی نہیں ہے۔" ایک کو چڑیا سے ایک بار پھر ہمدردی ہوئی۔

"تو یہ بھی ہماری ذمے داری نہیں ہے۔ اس کی ممی اور نانا کی ذمے داری ہے۔"

”لیکن می اس کے پاپا بھی تو نہیں ہیں نا، آپ ہی تو کہتی ہیں ہمیں ان کے ساتھ بہت Kind ہونا چاہیے جن کے پاپا نہ ہوں..... اور ہم کو ان کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔“ ایک نے اپنی می کو ان کی کبھی کہی جانے والی بات یاد دلانی۔ چند لمحوں کے لیے اس کی می کچھ جواب نہیں دے پائی تھیں۔ بڑوں کا سارا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں چھوٹوں کو نصیحت کے ذریعے اچھائی اور عمل کے ذریعے برائی سکھانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں اور اس کوشش کے نتیجے میں تربیت نہیں کنفیوزن دیتے ہیں۔

”اس کے نانا ہیں نا!“ اس کی می نے ایک کمزور لاجب دی۔

”پراس کے پاپا تو نہیں ہیں نا۔“ ایک نے ترکی بہ ترکی کہا۔

”دیکھو کسی سے دور رہنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اس کے ساتھ Unkind ہیں..... میں یہ تھوڑی کہہ رہی ہوں کہ تم اس سے بدتمیزی کرو یا اس کو تکلیف پہنچاؤ۔ بیٹا، میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ تم اس سے دور رہو۔“ ایک نے اس بار ماں سے کچھ نہیں کہا تھا وہ جیسے بورڈ پر اپنے مہروں کو آگے پیچھے کرتے ہوئے مصروف دکھنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ ایک چھوٹا سا بچہ ہونے کے باوجود اس کو اپنی می کے Argument کے کمزور ہونے کا اندازہ ہو گیا تھا۔

اگلے دن وہ ٹینس کورٹ پر تھا جب ہمیشہ کی طرح اپنے مقررہ وقت پر چڑیا وہاں آگئی تھی۔ ایک بچے کی زندگی کا سب سے مشکل ترین مرحلہ اس کو بھی درپیش تھا۔ ایک چیز جو اس کی پسندیدہ تھی اور دوسری طرف اس کی می کی ہدایت تھی۔ ایک بچہ ہوتے ہوئے بھی وہ یہ جان سکتا تھا کہ چڑیا کے بارے میں اس کی می کی رائے اور اندازہ ٹھیک نہیں تھا، وہ واقعی ایک اچھی لڑکی تھی..... پر دوسری طرف وہ ایک Obedient بچہ بھی تھا۔ بڑا بھائی..... اور ایک ایسا بچہ جس کی فرمانبرداری کی سب مثالیں بھی دیتے تھے۔

چڑیا نے آتے ہی اسپورٹس کٹ کو کھول کر اس میں سے ہمیشہ کی طرح دوسرا ریکٹ نکالنے کی کوشش کی۔ کٹ میں آج خلاف معمول دوسرا ریکٹ نہیں تھا۔ اس نے حیرانی سے ایک کو دیکھا جو اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے اپنے ریکٹ سے گیند کو دوسرے کورٹ میں پھینکنے میں لگن تھا۔ وہاں اس کی ہیلو کا جواب نہیں تھا۔ کوئی eye-contact نہیں تھا۔

”ایک..... ایک!“ اس نے ایک کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ متوجہ نہیں ہوا، وہاں مکمل خاموشی تھی۔

☆☆☆

سیل فون بج رہا تھا لیکن دوسری طرف سے کال ریسپونڈ نہیں ہو رہی تھی۔ شیردل فون ہاتھ میں لیے بے حد تحمل سے کال ریسپونڈ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کو زندگی میں جتنا انتظار اس عورت نے کرا دیا تھا کسی نے نہیں کروایا تھا۔ سیل فون بہت دیر تک بجتا رہا پھر شیردل نے کال ختم کر دی۔

”Shairdil here. please call me back“ ایک Text لکھ کر اس نے عکس کو بھیجتے ہوئے اس نے اپنا سیل سامنے پڑی ٹیبل پر رکھ دیا۔ سگریٹ کے کیس سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا کر سلگاتے ہوئے اس نے ٹانگیں دوپارہ ٹیبل پر رکھ دی تھیں۔ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے بھی اس کی نظریں مسلسل سیل فون کی تاریک اسکرین پر جمی تھیں۔ اگر وہ ایک راتگ نمبر سے کال نہیں لے رہی تھی تو کم از کم اب وہ اپنا تعارف کروا چکا تھا اور تعارف کروائے بھی تین منٹ ہو چکے تھے۔ وہ دل ہی دل میں ذرا سا جھنجھایا تھا اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اس نے یاد کیا آخری بار دونوں کی بات کب ہوئی تھی، تقریباً ایک سال پہلے جب اس نے عکس کو اس کی

برتھ ڈے پر مبارک باد دینے کے لیے فون کیا تھا۔ وہ اس وقت امریکا میں تھی، ان کی بات آدھے گھنٹے تک ہوتی رہی تھی پھر دونوں عیدوں پر ان کے درمیان بات نہیں ہو سکی۔ عکس کا فون نمبر بند تھا اور آنسر فون آن تھا۔ شیردل نے اس کے لیے مبارک باد کے پیغامات چھوڑ دیے تھے۔ دونوں بار مبارک باد کا کوئی جواب نہیں آیا۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اس نے شیردل کے پیغام نہ سنے ہوتے۔ شیردل کو ایک مبہم انتظار تھا اور کیوں تھا اس کا جواب بھی وہ اپنے آپ کو نہیں دے سکتا تھا۔

پچھلے پانچ چھ سالوں میں ان کی بہت کم ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ خاص طور پر شیردل کی شادی کے بعد تو تقریباً نہ ہونے کے برابر۔ اس کے باوجود شیردل کو اس کے بارے میں سب کچھ پتا چلتا رہتا تھا یا پھر وہ خبر رکھتا تھا۔

شہر بانو سے منگنی کے چند مہینوں بعد ہی اسے عکس کی اسلام آباد میں پوسٹنگ کے بارے میں پتا چلا تھا۔ شیردل بوسٹن میں بیٹھائیں دن اس اطلاع کو ہضم کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ یہ نا قابل یقین بات تھی۔ وہ اس سے پہلے پشاور میں تھی۔ پشاور سے سیدھا اسلام آباد جیسی Coveted position پر جہاں تمام Political اور ملٹری Big wigs اپنے بچوں اور بھانجے بھینچوں کو پوسٹ کروانے کے لیے جوڑ توڑ کرتے پھرتے تھے وہاں ایک خاتون آفیسر اور وہ بھی عکس مراد علی کی تعیناتی حیران کن تھی اور شیردل سے یہ کیسے ہضم ہو سکتی تھی جب وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر وہ فل براٹ اسکالر کے طور پر ہارورڈ میں نہ ہوتا تو اس وقت اسلام آباد کی اس سیٹ پر اسٹنٹ کمشنر کے طور پر وہ تعینات ہوتا۔ ایک سیکریٹری کے بیٹے کے طور پر وہ جیسے اپنا حق سمجھتا تھا، کسی امتحان کو ناپ کر کے سول سروس میں آنا اور بات تھی لیکن عملی میدان میں اچھی پوسٹنگز پر ہونے کے لیے کچھ دوسری قابلیتوں کا ہونا ضروری تھا اور شیردل کے پاس وہ چیک لسٹ پوری تھی۔

اسلام آباد کی وہ تعیناتی میرٹ پر ہوتی تب بھی ڈی ایم جی کے انہیں دو جونیئر آفیسرز کے درمیان ہوتی اور شیردل کو ایک مرد آفیسر کے طور پر ترجیح دی جاتی لیکن اب عکس مراد علی وہاں تھی جہاں وہ ہونا چاہتا تھا اور نہیں ہو سکتا تھا۔

”She is lady luck's blue-eyed girl“ اس کے اسی کے بیچ میٹ نے ہنستے ہوئے شیردل کو بتایا تھا جس نے اسے اس کی فیڈرل کپیٹل میں پوسٹنگ کے بارے میں بتایا تھا۔

”وہ تو وہ ہمیشہ سے ہے لیکن یہ پوسٹنگ.....“ شیردل اب بھی اسی طرح ہکا بکا تھا۔

”پشاور میں امریکن ایسوسی ایشن اور US Aid والوں کے ساتھ بہت کام کیا ہے اس نے۔ کہتے ہیں اس کی اس پوسٹنگ میں انہی کی کارفرمائی ہے، وہ بڑے متاثر ہیں اس خاتون کی قابلیت سے۔“ ظفر نے ان وجوہات کو بیان کیا جو اس کے خیال میں عکس کی... پوسٹنگ کی اصلی وجہ تھی۔ شیردل نے ظفر کے اس بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا وہ جانتا تھا اسلام آباد کی اس پوسٹنگ پر پاکستان کے اندر اور باہر موجود DMG کے تمام جونیئر آفیسرز اس وقت اسی طرح کے تبصرے فرما رہے ہوں گے۔ وہ کچھ انکوریٹے والی صورت حال تھی اور شیردل عکس سے بے حد جلیس ہونے کے باوجود اپنے حسد میں اس حد تک نہیں جاتا تھا کہ وہ اس کے پروفیشنل یا قابلیت کے حوالے سے سوال اٹھاتا یا اعتراضات کرتا۔

شہر بانو سے منگنی کے بعد عکس اور اس کے درمیان غنی حمید کے حوالے سے Argument ہوا تھا۔ وہ غنی کو شدید نا پسند کرتا تھا اور اکیڈمی میں ٹریننگ کے دوران غنی واحد آفیسر تھا جس کے ساتھ شیردل کی بول چال بھی نہیں تھی اور عکس اور غنی کی قربت اور متوقع شادی کے حوالے سے نافع سے علم ہونے کے بعد شیردل کی کوشش کے باوجود اپنے آپ کو زلی ایکٹ کرنے سے روک نہیں سکا تھا۔ جواباً وہی ہوا تھا جس کی شیردل کو توقع نہیں تھی

لیکن اسے کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ غنی کے معاملے پر ان کی آپس میں جس نوعیت کی گفتگو ہوئی تھی اس کے بعد شیردل نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ عکس سے دوبارہ کبھی رابطہ نہیں کرے گا۔

بوسٹن سے واپس آنے کے بعد اپنی شادی کے بعد لاہور میں پوسٹنگ کے دوران اس نے عکس کو اسلام آباد میں 14 اگست کی پرچم کشائی کی تقریب کی لائیو کوریج میں TV پر دیکھا تھا۔ وہ تقریب کے مختلف انتظامات کے سلسلے میں بار بار ادھر سے ادھر پھر رہی تھی۔ بالوں میں نکائے یا پھنسائے سن گلاسز، کندھے پر لٹکائے ایک بیگ اور ہاتھ میں پکڑے ایک وائرلیس کے ساتھ وہ پنڈال میں سینئر آفیسرز اور غیر ملکی مندوین کے درمیان ٹشل کا ک بنی نظر آرہی تھی۔ وہ ان بہت کم مواقع میں سے ایک موقع تھا جب شیردل اسے کسی افراتفری میں دیکھ رہا تھا اور پرچم کشائی کی اس تقریب کو پاکستان پرچم کے لیے اور شیردل، عکس کے لیے دیکھ رہا تھا۔ اگر اس تقریب میں وہاں جامرز کام نہ کر رہے ہوتے تو شیردل سیل پر اسے کوئی ٹیکسٹ ضرور کر دیتا اور اس ٹیکسٹ کے جواب میں شیردل کو جو جواب ملتا تھا اس سے اس کے چودہ طبق صاف ہو جاتے لیکن وہ پھر بھی یہ رسک لینے میں تامل نہ کرتا۔ شیردل کی سوچوں کا تسلسل ایک دم ٹھیل پر پڑے سیل فون کی آواز سے ٹوٹا تھا۔ اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر سیل فون اٹھایا وہاں عکس مراد علی کا نام چمک رہا تھا۔ وہ اسے کال بیک کر رہی تھی۔

☆☆☆

وہ پہلی بار تھا جب کسی نے چڑیا کا دل اتنی بری طرح سے توڑا تھا، وہ پندرہ منٹ زبرد چہرے کے ساتھ ٹینس کورٹ پر اس کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے بار بار سروں کرنے والے ایک کوچپ چاپ دیکھتی رہی۔ کٹ میں دوسرا ریکٹ اس لیے نہیں تھا کہ ایک اس کے ساتھ کھیلنا نہیں چاہتا تھا اور یہ فیصلہ اس نے کیوں کیا تھا، یہ چڑیا کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن خود کو اس طرح نظر انداز کیے جانے کی تکلیف اسے شدت سے ہوئی تھی خاص طور پر اس لیے کیونکہ ایک اتنے ہفتوں سے اسے وی آئی بی ٹریٹمنٹ دینا آ رہا تھا۔

”تم مجھ سے ناراض ہو؟“ چڑیا نے جیسے مصلحت کی کوشش کی تھی جواب نہیں ملا تھا۔

”ایک!“ چڑیا نے اسے ایک بار پھر پکارا۔ وہ اس بار اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے دور ایک کیاری میں جا کر ٹینس بالز ڈھونڈنے لگا۔ مصالحت کی ساری کوششیں بری طرح ناکام ہوئی تھیں۔ وہ چند منٹ اور وہاں کھڑی رہی پھر جتنے جوش و خروش کے ساتھ وہ ٹینس کورٹ پر آئی تھی اتنی ہی خاموشی اور رنجیدگی کے ساتھ وہ ٹینس کورٹ سے چلی گئی تھی لیکن ٹینس کورٹ سے اپنے کوارٹر تک واپسی میں چڑیا آنسوؤں سے روتی رہی تھی۔ اس دن اس نے کئی ہفتوں کے بعد کتنا، منہ، ڈیڈ، ٹوک کو اپنے ساتھ پایا اور اتنے ہفتوں میں وہ پتا نہیں کہاں غائب ہو چکے تھے۔

ایک جب کیاریوں میں پڑی ہوئی گیندوں کو اکٹھا کر کے پلٹا۔ چڑیا وہاں سے غائب ہو چکی تھی، ٹینس سے یک دم اس کا دل اچاٹ ہوا تھا۔ وہ اس کی دوست تھی، اسے اچھی لگتی تھی اور وہ اتنے دن سے اس کے ساتھ کھیل رہی تھی جس کے لیے اس کو اس طرح انگور کر دینا آسان نہیں تھا۔ ٹینس کٹ کو وہاں سے اٹھائے بغیر وہ بے حد خراب موڈ میں اندر چلا گیا تھا۔

چڑیا نے اس دن رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ سہ پہر سے رات تک خیر دین کے واپس آ جانے تک کتنا منہ سے باتیں کرتی رہی تھی، اس کی ماں نے بار بار آ کر اس کو کھانے کے لیے کہا تھا لیکن وہ بہانے بناتی

رہی۔ اس نے ماں کو ایک کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن خیر دین کو دیکھتے ہی وہ رونے لگی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اسے ساتھ لپٹاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”کیا ہوا چڑیا؟ کیوں رو رہی ہو؟“

”نانا، ایک مجھ کو ٹینس نہیں کھلاتا۔“ اس نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ خیر دین کے مسلسل استفسار پر کہا۔ خیر دین ٹھٹکا پھر اس نے اسے ساتھ لپٹا کر بہت پیار کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں بیٹا؟“

”پتا نہیں نانا۔۔۔۔۔ بس وہ مجھ سے بات بھی نہیں کر رہا اور مجھ کو ٹینس بھی نہیں کھلا رہا۔“ گالوں پر بہتے آنسوؤں کے ساتھ چڑیا نے خیر دین سے کہا۔

”میں تمہیں اسی لیے منع کرتا تھا کہ تم وہاں مت جایا کرو اور ان کے ساتھ مت کھیلا کرو۔“ خیر دین نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے اس سے کہا۔

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا نانا۔“ آنسوؤں کا ایک نیا سیلاب چڑیا کی آنکھوں میں اٹھ آیا تھا۔

”میں جانتا ہوں بیٹا، تم نے کچھ نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے ایک کو صاحب یا اس کی مٹی نے تمہارے ساتھ کھیلنے سے منع کیا ہو۔“ چڑیا کے دل کو ایک نیا دھچکا پہنچا تھا۔

”لیکن کیوں نانا؟“

”بیٹا وہ افسر لوگ ہیں، صاحب لوگ ہیں۔ ہم تو غریب لوگ ہیں نا۔“ خیر دین اس کو جو سمجھا رہا تھا وہ ایک سچے کا ذہن نہیں سمجھ پارہا تھا۔ سماجی فرق اور عدم مساوات۔۔۔۔۔ بڑوں کی دنیا کے معیار اور تعریفیں تھیں۔ بچوں کی دنیا کے ضابطے کچھ اور ہوتے ہیں۔

”تم اب وہاں مت جانا۔“ اسے بہت کچھ سمجھانے کے بعد خیر دین نے اسے کہا۔ چڑیا نے بوجھل دل کے ساتھ سر ہلا دیا۔ اس کی فیری ٹیل کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

ایک اگلی سہ پہر ٹینس کورٹ پر آتے ہی چڑیا کو ڈھونڈنا رہا۔ وہ کسی پیڑ پودے کے پیچھے نہیں تھی۔ نہ ہی وہ اس دن ٹینس کورٹ پر آئی تھی۔ وہ اکیلا اور کچھ نہیں تو ٹینس سرو کی ہی پریکٹس کر لیتا تھا لیکن اب اس سے وہ بھی نہیں ہو پارہی تھی۔ چڑیا کا حیران اور اداس چہرہ اسے کل سے اپ سیٹ کر رہا تھا اور اب اس کی عدم موجودگی اس کے لیے مزید پریشان کن تھی۔ مسئلہ ٹینس یا پیس کا نہیں تھا مسئلہ ان باتوں کا تھا جو وہ اس سے شیر کرتا تھا۔ وہ باتونی تھا اور گھر میں موجود تمام سچے اس سے چھوٹے تھے اور اس کو بے وقوف لگتے تھے۔ واحد چڑیا تھی جس کو اس کی ہر بات کی سمجھ آتی تھی۔ اس کے نہ آنے کا مطلب اس کے پارٹنر کا کھوجانا بھی تھا۔

اس دن ایک سارا دن کسی نہ کسی بات پر اپنی مٹی سے ضد کرتا رہا، اس نے کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا تھا۔ ہوم ورک بہت خراب کیا تھا۔ اپنی مٹی کے سمجھانے کے باوجود اس نے ایک بار چھوٹی بہن پر ہاتھ اٹھایا، ایک بار بھائی پر۔۔۔۔۔ اس کی مٹی اس کے اس خراب موڈ کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھیں اور ایک خود بھی کسی کو یہ سمجھا نہیں سکتا تھا کہ مسئلہ تھا کیا۔ پہلے وہ چڑیا کو انگور کر رہا تھا اور وہ ٹھیک تھا اور اب چڑیا اسے انگور کرنے لگی تھی تو سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شہر بانو نے اپنی مہی کو وہ تیسری کال کی تھی جو دوسری طرف سے ریسپونس کی گئی تھی۔ وہ یقیناً فون کے قریب نہیں تھیں یا پھر کسی کام میں مصروف تھیں، اس نے انہیں دوبارہ کال کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ اس بار وہ انہیں تقریباً چھ مہینے کے بعد کال کر رہی تھی اور وہ بھی کسی فارمیٹی سے زیادہ بڑی چیز نہیں تھی۔ ان کے درمیان فون کالز کا سلسلہ اس کی شادی اور پاکستان سٹل ہونے کے بعد آہستہ آہستہ اسی طرح کم ہوتا گیا تھا۔ پہلے وہ ہفتے میں کم سے کم ایک بار ضرور بات کر لیتی تھیں، آہستہ آہستہ وہ مدت بڑھنے لگی۔ مثال کی پیدائش کے بعد تو یہ وقت اور بھی زیادہ ہو گیا۔ اور ہر دفعہ فون پر بات ہونے پر دونوں کے درمیان کسی جذباتی گرم جوشی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ وہ حال احوال دریافت کرتیں، پندرہ بیس منٹ ایک دوسرے کو اپنی مٹی اور پروفیشنل مصروفیات کے بارے میں بتاتیں۔ شہر بانو ان سے پاکستان آنے کا پوچھتی وہ اس سے امریکا۔ اور دونوں ایک جھوٹے ایکسیکوز کے ساتھ گفتگو ختم کر دیتیں۔ پھر اگلے کئی مہینے دونوں کے درمیان کسی رابطے کے بغیر گزر جاتے اور پھر دوبارہ اچانک ایک دن یا تو اس کی مہی فون کر لیتیں یا شہر بانو کو پیٹھے بٹھائے فون کی فارمیٹی نبھانا یاد آ جاتا۔

وہ کبھی بھی اپنی مہی سے زیادہ کلوز نہیں رہی تھی۔ بچپن میں اس کی کل کائنات اس کا باپ ہی تھا۔ ماں ہمیشہ اس کے لیے ایک سیکنڈری فکر تھی۔ زندگی میں صرف ایک وقت ایسا آیا تھا جب وہ اپنی ماں کے بہت قریب ہوئی تھی اور وہ ان کی بیماری کا زمانہ تھا۔ انہیں بریسٹ کینسر ہو گیا تھا اور زندگی میں پہلی بار شہر بانو نے ان کے علاج کے دوران محل سے ان کا خیال رکھنے اور ان کے پاس رہ کر ان کی دیکھ بھال کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کی ماں اس کے لیے بہت عرصہ شکر گزار رہی تھی۔ وہ واحد وقت تھا جب ان کے درمیان موجود کئی سال پرانی مٹی کچھ عرصے کے لیے غائب ہو گئی تھی اور شکایات اور الزامات کی وہ بو چھاڑ جس کا وہ ہمیشہ ایک دوسرے کو نشانہ بناتی تھیں رک گئی تھی۔

دس سال کی عمر میں اپنے باپ کی پراسرار حالات میں ہونے والی موت کے بعد شہر بانو کبھی پاکستان نہیں آسکی تھی اور امریکا شفٹ ہو جانے کے بعد ایک لمبا عرصہ وہ فنی طور پر بہت اپ سیٹ رہی تھی۔ وہ ایک گھر سے ایک دم جیسے کسی جنگل میں آ گئی تھی۔ مزید خرابی شرمین کی دوسری شادی نے کی تھی۔ وہ ماں سے پہلے ہی زیادہ ایچ نہیں تھی اور رہی سہی کسر اس احساس نے پوری کر دی تھی کہ اس کی مہی نے اس کے پایا کی جگہ کسی اور کو دے دی تھی۔ وہ دو تین سال کی زندگی کے بدترین سالوں میں سے تھی۔ اس نے کبھی اپنے باپ کی مٹی کو اس طرح محسوس نہیں کیا تھا جس طرح وہ اب کرتی تھی۔ شرمین، شہباز کی کوئی چیز اپنے ساتھ امریکا نہیں لائی تھی حتیٰ کہ اس کی کوئی تصویر تک۔ وہ جیسے دانستہ یہ کوشش کر رہی تھی کہ شہر بانو کے ذہن سے اس کے باپ کا تصور تک ختم کر دے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ تصور اس کے ذہن کے پردوں پر کچھ اور پکا ہو گیا تھا۔ دو تین سال ایک بچے کے طور پر وہ ہر جگہ اپنے باپ کو ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ مر چکا تھا وہ کبھی کسی پارک کسی سڑک کسی شاپنگ مال میں اپنے پاس سے گزرتے ہر مرد کے چہرے میں ایک ہی چہرہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتی۔ وہ چہرہ جو اسے ایک دم اس کی بے خبری میں اٹھا کر اپنی بانہوں کے گھیرے میں اپنے سینے میں چھپا لیتا تھا۔ وہ ہاتھ جو اسے ہوا میں اچھالتے تھے اور اس کی کھلکھلاہٹوں پر اسی کی طرح کھلکھلا کر ہنس دینے والا چہرہ۔ وہ انگلی جسے پکڑ کر چلتے ہوئے وہ جیسے دنیا بھر عبور کر سکتی تھی۔ وہ جس کے سامنے وہ فرمائشوں کا اخبار لگا دیتی تھی۔ شہر بانو کئی سال لوگوں کے چہروں میں اپنے پاپا کا چہرہ تلاش کرتی رہی تھی اور اس ساری Effort نے شرمین سے اس کی نفرت اور بیزارگی میں اضافہ کیا تھا۔

سو تیلاباب برا آدمی نہیں تھا۔ اس کے اور شرمین کے درمیان شادی کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ شرمین شہر بانو کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ شادی کے بعد بھی اگرچہ شہر بانو نے پوری کوشش کی تھی کہ شرمین اسے نانا کے گھر پر ہی چھوڑ دے جہاں رہنے کی وہ اب عادی ہو چکی تھی لیکن شرمین اس پر تیار نہیں ہوئی تھی۔

فاروق ایک اچھا انسان تھا اور اس نے شہر بانو کے ساتھ بہت محبت اور شفقت دکھائی۔ شہر بانو پر ایک خاص حد تک اس محبت اور شفقت کا اثر بھی ہوا تھا۔ ماں سے اس کی ناراضی اور کشمکش تو ختم نہیں ہوئی تھیں لیکن وہ باپ سے قریب ہو گئی تھی لیکن اس قربت کو فاروق اور شرمین کی پیدا ہونے والی بیٹی نے ختم کر دیا تھا۔ فاروق کی اپنی پہلی وائف سے دو بیٹے تھے۔ شرمین سے اس کی بیٹی ہو گئی تھی۔ شہر بانو کی اہمیت یک دم ایک بار پھر ختم ہو گئی تھی۔ یہ خیال شہر بانو کا تھا اور شرمین کی بے انتہا کوشش کے باوجود وہ یہ خیال ترک کرنے پر تیار نہیں تھی۔ ڈیڑھ سال بعد اس بچی کا انتقال ہو گیا تھا۔ شرمین اور فاروق نے اس کے بعد کوئی اور بچہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ایک اور سال تھا جب شرمین نے اپنے اور شہر بانو کے ریلیشن شپ کو بہتر کرنے کی کوشش کی۔ اگلے چند سال اس کے اور شہر بانو کے اچھے سالوں میں سے تھے۔ شہر بانو باپ کو اب بھی اپنی زندگی اور ذہن سے الگ نہیں کر پاتی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ مٹی اور رنجیدگی اس کے اندر سے کم ہونے لگی تھی جو پورے لڑکپن میں اس کا حصہ رہی تھی۔ شہر بانو کے یونیورسٹی جانے کے بعد یہ تعلقات کچھ اور بھی بہتر ہو گئے تھے لیکن شرمین کی بیماری وہ واحد ٹائم پیڑ تھا جس میں شہر بانو کی طرف سے شہباز کی موت کے بعد سے پہلی بار شرمین کے لیے کسی قسم کی جمپین ایسوشنل وابستگی کا اظہار کیا گیا تھا۔ وہ ماں کے لیے Concerned چاہتی تھی۔ شرمین کی صحت یابی اس وقت اس کی سب سے بڑی ترجیح تھی، شرمین کو صحت یاب ہوتے ہوئے تقریباً دو سال لگ گئے تھے لیکن ان دو سالوں میں شہر بانو اور شرمین کی جیسے سے سرے سے Bonding ہوئی تھی اور اس Bonding کو سب سے بڑا دھچکا اس وقت پہنچا تھا جب شہر بانو نے پہلی بار شرمین کو شیر دل میں اپنی دلچسپی اور اس کے پروپوزل کے بارے میں بتایا تھا۔ شرمین نے شیر دل کے آدھے تعارف کے بعد ہی اسے روک دیا تھا اور بے حد سرد مہری سے کہا تھا۔

”میں جانتی ہوں اسے اور میں مر کر بھی تمہاری شادی اس سے نہیں ہونے دوں گی۔“

☆☆☆



”ہاں، میں سوئی ہوں اس وقت۔“ چڑیا نے نظریں ملائے بغیر خیر دین کے جھوٹ کا پردہ رکھا۔

”لیکن تم تو اس وقت میرے ساتھ کھیلتی تھیں۔“ ایک نے اسے یاد دلایا۔

”اب میں سوئی ہوں۔“ چڑیا نے مدہم آواز میں کہا۔

”چلو بس اب کھیلتے ہیں، تم یہ ریکٹ پکڑو میں دوسرا ریکٹ نکالتا ہوں۔“ ایک نے جلدی سے بات جیسے بدلنے کی کوشش کی تھی۔

”نہیں..... اب میں ٹینس نہیں کھیلوں گی۔“ چڑیا نے اس کے بڑھائے ہوئے ریکٹ کو نہیں پکڑا تھا۔

”کیوں؟“ ایک چونکا۔

”کیونکہ میرے پاس ریکٹ نہیں ہے۔“ دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے چڑیا نے بڑے تحمل سے کہا تھا۔

”میں دے رہا ہوں نا تم کو۔“ ایک نے دوبارہ ریکٹ بڑھایا۔

”یہ میرا نہیں ہے۔“ چڑیا نے نفی میں سر ہلایا۔

”تو کیا ہوا چڑیا؟ میں خود دے رہا ہوں تمہیں۔“ ایک نے کہا۔

”لیکن اب مجھے ٹینس اچھا نہیں لگتا۔“ ایک اس بار ریکٹ پکڑے کچھ دیر بیٹھا رہا تھا پھر اس نے بے حد

متانت سے کہا۔

”تم مجھ سے ناراض ہو؟“ چڑیا نے نفی میں سر ہلایا۔

”تم ہو۔“ ایک نے بے ساختہ کہا۔ ”I am sorry“ چڑیا نے بے ساختہ سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”اوکے۔“ وہ ساتھ مسکرائی بھی تھی۔ ایک بھی مسکرایا۔

”چلو پھر کھیلتے ہیں نا!“

”نہیں، ہم ویسے ہی باتیں کرتے ہیں بیٹھ کر..... مجھ کو ٹینس بورنگ لگتی ہے اب۔“ وہ دونوں بچے تھے لیکن کسی

Psychic کی طرح ایک دوسرے کا ذہن پڑھ رہے تھے۔ ایک کو اندازہ ہو گیا تھا کہ چڑیا اب دوبارہ اس کا ریکٹ

نہیں لے گی۔ وہ خیر دین کی ہدایات تھیں یا چڑیا کی اپنی ضد جو بھی تھا ایک نادم ہونے کے ساتھ ساتھ چڑیا کے حوالے

سے بے حد محتاط بھی ہو گیا تھا۔ وہ اب ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے چڑیا دوبارہ ہرٹ ہوتی باروٹھ جاتا۔

وہ اگلے تین دن ایک کو نظر نہیں آئی تھی اور کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ نہ عقبی باغ میں کہیں گلہریوں کے ساتھ کھیلتے

ہوئے، نہ کوارٹرز کے پاس آم کے درخت پر پڑے جھولے میں جھولا جھولتے ہوئے، نہ برآمدے میں لگے اس آئینے

کے سامنے جس میں وہ پتا نہیں کتنی دیر اپنا عکس دیکھتی رہتی تھی۔ بعض دفعہ ایک کو لگتا تھا وہ شاید اس میں کچھ ڈھونڈ رہی

ہوتی تھی..... نہ باری ڈول کے باہر نکل آنے پر اس کی یونیاں کرنے آئی تھی، نہ فری زنی کھیلتے ہوئے آکر ان کے کھیل

میں شامل ہوئی تھی، نہ کسی بیڑ پوڈے سے جھانکتی پائی گئی تھی اور نہ ہی وہ خیر دین کے ساتھ اس کی سائیکل پر گھر سے باہر

جاتے دیکھی گئی تھی۔ چڑیا جیسے کہیں چھپ گئی تھی اور ایک کی بے چینی اور اضطراب جیسے ساتویں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔

تیسرے دن ایک کی ہمت بالآخر جواب دے گئی تھی۔ وہ سہ پہر کو ٹینس کورٹ پر جانے کے بجائے سیدھا

خیر دین کے کوارٹر گیا تھا۔ خیر دین دو پہر کا کھانا تیار کرنے کے بعد اس وقت کچھ دیر کوارٹر میں آرام کرنے جایا کرتا تھا۔

”چاچا چڑیا گھر پر ہے؟“ دروازے پر دستک پر خیر دین باہر گیا تھا۔ اندر کوارٹر میں ایک کونے میں بیٹھی

ہوم ورک کرتی چڑیا ایک کی آواز پر کرنٹ کھا کر کچھ لکھتے لکھتے رکی تھی۔

”بیٹا وہ سو رہی ہے۔“ چڑیا ایک کی آواز پر اپنا ہوم ورک بند کرنے لگی تھی جب اس نے خیر دین کو کہتے سنا۔

نانا جھوٹ نہیں بولتے پھر اب کیوں بول رہے ہیں؟ وہ نوٹ بک ہاتھ میں لیے حیران ہوئی تھی۔

”اچھا..... وہ کب سو کر اٹھے گی؟“ چڑیا نے ایک کی آواز میں تھوڑی مایوسی دیکھی۔

”وہ کافی دیر تک سوئی رہتی ہے شاید شام تک سوئے گی پھر اٹھ کر اپنا ہوم ورک کرے گی۔“ خیر دین

بڑے تحمل سے جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا اور اندر بیٹھی چڑیا حیران تھی۔

”اچھا پھر اس کو بتا دیجیے گا کہ میں آیا تھا۔“ اس نے ایک کو کہتے سنا۔ چند لمحوں کے بعد خیر دین اندر آ گیا۔

”نانا ایک آیا تھا؟“ خیر دین تو شاید ایک کی آمد کے بارے میں اسے کچھ نہ بتاتا لیکن چڑیا نے کچھ بے

قراری کے عالم میں اس سے خود ہی پوچھ لیا تھا۔

”ہاں چڑیا..... لیکن بیٹا دیکھو اب تم دوبارہ اس کے ساتھ جا کر کھیلنا مت شروع کرنا..... وہ لوگ ویسے

بھی ایک دو ہفتے میں چلے جائیں گے۔ کیا فائدہ ہے اس کھیل کو اور دوستی کا۔ پھیلی بار بھی تم کتنا روکی ہو، میں

برداشت نہیں کر سکتا تمہاری تکلیف۔“ خیر دین نے جیسے اسے صاف لفظوں میں کہا تھا۔ چڑیا جواب دینے کے

بجائے سر جھکا کر ہوم ورک کرنے لگی۔ چار پائی پر لیٹتے ہوئے خیر دین کو پتا چل گیا تھا کہ اس کا کیا مطلب تھا۔

”اچھا تم مل لیا کرو ان سب سے..... لیکن اب ان کے ساتھ کھیل کود میں حصہ مت لینا۔“ خیر دین نے

اپنی ہی ہدایات اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر واپس لی تھیں۔ چڑیا کا چہرہ چند لمحوں میں کھل اٹھا تھا۔

برق رفتاری سے ہوم ورک آدھے گھنٹے میں ختم کر کے وہ اپنے کوارٹر سے نکل کر ٹینس کورٹ پر آئی اور وہاں

اس نے کورٹ سے باہر پڑی کرسیوں میں سے ایک پر ایک کو اپنا ریکٹ پکڑے بے حد اداسی کے عالم میں بیٹھے

دیکھا تھا۔ وہ ریکٹ کی String کو ٹھیک کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے چڑیا کو آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن

پاس آنے پر اس کے قدموں کی آہٹ پر اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا، چڑیا کو دیکھ کر اس کا چہرہ یک دم جیسے ہزار

واٹ کے بلب کی طرح جل اٹھا تھا۔ چڑیا بھی جواباً مسکرائی تھی۔ وہ آکر اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

”تم سو رہی تھیں؟“ ایک کو فوری طور پر اس سے بات کا آغاز کرنے کے لیے اور کچھ نہیں سوچا تھا۔



وہ سبق جو خیر دین اسے ہمیشہ دیتا تھا اور وہ سمجھ نہیں پاتی تھی وہ ایک کی ایک چھوٹی سی حرکت نے اسے سمجھا دیا تھا۔ چڑیا جان گئی تھی کہ صاحب لوگ اس لیے ان جیسے نہیں تھے کیونکہ وہ کوئی بھی چیز خرید کر استعمال کرتے تھے مانگ کر نہیں اور وہ چیز جو مانگ کر لی جاتی ہے وہ کبھی بھی کوئی چھین سکتا ہے۔ اس نے اس ریکٹ کو چھونے اور ٹینس کھیلنے کا شوق پورا کر لیا تھا اور اس کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔

وہ چند ہفتوں میں کھیل میں ماہر نہیں ہو سکتی تھی اور کھیل سیکھ لینے کے بعد بھی وہ دوبارہ اس کھیل کو کھیلنے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی۔ اسکول میں ٹینس کی سہولیات نہیں تھیں اور ڈی سی ہاؤس میں اب کوئی ایک نہیں ہوتا جو اسے اپنا ریکٹ بھی دیتا، کوچنگ بھی کرتا اور اس کے ساتھ کھیلتا بھی..... وہ بڑے لوگوں کا کھیل تھا..... صاحب لوگوں کا..... وہ چڑیا کا کھیل نہیں تھا۔ یہ سب اسے خیر دین نے پیار سے سمجھایا تھا اور اس بار چڑیا کو پہلی بار تکلیف سے ہی سہی لیکن اپنی سوشل Standing سمجھا آ گئی تھی۔

لیکن ایک سے وہ دور نہیں رہ سکتی تھی۔ خاص طور پر اب جب وہ ایک بار پھر سے چڑیا کو اپنا دوست بنانے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اسے نہ یہ پروا تھی کہ می ناراض ہوں گی نہ اس بات کی پروا کہ وہ چڑیا کی وجہ سے کئی بار اپنا ہوم ورک بھی چھوڑ رہا تھا اور کچھ ایسا ہی حال چڑیا کا بھی تھا۔ ایک آدھ بار خیر دین کی نصیحتوں کے زیر اثر رہنے کے بعد وہ ایک بار پھر ایک کی گرویدہ تھی۔ چڑیا نے ٹینس کھیلنا بند کیا تھا تو ایک کی دلچسپی بھی ٹینس میں یک دم ختم ہو گئی تھی۔ وہ انکل اور می کے کہنے کے باوجود ٹینس کی پریکٹس کے لیے نکلنے سے کتراتا لیکن ٹینس نہ کھیلنے کے باوجود وہ دونوں دن میں کئی بار ایک دوسرے سے ملتے۔ فری زنی کھیلتے، شطرنج کھیلتے۔ ایک کی پھینکی ہوئی ڈسک آہستہ آہستہ چڑیا کے ہاتھ میں آنے لگی تھی۔ صرف پہلی بار فری زنی کھیلتے ہوئے ایسا ہوا تھا کہ ڈسک پکڑنے کی کوشش میں ڈسک چڑیا کے ہاتھ میں تو آ گئی تھی لیکن اس کے ہاتھ کو بری طرح زخمی بھی کر گئی تھی۔ چڑیا نے شدید تکلیف کے باوجود منہ سے آواز نہیں نکالی تھی۔ وہ ایک پر کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ کہتا وہ ایک ڈسک بھی کیچ نہیں کر سکتی۔ شدید تکلیف کے ساتھ اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈسک دوبارہ ایک کی طرف پھینکنے کی کوشش کی تھی لیکن ٹھیک سے پھینک نہیں سکی تھی اور اس وقت ایک نے بہت دور کھڑے بھی اس کی تکلیف کا اندازہ کر لیا تھا۔

”تمہیں ہاتھ پر چوٹ لگی ہے کیا؟“ ایک نے دور سے ہی آواز دے کر پوچھا۔

”نہیں تو.....“ چڑیا نے بے ساختہ کہا لیکن ایک اس کی طرف بھاگتا آیا تھا۔ اس نے پاس آ کر چڑیا کا ہاتھ دیکھا جو صحیح طرح سیدھا بھی نہیں ہو رہا تھا اور ہلکی سی پیلا ہٹ اور سوجن نظر آنے لگی تھی۔

”تم کو چوٹ لگ گئی اور تم نے بتایا بھی نہیں۔“ ایک اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے افسوس سے بولا۔

”تم نے بہت زور سے ڈسک پھینکی تھی۔“ چڑیا نے ہلکی سی آواز میں کہا۔

”اجہتی تم کو نہیں پکڑنا چاہیے تھی ڈسک اگر یہ زیادہ زور سے آرہی تھی تو۔“ ایک نے اسے ڈانٹا۔ وہ اکثر ٹینس سکھاتے ہوئے بھی اس کو ڈانٹ دیتا تھا۔ چڑیا خاموش ہو گئی۔ وہ اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بہت دیر تک دباتا رہا تھا پھونکیں مار مار کر..... یہ اس کی فرسٹ ایڈ تھی۔ اور اس انجری کے بعد ایک نے فری زنی پھینکنے کے اسٹائل کو تبدیل کیا تھا اور اس کی رفتار کو بھی کم کر دیا تھا۔ جب وہ شطرنج یا فری زنی نہ کھیلتے تو پھر وہ سارا دن بے مقصدان وسیع و عریض لانز میں پھرتے، تتلیاں اور کیڑے مکوڑے اکٹھے کرتے رہتے۔ تتلیاں چڑیا پکڑا کرتی تھی اور کیڑے

مکوڑوں کی Collection بنانے کا آئیڈیا ایک کا تھا۔ جیم، اچار اور Syrup کی خالی بوتلوں میں وہ بڑی بے جگری سے لان کی کیاریوں میں مٹی اور پودوں پر بیگتے کیڑے اٹکھتے کرتا پھرتا۔ یہ جیسے اس کے نزدیک چڑیا کو متاثر کرنے کی کوششوں کا ایک حصہ تھا اور چڑیا متاثر ہوئی تھی۔ دل میں اسے گھن بھی آتی تھی جب ایک گندے مندے کیڑے مکوڑے کئی بار خالی ہاتھ سے ہی پکڑ لیتا لیکن پھر وہ مسکراتے ہوئے ایک کوسراہتی تھی۔ اور کبھی وہ لان میں پھولوں اور پتوں کی کلکیشن بناتے پھرتے اور مالیوں سے ان کے نام پوچھ پوچھ کر لکھتے رہتے اور جب وہ یہ عجیب و غریب کلکیشن نہ کر رہے ہوتے تو پھر وہ عمارت کے عقب میں سروٹ کوارٹرز کے قریب لگے ہوئے مختلف پھلدار درختوں پر چڑھے جامن، کیریاں اور کھٹے انگور، شہوت انا تار کرالی اور نمک مرچ کے ساتھ کھاتے یا پھر غلیلوں سے ان اونچے لمبے درختوں پر بیٹھے پرندوں کا شکار کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ وہ چڑیا کی زندگی کا سب سے بہترین موسم گراما تھا۔ ایسے دن جب وہ واپس کوارٹرز میں آتا ہی نہیں چاہتی تھی اور کچھ یہی حال ایک کا بھی تھا۔ اپنی سن میں پڑھنے والا وہ کچھڑ اور گروڈ پچھ جو اس گھر میں ہر وقت تک سک سے درست رہنے والے حلیے میں آیا تھا جو فورک اور ٹاف کے بغیر کھانا نہیں کھا سکتا تھا اور جوٹنس، سوئمنگ اور فری زبی کھیلتا تھا۔ اب لان میں چھپن چھپائی کھیلتا پھرتا تھا۔ چوبیس گھنٹے پاؤں پر موجود موزے اب لان کے مختلف حصوں سے دریافت ہوتے تھے۔ اس کی جیبوں میں اب کیریاں اور کچے انگور بھرے ہوتے تھے اور وہ اس تمام موج مستی میں ساتویں آسمان پر تھا، ماں کی چیخ پکار بھی اب اس پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ اس کی ماں کو پتا تھا کہ وہ چڑیا کے ساتھ کھیلتا تھا لیکن وہ جب بھی اسے ڈھونڈنے آتی، چڑیا کا نام و نشان بھی اسے کہیں نہیں ملتا تھا۔ وہ بالکل اکیلا لان میں کہیں نہ کہیں کچھ کرتا پایا جاتا اور وہ اس بات کو کسی طرح ماننے پر تیار نہیں ہوتا کہ وہاں آس پاس کہیں چڑیا تھی۔ چڑیا جیسے ایک Well-kept سیکرٹ تھی۔ اس کی می اسے ڈانٹتے کھینچتے وہاں سے لے جاتیں اور وہ چند منٹوں کے بعد پھر لان میں موجود ہوتا۔



شیردل نے فون انگینج کیا۔ پھر کال ڈس کنیکٹ کرنے کے بعد دوبارہ عکس کو کال کی۔ اس بار پہلی تیل پر کال ریسپونڈ کی گئی تھی۔

”السلام علیکم“ شیردل کے پورے وجود سے کوئی چیز گزری تھی۔ اس عورت کی آواز سن کر وہ چند لمحوں کے لیے اس کیفیت کا شکار ضرور ہوتا تھا۔

”کب آئی ہو پاکستان؟“ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے عکس سے پوچھا۔

”22 کو“ مختصر جواب ملا تھا اسی Soothing آواز اور بے حد شستہ لب و لہجے میں۔ چند لمحوں کے

لیے شیردل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے مزید کیا پوچھے۔ یہ نہیں تھا کہ اس کے پاس سوال نہیں تھے لیکن ان سوالوں کے جواب ان دونوں کے لیے بڑے تکلیف دہ ہوتے تھے۔ ان کے درمیان جب بھی کبھی بات ہوتی تھی بڑے ہلکے پھلکے موڈ میں ہوتی تھی۔ آج پہلا موقع تھا جب گفتگو کو شروع کرنا ہی دونوں کے لیے مشکل ہو رہا تھا شاید اس لیے کہ ان دونوں کی زندگی میں اس وقت کوئی دوسرا آچکا تھا۔

”شہر بانو کیسی ہے؟“ اس نے عکس کو کہتے سنا۔ شیردل کو لگا وہ شاید ساتھ کوئی کام بھی کر رہی ہے۔

”بھی ٹھیک ہے، تم کیا کر رہی ہو؟“

”کچھ پکینگ وغیرہ کر رہی ہوں اور بیٹی کا کیا حال ہے تمہاری؟“ وہ دوسری طرف بڑے Casual انداز میں بول رہی تھی۔ ساتھ کچھ کھڑکھڑاہٹ کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔

”مثال بالکل ٹھیک ہے۔“ شیردل نے کہا۔

”میرے ہمسائے میں آرہی ہو تم؟“ شیردل کا اشارہ پوسٹنگ کی طرف تھا، عکس دوسری طرف سے مدہم آواز میں ہنسی تھی۔

”میری تو دیسے خواہش تھی تمہاری خالی سیٹ پر آتی۔“ اس نے عکس کو کہتے سنا۔

”ارے..... اچھا..... یہاں آنا چاہتی ہو تم؟“ شیردل نے چونک کر کہا۔

”تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“ شیردل کو محسوس ہوا وہ بہت خوشگوار موڈ میں تھی۔

”مجھے کیا اعتراض ہوگا..... ابھی آ جاؤ۔“ شیردل نے بے ساختہ کہا۔ وہ پھر ہنسی۔ اس بار شیردل چپ نہیں رہ سکا تھا۔

”تم نے کچھ زیادہ ہنسنا شروع نہیں کر دیا؟“

”تمہیں کوئی مسئلہ ہے اس سے؟“ جواب اسی انداز میں ملا تھا۔

”یار پوچھ رہا ہوں۔“ شیردل نے کچھ مدافعتانہ انداز میں کہا۔

”تم ہمیشہ اٹنے سوال ہی پوچھا کرو مجھ سے۔“

”خیر ہر سوال تو الٹا نہیں کیا میں نے..... کچھ سیدھے بھی تھے۔“ شیردل نے بے ساختہ کہا۔

”ان سیدھے سوالوں کے بھی جواب اٹتے تھے۔“

”تم نے تو سیدھے سیدھے ہی دیے۔“ وہ اس بار کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ دونوں دوسرے کی بات کے Context کو سمجھ گئے تھے۔ شیردل بھی ہنس دیا۔

”کسی مدد وغیرہ کی ضرورت ہے؟“ اس نے عکس سے کہا۔

”نوشہ نکلس۔“ شیردل کو اسی جواب کی توقع تھی۔ وہ خوشی سے مرجاتا اگر وہ کسی کام کے لیے کہہ دیتی۔ وہ اب اس سے امریکا میں اس کے Stay کے حوالے سے بات کرنے لگا تھا۔ عجیب بات تھی لیکن وہ جب بھی ایک دوسرے سے بات کرنا شروع ہوتے کرتے ہی چلے جاتے، انہیں خود پر بند باندھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ پتا نہیں کیا کیا تھا جو انہیں ایک دوسرے سے شیر کرنا یاد آ جاتا تھا اور یہ اکیڈمی کے دنوں سے تھا۔ وہ Argument کرنا بھی شروع کرتے تو وہ بھی لمبا ہوتا جاتا تھا اور اتنا لمبا ہوتا کہ اس کا اختتام کسی اور ڈسکشن پر ہوتا۔ اب بھی ہوا تھا۔ شیردل اب اس کو اپنے ڈیویژن کے حوالے سے انفارمیشن دے رہا تھا۔ دو سال پاکستان سے باہر رہنے کے باوجود وہ ill informed نہیں تھی اور پاکستان میں آئے ایک ہفتہ ہونے کے باوجود اسے اس ڈسٹرکٹ کے بارے میں تمام بنیادی معلومات تھیں جہاں اس کی پوسٹنگ ہوئی تھی۔ شیردل سے وہ بس اپنے نوش Tall y کر رہی تھی۔

”Oh..... السلام علیکم۔“ بات کرتے کرتے شیردل نے اسے کسی سے کہتے سنا تھا پھر اس نے کسی مرد کی آواز سنی جو بڑی بے تکلفی سے عکس سے بات کر رہا تھا۔

”اچھا شیردل..... تم سے دوبارہ بات ہوگی..... مجھے لُچ پر جانا ہے..... خدا حافظ۔“ اس نے شیردل کے ساتھ بات کرتے کرتے یک دم بہت عجلت کے عالم میں فون بند کیا تھا۔ وہ سیل فون ہاتھ میں لیے بیٹھا رہ گیا تھا۔ چند لمحے اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد اس نے جیسے کچھ بے چینی اور خفگی کے عالم میں عکس کو ایک Text

کیا تھا۔ چند منٹوں میں اس Text کا جواب آ گیا تھا۔

”Shut up۔“ شیردل کا رنگ ہمیشہ کی طرح سرخ ہوا تھا۔ اس کے سیل فون میں عکس کی طرف سے پچھلے تمام سالوں میں آنے والے Shut up 131 کے میسجز محفوظ تھے۔ اور شیردل ان 131 میسجز کو تاریخ پڑھے بغیر بھی پہلی Shut up کال سے موجودہ تک کی ہسٹری، سیاق و سباق، تاریخ اور لوکیشن بتا سکتا تھا۔ زندگی میں شیردل نے عکس کے علاوہ کسی اور سے یہ لفظ نہ سنا تھا اور نہ وہ برداشت کر سکتا تھا۔ زندگی میں عکس صرف ایک شخص سے Rude ہوتی تھی۔ صرف ایک شخص تھا جس کو وہ دھڑلے سے Shut up کال دیتی تھی اور وہ شیردل تھا۔ شیردل نے اس 132 ویں شٹ اپ کال کو msg folder میں Save کیا اور پھر اس نے سرخ چہرے اور بے حد خفگی کے عالم میں لان سے اٹھتے ہوئے عکس کو ایک طویل Text کیا۔

☆☆☆

نیند میں وہ ہڑبڑا کر کسی کی چیخوں اور رونے کی آواز سے اٹھا تھا۔ چند سیکنڈز میں اس نے وہ آواز پہچانی تھی۔ وہ چڑیا کی آواز تھی۔ ایک نیم خوابیدگی کے عالم میں جیسے بستر سے نکل کر باہر بھاگا تھا۔ وہ تقریباً آدھی رات کا وقت تھا۔ نیم خوابیدہ آنکھوں کے ساتھ اپنے کمرے کے دروازے سے باہر نکلنے پر اس نے وہ منظر دیکھا تھا جو اگلے کئی سال اس کے ذہن کے ساتھ ایک آسیب کی صورت میں چپکا رہا تھا۔ وہ اوپر والی منزل پر اپنے کمرے کے دروازے سے آگے نہیں جاسکا تھا۔ ہڈیاں انداز میں چیخیں مارتی ہوئی چڑیا بھاگتے ہوئے تاہم وارداتوں سے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

”نانا..... نانا۔“ وہ چلا تے ہوئے خیر دین کو آوازیں دے رہی تھی۔

وہ سیڑھیوں کے وسط میں تھی اور سیڑھیوں کے بالکل اوپر اس نے اپنے انکل کو بے حد تیز رفتاری کے عالم میں اس کے پیچھے بھاگتے اور سیڑھیاں اترتے دیکھا تھا۔ رینگ کے پاس کھڑا ایک لڑنے لگا تھا، اس نے زندگی میں اس سے زیادہ خوف کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ چڑیا کی ہڈیاں چیخیں نہیں تھیں جس نے اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑائی تھی۔ یہ اس کا برہنہ جسم تھا جس نے ایک کوہ ہشت زدہ کیا تھا۔ رینگ کو پکڑے۔ وہ تھر تھر کانپتے ہوئے کسی مجسمے کی طرح کھڑا رہا۔ اس کے انکل نے چند جستوں میں نیچے کے زینوں پر پہنچ جانے والی چڑیا کو پکڑ لیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ بلند آواز میں چلاتے ہوئے خیر دین کو پکار رہی تھی۔ پھر ایک نے اپنے انکل کو یکے بعد دیگرے چڑیا کے چہرے پر پھینک مارنے دیکھا پھر اس نے اپنے انکل کو دونوں ہاتھوں سے چڑیا کا منہ اور گلا دباتے ہوئے دیکھا۔ وہ اب زمین پر گری ہوئی تڑپ رہی تھی۔ اس کی وہ ہڈیاں چیخیں بند ہو چکی تھیں۔ اس کے انکل فرش پر چڑیا کے اوپر جھکے اپنا ایک ہاتھ چڑیا کے منہ پر پختی سے جمائے دوسرے ہاتھ سے اس کا گلا دبا رہے تھے۔ ڈی سی ہاؤس میں اب ایک بار پھر وہی سنانا تھا جو ہمیشہ رات کے اس پہر ہوتا تھا اور جسے یا تو باہر درختوں سے آلوؤں کی آواز توڑتی تھی یا جھینگروں کی..... یا باہر رات کو لان میں کھلے چھوڑے جانے والے گارڈز کے گتوں کی۔

رینگ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے پتے کی طرح کا نپتے ایک نے سب کچھ نیم خوابیدہ ذہن کے ساتھ کھلی آنکھوں اور پلمپلین جھپکائے اور سانس لیے بغیر دیکھا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ فرش پر گری چڑیا کا تڑپتا ہوا وجود آہستہ آہستہ ہلنا بند ہوتا جا رہا تھا۔ وہاں اس کی آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہو رہا تھا ایک اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، اپنے ماؤف نیم خوابیدہ ذہن اور کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ۔ چڑیا رات کے وقت وہاں کیوں آئی تھی؟ ایک کو یاد آ گیا۔

”Magnetic chess board دیکھا ہے بھی؟“ اس نے تین دن پہلے لان میں ایک خرگوش کو

پکڑنے کی کوشش میں اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے یک دم پلٹ کر چڑیا سے کہا۔ جو اسی کی طرح اس خرگوش کو پکڑنے کی کوشش میں بے حال ہو رہی تھی۔

”نہیں تو..... تمہارے پاس ہے کیا؟“ چڑیا بھاگتے بھاگتے رک گئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی، اس نے رک کر جیسے اپنی بے قابو ہوتی ہوئی سانس کو بحال کرنے کی کوشش کی۔

”میرے پاس نہیں ہے، انکل کے پاس ہے۔ اتنا بڑا اور بہت خوب صورت۔“ ایک نے ہاتھوں کے اشارے سے اس کا سائز بتایا۔ چڑیا بے اختیار امپریس ہوئی۔

”کہاں ہے؟“  
”وہ جو اوپر ان کی لائبریری ہے نا، اس میں رکھا ہے۔“ ایک نے لوکیشن بتائی۔

”مجھے لا کر دکھاؤ نا۔“ چڑیا نے بے ساختہ فرمائش کی۔ ایک چند لمحے سوچ میں پڑ گیا۔ یہ ذرا مشکل اور ناممکن سا کام تھا۔ وہ بہت وزنی جیسے یورڈ تھا اور اس کا سائز اتنا تھا کہ وہ اس کو کسی طرح بھی چھپا کر اوپر والی منزل سے نیچے والی منزل پر گھر میں موجود نوکروں اور دوسرے افراد کو دھوکا دے کر نہیں لاسکتا تھا۔ سرکھپاتے ہوئے اس نے چڑیا کو یہ بتایا۔ چڑیا کا چہرہ بجھ گیا۔

”اوکے۔“ اور اس بجھے چہرے اور اوکے نے ایک کو بے چین کر دیا۔

”اچھا میں کوئی راستہ تلاش کرتا ہوں۔“ اور وہ راستہ اس نے بالآخر دو دن کے بعد تلاش کر لیا تھا۔ اس کی ممی اور آنٹی ویک اینڈ پر کسی فیملی فنکشن میں شرکت کے لیے لاہور چلی گئی تھیں۔ اس کے انکل ساتھ نہیں گئے تھے اور ایک بھی ماں کے اصرار اور خفگی کے باوجود ساتھ نہیں گیا تھا۔ وہ ماں کو کیسے یہ بتا دیتا کہ اس کے پاس چڑیا کو Magnetic board دکھانے کا ایک سنہری موقع آیا تھا اور وہ اسے کسی قیمت پر ضائع نہیں کر سکتا تھا۔

ویک اینڈ پر دونوں فیملیز کے گھر سے چلے جانے کے بعد گھر پر صرف ایک اور اس کے انکل تھے۔ وہ دونوں بہت دیر تک ان کے گھر سے چلے جانے کا انتظار کرتے رہے اور پھر بالآخر مایوس ہو گئے۔ وہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ ہال کمرے میں بیٹھے تھے جہاں سے گزر کر ہی وہ اوپر والی منزل پر جاسکتے تھے۔ شام ہو جانے پر بھی جب اس کے انکل گھر پر ہی رہے تو ایک نے جیسے ایک اور منصوبہ بتایا۔ ان دونوں نے طے کیا تھا کہ ایک کچن کا تختی دروازہ جو نوکروں کے جانے کے بعد بند ہو جاتا تھا وہ رات کو اسے کھول دے گا۔ چڑیا، خیر دین اور حلیمہ کے سونے کے بعد اپنے کو اوڑھے نکل کر کچن میں آجائے گی اور پھر وہ دونوں اوپر لائبریری میں جا کر نہ صرف وہ Magnetic chess دیکھیں گے بلکہ جیس کھیلیں گے بھی۔ وہ یہ پلان بنانے کے بعد شام کو ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے تھے۔ ایک نے نوکریاں کے جانے کے بعد دروازہ کھول دیا تھا اور بہت دیر وہ چڑیا کے انتظار میں نیچے ٹھٹھا بھی رہا پھر وہ اوپر جا کر ویڈیو گیم کھیلنے لگا اور اسے نہیں پتا وہ گیم کھیلے کھیلے کب سویا تھا۔

”ہم نے تو جیس کھیلنی تھی۔“ ایک کو جیسے کرنٹ لگا۔ ”اور چڑیا تو جیس کھیلنے آئی تھی..... تو پھر..... انکل..... اور چڑیا کے کپڑے..... اور چڑیا کی چیخیں..... وہ اس کو کیوں مار رہے تھے؟“ ایک نے رینگ کو پکڑے پکڑے کچھ آگے جھپک کر دہشت زدہ ذہن کے ساتھ چڑیا کے تڑپتے ہوئے جسم کو دیکھنے کی کوشش کی۔ چڑیا کا جسم اب آہستہ آہستہ حرکت کرنا چھوڑ رہا تھا..... ایک اس لمحے بھی کچھ اور نہیں سمجھ پایا تھا..... ایک چیز کے سوا..... چڑیا سر رہی تھی یا شاید مر گئی تھی۔ (باقی آئندہ)

شیردل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا۔ اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں نئی بوئے میٹیم ہیں۔ شیردل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ایک دن شیردل اپنے سینئر اختر درانی کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ اختر درانی کی بیوی ترکین، شہر بانو کو بتاتی ہے کہ پہلے کسی آفیسر کی بیوی نے اس گھر میں اپنے شوہر کو مار کر خودکشی کر لی تھی اس لیے وہاں رہنے والوں کی ازدواجی زندگی مشکلات کی زد میں آ جاتی ہے۔ ترکین کے پوچھنے پر کہ ان کی شادی لومیرج کا نتیجہ ہے۔ یہ بات سن کر شہر بانو ماضی کی خوب صورت یادوں میں کھو جاتی ہے۔ جہاں صرف وہ اور شیردل ہوتے ہیں۔ دونوں کی ذہنی ہم آہنگی انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ ہاجرہ اور اس کے شوہر..... نے اپنے بے گھر ہونے کا ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا۔ خیر دین میٹرک کے بعد کوئی اور نوکری تو نہ کر۔ کالین ڈی سی ہاؤس میں تنگ کی نوکری کرنے لگا۔ خیر دین کی ایک بیٹی بھی حلیہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کر دیتا ہے جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوئی ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد حلیہ کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے۔ یوں حلیہ اور چڑیا خیر دین کے ساتھ اس ڈی سی ہاؤس میں رہنے لگتی ہیں۔ چڑیا کو جب اس گھر میں یونوں کے بارے میں پتا چلتا ہے تو وہ اپنی خیالی دنیا میں ان کے خاکے بناتی ہے، ان سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس نے ان یونوں کو مختلف نام بھی دیے، وہ ہر وقت ان کی کھوج میں رہتی ہے تاکہ وہ ان سے دوستی کر سکے۔ نئے صاحب یعنی شیردل کو یہ پسند نہیں ہوتا کہ ملازم کی فیملی ان کی فیملی کے ساتھ ربط و ضبط رکھے۔ وہ جب ٹینس کورٹ بناتے ہیں اور وہاں کھیلتے ہیں تو چڑیا یونوں کے پیچھے سے چھپ کر انہیں دیکھتی ہے۔ وہ ہر روز شام کو ان آئینوں کو دیکھتا بھی نہیں بھولتی کیونکہ خیر دین نے اس سے کہا تھا کہ شام کے وقت یونے اس میں نظر آتے ہیں لیکن چڑیا کو جو بونا نظر آتا ہے وہ بہت خوفناک ہوتا ہے اس لیے وہ اسے بونا نہیں مانتی پھر اسے اس میں ایک نظر آتا ہے۔ ایک شیردل کی چھوٹی بہن آنرہ کا بیٹا ہے وہ لوگ چھڑیاں گزارنے شیردل کے گھر آتے ہیں۔ ایک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایک سے ٹینس کھیلتا سیکھتی ہے اور ایک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو شیردل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ شیردل گھر میں قرآن خوانی کا اہتمام کروانا ہے اسے اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کام اس نے پہلے کیوں نہیں کیا۔ شیردل کے کوئیک فیاض کا ٹرانسفر ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ عکس کی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ چڑیا کی باری ڈول سے دوستی ہو جاتی ہے، چڑیا اسکول میں باری ڈول کا خیال کرتی ہے اور اسے چیزیں دیتی ہے، عکس سے پہلا تعارف شیردل کا بلک سرورس کمیشن کے امتحان کے رزلٹ کے بعد ہوا کیونکہ پہلی پوزیشن شیردل کی متوجہ تھی لیکن وہ پہلی پوزیشن حاصل نہ کر سکا پہلی پوزیشن عکس مراد علی نے لی تھی۔ ایک شطرنج کے لیے چڑیا کے خیالات اپنے انکل کو بتاتا ہے تو ایک کی ماما کو غصہ آتا ہے اور وہ ایک کو چڑیا کے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیتی ہیں۔ چڑیا ایک کے روتے سے بہت ہرٹ ہوتی ہے اور ایک کو نظر انداز کرے تو ایک سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ شیردل عکس کو فون کرتا ہے وہ سوچتا ہے کہ اس کی عکس سے بات اور ملاقات کب ہوئی تھی، شہر بانو سے منگنی کے بعد اس کو پتا چلا تھا کہ عکس کی عینی سے شادی متوجہ ہے۔ شہر بانو جب دس سال کی تھی تو اس کے باپ شہباز کا انتقال ہو گیا تھا اور شرمین دوسری شادی فاروق سے کرتی ہے اس کی پہلی بیوی سے دو بیٹے تھے۔ فاروق اور شرمین کی ایک بیٹی ہوئی تھی جو مر جاتی ہے۔ شرمین کو شہر بانو جب شیردل کے بارے میں بتاتی ہے تو وہ اس رشتے پر راضی نہیں ہوتی۔ ایک چڑیا سے سوری کرتا ہے اور اسے رات کو ملاتا ہے تاکہ اسے میکننگ جیس دیکھائے لیکن ایک خود سو جاتا ہے اس کی آنکھ کسی کے رونے اور چیختے سے کھلتی ہے یہ چڑیا کی آواز تھی وہ باہر نکل کر جو منظر دیکھتا ہے وہ اس کے ذہن سے ٹوٹ کر نکلتا ہوتا۔

(اب آگے پڑھیں)

اس اسٹینڈنگ مرمر میں اپنے عکس پر پہلی نظر ڈالتے ہی اس نے اپنی یادداشت کے سارے خانوں کو جسم سے اترے ہوئے لباس کی جیسوں کی طرح کھٹکنا اور جھاڑنا شروع کر دیا تھا۔ کتنے سال بعد اس نے اس مرمر کو دیکھا تھا اور اس مرمر میں کیا کیا دیکھا تھا۔

آئینہ اتنے سالوں کے بعد آج بھی وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ کم آب و تاب کے ساتھ لیکن اسی وقار کے ساتھ جس کے ساتھ اس نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ گھر کا ایک میٹر مکمل طور پر بدل چکا تھا۔ وہ آئینہ جیسے کسی شہزادی کا رومال تھا جسے وہ پھاڑ کر پھینے اور غائب ہونے سے پہلے شہزادے کی رہنمائی کے لیے باہر چھوڑ گئی تھی۔ واحد سراغ..... ہر ہر بھید تک لے جانے اور اسے پانے والا۔ چند لمحوں کے لیے اس آئینے کو دیکھتے ہوئے اسے یوں لگا تھا

جیسے وہ بھی تب ہی وہاں سے ہٹے گا، غائب ہوگا جب حضرت سلیمان کے عصا کی طرح اسے بھی کھڑے کھڑے دیمک لگ جائے گی، پھر ایک دن وہ برادے کے ایک ڈھیر اور آئینے سے شیشے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر وہاں سے ہٹا دیا جاتا۔ پتا نہیں وہاں کھڑا وہ کس کس کا عکس دیکھتا اور دکھاتا رہا تھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ اس آئینے میں نظر آتی عمارت کے بیرونی حصے کے عکس کو دیکھنے لگی۔ انگلیوں کی پوروں پر اس نے جیسے وہ سال گئے تھے جب وہ آخری بار اس گھر سے گئی تھی۔ وہ گھر جو اس کی زندگی کا خوب صورت ترین اور سیاہ ترین باب تھا۔ وہ گھر جس سے زیادہ محبت اور نفرت اسے کبھی کسی جگہ سے نہیں ہوئی تھی لیکن وہ گھر جو وہاں آکر بسنے والے انسانوں کے تمام احساسات سے بے نیاز آج بھی اسی تمکنت سے وہاں کھڑا تھا۔

اور پھر آئینے میں اپنے اور اس گھر کے عکس کے درمیان اس نے ایک دم کسی کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ بے اختیار مسکرائی۔ اس نے زندگی میں اس مرد کے علاوہ صرف ایک مرد کو..... وہ آگے کچھ سوچ نہیں پائی، وہ اب اس کے عقب میں کھڑا اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے اس کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کھڑا تھا۔

"You look lovely" وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"Thank you for flattering me" اس نے جواباً کہا۔ وہ اس کے عکس پر نظر جمائے ہوئے بے اختیار مسکرایا۔ گہری، گرم جوش، بہت کچھ یاد دلانے والی آنکھیں..... بے حد باریک ہونٹوں پر آنے اور کھیلنے والی بے ساختہ اور زخدار مسکراہٹ..... اور یہ مسکراہٹ کیا کیا طوفان نہیں اٹھا دیتی تھی۔ کون کون سی قیامت تھی جو بپا نہیں کر دیتی تھی۔

"You are more than welcome" اس نے ذرا سانس کر اس کی بات پر جیسے کسی ندامت کا اظہار کیے بغیر دھڑلے سے کہا۔

"تمہیں پتا ہے میں پہلی بار اس گھر میں کب آئی تھی؟" اس نے آئینے میں اس کے عکس کے عقب میں موجود عمارت پر ایک نظر ڈالتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ وہ اب بھی اس کے کندھے پر اسی طرح دونوں ہاتھ جمائے، ٹکائے کھڑا تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کر رہی تھی، نرم، سہارا دیتا ہوا دباؤ۔ چند لمحوں کے لیے جیسے اس کا دل اس سے لپٹ جانے کو چاہتا تھا۔

"جب....." اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق سے نہیں نکل سکی۔ آنسوؤں کے ایک ریلے نے اس کی قوت گویائی اور بینائی دونوں کو بیک وقت مفلوج کیا تھا۔ یادیں تھیں..... درد کے آبلے تھے جو گرم پانی کے چشموں کی سطح پر ابھرنے والے بلبلوں کی طرح پھٹنے لگے تھے۔ کندھوں پر ٹکے وہ دونوں ہاتھ سرعت سے بازوؤں پر آئے پھر انہوں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ حصار جس نے زندگی میں کبھی اس کو اکیلا نہیں چھوڑا تھا، وہ حصار جو اس کے لیے ایک عطا تھا کسی کا تحفہ۔ اس کے بازوؤں کے حصار میں روتے ہوئے اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کون سے کانٹے پہلے نکال کر اس کو دکھائے..... وہ جو پاؤں میں تھے یا وہ جو دل میں تھے۔ سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اس کو دوبارہ بھلانے کے لیے وہ کیا کرے گی۔

اس گھر کے برآمدے میں لگا وہ آئینہ، شہزادی تک پہنچانے والا واحد سراغ، اب جیسے شہزادے کو اس کے



کے بارے میں کسی کا تبصرہ سنا تھا اور وہ جیسے اش اش کراٹھا تھا۔ عکس مراد علی کے لیے اس سے زیادہ موزوں ٹائٹل کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

اور شہد کی وہ دلدل پاکستان واپسی کے بعد چیف کمشنر کو دی جانے والی اس پہلی بریفنگ میں بھی اسی طرح تباہ کن حد تک پُر اعتماد اور مستعد تھی۔

میننگ کا اختتام لٹچ کے بعد ہوا تھا اور اپنی گاڑیوں کی طرف جاتے ہوئے پورے دن میں پہلی بار شیردل اور عکس کو ایک دوسرے سے انفارمل گفتگو کا موقع ملا تھا۔ ان کا اسٹاف ان کی گاڑیوں کے پاس پہنچ چکا تھا اور وہ خود سڑے میں رک کر ایک دوسرے سے گپ شپ کرنے لگے۔

”تم کیا کر رہی ہو اب؟“ شیردل نے اس کی اگلی مصروفیات کا پوچھا۔ چار بجنے والے تھے اور آفس ٹائم تقریباً ختم ہونے والا تھا۔

”میں ابھی تو گھر جاؤں گی پھر شام کو دوبارہ آفس جانا ہے کیوں تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ عکس نے اس سے پوچھا۔

”میں سوچ رہا تھا بیٹھتے ہیں کہیں..... چائے، کافی پیتے ہیں، گپ شپ لگاتے ہیں، کافی عرصہ ہو گیا بیٹھ کر بات کیے۔“ شیردل نے اس سے کہا وہ چند لمحوں کے لیے جیسے سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے جیسے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے چلتے ہیں کہیں..... گھر چلو گے یا گالف کلب چلیں؟“ عکس نے اس سے کہا۔  
 ”I'm at your disposal“ شیردل نے بے ساختہ مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ جواباً قدم بڑھاتے ہوئے مسکرائی۔

”Then you would be disposed off soon“ شیردل اس کی بات پر بے اختیار ہنسا۔

”وہ تو تم نے سالوں پہلے کر دیا۔ dumped...discarded۔“ شیردل نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے جیسے اسے جتایا۔

”گالف کلب چلتے ہیں۔“ بات کو اس نے اسی مہارت سے بدلا تھا جس کی توقع شیردل کو تھی۔  
 ”شہر بانو کیسی ہے؟“ گالف کلب کے ریسٹورنٹ کی گلاس ونڈوز کے پاس پڑی ایک ٹیبل پر اپنی نشست سنبھالتے ہی عکس نے اس سے پوچھا۔

”بڑے خراب موڈ میں ہے آج کل۔“ شیردل نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”کیوں؟..... کیا ہوا.....؟“ وہ بھی مسکرائی۔

”میرا خیال ہے میں وجہ ہوں۔“ شیردل نے سگریٹ کا پیک کھولا اور بڑی سنجیدگی سے کہتے ہوئے ایک سگریٹ نکالا۔

”ہاں وہ تو میں جانتی ہوں تم ہی وجہ ہو گے..... مگر اس بار کیا کیا ہے تم نے۔“ عکس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لیکن ایک ہفتے کی میڈیکل لیو کے بعد اکیڈمی میں آنے والی لڑکی شیردل کو اس سے کہیں زیادہ انٹریکٹو لگی تھی جتنی اسے نیوز پیپر میں لگی تھی۔ وہ کسی اسکن انٹیکشن کا شکار بھی اور قدرے صحت یاب ہونے کے باوجود اس کے چہرے، گردن، ہاتھوں اور بازوؤں پر سرخ رنگ کے چھوٹے بڑے ان گنت دھبے تھے اور اس الرجی نے عکس مراد علی کو کافی مضحکہ خیز سی حالت میں ہر ایک سے متعارف کروایا تھا۔ وہ اپنی اس حالت کے باوجود اور بے حد ریزرو طبیعت رکھنے کے بعد بھی اپنے کامن کے ساتھیوں سے علیک سلیک کی کوشش کر رہی تھی۔ اگر وہاں کسی کو یہ غلط فہمی تھی کہ پہلی پوزیشن لینے والی امیدوار خراب اور اٹھے دماغ کے ساتھ وہاں پہنچے گی تو وہ غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔ عکس مراد علی بے حد نرم خور اور دوستانہ مزاج رکھنے والی لڑکی تھی۔ اگلے ایک ہفتے میں شیردل نے اس کو ہر ایک کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے دیکھ لیا تھا سوائے اپنے..... اور یہ چیز جیسے اسے بری طرح کھلی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے عکس نے اسے دانسا نظر انداز کیا تھا..... اپنے سب سے قریبی اور سب سے خطرناک حریف کو۔

چند بار اکیڈمی میں مختلف جگہوں پر ان کا آمنا سامنا بھی ہوا تھا مگر تب بھی دونوں کے درمیان سرد مہری اور خاموشی نہیں ٹوٹی تھی اگر عکس نے شیردل سے علیک سلیک میں پہل نہیں کی تھی تو شیردل نے بھی اسے گھاس نہیں ڈالی تھی۔ وہ بھی اسے ہر جگہ پر اسی طرح نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا تھا جس طرح وہ اسے۔ وہ اس کے وہاں ہوتے ہوئے بھی اس سے آنکھیں پھیرے رہتی تھی اور اس سرد مہری میں کچھ اضافہ اس حقیقت نے بھی کر دیا تھا کہ اس کی آمد کے چند دنوں میں ہی عکس نے کلاسز میں شیردل جیسے ماہتاب کو گرہن لگانا شروع کر دیا تھا۔ وہ کلاس میں ہمیشہ کم پوائنٹس پر بولتی تھی لیکن ان پوائنٹس اور ان مواقع پر بولتی تھی جن پر دوسروں کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا یا جب دوسرے بحث کر کر کے کسی کو جیکل نتیجے پر پہنچنے میں ناکام ہو چکے ہوتے..... اور پھر جیسے ہر ایک کو لاشعوری طور پر کلاس کے کسی کو نے سب سے آخر میں ابھرنے والی اس بے حد خوب صورت آواز کا انتظار ہوتا تھا جو مسئلے کے الجھے ہوئے دھاگے کا سراکھن میں سے بال کی طرح نکال کر یوں پلیٹ میں سب کے سامنے رکھتی کہ چند لمحوں کے لیے سب کو اپنا آپ چننا اور احمق محسوس ہوتا..... اور بہت آہستہ آہستہ عکس مراد علی نے اپنے آپ کو کلاس کا فوکل پوائنٹ بنانا شروع کر دیا تھا۔ وہ 188 لوگوں کے اس کامن میں سب سے برتر کیوں تھی یہ بہت جلد ہی سب کو پتا چلنا شروع ہو گیا تھا۔ وہاں موجود تمام لڑکے لڑکیاں غیر معمولی ذہانت کے حامل تھے اور تمام ہی اپنے اپنے علاقوں اور فیلڈز میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتے آئے تھے تو اکیڈمک ریکارڈ کی بنیاد پر عکس اور دوسرے لوگوں میں بہت زیادہ فرق نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لیکن وہ کسی بھی ڈسکشن میں کسی بھی پوائنٹ کو سمجھنے میں ریزر شارپ تھی اور اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے کمرشل کلیئر اور ٹو دی پوائنٹ۔ کلاس میں یہ اس کی امتیازی خصوصیات تھیں جو بعض مواقع پر دوسروں کو مرعوب کرتی تھیں لیکن کئی مواقع پر دوسروں کو خائف اور Insecure کر دیتی تھیں۔ وہ دوسروں کی بات کاٹ کاٹ کر جذباتی انداز میں اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی عادی نہیں تھی، نہ ہی اسے کلاس میں ہر سوال کا جواب سب سے پہلے دینے کا خبط تھا۔ وہ ہر ایک کی بات بہت دیر تک اور بے حد سکون سے سن لینے کے بعد اپنا اختلافی نقطہ نظر دوسروں کے سامنے رکھتی تھی۔ کم سے کم اس معاملے میں وہ اپنے کامن کی تمام لڑکیوں سے مختلف تھی۔

عکس مراد علی شہد کی دلدل ہے۔ میں اس اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے شیردل نے ایک دن عکس



”اس بار سے کیا مراد ہے تمہاری۔“ وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے ٹھٹکا۔ ”پہلے کیا کرتا رہا ہوں میں؟“

”میں تمہاری Biography (سوانح) نہیں لکھ رہی۔“ عکس نے اطمینان سے کہا۔ وہ ہنسا۔

”یار میرا خیال ہے اگر میری طلاق ہوئی تو اس میں ایک بنیادی رول چیف کا ہوگا۔“ وہ اب سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بے حد سنجیدگی اور جیسے کچھ تشویش سے کہہ رہا تھا۔ عکس کو ہنسی آگئی۔ اس کا اشارہ چیف کشنر کی طرف تھا جو ڈویژن کے ڈی سی اوز کو پھر کی طرح گھمانے میں کمال شہرت رکھتا تھا..... وہ خود Workaholic تھا اور اس کو بعض دفعہ آدھی رات کو کوئی فائل چیک کرتے ہوئے کوئی بھی ڈی سی اویاد آجاتا تھا اور جو اسے آدھی رات کو یاد آجاتا وہ فجر تک اپنی جان اس سے چھڑا نہیں پاتا تھا۔ این ڈی لطیف اپنا کام آفس میں کر کے آتا تھا اور باقیوں کا کام اپنے گھر میں نبھاتا تھا اور وہ بھی بے حد فرصت سے۔ ڈی ایم جی کے سینئر آفیسرز میں بہت کم این ڈی لطیف کی طرح 18 گھنٹے کام کرنے کا اسٹیمنار رکھتے تھے اور وہ جس ڈویژن میں بھی ہوتا اس کے ماتحتوں کی جان حلق میں اٹکی رہتی اور آج کل شاید شیردل اس کی توجہ کا خاص مرکز تھا اور اس کی وجہ اس کے ڈسٹرکٹ میں شروع ہونے والے بڑے بڑے پروجیکٹس تھے۔

”تم ہنس سکتی ہو کیونکہ I think the chief has a crush on you“ شیردل نے اس کی ہنسی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے بتانے کی دانستہ کوشش کی۔ عکس نے ایک دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ سامنے پڑے ہوئے گلاس میں پانی اٹھٹنا شروع کر دیا۔ وہ شیردل کی اس ہجو اس کی عادی تھی اور آج کی میٹنگ میں عکس کے علاوہ شیردل سمیت تمام DCO's اپنے اپنے حصے کی کافی بے عزتی سمیٹے بیٹھے تھے..... اور اس ”جھاڑ پونچھ“ کے بعد شیردل سے وہ اسی طرح کے رد عمل کی توقع کر رہی تھی۔

”تم مجھے شہر بانو کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔“ عکس نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے اس کی کوششوں پر جیسے پانی ڈالتے ہوئے کہا۔

”لیکن اس سے پہلے میں تمہیں چیف کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔“ شیردل نے بات کو پھر وہیں لے جاتے ہوئے کہا۔ ”چیف تمہیں پسند کرنے لگا ہے شاید۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”شاید نہیں یقیناً..... تمہیں اس سے کوئی پرابلم ہے کیا؟“ وہ بری طرح لا جواب ہوا تھا۔

”نہیں ہونی چاہیے کیا؟“ اس نے چند لمحوں کے بعد پوچھا۔

”بالکل نہیں ہونی چاہیے۔“ عکس نے ترکی بہ ترکی کہا اور ساتھ ہی اسے کھانسی آئی اور پھر وہ کھانستی ہی چلی گئی۔

”کیا ہوا یار؟“ شیردل نے اس کا گلاس اٹھا کر اسے تھمانے کی کوشش کی۔

”یہ تمہارے سگریٹ کا کمال ہے۔“ عکس نے بے مشکل اپنی کھانسی پر قابو پاتے ہوئے پانی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ شیردل نے چونک کر ہاتھ میں پکڑے سگریٹ کی طرف دیکھا۔

”کیوں سگریٹ نے کیا کیا ہے؟“ وہ قدرے حیران ہوا اس سے پہلے اس کی اسموکنگ نے کبھی عکس کی یہ حالت نہیں کی تھی۔

”Asthma ہے مجھے۔“ عکس نے پانی کا ایک اور گھونٹ لیا۔

”ارے یہ کب سے؟“ شیردل نے چونک کر بے اختیار سگریٹ کو الٹش ٹرے میں مسل کر بھجاتے ہوئے کہا۔

”امریکا کی سوغات ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”اور تم جو چیف کے بارے میں ہجو اس کرتے رہتے ہو نا سید اگر ان تک پہنچ گئی تو دن میں تارے دکھادیں گے وہ تمہیں۔“ عکس نے جیسے اسے تنبیہ کی۔

”یار آدھی رات کو کال کر دیتے ہیں..... میری ساری رات آج کل فون پر چیف کے ساتھ ہی گزر رہی ہے۔“ شیردل واقعی تنگ آیا ہوا تھا۔

”میرا خیال ہے اصلی crush ان کا آج کل تم پر ہے۔“ عکس نے مسکراتے ہوئے اسے tease کیا۔

”شہر بانو کہتی ہے میں مستقبل کا این ڈی لطیف ہوں۔“ شیردل نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”یعنی تم چیف کا ماضی ہو؟“ عکس مسکرائی۔ ”اگر چیف تمہارے جیسے ہینڈسم ہوتے تو ان کا لائف اسٹائل تمہارے جیسا ہی ہوتا، پھر تو ان کے پاس رات چھوڑ دن کو بھی کام کرنے کا وقت نہ ہوتا۔“ شیردل نے ایک بار پھر اس کے چوٹ کرتے جملے کو نظر انداز کیا۔

”اس دن فون پر کس کے ساتھ بات کر رہی تھیں تم؟“ شیردل نے اس کے تھرے کے جواب میں وہ سوال کیا جو اتنے دنوں سے اس کے ذہن میں کلبار رہا تھا۔ عکس نے بے اختیار گہری سانس لی۔

”اس ایک سوال کے لیے کتنی لمبی تمہید باندھی تم نے، میرے ساتھ چائے پیئے آئے، گھما پھرا کر ادھر ادھر کی باتیں کیں، سیدھا سیدھا اسی دن کیوں نہیں پوچھ لیا تم نے..... اتنا لمبا صبر اور انتظار..... That's sound like you Sherdil..... کیسے گزار لیے تم نے اتنے دن اس بے چینی کے ساتھ کہ میں کس سے بات کر رہی تھی اس دن..... بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کس کے ساتھ ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی۔“ اس نے مونو سکیئنڈ میں شیردل کا مدعا جانا تھا اور اسی رفتار سے شیردل کی گفتگو کو مذاق اڑاتے ہوئے ادھیڑا تھا۔ شیردل نے اس عورت کے ہاتھوں شرمندہ ہو کر برا ماننا بہت پہلے چھوڑ دیا تھا..... فائدہ نہیں تھا خواہ مخواہ اس کی باتوں کو دل سے لگانے کا۔

”اچھا تو پھر کون تھا وہ؟“ شیردل نے اسی ڈھٹائی کے ساتھ پوچھا۔

”پیرنٹس آئے ہوئے ہیں آج کل میرے، ساری فیملی ہے یہاں۔ تمہارا کیا خیال تھا..... کون ہوگا؟“

شیردل ہی کی طرح عکس نے بھی اس کے ان اٹھے سیدھے سوالوں اور باتوں کا برا ماننا اکیڈمی میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ اسے کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ شیردل بے اختیار مسکرایا۔

”اوہ پیرنٹس آئے ہوئے ہیں..... گریٹ۔“ عکس کے سوال کو اس نے بھی اسی طرح گول کیا تھا مگر کیا اطمینان تھا جو اس نے محسوس کیا تھا۔

”لیکن تمہاری فیملی کیوں آئی ہوئی ہے یہاں.....؟“ شیردل کو مسکراتے ہوئے یک دم خیال آیا۔

”مجھ سے ملنے..... میں دو سال پاکستان سے باہر رہی ہوں وہ تو ہر سال آتے ہیں یہاں..... اس بار

میری وجہ سے کچھ جلدی آگئے ورنہ دسمبر میں آتے۔“ عکس نے تفصیل سے بتایا۔ ویٹراب انہیں کافی اور اسٹینکس سرور کر رہا تھا۔

”تمہارے اسٹینٹس میں کوئی تبدیلی ہوئی؟“ ویٹر کے جانے کے بعد کیک کے ایک سلائس کو کاٹ کر اٹھاتے ہوئے شیردل نے اس سے وہ سوال کیا جو وہ بہت عرصے سے کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

”بدلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“ کیک کا ٹکڑا شیردل کو پیک دم کڑوا لگا۔

”مطلب؟“ وہ کیک کا دوسرا ٹکڑا اٹھا بٹے اٹھتے رک گیا۔

”تم یہ کیوں چاہتے ہو شیردل کہ میں تمہیں اپنی ہر پرسنل بات بتایا کروں۔ یہ بھی بتاؤں کہ میری فلاں شخص سے منگنی یا شادی ہونے والی ہے یا ہو رہی ہے..... یا.....“ شیردل نے اس کی بات کاٹ دی۔

”So you are seeing some one these days?“

”اگر تم مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ اس کے بعد اس ایٹو کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرو گے تو میں تمہیں اس سوال کا جواب دوں گی۔“ عکس نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”او، کے..... اب بتاؤ۔“ شیردل نے بے ساختہ کہا۔

”ہاں۔“ اس نے بھی فوراً ہی جواب دیا۔

”سچ میٹ ہے ہمارا کوئی؟“ شیردل بے اختیار ٹیبل پر کچھ آگے جھک آیا۔

”تم نے کیا وعدہ کیا ہے ابھی؟“ عکس نے کچھ خفگی سے کہا۔

”میں تمہارے بارے میں نہیں اس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔“ وہ بھی اتنا ہی سنجیدہ تھا۔

”تمہیں کیا کرنا ہے اس کے بارے میں کچھ بھی جان کر؟“

”اور تم کیوں اس کو مجھ سے چھپا رہی ہو؟“ اس نے ترکی بہ ترکی عکس سے کہا۔ وہ بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گئی۔

”جب تمہیں شادی کا کارڈ ملے گا تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ کون ہے وہ.....“

”میں شادی کے کارڈ پر ٹٹ ہونے سے بہت پہلے تمہیں بتا دوں گا کہ کون ہے وہ.....“ شیردل نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔

”میں نے شہر بانو کے بارے میں تم سے کچھ پوچھا تھا؟“ عکس نے بے حد خفگی کے عالم میں اس سے کہا۔

”میں نے خود تمہیں سب کچھ بتا دیا تھا..... چھپایا کیا تھا؟“ وہ لا جواب ہو گئی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا وہ واقعی اس سے کبھی کچھ نہیں چھپاتا تھا..... کم از کم عکس کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس نے شیردل سے کچھ بھی پوچھا ہو

اور اس کو جواب دینے میں تامل رہا ہو۔ وہ چند لمحے یہی سوچتی رہی تھی۔

”سچ میٹ ہے ہمارا کوئی؟“ شیردل نے اسے خاموش دیکھ کر پھر کہا۔

”نہیں۔“ اس بار عکس نے کسی اعتراض کے بغیر کہا۔

”سول سرورنٹ ہے؟“

”نہیں۔“

”اوہ.....“ شیردل نے بے اختیار کہا۔

”گورنمنٹ سروس میں نہیں ہے۔“ شیردل کو اب پہلے سے بھی کچھ زیادہ دلچسپی ہوئی۔

”نہیں۔“

”تو.....؟“ وہ جواب دیتے میں ایک بار پھر متامل نظر آئی شیردل کو اس سوالی کا جواب دینے کا مطلب

کیا تھا وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اس کی زندگی کی بہت ساری fantasies کو ختم کرنے کا باعث بنتا رہا تھا..... اپنی نیک نیتی کے باوجود..... اور اس سے معلومات کے تبادلے کا مطلب عکس کو خائف کر رہا تھا۔ شیردل بے حد متامل سے اس کے سامنے بیٹھا کافی پیتا ہوا اس کے چہرے پر نظریں جمائے اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ وہ سالوں بعد مل رہے ہیں..... درمیان میں بہت کچھ آیا تھا اور بہت کچھ ہوا تھا لیکن اس کے باوجود ایک ملاقات میں ہی وہ ایک بار پھر یوں شیر و شکر ہو گئے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور یہ ان کے تعلق کا حیران کن پہلو تھا۔ وقت، فاصلہ، اختلافات، کوئی چیز ان کے باہمی تعلق اور ذہنی ہم آہنگی کو ختم نہیں کر پائی تھی۔ وہ جب بھی ملتے تھے بے حد کوشش کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ بہت دیر تک ریز روڈ اور فارل نہیں رہ پاتے تھے۔ بات شروع کرتے اور پھر بات سے بات نکلتی جاتی۔ کون سی چیز ذاتی ہونے کی وجہ سے دوسرے کے لیے قابل مداخلت نہیں تھی انہیں یہ بھی بھول جاتا..... ان کے لیے جیسے ایک دوسرے کی ذات اور زندگی میں کوئی نوگوا سیر یا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کم از کم شیردل ایسا ہی سمجھتا اور محسوس کرتا تھا اور اس وقت بھی یہی ہو رہا تھا۔ کافی کے ایک کپ سے شروع ہونے والی گفتگو چند منٹوں میں کہاں پہنچ گئی تھی۔ دونوں کو وہاں آنے سے پہلے اندازہ بھی نہیں تھا۔ عکس اب پچھتا رہی تھی اسے شیردل کی آفر قبول نہیں کرنی چاہیے تھی۔ شیردل نے کافی کا گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھا اور پھر بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”وہ جو اس دن میں نے جس مرد کی آواز سنی تھی وہ یقیناً یہی صاحب ہوں گے اور اپنی فیملی کے ساتھ

تمہارے گھر پر تھے وہ۔“ شیردل کے ذہن کو صرف وہ Psychic کی طرح نہیں پڑھتی تھی، وہ بھی اس کی ہر

بات اور ارادے کو ڈی کوڈ کرنے میں ماہر تھا۔ چھپاتے تو ایک دوسرے سے کیا چھپاتے وہ..... اور کس

طرح.....؟ صرف ایک صورت تھی اگر اندھے اور گونگے بن کر بیٹھ جاتے دونوں تو..... اور یہ ان دونوں کے

لیے ہی ممکن نہیں تھا۔ عکس نے بھی بالآخر اپنی کافی ختم کر لی۔

”منگنی ہوئی ہے یا شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے؟“ شیردل یوں اطمینان سے پوچھ رہا تھا جیسے اسے اپنے

منگنے کے تیر ہونے کا الہامی یقین ہو۔

”وہ صرف ہمارے گھر آئے تھے..... دونوں فیملیز ایک دوسرے سے ملیں اور بس..... اور کچھ فائنل

نہیں ہوا ابھی۔“ عکس نے مزید کچھ چھپانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اسے بتایا۔

”اور کون ہیں یہ موصوف؟“ شیردل نے کانٹے کے ساتھ کڑوے کیک کا ایک اور ٹکڑا اٹھایا۔

”میرے ساتھ امریکا میں ہی تھا، بوسٹن یونیورسٹی سے بی ایچ ڈی کی ہے اس سال اس نے ماس

کیونیکیشنز میں..... پولیٹیکل فیملی سے تعلق ہے اس کا..... اور اس کے فادر پارلیمنٹیرین ہیں..... اور اب تم مجھے

ڈھونڈھ کر اس کے بارے میں کچھ ایسی معلومات دینا کہ مجھے اس کی شکل دیکھنے میں بھی دلچسپی نہ رہے۔“ بے

حد سنجیدگی سے کہہ گئے آخری جملے پر شیردل کو بے اختیار ہنسی آئی تھی لیکن عکس کو نہیں..... وہ جانتا تھا کہ عکس کا

اشارہ کس طرف تھا..... غنی حمید کی طرف..... اور ان تمام مردوں کی طرف جنہیں ماضی میں وقتاً فوقتاً عکس شادی

کی نیت سے کنسیدر کرتی رہی اور شیردل ہر بار کوئی نہ کوئی ایسی چیز ان لوگوں کے حوالے سے اس کے سامنے

پیش کرتا رہا کہ وہ کچھ دیر کے لیے سکتے میں آ جاتی۔ شیردل جیسے فیملی بیک گراؤنڈ اور پہنچ کے ساتھ کسی کا کچا چٹھا



”اتنا کام ہو گیا کہ تمہارے پاس میرے یا اپنی بیٹی سے بات کرنے کے لیے بھی وقت نہیں رہا۔“ اس کی بیوی نے گلہ کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارے پاس ہی تو ہوتا ہوں ہر وقت۔۔۔ جیسے ابھی۔“ اس نے جیسے اپنی بیوی کی تشویش کم کرنے کی کوشش کی۔

”ہاں ہو تو تم پاس ہی لیکن پتا نہیں کہاں پہنچے ہوئے ہو، پچھلے چند دنوں سے۔“ اس بار اس کے شوہر نے کتاب کو دوبارہ کھول لیا۔ وہ جیسے اس سے اور اس ٹاپک سے مکمل طور پر بچنا چاہتا تھا۔

”اور یہ خیر دین کہاں چلا گیا ہے؟“ شوہر سے بات کرتے کرتے اسے ایک دم گھر کا سب سے اہم ایشو یاد آیا۔ کتاب پر اس کے شوہر کی گرفت کچھ اور سخت ہو گئی۔

”خیر دین کو نکال دیا ہے میں نے۔“ ایک صفحہ پلٹتے ہوئے اس نے بیوی کو دیکھے بغیر کہا۔ بعض باتوں پر کسی سے بھی نظریں ملا کر مشکل ہو جاتا ہے خاص طور پر اس شخص سے جو آپ کی زندگی کا ساتھی ہو، آپ سے اندھی محبت کرتا ہو اور آپ کی ہر بات پر آمنا و صدقاً کہہ کر یقین کرنے کا عادی ہو۔

”نکال دیا؟“ وہ بری طرح چونکی۔ ”کیوں؟“ خیر دین جیسے خانہ ماں کو ملازمت سے نکال دینا اور وہ بھی اس طرح اچانک کسی وارننگ کے یا اس کو بتائے بغیر۔۔۔ وہ حیران نہ ہوتی تو کیا ہوتی۔ وہ آج تک جہاں جہاں پوسٹڈ رہے تھے اور جن جن ملازمین سے ان کا واسطہ پڑتا رہا تھا ان میں خیر دین بلاشبہ سب سے بہترین تھا اور اس حقیقت کو انہوں نے پہلے چند دنوں میں ہی تسلیم کر لیا تھا۔

”چوری کی تھی اس نے۔“ اس کے شوہر نے کتاب کا ایک اور صفحہ پلٹا۔ وہ اب بھی اس کی طرف دیکھے بغیر بات کر رہا تھا۔

”خیر دین نے؟“ اس کو جیسے شوہر کی بات پر کرنٹ لگ گیا۔

”ہاں۔۔۔ کیا چرایا تھا اس نے؟“ وہ اب بھی یقین نہیں کر پارہی تھی۔

”چرا لیتا اگر میں اچانک بیڈروم میں نہ آ جاتا۔۔۔ تمہاری جیولری نکال کر بیٹھا ہوا تھا۔“ کتاب کے صفحے اب بہت رفتار سے پڑھے جا رہے تھے۔

وہ بے یقینی سے ایک لفظ بھی کہے بغیر اپنے شوہر کو دیکھتی رہی۔ کتاب پر نظریں جمائے ہوئے بھی اس نے بہت بری طرح سے خیر دین کے لیے بیوی کی زبان سے لعنت و ملامت سننے کی خواہش کی تھی، یہ جیسے ایک تصدیق ہوتی کہ اس کی بیوی نے اس کی بات کا ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر یقین کر لیا ہے مگر بیوی خاموش تھی اور جب وہ اگلے کئی منٹ تک خاموش ہی رہی تو اسے کتاب سے نظریں ہٹانی پڑیں۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”Impossible۔“ وہ کم از کم یہ لفظ اپنی بیوی کے منہ سے سننے کا خواہش مند نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ بے ساختہ گردن لگی میں ہلا رہی تھی۔

”Impossible والی کیا بات ہے اس میں؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ تند و تیز ہو گیا۔ ”نو کر تو نو کر ہوتے ہیں۔۔۔ کبھی بھی کچھ بھی کر سکتے ہیں۔۔۔ ہم ان پر اعتماد تو نہیں کر سکتے۔۔۔ چاہے وہ کتنے بھی اچھے کیوں نہ ہوں۔“ وہ خیر دین کے لیے بیوی کی پسندیدگی سے واقف تھا۔ ”مجھے بھی تمہاری ہی طرح شک لگا تھا

لیکن میں اگر اچانک بیڈروم میں نہ آ جاتا تو تمہاری جیولری غائب ہو چکی ہوتی۔ اس سے پہلے بھی کئی بار میری تھوڑی بہت رقم ادھر سے ادھر ہوتی رہی۔۔۔ میں نے تم سے ذکر نہیں کیا لیکن میں محتاط ہو گیا تھا بہت۔ خیر دین تو شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ تم لوگ گھر میں نہیں ہو۔۔۔ میں رات گئے اسٹڈی میں بیٹھا رہتا ہوں تو وہ بڑے اطمینان سے جیولری کا صفایا کر دے گا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔“ اس نے اتنی لمبی بات کیوں کی تھی اسے سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید یہ اس کی بیوی کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات تھے جن کو ختم کرنے کی ایک desperate کوشش تھی جو وہ کر رہا تھا یا پھر یہ اس کی اپنی آواز کا کھوکھلا پن تھا جس کی بازگشت سے بچنے کے لیے اسے مسلسل بولنا پڑ رہا تھا۔

وہ بات ختم کر کے چند لمحے بیوی کو دیکھتا رہا پھر جیسے اس نے کچھ بے بس ہو کر کہا۔ ”تم اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟۔۔۔ میں جانتا ہوں خیر دین بہت اچھا لگتا تھا۔۔۔ But you just don't worry۔۔۔ ایک آدھ ہفتے میں اس سے بھی اچھا لگ ل جائے گا ہمیں۔۔۔ میں نے ایک دو لوگوں کو بتایا ہے تب تک جمشید سے کام چلاؤ۔۔۔“ اس نے کچن میں خیر دین کے مددگار کا نام لیا اور دوبارہ کتاب کھول لی۔

”میری جیولری بیڈروم میں نہیں تھی۔“ وہ چند لمحوں کے لیے ہل نہیں سکا، آئینہ دیکھے بغیر بھی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے چہرے کا رنگ اس وقت زرد ہو گا۔ سراٹھا کر اس نے اپنی بیوی کو دیکھا جس کے چہرے پر بے یقینی اور الجھن اب بھی ویسے کی ویسی تھی۔

”بیڈروم میں نہیں تھی تو کہاں تھی؟“ اس نے خود کو ٹارٹل دکھانے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میرے پاس تھی۔۔۔ میں ساتھ لے کے گئی تھی۔“

اس کا رنگ اب زرد سے یقیناً سفید پڑا ہو گا۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہا تھا۔۔۔ کم از کم یہ جھوٹ بولنے سے پہلے اسے ایک بار الماری میں جیولری کی موجودگی کو ضرور کنفرم کر لینا چاہیے تھا۔

”میرا خیال ہے خیر دین کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے تمہیں۔۔۔“ اس نے بالآخر اپنی بیوی کو کہتے سنا۔

”شاید جیولری اسے الماری میں نہیں ملی اس لیے اتنی دیر لگ گئی اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ورنہ وہ تو میرے آنے سے بہت پہلے تمہاری جیولری نکال کر غائب ہو جاتا۔“ وہ اپنی بیوی کو یہ موقع نہیں دے سکتا تھا کہ وہ خیر دین کو بے گناہ سمجھے۔

”میں کمرے میں آیا تو وہ الماری اور دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ میں تو یہی سمجھا کہ تمہاری جیولری نکال رہا ہے، یہ تو بہت اچھا ہوا کہ وہ وہاں تھی ہی نہیں تم ساتھ لے گئیں۔۔۔“ بات کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی ایک بار پھر اسے بے یقینی کے انہی تاثرات کے ساتھ پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی، اب کیا تھا؟ اس نے جیسے کراہتے ہوئے دل ہی دل میں خود سے پوچھا۔ وہ اتنا برا جھوٹ بولنے والا تو نہیں تھا کہ وہ اس پر یقین ہی نہ کر پاتی۔

”الماری اور دروازہ کی چابیاں تو میرے پاس تھیں۔۔۔ خیر دین نے انہیں کیسے کھول لیا؟“ چند لمحوں کے لیے اسے سمجھ نہیں آیا کہ اس کے چہرے کا رنگ اب کیسا ہو گیا ہو گا یا کوئی رنگ اب رہا ہی نہیں تھا۔

اس نے اپنے آپ کو پھر کوسا۔ وہ DMG کے قابل ترین آفیسرز میں سے تھا اور اس نے خیر دین کے

خلاف چارج ٹیٹ تیار کرتے ہوئے اپنی تقریباً ڈیڑھ سال کی ٹریننگ کے تقریباً ہر اصول کو نظر انداز کیا تھا۔۔۔۔۔ جھوٹ کو دلائل اور ثبوتوں کے ساتھ پیش کریں، اسے اکیڈمی میں وہ مزاحیہ ڈیویس یاد آئی جو اس نے جیتی تھی۔۔۔۔۔ سچا جھوٹ بولنے کے سوکارآمد طریقے۔۔۔۔۔ ہر خیالی پلاؤ پر ڈالنے کے لیے اصلی قورمہ تیار کریں۔ اسے اکیڈمی کے ایک انسٹرکٹر Proverb یاد آیا۔

”یقیناً اس نے بنوائی ہوں گی چابیاں۔۔۔۔۔ یہ کون سا مشکل کام ہے۔۔۔۔۔ یا پھر کسی اور چابی سے کھول لی ہوگی۔۔۔۔۔ کوئی پہلی بار تو چوری نہیں کر رہا ہوگا وہ کہ بغیر تیاری کے کرے گا۔“ کتاب کے صفحے ایک بار پھر برقی رفتار سے پلٹے جانے لگے۔۔۔۔۔ اس کی بیوی نے اس کی اس بات کے جواب میں بھی کچھ نہیں کہا اور اس کی اس خاموشی نے جیسے اس کی جان حلق میں اٹکادی تھی۔ ان کی شادی کے تمام سالوں میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کی بیوی نے کبھی اس کے ساتھ اس طرح کے معاملات پر سوال جواب کیے ہوں، وہ اپنے شوہر کی رائے اور ہر بات کو جوں کا توں قبول کرنے کی عادی تھی۔ یہ اپنے شوہر پر اندھا اعتماد کی سنہری مثال تھی اور ایسا اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ اپنے شوہر سے دیوانہ وار محبت کرتی تھی، یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی کسی بات پر یقین کرنے میں وہ جذبات اثر انداز نہ ہوتے۔

”میں سونے جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ بہت تھک گیا ہوں۔۔۔۔۔“ اس نے اپنی بیوی کی خاموشی سے جیسے کچھ خائف ہوتے ہوئے وہاں سے اٹھنے میں غافیت سمجھی۔ پتا نہیں اس کی خاموشی میں اب مزید کون سا سوال یا اعتراض چھپا ہوتا جو اسے لا جواب اور جھوٹا ثابت کر دیتا۔

اور اس کا یہ اندازہ اور خدشہ ٹھیک تھا۔ شوہر کے بستر پر جا کر لیٹنے کے بعد بھی وہ وہیں بیٹھی رہی تھی۔ وہ اس کے جیمز کی گٹری کی الماری تھی جس کی ایک دراز میں وہ جیولری رکھتی تھی۔ الماری کا ایک حصہ وارڈ روب پر مشتمل تھا مگر وہاں پر بہت قیمتی کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ ایسے ملبوسات جو وہ عام طور پر بہت بڑے لیول کے فیملی یا دوسرے فنکشنز میں استعمال کرتی تھی۔ ان کے اپنے بیڈروم میں پرانے زمانے کی طرز کی ایک وارڈ روب دیوار میں موجود تھی اور اس کے اور شوہر کے روزمرہ کے ملبوسات اسی میں ہوتے تھے اور وہ وارڈ روب کھلی رہتی تھی۔ خیر دین خود ہی اس وارڈ روب میں اس کے اور اس کے شوہر کے ملبوسات پر لیس کرنے کے بعد لٹکا دیتا تھا۔۔۔۔۔ اور ایسا کئی بار اس کی عدم موجودگی میں بھی ہوتا تھا اور وہ وارڈ روب خیر دین کے لیے ممنوعہ چیز نہیں تھی۔۔۔۔۔ لیکن اس کا شوہر یہ کہہ رہا تھا کہ خیر دین وہ الماری کھولے کھڑا تھا جس میں اس کی جیولری تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ویک اینڈ شہر سے باہر گزارنے کے بعد واپس آنے پر اس نے اپنی الماری اور دراز کو اسی طرح لاکڈ پایا تھا جس طرح وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ اگر خیر دین نے انہیں توڑ پھوڑ کر کھولا تھا تو وہ اسے کھلے ہی ملنے چاہیے تھے اور اگر وہ کسی چابی سے کھولے گئے تھے تو خیر دین کے کھلی الماری اور دراز کے پاس پکڑے جانے کی صورت میں اسے انہیں دوبارہ لاک کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ اس صورت میں بھی اس کی الماری کو کھلا ہونا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ اور اگر انہیں بعد میں اس کے شوہر نے لاک کیا تھا تو پھر اس کے شوہر کو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ شاید اس نے چابیاں بنوائی ہوں گی اور ان کے ساتھ کھولا ہوگا۔

اس کے شوہر کے بیان میں تضادات تھے لیکن اس کے لیے یہ بات پریشان کن نہیں تھی۔ پریشانی اسے

اپنے شوہر کے گھبرانے سے ہو رہی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے شوہر کو کنفیوژڈ دیکھا تھا۔ اس کا شوہر اگر اسے جھوٹ کے اس پلندے کے بغیر سیدھا سیدھا کوئی وجہ بتائے بغیر یہ کہہ دیتا کہ اس نے خیر دین کو نوکری سے نکال دیا ہے تو اسے شاید اس طرح کی عجیب فیلنگز کا احساس نہ ہوتا جو اب ہو رہا تھا۔ کچھ غلط تھا۔۔۔۔۔ مگر کہاں۔۔۔۔۔؟ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ مسئلہ اس کے شوہر کی سائیڈ پر تھا خیر دین کی سائڈ پر نہیں۔۔۔۔۔ اور عقل یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ جو کچھ اس کا شوہر کہہ رہا تھا وہ ٹھیک تھا۔ وہ رات گئے تک بے مقصد بیٹھی رہی تھی پھر سونے سے پہلے اس نے پتا نہیں کیا خیال آنے پر ایک بار اٹھ کر الماری اور دراز چیک کیے جن کے حوالے سے اس کے شوہر نے خیر دین پر اتنے سنگین الزامات لگائے تھے۔ وہاں کسی لاک کو زبردستی کھولنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ دراز میں اس کی چیزیں جوں کی توں موجود تھیں جس طرح اور جس ترتیب سے وہ رکھا کرتی تھی۔

اس رات اسے نیند مشکل سے آئی تھی۔ اگلی صبح اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان خیر دین کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس کے شوہر نے جیسے سکون کا سانس لیا تھا لیکن شوہر کے گھر سے جانے کے بعد اس نے جشید سے خیر دین کے بارے میں سوال کیا اور اس وقت اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ گھر کے تمام ملازم کچھ عجیب سے طریقے سے ری ایکٹ کر رہے تھے۔ خیر دین کے نام پر وہ سب جیسے گونگے ہو جاتے تھے یا ان کے چہروں پر عجیب سی ہوائیاں اڑنے لگتی تھیں۔ جشید وہ پہلا ملازم تھا جس سے اس نے خیر دین کے بارے میں پوچھا تھا۔ جواب عجیب رٹے رٹائے انداز میں ملا تھا۔

”وہ نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔“ جواب اس سے مختلف تھا جو اس کے شوہر نے دیا تھا۔ وہ کھٹکی لیکن اس نے نظر انداز کر دیا۔

”کہاں چلا گیا؟“

”گماؤں۔“ جشید اس سے نظریں ملائے بغیر میکانیکی انداز میں بول رہا تھا یوں جیسے وہ کوئی رپورٹ تھا اور پھر اگلے دو تین دن میں اس نے خیر دین کے نام پر گھر کے تمام ملازموں کو رپورٹ بننے دیکھا تھا۔ وہ الجھنے اور چڑنے لگی تھی ان کے اس ایک جیسے رد عمل سے۔ وہ جیسے کسی تھیر کے ایکسٹراز تھے جو اپنی لائنز کو بے حد ناقص اور بھونڈے انداز میں ادا کر کے اپنے رول کو مضحکہ خیز بناتے ہوئے audience سے نوٹس ہو رہے تھے۔

وہ تو قیر کیا لیتے۔۔۔۔۔ وہ ہونجک کے مستحق بھی نہیں ہو پارہے تھے۔ وہ چند دن سے زیادہ خیر دین کا معما سمجھنے کی کوشش نہیں کر سکی۔ اس کی نند اپنے بچوں کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیاں گزار کر واپس جا رہی تھی اور اس کا بیٹا ایک پچھلے کئی دن سے بری طرح بخار میں پھنک رہا تھا۔ اگلے چند دن ایک کو ہسپتالز کرنا پڑا اور خیر دین کی میڈیکل گمشدگی بڑے آرام سے پس پشت چلی گئی۔ ایک اس کے شوہر کو بہت عزیز تھا یہ وہ ہمیشہ سے جانتی تھی لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایک کی بیماری اس کے شوہر کو اس طرح اپ سیٹ کرے گی۔ اس نے اپنے شوہر کو اپنی بیٹی کی چھوٹی موٹی بیماریوں پر اس طرح پریشان دیکھا تھا یا وہ اب اسے ایک کی بیماری پر پریشان دیکھ رہی تھی۔ ایک بیماری کے دوران بے حد چڑچڑاہو گیا تھا خاص طور پر اسے شیر دل کے ساتھ ایک کے رویے کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے انکل کو دیکھتے ہی بے وجہ ضد کرتا، بدتمیزی کرتا یا رونے لگتا اور اس کا شوہر جیسے اسے بہلانے کی ہر کوشش میں بری طرح ناکام ہو رہا تھا۔ وہ شاندار

چھٹیاں جو شروع میں اس کے لیے بے حد خوشگوار اور یادگار تھیں اب آخری دنوں میں ایک کی بیماری اور اس کے روتے کی وجہ سے جیسے مستقل ٹینشن کا ایک ذریعہ بن گئی تھیں۔ اس کی تند کے پاس اب اس کے ساتھ آؤٹنگ یا شاپنگ کا نام نہیں تھا۔ اس کی مکمل توجہ اپنے بیٹے کی صحت یابی کی طرف تھی اور انہی حالات میں جب اسپتال میں ایک کی حالت کچھ بہتر ہونے پر اس کی تند نے واپس لاہور جانے کا فیصلہ کیا تو اس نے جیسے سکون کی سانس لی۔ تند اور اس کی فیملی کے ساتھ بے حد دوستی ہونے کے باوجود وہ اب گھر میں ہونے والی اس مستقل بیمار داری سے بیزار ہونے لگی تھی جو گھر آنے کے بعد اس کے شوہر کا بچا کچھ وقت بھی لے لیتی تھی۔

انہی دنوں میں باربی ڈول نے چند بار اس سے چڑیا کا پوچھا۔ وہ اتنے دن سے چڑیا کو کہیں نہ دیکھنے پر جیسے کچھ بھٹس کا شکار تھی۔ اصل تشویش شاید اسے لائی پاپس اور کینڈیز کی اس سپلائی کے بند ہونے کی وجہ سے ہوئی تھی جو پہلے چڑیا کی وجہ سے باقاعدگی سے جاری تھی۔

چڑیا یہاں سے چلی گئی ہے۔“ اس نے باربی ڈول کے استفسار پر اسے بتایا۔

”کہاں چلی گئی ہے؟“ باربی ڈول بری طرح حیران ہوئی تھی۔ اسے یہ سمجھ نہیں آیا تھا کہ چڑیا اپنا گھر چھوڑ کر کہیں اور کیسے چلی گئی تھی۔

”وہ اپنے نانا کے ساتھ اپنے گاؤں چلی گئی۔“ اس نے باربی ڈول کے سوالوں کے جواب میں مختصراً کہا۔

”کیوں؟“ باربی ڈول پریشان ہوئی۔

”وہاں ان کا گھر ہے۔۔۔۔۔ وہ اب وہاں رہیں گے۔“ اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

”ہمارے بھتیجا بڑا گھر ہے؟“ باربی ڈول نے کچھ دیر خاموش رہ کر جیسے کچھ بے قراری کے عالم میں ماں سے کہا۔

”شاید۔۔۔۔۔“ ماں نے کچھ گول مول سا جواب دیا۔

”اب وہ کبھی یہاں نہیں آئے گی؟“ باربی ڈول نے ایک بار پھر سے بے قرار ہو کر پوچھا۔

”نہیں۔“ اس بار اس نے دو ٹوک جواب دیا۔

”اور اسکول بھی نہیں؟“ باربی ڈول کو مزید تشویش ہوئی۔

”اسکول تو آئے شاید۔“ اس نے چند لمحے سوچ کر باربی ڈول کو تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کی۔

”اوکے۔۔۔۔۔ باربی ڈول بے ساختہ مطمئن ہوئی۔ یعنی چڑیا سے ملاقات کے امکانات ابھی باقی تھے۔

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے کے بعد باربی ڈول نے اسکول جانا دوبارہ شروع کیا۔ چڑیا سے دوبارہ ملاقات کی خواہش جیسے اسکول جانے میں اس کی بنیادی دلچسپی کی وجہ بن گئی تھی۔ پہلے دن اسکول میں وہ متلاشی نظروں سے بریک ٹائم میں چڑیا کو ڈھونڈتی رہی اس سے پہلے پورا دن ہر بار کلاس روم کے دروازے کے سامنے سے کسی کے گزرنے پر وہ بے اختیار دروازے کو اس مسکراتے ہوئے چہرے کے نظر آنے کی امید میں دیکھتی رہی تھی۔ وہ بہت اداس پہلے دن اسکول سے واپس آئی تھی۔ اگلے دو دن چڑیا کا انتظار کرنے کے بعد وہ چوتھے دن خود چڑیا کی کلاس میں چلی گئی تھی۔

”وہ تو اسکول ہی نہیں آرہی۔“ اس کی ایک فرینڈ نے باربی ڈول کو دیکھتے پر اسے بتایا اور ساتھ ہی اس سے پوچھا۔ ”وہ بیمار ہے کیا؟“

باربی ڈول کو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کی فرینڈ کے سوالات کا کیا جواب دے۔ چڑیا تو واقعی اس کے گھر میں تھی، اسے بتا ہونا چاہئے تھا اس کے بارے میں۔

”وہ گاؤں چلی گئی ہے۔“ اس نے سوچ سوچ کر اس کی فرینڈ کو وہ وجہ بتائی جو اس کی مٹی نے بتائی تھی اور وہاں سے آگئی۔

ایک ہفتہ گزرنے کے بعد چڑیا کی کلاس ٹیچر اس کے پاس آئی تھیں اور انہوں نے ایک وارننگ لیٹر اس کی ڈائری میں چڑیا کو دینے کے لیے اسمبلی کر دیا تھا۔ وہ ایک ہفتے سے اسکول سے بغیر اطلاع اور بغیر اپیلیکیشن کے غائب تھی۔ کچھ دن اور گزر جاتے تو اسکول سے اس کا نام کاٹ دیا جاتا۔ اسکول کے پاس چڑیا سے رابطے کا واحد ذریعہ باربی ڈول تھی کیونکہ چڑیا اور باربی ڈول کا ہوم ایڈرس ایک ہی تھا۔

چڑیا کی کلاس ٹیچر کو اپنی کلاس کی سب سے برائے بچی کے یوں اچانک غائب ہونے پر بے حد تشویش تھی۔ اس سے پہلے اس نے بھی اسکول سے چھٹی نہیں کی تھی۔۔۔۔۔ بغیر اطلاع چھٹی کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ باربی ڈول سے چڑیا کے بارے میں سوالات کرتی رہیں اور اس کے یہ بتانے پر کہ چڑیا گاؤں چلی گئی وہ گاؤں میں اس کا ایڈریس پوچھنے کی کوشش کرتی رہیں۔

اس دن شام کو ہوم ورک کے لیے بیٹک کھولتے ہوئے اس کی مٹی نے اس کی ڈائری میں چڑیا کو اسکول کی طرف سے ملنے والا وہ وارننگ لیٹر دیکھا جو DC ہاؤس کے پوسٹل ایڈرس پر بھیجا جاتا اگر باربی ڈول خود اسکول نہ جا رہی ہوتی۔ خیر دین کے دیے ہوئے فون نمبر پر رابطہ کرنے پر یقیناً اسکول کلرک کو کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا تھا اور خاطر خواہ جواب ملتا بھی کیسے۔ DC ہاؤس کا آپریٹر چڑیا کے اسکول سے آنے والی ایک کال پر خیر دین کے بارے میں انہیں کتنی تفصیلات دے سکتا تھا۔ خاص طور پر جب گھر کا ہر ملازم اندر کی کہانی سے واقف تھا لیکن خاموش تھا تو آپریٹر کے پاس بھی یہ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ خیر دین جاب چھوڑ گیا تھا۔

وہ بہت دیر تک اس وارننگ لیٹر کے میٹر کو پڑھتی رہی۔ انجھنوں کی اس ڈوری میں ایک گرہ اور لگی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ خیر دین کتنے شوق اور محنت سے چڑیا کو پڑھا رہا تھا اور وہ اس بات سے بھی واقف تھی کہ اس کی تعلیم کے اخراجات وہاں سے پوسٹ آؤٹ ہونے والے ایک پرانے آفیسر اور اس کی بیوی اٹھا رہے تھے۔۔۔۔۔ اور وہ اس بات سے بھی آگاہ تھی کہ چڑیا ایک آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ جتنی بار بھی باربی ڈول کے لیے اسکول جا کر سسٹر ایلیکس سے ملی تھی ہر بار اس نے ان سے چڑیا کے قصیدے سنے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ اس بچی کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھنے لگی تھیں۔ کئی بار اندر بیٹھے ہوئے اس نے چڑیا کو لان میں باربی ڈول کے ساتھ نرسری rhymes گاتے ہوئے سنا۔ اس کی آواز اور لب و لہجہ اتنا خوب صورت اور عمدہ تھے کہ وہ بہت بار اس کی rhymes سننے بیٹھ جاتی تھی اور باقی رہی سہی کسر باربی ڈول کے سنائے ہوئے قصوں نے پوری کر دی تھی۔ ایک کی ماں کے برعکس چڑیا کے بارے میں یہ سب کچھ جان لینے کے بعد اس نے باربی ڈول کو بھی اس کے ساتھ کھیلنے سے روکا نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اسے ہمیشہ محسوس ہوتا تھا کہ

وہ بچی خود ہی ان لوگوں کے سامنے باربی ڈول یا دوسرے بچوں کے قریب آنے سے اجتناب کرتی تھی اور اب بیٹھے بیٹھے اس بچی کا اس طرح غائب ہو جانا اسے سمجھ نہیں آیا تھا۔

”خیر دین کی نواسی نے اسکول جانا چھوڑ دیا ہے کیا؟ آدھے گھنٹے بعد اپنے شوہر کے گھر آنے پر اس نے چڑیا کے دارنگ لیٹر کا تذکرہ اس کے سامنے چھیڑا۔ وہ دونوں ابھی کچھ دیر پہلے ہی شام کی چائے پینے کے لیے بیٹھے تھے۔ وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے بری طرح بدکا۔

”خیر دین کی نواسی کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟“ وہ اپنے شوہر کے جواب پر جیسے ہکا بکا رہ گئی تھی۔ یقیناً وہ اپنے سوال کے جواب میں اپنے شوہر کے منہ سے یہ جواب سننے کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

”میں کب کہہ رہی ہوں کہ آپ کا اس سے کوئی تعلق ہے۔ میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ وہ اسکول نہیں جا رہی۔“ اس نے دوبارہ اپنا سوال دہراتے ہوئے کہا لیکن اس بار اس نے سوال کو اطلاع بنا کر پیش کیا تھا۔

”اس کا اسکول جانا نہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔“ اس بار اس کے شوہر نے کچھ بہتر جواب دیا تھا۔

”چڑیا کی کلاس پیچھے اس کا وارننگ لیٹر ہماری بیٹی کو دیا ہے۔“ سرسری انداز میں یہ اطلاع اپنے شوہر کو دیتے ہوئے اگر اسے اپنے شوہر کے رد عمل کا اندازہ ہوتا تو وہ شاید ایسی اطلاع اسے دیتے ہوئے سو بار سوچتی۔

”کیا مطلب؟ انہوں نے اس کا وارننگ لیٹر میری بیٹی کے ذریعے بھجوایا ہے۔“ اس کے شوہر نے چائے کا کپ رکھ دیا تھا۔ ”how dare they“ انہیں ایک آفیسر اور نوکر کے بچے میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ ان کی ہمت بھی کیسے ہوئی کہ وہ میری بیٹی سے آکر ایک نوکر کی بچی کے حوالے سے بات بھی کرتے۔“

اس نے زندگی میں اپنے شوہر کو کبھی اس طرح اتنی معمولی سی بات پر اتنا غضبناک نہیں دیکھا تھا۔

”وہ ہمارے سرورٹ کو ارڈرز میں رہ رہی ہے تو شاید اس لیے انہوں نے پوچھ لیا۔۔۔۔۔۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔۔“ اس نے بے حد حیرانی کے عالم میں اپنے شوہر کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بڑی طرح ناکام ہوئی تھی۔ شیردل نے چند منٹوں کے اندر آپریٹر سے باربی ڈول کے اسکول کی پرنسپل سے بات کروانے کا کہا تھا۔

”تم اوورری ایکٹ کر رہے ہو۔“ اس نے اپنے شوہر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”میں اوورری ایکٹ کر رہا ہوں۔۔۔۔۔۔؟“ وہ اس پر الٹ پڑا تھا۔

”میں اسے اس لیے شہر کے مہنگے ترین اسکول میں پڑھا رہا ہوں کہ وہ نوکروں کے بچوں کے لیے میسر کا کام کرے۔۔۔۔۔۔ وہ اتنی فیس لیتے ہیں انہوں نے ڈائریکٹ خیر دین کو اپروچ کیوں نہیں کیا۔۔۔۔۔۔ اس کے پوسٹل ایڈریس پر ڈائریکٹ کاٹیکٹ کرتے، میری بیٹی سے انہوں نے اس طرح کا کام کیوں کروایا۔“ وہ سمجھ نہیں پاری تھی کہ وہ غصے میں اس طرح آؤٹ آف کنٹرول کیوں ہو رہا تھا۔ کیا یہ کسی اور مسئلے کی وجہ سے تھا۔۔۔۔۔۔؟ کسی آفس کی ٹینشن کی وجہ سے۔۔۔۔۔۔؟ یا پھر وہ مسئلہ واقعی اتنا بڑا تھا کہ اس پر اس طرح ہنگامہ کیا جاتا۔ وہ جس وقت فون پر سسٹرائیکٹس کے ساتھ بدزبانی کر رہا تھا وہ اس وقت بھی اسے اسی طرح بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ اگر اسے یہ پتا ہوتا کہ وہ اسکول کی پرنسپل سے اس طرح بات کرنے لگا تھا تو وہ اسے کبھی ان سے بات

کرنے نہ دیتی۔ اسے یہ نہیں پتا تھا کہ سسٹرائیکٹس نے اسے جوابا کیا کہا تھا لیکن اسے اس کی گفتگو سے یہ پتا چل گیا تھا کہ وہ اس کے انداز گفتگو کو بے حد ناپسند کر رہی تھیں اور انہوں نے ایک پوائنٹ پر آکر کال بند کر دی تھی۔ اس کے شوہر کی انا پر یہ جیسے ایک اور کاری ضرب تھی وہ اس شہر کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ جس کا مطلب اس معاشرے میں بادشاہ کا ہونا تھا اور ایک معمولی نن نے DC کی کال ڈسکلیفٹ کرنے کی جرات دکھائی تھی۔۔۔۔۔۔ یہ بے عزتی سی بے عزتی تھی۔ وہ بار بار آپریٹر کو دوبارہ کال ملانے کے لیے کہتا رہا اور آپریٹر اسے بار بار یہ اطلاع دیتا رہا کہ کال نوینٹ کے رہائشی حصے سے اس کی کال انڈنڈ نہیں کی جا رہی اور اس تمام عرصے کے درمیان وہ بار بار اپنے شوہر کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ اسی طرح غضبناک رہا تھا اور اس کا یہ رویہ اس کے لیے شرمندگی کا باعث بن رہا تھا۔ وہ جس بیک گراؤنڈ سے تھی وہاں استاذ اور تعلیم و تدریس سے متعلقہ لوگوں کی بے حد عزت کی جاتی تھی خود اس نے اپنے شوہر اور اس کی فیملی کو اس حوالے سے بے حد تمیز و تہذیب والا پایا تھا اور اب ایک چھوٹی سی بات پر وہ جیسے تھکے سے اکھڑ گیا تھا۔ وہ اس سارے argument کے بعد چائے اسی طرح چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اس کی بیوی ایک عجیب محسوس کا شکار وہاں بیٹھی رہ گئی تھی۔

رات تک وہ نارمل ہو چکا تھا اور اس نے دوبارہ فی الحال اپنے شوہر کے ساتھ یہ معاملہ ڈسکس کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ خیر دین اور اس سے متعلقہ ہر چیز سے فی الحال بری طرح چڑا ہوا تھا اور اس کے بات کرنے پر پھر اوورری ایکٹ کر سکتا تھا۔

”پاپا اسکول آئے تھے۔۔۔۔۔۔“ باربی ڈول نے اگلی شام ہوم ورک کرتے ہوئے ماں کو اطلاع دی۔۔۔۔۔۔ وہ بری طرح چونک گئی۔

”اسکول آئے تھے۔۔۔۔۔۔ پاپا؟“ وہ بری طرح حیران ہوئی تھی۔ اس کا شوہر کم از کم صبح ناشتے کی ٹیبل پر ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کر کے گیا تھا۔

”Yes“ باربی ڈول کلرنگ بک میں کلر کرنے میں مصروف رہی۔

”تم اسکول گئے تھے؟“ وہ پہلا موقع تھا جب اس نے اپنے شوہر کے گھر آتے ہی اس سے کسی مسئلے پر



باز پرس شروع کر دی تھی۔

”ہاں.....“ وہ ٹھٹکا اور پھر اس نے بغیر کسی تاثر کے کہا۔

”کس لیے؟“ وہ بے حد تنجیدگی سے اپنے شوہر کو دیکھتی رہی جو اپنی مائی اتارنے کے بعد اب کوٹ اتار رہا تھا۔

”سسٹر سے بات کرنی تھی مجھے۔“ اس نے مختصر کہا۔

”چڑیا کے بارے میں؟ اس نے بے اختیار کہا۔ وہ بری طرح جھنجھلا یا۔

”تمہارے لیے کیوں ضروری ہے کہ تم ہر بات پر مجھ سے انٹرویو گیت کرو؟“ وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ ان کی ازدواجی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس سے اس طرح بات کر رہا تھا۔ ان دونوں کی لومیرج ایک مثالی شادی سمجھی جاتی تھی اور ان کا کپل ایک آئیڈل کپل..... وہ دیوانہ وار ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک دوسرے پر اعتماد کرتے تھے..... اور اس رشتے میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کے ایک سوال پر وہ اسے اس طرح کی بات کہتا جس طرح کی بات اس نے کہی تھی۔

”میں ایک سوال کر رہی ہوں..... انٹرویو گیت کیوں کروں گی؟“ اس نے جواباً جزبہ ہوتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا۔

”تم سوال بھی مت کرو۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”تم سسٹر ایکٹس سے کوئی جھگڑا تو نہیں کر کے آئے؟“ اس نے اس کی بات پر Argue کرنے کے بجائے اس سے اس بات کے بارے میں پوچھا جس کے حوالے سے اسے تشویش تھی۔

”نہیں۔“ اس نے آنکھیں ملانے بغیر اپنی بیوی سے جھوٹ بولا۔ اس سے سچ بولنے کا مطلب گھر میں ایک نئے جھگڑے کا آغاز تھا۔

”Thank God“ میں سوچ رہی تھی تم سسٹر ایکٹس کے ساتھ جھگڑا کرنے گئے تھے۔“

”میں بے وقوف نہیں ہوں۔“

”ہاں لیکن تم بعض دفعہ بہت عجیب ری ایکٹ کرتے ہو۔“ وہ چند لمحے اپنی بیوی کا چہرہ دیکھتا رہا پھر وہ بے حد خاموشی سے واش روم چلا گیا۔

باربی ڈول آہستہ آہستہ چڑیا کو بھولتی گئی تھی۔ اس کے باپ کے اسکول کے چکر کے بعد دوبارہ کبھی کسی نے باربی ڈول سے چڑیا کا ذکر نہیں کیا تھا..... صرف چڑیا کی کچھ فرینڈز تھیں جو باربی ڈول سے وقتاً فوقتاً چڑیا کے بارے میں پوچھتی رہتیں..... لیکن آہستہ آہستہ ان کے سوال بھی ختم ہوتے گئے تھے۔ چڑیا بہت خاموشی سے ان سب کی زندگی سے نکل گئی تھی۔

☆☆☆

عکس اور شیردل کا اکیڈمی میں پہلا آئنا سا مٹریٹنگ اشارت ہونے کے تقریباً ایک ماہ بعد ہوا تھا۔ عکس لاہریری میں کوئی کتاب ایٹو کروانے کے لیے کھڑی تھی اور شیردل کوئی کتاب واپس کروانے کے لیے کچھ دیر پہلے ہی لاہریری آیا تھا۔ لاہریرین کا ڈیوٹی خالی تھا۔

”ہیلو۔“ شیردل نے عکس کے ساتھ رکی ہیلو ہائے کا تبادلہ کیا جو ان کے درمیان اب تک ہونے والی واحد گفتگو رہی تھی۔ اور پھر وہ خاموشی سے خود بھی لاہریرین کے انتظار میں ڈیسک کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ پہلا موقع تھا جب وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب کھڑے تھے اور دونوں کو ہی بہت جلدی تھی ورنہ شاید وہ دونوں وہاں کھڑے لاہریرین کا انتظار کرنے کے بجائے لاہریری میں گھوم پھر کر کوئی اور کتاب دیکھ لیتے۔

تقریباً پانچ منٹ ایک دوسرے کے برابر بے وقوفوں کی طرح کھڑے رہنے کے بعد شیردل نے بالآخر عکس کی طرف مڑ کر کہا۔

”یہ ڈیسک کب سے خالی ہے؟“ عکس اس کے سوال پر چونکی۔

”آ..... جب سے میں یہاں کھڑی ہوں۔“ وہ ایک لمحے کے لیے ہڑبڑائی اور پھر شیردل نے کہا۔

”اور آپ یہاں کب سے کھڑی ہیں؟“ وہ پہلا موقع تھا جب شیردل کو اتنے قریب سے عکس مراد علی کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کی اسکن انکیشن ختم ہو چکی تھی اور اسے دیکھتے ہوئے شیردل کو اعزازہ ہوا کہ وہ اتنی ان اثریکٹو نہیں تھی جتنا وہ اسے سمجھ رہا تھا۔

”آپ کے آنے سے چند منٹ پہلے ہی آکر کھڑی ہوئی ہوں میں۔“ عکس نے کہا۔

”بہت زیادتی ہے یہ تو چند منٹ ہو گئے ہیں۔“ شیردل نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”اب کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں؟ لاہریری کا سارا اسٹاف ہی غائب ہو گیا ہے۔“ وہ بڑبڑا رہا تھا۔

”آپ نے کتاب ریٹرن کروانی ہے؟“ عکس نے اس سے کہا۔

”ہاں..... اور صرف اتنے سے کام کے لیے بھی آدھا گھنٹا ہو گیا ہے مجھے۔“ شیردل نے اسے جواب دیا۔

”عکس نے مسکراتے ہوئے ان ساتھ منٹوں کو پہلے پندرہ اور اب آدھے گھنٹے میں تبدیل ہوتے سنا۔

”آپ مجھے دے دیں کتاب..... میں ریٹرن کروادوں گی جب اسٹاف میں سے کوئی آئے گا۔“ شیردل نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بڑے شستہ انداز میں اسے آفر کر رہی تھی، ایک غیر متوقع آفر۔ وہ چند لمحوں کے لیے حیران ہوا پھر اس نے کہا۔

”تھینک یو..... آپ کو جلدی نہیں ہے کیا؟“

”بہت زیادہ جلدی نہیں ہے۔“ وہ مسکرائی تھی، وہ بھی مسکرا دیا۔ برف پگھلنے لگی تھی۔ شیردل نے اپنی کتاب اس کے پاس کاؤنٹر پر چھوڑ دی اور خود وہاں سے چلا گیا۔

عکس سے اس کی دوسری ملاقات ایک ویک اینڈ اکیڈمی کے گراؤنڈ میں صبح سویرے جوگنگ کے دوران ہوئی تھی۔ ان کے بہت کم بیچ میٹ چھٹی کے دن سورج کے نکلنے سے بھی پہلے اس طرح کی کسی جسمانی سرگرمی میں مصروف پائے جاتے تھے۔ شیردل نشے کی حد تک رنگ اور جوگنگ کا عادی تھا اور عکس صبح سویرے طلوع آفتاب کو دیکھنے اور اس وقت چہل قدمی کی۔ شیردل اس کو اکثر رنگ کے دوران وہاں دیکھا کرتا تھا لیکن عام دنوں میں اس وقت کچھ دوسرے کامنز بھی وہاں پائے جاتے تھے اور شیردل کو پہلے کبھی موقع ملا بھی تو اسے عکس کو مخاطب کرنے میں دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن لائبریری والے واقعے کے بعد اس نے پہلی بار رنگ کے دوران عکس کو اکیلے دیکھا تھا اور وہ اس کو دیکھتے ہوئے رک گیا تھا۔

”بہت ہمت ہے آپ کی سنڈے کو بھی نکلی ہوئی ہیں۔“ شیردل نے اس کے قریب رکتے ہوئے علیک سلیک کے بعد کہا۔

”آپ سے کم ہی ہے ہمت۔۔۔۔۔ میں تو صرف ہلکی پھلکی چہل قدمی کے لیے نکلی ہوں۔۔۔۔۔ آپ کی طرح ڈھائی تین میل کی رنگ تو نہیں کرتی سنڈے کو۔“ شیردل نے بے حد حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا تھا وہ واقعی ڈھائی تین میل رنگ کیا کرتا تھا اور عکس کے منہ سے یہ بات اسے بے حد حیران کن لگی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا جب وہ اسے ٹریک کے چکر لگاتے باقاعدگی سے دیکھتی رہی ہو۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں یک دم شاید اتنی حیرانی آئی تھی کہ عکس بھی پوچھے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ شیردل نے مسکراتے ہوئے ٹالا۔

”چلیں پھر آپ چہل قدمی کریں اور میں اپنے تین میل پورے کرتا ہوں۔“ اس نے رنگ دو بارہ اشارت کرتے ہوئے عکس سے کہا۔ چند منٹوں کے بعد ٹریک کے بینڈ پر اس نے اپنے عقب میں عکس کو دیکھنے کی کوشش کی وہ اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ حیران رہ گیا تھا، وہ اتنی جلدی کہاں غائب ہو سکتی تھی۔ اس کے چلنے کی رفتار اتنی زیادہ تو نہیں تھی کہ وہ منٹوں میں وہاں سے اپنے ہاسٹل پہنچ جاتی۔۔۔۔۔ باقی رنگ کرتے ہوئے وہ مسلسل اس جگہ پر عکس کو کھوجتا رہا جہاں وہ اس سے ملا تھا لیکن وہ اسے نظر نہیں آئی اور پھر اچانک اس نے اسے ایک درخت کے ساتھ پشت نکائے کھڑے دیکھا تھا وہ اب ٹریک پر اسی طرف تھا جس طرف وہ پہلے عکس سے مل چکا تھا۔ ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا تھا اسے جیسے عکس کو ڈھونڈ لینے پر۔ رنگ کرتے ہوئے وہ وقتاً فوقتاً نظریں اٹھا کر اس کو دیکھتا رہا وہ اسی طرح درخت کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ ٹریک پر اس کی طرف بڑھتے ہوئے شیردل کو احساس ہوا کہ وہ کچھ دور کسی چیز کو دیکھنے میں مگن تھی۔ اس نے بھاگتے بھاگتے عکس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ ٹریک کے بالمقابل روش کے دوسری طرف نظر آنے والے لان کی ایک ہاڑ کے پاس جلی اپنے کچھ نیچے لیے پھر رہی تھی۔ شیردل نے ٹریک پر بھاگتے ہوئے اس سے بات کرنے کی شدید خواہش کے باوجود بھی اس درخت کو کر اس کیا جس کی دوسری طرف وہ کھڑی تھی۔

”میں ڈراپ کر دوں آپ کو؟“ ایک ہفتے کے بعد ان کی تیسری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی ایک ایک اینڈ تھا۔ سہ پہر کے قریب شیردل اپنے گھر کا ایک چکر لگانے کے لیے نکلا تھا جب اس نے اکیڈمی کے داخلی دروازے کی طرف جاتی ہوئی عکس کو دیکھا۔ اس نے گاڑی روک کر اسے آفری۔

”نہیں تھینک یو۔۔۔۔۔“ اس نے انکار کیا۔

”او کے۔۔۔۔۔“ شیردل نے اصرار نہیں کیا۔ وہ شاید اس انکار کے بارے میں سوچتا تک نہیں اگر اکیڈمی کے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے بیک ویو مرر میں وہ مجتبیٰ فرقان کی گاڑی کو اس کے قریب آکر رکھتے اور اسے اس کی گاڑی میں بیٹھنے نہ دیکھ لیتا۔ خفگی کا ایک شدید احساس تھا جو اسے ہوا تھا۔ اس کے لیے شیردل کے ساتھ جانا قابل قبول نہیں تھا مجتبیٰ کی گاڑی میں جانے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ عکس سے ایک بار پھر بری طرح چڑا تھا

۔۔۔

اکیڈمی کی سب سے خوب صورت لڑکی عالیہ نعیم اور سب سے hot لڑکی عکس ہے۔ وہ اس رات میس میں بیٹھا چند دوسرے کامنرز کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا جب ان کی ساتھی لڑکیوں کا ذکر شروع ہوا اور نافع نے تبصرہ کیا۔ شیردل کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔۔۔۔۔ اور اس کرنٹ کی وولٹیج میں اس وقت کچھ اور اضافہ ہوا جب اس نے وہاں بیٹھے باقی تینوں کامنرز کو بھی نافع سے متفق پایا۔ عالیہ نعیم کو بیوٹی کوئین ماننے میں اسے بھی تامل نہیں تھا لیکن عکس کو ہائیسٹ ووئین ماننے میں اسے تذبذب تھا۔

”عکس سب سے ہاٹ ہے؟ کم آن۔“ اس نے جیسے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

”تو تمہیں کون ہاٹ لگتی ہے؟“ نافع نے جواباً اس سے کہا۔ شیردل نے دومنٹ میں اپنے کامنرز کی تمام لڑکیوں کی اسکریننگ کی اور پھر غیر محسوس طور پر وہ عکس کے نام پر آکر رہا۔

”ہاٹ“ وہ اب بھی جیسے کچھ نہ مانتے والے انداز میں اس کو the most wanted ووئین کے معیار پر پرکھ رہا تھا۔ اور بالکل اس لمحے عکس مراد علی نے میس میں قدم رکھا تھا اور اکیڈمی میں کئی ہفتے گزارنے کے بعد اس دن پہلی بار شیردل کو بتا چلا کہ عکس اپنے کامن میں پاپولر نہیں تھی وہ اس کامن کے تمام لڑکوں میں پاپولر تھی اور اس کی وجہ اس کی پہلی پوزیشن سے بڑھ کر بھی کچھ تھی۔ نافع اگر کہہ رہا تھا کہ اس کی فکر وہاں موجود لڑکیوں میں سب سے اچھی تھی تو وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ شیردل نے اتنے ہفتوں میں پہلی بار اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیا تھا۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو کچھ بھی پہن لیتیں ان پر اچھا لگتا تھا۔۔۔۔۔ کامن کی کچھ دوسری لڑکیوں کی طرح وہ میک اپ زدہ نہیں تھی۔ بلکہ شیڈز کی ایک لپ اسٹک اور بڑے نفاست سے پن اپ کیے ہوئے شانوں سے کچھ نیچے تک جاتے گھنے بال جو اسٹیلپس میں کٹے ہوئے تھے اور جنہیں وہ صرف وہاں سوشل اینگلز میں کھلے رکھتی تھی۔۔۔۔۔ اس کا سنگھار تھی اور یہ اس کی شاندار فکر تھی جو اسے باقی تمام لڑکیوں میں غیر محسوس طور پر ممتاز کیے ہوئے تھی۔۔۔۔۔ اس دن وہاں بیٹھے ہوئے شیردل کو پہلی بار اسے دیکھتے دوسرے لڑکے عجیب انداز میں چبھے تھے۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ عکس مراد علی کے حوالے سے اس طرح کی فیئنگو وہاں موجود تقریباً ہر اس لڑکے کی تھیں جو پہلے سے کہیں انٹرنشڈ نہیں تھا۔

باقی آئندہ

شیردل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بونے مقیم ہیں۔ شیردل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ایک دن شیردل اپنے سینئر اختر درانی کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ اختر درانی کی بیوی تین، شہر بانو کو بتاتی ہے کہ پہلے کسی آفیسر کی بیوی نے اس گھر میں اپنے شوہر کو مار کر خودکشی کر لی تھی اس لیے وہاں رہنے والوں کی ازدواجی زندگی مشکلات کی زد میں آ جاتی ہے۔ تین کے پوچھنے پر کہ ان کی شادی کو میرج کا نتیجہ ہے۔ یہ بات سن کر شہر بانو ماضی کی خوب صورت یادوں میں کھو جاتی ہے۔ جہاں صرف وہ اور شیردل ہوتے ہیں۔ دونوں کی ذہنی ہم آہنگی انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ ہاجرہ اور اس کے شوہر نے اپنے بیٹے کو بڑھا لکھا کر ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا۔ خیر دین میٹرک کے بعد کوئی اور نوکری تو نہ کر سکا لیکن ڈی سی ہاؤس میں ٹک کی نوکری کرنے لگا۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کر دیتا ہے جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد حلیمہ کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے۔ یوں حلیمہ اور چڑیا خیر دین کے ساتھ اس ڈی سی ہاؤس میں رہنے لگتی ہیں۔ چڑیا کو جب اس گھر میں بونوں کے بارے میں پتا چلتا ہے تو وہ اپنی خیالی دنیا میں ان کے خاکے بنا سکتی ہے، ان سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس نے ان بونوں کو مختلف نام بھی دیے، وہ ہر وقت ان کی کھوج میں رہتی ہے تاکہ وہ ان سے دوستی کر سکے۔ نئے صاحب کو یہ پسند نہیں ہوتا کہ ملازم کی فیملی ان کی فیملی کے ساتھ ربط و ضبط رکھے۔ وہ جب ٹینس کورٹ بناتے ہیں اور وہاں کھیلتے ہیں تو چڑیا پودوں کے پیچھے سے چھپ کر انہیں دیکھتی ہے۔ وہ ہر روز شام کو ان آبیوں کو دیکھتا بھی نہیں بھولتی کیونکہ خیر دین نے اس سے کہا تھا کہ شام کے وقت بونے اس میں نظر آتے ہیں لیکن چڑیا کو جو بونا نظر آتا ہے وہ بہت خوفناک ہوتا ہے اس لیے وہ اسے بونا نہیں مانتی پھر اسے اس میں ایک نظر آتا ہے۔ ایک ڈپٹی کمشنر کی چھوٹی بہن آرزو کا بیٹا ہے وہ لوگ چھٹیاں گزارنے اپنے باموں کے گھر آتے ہیں ایک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایک سے ٹینس کھیلنا سیکھتی ہے اور ایک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو انکل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ شیردل گھر میں قرآن خوانی کا اہتمام کرواتا ہے اسے اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کام اس نے پہلے کیوں نہیں کیا۔ شیردل کے کوئی ایک فاضل کا فرانسفر ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ عکس کی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ چڑیا کی باربی ڈول سے دوستی ہو جاتی ہے، چڑیا اسکول میں باربی ڈول کا خیال کرتی ہے اور اسے چیزیں دیتی ہے، عکس سے پہلا تعارف شیردل کا بلک سروس ٹیکشن کے امتحان کے رزلٹ کے بعد ہوا کیونکہ پہلی پوزیشن شیردل کی متوقع تھی لیکن وہ پہلی پوزیشن حاصل نہ کر سکا پہلی پوزیشن عکس مراد علی نے لی تھی۔ ایک شطرنج کے لیے چڑیا کے خیالات اپنے انکل کو بتاتا ہے تو ایک کی ماما کو غصہ آتا ہے اور وہ ایک کو چڑیا کے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیتی ہیں۔ چڑیا ایک کے رویتے سے بہت ہرٹ ہوتی ہے اور ایک کو نظر انداز کرے تو ایک سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ شیردل عکس کو فون کرتا ہے وہ سوچتا ہے کہ اس کی عکس سے بات اور ملاقات کب ہوئی تھی، شہر بانو سے ملنے کے بعد اس کو پتا چلا تھا کہ عکس کی غمی سے شادی متوقع ہے۔ شہر بانو جب دس سال کی تھی تو اس کے باپ شہباز کا انتقال ہو گیا تھا اور شرمین دوسری شادی فاروق سے کرتی ہے اس کی پہلی بیوی سے دو بیٹے تھے۔ فاروق اور شرمین کی ایک بیٹی ہوئی تھی جو مر جاتی ہے۔ شرمین و شہر بانو جب شیردل کے بارے میں بتاتی ہے تو وہ اس رشتے پر راضی نہیں ہوتی۔ ایک چڑیا سے سوری کرتا ہے اور اسے رات کو بلاتا ہے تاکہ اسے میٹنگ چیس دکھائے لیکن ایک خود سوچتا ہے اس کی آنکھ کسی کے رونے اور چیخنے سے کھلتی ہے یہ چڑیا کی آواز تھی وہ باہر نکل کر جو منظر دیکھتا ہے وہ اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتا۔ خیر دین نے عکس مراد علی کو اکیڈمی میں ٹریننگ اسٹارٹ ہونے کے ایک ہفتے بعد دیکھا اور کچھ دنوں میں اسے لگا کہ عکس مراد علی کا من کی تمام لڑکیوں سے مختلف تھی۔ چند ساتھیوں نے اسے شہد کی دلہل کا ٹائٹل دے دیا تھا۔ اتنے عرصے بعد شیردل عکس کو میٹنگ میں دیکھتا ہے تو اس کو عکس میں کوئی فرق نہیں لگتا وہ اب بھی ویسی ہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر خیر دین پر چوری کا الزام لگا کر اسے نوکری سے نکال دیتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی کو اس بات پر یقین نہیں آتا، باربی ڈول، چڑیا کے اسکول نہ آنے سے پریشان ہوتی ہے۔

(اب آگے پڑھیں)

عکس نے گاڑی سے اترتے ہوئے سر اٹھا کر اس آئینے کو دیکھا جو اس گھر کے برآمدے میں دروازے کے پاس رکھا تھا اور جس میں اس وقت شیردل اور شہر بانو کی پشت نظر آرہی تھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے وہ کمشنر اور اس کی بیوی کا استقبال کر رہے تھے جن کی گاڑی اس وقت پورچ میں داخلی برآمدے کے بالکل سامنے کھڑی تھی، خود اس کی گاڑی پورچ کی چھت سے باہر تھی۔ نظریں آئینے سے ہٹا کر اس نے ایک

لمحے کے لیے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا جہاں سے ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی۔ پانی کی ہلکی پھوار نے اس کے چہرے، بالوں اور لباس کو ذرا سا نم کیا اور برآمدے میں کمشنر اور اس کی بیوی سے ملتے ہوئے شیردل نے بالکل اس لمحے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ سیاہ موتیوں سے انیمبر انڈرڈ ایک فٹنگ والا سیاہ شیفون کا لباس پہنے ہوئے تھی جو اس کے متناسب جسم کو کچھ اور بھی متناسب کر رہا تھا۔ عام طور پر کھلے رہنے والے گھنے سیاہ بال اس وقت ایک سیاہ ٹیٹ میں ڈھیلے جوڑے کی شکل میں اس کی گردن کے پیچھے سٹے اس کی پتلی اور لمبی گردن کو نمایاں کیے ہوئے تھے۔ دائیں کندھے پر اسٹول کی شکل میں یہ شدہ دوپٹا ڈالے وہ بائیں ہاتھ میں ایک بہت چھوٹا اور خوب صورت سیاہ پرس پکڑے ہوئے تھی۔ شیردل نے اس سے نظریں ہٹائیں مشکل کام تھا یہ اور اس نے مشکل سے ہی کیا۔ وہ کمشنر اور ان کی فیملی کے ساتھ آئی تھی اس لیے کمشنر اور ان کی بیوی گاڑی سے اتر کر سیدھا اندر جانے کے بجائے چند لمحوں کے لیے وہیں برآمدے میں رک گئے تھے۔ کمشنر کا استقبال کرنے کے بعد شیردل برآمدے سے نکل کر اس کی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس کی طرف جاتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اس نے اپنی جیب میں پڑا ٹشو پیپر ٹٹولا تھا۔

ڈرائیور سے کچھ کہتے ہوئے عکس جب تک پلٹی وہ اس کے سامنے تھا۔ دونوں بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ بلیک ڈز سٹ کے ساتھ ایک سرخ Striped ٹائی لگائے، سلور کف لنکس اور ٹائی پر ایک کرشل کی ٹائی پن لگائے وہ اپنے اس حلیمے میں اس کے سامنے کھڑا تھا جو اس کی ایک وجہ شہرت تھی۔ اکیڈمی میں کوئی اور کام نہ اپنی ڈریسنگ سینس میں شیردل کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ عکس مراد علی نے اپنے اتنے سال کی سروس میں بھی شیردل سے زیادہ خوش لباس مرد نہیں دیکھا تھا۔

عکس نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ ستائشی نظروں سے شیردل کو دیکھا۔ ہوا کے ایک جھونکے نے شیردل کی ٹائی کو اڑایا۔ عکس کی نظر بھٹکی۔ اس کی ٹائی کو بے اختیار اڑنے سے روک دینے کی خواہش کو اس نے اتنی ہی بے اختیاری کے ساتھ دبایا جس طرح وہ ابھرتی تھی۔

دونوں کے درمیان اب خیر مقدمی کلمات کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ وہی رسمی جملے..... اور وہی ان کے مفہوم..... وہ ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بات کر رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر نظریں جمائے شیردل کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ اس کے چہرے پر موجود کون سی شے کس کو ماند کر رہی تھی۔ اس کے کانوں کی لوؤں میں دھکتے سفید موتیوں کے studs اس کی شفاف چمکدار سیاہ آنی لائنز سے جی آنکھوں کو یا اس کی آنکھیں سرخ لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں سے چھلکتی دودھیا دانتوں کی قطار کو جو اس کی مسکراہٹ کو اور بھی دلکش کر رہی تھی۔ بارش کی پھوار کے ننھے ننھے قطرے اس کے قطرہوں کی طرح اس کے بالوں اور چہرے پر چمک رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے شیردل کا دل چاہا وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے صاف کر دے..... صرف ایک لمحے کے لیے پھر اس نے نظر جھرائی تھی..... جیب سے ایک ٹشو نکال کر غیر محسوس انداز میں عکس کی طرف بڑھاتے ہوئے شیردل نے کہا۔

”تم نے بڑا رسک لیا۔“ عکس نے کسی سوال کے بغیر وہ ٹشو تھام کر اسی غیر محسوس انداز میں چہرہ اور سر تھپتھپاتے ہوئے کچھ حیرانی سے اس سے پوچھا۔

”کیا؟“ وہ دونوں اب ساتھ چل رہے تھے۔  
 ”بارش میں گاڑی سے نکل آئیں۔“ قدم بڑھاتے ہوئے شیردل نے کچھ سنجیدگی سے کہا۔  
 ”تو؟“ وہ الجھی۔

”اگر میک اپ بہہ جاتا تو؟“ اس بار شیردل کے ہونٹوں اور آنکھوں میں شرارت لہرائی تھی یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ایک سیاہ آنی لائٹز اور لپ اسٹک کے سوا شاید ہی کچھ لگائے ہوئے تھی۔

”ہاں رسک تو تھا، میک اپ صاف ہو جاتا تو تم اس سے زیادہ گھورتے مجھے..... جتنا ابھی گھور رہے تھے۔“ عکس نے ہاتھ میں پکڑے ٹشو کو بڑی نفاست سے لپیٹ کر پرس میں بے نیازی سے رکھتے ہوئے کہا۔ جواب ویسا ہی آیا تھا جیسا سوال کیا تھا۔ اسے دیکھے بغیر شیردل نے بے اختیار سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ چھپائی۔ وہ باقی لوگوں کے قریب پہنچ چکے تھے اور وہ اسے جواباً کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

”کمشنری بیوی کے ساتھ بات کرنی شہر بانو عکس کے استقبال کے لیے چند قدم آگے بڑھ آئی تھی۔  
 ”شہر بانو..... عکس مراد علی.....“ ایک لفظ میں شیردل نے باری باری دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کروایا۔ دونوں ناموں کے ساتھ کوئی سیاق و سباق نہیں تھا پھر بھی دونوں ایک دوسرے کو اس سے کہیں زیادہ جانتی تھیں جتنا شیردل نے ان کا تعارف کروایا تھا۔

سفید شیٹوں کے کلیوں والے کُرتے اور چوڑی دار پا جاسے میں شہر بانو ایک باری ڈول لگ رہی تھی۔ دودھیارنگت، سیاہ لمبی خمدار پلکیں، ننھی سی نوک والی چٹکی تاک اور بے حد باریک مسکراتے ہونٹ۔ عکس کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی تھی اس کو دیکھ کر۔ شیردل کو اس سے زیادہ پرفیکٹ لڑکی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ واقعی صرف شیردل کے ساتھ سمجھتی تھی۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے عکس نے سوچا تھا۔

شہر بانو نے اس سے پہلے عکس مراد علی کا نام سنا تھا یا اس کو شیردل کی گروپ فوٹو گرافس میں دیکھا تھا۔ جہاں وہ لاکھ غور کرنے کے باوجود بھی اس کی شکل و صورت اور حلیے میں وہ خاص چیز ٹھونسنے میں ناکام رہی تھی جو اس کے ذہن میں کسی خدشے یا اندیشے کو جنم دیتی لیکن آج اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی وہ عکس مراد علی سے بری طرح خائف ہوئی کیوں ہوئی؟ یہ اسے کئی دن سمجھ نہیں آیا۔ نہ اسے شیردل سے کوئی خدشہ تھا نہ عکس مراد علی اس حسن و جمال کی مالک تھی جس سے اسے کوئی احساس کمتری ہونے لگتا لیکن اس کے باوجود اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ عکس مراد علی کو نظر انداز کرنا بے حد مشکل تھا اور اس کو پسند نہ کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار۔

برآمدے کی انٹریس پر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے وہ دونوں شہر بانو کو کسی فوٹو فریم کا حصہ لگے تھے۔ ایک پرفیکٹ پکچر، دراز قد، اٹریکٹو، پُراعتاد، اسارٹ..... سیاہ لباس میں ملبوس وہ ایک ایسا کیل لگے تھے جو گھر سے نکلتے ہوئے پرفیکٹ میچنگ کر کے آئے تھے۔ کوئی بھی ایک نظر میں دیکھ لیتا کہ عکس کے ہونٹوں کی لپ اسٹک کا رنگ شیردل کی ٹائی کے رنگ کا ایک حصہ لگ رہا تھا..... شہر بانو نے بھی نوٹس کیا تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے کسی رشتے اور تعلق کے بغیر بھی ان دونوں کی باڈی لینگویج میں ایک عجیب کیمسٹری تھی۔ ایک عجیب سا رابطہ اور تعلق جس کو نہ چھپانے کی کوشش تھی نہ دکھانے کی..... لیکن پھر بھی وہ چھپ چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ شہر بانو ابھی ننھی..... اور پھر چاہتے کے باوجود وہ عکس سے ویسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کر سکی جو وہ دوسرے

”شیردل کی زندگی میں بہت لڑکیاں آئی ہوں گی لیکن محبت..... وہ اس نے صرف مجھ سے کی، مجھ سے کی تو مجھ سے شادی کی ورنہ وہ کسی سے بھی شادی کر سکتا تھا۔ کوئی لڑکی شیردل کو انکار تو نہیں کر سکتی تھی۔“ پتا نہیں کیا کیا تاویلیں اور جواز دے کر وہ خود کو یہ یقین دلاتی تھی کہ محبت نام کی شے شیردل نے صرف اسی کے لیے محسوس کی ہوگی..... باقی سب کچھ..... کچھ بھی نہیں تھا اور شیردل نے ازدواجی زندگی کے اتنے سالوں میں اپنے رویے سے جیسے اس کے اس بلی کے سامنے آنکھیں بند کیے کیو تر جیسے اعتماد اور یقین پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی..... اس نے شہر بانو کی ماں کی ان تمام پیش گوئیوں اور اعلانات کو غلط ثابت کر دیا تھا جو شرمین نے شیردل

”اچھا.....؟ میں نے آپ کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔“ عکس اس کی بات پر مسکرا دی۔ شہر بانو نے کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے واقعی شیردل سے عکس مراد علی کے نام کے سوا اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا تھا، اس کے باوجود وہ اتنا احساس ضرور رکھتی تھی کہ عکس مراد علی شیردل کا وہ بلیک ہول ہے جسے کھوجنا صبر آزما اور خود اذیتی کے سوا کچھ نہیں اور شہر بانو کو کسی بلیک ہول میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شیردل کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی مثالی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی کوئی آئیڈیل نہیں بنایا تھا لیکن شیردل کے ساتھ اتنے سال گزارنے کے بعد وہ جانتی تھی کہ وہ اگر ایک آئیڈیل شوہر کا کوئی خاکہ بناتی تو وہ شیردل ہی کا ہوتا۔ وہ پیار کرنے والا، خیال رکھنے والا، وفادار شوہر تھا جس سے شہر بانو کو اس کی مصروفیات کے علاوہ کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو شوہر کی زندگی اور ہر سرگرمی کو قابلِ دراندازی سمجھتی تھیں۔ شیردل نے اسے ایک عورت اور بیوی کے طور پر بہت space دی تھی اور شہر بانو نے وہی space اس کو دی تھی۔ شیردل اب اس کا تھا اور جب تک وہ اس کا تھا اسے یہ جاننے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اس سے پہلے کون کون شیردل کو اپنا بنانا چاہتا تھا یا شیردل کس کو اپنا..... اور صرف یہ ایک بات اور سوچ تھی جس پر ہمیشہ اس کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے رکتی تھی جس کو وہ ہمیشہ سر سے جھٹک دیتی تھی۔ اس کا دل یہ کبھی نہیں مان سکتا تھا کہ شیردل اس سے پہلے کسی سے محبت کرتا تھا، کر چکا تھا یا کر سکتا تھا..... یہ خیال بھی اس کو جسم میں ٹھکنے والی میخوں کی طرح لگتا تھا۔

”شیردل کی زندگی میں بہت لڑکیاں آئی ہوں گی لیکن محبت..... وہ اس نے صرف مجھ سے کی، مجھ سے کی تو مجھ سے شادی کی ورنہ وہ کسی سے بھی شادی کر سکتا تھا۔ کوئی لڑکی شیردل کو انکار تو نہیں کر سکتی تھی۔“ پتا نہیں کیا کیا تاویلیں اور جواز دے کر وہ خود کو یہ یقین دلاتی تھی کہ محبت نام کی شے شیردل نے صرف اسی کے لیے محسوس کی ہوگی..... باقی سب کچھ..... کچھ بھی نہیں تھا اور شیردل نے ازدواجی زندگی کے اتنے سالوں میں اپنے رویے سے جیسے اس کے اس بلی کے سامنے آنکھیں بند کیے کیو تر جیسے اعتماد اور یقین پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی..... اس نے شہر بانو کی ماں کی ان تمام پیش گوئیوں اور اعلانات کو غلط ثابت کر دیا تھا جو شرمین نے شیردل

”اچھا.....؟ میں نے آپ کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔“ عکس اس کی بات پر مسکرا دی۔ شہر بانو نے کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے واقعی شیردل سے عکس مراد علی کے نام کے سوا اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا تھا، اس کے باوجود وہ اتنا احساس ضرور رکھتی تھی کہ عکس مراد علی شیردل کا وہ بلیک ہول ہے جسے کھوجنا صبر آزما اور خود اذیتی کے سوا کچھ نہیں اور شہر بانو کو کسی بلیک ہول میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شیردل کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی مثالی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی کوئی آئیڈیل نہیں بنایا تھا لیکن شیردل کے ساتھ اتنے سال گزارنے کے بعد وہ جانتی تھی کہ وہ اگر ایک آئیڈیل شوہر کا کوئی خاکہ بناتی تو وہ شیردل ہی کا ہوتا۔ وہ پیار کرنے والا، خیال رکھنے والا، وفادار شوہر تھا جس سے شہر بانو کو اس کی مصروفیات کے علاوہ کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو شوہر کی زندگی اور ہر سرگرمی کو قابلِ دراندازی سمجھتی تھیں۔ شیردل نے اسے ایک عورت اور بیوی کے طور پر بہت space دی تھی اور شہر بانو نے وہی space اس کو دی تھی۔ شیردل اب اس کا تھا اور جب تک وہ اس کا تھا اسے یہ جاننے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اس سے پہلے کون کون شیردل کو اپنا بنانا چاہتا تھا یا شیردل کس کو اپنا..... اور صرف یہ ایک بات اور سوچ تھی جس پر ہمیشہ اس کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے رکتی تھی جس کو وہ ہمیشہ سر سے جھٹک دیتی تھی۔ اس کا دل یہ کبھی نہیں مان سکتا تھا کہ شیردل اس سے پہلے کسی سے محبت کرتا تھا، کر چکا تھا یا کر سکتا تھا..... یہ خیال بھی اس کو جسم میں ٹھکنے والی میخوں کی طرح لگتا تھا۔

”شیردل کی زندگی میں بہت لڑکیاں آئی ہوں گی لیکن محبت..... وہ اس نے صرف مجھ سے کی، مجھ سے کی تو مجھ سے شادی کی ورنہ وہ کسی سے بھی شادی کر سکتا تھا۔ کوئی لڑکی شیردل کو انکار تو نہیں کر سکتی تھی۔“ پتا نہیں کیا کیا تاویلیں اور جواز دے کر وہ خود کو یہ یقین دلاتی تھی کہ محبت نام کی شے شیردل نے صرف اسی کے لیے محسوس کی ہوگی..... باقی سب کچھ..... کچھ بھی نہیں تھا اور شیردل نے ازدواجی زندگی کے اتنے سالوں میں اپنے رویے سے جیسے اس کے اس بلی کے سامنے آنکھیں بند کیے کیو تر جیسے اعتماد اور یقین پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی..... اس نے شہر بانو کی ماں کی ان تمام پیش گوئیوں اور اعلانات کو غلط ثابت کر دیا تھا جو شرمین نے شیردل

”اچھا.....؟ میں نے آپ کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔“ عکس اس کی بات پر مسکرا دی۔ شہر بانو نے کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے واقعی شیردل سے عکس مراد علی کے نام کے سوا اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا تھا، اس کے باوجود وہ اتنا احساس ضرور رکھتی تھی کہ عکس مراد علی شیردل کا وہ بلیک ہول ہے جسے کھوجنا صبر آزما اور خود اذیتی کے سوا کچھ نہیں اور شہر بانو کو کسی بلیک ہول میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شیردل کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی مثالی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی کوئی آئیڈیل نہیں بنایا تھا لیکن شیردل کے ساتھ اتنے سال گزارنے کے بعد وہ جانتی تھی کہ وہ اگر ایک آئیڈیل شوہر کا کوئی خاکہ بناتی تو وہ شیردل ہی کا ہوتا۔ وہ پیار کرنے والا، خیال رکھنے والا، وفادار شوہر تھا جس سے شہر بانو کو اس کی مصروفیات کے علاوہ کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو شوہر کی زندگی اور ہر سرگرمی کو قابلِ دراندازی سمجھتی تھیں۔ شیردل نے اسے ایک عورت اور بیوی کے طور پر بہت space دی تھی اور شہر بانو نے وہی space اس کو دی تھی۔ شیردل اب اس کا تھا اور جب تک وہ اس کا تھا اسے یہ جاننے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اس سے پہلے کون کون شیردل کو اپنا بنانا چاہتا تھا یا شیردل کس کو اپنا..... اور صرف یہ ایک بات اور سوچ تھی جس پر ہمیشہ اس کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے رکتی تھی جس کو وہ ہمیشہ سر سے جھٹک دیتی تھی۔ اس کا دل یہ کبھی نہیں مان سکتا تھا کہ شیردل اس سے پہلے کسی سے محبت کرتا تھا، کر چکا تھا یا کر سکتا تھا..... یہ خیال بھی اس کو جسم میں ٹھکنے والی میخوں کی طرح لگتا تھا۔

ماہنامہ پاکیزہ۔ جنوری 2012ء۔ 23

کے ساتھ شادی کی ضد پر اسے شیردل اور اس کی فیملی کے حوالے سے بتائی تھیں۔

ضلع کی تمام ایڈمنسٹریشن ہال کمرے میں اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ شیردل کے گھر پر ہونے والے اس ڈنر کے لیے موجود تھیں اور کمشنر اور ان کی بیوی وہ آخری مہمان تھے جنہیں پہنچنا تھا۔ عکس وہاں بہت پہلے آچکی ہوتی اگر کمشنر اور ان کی بیوی نے ایک ہی شہر سے جانے کی وجہ سے اسے اپنے ساتھ جانے کی دعوت نہ دی ہوتی۔

ڈنر کے دوران شہر بانو کی نظریں وقتاً فوقتاً عکس پر بھٹکتی رہیں۔ وہ عکس مراد علی کو سننا چاہتی تھی جیسے اسے جانتا چاہتی تھی لیکن عکس مراد علی نے سارا وقت بے حد خاموشی سے وہاں ہاتھ میں ڈرنک یا چائے لیے مسکراتے دوسروں کی باتیں سنتے ہوئے گزارا تھا۔ چند ایک بار ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ شہر بانو نے ایک مہمان نواز میزبان کی طرح اس سے کھانے وغیرہ کے حوالے سے پوچھا۔ عکس نے ایک مہذب مہمان کی طرح اپنی سیری کا اظہار کیا۔ شہر بانو کسی اور کی طرف متوجہ ہو گئی اور گفتگو کہیں سے کہیں چلی گئی۔

ڈنر کے اختتام پر مہمانوں کو رخصت کرتے ہوئے شہر بانو اور عکس کا ایک بار پھر آمنا سامنا ہوا تھا۔ شہر بانو اب اس سے پہلے کی طرح نہیں ملی تھی۔ وہ ایک گرم جوش میزبان کی طرح اس سے گلے ملی تھی۔ عکس مراد علی کی پوریج سے نکلتی ہوئی گاڑی کو دیکھتے ہوئے شہر بانو کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ چند ہفتوں میں عکس سے دوبارہ وہاں ایک مہمان کے طور پر ملے گی اور وہ اس سے میزبان کے طور پر۔

☆☆☆

کریٹ میں سے ایک ایک آم نکال کر وہ ساتھ ساتھ اس پر لگے اسٹیکرز چیک کر رہی تھی جس آم پر اسٹیکر نظر نہ آتا وہ ایک لچھے کے لیے رک کر آم کو گھما پھرا کر اس کا اسٹیکر تلاش کرنے کی کوشش کرتی پھر اسٹیکر کو آم کے کسی نہ کسی حصے پر موجود پا کر وہ جیسے مطمئن ہو جاتی۔ صبح اسکول جانے سے پہلے ریڑھی پر پھلوں کو سجانا اور ترتیب سے رکھنا اس کے پسندیدہ کاموں میں سے ایک تھا لیکن آج چھٹی کا دن تھا اور چھٹی کے دن وہ خیر دین کے ساتھ آتی اور فٹ پاتھ پر ایک اسٹول پر بیٹھی اپنا سبق یاد کرتے ہوئے پھلوں کی ترتیب کو بگڑنے نہ دیتی۔ کسی بھی گاہک کے آنے پر وہ بے حد ایکسٹنڈ انداز میں گاہک کے سب سے اچھا پھل چننے کی کوشش میں جیسے اس گاہک سے بھی زیادہ پھرتی اور دلچسپی دکھاتی، وہ اس کو پھلوں کی سجاتی ہوئی ڈھیروں میں سے اچھے سے اچھا پھل نکال کر دکھاتی اور پھر ترازو پر رکھ دیتی جس پر خیر دین پھل تول رہا ہوتا اور جب وہ گاہک چلا جاتا تو وہ نئے سرے سے بچے ہوئے پھلوں کو ترتیب دیتی۔ پھلوں کی بڑی بڑی ڈھیروں کو گھٹتے دیکھنا اس کا جیسے ایک اور پسندیدہ مشغلہ تھا۔ خیر دین نے کیا کمایا اور کیا بچایا سے زیادہ چیز یا کو خوشی اس بات کی ہوتی تھی کہ اس کی ریڑھی کا پھل ضرور بکنا اور شام تک ختم ہو جاتا تھا۔ بالکل دال کی اس دیگ کی طرح جو صبح لہا لہا بھری ہوتی اور خیر دین کے لیے اسے ہلانا بھی مشکل ہوتا لیکن شام تک وہ اس طرح خالی ہو جاتی کہ بعض دفعہ خیر دین کو اسے ٹیڑھا کر کے چچ کے ساتھ اس کے پینڈے کو کھرچ کھرچ کر بھی اپنے کسی گاہک کی فرمائش پر اس کا پیالہ بھرنا پڑتا۔ خیر دین دال سے جتنا کماتا تھا پھلوں سے اتنا نہیں کماتا تھا لیکن چیز یا کو دال کے بزنس سے زیادہ پھلوں کی اس رنگین ریڑھی میں دلچسپی تھی جسے وہ خود سجاتی تھی۔ وہ جیسے اس کا کیڑوس تھی جس پر وہ مختلف رنگوں اور شکلوں کے پھلوں سے اپنی Creativity کا اظہار کرتی تھی۔ وہ ریڑھی اس فٹ پاتھ پر خیر دین کی دال مشہور اور مقبول

24 ماہنامہ پاکیزہ۔ جنوری 2012ء

ہو جانے سے پہلے اس فٹ پاتھ کی سب سے خوب صورت پھلوں کی ریڑھی تھی جس پر پہلی نظر ڈالنے کے بعد کوئی پھل خریدنے کی خواہش نہ رکھنے کے باوجود بھی ایک دوسری ستائشی نظر ضرور ڈالتا تھا۔ کسی نے کبھی اس ریڑھی پر بد نظمی اور بے ترتیبی نہیں دیکھی تھی، نہ ہی گندگی اور اس میں خیر دین کے اپنے سلیقے کے ساتھ ساتھ چڑیا کے مزاج کی نفاست کا بھی عمل دخل تھا۔ شروع شروع میں خیر دین صرف پھلوں کی ایک ریڑھی لے کر ہی اس فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا تھا۔ لیکن چند ہفتوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ صرف پھلوں کی ریڑھی کے ساتھ گھر کا خرچہ چلانا مشکل تھا..... خاص طور پر اب جب کچھ بھی مفت نہیں تھا..... چند ہفتوں میں ہی خیر دین نے اسی پھلوں کی آدھی ریڑھی کو خالی کرتے ہوئے وہاں اس دال کا دیگر رکھ لیا تھا جس کے لیے وہ ڈی سی ہاؤس میں مشہور تھا..... اور اس کی دال کچھ دنوں کے اندر اس کی توقعات سے بھی زیادہ بکنے لگی تھی۔ چند ہفتے گزرتے ہی اسے اس دال کے دیکھے کو دیگ میں تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور اس کے ساتھ ہی اس نے پھلوں کی ریڑھی کو بھی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ صبح منڈی جا کر پھل لانا اور دال بیکانا بہت دقت طلب کام تھے لیکن چڑیا کی آنکھوں اور چہرے پر اترتی مایوسی اسے اس کے فیصلے پر عمل درآمد نہ کرا سکی۔

خیر دین نے اپنی زندگی کی مشقت کچھ بڑھالی تھی لیکن پھلوں کی وہ ریڑھی اس نے ختم نہیں کی البتہ اب اس ریڑھی سے دال کا بزنس اس نے ایک دوسری ریڑھی پر منتقل کر لیا تھا اور ایک نو عمر لڑکا اس نے اپنا ہاتھ بٹانے کے لیے بھی رکھ لیا تھا۔

خیر دین کی رہائش اس فٹ پاتھ سے ملحقہ رہائشی علاقے میں تھی اور اسکول سے واپس آنے کے بعد چڑیا خیر دین کے پاس آ کر اس کی ریڑھی پر بیٹھ جاتی۔ وہ وہیں اپنا اسکول کا ہوم ورک بھی کرتی اور اس کی ریڑھی کی حفاظت اور نگرانی بھی۔ جب تک خیر دین نے اپنا ہاتھ بٹانے اور ادھر ادھر کے کاموں کے لیے وہ لڑکا نہیں رکھا تھا چڑیا ہی تب تک خیر دین کا ”چھوٹا“ بھتیجی۔ جو اس کا ہاتھ بٹانے کے ساتھ ساتھ سڑک پر لوگوں اور گاڑیوں کے شور سے بے نیاز اور بے پروا اپنا سبق یاد بھی کرتی تھی اور لکھنے والا ہوم ورک بھی۔ اس کے آس پاس ہونے والا کوئی شور اس کے فوکس اور توجہ کو بانٹنے میں کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ہی چڑیا نے اپنے آپ کو آس پاس کی شور مچاتی دنیا کو شٹ آف کرنا سیکھا بالکل اس طرح جیسے اس نے اس رات اپنی زندگی کے سب سے بھیا تک اور تکلیف دہ تجربے پر ایک مینٹل بلاک لگایا تھا اور جب تک وہ اس پر مینٹل بلاک نہیں لگا سکی چڑیا تب تک ذہنی طور پر مفلوج ہوتی رہی۔ نو سال کی اس بچی نے بڑوں کی دنیا کا ”جنس“ نام کا آسیب بہت غلط عمر میں دیکھا تھا۔ اس آسیب نے اس کی بچوں کی دنیا کی ساری خوب صورتی اور رنگینی کو پلک جھپکتے میں غائب کر دیا تھا۔ چند ہولناک گھنٹوں نے اس کی زندگی میں نیپام بم سے زیادہ تباہی برپا کی تھی۔ زندگی وہ fairytale نہیں تھی جو وہ گزار رہی تھی بلکہ وہ تھی جس کی ایک جھلک نے اس کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔

وہاں اس رات اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ یہ سوال چڑیا کو گونگا کر دیتا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ یاد نہیں کر پاتی تھی، صرف تاریکی اور اپنی گردن پر کسی کے ہاتھوں کی گرفت۔ ایک کی ہڈیانی چیخیں اور اس ساری تکلیف سے زیادہ تکلیف وہ اپنی عریانی اپنے برہنہ جسم کا تصور..... اور اس کے بعد چڑیا کا ذہن مفلوج ہو جاتا۔ وہ کانپتے جسم اور بھیچے ہونٹوں کے ساتھ سرد جسم اور پھٹی آنکھوں کے ساتھ ماں کو دیکھتی بے آواز اور بے حس و

حرکت روتی جاتی اور اس کے جسم پر ٹھنڈے پسینے آتے..... اور اس کی ماں اس کی حالت دیکھنے کے بعد بلک بلک کر روتی جاتی۔ اس نے چڑیا سے کچھ بھی پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔ جس حالت میں خیر دین نے اسے ڈی سی ہاؤس میں دیکھا تھا اس کے بعد کسی سوال جواب کے بغیر بھی وہ جانتا تھا وہاں کیا ہوا تھا؟ چڑیا کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ حلیمہ کی طرح وہ چڑیا سے کبھی کچھ نہیں پوچھ سکا تھا، وہ سوال یا کوئی بھی سوال۔ وہ خیر دین کی عمر بھر کی کمائی سے کھڑی کی ہوئی ایک شاندار عمارت تھی جسے اس حالت میں اس گھر میں دیکھ کر خیر دین پلک جھپکتے میں خود ڈھے گیا تھا۔ کوئی ظلم سا ظلم ہوا تھا اس پر..... سوال جواب کیا رہ گئے تھے، کس نے کرنے تھے اور کیوں کرنے تھے۔

اس نے ہڈیانی اور جنونی انداز میں صرف ڈی سی کو مارنے کی کوشش کی تھی۔ نتیجہ وہی ہوا تھا جو ہو سکتا تھا۔ چند منٹوں میں ڈی سی کے حفاظتی عملے نے اسے زد و کوب کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن پہنچا دیا تھا جہاں وہ اگلے دو دن تشدد کا نشانہ بنتا رہا۔ راتوں رات اس کی بیٹی کو چڑیا اور کوارٹر کے سامان کے ساتھ ڈی سی ہاؤس سے باہر پھنکوا دیا گیا تھا۔ رات کے وہ آخری چند گھنٹے چڑیا نے اپنی ماں کے ساتھ ڈی سی ہاؤس سے باہر پھنکوائے ہوئے ان کے سامان کے ڈھیر پر اپنی روتی ہوئی ماں سے لپٹے ایک عجیب خوف اور دہشت کے عالم میں گزار دیے تھے۔

فجر کی نماز کے بعد دن ہونے پر اس کی ماں سامان کے اس ڈھیر کو وہیں چھوڑے اسے ساتھ لیے وہاں سے کئی فرلانگ دور ایک pco سے اپنے کسی جاننے والے کو فون کر کے وہاں پہنچنے کا کہہ کر جب تک واپس آئی سامان کے اس ڈھیر سے بہت کچھ راستے سے گزرنے والے اٹھا کر لے جاتے تھے اس سامان کا ماتم چڑیا کی ماں تب کرتی اگر ماتم کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی اور سامان نہ ہوتا۔ اگلے چند گھنٹوں میں اس جاننے والے نے اس سامان کو اٹھوا کر انہیں اپنی چھت کے نیچے پناہ تو دے دی تھی لیکن خیر دین کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ بھی کسی کالج میں اردی تھا اور ڈی سی کے حکم پر بند کیے جانے والے خیر دین کے لیے وہ کیا کرتا۔ ایف آئی آر میں خیر دین پر ڈی سی کے گھر میں چوری کے الزام کے ساتھ چوری کرتے ہوئے پکڑے جانے پر ڈی سی پر قاتلانہ حملہ کرنے کا بھی الزام تھا اور ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر کے جان اور مال پر ہاتھ ڈالنے کا نتیجہ جو ہو سکتا تھا وہی ہوا تھا۔ شہر کا کوئی بھی وکیل فیس لیے بغیر خیر دین کے لیے ضمانت کی کوششوں کا حصہ بننے کو تیار نہیں تھا اور بے بسی اور کسمپرسی کی اس انتہا کا ایک ایک لمحہ اس نو سالہ بچی کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑ کر گیا تھا۔

دو دن کے بعد ڈی سی ہاؤس کے عملے نے ڈی سی کی طرف سے مصالحتی کوششوں کا آغاز کیا تھا اور خیر دین نے بنا چوں و چرا اس مصالحت نامے پر دستخط کر دیے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جیل کے اندر چلے جانے کے بعد پیچھے کچھ باقی نہیں بچتا تھا جو حلیمہ اور چڑیا کو سہارا دیتا۔ اس کے لیے تھانے سے باہر آنا اشد ضروری تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ چڑیا اور اپنی زندگی کے بلے کے ڈھیر سے کیا کیا بچا سکتا تھا۔

ڈی سی خیر دین کے ساتھ مقدمہ انور ڈنہیں کر سکتا تھا۔ اگر مقدمے میں خیر دین چڑیا کے حوالے سے کچھ الزامات لگا دیتا تو کچھ ثابت نہ ہونے کی صورت میں بھی وہ الزامات اتنے خطرناک ضرور تھے کہ ایک لائق

فائق ڈی ایم جی آفیسر کی ساکھ نام اور تباہ کن کیریئر ڈوبنے کے لیے کافی تھے اور ڈی سی اس بات سے اچھی طرح واقف تھا۔ مالی بد عنوانی کے الزامات کا دفاع کیا جاسکتا تھا اور وہ ایسے الزامات ہوتے تھے جن کو اگر غلط ثابت کر دیا جاتا تو ہر معاملے میں باعزت طور پر نکل آنا ممکن تھا لیکن اخلاقی جرائم سے متعلق الزامات اگر کورٹ تک چلے جائیں تو پھر بے قصور ثابت ہونے کے باوجود الزامات اور شکوک و شبہات کی گرد بہت عرصے تک نہیں بیٹھتی۔ وہ دھول فریقین کو گرد آلود رکھتی ہے۔

ڈی سی بے وقوف نہیں تھا، چڑیا کے حوالے سے کسی الزام کی گونج اس کے کیریئر سے پہلے اس کی ازدواجی زندگی کو تباہ کرنے کا باعث بنتی۔ اپنی فیملی میں اسے بے حد شرمندگی اور خفت کا سامنا کرنا پڑتا..... اس کے لیے خیر دین سے خاموش مصالحت اس سے کہیں زیادہ ضروری تھی جتنی خیر دین کے لیے اس کے ساتھ..... خیر دین اس کے جیسی ذہانت رکھتا تو اپنے کارڈز زیادہ سمجھداری سے کھیلتا، مصالحت نامہ اپنی شرائط پر کرتا لیکن وہ ڈی سی اور اس کے پیچھے تمام انتظامی مشینری کے دباؤ اور دھمکیوں کے سامنے ٹھہر نہیں سکا۔ ڈی سی نے اس کے خلاف ایف آئی آر واپس لی تھی لیکن اسے ملازمت سے برخاست کر دیا تھا اور اس کے خلاف دی جانے والی رپورٹ میں لگائے گئے الزامات واپس نہیں لیے تھے۔ خیر دین کی صرف نوکری نہیں گئی تھی پنشن اور ریٹائرمنٹ پر ملنے والے تمام فنڈز بھی چلے گئے تھے لیکن بس یہ ہوا تھا کہ وہ تیسرے دن صبح سویرے اپنے جسم پر چونوں کے کئی چھوٹے بڑے نشان لیے حلیمہ اور چڑیا کے پاس پہنچ گیا تھا۔

زندگی میں پہلی بار چڑیا ہمیشہ کی طرح ہستی کھلکھلاتی بھاگتی خیر دین کے پاس نہیں جا پائی تھی۔ جو کچھ ہوا تھا اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ کوئی قصور نہ ہونے کے باوجود وہ نو سالہ بچی شدید احساس جرم کا شکار تھی۔ وہ جن کے گھر پر ٹھہرے ہوئے تھے وہاں وہ جیسے سرکس کا ایک جانور تھی جس کی کہانی دن میں کئی بار اس کے سامنے حلیمہ یا اس گھر کی عورتیں وہاں آنے والی آس پڑوس کی عورتوں کو سناتیں..... وہ وہاں موجود ہوتی تو سر جھکائے کسی بات کی طرح سب کچھ سنتی جاتی۔ وہ رات پھر اسی تکلیف کے ساتھ اس پر گزرتی، اسی خوف، اذیت اور بے بسی کے احساس سے وہ دوبارہ گزرتی..... اور دو دن کے درجنوں بار دہرائے جانے والے اس مینٹل ٹارجر کے بعد ایک لمحہ وہ آگیا تھا جب 9 سال کی اس بچی نے اپنے لیے شدید نفرت محسوس کی تھی۔ وہ دو دن میں ہی احساس جرم کی دوسری سیڑھی پر آگئی تھی۔ ہمدردی کے جیلے، ترس بھری نظریں اور کریدنے والے سوالات، ان میں سے کسی چیز نے اس traumatized بچی پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا تھا۔ اس کے ساتھ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ وہ اچھی بچی نہیں تھی۔ ان دو دنوں میں اپنے حواس کو بحال کرنے کی پہلی کوشش کے دوران یہ پہلا نتیجہ تھا جو چڑیا نے نکالا تھا۔

جوا جھمٹے تھے ہوتے ہیں ان کے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہوتا اور ان کی وجہ سے ان کے نانا کو تکلیف بھی نہیں پہنچتی۔ خیر دین کو پہلی بار تکلیف اور زخموں کی وجہ سے لڑکھڑاتے قدموں سے گھر کے اندر داخل ہوتے دیکھ کر خوشی کے احساس کے باوجود آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ چڑیا نے دوسرا نتیجہ نکالا تھا۔

وہ چھوٹا سا گھر تھا، وہ وہاں چھپ نہیں سکتی تھی لیکن وہ چھپنا چاہتی تھی۔ وہ خیر دین کے سامنے آنا نہیں چاہتی تھی، اگر نانا نے کچھ پوچھا تو.....؟ اگر نانا نے ڈانٹا تو؟ نانا اب مجھے بہت برا سمجھتے ہوں گے..... خدشات



اور وہاں سے زندگی میں اس کا پہلا تعارف بھی اسی عمر میں ہوا۔ چڑیا چپ چاپ بیٹھیاں چڑھ کر چھت پر چلی گئی تھی۔ دو کمروں کی وہ چھوٹی سی چھت کا ٹھکڑا سے اٹی ہوئی تھی اور اس کا ٹھکڑا میں کوشش کے باوجود چڑیا کوئی ایسی جگہ تلاش نہیں کر سکی جہاں وہ چھپ جاتی اور چھت پر آنے والا کوئی بھی شخص اسے پہلی ہی نظر میں نہ ڈھونڈ لیتا۔ بس چھت پر کھڑکی کا ایک ٹوٹا ہوا پت دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا جس کے پیچھے پھٹی پرانی بور یوں میں کوئی سامان بھرا پڑا تھا۔ چڑیا اپنے پتلے وجود کے ساتھ اپنے آپ کو سیکڑ کر انہی بور یوں میں سے ایک پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور اس دن وہاں بیٹھے اس نے اس سامان میں چند چھوٹی بڑی چھپکلیاں، ایک چوہا، بڑی بڑی دو کڑیاں اور ایک لال بیگ کے ساتھ چند دوسرے کیڑے مکوڑے بھی دیکھے۔ اور زندگی میں پہلی بار وہ گم صم کسی خوف کے بغیر ان تمام چیزوں کو اپنے آس پاس اور ارد گرد حرکت کرتے دیکھتی رہی۔ صرف چند دن پہلے وہ ساری چیزیں اس کے خوف کا منبع تھیں۔ خوف نام کی کیفیت کو وہ ان غیر انسانی چیزوں کے ساتھ منسوب کر کے محسوس کرتی تھی۔ صرف چند دن میں خوف نے اپنا منبع بدل لیا تھا۔ خوف نے اب اپنے آپ کو انسانی شکل میں ڈھال لیا تھا۔ اب اس کی دم، پڑ چار پاؤں، آٹھ ٹانگیں، سرخ، گرے، سیاہ چمکیلا کراہیت آمیز رنگا وجود نہیں ہوتا تھا جس کے ساتھ وہ ریگ کراڑ کر دیواروں درختوں سے چپکنا دوڑتا پھرتا تھا۔ اب اس کا خوف دو آنکھوں، دو ہاتھوں، ایک ناک، ایک منہ والا اور خوب صورت صاف رنگت والا ہو گیا تھا جو خوب صورت لباس پہنتا تھا اور دو ٹانگوں پر چلتا تھا۔ وہاں بیٹھے ان سارے کیڑے مکوڑوں کو دیکھتے ہوئے چڑیا نے اپنے آپ کو ان کے قبیل کا حصہ محسوس کیا۔ ان سب کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ یہاں اس چھت پر سامان میں چھپے بیٹھے ہیں۔ چڑیا نے باری باری ان سب کو دیکھتے ہوئے بے حد ہمدردی سے سوچا۔

نیچے گھر کے اندر بیٹھے پانی مٹے ہوئے خیر دین نے چند ہی منٹوں میں چڑیا کی عدم موجودگی محسوس کر لی تھی۔ چڑیا کی ڈھنڈیا پچی تھی اور وہ نہیں مٹی تھی۔ کسی نے اسے چھت پر جاتے دیکھا اور وہاں جا کر ڈھونڈا اور وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ خیر دین پانی کا گلاس چھوڑتا ہوا بے حد حواس باختگی کے عالم میں خود اسے چھت پر ڈھونڈنے پہنچا تھا۔ چھت خالی تھی۔ وہ چڑیا کا نانا نہ ہوتا تو اسے بھی چھت خالی ہی نظر آتی، پر اس نے چڑیا کو اس خالی چھت پر بھی تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ چند منٹ لگے تھے اس کھڑکی کے اس ٹوٹے پت کے پیچھے سانس روکے بے حس و حرکت بیٹھی چڑیا تک پہنچتے جو چھت پر خیر دین کے بار بار پکارنے پر بھی برستی آنکھوں کے ساتھ اسی طرح چھپی بیٹھی رہی تھی پھر اس نے ایک سائے کو سورج کی روشنی کو روکتے دیکھ کر سر اٹھایا تھا۔ خیر دین کبھی چڑیا کو اتنا بوڑھا نہیں لگا تھا جتنا اسے اس دن لگا تھا۔ بڑھی ڈاڑھی، وحشت زدہ آنکھیں اور تلکے کپڑے، وہ اپنے نانا کو پہچان نہیں سکی۔ وہ اس جلیے کے کسی شخص سے کبھی واقف نہیں رہی تھی لیکن وہ پھر بھی خیر دین کو سراٹھا کر دیکھتی رہی، آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ۔ اس کا اور خیر دین کا آخری سامنا اس رات تب ہوا تھا جب اس نے اپنی چادر کے ساتھ اس کے برہنہ جسم کو لپیٹا تھا لیکن اس رات روتی ہوئی چڑیا سے اس نے کچھ کہا نہیں تھا۔ خیر دین کے دل کو کسی چیز نے آری لے کر کاٹا تھا۔ یہ چڑیا کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں اور ڈراسہا کا نپتا وجود نہیں تھا، یہ ان آنکھوں میں جھلکنے والی ندامت تھی جس نے خیر دین کو مارا تھا۔ کس چیز کا احساس جرم..... کیسی ندامت؟ کچھ بھی کہے بغیر اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر چڑیا کو بوری سے اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا پھر اس نے فرش پر بیٹھے ہوئے چڑیا کو اپنے ساتھ لیٹا لیا، نہ وہ رویا تھا نہ اس نے چڑیا سے کچھ کہا تھا، نہ اس نے چڑیا سے

کچھ پوچھا تھا۔ وہ اسے بہت دیر تک اپنے سینے سے لپٹائے رہا تھا یوں جیسے اس کی تکلیف کو اسفنج کی طرح اس کے وجود سے نچوڑ کر خود جذب کر لینا چاہتا ہو، یوں جیسے کسی کی اکھڑتی سانس کو بحال کرنے کے لیے اسے آکسیجن کی سپلائی دینے کی کوشش کی جا رہی ہو اور اس کی اس گرم جوش آغوش نے دونوں کام کیے تھے۔ وہ ٹھنھرتا، کانپتا، سکڑتا، سہا، ننھا وجود جان بلی کی اس کیفیت سے نکلنے لگا تھا۔ اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں خود بخود خشک ہونے لگی تھیں۔ چڑیا کو اس کا نانا دوبارہ مل گیا تھا۔

خود سے الگ کر کے خیر دین نے سب سے پہلے اس کے بکھرے الجھے بال سلجھائے تھے۔ ان ہیر پتھر کو اس کے بالوں سے نکالا تھا جو ان تین دنوں میں اس کے بالوں کو سلجھانے سے زیادہ الجھانے کا کام کر رہی تھیں۔ پونی میں پڑا برہینڈ اب پونی کے آخری سرے پر آچکا تھا اور چڑیا کے آدھے سے زیادہ بال اس کی گرفت سے آزاد بے ترتیب لٹوں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ اس چھت پر بیٹھے خیر دین نے سب سے پہلے اس کے بکھرے بالوں کو سلجھایا۔ اس کی چھوٹی سی پونی نما چڑیا گوندھ کر اس کی باقی لٹوں کو ہیر پتھر کے ساتھ دوبارہ جمایا..... وہ جیسے چڑیا کو اپنی زندگی کا ایک اور بڑا گردے رہا تھا، منہ پر چوٹ کھانے کے بعد اوندھے منہ گرنے کے بعد ہتھیار ڈالنے کے بجائے اٹھ کر دوبارہ کھڑے ہونے کا۔ اپنے پیروں پر اپنی ہمت اور اپنی مرضی سے بالکل وہیں کھڑے ہونے کا جہاں گرائے گئے ہو۔

☆☆☆

”تو یہ تھی عکس مراد علی..... بڑی curiosity تھی اس سے ملنے کی مجھے۔ آج بالآخر موقع مل ہی گیا.....“ رات کو ڈنر ختم ہونے کے بعد سونے کے لیے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد شہر بانو نے واپس بیڈ روم میں آتے ہوئے شیردل سے کہا۔ وہ بھی کپڑے تبدیل کر کے ابھی کچھ دیر پہلے ہی آکر بستر پر لیٹا تھا اور اس وقت اپنے سیل فون پر بڑی برق رفتاری کے عالم میں اپنے نیکسٹ میسر دیکھنے اور ان کے جواب بھیجنے میں مصروف رہا۔ اس نے شہر بانو کا تبصرہ سنا تھا لیکن اس تبصرے کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ شہر بانو اپنے بستر پر سونے کے لیے لیٹنے کے بجائے کروٹ لے کر شیردل کے پاس آگئی۔ اس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے اس نے مزید کہا۔

”اچھی ہے۔“ شیردل نے جواب دیے بغیر اس کے گرد اپنا بازو حائل کر لیا لیکن وہ اب بھی اپنے سیل فون کے ساتھ ہی مصروف تھا۔ شہر بانو کو لگا اس نے شاید عکس کے بارے میں اس کا تبصرہ نہیں سنا۔ شیردل کے سیل فون والی کلائی اور نیچے بازو کی کہنی تک پھیلے ہوئے سیاہ بالوں کے گھنے روکس کو اپنے ہاتھ کی نرم پوروں سے سلجھاتے ہوئے شہر بانو نے ایک بار پھر اپنا تبصرہ دہرایا۔ اس بار جواب آ گیا تھا۔

”ہونہ.....“ شہر بانو نے ذرا سا سراٹھا کر شیردل سے کہا۔

”شیری اب تم مجھ سے بات کرو گے یا ابھی بھی کمشنر کو text کرتے رہو گے؟“ اس کے انداز میں خفگی تھی۔

”میں سن رہا ہوں یار۔“ شیردل نے مسکرا کر بہلانے والے انداز میں سیل فون سے اس کی ناک کی نوک تھپتھپائی۔ وہ ایک بار پھر فون کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”لگتا ہے تمہارے چیف نے نیا نیا text کرنا سیکھا ہے۔ پچھلے دو دن سے اس نئی مصیبت نے ناک میں دم کیا ہوا ہے۔“ شہر بانو واقعی شیردل اور کمشنر کے درمیان رابطے کے اس ایک اور ذریعے سے تنگ آ گئی تھی جو دو دن پہلے شروع ہوا تھا۔ شیردل اس کی بات پر مسکرا دیا۔

”چیف نے بلیک بیری لیا ہے نیا نیا اور ابھی اس کے فنکشنز نہیں سمجھ پارہے۔ آج ڈنر پر بھی وہی سمجھا تا رہا ہوں انہیں اور اب بھی وہی سمجھا رہا ہوں۔“ شہر بانو اس کے اس سوشل ورک کے بارے میں جان کر زیادہ خوش نہیں ہوئی تھی۔

دو دن سے بھابی کو کیے جانے والے سارے میجر بھی مجھ تک آرہے ہیں۔ پتا نہیں بھابی تک کس کے جارہے ہوں گے۔ میں نے ابھی منع کیا ہے انہیں کہ جب تک ہاتھ صاف نہ ہو جائے کم سے کم بھابی کو کوئی پرائیوٹ میسج نہ کریں۔“ شہر بانو کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ وہ کمشنر کی ٹیکنالوجی کے حوالے سے Incompetence کے بارے میں آگاہ تھی۔

”تم نے یہ کہہ دیا ان سے؟“ اس نے ہنستے ہوئے شیردل سے پوچھا۔

”ہاں کہا لیکن اس طرح نہیں کہا۔“ شیردل بھی جواباً مسکرایا۔

”اب تک پہنچ نہیں گئے ہوں گے؟“ اس نے کمشنر کے اپنے شہر میں پہنچنے کے حوالے سے پوچھا۔

”نہیں لیکن پہنچنے والے ہیں۔“ شیردل اب بھی text کر رہا تھا۔

”اب بس کرونا۔“ شہر بانو جھلائی۔

”One last text“ شیردل نے بے ساختہ کہا اور پھر چند لمحوں کے بعد سیل فون بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”کیا کہہ رہی تھیں تم؟“ شہر بانو کے گرد اپنے دونوں بازو جھانک کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”عکس کے بارے میں بات کر رہی تھی۔“

”ہونہ۔“ شہر بانو نے بے اختیار سر اٹھا کر شیردل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”یہ ہونہ کیا ہوتا ہے؟“

”اور کیا کہوں؟ تعریف تو تم پہلے ہی کر رہی ہو۔“ شیردل مسکرایا تھا۔

”وہ جتنی اٹریکٹو ہے میں حیران ہوں اب تک سنگل کیسے ہے..... شادی کیوں نہیں کی اس نے ابھی

تک۔“ وہ شیردل سے یہ سوال نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اسے سمجھ نہیں آیا یہ سوال کیسے اس کی زبان پر آیا تھا۔

رات کے پچھلے پہر جیسے اس کا لاشعور بولنے لگا تھا۔ شیردل کے چہرے سے چند انچ دور اس کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈالے اس نے شیردل کو جیسے کسی دام میں لانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس سوال کا جواب اس کی زبان

سے نہیں جیسے اس کی آنکھوں میں پڑھنا چاہتی تھی۔ شیردل اس سے آنکھیں نہیں چرا سکا۔ وہ اس کے اتنے

قریب تھی کہ آنکھیں چرا کر بھی اسے دوبارہ اس سے آنکھیں ملانی پڑتیں۔

”اس کا ذاتی مسئلہ ہے..... میں نے کبھی پوچھا نہیں۔“ بے تاثر لہجے میں شیردل نے اس کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے اپنے لاشعور کو بولنے نہیں دیا۔ اس کے اور عکس کے درمیان ہونے والا ہر سوال جواب صرف دو

سامعین اور دو لوگوں کے لیے تھا..... عکس..... اور..... شیردل کے لیے۔ وہ اپنی اور عکس کی کوئی ذاتی گفتگو نہیں نہیں دہراتا تھا، کسی تیسرے چوتھے شخص کے سامنے نہیں۔ یہ ان کے رشتے اور تعلق کا ایک unsaid rule تھا۔ ایک دوسرے کا کوئی راز کسی سے شیئر کرنا تو خیر ناممکنات میں سے تھا۔

”تم اور وہ تو آپس میں کافی کلوز ہو شاید..... تم نے بھی کبھی نہیں پوچھا؟“ لاشعور نے پھر ایک اور سوال کیا جو شعور چھپائے ہوئے تھا۔

”نہیں۔“ وہ پلکیں جھپکائے بغیر شیردل کو دیکھتی رہی، وہ بھی اسے اسی طرح دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی وہ جواب نہیں تھا جس کی اسے توقع تھی، نہ اس جواب کی..... نہ اس کے اتنے مختصر ہونے کی لاشعور اگلا سوال کرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا جب اس نے شیردل کو کہتے سنا۔

”I love you shabi“ وہ اب اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ عکس مراد علی سینڈرز میں کہیں غائب ہو گئی تھی۔

”سو بار کہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے شیردل کی ٹھوڑی کو اپنے ہونٹوں سے چھوتے ہوئے کہا۔

”صرف سو بار.....؟“ شیردل ہنسا۔

”تم زیادہ بار کہنا چاہتے ہو؟“ اس نے شیردل کے سینے پر عجیب سرشاری کے عالم میں اپنا ماتھا ٹکاتے ہوئے اسے چھیڑا۔

”نہیں تو.....“ شیردل مسکراتے ہوئے سنجیدہ ہوا۔

”نہیں؟“ وہ ایک دم اس سے الگ ہوئی۔

”ہاں.....“ وہ پھر ہنسی۔

”تو پھر کہو۔“

”After you ma'am.“ وہ پھر ہنسی۔

”I love you sherdil.“ شیردل مسکرایا۔ ”میں نے تمہارے علاوہ کسی دوسرے مرد سے

محبت نہیں کی۔ کر ہی نہیں سکتی۔“ اس کے گال چھوتے ہوئے وہ اسی سرشاری کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

”اور تم.....؟“ وہ جیسے اب وہی سب کچھ اس کی زبان سے سننا چاہتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی اس نے اپنے سوال سے شیردل کو کیسی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ نادانستگی میں اپنے اور اس کے بیچ عکس مراد علی کو لے آئی تھی۔

”I love you shabi“ شیردل ایسے نازک مرحلوں سے بہت بار گزرا تھا۔ عکس مراد علی سے

بہت بار بیچ کر گزرنے کی کوشش کی تھی اس نے۔ لیکن عکس کو اپنے دل میں اس جگہ سے ہٹائے بغیر اور ہلائے بغیر جہاں وہ تھی۔

”تم میری زندگی کی دو خوب صورت اور قیمتی ترین چیزوں میں سے ایک ہو..... I am incomplete

without you“ شہر بانو مسکرا دی۔ وہ ہمیشہ اس سے یہی کہا کرتا تھا اور وہ جانتی تھی وہ دوسری قیمتی اور خوب

صورت چیز کون تھی..... مثال شیردل۔

دنیا کا کوئی مرد شیر دل جیسا نہیں تھا..... ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے سینے پر سر رکھے آنکھیں موندتے ہوئے شہر بانو نے سوچا۔ وہ ٹھیک سوچ رہی تھی۔ دنیا کا کوئی مرد شیر دل جیسا نہیں تھا..... ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہاں سے 250 کلو میٹر دور اپنے گھر کے بیڈروم میں اپنے پرس سے شیر دل کا دیا ہوا اٹھوپپر نکالتے ہوئے عکس مراد علی نے بھی یہی سوچا تھا۔

☆☆☆

”تیری ہے زمیں، تیرا آسمان  
تو بڑا مہرباں تو بخشش کر  
سبھی کا ہے تو سبھی تیرے ہیں  
خدا میرے تو بخشش کر

باربی ڈول کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ اگر اس وقت اسمبلی ایریا میں کھڑی نہ ہوتی تو چھلانگیں لگاتی جا کر چڑیا سے لپٹ جاتی۔ کئی ہفتوں کے بعد اس دن اس نے کہا سنڈ اسمبلی کے دوران پہلی بار دوبارہ چڑیا کو دیکھا تھا اور اسے وہ سب گاتے سنا تھا جسے گاتا سنتے ہوئے وہ پہلی بار چڑیا کے عشق میں گرفتار ہوئی تھی۔ وہ آواز ویسی ہی میٹھی تھی، مدھر، پرسوز، ملائم اور پُر اثر..... اور اسمبلی ایریا آج بھی اسی ٹرانس میں تھا جس ٹرانس میں چڑیا کی آواز انہیں لے جاتی تھی۔

اس دن بریک کے دوران باربی ڈول بہت دیر چڑیا کی منتظر رہی۔ بریک گزر گئی چڑیا نہیں آئی اور جب وہ نہیں آئی تو وہ جیسے کچھ بے قراری کے عالم میں ہاتھ روم جانے کا بہانہ کر کے خود اس کی کلاس میں چلی آئی تھی۔

باربی ڈول کو اس کی کلاس کے دروازے میں نمودار ہوتے سب سے پہلے چڑیا کی دوست نے دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح دروازے کے سامنے سے ایک بار گزری تھی، دوبار گزری تھی۔ اس نے اپنی آمد اور موجودگی کا احساس چڑیا کو دلانے کی کوشش کی تھی۔ ہمیشہ وہ یہی کیا کرتی تھی اور چڑیا اسے بار بار اپنے دروازے کے سامنے سے گزرتے دیکھ کر کلاس نیچر سے کوئی بہانہ کر کے باہر آ جاتی تھی لیکن آج ایسا نہیں ہوا تھا۔ باربی ڈول بار بار دروازے کے سامنے سے گزرتی رہی اور اپنی دوست کے احساس دلانے کے باوجود بھی چڑیا نے ایک بار بھی گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ دروازے کی طرف دیکھنے کی کوشش نہ کلاس سے باہر جانے کا تردد۔ کسی بت کی طرح میٹھی وہ سامنے بلیک بورڈ کو دیکھتی رہی اور اپنی نوٹ بک میں کلاس ورک اتارتی رہی۔ ٹیچر کے بورڈ صاف کرنے کے بعد بھی وہ گردن سیدھی کیے بلیک بورڈ کو بے مقصد دیکھتی رہی اور تب تک دیکھتی رہی جب باربی ڈول نے اس کی بے اعتنائی محسوس کر کے بڑی مایوسی کے عالم میں دروازے کے سامنے سے بار بار گزرتا چھوڑ دیا اور جب اس نے دروازے کے سامنے سے گزرتا چھوڑ دیا تو چڑیا نے گردن موڑ کر پہلی بار دروازے کو رنجیدگی کے عالم میں دیکھا۔ وہ کتنی بار دروازے کے سامنے سے گزری تھی، دروازے کی طرف متوجہ نہ ہونے کے باوجود چڑیا بتا سکتی تھی اور اب جب وہ باہر نہیں تھی تو کلاس کے اندر بیٹھے بیٹھے چڑیا یہ بھی جانتی

323 ماہنامہ پاکیزہ۔ جنوری 2012ء

تھی وہ اور باربی ڈول کبھی فرینڈ نہیں بن سکتی تھیں۔ نہ وہ اور باربی ڈول۔ نہ وہ اور ایک۔ باربی ڈول کی صبح جتنی خوشی اور سرشاری کے عالم میں گزری تھی باقی کا دن اتنی ہی اداسی میں گزرا تھا۔ چڑیا نے اس سے بات نہیں کی تھی اور اس بات نہ کرنے کی وجہ باربی ڈول کی سمجھ سے باہر تھی۔

اس نے اس دن گھر جا کر اپنی می کو سب سے پہلے چڑیا کے بارے میں ہی بتایا تھا۔ اس کی می چڑیا کی واپسی کے بارے میں جان کر چونکی تھی پھر اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ موضوع نہیں بدل سکی تھی۔ چڑیا نے اس سے بات کیوں نہیں کی باربی ڈول کی زندگی کا اہم ترین ایٹو تھا۔ ”لنچ“ ڈنر، ہوم ورک کہیں بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اپنے باپ کے گھر آنے پر بھی باربی ڈول نے اسے سب سے پہلے چڑیا کے بارے میں ہی بتایا تھا اور اس کے باپ کا رنگ جیسے فق ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر چپ کا چپ بیٹھا رہ گیا تھا پھر اس نے باربی ڈول سے بے حد حکمانہ انداز میں کہا۔ ”تم آئندہ کبھی چڑیا سے نہیں ملو گی، نہ ہی اس سے بات کرو گی، نہ ہی اس کی کلاس میں جاؤ گی۔“ باربی ڈول باپ کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی۔ اسے باپ سے یہ سننے کی توقع نہیں تھی۔

”لیکن کیوں۔“ باربی ڈول نے حیران نظروں سے اپنے مخصوص انداز میں باپ سے پوچھا۔ وہ اسے کوئی جواب دیے بغیر کچھ جھنجھلاہٹ کے عالم میں وہاں سے چلا گیا۔ چڑیا کی واپسی کب ہوئی تھی؟ اور کیوں ہوئی تھی.....؟ یہ اس کے لیے ایک نیا درد سر تھا۔ خیر دین کے ساتھ مصالحت کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ اب دوبارہ شہر نہیں آئے گا اور چڑیا کے واپس آنے کا مطلب تھا کہ خیر دین ان شرائط کی خلاف ورزی کر رہا تھا۔ لیکن بہت چالاکی اور عقلمندی دکھاتے دکھاتے بھی وہ ایک بے وقوفی کر گیا تھا کہ اس نے خیر دین کو بلیک میل کرنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی نوکری ختم ہو چکی تھی، پنشن روک لی گئی تھی، اسے کسی بھی قسم کی سرکاری نوکری کے لیے نا اہل قرار دے دیا گیا تھا..... اور اب اگر وہ خیر دین کو ایک بار پھر سے شہر چھوڑ دینے پر مجبور کرنے کی کوشش کرتا تو کس چیز کی دھمکی دے کر کرتا۔ مقدمے کا نئے سرے سے آغاز۔ اسے یقین تھا اس دباؤ میں خیر دین نہیں آ سکتا تھا۔ لے دے کے باقی یہی بچا تھا کہ وہ ناجائز طور پر اسے پولیس کی تحویل میں رکھتا..... اور اس بار وہ یہ کام کرنے سے جھجک رہا تھا۔ خوف اسے اس طبقے سے صرف یہ تھا کہ اگر وہ کوئی درخواست لے کر شہر کے کسی دوسرے انتظامی آفیسر یا کسی MPALMAN کے پاس چلا جاتا تو اس کا دھڑن تختہ ہو سکتا تھا وہ جن جس کو اس نے بڑی صفائی لیکن بے حد مشکل سے بوتل میں بند کیا تھا وہ دوبارہ آزاد ہو جاتا اور اس سے زیادہ خوفناک ثابت ہوتا جتنا وہ بوتل میں بند کرتے ہوئے تھا۔ اس رات کے واقعات کی بازگشت وہ کان بند کیے ہوئے بھی بہت جگہوں پر سن رہا تھا اور اس کی جھڑی سی ہاؤس کا عملہ تھا۔ وہ ڈی سی کو سرو کرتے تھے لیکن ان کی ہمدردیاں خیر دین کے ساتھ تھیں اور ڈی سی اس حقیقت سے واقف بھی تھا اور خائف بھی۔ طاقت سے وہ ان سب کو رسیاں تو ڈالے ہوئے تھا لیکن وہ لوئر مڈل کلاس سے آنے والے اس ماتحت عملے کی نفسیات سے واقف تھا۔ مالیوں، ڈرائیوروں، چوکیداروں، خانساؤں، ویٹرز اور دوسرے ملازموں پر مشتمل یہ طبقہ کسی بھی آفیسر کے لیے آستین کا سانپ ثابت ہو سکتا تھا۔ ان کے پاس

ماہنامہ پاکیزہ۔ جنوری 2012ء

کسی بھی آفیسر کی ساکھ کو خراب کرنے کے لیے زبان جیسا خطرناک ہتھیار تھا جس کا وار کبھی خطا نہیں جاتا تھا۔ خیر دین کے معاملے کی بازگشت کو ڈی سی ہاؤس تک رکھنے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اندرون خانہ شہر کے دوسرے بہت سارے انتظامی آفیسرز کو اپنے ماتحت عملے کے توسط سے خیر دین اور اس کے درمیان جھگڑے کی اصل نوعیت کا پتا تھا..... اور اس تمام صورت حال میں خیر دین کا دوبارہ نمودار ہو جانا اس کے لیے گلے کی ہڈی کے برابر تھا جسے وہ اگل سکتا تھا نہ نگل سکتا تھا۔

اپنی desperation میں اس نے خیر دین پر ایک اور وار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کا وہ وار اس کے لیے کتنا تباہ کن ثابت ہونے والا تھا۔ اس سارے مسئلے سے اتنی ہوشیاری سے جان چھڑا لینے کے بعد اس نے نادانستگی میں اپنے ہاتھوں سے دوبارہ اپنے لیے وہ جال بچھایا تھا جو اس کو لے ڈوبنے والا تھا۔

☆☆☆

”میں بہت خوش ہوں۔“ اس نے فون پر چپکتے ہوئے عکس کو بتایا۔ ”and actually Im happy for you“ تم آنا چاہتی تھیں نا اس سیٹ پر۔“

”تم زہر لگتے ہو اس طرح کی منافقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیر دل۔ صاف صاف کہو تمہاری ولی مراد بر آئی ہے بلکہ کیا کہوں..... لاٹری نکل آئی ہے تمہاری۔“ وہ عکس کی بات پر برا منائے بغیر ڈھٹائی سے ہنسا تھا، جانتا تھا وہ جھنجھلائی ہوئی ہوگی۔ صوبے میں غیر متوقع انتظامی اکھاڑ پچھاڑ کا طوفان آیا تھا اور وہ دونوں بھی اس کی زد میں آئے تھے۔ عکس کی پوسٹنگ شیر دل سے زیادہ بڑے شہر میں تھی جو ڈویژن کا درجہ بھی رکھتا تھا اور اس کی وہاں سے شیر دل کی سیٹ پر تبدیلی کم از کم پروفیشنل عکس کو اچھی نہیں لگ سکتی تھی یہ شیر دل جانتا تھا اور وہ اس صورت حال سے محفوظ ہوا تھا۔ وہ ڈی ایم جی کے قابل ترین آفیسرز میں سے تھے اور آپس کے تعلق کے باوجود پروفیشنل ان دونوں کے درمیان کانٹے کا مقابلہ رہتا تھا ہمیشہ۔ شیر دل کا خیال تھا کہ عکس بہت مواقع پر بہت جگہوں پر خوش قسمت رہی تھی اور قسمت کا یہ غیر متوقع ساتھ عکس کے کیریئر گراف کے مسلسل اوپر کی طرف سفر میں ایک اسٹرونگ فیکٹر تھا اور عکس کے بارے میں یہ رائے رکھنے والا وہ اس کے بیچ میٹس میں سے واحد نہیں تھا..... اور اب خوش قسمتی کی دیوی کا چند لمحوں کے لیے شیر دل پر مہربان ہونا اس کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہی تھا۔

”دیکھو تم کو بھی خوش ہونا چاہیے..... اپنے شہر میں پوسٹنگ کا موقع مل رہا ہے تمہیں، کم اعزاز کی بات ہے کیا۔“ وہ اسی طرح ہنستے ہوئے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

”شیر دل تم کبھی مجھے اپنے سے کسی بہتر پوسٹ پر دیکھ ہی نہیں سکتے۔“ اس نے شیر دل کے بہلاوے سے بہلنے کے بجائے کہا۔

”تم دیکھ سکتی ہو؟“ شیر دل نے جواباً کہا۔

”ہاں.....“

”Really“

”Shut up“

”عکس! تمہیں شرم نہیں آئی اس طرح کی بات کرتے ہوئے؟“

”تم نے کہا پہلے یہ۔“ چلو ٹھیک ہے میں فون رکھ رہی ہوں۔“ وہ بے حد اور خلاف معمول سنجیدہ تھی۔

”تم کیا واقعی میری سیٹ پر آنا نہیں چاہتی تھیں؟“ شیر دل کو اس کے لہجے سے پہلی بار تشویش ہوئی۔

”نہیں.....“ اس کا جواب دو ٹوک تھا۔

”کیوں؟“ وہ بھی سنجیدہ ہوا۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس نے عکس کو کسی ناسک یا پوسٹ کے حوالے سے اتنا reluctant دیکھا تھا۔

”بہت ساری وجوہات ہیں۔“

”کوئی ایک دو بتا دو۔“ وہ واقعی حیران تھا۔

”چلو خیر اب کیا ہو سکتا ہے..... پوسٹنگ ہو گئی ہے تو سیٹ تو سنبھالنی ہی پڑے گی۔“ شیر دل کو محسوس ہوا اس نے بات بدلی تھی۔

”trust me اس پوسٹنگ اور ٹرانسفر میں میرا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ تم کو پتا ہے میں کبھی tenure پوری کیے بغیر ان ایمر جنسی ٹرانسفرز کے حق میں نہیں رہا۔ میں نے تو پتا نہیں کیا کیا شروع کروایا ہے یہاں اس بجٹ کے بعد، ہر چیز کا کریڈٹ تم لے جاؤ گی۔“ شیر دل ایک ہی جملے میں سنجیدہ ہوا اور پھر فکر مند۔ عکس کو ہنسی آئی وہ جانتی تھی یہ فکر مندی مصنوعی نہیں تھی۔ شیر دل کو ٹرانسفر آرڈرز آتے ہی سب سے پہلے یہی پچھتاوا لگا ہوگا کہ اس کی محنت کا پھل کوئی اور کھانے والا تھا۔

”ایک سال میں ایسے بھی کیا تیر مار لیے ہوں گے تم نے، حوصلہ رکھا کرو اور دل بڑا کرو اپنا۔“ اس کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے شیر دل نے اس سے اچانک خیال آنے پر پوچھا۔

”عکس تم conventarian ہو؟“ وہ اس کے سوال پر چند لمحوں کے لیے ٹھٹکی پھر اس نے کہا۔

”ہاں، تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”مثال کے اسکول گیا تھا۔ وہاں پرنسپل آفس میں رول آف آئر پر تمہارا نام دیکھا۔ پہلے تو کبھی میں نے غور نہیں کیا تھا، اس بار اتفاقاً اسے دیکھتے ہوئے تمہارے نام پر نظر پڑ گئی میری۔“ شیر دل نے اسے بتایا۔ ”ویسے تمہیں اپ ڈیٹ رکھنے کے لیے بتا رہا ہوں کہ تمہارا ریکارڈ ابھی تک ٹوٹا نہیں ہے۔“ عکس اس کی بات پر مسکرا دی۔

”اچھا..... نہیں ٹوٹا.....؟ ٹوٹ جائے گا، ہر کسی نہ کسی نشانے کی زد میں ہوتا ہے، کون پرنسپل ہے آج کل وہاں؟“ اس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”سنسٹر ایکٹس ہیں۔“

”Great..... تو مثال کو بھی تم نے وہیں ایڈمٹ کروایا ہوا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، شہر بانو کا لونٹ کے علاوہ کہیں اور بھیجنے پر تیار نہیں ہوئی ورنہ میں کچھ اور try کرنا چاہتا تھا اس کے لیے۔“ عکس دلچسپی لیتے ہوئے اس کی بات سنتی رہی۔ وہ مثال کے ساتھ شیردل کی گہری جذباتی وابستگی سے واقف تھی۔ مثال شیردل کی کمزوریوں میں سے ایک تھی اور وہ ان موضوعات میں سے ایک تھی جس پر بات کرتے ہوئے شیردل کسی کو بھی بور کر سکتا تھا..... عکس کے علاوہ وہ دلچسپی سے شیردل کی باتیں سنتی رہتی تھی اور اس کی باتیں سنتے ہوئے اسے اکثر احساس ہوتا کہ وہ قابل رشک حد تک اچھا باپ تھا اور وہ کئی بار شیردل کو یہ بتائے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ ہر بار جواباً مسکرا دیتا تھا۔

”تمہیں پتا ہے سب سے بڑا فائدہ تمہیں میری سیٹ پر آکر کیا ہونے والا ہے؟“ شیردل بات کرتے کرتے اچانک پولا۔ عکس کو موضوع گفتگو کی اس abrupt تبدیلی سے حیران نہیں ہوئی۔ وہ جب سے شیردل کو جانتی تھی وہ ایسا ہی تھا۔ ایک ایشو پر بات کرتے کرتے اس کی ذہنی رو پٹا نہیں کہاں پلٹا کھا جاتی۔ بے حد سنجیدہ باتیں کرتے ہوئے وہ اچانک درمیان میں ایک انتہائی احتفانہ بات بڑی سنجیدگی سے کر دیتا اور کبھی انتہائی احتفانہ باتیں کرتے ہوئے سنہری حروف میں لکھی جانے والی کوئی بات کہہ دیتا۔ عکس اس کے چہرے اور ذہن کو کسی psychic کی طرح پڑھتی تھی۔

”کیا.....؟“

”تمہیں ایک شاندار گھر ملنے والا ہے well decorated, well maintained شہر بانو اور میں نے جان لگا دی ہے اس بھوت بنگلے کو اس حالت میں پہنچانے میں..... جس میں تم نے اسے دیکھا ہوگا۔“

”اچھا.....“ مختصر جواب آیا۔

”اور بڑی مزے کی بات بھی ہے اس گھر کے بارے میں۔“ شیردل کو اچانک اس پر ایک اور انکشاف کرنے کا خیال آیا۔

”کیا.....؟“ عکس نے اسی انداز میں ایکساٹنڈ ہوئے بغیر کہا۔

”اس گھر کے بارے میں بہت ساری myths ہیں۔ پہلی یہ کہ یہاں بونے ہیں اور دوسری یہ کہ یہاں رہنے والا کوئی کپل اکٹھا نہیں رہ سکتا۔ وہ ضرور الگ یا کسی حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ چیف نے یہ کام کروانے کی بڑی کوشش کی ہے لیکن کچھ ہوا نہیں ورنہ کچھ ہو جاتا تو میری پوری خواہش ہوتی کہ تم اور جواد ملٹی بھی شادی کے بعد اسی گھر میں رہتے۔“ وہ اس کی انتہائی سنجیدگی سے کہی بات پر کھلکھلا کر ہنس دی۔

”تم کتنے mean ہو شیردل۔“

”ہمیشہ سے تھا۔“ اس نے بر جستہ کہا۔ ”ویسے یہ پہلی myth کوئی myth نہیں ہے۔ یہاں واقعی کچھ نہ کچھ ہے۔ لیکن وہ کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچاتا۔“ شیردل کو اس سے بات کرنے کے بعد اچانک خیال آیا تھا کہ شاید اس نے کسی مافوق الفطرت چیز کا ذکر کر کے کچھ غلطی کی تھی کیونکہ عکس کو اس گھر میں اکیلا رہنا تھا لیکن پھر اسے خیال آیا تھا کہ وہ غلطی کوئی اتنی سنگین نہیں تھی۔ وہ جس عورت سے بات

36 ماہنامہ پاکیزہ جنوری 2012ء

کر رہا تھا اسے اس نے کم از کم اپنے سامنے اکیڈمی کے تمام عرصہ کے دوران کسی چیز سے خائف نہیں دیکھا تھا۔ اس کا نرم و نازک سراپا اتنی اعصاب رکھتا تھا۔ وہ اس سے اکیڈمی میں پہلی بار متاثر بھی ایسی ہی کسی چیز سے ہوا تھا۔

اکیڈمی کے دنوں میں کسی اسٹڈی ٹور کے سلسلے میں وہ لوگ قلعہ روہتاس گئے تھے وہاں سے واپسی پر انہوں نے ایک سرکاری ریسٹ ہاؤس میں لنچ کیا تھا۔ لنچ ابھی ارنج نہیں ہوا تھا اور اس کے انتظامات دیکھنے کے لیے ہی کچن میں دوسرے کامرز کے ساتھ انہوں نے کچن کا وزٹ کیا تھا اور کچن سے ملحقہ ڈائننگ ہال میں گھومتے ہوئے انہیں پتا چلا کہ وہاں یہ آزادی صرف سول سروس اکیڈمی میں زیر تربیت ان کے کامن کو نہیں تھی بلکہ ہر رنگ، سائز اور شکل کے بے خوف چوہوں کو بھی تھی جن میں اور شیردل سمیت دوسرے کامرز کی اس ریسٹ ہاؤس میں گھومنے پھرنے کی آزادی اور بے تکلفی میں صرف یہ فرق تھا کہ وہ ان کی طرح پشت کے پیچھے ہاتھ باندھ کر ادھر سے ادھر نہیں جا رہے تھے..... ورنہ انہیں کم از کم اس ریسٹ ہاؤس میں انسان نامی شے سے تو کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ جس اطمینان و سکون سے وہ تمام چوہے ان سب کی موجودگی کے باوجود اپنی اپنی روزمرہ کی سرگرمیوں میں مشغول تھے ان پر کامرز کو رشک آ رہا تھا اور رشک کی اس کیفیت کے دوران ہی مرد کامرز میں سے کسی نے ان چوہوں میں سے کسی ایک کو پکڑ کر لڑکیوں کو خوفزدہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

شیردل ویسے تو اس طرح کے پریکٹیکل جوکس میں شامل نہیں ہوتا تھا لیکن اس دن یہ عکس کو دوسری لڑکیوں کے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں ڈرتا ہوا بھاگتے ہوئے دیکھنے کی خواہش تھی جس نے اسے بھی اس پریکٹیکل جوک کا حصہ بنا دیا۔

چند چوہوں پر ریسٹ ہاؤس کے ملازمین کی مدد سے بڑی آسانی سے کپڑا ڈال کر قابو پایا گیا اس کے بعد انہیں ایک تھیلے نما بیگ میں منتقل کر دیا گیا اور لنچ کے بعد جب سب لوگ سویٹ ڈش سے محفوظ ہو رہے تھے تو ایک کامرز نے بڑے اطمینان کے عالم میں ٹیبل کے ایک کونے پر بڑی احتیاط سے باری باری وہ دو تین چوہے چھوڑ دیے تھے۔ ڈائننگ ہال میں دو تین ڈائننگ ٹیبلز کو جوڑ کر بہت لمبی چوڑی کھانے کی ٹیبل سجائی گئی تھی جس کے ایک سرے سے چوہوں نے بھاگنا شروع کیا۔ شروع کے چند قدموں کے بعد انہوں نے ٹیبل کے اطراف سے نکلنے کی کوشش کی لیکن دونوں اطراف میں لوگوں کی قطاروں کو دیکھ کر وہ کسی رکاوٹوں والی ریس میں شریک کھلاڑیوں کی طرح بالکل سیدھا بھاگنے لگے تھے۔ ڈوگلوں، چچوں، پلیٹوں، ڈشز کی رکاوٹوں کو برق رفتاری اور ہوشیاری سے پھلانگتے ہوئے ان چوہوں کے اچانک کہیں سے نمودار ہو جانے پر وہاں بیٹھے پاکستان کی مستقبل کی اسٹیل شمنٹ کو پہلے سکتہ ہوا، پھر ان میں سر اسیمبلی پھیلی اور پھر ہڑ بونگ اور چیخ پکار کا آغاز ہوا..... اور بھاگنے والوں میں پہلی صف میں وہ مرد کامرز تھے جنہیں اس منصوبے سے لاعلم رکھا گیا تھا۔ خواتین سے تو خیر چوہا نظر آنے پر اس کے علاوہ کسی اور رد عمل کی توقع کی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ کرسیاں الٹاتی، چیخ پلینیں اور گلاس گراتی..... بیگز اور سینڈلز کو پھینکتی..... دوپٹوں سے الجھتی چیخ پکار کے کورس کے ساتھ ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں تمام خواتین

ماہنامہ پاکیزہ جنوری 2012ء 37

کامنرز کمرے سے باہر تھیں۔ مرد کا منر ان سے پہلے ہی باہر بھاگ چکے تھے۔ ہاں میں اب ہنسی سے دوہرے ہوتے ہوئے ٹیبل کے ایک سرے پر کھڑے وہ چند کامنرز تھے جو اس پریکٹیکل جوک کے خالق تھے یا ٹیبل کے بالکل درمیان ایک کرسی پر کسٹروڈ پڈنگ کا ایک پیالہ ہاتھ میں لیے بیٹھی عکس مراد علی تھی جس کے سامنے سے اب وہ چوہے بھاگتے ہوئے گزر رہے تھے۔

وہ اس وقت کسٹروڈ پڈنگ کے چند آخری چیچ لے رہی تھی جب اس نے ٹیبل کے داہنی طرف چیچ پکار کے ساتھ افراتفری دیکھی اور اس افراتفری کی نوعیت جاننے کے لیے ٹیبل پر کچھ آگے کو جھک کر گردن موڑ کر اس نے داہنی طرف کی میز کے حصے کو دیکھا اور تب اس نے پہلی بار ٹیبل پر بے حد تیزی سے حرکت کرتی ان مٹخنی سی چیزوں اور ان چیزوں کے بیک گراؤنڈ میں کھڑے ہنسی سے بے حال شیردل اور چند دوسرے کامنرز کو دیکھا۔ صورت حال کو سمجھے بغیر جو پہلا کام اس نے کیا تھا وہ نہایت سرعت اور سکون کے ساتھ سویٹ ڈش کا اپنا پیالہ اٹھانا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی اس حرکت نے کسی کو حیرانی کا پہلا جھٹکا دیا تھا۔ جہاں چیچ، پلٹیں اور گلاس گرائے اور چھوڑ کر بھاگا جا رہا تھا وہاں وہ بڑے اطمینان کے ساتھ میز پر بھاگتے چوہوں کو کسٹروڈ پڈنگ کھاتے ہوئے دیکھنے لگی تھی یوں جیسے وہ وہیلڈن کے سینٹر کورٹ میں رائل گیلری میں بیٹھی گرینڈ سلام کا فائل دیکھ رہی تھی۔ شیردل اس کے انداز کے لیے اس سے اچھی analogy نہیں لاسکتا تھا۔ عکس نے اس کی امیدوں پر گھڑوں پانی ڈالا تھا۔ اس کے سامنے ٹیبل پر پڑے کسٹروڈ پڈنگ کے ایک باؤل کو خود کو اسپانڈر مین سمجھنے والے ایک چوہے نے پھلانگنے کی کوشش کی اور اس کوشش کے دوران وہ اس پلیٹ سے غراب سے باؤل کے اندر گرا جس پر سے وہ ہوا میں چھلانگ لگا کر بلند ہوا تھا۔ پڈنگ کے چند چھینٹے باہر آ کر گرے اور وہ بدحواسی کے عالم میں اس پڈنگ سے ٹکٹے کے لیے بری طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگا جو اس وقت اس کے لیے دلدل ثابت ہو رہی تھی اور اس کے سامنے بیٹھی ”شہد کی دلدل“ نے بے حد ہمدردی سے اسے دیکھا تھا۔ اپنے ہاتھ میں پکڑے پیالے میں موجود پڈنگ کا آخری چیچ بڑے پرسکون انداز میں منہ میں ڈالتے ہوئے شیردل نے عکس کو پڈنگ کا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے دیکھا پھر اسی سکون کے ساتھ اس نے ہاتھ بڑھا کر سرونگ اسپون ..... کے ساتھ باقی پڈنگ سے نبرد آزما چوہے کو باؤل سے نکالا اور بے حد احتیاط کے ساتھ ٹیبل پر چھوڑ دیا۔ چوہا سیکنڈز میں وہاں سے غائب ہوا تھا۔ اپنی گود میں رکھا ٹیبل نیپکن بے حد نفاست سے تہ کر کے ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ کرسی کے پائے کے قریب رکھا اپنا بیڈ بیگ اٹھائے ہوئے بڑے اطمینان کے عالم میں کرسی دھکیل کر ہال سے چہل قدمی کے انداز میں باہر گئی تھی۔ وہ اپنے جس Composure کے لیے گرد و پائس کے دوران مشہور تھی وہ Composure آج بھی حواس باختگی میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔ شیردل کو اگر عکس مراد علی کو ایک چوہا دیکھ کر بھاگتا نظر آنے کی تمنا تھی تو وہ تمنا پوری نہیں ہوئی تھی۔ اپنے حواس اور اعصاب پر قابو رکھنے کا اس سے بہترین ڈسپلے شیردل نے کسی عورت میں نہیں دیکھا تھا۔

اگر کوئی ایک چیز تھی جس کو چڑیا ڈی سی ہاؤس سے نکالے جانے کے بعد مس کرتی تھی تو وہ اس کے وہ سات ساتھی بونے تھے..... ٹوکو، کنویشنو، ٹوکو، کنفا، منفا، ڈیڈو..... جو اس رات اس گھر میں ہی رہ گئے تھے۔ کئی دن تو چڑیا کو ان کا خیال ہی نہیں آیا لیکن پھر آہستہ آہستہ اسے ان کا خیال آنے لگا تھا۔ وہ ایس تھی جسے اس کے ونڈر لینڈ سے نکال دیا گیا تھا اور لا کھ جانے کے باوجود بھی وہ اس ونڈر لینڈ میں دوبارہ نہیں جاسکتی تھی کیونکہ وہ اس ونڈر لینڈ کا رستہ بھول چکی تھی اور اس کے سات ساتھی اس ونڈر لینڈ سے باہر نہیں آسکتے تھے۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی چڑیا اب کسی طرح بھی اس ونڈر لینڈ اور اس میں بسنے والے اپنے سات ساتھیوں کا کوئی تصوراتی رابطہ اور تعلق بھی نہیں ڈھونڈ سکتی تھی۔ چڑیا وہ پاس ورڈ بھول گئی تھی جسے استعمال کر کے وہ اپنے تصورات کی اس خوب صورت دنیا میں دوبارہ رسائی حاصل کر سکتی۔ وہ سات بونے کام پر گئے تھے اور ان کی عدم موجودگی میں سنو واٹ زہروالا سیب کھا کر سو گئی تھی۔ چڑیا نے اپنی فیری ٹیل کا خاتمہ بھی نہیں کیا تھا۔ اپنے سات ساتھی بونوں سے بے پناہ شکایتیں رکھنے کے باوجود..... وہ کیوں اس کی مدد کو نہیں آئے تھے؟ انہوں نے کیوں اس کو اکیلا چھوڑ دیا تھا؟ انہوں نے کیوں اس کے ساتھ وہ سب کچھ ہونے دیا جو ہوا تھا؟ گلے شکوؤں کی ایک لمبی فہرست تھی جنہیں دل میں لیے چڑیا بہت دیر تک ان ساتوں سے خفا رہی تھی لیکن پھر وہ گلے شکوے آہستہ آہستہ خود ہی ختم ہو گئے تھے۔ وہ اب صرف بے حد رنجیدگی سے انہیں مس کرتی تھی۔ اس کی تصوراتی دنیا میں اب کوئی جیتا جاگتا ساتھی نہیں تھا اور اس تنہائی نے چڑیا کو اکیلا ہی نہیں خاموش بھی کر دیا تھا۔ اکیلے بیٹھ کر اپنے آپ اور کنفا، منفا سے باتیں کرنے کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ کھیل کود اور ان کو اپنے پورے دن کی سرگرمیوں کا بتا کر ان کے قصے سننے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔

خیر دین حلیمہ، چڑیا اور وہ بچا کچھا سامان لیے تھانے سے رہائی کے اگلے ہی دن اپنے گاؤں واپس چلا گیا تھا۔ جہاں اس کی اور چڑیا کی رسوائی کی داستان اس کی آمد سے بھی پہلے پہنچ چکی تھی۔ شہر میں اب اردلیوں، نائب قاصدوں، مالیوں اور چوکیداروں کے طور پر سرکاری اداروں میں گاؤں کے بہت

سارے لوگ کام کر رہے تھے اور خیر دین کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ان تمام واقعات کو گاؤں اور وہاں موجود اپنے خاندان تک پہنچنے سے روک پاتا، چھپا سکتا..... اور ایسا ممکن ہوتا تب بھی خیر دین اپنے خاندان سے یہ بھی نہیں چھپانا چاہتا تھا وہ اپنے خوئی رشتوں کے کندھوں پر سر رکھ کر رونا چاہتا تھا، اس اذیت اور تکلیف کو ان کے ساتھ بانٹنا چاہتا تھا جو وہ کسی کے ساتھ نہیں بانٹ پایا تھا۔

گاؤں پہنچنے کے بعد خیر دین کا پہلا کام اپنے گھر کے دروازے پر لگی وہ سختی اتارنے کا تھا جو پچھلی کئی دہائیوں سے اس کے گھر کے دروازے پر لگی گاؤں میں اس کے خاندان کی عزت اور پہچان کا باعث تھی اور اس سختی کے اترتے ہی گاؤں میں خیر دین کے نام اور خاندان کا دب دبہ بھی ختم ہو گیا تھا، وہ اب پھر سے کمیں ہو گئے تھے۔ وہ کمیں جو شاہ کے کتے تھے اور شاہ کی وجہ سے اپنی اوقات بھول بیٹھے تھے۔ سرکاری نوکری اور اس نوکری کے ساتھ ملنے والی تمام مراعات گنوا کر خیر دین زندگی میں پہلی بار خالی جیب اپنے گاؤں اور گھر پہنچا تھا۔ ساری عمر وہ جب بھی چھٹی پر گھر آتا رہا اس کے گھر ملنے کے لیے آنے والوں کا تاننا بندھا رہتا..... گاؤں کے لوگ اور قریب اور دور کے رشتے دار اس کے پاس چھوٹے موٹے کاموں کے لیے یوں رقعے اور چٹھیاں لے کر آتے جیسے وہ ڈی سی کا خانساں نہیں خود ڈی سی تھا اور خیر دین وہ ساری چٹھیاں اور رقعے اکٹھے کرتا انکی چھٹی تک واقعی ایک ایک کر کے ان تمام درخواستوں پر عمل درآمد کے لیے اپنے صاحب اور صاحب کے جاننے والے دوسرے صاحبوں سے سفارش کروا تا پھر تا..... اور خیر دین کے کہنے پر کام ہوتا تھا تو گاؤں میں خیر دین کے خاندان کے سر پر ایک اور قلنی کا اضافہ ہو جاتا تھا۔

اب وہی خیر دین لئے پئے حال میں واپس آیا تھا۔ اس سے ملنے کے لیے آنے والوں کا تاننا اب بھی اسی طرح بندھا ہوا تھا لیکن اب وہ سب لوگ تماشا یوں کا روپ دھار کر وہاں آئے تھے..... یہ دیکھنے اور سننے کے لیے کہ خیر دین آسمان سے زمین پر کس طرح آیا تھا..... اور زمین پر آنے کے بعد اس کی حالت کیا تھی۔ خیر دین جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا وہاں سانپ میٹھی کا کھیل دیکھ کر خوش ہونے والوں کی بڑی تعداد تھی جن کے لیے دوڑ میں سب سے آگے بھاگنے والے کو فٹنگ لائن کے قریب پہنچنے سے پہلے منہ کے بل گرتے دیکھ کر تالی بجا کر اٹھنے والوں کی تعداد اس کی شاندار رفتار اور کارکردگی کو دیکھ کر داد و تحسین دینے والوں سے کہیں زیادہ تھی۔ خیر دین اب ان جیسا ہو گیا تھا۔ ان سب کی طرح اور یہ امر باعث اطمینان تھا۔ چار جملے اس سے ہمدردی اور ڈی سی اور حکومت پر ملامت کے بعد وہ سب جس ایک احساس کے ساتھ خیر دین سے مل کر رخصت ہوتے وہ یہی اطمینان تھا۔ ان کے اس یقین میں اضافہ ہوتا کہ لاکھ پڑھ لکھ لو، کچھ نہیں ہوگا۔ ان کے طبقے کے حالات نہیں بدلتے اور نہیں بدلیں گے۔ وہ خدمت اور ذلت کے لیے پیدا ہوئے تھے اور یہی دو کام کرتے مرجائیں گے۔ اب خیر دین کو ہی لے لو ساری عمر سرکار کی خدمت کر کے اتنا پڑھ لکھ کے بھی کیا مل گیا اسے، خود بھی خوار ہوا اور بچی کی زندگی بھی برباد کر دی۔ اس سے تو اچھا تھا کہ گاؤں میں اپنی بھٹی پر بیٹھتا یا زمیندار کا مزارعہ بن جاتا یا پھر اپنی ہی

خاندانی زمین پر کاشت کاری کر لیتا..... وال روٹی تو اس سے بھی چل ہی جاتی۔ خیر دین ان سب کے لیے اپنی زندگی کو بہتر کرنے کے لیے جدوجہد نہ کرنے کے حق میں دی جانے والی ایک سنہری مثال بن گیا تھا۔

آہستہ آہستہ خیر دین کے گھر آنے والے لوگوں کی تعداد میں کمی ہونا شروع ہو گئی تھی اور اس کمی کے ساتھ ساتھ خیر دین کے خاندان والوں میں بھی اس کے اور حلیمہ اور چڑیا کے لیے دکھائی جانے والی ابتدائی ہمدردی اور گرم جوشی بھی ختم ہوتی گئی تھی۔ خیر دین اس سے پہلے ساری عمر انہیں دینے والا تھا اب ان سے لینے والا بن کر پلٹا تھا۔ ایک کمرے اور دو وقت کی روٹی کے علاوہ خاندان والوں کے پاس خیر دین کو دینے کے لیے کچھ نہیں تھا اور خود خیر دین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گاؤں میں کیا کرے یا کیا کر سکتا تھا۔ بھٹی پر وہ نہیں بیٹھ سکتا تھا، نہ تو اسے اس کام کا تجربہ تھا اور نہ ہی ساری زندگی سرکاری نوکری کرنے کے بعد وہ اس مشقت والے کام کے قابل رہا تھا۔ واحد کام جو وہاں وہ کر سکتا تھا وہ کاشت کاری تھی اور اس کے لیے زمین چاہیے تھی۔ اس کے ماں باپ کی طرف سے وراثت میں ملنے والی زمین کا رقبہ اس کے تمام بھائی مشترکہ طور پر کاشت کرتے تھے۔ زمین کا وہ چھوٹا سا ٹکڑا اس مشترکہ خاندانی کاشت کاری کے نتیجے میں صرف اس قابل ہو سکا تھا کہ پورے خاندان کو سال بھر کا اناج دے دیتا یا پھر اتنی سبزی پیدا کر دیتا جو اس کے بھائی، ہر روز قریبی شہر کی منڈی میں ریڑھے پر لا کر بیچ آتے اور اس سے ملنے والی رقم سے ان کے اور زمین کے اخراجات پورے ہوتے رہتے۔ سبزی کی فروخت سے ملنے والی وہ رقم پہلے ہی بہت سارے حصوں میں تقسیم ہونے کے بعد کبھی بھی ہر روز کسی کے حصے میں آنے والے چند سو سے زیادہ نہیں بڑھتی تھی اور ان چند سو میں سے بھی کچھ اور کمی کرنے کے لیے خیر دین کو حصہ دار بنانے کا فیصلہ خاندان کے ہر شخص کے لیے مشکل تھا۔ وہ اس حصہ داری کے بجائے صرف اس بات پر آمادہ تھے کہ خیر دین کی تین وقت کی روٹی مختلف بھائیوں کے چوٹھوں پر تقسیم کر دی جاتی۔ خیر دین نے سرکاری نوکری کے دوران گاؤں میں ہی تھوڑی اور زمین خریدی تھی لیکن اپنے ماں باپ کی محبت میں اس



نے زمین کے اس ٹکڑے کو بھی اپنے بھائیوں کو کاشت کاری کے لیے سونپ دیا تھا۔ زمین کا وہ ٹکڑا اس کے بھائیوں کے زیر استعمال ہونے کے باوجود اس کے اپنے نام تھا۔ گاؤں میں واپس آ جانے کے چند ہفتوں میں ہی خیر دین کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ خاندانی زمین میں سے فوری طور پر کسی قسم کا کوئی مالی فائدہ ملنا مشکل تھا لیکن وہ اپنی ملکتی زمین کو اپنے زیر استعمال لے آتا تو فوری طور پر اس کے بہت سارے مالی مسائل حل ہو سکتے تھے۔ اپنے بھائیوں سے اس نے ایک شام اس زمین کو واپس لینے کی خواہش کا اظہار کیا اور اگلے دن وہ جس گھر میں رہ رہا تھا وہ اس کے خونی رشتوں کا نہیں رہا تھا۔ ایک ہی رات میں ان سب کی نظریں بدل گئی تھیں۔ خیر دین نے ایسی بے گانگی اور بے رخی پہلے نہیں دیکھی تھی۔ وہ خیر دین کو اس گھر میں رکھنے پر تیار تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی خیر دین کو اس کی زمین واپس کرنے پر تیار نہیں تھا۔ وہ اس کا جائز حق ہوتا نہ ہوتا..... خیر دین جن حالات سے گزر رہا تھا ان میں اس کے لیے یہ مزید ایک صدمہ اور دھچکا تھا۔ اپنوں سے ملنے والے زخم قہور کے زہر کی طرح ہوتے ہیں۔ شہر سے خیر دین مر کے آیا تھا اور خاندان والوں نے اسے دفن کر دیا تھا۔ ایسا بوجھ اس نے کبھی زندگی میں نہیں اٹھایا تھا۔ ایسا محتاج اور کمزور خیر دین کبھی نہیں پڑا تھا۔ وہ اپنے بھائیوں سے زمین کا مطالبہ کر سکتا تھا لیکن ان سے لے نہیں سکتا تھا کیونکہ ان کے ساتھ ان کے بیٹے کھڑے تھے اور بھتیجیوں کی اس لمبی فوج سے خیر دین ٹکر نہیں لے سکتا تھا۔ زندگی میں وہ پہلا موقع تھا جب خیر دین کو ایک بیٹا نہ ہونے کا دکھ ہوا تھا..... بیٹے شاید ایسے موقعوں کے لیے ہی مانگے جاتے ہیں۔

خیر دین روز زمین پر جاتا..... بھائیوں اور بھتیجیوں کے منہ نہ لگانے کے باوجود ڈھیوں کی طرح ان کے ساتھ کام کرتا پھر شہر جا کر سبزی بیچتا..... اور اس ساری مشقت کے عوض کوئی اسے پچاس سو پکڑا دیتا۔ وہ چند نوٹ ہاتھ میں لے کر خیر دین خون کے آنسو روتا۔ اس پر چڑیا اور حلیمہ کی ذمہ داری نہ ہوتی تو وہ مرجاتا لیکن کبھی اس طرح حق کے بجائے بھیک نہ لیتا لیکن اس کی زندگی میں موجود دو عورتوں نے اسے بہت کمزور کر دیا تھا..... مجبور، کمزور اور بے بس۔

چڑیا اپنے نانا کی اس بے بسی کی داستان کی عینی شاہد تھی۔ ایک بچہ انسانوں کے عروج اور زوال کی سائیکل کو نہیں سمجھتا۔ اپنے ارد گرد سب کچھ اچھا دیکھ کر وہ یہی سمجھتا ہے کہ دنیا بس ایسی ہی اچھی ہوتی ہے اور ایسی ہی رہے گی اور اپنے آپ کو برے حالات میں بھی دیکھ کر اس کی سوچ یہی ہوتی ہے۔ چڑیا نے اس گاؤں میں خیر دین کا عروج و زوال، عروج و زوال سے واقف ہوئے بغیر دیکھا تھا اور خیر دین کے ساتھ اس نے اپنا عروج و زوال بھی دیکھا تھا، وہ خیر دین کے ساتھ چھٹی پر گاؤں آتی تو وہاں اس کا بھی شاندار استقبال ہوتا تھا۔ وہ جتنے دن وہاں رہتی شاہانہ انداز میں رہتی کیونکہ وہ خیر دین کی نواسی تھی۔ انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتی تھی اور خیر دین کی طرح انگریزی بول سکتی تھی اور ہمیشہ فرسٹ آتی تھی۔ وہ فرائیڈ تھی اور اپنے خاندان کے تمام بچوں سے زیادہ اچھی اور مہنگی چیزیں تھیں اس کے پاس۔ رہنر تھے، گھڑی تھی، بالیاں تھیں، بوٹ بھی تھے۔ وہ دوسرے بچوں کی طرح مسواک اور دندا سے سے دانت صاف نہیں کرتی تھی تو تھ پیسٹ کرتی تھی اور وہ اپنے بالوں کو دیسی صابن سے رگڑ رگڑ کر نہیں دھوتی تھی

بلکہ شیمپو کرتی تھی۔ وہ اپنے بالوں میں برش کرتی تھی اور پاؤڈر اور کریم لگاتی تھی۔ وہ چاول ہاتھ سے نہیں کھاتی چیچ سے کھاتی تھی، شیشے کے گلاس میں پانی پیتی تھی اور اس کے پاس ایسے کھلونے تھے جو گاؤں میں کبھی کسی نے دیکھے تک نہیں تھے۔ خیر دین نے چڑیا کو میم صاحب کی طرح پالا تھا اور چڑیا اور چڑیا کا رہن سہن پورے خاندان کے بچوں کو اس پر رشک کرنے پر مجبور کر دینے کے لیے کافی تھا۔

اور اب وہ میم صاحب ایک تماشے کی صورت میں ان کے بیچ واپس آئی تھی۔ اس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں دنوں میں ہر جگہ پھیل گئی تھیں اور انہیں پھیلا نے میں خیر دین کے اپنے خاندان کا زیادہ حصہ تھا۔ چڑیا کے سامنے نیچے چڑیا کے بارے میں اس کو دیکھتے ہوئے سرگوشیاں کرتے یا اسے عجیب مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے..... اسے اپنے جیسا بلکہ اپنے سے زیادہ بری حالت میں دیکھنا خاندان کے بچوں سے زیادہ ان کے ان بڑوں کو خوشی اور تسکین پہنچا رہا تھا جو اس سے پہلے اسے دیکھ کر اپنے بچوں کے حوالے سے مزید حسرتوں کا شکار ہو جاتے تھے۔

وہاں آنے کے چند دن کے بعد ہی خیر دین نے اسے گاؤں کے اسی اسکول میں دوبارہ داخل کروادیا جہاں سے اس نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا۔ چڑیا اس دن پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ اسے اس کانٹنٹ سے بہت پیار تھا جہاں وہ پڑھ رہی تھی وہاں اس کی فرینڈز تھیں فیورٹ ٹیچرز تھیں اور باربی ڈول بھی تھی۔ اس کی تصوراتی دنیا پہلے ہی جیتے جاگتے کرداروں سے محروم ہو چکی تھی اب اس کی حقیقی دنیا بھی ان تمام لوگوں سے محروم ہو گئی تھی جن سے وہ پیار کرتی تھی۔

گاؤں کے اسکول میں گزارے ہوئے چند ہفتے چڑیا کی زندگی کا ایک اور بے حد تکلیف وہ تجربہ تھا۔ وہ چھوٹا سا گاؤں چڑیا کے ساتھ ہونے والے واقعے سے آگاہ تھا اور اسکول میں آنے والا ہر بچہ بھی چڑیا کو جیسے اسی حوالے سے پہچانے اور اس میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ پہلے ہی دن اس کی ایک ٹیچر نے اسے اسٹاف روم میں بلوا کر وہاں تمام ٹیچرز کے درمیان ڈی سی ہاؤس میں ہونے والے واقعے کے بارے میں اسے کریدنا شروع کر دیا۔ وہ خوف سے اسی طرح گنگ ہو گئی تھی جس طرح اس واقعے کے بارے میں کسی کے بھی سوالوں سے ہو جاتی تھی اور اس کی خاموشی نے جیسے ان ٹیچرز کو Irritate کیا تھا۔ چڑیا پہلے دن ہی اپنی ٹیچرز پر ایک برا تاثر چھوڑ کر آئی تھی جو اس کے اس اسکول میں آخری دن تک قائم رہا تھا۔

اس کی ٹیچرز کا وہ تجسس صرف ایک ابتدا تھی اس کے بعد کے ہفتوں میں چڑیا نے اپنی ہم عمر بچیوں اور ٹیچرز کی طرف سے بدترین جنسی سوالات اور darassment کا سامنا کیا تھا۔ اس کی اپنی کلاس کی بچیوں سے لے کر بڑی کلاسز کی بچیوں تک ہر ایک کو چڑیا سے اس واقعے کی تفصیلات جاننے کے لیے ایک عجیب سا تجسس اور بے چینی رہتی تھی۔ وہ کسی فری چیریڈ یا لنچ بریک کے دوران اسکول کے میدان میں بڑی کلاسز کی بچیوں سے چھپتی پھرتی جو اسے گروپ کی شکل میں گھیر لیتیں اور پھر ان سے انتہائی بے ہودہ سوالات کرنا شروع کر دیتیں..... ایسے سوالات جن پر چڑیا کبھی خوفزدہ ہوتی تو کبھی شرم سے سرخ اور کبھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔ اس اسکول میں اس کا کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا جب وہ دن میں کم

ازم ایک بار کسی بچی یا بچہ کی وجہ سے رو نہ پڑتی ہو۔

اور اسکول میں اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ خیر دین نہیں جانتا تھا۔ چڑیا جو ہمیشہ اپنے اسکول میں ہونے والی ایک ایک بات خیر دین کو بتایا کرتی تھی اب اس واقعے کے حوالے سے کچھ بھی خیر دین کو بتانے سے ڈرتی اور جھجکتی تھی۔ اسکول سے اب اسے خیر دین کے بجائے حلیمہ لینے آتی تھی اور وہ حلیمہ کے سامنے اترے چہرے کے ساتھ اسکول سے برآمد ہوتی اور خاموشی سے اس کے ساتھ گھر کے رستے پر چل پڑتی۔ پورے دن میں وہ پہلا موقع ہوتا تھا جب وہ خوف و ہراس کی اس کیفیت سے باہر آتی تھی اور جب وہ سر اٹھا کر رستے میں آنے والے کسی شخص کو دیکھ سکتی تھی، سر اور نظریں جھکائے نہیں چلتی پھرتی تھی۔ حلیمہ نے بیٹی کے اترے چہرے کو دیکھ کر پریشان ہونا یا سوال کرنا چھوڑ دیا تھا۔ زندگی میں اب اتنے مسئلے ہو گئے تھے کہ چڑیا کی اداسی اور ناخوشی جیسا مسئلہ بہت پیچھے چلا گیا تھا۔

چڑیا اسکول والے عقوبت خانے سے گھر والے چھوٹے سے عقوبت خانے میں آ جاتی جہاں باقی کا سارا دن وہ اس کمرے میں ہی بیٹھے بیٹھے گزار دیتی جس میں حلیمہ اور خیر دین کی رہائش تھی۔ وہ وہیں ہوم ورک کرتی وہیں کھانا کھاتی اور پھر وہیں اپنے کھلونے یا کہانیوں کی کوئی کتاب نکال کر بیٹھ جاتی اور اس طرح ایک اور دن گزار جاتا۔ خیر دین شام کو گھر آتا تھا اور اتنا تھکا ہوا ہوتا تھا کہ اس کے لیے چڑیا یا حلیمہ سے بات کرنے کے لیے بھی وقت نہیں ہوتا تھا۔ اسکول کی پڑھائی اتنی آسان تھی کہ خیر دین کو پہلے کی طرح اسے پڑھانے کی جدوجہد میں خود کو ہلکان نہیں کرنا پڑتا تھا۔ وہ اب بھی چڑیا کی ہر چیز کا خیال کرتا تھا اس کے کھانے پینے کا لباس کا..... اب بھی وہی اس کی پونی یا چٹیا کر کے اسے صبح اسکول چھوڑ کر آتا تھا لیکن بس اس میں فرق یہ آیا تھا کہ اب اس نے اپنی پروا کرنی چھوڑ دی تھی۔ وہ بالوں کو نہیں رنگتا تھا اب، نہ ہی کپڑے استری کر کے پہنتا تھا..... نہ اپنی ڈاڑھی باقاعدگی سے منڈواتا تھا اور چڑیا کو خیر دین پر ترس آتا تھا اسے لگتا تھا خیر دین کے اس حلیمہ کی ذمہ داری بھی وہی ہے اس نے اپنے نانا کو اتنا بوڑھا کر دیا تھا۔ سب کچھ شاید اسی طرح چلتا رہتا اگر چڑیا زندگی میں پہلی بار امتحان میں فیل نہ ہو جاتی اور اس کی ناکامی خیر دین کے لیے جیسے ہارٹ ایک سے کم نہیں تھی۔ وہ بے یقینی کے عالم میں رزلٹ کارڈ میں تقریباً ہر مضمون کے نیچے لگی سرخ لکیر کو دیکھتا رہا۔ سہ ماہی امتحان کا نتیجہ لینے وہی اسکول گیا تھا اور رزلٹ کارڈ کو دیکھ کر ہونے والی بے یقینی اس کے سپر زکو دیکھ لینے کے باوجود بھی قائم رہی تھی۔ اس کے برابر کھڑی چڑیا سر جھکائے نظریاؤں پر جمائے ہوئے اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہی تھی اور اس کی کلاس میچر خیر دین کو چڑیا کی شکایت پر شکایت لگا رہی تھی۔ خیر دین گم صم اس کو لیے اسکول سے آ گیا تھا۔ اس نے رستے میں چڑیا سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔

گھر آ کر اس نے گاؤں آنے کے بعد پہلی بار چڑیا سے اسکول کے حوالے سے بات کی۔ ”تم پڑھنا نہیں چاہتیں چڑیا؟“ چڑیا نے نفی میں سر ہلادیا خیر دین کو یقین نہیں آیا۔

”تم پڑھو گی نہیں تو کیا کرو گی؟“ چڑیا بے اثر چہرے کے ساتھ خیر دین کو دیکھتی رہی۔

”میں نے تم پر کتنی محنت کی ہے چڑیا۔“ اس نے جیسے بے بس سے انداز میں چڑیا سے زیادہ خود سے

کہا تھا۔

”یہ اسکول مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ بہت دیر کے سوال جواب کے بعد چڑیا کے منہ سے بالآخر نکلا۔

”کیوں؟“ خیر دین حیران ہوا۔

”یہاں سب مجھ سے غلط سوال کرتے ہیں۔“

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ خیر دین دھک سے رہ گیا تھا اسے تو یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ چڑیا کو اسکول میں ایسا کوئی مسئلہ ہو سکتا تھا۔ اس نے چڑیا سے غلط سوالوں کی نوعیت دریافت نہیں کی تھی، اسے اندازہ تھا وہ سوال کیسے ہوں گے۔

اس رات خیر دین نے بیٹھ کر ایک بار پھر سوچا تھا کہ اسے کرنا کیا ہے..... وہ وہیں گاؤں میں رہے یا پھر شہر کو پلٹ جائے اور شہر کو پلٹ جانے کا مطلب اس معاہدے کی خلاف ورزی تھی جو وہ ڈی سی کے ساتھ کر کے آیا تھا۔ چڑیا اس کی زندگی کا فوکس تھا اس نے آج تک جو کچھ کیا تھا چڑیا کے لیے کیا تھا۔ اس کو آگے بھی جو کچھ کرنا تھا چڑیا کے لیے ہی کرنا تھا۔

☆☆☆

باربی ڈول نے چند ایک بار ہوم ورک کرتے ہوئے اپنی می کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس کی می فون پر اس کی دادی سے بات کر رہی تھی اور بات کرتے ہوئے مکمل طور پر مگن تھی۔

”جی می بس ایک ہفتے تک شفٹ ہو جائیں گے۔“ باربی ڈول کی می نے مسکراتے ہوئے اپنی ساس سے کہا تھا۔

”چلو اچھا ہے..... حبیب نے سیکرٹری کے پیچھے پڑ کر پوسٹنگ کروائی ہے اس بار اور وہ بھی صرف تمہاری وجہ سے ورنہ حبیب کہاں اس چیز پر believe کرتے ہیں کہ ایک جگہ پر مدت مکمل کیے بغیر کسی دوسری جگہ ٹرانسفر کروائی جائے۔“ اس نے ساس کی باقی بات پر دھیان نہیں دیا۔

”میری وجہ سے؟ میری وجہ سے کیوں می؟“ اس نے ساس سے کہا۔

”تم نے ہی تو کہا تھا ٹرانسفر کے لیے..... تم کمفرٹبل نہیں تھیں گھر میں..... انہی یونوں وغیرہ کی وجہ سے..... کہہ رہا تھا کہ گھر میں پھر کچھ عجیب و غریب واقعات ہونے لگے ہیں۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنی ساس کو کیا جواب دے۔ وہ اس وقت حیرت کے ایک شدید جھٹکے کا شکار تھی۔ اس کے شو ہرنے یہ امپریشن دے کر اس کے سر سے اپنی ٹرانسفر کے لیے سفارش کروائی تھی کہ اسے اس گھر میں مسائل ہو رہے تھے۔ حالانکہ وہ پرسائل اب پرانی بات ہو چکی تھی وہ ان سب چیزوں کے ساتھ اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر چکی تھی، یہ اب اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں رہی تھی..... اور ابھی حال ہی میں تو ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا جس کی شکایت اس نے اپنے میاں سے کی ہو، پھر اس کے شو ہر کو اچانک اس طرح بیٹھے بٹھائے کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس نے اپنی بیوی کا نام استعمال کیا۔ اس نے ساس سے کوئی تردید نہیں کی تھی اور موضوع بدل کر بات کرنے لگی لیکن وہ بری طرح الجھ گئی تھی اور جب

دس منٹ بعد فون رکھ کر وہ باربی ڈول کی طرف متوجہ ہوئی تو باربی ڈول بھی بے حد بیزار بیٹھی تھی۔  
 "Mummy I need to tell you something"  
 اس نے فون سے فری ہوتی ہوئی ماں کو اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر کہا۔  
 "ہاں بتاؤ۔" اس کی کلاس ورک کی نوٹ بک اٹھاتے ہوئے اس کی مٹی نے اس سے کہا۔  
 "بابا آج اسکول آئے تھے۔" وہ نوٹ بک پر نظر دوڑاتے ہوئے چومک گئیں۔  
 "بابا آئے تھے؟" اس نے حیرانی سے باربی ڈول سے پوچھا۔ اس نے سر ہلایا۔  
 "لیکن وہ مجھ سے نہیں ملے..... ان کو ملنا چاہیے تھا نامی۔" باربی ڈول نے اسے بتایا پھر ساتھ ہی شکایت کی۔

"تم سے نہیں ملے تو پھر تمہیں کس نے بتایا؟" اس نے سنجیدگی سے باربی ڈول سے پوچھا۔  
 "مجھے ٹیچر نے بتایا۔" "He had a fight with sister" وہ باربی ڈول کی بات پر کچھ لمحے ہل نہیں سکی پھر اس نے بے یقینی سے کہا۔  
 "Your Papa had a fight with sister"  
 "yes۔" باربی ڈول نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔  
 "which sister?"  
 "Sister Agnus" وہ اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔  
 "اور مئی پاپا نے سسٹر سے کہا تھا کہ چڑیا کو اسکول سے نکال دیں۔" باربی ڈول نے روانی سے لیکن کچھ بے چینی سے کہا۔

☆☆☆

فاطمہ نے ایک کو اپنی ڈبیٹ کا آغاز کرنے کے لیے اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس کا نام اناؤنس ہونے سے لے کر اب تک وہ اس سے اپنی نظریں نہیں ہٹا پائی تھی۔ اپنی ڈبیٹ کا کاغذ ہاتھ میں لیے وہ ایک بت کی طرح بیٹھی اس کی تین منٹ کی تقریر سنتی رہی تھی جس کے دوران ہال کئی بار تالیوں سے گونجا تھا اور کئی دفعہ حاضرین کے چہروں پر مسکراہٹیں آئی تھیں۔ صرف وہ تھی جس نے نہ تالی بجائی تھی نہ وہ مسکرائی تھی۔ وہ گم صم اسے دیکھتی رہی تھی۔ وہ اسٹیج سے تالیوں کی گونج میں نیچے اترتا تھا اور اپنی ٹیم کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ فاطمہ کو اب اپنے ادارے کی ٹیم کو لیڈ کرنا تھا اور اب ان کی ٹیم کی باری تھی اور میزبان ٹیم ہونے کی حیثیت سے وہ تالیوں سے گونجتے ہال میں اپنا نام لیے جانے پر اپنی کرسی سے اٹھی تھی۔ اس کے ادارے کے اسٹوڈنٹس اور ٹیچرز کے تالیاں بجاتے ہاتھوں میں پہلے سے بھی زیادہ جوش آگیا تھا۔ وہ اپنے ادارے کی سب سے بہترین ڈیٹیٹر تھی اور جہاں وہ ہوتی وہاں پہلی پوزیشن کہیں اور نہیں جاسکتی تھی..... تو آج بھی وہ سارے اس ہال میں اسی اندھے اعتماد اور یقین کے ساتھ بیٹھے تھے..... صرف سیڑھیاں چڑھتی فاطمہ تھی جو اس اعتماد اور یقین سے محروم تھی۔

اپنے تئیں ہوئے جسم کو حتی الامکان ریلیکس کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے پہلی بار اس آئینے کو دیکھا، وہ اب بھی ویسے ہی وہاں کھڑا تھا۔ اپنے اسی استقبالی، خیر مقدمی انداز میں..... اسی غرور اور طغیانی کے ساتھ..... اسی پُراسراریت میں لپٹے جس نے پہلی بار اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ برآمدے میں قدم بڑھاتے ہوئے اس نے آئینے پر ایک نظر اور دوڑائی تھی۔

اس گھر میں اس کی آمد 26 سال بعد ہوئی تھی اور ان 26 سالوں کو اس نے جیسے ایک مونوسکینڈ میں calculate کر لیا تھا۔ گھر کے اندرونی دروازے کو اس کے انتظار میں کھڑے ملازم نے کھولتے ہوئے اسے سلام کیا تھا۔ اس نے سانس روک کر اس دروازے سے اندر قدم رکھا تھا۔ اس کا ماتحت عملہ اس کے ہمراہ تھا۔ اس کا پی اے اس گھر کی تفصیلات سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا وہ اسے روک دے۔ اسے اس گھر کے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ گھر اس کی یادداشت کا انٹ حصہ تھا جسے کھرچ کھرچ کر مٹا دینے کی ہر کوشش ناکام رہی تھی۔

ہال میں پہنچ کر چند لمحوں کے لیے اس کے قدم فریز ہو گئے تھے۔ وہ سیڑھیاں اب اس کے سامنے تھیں۔ سیڑھیاں، چیمیں اور.....

”وہ وہاں کچن کا دروازہ ہے۔“ پی اے کا جملہ اسے جیسے کرنٹ کی طرح لگا تھا جو اسے حال میں واپس لے آیا تھا۔ اس نے چونک کر ان سیڑھیوں سے نظریں ہٹائیں اور پی اے کو دیکھا۔

”پانی مل سکتا ہے؟“ اپنے اعصاب اور حواس پر بیک وقت قابو رکھنے کی کوشش میں اس نے لگا تار بولتے پی اے کو ٹوکا۔ پی اے فوری طور پر اس کی پیاس بجھانے کے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ اسے اپنے گرد جو خاموشی چاہیے تھی وہ چند منٹوں کے لیے ہی سہی لیکن مل گئی تھی۔ جسم میں سے گزرتی خوف کی ایک لہر کو اس نے جیسے خود کو ساکت رکھتے ہوئے earth کیا۔ غیر محسوس انداز میں اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں کھینچتے ہوئے اس نے ایک نظر اپنی کلائی پر ڈالی۔ اس کے روٹھے کھڑے ہو رہے تھے۔ اسی غیر محسوس انداز میں ہاتھ جھٹکتے اور نظریں چراتے ہوئے اس نے پانی کا وہ گلاس تھا جو اس کے سامنے ایک ٹرے میں پیش کیا گیا تھا۔ اس نے ایک سانس میں وہ گلاس خالی کیا تھا۔ وہ گھر اسے کس طرح ہیبت زدہ کرنے والا تھا یہ اس کے لیے کوئی اجنبی بات نہیں تھی۔ اس نے وہاں پوسٹ نہ ہونے کی مقدور بھر کوشش کی تھی مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ آسیب زدہ گھر 26 سالوں کے بعد جیسے اسے ایک بار پھر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

”مجھے اس گھر کو ایک نظر دیکھنے دیں۔“ پی اے نے اس کے پانی کا گلاس رکھتے ہی دوبارہ بولنا شروع کیا ہی تھا..... کہ اس نے اسے ٹوک دیا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ ماتحت عملے نے کچھ حیران نظروں کا تبادلہ کیا لیکن پھر کچھ کہے بغیر اس کے ہمراہ ہو لیے۔

گھر بہت تبدیل ہو چکا تھا لیکن وہاں موجود پرانی چیزوں میں سے کوئی بھی ایسی نہیں تھی جسے اس نے ایک ہی نظر میں نہ پہچان لیا ہو۔ اسے رہائشی عمارت کا جائزہ لینے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس گھر نے اس کی زندگی میں ideal اور idealism نام کی چیز کو چھین لیا تھا اور بہت سارے سوال دے دیے تھے جنہیں

اس کا دماغ بہت سالوں تک کھوجتا رہا..... الجھتا رہا..... ناکام ہوتا رہا..... اور پھر جب بالآخر اسے جواب ملا تھا تو بے یقینی کی ایک عجیب سی کیفیت نے اگلے کئی سال اسے اپنے حصار میں رکھا اور بے یقینی وہ واحد شے نہیں تھی جو بہت عرصے اس کے ہمراہ رہی تھی..... ایک ناقابل بیان اذیت بھی، شرم اور دکھ کا ایک عجیب احساس بھی اور ان تمام احساسات کے درمیان وہ ایک چہرہ بھی جو اپنی آنکھوں میں خوف اور دہشت لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ صرف چند سیکنڈز کے لیے ملنے والی وہ نگاہ جس کا تصور بھی اسے ٹھنڈے پسینے دلانے کے لیے کافی تھا۔

اوپر والے فلور کے تقریباً تمام کمرے لاکڈ تھے۔ اس نے کسی کمرے کو نہیں کھلوا یا۔ وہاں اب ایسا کچھ نہیں تھا جسے دیکھنے کی اسے خواہش تھی۔ اس گھر کا ماسٹر بیڈروم بھی لاکڈ تھا اور صرف وہ واحد کمرہ تھا جس کے دروازے کے باہر اس کے قدم چند لمحوں کے لیے فریز ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اس کمرے میں جانے کی شدید خواہش نے اسے آن گھیرا تھا پھر اس نے اسی رفتار سے اس خواہش کو جھٹک دیا تھا۔

”باہر چلتے ہیں۔“ اس نے جیسے منٹوں میں عمارت کے اندر دنی جائزے کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ وہاں اندر کھڑے بہت سی چیزوں اور یادوں کا ایک سیلاب تھا جو اسے بہائے لیے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے وجود کو غرق ہونے سے بچانے کی جیسے ایک اور کوشش کی تھی۔

عمارت کے ارد گرد موجود لان پہلی نظر میں اسے ویسا ہی لگا تھا..... اور دوسری نظر نے اسے وہ خاردار جھاڑیاں، کھوکھلے ہوتے تنے اور سوکھے ہوئے بیڑ پودے دکھانے شروع کر دیے تھے جو بظاہر اس تراش خراش کے دم پر کھڑے تھے جو یقیناً اس کی آمد سے ایک دن پہلے کی گئی تھی۔ 26 سال پہلے وہ لان اس حالت میں نہیں تھا..... نہ وہ لان نہ وہاں کے درخت اور پودے اور نہ ٹینس کا وہ کورٹ جس پر آخری میچ یقیناً سالوں پہلے کھیلا گیا تھا۔ سب کچھ بوسیدہ اور خستہ حال تھا ان تکلیف دہ یادوں کی طرح جو اس کے اندر سرکنڈوں کی طرح سر نکالے ہمہ وقت موجود رہنے کے باوجود ایک لمبے عرصے سے وہ کاٹ اور چھن کھو چکی تھیں جس نے اس کے بچپن کے ایک بڑے حصے کو بے حد بے رحمی سے لہو لہان اور مسخ کیا تھا۔

”اس طرف سرونٹ کو ارٹرز ہیں۔“ پی اے نے اسے کسی رہنمائی کا انتظار کیے بغیر لان کے عقبی حصے میں کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح جاتے ہوئے دیکھ کر کچھ حیرانی کے ساتھ کہا۔ اس کو ڈی سی کے انداز میں اس عمارت کے لیے ایک عجیب سی familiarity (مانوسیت، واقفیت) نظر آ رہی تھی۔

”پتا ہے۔“ اس کے انداز میں واقعی ہی ایک عجیب سی مانوسیت تھی اس گھر کے لیے۔ کوئی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا تب بھی اس کے لیے عمارت کے عقبی حصے میں اس جگہ جانا دشوار نہ ہوتا۔ اس کے قدم اب جس رستے پر تھے وہاں اس کی زندگی کی بہترین اور بدترین یادیں بکھری تھیں۔ کچن کے عقبی دروازے سے کئی فرلانگ دور۔ عمارت کے بالکل عقب میں، وہاں اب وہ کوارٹرز نہیں تھا۔ چند لمحوں کے

لیے اس نے اپنے آپ کو اسی شاک اور بے بسی کی حالت میں پایا جو اس نے 26 سال پہلے اس رات محسوس کی تھی۔

وہ closure اب بھی نہیں ہوا تھا جس کی خواہش اسے وہاں تک لے آئی تھی۔ وہ آسیب اب بھی اس کے وجود کے اندر ہی رہنے والا تھا۔

☆☆☆

ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ ایک فرنٹ رو میں اس مباحثے کے دوسرے مقررین کے ساتھ بیٹھا اسٹیج کی میٹرھیاں چڑھتی فاطمہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلی بار اپنی سن کی ٹیم میں شامل ہو کر کسی انٹر کالجیٹ مقابلے میں شریک ہونے آیا تھا۔ کنیرڈ کی ٹیم ہمیشہ سے ہی ایک سخت حریف رہی تھی ان کے لیے..... اور ہوم گراؤنڈ اور ہوم کراؤڈ کے اضافی advantage کے ساتھ وہ اس بار کچھ اور بھی deadly ہو سکتی تھی۔ اس کے برابر بیٹھے اس کے ٹیم میٹ اکبر علی نے اسے اسٹیج پر چڑھتی ہوئی فاطمہ کے بارے میں انفارم کرنا شروع کیا۔ وہ کنیرڈ کالج کا Ace تھی۔ کم سے کم اکبر کی باتوں سے اس نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ وہ بہت سے مقابلوں میں اس لڑکی کے ہاتھوں ٹرافی گنوا چکا تھا۔ فلک شگاف تالیوں کی گونج میں اس سے آٹھ دس گز دور اس کے تقریباً بالمقابل اس لڑکی نے روسٹرم سنبھال لیا تھا۔

ہال میں اب پن ڈراپ سائنلس ہو گئی تھی۔ اس لڑکی پر نظریں جمائے ایک کے ہونٹوں پر بے اختیار ایک مسکراہٹ رہ گئی۔ یہ وہ پروٹوکول تھا جو آڈینس صرف ایک چیمپئن ڈیٹ کو دیتا تھا۔ اس لڑکی کی تقریر میں اس کی دلچسپی اور تجسس کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ وہ اب روسٹرم پر لگا مائیک ٹھیک کر رہی تھی اور اس وقت پہلی بار ایک نے اسے نروس محسوس کیا..... اور اگر ایسا تھا تو ایک حریف کے طور پر یہ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے کی سب سے اچھی خبر تھی۔ وہ اتنا ہی mean تھا جتنا کسی بھی مقابلے کے حریف ایک دوسرے کے لیے ہو سکتے تھے خاص طور پر اس صورت میں جب بد مقابلہ صائب نازک ہو اور اس کی کامیابی کے قوی امکانات ہوں۔ ایک کو وہاں نیچے بیٹھے اگر کسی بات کا اندازہ نہیں ہوا تھا تو وہ یہ تھا کہ اس لڑکی کی نروس نیس کی وجہ وہ خود تھا۔ وہ اگر اسٹیج سے نیچے بیٹھا اس پر نظریں جمائے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا تو وہ روسٹرم کے سامنے کھڑی اس کو نہ دیکھنے کے باوجود اس کے وجود سے کسی پہاڑ میں دبے آتش فشاں کی طرح باخبر تھی۔

ایک نے مباحثے کے آغاز میں چند ہی جملوں کے بعد اسے پہلی بار ایک دم خاموش ہوتے دیکھا۔ وہ واضح طور پر تقریر بھولی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ غلطی نوٹس ہوتی کنیرڈ کی ٹیم اور ہال میں بیٹھی آڈینس نے تالیاں پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ کسی مقرر کی غلطی کو کو راپ کرنے کا سب سے بہترین طریقہ..... ایک اور وہاں بیٹھے دوسرے کا لجز کے مقررین میں خوشی کی ایک لہری دوڑی تھی۔ تقریر بھولنا اور شروع کے چند سیکنڈز میں ہی بھولنا کسی مقرر کے لیے کتنا demoralising تھا وہ سب جانتے تھے۔ فاطمہ کی تقریر میں سب کا انہماک پہلے ہی تھا۔ اب اشتیاق بھی بڑھ گیا تھا۔

تالیوں کی تھمتی گونج میں ایک نے فاطمہ کو تقریر کا دوبارہ آغاز کرتے سنا۔ وہ پھر شروع سے تقریر کر

رہی تھی بجائے اسی جملے سے شروع کرنے کے جہاں سے وہ بھولی تھی۔ جس کا مطلب تھا اس کی تین منٹ کی تقریر اب چند سیکنڈز کے ضائع ہونے سے تین منٹ سے اوپر ہی جانے والی تھی، اگر وہ درمیان میں کہیں بے حد شاندار پر فارم کرتے ہوئے تیز رفتاری سے ان چند سیکنڈز کو گورنہ کر لیتی تو..... کنیئرڈ کی ٹیم ایک دم ٹینس نظر آنے لگی تھی۔ ان کی ٹیم پر فارمنس کا آغاز کیپٹن کی غیر متوقع بری پر فارمنس سے ہوا تھا۔ 30 سیکنڈ کے بعد ان کی کیپٹن ایک بار پھر پہلے انکی تھی، پھر دوبارہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔ ایک نے بے حد ریلیکس انداز میں اپنی سیٹ کے ساتھ ٹیک لگالی..... ویسا ہی اطمینان وہاں بیٹھے تمام شرکا کی باڈی لینگویج میں چھلکنے لگا تھا۔ اس لیول کے مقابلے میں تقریر کے دوران دوبار بھولنا، ایک بار اٹلنا آپ کو ٹاپ تھری پوزیشنز سے باہر کرنے کے لیے بہت کافی تھا..... اور فاطمہ اب پوزیشنز کی دوڑ سے باہر تھی۔

تقریر کے اختتام تک وہ دو اور غلطیاں بھی کر چکی تھی اور ہر غلطی کے بعد اس کی نروس نیس بڑھتی گئی تھی۔ ایک نے اس کی باقی کی تقریر زیادہ دلچسپی کے بغیر سنی تھی۔ اسے اب کنیئرڈ کی دوسری ڈیٹر کا انتظار تھا۔ فاطمہ جس شاندار استقبال کے ساتھ اسٹیج پر آئی تھی اتنی ہی خاموشی کے ساتھ وہ اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد اسٹیج سے ہٹی تھی۔ وہ پین ڈراپ سائلنس جو ایک ٹیمپن ڈیٹر کو پروٹوکول کے طور پر دی گئی تھی وہ اب اس کی غیر متوقع خراب پر فارمنس پر بے یقینی کی کیفیت اختیار کر گئی تھی۔ فاطمہ جھکے کندھوں اور سر کے ساتھ بے حد خاموشی کے ساتھ اسٹیج سے اتر رہی تھی۔ اس وقت دوسری بار ایک کو لگا وہ اس چہرے کو پہلے کہیں دیکھ چکا تھا..... کہاں؟ ایک لمحے کے لیے اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے وہ الجھا۔ اسے یاد نہیں آیا..... شاید کہیں..... ایسی ہی کسی declamation یا debate (مقابلہ خطابت) میں کہیں۔ اس نے خود ہی اپنے آپ کو جواب دینے کی کوشش کی۔ کسی مقابلے کے علاوہ وہ کنیئرڈ کی کسی لڑکی سے کہاں مل سکتا تھا، لیکن مسئلہ صرف یہ تھا کہ ایک نے بہت کم تقریری مقابلوں میں کسی تماشائی کے طور پر شرکت کی تھی اگر اس نے فاطمہ کو کسی جگہ ایک مقرر کے طور پر دیکھا ہوتا تو وہ اسے کسی نہ کسی حد تک یاد ہوتی..... اور اس سب کے باوجود اس لڑکی کا چہرہ اسے بہت شگسا لگا تھا۔

”کیا ہو گیا تم کو آج؟“ اپنی سیٹ سنبھالتے ہی اس نے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی نوین کو کہتے سنا۔ فاطمہ جواب نہیں دے سکی۔ اسٹیج پر اب نوین کا نام لیا جا رہا تھا۔ وہ اس کا کندھا تھپک کر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ فاطمہ غم صم اس کو اسٹیج پر چڑھتا دیکھتی رہی۔

”کیا ہوا؟“ مسز انیلا غفران اس کے پاس آ کر چند لمحوں کے لیے بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے لہجے میں مایوسی کے ساتھ ساتھ تشویش بھی تھی۔ انہوں نے بھی فاطمہ کو اس سے پہلے اسٹیج پر آج جیسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ فاطمہ کے پاس اپنی اس خراب کارکردگی کے لیے کوئی ایکسکوز نہیں تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔

وہ نوین صلاح الدین کا دن تھا۔ اس نے اسٹیج پر وہ کسر پوری کر دی تھی جو فاطمہ نے چھوڑی تھی۔ کنیئرڈ ٹرائی ایک اور اکبر کی ٹیم کے ہاتھوں ہارا تھا لیکن پہلی پوزیشن نوین نے لی تھی۔

فاطمہ نے ایک کو دوسری پوزیشن لیے اکبر کے ساتھ شیلڈ اور ٹرائی لینے کے لیے دوبار اسٹیج پر آتے دیکھا تھا۔ بار بار اسے دیکھتے ہوئے وہ درد کے ایک سمندر سے گزر رہی تھی۔ وہ مقابلہ، وہ ٹرائی، وہ تقریر..... کچھ معنی نہیں رکھتی تھی اس کے لیے۔ اس کے نزدیک اہم صرف ایک شے تھی اسے پہچانا نہ جائے..... وہ اسے شناخت نہ کرے۔ اس نے تین منٹ کی وہ تقریر جیسے ایک شناخت پریلے دوران اپنی ایک خواہش کے ساتھ ایڑیاں رگڑتے گزارے تھے۔ وہ فاطمہ کی زندگی کی آخری انٹرکالجیٹ ڈیویس تھی۔

☆☆☆

”تم کیوں چاہتے ہو کہ چڑیا اسکول چھوڑ دے؟“ سوال اتنا اچانک اور ڈائریکٹ تھا کہ کچھ دیر کے لیے وہ جواب ہی نہیں دے سکا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ڈنر کے بعد اپنے بیڈروم میں سونے کے لیے آئے تھے۔ جب اس نے اپنی بیوی کے منہ سے یہ بات سنی۔ کوئی تردید یا جھوٹ فی الحال خطرناک ثابت ہوتا خاص طور پر جب اسے یہ پتا نہیں تھا کہ اس کی بیوی کو یہ بات کس سے پتا چلی ہے اور وہ کس حد تک ”کیا“ جانتی تھی۔ پہلا شک اسے بارلی ڈول پر ہوا تھا اور اگر وہ اس کی بیوی کی source of information تھی تو پھر معاملہ خطرناک نہیں ہوا تھا۔

”میں نہیں چاہتا کہ وہ اس اسکول میں پڑھے جہاں میری بیٹی پڑھتی ہے۔“ اس نے کسی سوال جواب کے بغیر اپنی بیوی سے کہا تھا۔ اس کی بیوی کے لیے اس کا جہاں اتنی آسانی سے اسے سوال کا سیدھا جواب دے دینا غیر متوقع تھا وہاں جواب اس سے زیادہ شگسا لگا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے بے یقینی سے اپنے شوہر کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ چند مہینے پہلے تک یہی شخص خیر دین کو ڈیوٹی آورز کے دوران اپنی نواسی کو اسکول سے لانے، لے جانے کی اجازت دے دیتے ہوئے تھا اور اب ایک دم یہ.....

”کیوں؟“ اس نے اس شاک سے جیسے باہر نکلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”میں نہیں چاہتا وہ میری بیٹی سے ملے۔“ جواب اب بھی اتنا ہی احمقانہ تھا۔

”تم اگر یہ چاہتے ہو کہ ہماری بیٹی اس سے نہ ملے تو تمہیں یہ بات اپنی بیٹی کو سمجھانی چاہیے چڑیا کو اس کے لیے اسکول سے نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے میں اس پر غور کروں گا۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اپنے شوہر سے کیا کہے۔ وہ آج زندگی میں دوسری بار اسے بے نیکی اور احمقانہ باتیں کرتا نظر آیا تھا۔ پہلے بھی یہ خیر دین کا معاملہ تھا جس پر اس نے اپنے شوہر کو بدحواس پایا تھا اور آج پھر یہ اس کی نواسی کا مسئلہ تھا جس پر اسے اپنا شوہر کچھ عجیب بوکھلایا نظر آیا تھا۔

”تم مجھ سے اپنا پرابلم شیئر کیوں نہیں کر رہے؟“ وہ بالآخر جیسے اس لمبی چوہے کے کھیل سے تنگ آ گئی تھی یا پھر اس معے کو خود حل کرتے کرتے اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

”کیا شیئر کروں تم سے؟“ وہ اس کے سوال نما اعتراض پر عجیب سے انداز میں ٹھٹکا تھا۔

”وہ صرف تم جانتے ہو کہ تم کیا شیئر نہیں کر رہے مجھ سے..... لیکن معاملہ صرف خیر دین کا چور ہونا اور چڑیا کا اس کی نواسی ہونا نہیں ہے۔“ وہ چند لمحے جیسے ہونٹوں کی طرح اپنی بیوی کا چہرہ دیکھتا رہا۔ یوں جیسے اسے اپنی



بیوی کی بات سمجھ ہی نہ آ پائی ہو..... یا سمجھ میں آنے کے بعد بھی وہ یہ تسلیم نہ کر پارہا ہو کہ اس کی بیوی اتنے واضح الفاظ میں اس پر اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کرے گی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا کہنا چاہ رہی ہو تم؟“ ایک typical مرد کی طرح اس نے جواب نہ دے پائے پر بلند آواز میں اس پر چلا کر اسے خائف کرنے اور موضوع سے ہٹانے کی کوشش کی۔ چند لمحوں کے لیے اس کی بیوی کی آواز ہی نہیں نکل سکی۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس پر چلایا تھا اور کس بات پر چلایا تھا۔ اس نے شدید بے عزتی محسوس کی تھی۔

”میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے سچ بولو۔“ وہ اس بار اور ڈائریکٹ ہو گئی تھی۔ اس کے شوہر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”سچ؟“ کیا جھوٹ بول رہا ہوں میں تم سے؟“ اس نے اب بھی چلاتے ہوئے ہی کہا تھا۔

”یہ میں تم سے جاننا چاہ رہی ہوں کہ تم کیا جھوٹ بول رہے ہو مجھ سے؟“ اس نے بھی اسی انداز میں چلاتے ہوئے شوہر کو جواب دیا۔ شادی کے اتنے سالوں میں آج پہلی بار وہ ایک دوسرے پر یوں چلا رہے تھے۔

”مجھے پورا حق ہے کہ میں ایسے کسی شخص کی اولاد کو اپنی بیٹی سے دور رکھوں جس سے مجھے نقصان پہنچا ہو۔“ اس کے شوہر نے ایک بار پھر اپنی اسی بات کو ترمیم شدہ الفاظ میں دہراتے ہوئے کہا۔

”تم نے ممی کو کہا ہے کہ وہ پاپا سے کہہ کر تمہاری ٹرانسفر یہاں سے کروادیں کیونکہ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔“ وہ بول نہیں سکا۔ یہ ایک غیر متوقع وار تھا اس کی بیوی کی طرف سے۔

”میں نے تم سے کب کہا کہ پاپا کو کہہ کر یہاں سے اپنی ٹرانسفر کرواؤ؟“ وہ اب بھی اسی انداز میں بول رہی تھی اور اپنے شوہر کے بدلتے تیور سے بری طرح خفا کر رہے تھے۔

”تم سے کس نے کہا؟“ اس کے شوہر کی آواز یک دم کمزور ہوئی۔ جواب معلوم ہونے کے باوجود اس نے پتا نہیں کیا سوچ کر اپنی بیوی سے پوچھا تھا۔ چیزیں اگر کھلنے پر آتی ہیں تو کھلتی ہی کیوں چلی جاتی ہیں؟ اس نے ایک جھنجھلاہٹ کے ساتھ سوچا تھا۔

”ممی نے بتایا ہے مجھے اور کون بتائے گا۔“

”میں نے پاپا سے بہت پہلے بات کی تھی ٹرانسفر کی..... اب نہیں کی۔“ اس کے شوہر نے کہا وہ اب اپنے بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز میں کچھ ڈھونڈنے بیٹھ گیا تھا۔ جھوٹ کا سارا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر جگہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ جاتا ہے۔ بڑے جھوٹ چھوٹے جھوٹ..... پھر ان سے چھوٹے۔ اس خاندان کا کوئی ایک فرد بھی مس ہو جائے تو پورا خاندان جھوٹ جھوٹ پکارنے لگتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی آج یہی ہو رہا تھا ایک جھوٹ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کے بعد اب اسے اس کے پورے خاندان کی ضرورت پڑ گئی تھی.....

جھوٹ جھوٹ کی اس پکار کو دبانے کے لیے۔

”میں نے تم سے کبھی نہیں کہا کہ تم یہاں سے ٹرانسفر کرواؤ۔ اس کی بیوی نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”اس گھر میں اثرات ہیں..... تمہیں ہی الیٹو تھا..... تم ہی ہر وقت مجھے قصے سناتی رہتی تھیں کہ آج یوں ہوا اور آج یوں ہوا۔“ اس کا شوہر ایک بار پھر اس پر الٹ پڑا۔ اسے اب اس قصے کو لپٹنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔

”میں نے تمہیں ہزار اسٹوریز سنائی ہوں گی لیکن کبھی بھی تمہیں ٹرانسفر کے لیے نہیں کہا۔“ اس کی خفگی کو شوہر کی تیز آواز نے ایک بار پھر بڑھایا۔

”میں اپنی بیٹی کی وجہ سے یہاں سے جانا چاہتا ہوں، میں نہیں چاہتا اس گھر میں اس کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچے۔“ اس کے شوہر نے ایک بار پھر اپنا بیان بدلا۔ وہ ایک بار پھر اپنے شوہر کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔

”ایک سال ہو رہا ہے اس گھر میں ہمیں..... تمہیں آج خیال آیا ہے کہ یہاں تمہاری بیٹی کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے؟“ اس نے بے حد خفی سے اپنے شوہر سے کہا۔ وہ اسے سچ نہیں بتا رہا تھا کم اس کے لیے اسے مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ چھپا کیا رہا تھا اس کا سر پیر بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

”کافی بحث کر چکا میں تمہارے ساتھ..... اب مزید نہیں۔ تم اپنے کام سے کام رکھو اور مجھے یہ مت بتاؤ کہ مجھے کس معاملے میں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ تمہاری ساری زندگی پاکستان سے باہر گزری ہے۔ تمہیں کیا پتا پاکستان میں کیسے رہا جاتا ہے اور کسی مسئلے کو کیسے حل کیا جاتا ہے۔“ اس کے شوہر نے بالآخر زچ ہوتے ہوئے کہا۔

”ایک چیز انسانیت ہوتی ہے اور اسے سمجھنے اور پریکٹس کرنے کے لیے مجھے کسی خاص جگہ رہنا ضروری نہیں ہے۔“ اس نے اسی تلخ انداز میں اپنے شوہر سے کہا تھا۔ وہ بھی اب اتنی ہی زچ ہونے لگی تھی اس جگہ پزل سے جو حل ہونے پر ہی نہیں آ رہا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اس کا شوہر پھر ٹھنکا۔

”تم ایک آٹھ نو سال کی بچی کو ایک بڑے کی کسی غلطی پر سزا نہیں دے سکتے۔“ اس نے دونوں انداز میں اپنے شوہر سے کہا۔

”وہ بھی چور ہے..... وہ بھی اچھی لڑکی نہیں ہے۔“ وہ چند لمحے پل نہیں سکی۔

”تب بھی..... تو بھی۔“ اس کی خاموشی زیادہ دیر قائم نہیں رہی تھی۔ اس کے لہجے کی قطعیت نے اس کے شوہر کو عجیب طرح سے سلگایا۔

”تم چڑیا کی اتنی سائینڈ کیوں لے رہی ہو؟ تم کونو کروں کے بچوں اور ان کی سائینگی سے کوئی واقفیت نہیں ہے۔ اس کے شوہر نے اپنی بیوی کی طرف داری کو بدلنے کی کوشش کی۔

”مجھے دلچسپی ہے بھی نہیں کسی کی سائینگی سمجھنے یا جاننے میں..... مجھے اگر دلچسپی ہے تو صرف ایک چیز میں..... اور وہ یہ کہ تم چڑیا کو اس اسکول سے نکالنے کی کوشش کرنا بند کر دو۔ خیر دین نے چوری کی ہے یا جو بھی کیا ہے اب اس chapter کو بند ہو جانا چاہیے کیونکہ یہ میری بیٹی کو affect کر رہا ہے۔ تم اپنی بیٹی کو اپ

ماہنامہ پاکیزہ۔ فروری 2012ء۔ 27

سیٹ کر رہے ہوں تمام چیزوں سے۔“

”میں اپنی بیٹی کو اپ سیٹ کر رہا ہوں؟“ وہ جیسے بے یقینی میں بولا تھا۔ ”میری اکلوتی اولاد ہے وہ..... میں اسے اپ سیٹ کروں گا؟ میں جو بھی کر رہا ہوں اس کے تحفظ کے لیے کر رہا ہوں۔“

”مجھے تمہاری کسی بات کی سمجھ نہیں آرہی۔ میں یہ جانتی ہوں کہ تم کچھ چھپا رہے ہو..... کیوں چھپا رہے ہو صرف یہ نہیں پتا مجھے..... نہ ہی مجھے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ خیر دین کا حوالہ چڑیا کو میری بیٹی کے لیے اتنا خطرناک کیوں بنا رہا ہے کہ تم اسے اس اسکول میں بھی دیکھنا نہیں چاہتے جہاں تمہاری بیٹی ہے۔“

”میں اب اس ایٹو پر تم سے کوئی بات نہیں کروں گا۔“ اس کا شوہر یک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تمہیں سونا ہے سو جاؤ..... بیٹھنا ہے بیٹھ جاؤ..... لیکن میرا دماغ چاٹنا بند کر دو۔“ وہ بے حد درشتگی سے کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا تھا۔

وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ اسے پتا تھا وہ اب اوپر اپنی اسٹڈی میں جا کر ڈرنک کرے گا اور ایک دو گھنٹے کے بعد آ کر چپ چاپ سو جائے گا۔ غصے اور ڈپریشن میں وہ شاید آج زیادہ پیسے گا..... لیکن وہ اس موڈ میں نہیں تھی کہ اسے منانے کی کوشش کرنی یا اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنی..... شادی کے اتنے سالوں میں یہ ضرورت اسے کبھی پڑی بھی نہیں تھی۔ وہ کبھی خفا بھی ہوتا تو بہت دیر تک اپنی خفگی برقرار نہیں رکھ پاتا تھا۔ وہ اس کی کمزوری تھی..... وہ اس سے بات کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

شادی کے اتنے سالوں میں اس نے کبھی بے مقصد اپنے شوہر کے ساتھ جھگڑے کیے بھی نہیں تھے۔ یہاں تک کہ اس نے کبھی اپنے شوہر کے regular drink کرنے کو بھی کبھی قابل اعتراض نہیں سمجھا تھا۔ وہ ساری عمر امریکا میں رہی تھی اور اس کی فیملی جتنی آزاد خیال تھی اس میں شراب کو ایک سوشل ڈرنک کے طور پر acceptance تھی۔ اس کا شوہر ویسے بھی شراب پی کر کبھی اتنا آؤٹ نہیں ہوا تھا کہ اسے اور اس کی ازدواجی زندگی کو کسی قسم کا خطرہ ہو جاتا۔

اب یہ پہلی بار ہو رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے روپے سے ناخوش ہو رہی تھی اور وہ بھی اس حد تک کہ اسے اپنے شوہر کے ساتھ جھگڑنا پڑ رہا تھا اور ایشو بظاہر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

اسے نہیں پتا اس کا شوہر دوبارہ اس کی بیٹی کے اسکول گیا یا نہیں لیکن دو دن بعد اس نے ناشتے کی ٹیبل پر اسے اپنے ٹرانسفر کی خوش خبری سنا دی تھی۔ اس نے بے حد خاموشی سے کچھ بھی کہے بغیر ناشتا کرتے ہوئے یہ خبر سنی اور کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے شوہر نے چند منٹ چائے کے سب لیتے ہوئے جیسے اس کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

”اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ میرا پی اے لے آئے گا۔“ اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اگلا جملہ بولا۔ اس بار وہ ناشتا کرتے ہوئے خشکی۔ اس ہدایت کا مفہوم تھا کہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ باربی ڈول کے اسکول جاتی۔

”میں اسکول جا کر یہ کام خود کروں گی۔ یہ اس کا پہلا اسکول ہے، ٹھیک ہے وہ زیادہ دیر یہاں نہیں رہی لیکن ہمیں جانے سے پہلے good will gesture کے طور پر اس کے ٹیچرز سے مل کر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔“

”تم چاہتی ہو میں بھی ساتھ جاؤں؟“ اس کے شوہر نے جواباً کہا۔

”تمہاری مرضی ہے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی لیکن میں ضرور جاؤں گی۔“ اس نے اپنے شوہر کو کسی قسم کا مشورہ دینے کے بجائے کہا۔

”میں بھی جاؤں گا۔“ وہ حیران ہوئی۔ اسے اپنے شوہر سے کم از کم اس جواب کی توقع نہیں تھی لیکن اس نے ساتھ ہی اطمینان کا سانس بھی لیا تھا۔

وہ ایک ہفتے کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ اپنی بیٹی کا اسکول چھوڑنے کا سرٹیفکیٹ لینے گئی تھی۔ وہ دونوں بہت دیر تک پرنسپل آفس کے وزیٹرز روم میں بیٹھے رہے تھے لیکن سسٹرائیکٹس نے انہیں ملاقات کے لیے اندر نہیں بلوایا تھا۔ اس کے شوہر کا پارا ایک بار پھر آسمان کو چھونے لگا تھا۔ وہ ساتھ نہ ہوتی تو اس دن اس کے شوہر اور سسٹرائیکٹس کے درمیان ایک اور جھگڑا ہوتا۔ سسٹرائیکٹس نے ان سے ملاقات نہیں کی تھی لیکن اس کی ہدایات پر اس کے ماتحت عملے نے اس کی بیٹی کا سرٹیفکیٹ فوری طور پر بنادیا تھا۔

وہ دونوں سسٹرائیکٹس سے ملاقات کا انتظار کر کر کے اٹھ کے وہاں سے آگئے تھے اور باہر نکلتے ہی اس کے شوہر نے بے حد خشکی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے دیکھ لیا نا کیسا attitude ہے اس سسٹر کا..... اور تمہیں شوق تھا good will gesture دکھانے کا..... میری اگر یہاں سے ٹرانسفر نہ ہو گئی ہوتی تو میں اس سسٹر کا دماغ درست کر دیتا۔“ اس کا شوہر واپسی پر تمام راستے بکنا جھٹکا گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے اسکول میں ایڈمیشن کے دوران اور بعد میں کئی بار سسٹرائیکٹس سے مل چکی تھی اور وہ اسے ہر بار بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ ویسی ہی ایک ننھی جیسی نن سے وہ خود کچھ عرصے پڑھی تھی۔ مشفق، دوستانہ، صاف گو اور اصول پرست۔ اب اگر وہ اپنا اسکول چھوڑ کر جانے والی ایک ننھی کے والدین سے ان کی لاکھ کوشش کے باوجود بھی ملنے پر تیار نہیں ہوئی تھی تو وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ ان کا اور اس کے شوہر کا جھگڑا کس حد تک گیا ہوگا۔ وہ خاموش بیٹھی بوجھل دل کے ساتھ اپنے شوہر کی باتیں سنتے ہوئے سسٹرائیکٹس کی خفگی دور کرنے کے لیے ایک آخری کوشش کرنے کا سوچتی رہی۔ اس شہر سے جانے سے پہلے اس نے فون پر سسٹرائیکٹس سے رابطہ کرنے کی ایک آخری کوشش کی تھی۔ یہ کوشش بھی ثمر آور ثابت نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

اسکول چھوڑ کر جانے سے پہلے باربی ڈول نے بھی چڑیا سے ملنے، بات کرنے اور اسے یہ بتانے کی بار بار کوشش کی تھی کہ وہ لوگ وہاں سے جا رہے تھے۔ اپنے باپ کی تمام تاکیدوں اور تنبیہوں کے باوجود

بھی..... لیکن وہ اس میں ناکام رہی تھی۔ چڑیا اب پہلے جیسی چڑیا نہیں رہی تھی۔ وہ باربی ڈول کو میلوں دور سے بھی دیکھ کر رستہ بدل جاتی تھی اور اگر وہ کسی بات پر جھنجھلائی تھی تو وہ صرف یہ تھی کہ باربی اس کی طرف کیوں آتی تھی۔ اپنا وقت اس کے کلاس روم کے باہر بار بار چکر لگانے میں کیوں ضائع کرتی تھی۔ باربی ڈول اس کی کلاس کے چکر لگانا شروع کرتی اور چڑیا کلاس کے اندر بیٹھی ٹینس ہونا شروع ہو جاتی۔ رائٹنگ بورڈ پر لکھی جانے والی چیزیں سمجھنا ایک دم اس کے لیے مشکل ہونے لگتا۔ ٹیچر کی آواز سن کر بات سمجھنا ایک اور دشوار کام ہوتا۔ اور کلاس میں بیٹھی اپنی دوست کے جملوں کو نظر انداز کرنا اس سے بھی بڑا جو باربی ڈول کو کہیں نمودار ہوتے دیکھتے ہی اسے بڑے اشتیاق سے بتاتی۔ ”باربی ڈول آگئی ہے۔“ اور پھر یہ جملہ باربی ڈول کے ہر چکر پر بولا جاتا۔

”تم باربی ڈول سے ناراض ہو کیا؟“ شروع کے چند دنوں کے بعد ہی اس کی دوست نے اس کا بدلا ہوا رویہ نوٹ کر لیا تھا۔

”وہ میری فریڈ نہیں ہے پھر میں اس سے کیوں ناراض ہوں گی؟“ اس نے جواباً بہت سوچ کر کہا اور اس کے جواب نے اس کی دوست کو مزید حیران کیا۔

”لیکن تم نے مجھے خود بتایا تھا کہ باربی ڈول تمہیں اچھی لگتی ہے اور تم نے اسے دوست بنا لیا ہے۔“ چڑیا نے اپنی دوست کی بات کا جواب خاموشی سے دیا تھا۔ وہ اپنی دوست کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس کے لیے باربی ڈول کے نظر آنے پر اسے نظر انداز کرنا مشکل ترین اور بے حد صبر آزما کام تھا، وہ اپنے نانا کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی جو اب باربی ڈول سے اس کا کسی بھی طرح کا رابطہ نہیں چاہتے تھے..... اور وہ نو سالہ بچی روز اسکول آکر دل اور دماغ کی ایک عجیب سی کشمکش میں الجھتی دن گزارتی۔ سنجے بڑوں جیسے کبھی نہیں ہو سکتے۔ ان کی زندگی کی تکلیف، اذیت، حادثہ یا trauma کچھ بھی ان کو بڑوں جیسا سخت دل اور unforgiving (معاف نہ کرنے والا) نہیں کرتا تھا۔ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں کسی بھی لاشعوری کوشش کے بغیر، چڑیا بھی شاید یہی کرتی اور نہ چاہنے کے باوجود وہ باربی ڈول سے بات کرنا شروع کر دیتی اگر تب ہی باربی ڈول کا باپ اس کی زندگی میں ایک بار پھر ایک سیاہ کردار کے ساتھ نمودار نہ ہو جاتا۔

☆☆☆

خیر دین کے گاؤں سے واپس شہر چلے جانے کے فیصلے کا اس کے خاندان نے بے حد گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ ان چند مہینوں میں شروع کے چند دنوں کے بعد اب دوسری بار ایسا ہوا تھا کہ اس کے خاندان والے ایک دم خیر دین سے خوش دلی سے بات چیت کر رہے تھے۔ اور یہ خوش دلی خیر دین کے چلے جانے تک قائم رہتی اگر خیر دین اپنی زمین بیچنے کے ارادے کا اظہار نہ کرتا۔ خیر دین زمین کو بیچنے کا فیصلہ کرنے کے لیے بھی مجبور تھا۔ شہر جا کر دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی کوشش کے لیے اسے تھوڑے بہت سرمائے کی ضرورت تھی اور وہ رقم اسے وہ زمین ہی دے سکتی تھی جو اس کی ملکیت ہونے کے باوجود عملی طور پر اس کے بھائیوں اور بھتیجیوں کے زیر استعمال تھی۔ خیر دین اس زمین کو انہی کے ہاتھوں بیچنا چاہتا

چاہتا تھا چاہے تھوڑی رقم کے عوض ہی سہی لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا کہ مفت میں ملنے والی چیز کو کوئی کوڑیوں کے بھاؤ بھی نہیں خریدتا۔ خاندان والوں نے شروع میں اسے بالواسطہ طور پر اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے بھائی بار بار اسے اپنی کمزور مالی حالت کا جتا کر یہ بتاتے رہے کہ وہ زمین خریدنے کے قابل نہیں ہیں۔ چاہے وہ انہیں کم رقم کے بدلے ہی وہ زمین ملے تب بھی اور چاہے وہ زمین کا معاوضہ قسطوں کی صورت میں لینے پر تیار ہو جائے تب بھی۔ ان کے رویے سے مایوس ہو کر خیر دین نے جب گاؤں میں اپنے چند دوستوں کے ذریعے زمین کے اور گاؤں کے ڈھونڈنے شروع کر دیے تو خاندان والوں کی چھریاں پہلی بار بغلوں سے باہر آ گئیں۔ انہوں نے خیر دین کو صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس زمین کو بیچ دینے کا خیال چھوڑ دے کیونکہ وہ مرکز بھی اس زمین کو نہیں چھوڑیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ خیر دین اس زمین کو بیچنے کا سوچ کر بھی بے حد خود غرض ہو رہا تھا۔ غربت کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہوتا ہے کہ بعض گناہ انتخاب نہیں مجبوری بن جاتے ہیں۔ بعض دفعہ انسان کو دنیا کے دکھتے دوزخ یا آخرت کے چھپے ہوئے دوزخ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ جنت یقین اور ایمان کے جس لنگر کے ساتھ منسلک ہوتی ہے وہ آپشنز میں ہوتا ہی نہیں۔

خیر دین کی زمین بک جانے کا مطلب اس کے خاندان کی مالی حالت کو کچھ مزید خراب ہونا تھا اور اس صورت حال کا سامنا کرتے ہی خاندان حادثہ یا ایک دم عجیب بدحواسی کا شکار ہو گیا تھا۔ خیر دین ان کا رزق گھٹانے آیا تھا۔ شاید پہلی بار ان میں سے اکثر کو بیچ معنوں میں خیر دین کی نوکری جانے اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا افسوس ہوا تھا۔ نہ یہ سب ہوتا نہ وہ گاؤں واپس آتا اور نہ انہیں زمین کے لالے پڑتے۔ انہیں خیر دین سے ہمدردی تھی یا نہیں تھی بہر حال اس بات پر وہ سب متفق تھے کہ وہ اس زمین کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے چاہے اس کے لیے ایک خونی رشتہ جاتا رہے۔

ایک مہینہ خیر دین ہر روز پنواری کے چکر کا تار رہا۔ وہ نہیں ملتا تھا، ملتا تھا تو اس کا کام ٹالتا تھا..... اور پھر جب بالآخر وہ رجسٹر نکال کر اسے دکھانے پر تیار ہوا تو خیر دین دم سادھے رہ گیا تھا۔ وہ زمین اب اس کے نام نہیں تھی۔ پچھلے ہفتوں کی تاریخ میں اس کے بھائیوں کے نام منتقل ہو چکی تھی۔ وہ جب تک ڈی سی کا خانساں تھا گاؤں میں موجود نہ ہونے کے باوجود کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ اس کی زمین کے ساتھ کچھ کرنا اور سرکاری لیبل لپٹے ہی وہ بے سرو سامان ہی نہیں بے زمین اور لاوارث بھی ہو گیا تھا۔ اس کے اپنے ہی اس کو نوچنے کے لیے گدھوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑے تھے۔ پتا نہیں اس کاغذ پر خیر دین کا انگوٹھا لگانے کے لیے اس کے اپنوں میں سے کون خیر دین بنا تھا۔ پنواری کو کتنی رشوت دی گئی تھی کہ خیر دین کی شکل سے شناسا ہونے کے باوجود اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

خیر دین جتنا لڑ سکتا تھا وہ پنواری سے لڑا..... لیکن وہ قسمت سے نہیں لڑ سکا جو اس کے ساتھ نہیں تھی۔ جب انسان کے اپنے اس کی پیٹھ میں خنجر گھونٹنے لگیں تو انسان دنیا کے ساتھ نہیں لڑ سکتا۔ خیر دین کس کس کے ساتھ لڑتا..... اپنے حالات کے ساتھ، خالی جیب کے ساتھ، اپنوں کی سرد مہری اور بے حس کے ساتھ یا آنے والے

دنوں میں چڑیا اور اس کی بیٹی کے حوالے سے جھانکتے آسیبوں کے ساتھ۔

وہ لڑنے جھگڑنے کے بعد زمین کی رجسٹری بغل میں دبائے روتا ہوا واپس گھر آ گیا تھا۔ وہ زمین کا ٹکڑا اس کی عمر بھر کی کمائی تھی۔ تمام جمع پونجی جسے اس نے اندھے اعتماد کے سہارے اپنے خونی رشتوں کو سونپ دیا تھا۔ وہ اعتماد واقعی اندھا ثابت ہوا تھا اور اب چاروں شانے چٹ پڑا تھا۔ پٹواری کے ہاں جو کچھ ہوا تھا وہ اس کا عشرِ عشر بھی نہیں تھا جو گھر پر ہوا تھا۔ خیر دین رنج اور صدمے کے ساتھ ساتھ شدید غصے میں بھی تھا اور گھر پہنچنے کے بعد اس نے گاؤں میں اپنے چند جاننے والے لوگوں کی مدد لے کر اپنے بھائیوں کے ساتھ اس معاملے پر بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے نتیجے میں جو کچھ ہوا تھا وہ خیر دین کے دل پر لگنے والا ایک اور چرکا تھا۔ اس کے بھائیوں نے اپنے بیٹوں کو اکٹھا کر کے خیر دین کو اسی وقت گھر سے چلے جانے کا کہا اور دوسری صورت میں اس کا سامان باہر پھینک دینے کا اعلان کیا۔

چند ماہ کے عرصے میں چڑیا نے خوف سے کانپتے ہوئے دوسری بار اپنے نانا کی ایسی تذلیل اور بے قدری دیکھی تھی۔ اس کی ماں اور نانا نے بہتی آنکھوں کے ساتھ اس ایک کمرے میں پڑا پناہ تمام سامان اٹھا لیا جو ان کا تھا۔ اس گھر سے نکلے ہوئے خیر دین قسم کھا کر گیا تھا کہ وہ اس گھر میں دوبارہ کبھی نہیں آئے گا۔ اس نے چند دنوں کے لیے گاؤں میں ہی اپنے ایک پرانے دوست کے ہاں پناہ لی۔

اس رات چڑیا نہیں سو سکی تھی۔ اس نو سالہ بچی نے بڑے آرام سے اپنے نامہ اعمال میں اپنا ایک اور گناہ تحریر کر لیا تھا، یہ سب بھی اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ امتحان میں پاس ہو جاتی تو نانا واپس شہر جانے کا نہ سوچتے اور پھر اس کے نانا کو وہ گالیاں اور دھکے اور دھمکیاں نہ ملتے جو اس نے دیکھے تھے۔

اس رات خیر دین کی کمر کچھ اور جھک گئی تھی۔ اس کے بالوں میں کچھ اور سفیدی اتر آئی تھی۔ اپنوں کا غم انسان کو باہر سے نہیں اندر سے مارتا ہے۔ خیر دین کو بھی اس نے مار دیا تھا۔ وہ اپنے اسی دوست سے کچھ رقم قرضہ لے کر واپس اسی شہر آ گیا تھا جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ شہر میں آتے ہی کسی واقف کار کے ذریعے ایک کمرے کا گھر کرائے پر لیتے ہی اس نے سب سے پہلا کام چڑیا کو اسکول لے جانے کا کیا تھا۔

چڑیا کا نام اسکول سے کٹ چکا تھا لیکن سسٹر ایکنس چڑیا کے لیے ہمیشہ سے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتی تھیں۔ انہوں نے کاننٹ کے قوانین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس بچی کو دوبارہ اسکول میں ایڈمیشن دلا دیا تھا۔ خیر دین کی نوکری ختم ہو جانے کا سن کر انہوں نے کہے بغیر چڑیا کی فیس کو ایک چوتھائی کر دیا تھا۔ خیر دین نے انہیں چڑیا کے ساتھ ہونے والے حادثے سے آگاہ نہیں کیا تھا لیکن اس کے باوجود سسٹر ایکنس نے چڑیا میں آنے والی تبدیلیوں کو نوٹس کیا تھا۔ چڑیا وہ پُر اعتماد بچی نہیں تھی جسے وہ جانتی تھیں۔ وہ ایک خوف زدہ آنکھوں، زرد رنگت، کمزور جسم اور بے مقصد انگلیاں چٹانے والی ایک بچی تھی جو خیر دین اور سسٹر ایکنس کی اس پوری ملاقات کے دوران کم صدمہ کسی مسکراہٹ کے بغیر سسٹر ایکنس کو دیکھتی رہی تھی۔ اسے جیسے یہ خوف تھا کہ سسٹر ایکنس اسے دوبارہ اسکول میں داخل نہیں کرے گی اور اسے اس ہیبت ناک اسکول میں دوبارہ جانا پڑے گا اور اسے یہ خوف تھا کہ ابھی کسی بھی لمحے خیر دین بلک بلک کر رونے لگے گا اور پھر سسٹر ایکنس کو وہی سب کچھ بتائے

گا اور پھر..... اس پھر کے آگے چڑیا کو تارکی کے سوا کچھ نہیں دکھتا تھا۔ وہ اس اسکول میں ستارہ تھی مگر بن نہیں بنا چاہتی تھی۔ خیر دین نے سمجھداری کی تھی اس نے سسٹر ایکنس کو چڑیا کے حوالے سے کچھ نہیں بتایا تھا، نہ چڑیا کے حوالے سے نہ ڈی سی کے ساتھ ہونے والے اپنے جھگڑے کے حوالے سے جس کے نتیجے میں اسے نوکری سے ہاتھ دھو بیڑے تھے۔

سسٹر ایکنس صرف یہی جان سکی تھی کہ ڈی سی نے کچھ لوگوں کو ملازمت سے مختلف وجوہات کی بنا پر فارغ کر دیا تھا اور ان میں خیر دین بھی تھا۔ وہ چڑیا کے حوالے سے اس ڈی سی کا ایک بار سامنا کر چکی تھی اور وہ نہ چاہنے کے باوجود بھی اسے ناپسند کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی اپنی بیٹی کے ایڈمیشن اور اسکولنگ کے لیے اسکول آتا رہا تھا لیکن انہیں کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کبھی اس طرح روڈ ہو کر بدتمیزی پر اتر سکتا ہے جس طرح وہ چڑیا کے نام اسکول کا ایک وارننگ لیٹر اس کی بیٹی کے ہاتھ گھر بھجوائے جانے پر ہوا تھا اور ایسا شخص کسی ملازم کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ سسٹر ایکنس نے بڑے آرام سے یہ نتیجہ نکال لیا تھا۔

ایک مسئلے کا حل نکالنے کے بعد خیر دین کو ڈاکٹر فرح اور ان کے شوہر سے رابطے کا خیال آیا۔ اتنے مہینوں میں اس نے ان دونوں میاں بیوی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اسے ان کا خیال چند بار آیا بھی تو اس نے سر سے جھٹک دیا۔ ایک شخص کی برائی نے خیر دین کو جیسے اس سارے نظام اور اسے چلانے والوں سے برگشتہ کر دیا تھا لیکن اب اپنی اور چڑیا کی بقا کے لیے کی جانے والی کوششوں میں اسے پھر وہ میاں بیوی یاد آ گئے تھے۔

اس نے ڈاکٹر فرح کے شوہر عابد کو فون کیا اور تب اسے یہ افسوسناک خبر ملی کہ دو ماہ پہلے کنسر کی وجہ سے فرح کی ڈیڑھ تھک ہو گئی تھی۔ خیر دین کو شدید صدمہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر فرح ایک بہت نفیس اور مہربان عورت تھیں۔ چڑیا کی زندگی کے شروع کے سالوں پر ان کی بلا واسطہ اور بالواسطہ بہت گہری چھاپ تھی۔ اگر ان کی کوشش نہ ہوتی تو چڑیا کبھی اس اسکول میں نہیں پڑھ سکتی تھی جہاں وہ پڑھ رہی تھی۔ عابد کے منہ سے ڈاکٹر فرح کی ڈیڑھ کا سن کر خیر دین کو اتنا صدمہ پہنچا تھا کہ کچھ دیر تک تو وہ بول ہی نہیں سکا تھا۔ اس کی خاموشی محسوس کر کے گفتگو کا دوبارہ آغاز بھی عابد نے ہی کیا تھا۔

”میں نے سنا ہے تم نے جاب چھوڑ دی اور واپس گاؤں چلے گئے۔ تمہارے صاحب نے فرح کا بھیجا ہوا منی آرڈر واپس کرتے ہوئے مجھے فون پر بتایا تھا۔ فرح کو تو یہ جان کر بھی بڑا افسوس ہوا تھا کہ تم نے اس کی اتنے سال کی محنت ضائع کرتے ہوئے چڑیا کو اسکول سے اٹھا لیا تھا۔“ عابد نے مزید بات کرتے ہوئے کہا۔ بیوی کا یوں اچانک آنے والا ذکر اسے اداس کر رہا تھا۔

”بس سر کچھ حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ میں گاؤں جانے پر مجبور ہو گیا تھا۔“ خیر دین نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر فرح کے بارے میں یہ ہولناک خبر سن کر وہ چند لمحوں کے لیے اپنی زندگی بھول گیا تھا۔

عابد نے چڑیا کے دوبارہ اسکول میں داخلے پر جیسے اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا اور ساتھ دوبارہ اسکول کی فیس

بھجوانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ وہ جیسے اپنی بیوی کی ایک خواہش کا احترام کرنا چاہتا تھا۔ خیر دین نے اس بار انکار کر دیا تھا۔ فوری طور پر شدید مالی بحران کا شکار ہونے کے باوجود بھی اسے یہ گوارا نہیں ہوا تھا کہ وہ سسٹریٹس کے چڑیا کے تعلیمی اخراجات کو تقریباً معاف کر دینے کے بعد اس مد میں کسی سے مزید رقم وصول کرنے کی کوشش کرتا۔ اس نے عابد سے چند ہفتوں میں ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور عابد نے اس کی یہ درخواست قبول کرتے ہوئے اسے کبھی بھی آنے کے لیے کہہ دیا تھا۔

ڈاکٹر فرح کا سن کر صرف خیر دین کو صدمہ نہیں ہوا تھا، حلیہ اور چڑیا کو بھی اتنی ہی تکلیف پہنچی تھی۔ خیر دین چند دنوں بعد عابد سے تعزیت کے لیے اپنی بیٹی اور چڑیا کے ساتھ اس شہر میں گیا تھا جہاں وہ پوسٹڈ تھا۔ عابد اور اس کے بچے ڈاکٹر فرح کی موت سے پیدا ہونے والے خلا کو بھرنے کے لیے نبرد آزما تھے۔ چڑیا کو اس نے اپنے بچوں سے ملوایا تھا لیکن وہ بچے بھی ماں کو کھونے کے بعد ابھی شکست و ریخت کے عمل سے گزر رہے تھے۔ زندگی پہلے جیسی نہ چڑیا کے لیے رہی تھی نہ ان کے لیے۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے چڑیا کے ساتھ بیٹھ کر چند رسمی باتیں کر کے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ چڑیا کی زندگی کی اداسی میں ڈاکٹر فرح کی موت نے اضافہ کر دیا تھا۔ ایک اور جیتا جاگتا کردار اس کی زندگی میں صرف ماضی کی ایک یاد بن کر رہ گیا تھا۔

”نانا میں ڈاکٹر ہی بنوں گی بس..... اور میں بہت زیادہ پڑھوں گی..... محنت سے..... دل لگا کر.....“ چڑیا نے واپس اپنے شہر آتے ہوئے بس میں خیر دین سے کہا تھا۔ خیر دین نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی تھی اتنے مہینوں میں یہ پہلا موقع تھا جب چڑیا کی چپ خود بخود ڈوٹی تھی اور اس نے اپنی زندگی اپنی تعلیم کے حوالے سے کوئی بات کی تھی پہلے کی طرح۔ خیر دین کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ چڑیا کا سر تھکتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اس سے کہا۔

”تم صرف ڈاکٹر مت بننا بیٹا..... ایک اچھی انسان بھی بننا..... بالکل ڈاکٹر فرح کی طرح۔“ چڑیا نے سر ہلایا تھا۔ زندگی میں برے انسانوں کے ایک ہجوم سے ملنے کے بعد اسے ایک اچھا انسان بننے کی ضرورت کا زیادہ احساس ہو گیا تھا۔ ایک بچے کے طور پر بھی وہ اچھے اور برے انسانوں کا ادراک کرتے لگی تھی۔ اس سے پہلے اس نے زندگی میں صرف اچھے انسان دیکھے تھے لیکن زندگی اور دنیا صرف اچھے انسانوں سے نہیں بنتی اور نہ ہی ان کے گرد گھومتی ہے۔ اس کا احساس اسے برے انسانوں سے مل کر ہوا تھا۔ باربی ڈول کا پاپا اور اس کے نانا کے بہن بھائی..... اور گاؤں کے اسکول کے ٹیچرز اور کلاس فیلوز۔ چڑیا نے زندگی میں کبھی اچھے انسانوں کی فہرست نہیں بنائی تھی لیکن اس نے برے انسانوں کی فہرست بنانا سیکھ لی تھی۔ یہ اس نے زندگی میں بعد میں سیکھا تھا کہ اچھے انسانوں کی تو فہرست بنائی جاسکتی ہے برے انسانوں کی نہیں۔ وہ بے شمار ملتے ہیں اور ہر جگہ ہوتے ہیں۔

☆☆☆

”کتنے ویکس کا کورس ہے؟“

”ٹو ویکس کا۔“

”میں سوچ رہی ہوں ان ٹو ویکس میں، میں می کے پاس States ہواؤں..... انہوں نے بھی کتنی بار کہا ہے پچھلے سال وزٹ کے لیے۔“ شہر بانو نے شیردل سے کہا۔ وہ کسی پروفیشنل کورس کے لیے سنگاپور جا رہا تھا اور شہر بانو اور مثال کو وہ اکیلا وہاں چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ وہ انہیں لاہور اپنے پیرنٹس کے پاس چھوڑ کر جانا لیکن شہر بانو نے لاہور جانے کے بجائے امریکا جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ اپنے لپ ٹاپ پر کام کرتے ہوئے شیردل نے شہر بانو کی بات سنی جو ڈریٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنے چہرے پر مساج کرتے ہوئے اس سے باتیں کر رہی تھی۔

”تم ٹو ویکس کے لیے جاؤ گی؟“ شیردل نے کام کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”نہیں تھری ویکس کے لیے، پھر اب جا رہی ہوں تو کچھ دن رہ لوں..... ویسے تو تمہاری بیٹی نے جان کھانا شروع کر دینا ہے دوسرے ہی دن سے تمہارے لیے۔ وہ کہاں رہ سکتی ہے تمہارے بغیر زیادہ۔“ شیردل نے مسکراتے ہوئے اس کی بات سنی اور کہا۔

”صرف میری بیٹی ہی نہیں رہ سکتی میرے بغیر یا میری بیٹی کی ماں بھی؟“ وہ شہر بانو کو چھیڑ رہا تھا۔ اس نے ڈریٹنگ ٹیبل کے آئینے میں سے مسکراتے ہوئے شیردل کو گھورا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اپنے laptop پر ہاتھ چلا رہا تھا۔

”تم کو پتا ہے۔“ اس نے جتانے والے انداز میں کہا۔

”نہیں مجھ کو نہیں پتا..... تم بتاؤ۔“ وہ اسی طرح کی بورڈ پر ہاتھ چلاتے ہوئے بظاہر سنجیدگی سے بولا۔

شہر بانو کے اظہار محبت کو وہ ہمیشہ انجوائے کرتا تھا۔ ایک عجیب مردانہ تسکین ملتی تھی اسے۔

”میں بار بار نہیں بتا سکتی تمہیں پتا ہے.....“ شہر بانو نے بظاہر بے پروائی سے کہا اور کن آنکھوں سے اس کو پھر آئینے میں دیکھا۔ شیردل بستر پر بیٹھا اسی طرح laptop پر کام کرتا رہا پھر اس نے بظاہر بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔

”تم رہ سکتی ہو میرے بغیر..... I know it for a fact now۔“ شہر بانو جانتی تھی وہ اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں پر کریم کا مساج کرتے ہوئے اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ غیر محسوس انداز میں ہاتھوں پر لگی کچھ زائد کریم کو اس نے شیردل کے چہرے پر لگا کر رگڑنا شروع کر دیا۔

”مت کرو۔“ شیردل نے کی بورڈ پر ہاتھ چلاتے ہوئے گردن ایک طرف کرتے ہوئے اسے ٹوکا۔

”کیوں؟“ شہر بانو نے جیسے اسے کچھ حیران ہو کر دیکھا تھا۔

”جب تم میرے بغیر رہ سکتی ہو اور مجھے مس بھی نہیں کرتیں تو پھر مت کرونا۔“ اس نے شہر بانو کو جتانے ہوئے کہا لیکن اس بار اس نے laptop کی اسکرین پر نظریں جمائے رکھیں اور شہر بانو کو کریم چہرے پر رگڑنے دی، وہ اس کی اس ناز برداری کا عادی تھا۔

”ٹھیک ہے میں نہیں جاتی پھر۔“ شہر بانو نے اب اس کی ٹھوڑی اور گردن پر ہاتھ رگڑنا شروع کیا۔

”اس کام کے لیے ویسے ٹشو پیپر استعمال کیا جاتا ہے۔“ شیردل نے یک دم حلقی سے کہا۔ وہ بے اختیار اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے ٹھٹھکا کر ہنس پڑی۔

”کیوں یہ کیوں نہیں؟“ شہر بانو نے کچھ حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”مت change کرو یا۔۔۔۔۔ یہ اچھا لگ رہا ہے۔“ اس نے playlist میں اسکرولنگ کو روکنے کے لیے شیردل کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔ شیردل رک گیا۔

تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا  
زندگی دھوپ تم گھنا سایہ  
”گاؤ بھی شیری۔“ شہر بانو نے اصرار کیا۔ وہ اسے عجیب مشکل میں پھنسا رہی تھی اور ہمیشہ یہی کرتی تھی سوچے سمجھے جانے بوجھے بغیر۔۔۔۔۔ پتا نہیں اس کو بعض چیزیں وہی کیوں اچھی لگتی تھیں جو عکس کو پسند تھیں اور جن کو شیردل صرف عکس کے حوالے سے یاد رکھتا تھا۔ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر اس نے شہر بانو کی فرمائش پوری کرنا شروع کی۔ وہ اب مسکراتے ہوئے اس کے بازو کے گرد اپنا بازو لپیٹنے بڑی طمانیت کے عالم میں اس کے کندھے پر گال ٹکائے جگجیت کے بجائے اس کی آواز سن رہی تھی اور شیردل جگجیت کی وہ غزل گنگناتے ہوئے عکس کی آواز کی بازگشت کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ اس نے پہلی بار اس غزل کو عکس ہی سے سنا تھا۔۔۔۔۔ جگجیت کی غزل تو اس نے بہت بعد میں سنی تھی، کہیں اور جگجیت کی غزل سنتے ہوئے بھی اس کو عکس ہی یاد آتی رہی تھی۔

وہ دونوں اکیڈمی میں میوزک کلب کے ممبر تھے اور کسی سوشل ایونٹ میں اس نے پہلی بار عکس کو کسی ساز و سازندے کے بغیر یہ غزل گاتے سنا تھا۔ اکیڈمی میں بہت کم لوگ گاسکتے تھے یا گانے کا شوق رکھتے تھے۔ اس سوشل ایونٹ کے پروگرام میں ایک غزل کے لیے عکس کا نام دیکھ کر جیسے سب کو کرنٹ لگ گیا تھا۔۔۔۔۔ اس کی آواز خوب صورت تھی جس طرح اکیڈمی کی بہت سی لڑکیوں کی تھی۔ اس میں نرمی اور ملائمت بھی تھی لیکن کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کا من کی topper یہ شوق بھی رکھتی تھی۔

اس کے اسٹیج پر آکر مائیک کے ہاتھ میں لینے تک وہاں بیٹھے تمام کا من رز کو بے حد دلچسپی تھی اس کی اس قابلیت اور ٹیلنٹ کو جانچنے میں لیکن ہال میں مائیک پر اس کی آواز بلند ہوتے ہی وہاں دلچسپی اشتیاق تجسس نام کی ہر چیز غائب ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ وہاں صرف عکس مراد علی کی آواز کا جادو تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ سانس لینا، نظریں ہٹانا، حرکت کرنا یک دم ہر ایک کے لیے بے حد اضافی اور غیر ضروری سے کام ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ اور شیردل اس ساکت اور ٹرانس میں آئے ہوئے کراؤڈ کا حصہ تھا۔

آج پھر دل نے اک تمنا کی  
آج پھر دل کو ہم نے سمجھایا  
وہ اپنی آواز کی ملائمت سے وہاں بیٹھے ہر شخص کے دل کو کاٹ رہی تھی۔ کسی اضافی نشتر کے بغیر۔۔۔۔۔ ایک پلین ڈارک بلیو گرتے اور سینے پر پھیلے ہوئے شیفون کے سفید دوپٹے اور سفید چوڑی دار پاجامے کے نیچے ایک بلیو کو لہا پوری چہل پہن، ماتھے پر بار بار پھسل کر آجانے والے بالوں کو ہلکے سے جھٹکنے کانوں میں ہلکورے لیتے بڑے بڑے سلور بالوں کے ساتھ مائیک ہاتھ میں لیے ہمیشہ کی طرح وہ آج بھی پکچر پر فیکٹ تھی۔

”کریم ضائع ہوتی یار۔“ وہ بھی اب شیردل کو چھیڑ رہی تھی۔  
”ظاہر ہے میں تو important ہوں نہیں تمہارے لیے۔۔۔۔۔ تو تم جو چاہے کرو میرے ساتھ۔“  
شیردل نے کام کرتے ہوئے اسکرین پر اسی طرح نظریں جمائے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ شہر بانو نے ہنستے ہوئے اسے ایک لمحہ کے لیے hug کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں تم بالکل بھی important نہیں ہو میرے لیے۔۔۔۔۔ تم بس میرے بوائے فرینڈ ہو۔“ وہ اب بیڈ کے کراؤن سے اسی کی طرح ٹیک لگائے اس کے کندھے پر سر رکھے laptop کی اسکرین پر excel شیٹس کو اوپر نیچے ہوتے دیکھنے لگی۔

”obviously۔“ شیردل نے کہا۔  
”obviously۔“ شہر بانو نے بھی اسی انداز میں کہا۔

”چلو ٹھیک ہے پھر تم اپنی می کے پاس ہی رہنا۔“ وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔  
”تم سر جاؤ گے میرے بغیر۔“ شہر بانو نے اس کے بازو پر ایک ہلکا سا مکا مارا۔ شیردل ہنس پڑا۔  
”اور تم؟“ اس نے جو اب شہر بانو سے پوچھا۔  
”میں بھی۔“ وہ بھی ہنس پڑی تھی۔

”Good۔“ شیردل جیسے اس کے جواب سے محظوظ ہوا۔  
”کوئی song ہی لگا دو۔“ اس کے کندھے سے سر ٹکائے اس نے شیردل سے فرمائش کی۔ شیردل کے laptop میں ان دونوں کے پسندیدہ میوزک کی ایک لمبی چوڑی playlist تھی۔ وہ جب بھی رات کو بیڈ روم میں بیٹھا کام کر رہا ہوتا تو ہینڈ فری کے ساتھ میوزک بھی سنتا۔ اگر شہر بانو جاگ رہی ہوتی تو وہ دونوں کام اور باتوں کے ساتھ song سنتے رہتے۔۔۔۔۔ بعض دفعہ وہ گھنٹوں اسی طرح اس کے کندھے سے سر ٹکائے اس کو laptop پر کام کرتا دیکھتی رہتی اور میوزک سنتی رہتی۔ اس کے لیے جیسے شیردل کے ساتھ اس طرح خاموشی سے بیٹھ کر وقت گزارنا بھی کافی تھا۔ شیردل نے اس کی فرمائش پر کام کرتے کرتے رک کر میڈیا پلیئر پر کوئی نمبر ڈھونڈا تھا اور اسے لگا دیا۔ بیڈ روم میں جگجیت کی غزل۔۔۔۔۔ تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا۔۔۔۔۔ گو نہجے لگی تھی۔ اس کے کندھے سے نکلے نکلے وہ ہلکی آواز میں گنگناتے لگی۔ شیردل مسکراتے ہوئے کام کرتے اسے گنگناتے سنتا رہا۔

”تم بھی گاؤ۔“ شہر بانو نے یک دم اس سے فرمائش کی۔ وہ مسکرا دیا لیکن اس نے شہر بانو سے کچھ کہا نہیں۔

”گاؤ بھی۔“ شہر بانو نے پھر اصرار کیا۔ شیردل بہت اچھا گالیتا تھا۔  
”یار بڑی ہوں آج۔“ اس نے شہر بانو کے اصرار پر عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔  
”بس مجھے نہیں پتا۔۔۔۔۔ دولا کز ہی گاؤ۔۔۔۔۔ لیکن میرے لیے گاؤ۔“ شہر بانو نے خفا ہوتے ہوئے کہا۔  
”اوکے لیکن کوئی اور گاتا ہوں۔۔۔۔۔ یہ نہیں۔“ شیردل نے یک دم playlist کو چیک کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں تو سنا دیا نایار..... تم نے کہا تھا بس چند لائنز سنا دو میں نے سنا دیں۔“ وہ ایک بار پھر اپنا کام کھول کر بیٹھ گیا..... ضروری تھا کہ وہ اب یہ سب کچھ بھولنے کی کوشش کرتا..... فائدہ نہیں تھا اب یہ سب کچھ یاد رکھنے کا..... لیکن وہ کئی بار کوشش کے باوجود بھی یہ سب بھولنے میں کامیاب نہیں ہوتا تھا۔

”میں نے سوچا ہے امریکا سے واپس آنے کے بعد ہی اس گھر کو renovate کروں گی۔“ شہربانو ایک بار پھر اسے ماضی سے حال میں لے آئی۔ وہ ابھی دو دن پہلے ہی ٹرانسفر ہو کر عکس کی جگہ پر آیا تھا۔ شہربانو نے شیردل سے ذکر نہیں کیا تھا لیکن اسے اس جگہ میں بے حد دلچسپی تھی جہاں چند مہینے وہ عورت رہی تھی جو اس کے شوہر کا کوئی ڈارک سیکرٹ تھی۔ اس گھر میں پہلا قدم رکھتے ہی اسے یہ فرق نظر آیا تھا جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا..... یا کم سے کم اس حد تک نہیں دیکھا تھا جس حد تک وہ وہاں نظر آیا تھا۔ گھر بلا کا صاف ستھرا رکھا گیا تھا اور صفائی ستھرائی کا یہی عالم اس نے ملازموں میں بھی دیکھا تھا۔ اس نے کسی ملازم کے گندے بڑھے ہوئے بے ترتیب ہال، ناخن، دانت اور بے ہنگم شیو نہیں دیکھی تھی۔ نہ ہی کسی کو میلے، سلوٹ زدہ بوسیدہ لباس میں دیکھا تھا نہ کسی کے پاؤں میں خراب جوتے دیکھے تھے۔ شہربانو نے اس سے زیادہ مستعد عملہ بھی کہیں نہیں دیکھا تھا۔ گھر کے بیرونی گیٹ پر موجود گارڈز سے لے کر اندرونی حصے میں کام کرنے والے ملازمین تک وہ کہیں کم سے کم علیے اور مستعدی میں کوئی خامی نہیں دیکھ پائی تھی۔ گھر کے عملے پر گھر سے زیادہ توجہ دی گئی تھی اگر یہ عکس نے کیا تھا تو..... اور فوری طور پر وہ اس کا کریڈٹ عکس کو دینے سے جھجک رہی تھی۔ کوئی بھی صرف چند مہینوں میں صفائی اور مستعدی کا یہ معیار حاصل نہیں کر سکتا تھا اور عکس کو وہاں صرف چند مہینے ہوئے تھے۔

وہ پہلا سرکاری گھر تھا جس میں داخل ہوتے ہی اس کا دل خوش ہو گیا تھا۔ اس نے بہت کم سرکاری رہائش گاہوں کے لانز کو اس طرح maintained دیکھا تھا۔ اس کے اپنے گھر کا لان بھی ایک exception تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کے لیے اس نے کتنی جان ماری تھی..... گھر کے کسی فرد کی ذاتی دلچسپی کے بغیر صرف مستعد عملے کے سر پر بھی وہ سب نہیں ہو سکتا تھا جو وہ وہاں دیکھ رہی تھی۔ وہ بہار کا موسم نہیں تھا لیکن کم سے کم اس لان کے سبزے اور رنگینی کو دیکھتے ہوئے اسے یونہی لگا تھا جیسے وہ بہار کے موسم میں ہی

تم چلے جاؤ گے تو سوچیں گے  
ہم نے کیا کھویا ہم نے کیا پایا

”اس عورت کو منگر ہونا چاہیے تھا۔ یہ اکیڈمی میں کیوں وقت برباد کر رہی ہے۔“ شیردل نے وہاں بیٹھے دوسرے مردوں کی طرح ایک بے حد chauvanistic ذہن کے ساتھ سوچا۔  
غزل کب ختم ہوئی تھی اس کا احساس کسی کو نہیں ہو پایا تھا۔ جگجگت کی اس غزل میں کتنے شعر تھے۔ ہر ایک ایک دم گنتی بھول گیا تھا۔ عکس کے خاموش ہونے پر بھی ہر ایک جیسے اگلے مصرعے کے انتظار میں تھا۔ وہاں کسی نے تالی تک نہیں بجائی تھی۔ پر اس کے مائیک کو واپس اسٹینڈ پر سیٹ کرنا تھا جس نے ایک دم پورے ہال کو زندہ کر دیا تھا۔ ایک Thunderous aplause (والہانہ داد/ ستائش) تھی جو اسے ملی تھی۔ کچھ مرد کا منر نے کھڑے ہو کر اس کے لیے تالیاں مٹی تھیں۔ وہ بڑے اطمینان سے میلا لوٹ کراچی سے غائب ہو گئی تھی۔

دوسری فرنٹ رو میں بیٹھا شیردل شاید اس ہال میں بیٹھا واحد کا منر تھا جس نے عکس کے لیے تالی نہیں بجائی تھی۔ وہ مرعوب تھا۔ متاثر تھا، ٹرانس میں تھا..... سب کچھ تھا لیکن وہ الوکا پنٹھا نہیں تھا اس لیے وقتی طور پر اس نے گدھا نظر آنا زیادہ بہتر محسوس کیا ایک ساتھی کے ٹیلنٹ کو داد دیتے ہوئے ساتھیوں کے درمیان قدرے بے تاثر چہرے کے ساتھ۔ اس نے پہلے گھڑی پر وقت دیکھا تھا پھر ہاتھ میں پکڑا پروگرام چارٹ..... وہاں ایک اور گانے کے بعد اس کی پیانو پر فارمنس تھی۔ اس نے پورے پروگرام کو پڑھا..... اپنے نام کے spelling تک کر کے پڑھ لیے۔ تالیاں تب بھی بجتی رہی تھیں۔ اور جب بالآخر تالیاں ختم گئیں اور اسے سیکریٹری اگلی پر فارمنس کو اتارنے لگا تو اس نے پہلی بار اپنی سیٹ سے ذرا سا آگے ہو کر دائیں کان کی لو کھجاتے ہوئے بائیں طرف گردن موڑ کر اس دوسری فرنٹ رو کے آخر میں بیٹھی ہوئی عکس مراد علی کو پہلی ستائشی نظر سے دیکھا۔

وہ اسٹیج پر آنے والے اگلے کا منر کے لیے مسکراتے ہوئے تالیاں بجانے میں مصروف تھی۔ اس کی طرح نہ گھڑی دیکھ رہی تھی نہ پروگرام چارٹ اور نہ اپنے دائیں بائیں۔

وہ اکیڈمی کے ہر کا منر کو اس کی کسی اچھی پر فارمنس پر بلا جھجک داد دیتا تھا۔ یہ صرف عکس مراد علی تھی جس کو شیردل نے ہمیشہ نظر انداز کیا اس معاملے میں..... اس کے نزدیک عکس کے لیے ستائشی کلمات کہنا، احساسات رکھنا اور داد دینا کیوں اتنا مشکل ہو گیا تھا وہ خود کبھی نہیں سمجھ سکا۔ وہ یہ تسلیم کرنے پر بھی تیار نہیں تھا کہ وہ اس لڑکی سے خائف تھا..... اس کے رعب میں تھا..... اور بری طرح اس کی طرف اثریکٹ ہو رہا تھا اس سے بچنے کی لاکھ کوشش کے باوجود بھی..... اور یہ سب اسی طرح چلتا رہتا اگر ان دونوں کے درمیان معنی حمید نہ آ جاتا۔

”شیربی کیا سوچ رہے ہو تم؟“ وہ ایک دم شہربانو کی آواز پر چونکا تھا۔

”کچھ نہیں..... کیا ہوا؟“

”تم مجھے گانا سنا رہے تھے۔“ شہربانو نے اسے یاد دلایا۔



لیے نہیں رہا تھا کہ وہ بہت پرانا ہو چکا تھا۔ اس نے ساتھ ہی عکس سے نئے کوئنگ ریج کا مطالبہ بھی کر دیا تھا۔ اس نے شہر بانو کو عکس کا جواب بتایا تھا۔  
 ”اچھا یہ صاف نہیں ہو سکتا..... یہ چمک نہیں سکتا؟ کیونکہ یہ پرانا ہے؟“ عکس نے اس سے بے حد سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

”کی بات ہے؟“ برکت نے بڑے اعتماد سے اس کے سوال پر سر ہلاتے ہوئے ہاں کہا۔ اسے اپنی پھیلائی ہوئی گندگی کے durable (ہمیشہ رہنے) اور پکا ہونے پر جیسے اندھا اعتماد تھا۔ عکس نے جو اگلی بات کی تھی اس نے برکت اور دوسرے ملازمین کو بھونچکا کر دیا تھا۔ اس نے اسٹین لیس اسٹیل دول، گرم پانی، سرکہ اور ڈیٹرجنٹ مانگا تھا۔ برکت اور ملازمین نے کچھ خفت اور شرمندگی کے عالم میں گھبرائے ہوئے انداز میں اسے روکتے ہوئے خود اس کو کنگ ریج کو دوبارہ صاف کرنے کی یقین دہانی کرائی تھی لیکن عکس نے انہیں ڈانٹ دیا تھا۔ وہ سب گنگ اس گھر میں آنے والی پہلی خاتون ڈی سی کو اسٹیل دول اور ڈیٹرجنٹ کے ساتھ رگڑ رگڑ کر وہ کوئنگ ریج صاف کرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ کچن میں برکت کے دودھ دگار دوسرے ملازمین بھی ڈی سی کو کوئنگ ریج صاف کرتے دیکھ کر اس کے دوسرے حصوں پر سے وہ گندگی اور غلاظت صاف کرنے میں کامیاب ہوئی گئے تھے جو اس سے پہلے اترتی ہی نہیں تھی یا کم از کم اس عزم اور نیت سے کبھی نہیں اتر پائی تھی جو کام کے حوالے سے ان کا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ پرانا کوئنگ ریج اس طرح چمک رہا تھا کہ برکت اس میں اپنا، ڈی سی اور کچن کا عکس دیکھ سکتا تھا۔

”ایک گھنٹا اسے صاف کرنے میں اس لیے لگا کیونکہ یہ شاید سالوں سے اچھی طرح صاف نہیں کیا گیا..... اگر ہمیشہ سے صاف ہوتا تو یہ ہر روز صرف دس منٹ لیتا صفائی کے لیے اور اس چمک کے لیے۔“ ڈی سی نے سنک میں ہاتھ دھوتے ہوئے اس تو لیے سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے کہا جو ایک ملازم نے اس کی طرف بڑھایا تھا۔

”اگر کسی چیز کو بدل دینے کا معیار یہ ہے کہ وہ پرانی اور گندی ہو گئی ہے تو میں اس معیار پر یقین نہیں

اس گھر میں آئی تھی۔ شہر بانو کو حسرت ہی رہی تھی کہ وہ اس لان میں کہیں مٹی اور جالوں سے اٹے پودے اور اداس درخت دیکھ پاتی۔ کہیں اسے خراب اور بے ڈھنگی تراش خراش میں کچھ پودے نظر آ جاتے۔ کہیں سوکھی اور پیلی گھاس، خشک اور گلے سڑے پتوں کا کوئی ڈھیر، ٹوٹے گملوں والے پودے یا کپڑا لگی ہوئی بلیں ہی مل جاتیں..... وہاں کمال کا نظم و نسق تھا..... جو بھی کچھ تھا عدم توجہی یا بے نظمی کا شکار نہیں تھا..... اس نے یہ کریڈٹ بھی عکس کو دینے سے گریز کیا..... نئے پودوں کی پیوریوں کی قطاریں اور کیاریوں میں ننھے ننھے پودوں کے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے بھی۔

گھر کے اندرونی حصے میں کوئی نئی تعمیر اور مہنگی ترین وائرلش نظر نہیں آئی تھی..... آرائشی اشیاء کا کوئی بے ہنگم ڈھیر نظر نہیں آیا تھا۔ وہاں زیادہ تر چیزیں وہی تھیں جو یقیناً ہمیشہ سے اس ڈی سی ہاؤس میں زیر استعمال تھیں..... لیکن اس پرانے فرنیچر اور آرائشی اشیاء کو خستہ اور بوسیدہ حالت میں نہیں رکھا گیا تھا۔ پردے بھی پرانے تھے لیکن وہ تمام چیزیں بے حد صاف ستھری اور چمک رہی تھیں..... پرانے قالین یقیناً بہت اچھی طرح سے دھلوائے اور صاف کروائے جاتے تھے ان پر اگر کہیں پہلے کے کوئی نہ مٹنے والے داغ تھے تو بھی وہ بہت ہلکے تھے اور بعض چھوٹے داغوں پر چھوٹے چھوٹے rugs ڈال کر جیسے ان قالینوں کے ایسے نشانوں کو کور کر دیا گیا تھا۔ شہر بانو بھی یہ کبھی نہ جان پاتی اگر وہ وہاں آنے کے دوسرے ہی دن اتفاقی طور پر کسی ملازم کو ایک rug اٹھا کر صفائی کرتے ہوئے نہ دیکھ لیتی۔ rug کے نیچے قالین پر شاید کسی paint کا ایک داغ تھا۔ ملازم سے پوچھنے پر اسے پتا چلا تھا کہ ان چھوٹے اور سستے rugs کو عکس کی ہدایات پر خرید کر وہاں مختلف جگہوں پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ وہ نئی ترین وائرلش کے نام پر بے مقصد اخراجات سے بچنے کی ایک بے حد عمدہ ترکیب تھی۔ اس گھر میں مختلف جگہوں پر ایسے بہت سے ”رفو“ کیے گئے تھے۔ شہر بانو ہر بار ایسے کسی نئے ٹوکے کو دیکھ کر اور سن کر چند لمحوں کے لیے خاموش ہو جاتی تھی۔ وہ کبھی کسی گھر کو ان طریقوں سے maintain نہیں کر سکتی تھی یہ اس کا طریقہ ہی نہیں تھا۔

کچن اس گھر کے لان کے بعد حیران کن طور پر سب سے زیادہ صاف حصہ تھا اور اس گھر میں آنے کے بعد ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ شہر بانو awe (عجب میں آئی تھی۔ اس کے لیے گرد سے پاک چمکتا فرش، صاف ستھرے کاؤنٹر اور چمکنائی اور میل کھیل سے پاک دھلے ہوئے چمکتے سنک۔ صاف ستھری منظم کچن کپینٹس اور آٹے اور چمکنائی کی ریلوے ٹریکوں سے پاک کوئنگ ریج دیکھنا جیسے خواب دیکھنے کے برابر تھا۔ پینٹری بھی اتنی ہی صاف ستھری اور منظم تھی جتنا کچن کا باقی حصہ۔ فریج اور فریزر کو کھول کھول کر دیکھنے پر بھی شہر بانو کو گندگی نظر نہیں آئی تھی اور ایسا کیوں تھا؟ کیونکہ عکس ناشتا اور رات کا کھانا باقاعدگی سے اسی کچن میں رکھی دو کرسیوں والی ایک چھوٹی میز پر کھاتی تھی۔ اکثر رات کو وہ اسی فریج میں سے دودھ خود نکال کر چائے بناتی تھی اور اسی کوئنگ ریج پر کبھی کبھار ٹائٹ اسٹیکس تیار کیا کرتی تھی۔

”اچھا یہ صاف نہیں ہو سکتا؟“ اس گھر کے خاندان نے عکس کے حوالے سے شہر بانو کو ایک کے بعد ایک قصہ سناتے ہوئے اسے ایک واقعہ quote کیا جب اس گھر میں آنے کے بعد اس کو کنگ ریج پر جمی چمکنائی پر عکس نے اعتراض کیا تھا اور خاندان برکت نے اسے کہا تھا کہ وہ بس اتنا ہی صاف ہو سکتا تھا اور چمک اس

رکھتی۔ پرانی چیز زیادہ کارآمد ہوتی ہے..... گندی چیز صاف کی جاسکتی ہے..... میں کسی چیز کو صرف تب بدلوں گی جب وہ بے کار ہو جائے اور وہ رزلٹ نہ دے جو ہم چاہتے ہوں اور ان میں چیزوں کے ساتھ ساتھ انسان بھی شامل ہو سکتے ہیں۔“ ششہ انداز اور تمیز سے دی گئی وارننگ بجلی کے 440 وولٹ کے کرنٹ کی طرح ان سب کو لگی تھی۔ ان میں سے کوئی سرکر بھی اس ڈی سی ہاؤس کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس شہر میں کوئی دوسرا ڈی سی ہاؤس نہیں تھا۔ کمشنر ہاؤس تھا جہاں پہلے سے موجود عملہ ان کو آنے دینے والا نہیں تھا یا پھر چھوٹے موٹے دوسرے سرکاری اداروں کے سربراہان کے گھر تھے جہاں جانا ان کے لیے سولی پر لٹکنے کے برابر تھا..... ڈی سی ہاؤس میں کام کرنا جیسے خود ڈی سی ہونے کے برابر تھا۔

شہر بانو کو برکت نے باقی جذبات اور خیالات نہیں بتائے تھے۔ شہر بانو خود جان سکتی تھی کہ اس دھمکی کے بعد اس گھر میں کیا ہوا ہوگا..... عملے کی وہ مستعدی، جانفشانی اور صفائی ستھرائی اب جیسے اس کے لیے ایک راز نہیں رہی تھی۔

”میڈم نے کبھی ہمیں ڈانٹا نہیں۔“ برکت اب بھی میڈم کے لیے رطب اللسان تھا۔ شہر بانو ایک گہری سانس لے کر اس کچن سے باہر آئی تھی۔ اسے شیردل کی وہ بات اب سمجھ میں آئی تھی جو اس نے کبھی عکس کے حوالے سے اپنے کسی سچ میٹ کو کہی تھی۔

”She is a lethal administrator“ وہ lethal administrator اب شہر بانو کے سامنے ہوم ایڈمنسٹریشن کے نئے اسٹینڈرڈ سیٹ کر رہی تھی۔

اس گھر میں اخراجات کے نام پر کہیں سرکاری پیسے کا زیاں نہیں کیا گیا تھا۔ نہ وہ یہ کام خود کرتی تھی نہ اپنے عملے کو کرنے دیتی تھی۔ ملازمین کو اس حوالے سے بہت صاف اور سخت ہدایات تھیں۔ وہ اپنے کام کے حوالے سے ملازمین پر بہت زیادہ ڈیپنڈنٹ نہیں تھی۔ بہت کم ہی کبھی اس نے رات کے وقت گھر میں کام کرنے والے عملے کو اپنے کسی ذاتی کام سے بلایا تھا۔ وہ بہت سادہ کھانا کھاتی تھی۔ عام دنوں میں دن ڈش مینو اور ویک اینڈ پر ذرا زیادہ اہتمام اور ایک آدھ اور لوازمات..... گھر پر ہونے والی دعوتوں اور فیملی کے آنے پر بھی گھر کا مینو ہمیشہ budgeted ہوتا تھا۔ ایک گوشت کی ڈش، ایک سبزی، ایک دال اور سویٹ ڈش..... اور یہ کھانا صرف اس مقدار میں پکنا تھا جو مہمانوں کی تعداد اور کچن کے عملے کے لیے مناسب ہوتا۔

دودن میں ہی اس گھر میں رہتے ہوئے شہر بانو کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ملازمین عکس کے بارے میں بات کرنا پسند کرتے تھے۔ اسے quote کرنا جیسے ان کی پسندیدہ سرگرمی تھی اور اس کے حوالے سے کچھ بتاتے ہوئے ان کے لہجے میں ایک عجیب سی ایکسپریمنٹ جھلکتی تھی۔ اس کی وجہ کیا تھی یہ شہر بانو نہیں جان سکی۔ اس پوسٹ پر پہلی خاتون آفیسر کے طور پر اس گھر میں آنا..... نوکروں کو دی جانے والی خاص مراعات خاص طور پر ان کے بچوں کے حوالے سے..... یا پھر عکس کا دوستانہ مزاج..... وجہ جو بھی تھی اس گھر میں دودن اس نے صرف ”عکس نامہ“ سنا اور دیکھا تھا اور یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والی وہ اکیلی نہیں تھی۔ شیردل دوسرا victim تھا لیکن اس کے لیے یہ سب پہلا تجربہ نہیں تھا..... عکس اپنے ساتھیوں کے لیے بلاوجہ خائف کرنے والی شے

نہیں بنی تھی۔

”تمہیں نیند آرہی ہے شبی؟“ وہ اس کے کندھے سے لگی اوکھٹا شروع ہو گئی تھی جب شیردل نے کام کرتے ہوئے اچانک اس کو دیکھ کر کہا۔ شہر بانو نے چونک کر آنکھیں کھول کر اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
”نہیں تو۔“

”آرہی ہے یار..... سو جاؤ۔“ شیردل نے اس کا سر تھپکتے ہوئے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔  
”نہیں آرہی۔“ شہر بانو نے ایک بار پھر اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ ”میں song سن رہی ہوں۔“ اس نے شیردل کو جیسے جتانے والے انداز میں کہا۔

”سنو پھر۔“ شیردل نے جیسے اسے اس کے حال پر چھوڑتے ہوئے کہا۔ یہ بھی روٹین کی بات تھی۔ وہ کام کرتا رہتا وہ اسی طرح میوزک سنتی ہوئی اس کے کندھے سے لگے لگے سو جاتی۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ جب تک کام سے فارغ ہوا وہ گہری نیند میں تھی۔ اپنا laptop بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے شیردل نے سب سے پہلے اسے بڑی احتیاط سے خود سے الگ کرتے ہوئے بستر پر لٹایا، وہ چند لمحوں کے لیے کسمپانی اور اس نے نیند میں کچھ کہا پھر وہ جیسے نیند میں ہی کسی چیز سے ڈری۔ شیردل نے کسی ننھے بچے کی طرح اس کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے چند لمحوں کے لیے اسے تھپکا۔ لاشعوری طور پر وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ بے حد جاذب نظر تھیکھے نقوش اور ملائم جلد والا ایک معصوم چہرہ..... وہ سوتے ہوئے ہمیشہ بچوں جیسی معصومیت اور بے خبری سے سوتی تھی۔ اس بات سے بے پروا کہ وہ کہاں تھی اور کہاں نہیں۔ وہ غیر محسوس انداز میں اس کے چہرے پر آئے بالوں کو نرمی سے ہٹا کر سمیٹتے ہوئے اسے دیکھتا گیا۔ اس نے زندگی میں شہر بانو سے زیادہ بے ضرر اور سادہ طبیعت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اپنے حال میں مگن مزے سے اپنی زندگی اپنے طریقے سے جینے والی..... اس نے شادی سے پہلے اور بعد اتنے عرصے میں کبھی شہر بانو سے کسی دوسرے کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سنی تھی۔ وہ اس سے بہت باتیں کیا کرتی تھی مگر دوسرے آفیسرز کی بیویوں جیسی باتیں کرتے اس نے شہر بانو کو بہت کم ہی دیکھا تھا۔ وہ بے حد حساس تھی اور شیردل کو اس بات کا اندازہ شادی سے بہت پہلے ہو گیا تھا۔ اس نے شہر بانو کا ہمیشہ اس سے زیادہ خیال رکھا تھا جتنا وہ رکھ سکتا تھا۔ وہ جذباتی طور پر اس سے کس قدر اٹیچڈ تھی اور کس حد تک اس پر ڈیپنڈنٹ تھی شیردل اس بات سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ شیردل ساری زندگی بے حد اسٹاکش، اسارٹ، خوب صورت اور تیز طرار لڑکیوں کی طرف اٹریکٹ ہوتا رہا تھا انہی کی کمپنی پسند بھی کرتا تھا۔ شہر بانو اور اس کے درمیان کیا کنکشن بنا تھا..... کیا common پوائنٹس نکل آئے تھے۔ اسے کبھی سمجھ میں نہیں آیا..... شہر بانو بے حد حسین اور اسٹاکش تھی لیکن وہ easy-going آرام طلب نہیں تھی نہ ہی تیز طرار۔ وہ لیے دیے رہنے والی ایک لڑکی تھی اور اس کے باوجود شیردل اس کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔ اس حد تک کہ وہ اس کو اپنی زندگی کا حصہ بنا بیٹھا تھا اور ان تمام سالوں میں وہ جب بھی اس فیصلے کے بارے میں سوچتا وہ اسے اپنی زندگی کے سب سے اچھے فیصلوں میں سے ایک سمجھتا تھا۔

نیند میں ہی شہر بانو نے اپنا ہاتھ بڑھا کر لاشعوری طور پر اس کی شرٹ کو اپنی مٹھی میں لیا تھا۔ شیردل ایک

لمحے کے لیے چونکا پھر وہ ایک بار پھر اس کے گہری نیند میں جانے کا انتظار کرنے لگا تاکہ اس کا ہاتھ اپنی شرٹ سے ہٹا کر بستر سے اٹھ سکے۔ وہ ہمیشہ سوتے ہوئے اسے اسی طرح پکڑ کر سوتی تھی۔  
 ”میں جب تمہارے پاس ہوتی ہوں تو مجھے ڈر نہیں لگتا۔“ وہ اکثر اس سے کہتی تھی۔  
 ”کس چیز کا ڈر؟“ وہ شروع، شروع میں اس سے پوچھا کرتا تھا۔

”کسی بھی چیز کا ڈر۔“ وہ جواباً کہتی۔  
 ”مثلاً؟“ شیردل کو curiosity (تجسس ہوتی۔)  
 ”تمہارے کہیں چلے جانے کا ڈر۔“ اس نے پہلی بار اس کے پوچھنے پر چند لمحے خاموش رہ کر کہا تھا۔ شیردل اس جواب پر حیران رہ گیا تھا۔ اسے کم از کم اس جواب کی توقع نہیں تھی۔  
 ”میں کہاں جاؤں گا یا۔۔۔؟“ اس نے اسی حیرانی میں پوچھا تھا۔  
 ”مجھے چھوڑ کر۔“ شہر بانو کے اگلے جملے نے اسے اور حیران کیا۔ وہ چند لمحے اس کی شکل دیکھتا رہا پھر ہنس دیا۔

”تمہیں چھوڑ کر۔۔۔؟“ کیا بے وقوفی کی بات ہے شبی، میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ تم سوچ بھی کیسے سکتی ہو یہ؟“ اس نے تب بھی شہر بانو کو اپنے بازو کے حصار میں لے لیا تھا۔ شہر بانو نے اس کو جواب دینے کے بجائے اس کے سینے میں منہ کو چھپا لیا تھا۔ شیردل کو لگا تھا وہ اس کا یہ اندیشہ دور کرنے میں کامیاب رہا تھا لیکن بہت آہستہ آہستہ اسے احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ اس کا یہ اندازہ غلط تھا۔ شہر بانو شدید قسم کے عدم تحفظ کا شکار تھی اور اس وقت سے تھی جب اس کا باپ اس کی زندگی سے پہلے parents کی divorce (طلاق) کی صورت میں نکل گیا۔۔۔۔۔ بعد میں خود کشی کی صورت میں ہمیشہ کے لیے۔۔۔۔۔ وہ باپ کی زندگی تک اس کے پاس ایک اکلوتی اولاد کی شکل میں خوش و غرم رہی تھی۔ ایک خوش باش، پُر اعتماد بیٹی۔۔۔۔۔ فیملی کے ٹوٹنے نے اس بیٹی کی شخصیت کو بہت مسخ کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر اس کے باپ کی خود کشی نے۔۔۔۔۔ زندگی شہر بانو کے لیے دوبارہ ویسی نہیں ہو سکتی تھی جیسے اس کے باپ کے ساتھ تھی۔۔۔۔۔ وہ علاوہ ساری عمر ساتھ لے کر چلی تھی اور اس خلا نے اس کے اندر بہت سارے خلا پیدا کر دیے تھے۔ شیردل اس کی زندگی میں مرہم کے ایک پھاہے کی طرح آیا تھا۔ سیٹھ اور سہارا دینے والے ہاتھوں کی طرح اور بہت صحیح وقت پر آیا تھا۔۔۔۔۔ شیردل نے واقعی اسے سمیٹ لیا تھا۔۔۔۔۔ وہ شہر بانو کے بارے میں overprotective (حد سے زیادہ نگہبان) تھا۔ محبت اور شادی کے رشتے میں بندھ جانے کے بعد بھی بہت وقت لگا تھا اسے شہر بانو کو یہ یقین دلانے میں کہ وہ صرف اس کا تھا اور کوئی بھی چیز اسے اس سے الگ نہیں کر سکتی تھی۔ شہر بانو کو چھوڑ جانے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

عکس شیردل کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت تھی، شہر بانو دوسری، شیردل کے لیے ہمیشہ یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ ان میں سے کس سے زیادہ محبت کرتا تھا کس کو اپنی زندگی سے الگ رکھ کر خوش رہ سکتا تھا۔ عکس اس کی زندگی کا حصہ نہیں تھی۔ اس سے مہینوں رابطہ نہ ہونے کے باوجود کوئی دن شیردل کی زندگی میں ایسا نہیں گزرا تھا جب شیردل کو اس کا خیال نہ آیا ہو۔ وہ لاشعوری طور پر اس کو سوچتا تھا اسے مٹ کر دیتا تھا۔ اپنی

زندگی میں ہونے والی ہر نئی development کو سب سے پہلے اس کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا تھا۔ کسی بھی مسئلے میں پھنس جانے کے بعد سب سے پہلے اس کے ساتھ ڈسکس کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے سامنے نہ ہونے کے باوجود اس کے ساتھ چلتی تھی، ساتھ رہتی تھی، ساتھ جیتی تھی۔ ایک عکس کی طرح جو زندگی کی ہر منعکس کرنے والی شے پر ابھرتا تھا۔

شہر بانو اس کی زندگی کا کلمہ تھا جو ہر وقت اس کی زبان پر رہتا تھا۔ وہ اس سے جو کہتی تھی جو کر رہی ہوتی تھی وہ شیردل کی زبان پر آ جاتا تھا۔ اس کی خوشی، خفگی شیردل کے دن بتاتے بگاڑتے تھے۔ وہ عکس سے اظہار محبت کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ شہر بانو سے اظہار محبت سے بغیر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

سسٹر اینکس کو لگا ڈی سی پاگل تھا یا اس کا ذہنی توازن خراب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ چند مہینے پہلے اس بات پر وہاں ہنگامہ کر کے گیا تھا کہ ایک نوکر کی نوای کو بھیجا جانے والا وارنٹک لیٹر اس کی بیٹی کے ہاتھ کیوں بھیجا گیا تھا اور وہ آج پھر وہاں اس مطالبے کے ساتھ آیا تھا کہ اس بیٹی کو اسکول سے نکال دیا جائے۔ اس کا نانا چور تھا اور اسے ڈی سی ہاؤس سے اسی وجہ سے ملازمت سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ خیر دین کے حوالے سے یہ انکشاف سسٹر اینکس کے لیے شاکنگ تھے لیکن اس سے زیادہ شاکنگ اس ڈی سی کا رویہ تھا جس نے پہلے یہ مطالبہ اپنے آفس میں بیٹھے اپنے پی اے کے ذریعے اس تک پہنچایا تھا پھر خود فون پر یہ مطالبہ دہرایا تھا اور اب اسے اطلاع دیے بغیر اس کے آفس میں آن دھمکا تھا۔

سسٹر اینکس کے لیے اپنا غصہ کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اس سے پہلے اسکول میں ایڈمیشن کے لیے انتظامی مشینری کا دباؤ برداشت کرتی رہی تھی لیکن یہ پہلا موقع تھا جب کسی بیٹی کو اسکول سے نکلوا دینے کے لیے انتظامی مشینری سرگرم نظر آرہی تھی۔ اس نے ڈی سی کے ساتھ جتنی نرمی اور تہذیب کا مظاہرہ کرنا ممکن تھا کیا لیکن ایک پوائنٹ پر آ کر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

"I cant take it any more - Please leave my office right away" (میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ اسی وقت میرے آفس سے چلے جائیں) باربی ڈول کا باپ بری طرح بھڑکا تھا۔ اس کی زندگی میں یہ دوسری بار ہوا تھا جب کسی نے اس سے اس طرح بدتمیزی سے بات کی تھی اور دونوں دفعہ یہ کارنامہ اسی عورت نے سرانجام دیا تھا جو اس کے سامنے ایک اسکول کی پرنسپل والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

"you dare not talk to me like that if you want to continue this job. You have no idea what I can do to remove you from this post" (اگر تم اپنی نوکری جاری رکھنا چاہتی ہو تو تم مجھ سے اس طرح بات کرنے کی جرات بھی مت کرنا، میں تمہیں اس پوسٹ سے ہٹانے کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہوں تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے) وہ بالکل ہی ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔

Mr DC if this is a challenge then. I take it. Please leave my office immediately. I have to meet some other visitors as

(ڈی سی صاحب، اگر یہ ایک چیلنج ہے تو میں اسے قبول کرتی ہوں۔ برائے مہربانی آپ فوراً میرے آفس سے نکل جائیں۔ مجھے کچھ اور لوگوں سے بھی ملاقات کرنی ہے)

وہ اب کچھ بھی کہے بغیر سرخ چہرے کے ساتھ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور یہ اچھا ہی ہوا اور نہ اب بھی وہ کھڑا نہ ہوتا تو سسٹراٹیکنس وہاں سے اٹھ جاتی۔ اس نے مزید سسٹر سے کچھ نہیں کہا تھا۔ بس تقریباً دروازہ توڑنے والے انداز میں کھول کر وہ وہاں سے نکلا تھا۔ اس کے جانے کے بعد سسٹراٹیکنس بہت دیر پریشانی کے عالم میں وہاں بیٹھی رہی۔ وہ اس سے خوف زدہ نہیں تھی لیکن اس کے باوجود وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ ڈی سی کے اختیارات اور پاورز کیا تھیں وہ کیا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے اسکول اور اس کو مشکل میں ڈالنے کے لیے۔ اسے یقین تھا آج نہیں تو کل اسے کیتھولک بورڈ آف ایجوکیشن سے فون آنے ہی والا تھا۔ وہ اسے اتنی دھمکیاں دے کر گیا تھا، کچھ نہ کچھ تو کرتا ہی..... لیکن اسے یقین تھا کہ کیتھولک بورڈ کا اسٹینڈ بھی اس ایڈوکیٹ پر ہی ہوگا جو اس کا تھا لیکن اس معاملے کے مزید بگڑنے سے پہلے اس کا خیر دین کے معاملے کو Interrogate (چھان بین) کرنا ضروری تھا۔ اس نے خیر دین کو دوسرے دن ہی اسکول بلوایا تھا اور جب اس نے ڈی سی کا مطالبہ اور الزامات خیر دین کے سامنے دہرائے تو اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔

بعض دفعہ انسان لاکھ کوشش کے باوجود بھی اپنا پردہ نہیں رکھ پاتا، وہ جیسے بچ چوراہے میں جا کر پھوٹتا ہے اور خیر دین کے ساتھ بھی اس وقت یہی ہو رہا تھا۔ اس نے سسٹراٹیکنس کو اپنی صفائی دینے کی کوشش کی اور پھر جیسے خود پر قابو نہ پاتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

اس دن جو کچھ سسٹراٹیکنس نے خیر دین سے سنا تھا اس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ چڑیا ان کی فیورٹ اسٹوڈنٹس میں سے تھی اور انہیں وہ سب کچھ سنتے ہوئے جیسے دلی رنج ہوا تھا۔ وہ اب چڑیا کی اس حالت کو سمجھ سکتی تھیں جسے وہ پہلے سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔ خیر دین ان کے سامنے کرسی پر بیٹھے روتے ہوئے سر جھکائے انہیں سب کچھ بتاتا رہا اور وہ تاسف سے سر ہلاتی رہیں۔ ان کے پاس وہ الفاظ نہیں تھے جن میں وہ خیر دین سے ہمدردی کا اظہار کرتیں یا اپنے رنج کو بیان کر پاتیں۔

☆☆☆

ایک آدمی نے ریڑھی پر پڑا پھل بڑے بڑے لفافوں میں بھر کر گاڑی کے اندر پھینکنا شروع کر دیا تھا۔ دوسرے نے دال کا دیگ اٹھا کر وہیں فٹ پاتھ پر الٹا دیا تھا۔ خیر دین نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی۔ ان کو روکا لیکن وہ کامیاب نہیں ہوا..... وہ تعداد میں زیادہ تھے اور سرکار کے آدمی تھے..... اور چڑیا اس سب کے دوران بے حد خوف زدہ روتے ہوئے خیر دین اور اپنے اوپر ٹوٹنے والی ایک اور قیمت دیکھتی رہی۔ وہ ان کا رزق تھا جو وہ چھین کر لے گئے تھے۔ ریڑھی پر اب کچھ بھی نہیں تھا جو تھا وہ زمین پر بکھرا ہوا تھا صرف لوگوں کا ایک جھوم تھا جو یہ تماشا دیکھنے کے لیے وہاں آن کھڑا ہوا تھا۔

اس نے آخری بار جب اس آئینے میں اپنا عکس دیکھا تھا تو اس کا لباس اور اس کا چہرہ..... اس کا جسم..... اور ان تینوں چیزوں سے بھی بڑھ کر اس کی روح، اس کی زندگی اور اس کے وجود کے پرچے اڑ گئے تھے۔ اب 26 سالوں بعد وہاں اس آئینے کے سامنے کھڑے اپنے آپ کو دیکھنا کیسا صبر آزما کام تھا کوئی اس سے پوچھتا..... لیکن اگر کسی کو یہ پتا ہوتا کہ وہاں اس پر اور اس کے خاندان پر کیا گزری تھی تو کوئی بھی اس سے کچھ بھی نہ پوچھتا۔

وہ ایک نظر جو اس آئینے کے سامنے سے جیتنے چلاتے اس نے اپنے چہرے پر ڈالی تھی، وہ چند سیکنڈ اس کے اندر سمندر کی کسی شوریدہ سرلہر کی طرح پلٹ کر آئے تھے..... سب کچھ اٹھل پھٹل کرتے۔ ایک طوفان تھا جو اس کے اندر آیا تھا اور جو اس کی آنکھوں میں آیا تھا۔ پانی نہیں تھا وہ جو اس کی آنکھوں سے برس رہا تھا۔ پانی ہوتا تو بہہ جاتا ہاتھ سے پونچھ لیا جاتا، وہ تو آبلے تھے جو اس گھر میں داخل ہو کر اس آئینے تک آتے آتے یوں پھوٹے تھے کہ پھوٹتے ہی چلے گئے تھے اور کیا کیا تھا جو ان آبلوں سے نہیں بہہ نکلا تھا..... درد کا ایسا سمندر اس کے اندر اتنے سالوں سے یوں قید تھا اس کو خود بھی کبھی پتا نہیں چلا۔ تکلیف تو تھی..... اذیت تو تھی..... جس کو اپنے وجود کے اندر مقید کرتے کرتے اس پر خاموشی کے تالے لگاتے لگاتے اس نے بہت سا وقت گزار دیا تھا اور وہ تکلیف وہ اذیت یوں پٹی بڑھی تھی اس کے اندر کہ ایک نظر سے سمندر ہو گئی تھی۔

اس گھر کے دروازے پر اس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر رونا اس کی زندگی کی خواہشات میں کبھی شامل نہیں تھا۔ اس گھر کو دوبارہ دیکھنا وہاں دوبارہ آنا تھی اس کی زندگی کی خواہشات میں نہیں تھا لیکن وقت اسے وہاں لے آیا تھا اور کیسے لے کر آیا تھا..... آبلوں سے رسنے والی اذیت، ذلت اب تشکر بننے لگی تھی..... عاجزی، احسان مندی، تشکر، اس کائنات کا حاکم..... اس ذات کے لیے تشکر اور احسان مندی..... جو دن پلٹا سکتا تھا اور جس نے دن پلٹا دیے تھے۔

زمین پر گھٹنوں کے بل گرتے ہوئے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اس نے اس گھر کے حاکم کے طور پر پہلا سجدہ کیا تھا اور وہ سجدہ کبھی ختم نہ ہوتا اگر وہ مہربان نرم مضبوط ہاتھ اس کی پشت کو مشفقانہ انداز میں نہ ٹھکنے لگتا..... اس نے اس کی تمام بدایات اور نسیجوں کو یکسر فراموش کر دیا تھا۔

اس ہاتھ نے سہارا دے کر اسے اوپر کھینچ لیا تھا..... ساری زندگی اس ہاتھ نے یہی کیا تھا اس کے لیے..... اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اپنے ساتھ اسے کسی ننھے بچے کی طرح چپکائے..... وہ دونوں اس گھر کے اندر جا رہے تھے۔ وہ صرف ایک چیز باہر بھول گئے تھے۔

☆☆☆

اس نے زندگی بھر ریڑھی لگا کر رزق نہیں کمایا تھا۔ اس نے ساری زندگی ایک ڈی سی ہاؤس میں بڑی عزت کے ساتھ رزق کمایا تھا..... ذلت اور زوال کا سفر صرف چند ماہ پہلے شروع ہوا تھا اس کے لیے۔ وہ ہمیشہ سے ایک ریڑھی والا ہوتا تو میونسپلٹی کے ان لوگوں کو چار گالیاں دیتا، تھوکتا یا ان کی نہیں کرتا، ان کو رشوت دینے کی کوشش کرتا..... مگر شرم سے ڈوب مرنے کی جگہ نہ تلاش کر رہا ہوتا..... نہ ہی اس کا چہرہ سرخ ہوتا نہ اس کی آنکھوں میں آنسو آئے ہوتے..... لیکن.....

خیرین اپنی نواسی کے ساتھ اس ہجوم کے بیچ میں سرکس کے اس جالور کی طرح کھڑا تھا جس کو سدھائے بغیر رنگ میں اتار دیا گیا تھا۔ وہ مجمع اب آہستہ آہستہ چھٹنے لگا تھا، تماشا ختم ہو گیا تھا۔ چند ہزار روپے سے اس ریڑھی پر کیا جانے والا وہ بزنس چند منٹوں میں ختم ہو گیا تھا۔ قرض کی وہ رقم جو خیرین نے اپنے دوست سے لی تھی شہر میں آنے سے پہلے اور جس سے اس نے یہ روزگار شروع کیا تھا وہ جیسے پلک جھپکتے میں ڈوب گئی تھی۔

میونسپلٹی کے لوگ جاتے جاتے اس ریڑھی کو وہاں موجود کھمبے کے ساتھ ایک تالے والی زنجیر کے ساتھ پیل کر گئے تھے..... اور اس کا قصور کیا تھا یہ اس فنٹ ہاتھ پر موجود لوگوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ صرف خیرین تھا جو سمجھ سکتا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا کیوں ہوا تھا۔ اس فنٹ ہاتھ پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دال چاول کی بھی ریڑھیاں تھیں

اور پھلوں کی بھی..... وہ ایک مصروف فٹ پاتھ تھا وہاں ایسی ریڑھیوں کا موجود ہونا کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن میونسپلٹی کے اہلکاروں کا وہاں آکر صرف خیر دین کی ریڑھی کو ان تمام ریڑھیوں میں سے شناخت کر کے اس کا نام پوچھنے کے بعد اس کا سامان یہ بتا کر ضبط کر لینا کہ اسے وہاں کام کرنے کا حق نہیں ہے کسی وجہ کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا اور وہ وجہ میونسپلٹی کے ایک اہلکار نے بے حد درشت لہجے میں اسے جاتے جاتے بتا دی تھی۔

”ٹم اس شہر میں کہیں بھی ریڑھی نہیں لگا سکتے اگر یہ کام کرنا ہے تو اس شہر سے چلے جاؤ۔“ وہ دھمکی تھی تنبیہ تھی، اعلان تھا یا چیخ..... خیر دین جانتا تھا وہ صرف ایک ہی شخص کی طرف سے آیا تھا جو اس شہر کا بادشاہ تھا اور جس کے بغیر اس شہر میں واقعی ایک پتا بھی نہیں مل سکتا تھا۔ خیر دین کے ارد گرد اکٹھا ہونے والا سارا مجمع آہستہ آہستہ چھٹتا گیا تھا۔ اس پاس کی ریڑھیوں اور دکانوں والے اس پراسرار صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے واپس اپنی اپنی جگہوں پر جا رہے تھے، صورت حال ان کو پراسرار نہ لگتی تو کیا لگتی۔ وہ ایک آدمی جس نے چند ہفتے پہلے وہاں ریڑھی لگانا شروع کی تھی آج بغیر کسی وجہ کے اس کی ریڑھی اور اس کے سامان کو بجتی سرکاریوں ضبط کر لیا گیا تھا اور وہ آدمی وجہ کیوں نہیں بتا رہا تھا.....

زار و قطار روتی ہوئی چڑیا نے فٹ پاتھ اور سڑک پر ریڑھی کے آس پاس بکھرے ہوئے ان پھلوں کو اٹھانا شروع کر دیا تھا جو میونسپلٹی کے اہلکاروں سے پھل اٹھاتے ہوئے زمین پر گر گئے تھے۔ اپنی قمیص کے دامن میں سسکیوں اور ہچکیوں سے روتے ہوئے اور بازو سے ناک اور آنکھیں رگڑتے ہوئے اس نے فٹ پاتھ اور سڑک پر گرا ہوا اپنا ایک ایک پھل چن لیا تھا۔

ایک بچے کے طور پر وہ اپنا سرمایہ اکٹھا کر رہی تھی جو ڈوبنے سے بچ گیا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ان بچے کچھے پھلوں سے وہ ریڑھی نہیں بھر سکتی تھی۔ وہ بزنس دوبارہ نہیں چل سکتا تھا۔ وہ پھر بھی ایک بچے کی لاشعوری معصومیت اور ڈیفنس میکانزم کے تحت وہ سب کچھ بچانے کی کوشش کر رہی تھی جو اسے بچتا نظر آ رہا تھا اور خیر دین نے اسے اس کوشش میں مصروف پا کر ایک عجیب سا حوصلہ پایا تھا۔ یہ سبق اسی کا تو دیا ہوا تھا چڑیا کو..... وہاں بت بن کر کھڑا رہ کر اس دھواں اڑانی بہت دور موڑ مڑنی میونسپلٹی کی گاڑی کو حسرت و یاس کی نظروں سے دیکھتے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا..... ان دس چندرہ پھلوں کو اٹھا لینے اور بچا لینے کا تھا..... وہ بیک کروٹوں میں نہ بدلتے لیکن کم سے کم تین وقت کے لیے ان کا پیٹ بھر سکتے تھے۔

خیر دین نے جب تک حوصلہ پکڑا تھا چڑیا زمین پر گرے سارے پھل ریڑھی پر ڈال چکی تھی..... وہ ریڑھی جو صرف آدھے گھنٹے پہلے پھلوں سے بھری ہوئی تھی اس میں اب کچھ گروڈا لودیب اور آم پڑے جیسے خیر دین اور چڑیا کا منہ چڑا رہے تھے۔ خیر دین بوجھل قدموں کے ساتھ چلتا ریڑھی کے پاس کھڑی چڑیا کے پاس آ گیا جواب ریڑھی پر پڑے ایک کپڑے کے ساتھ ان گروڈا لود پھلوں کو صاف کر رہی تھی، وہ خیر دین کے لیے بس یہی کر سکتی تھی، نو سال کی عمر کی ایک بچی کے پاس خیر دین کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا لیکن آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ ہچکیوں سے روتے ہوئے ان پھلوں کو صاف کرتے چڑیا نے سوچا تھا وہ زندگی میں کبھی نہ بھی اپنے نانا کو ایک پھلوں سے بھری ہوئی خوب صورت ریڑھی ضرور ملے کر دے گی۔ جس میں ہر رنگ اور ہر موسم کا بہترین پھل ہوگا، اس سے کہیں زیادہ تعداد میں اور کہیں زیادہ اچھا جتنے میونسپلٹی کے وہ اہلکار اٹھا کر لے گئے تھے۔

خیر دین نے سڑک پر پڑی ایک اینٹ اٹھا کر اس زنجیر کو توڑ ڈالا تھا جو میونسپلٹی کے اہلکار اس کی ریڑھی کے پیسے کو کھبے کے ساتھ باندھنے کے لیے ڈال گئے تھے۔ نانا اور نواسی ریڑھی کو دھکیلتے ہوئے خاموشی کے عالم میں وہاں سے لے گئے تھے، روز وہ باتیں کرتے گھر جاتے تھے آج پہلی بار وہ سفر گوشتوں کی طرح طے ہوا تھا۔

وہ ان تینوں کے لیے ایک اور برا دن تھا۔ اس دن بھی خیر دین، حلیمہ اور چڑیا نے کچھ نہیں کھایا۔ اس رات بھی چڑیا

نے اپنے نانا اور حلیمہ کو باتیں کرتے اور روتے ساری رات جاگتے دیکھا تھا اور اس دن بھی چڑیا نے اپنے پاس موجود ایک چھوٹی سی ڈائری میں ان تمام چیزوں کی فہرست میں جو وہ اپنے نانا کو دینا چاہتی تھی ایک پھلوں والی ریڑھی کا اضافہ بھی کیا تھا۔

خیر دین اگلا ایک ہفتہ شہر میں کہیں بھی ریڑھی نہیں لگا سکا۔ وہ خائف تھا..... نقصان سے، ذلت سے اور قسمت سے جواب اس پر اوجھے سے اوجھا دار کر رہی تھی۔ اس کے پاس اتنی جمع پونجی تھی کہ وہ ایک بار پھر ریڑھی کو پھلوں سے اور دال کے دھچکے کو دال سے بھر کر بازار لے جاتا..... لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنا بڑا رسک لے یا پھر اپنا کام کرنے کے بجائے کسی کے پاس محنت مزدوری کر لے۔

ایک ہفتے کے بعد وہ ایک اور ہفتہ جگہ جگہ مزدوری کی تلاش میں پھرتا رہا..... جس عمر میں وہ کام تلاش کر رہا تھا اس عمر کے لوگوں کو مالک کام سے فارغ کر رہے ہوتے تھے۔ ایک ہفتے تک دھکے کھاتے رہنے کے بعد اور گھر میں پڑی ہوئی جمع پونجی کو ہر روز گھٹتا دیکھتے رہنے کے بعد خیر دین نے ایک بار پھر خطرہ مول لے ہی لیا تھا۔ وہ دال کا دھچکا اور ریڑھی کو پھلوں سے بھر کر ایک بار پھر رزق تلاش کرنے نکل پڑا تھا لیکن اس بار اس نے پہلے والے فٹ پاتھ پر ریڑھی نہیں لگائی تھی۔ وہ ایک گنجان بازار میں جیسے چھپنے والے انداز میں ریڑھی لگا کر کھڑا ہو گیا تھا..... اور سارے دھڑکوں اور خدشات کے باوجود وہ دن خیر خیریت سے گزر گیا تھا اور شام کو جب وہ دال کے دھچکے اور پھلوں کی ریڑھی سے کمائے جانے والے کچھ نوٹ اپنی جیب میں لیے لوٹا تھا تو اسے چڑیا کی زبان سے وہ خوش خبری مل گئی تھی جس کی اسے کم سے کم اس وقت توقع نہیں تھی۔

☆☆☆

باربی ڈول کا آج اسکول میں آخری دن تھا کیونکہ اس کے پاپا کی وہاں سے ٹرانسفر ہو گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر چڑیا سے ملنے آئی تھی اور اس بار اس کی مہمی اس کے ساتھ تھیں۔ باربی ڈول اپنی مہمی کا ہاتھ پکڑے انہیں جیسے ضد کرتے دیکھتے ہوئے چڑیا کی کلاس میں لے آئی تھی۔ وہ وہاں نہیں آنا چاہتی تھی کیونکہ اسے بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ ایک ایسی بچی کا سامنا کیسے کرے گی جسے اس کا شوہر اس کے نانا کی وجہ سے شدید ناپسند کرتا تھا اور جس پر اس کی چار سالہ بیٹی فریفتہ تھی۔

چڑیا کی کلاس میں آ کر اس نے ٹیچر سے چند منٹوں کے لیے چڑیا کو باربی ڈول سے ملنے کے لیے کلاس سے باہر بھیجنے کے لیے درخواست کی تھی۔ چڑیا کا دل باربی ڈول اور ڈی سی کی بیوی کو دیکھ کر بری طرح ڈوبا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر کچھ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی کیونکہ اسے فوری طور پر سمجھ نہیں آیا تھا کہ باربی ڈول کی مہمی اسے کس لیے باہر بلا رہی تھیں۔

وہ فق چہرے اور لرزرتے کانپتے جسم کے ساتھ باہر کارپڈور میں آئی تھی جہاں باربی ڈول اور اس کی مہمی کھڑی تھیں۔ اور یہی وہ پہلا موقع تھا جب باربی ڈول کی مہمی نے اس بچی کا بخور جائزہ لیا تھا جو اس کے نزدیک اس سرکاری گھر کا سب سے عجیب و غریب اور پراسرار کردار ثابت ہوا تھا جہاں رہنے کے بعد وہ جا رہی تھی۔

”بیٹا ہم لوگ یہاں سے جا رہے ہیں کیونکہ باربی ڈول کے پاپا کی یہاں سے ٹرانسفر ہو گئی ہے۔“ باربی ڈول کی مہمی نے اس سے ہاتھ ملانے کے بعد اسے بتانا شروع کیا تھا اور کئی مہینوں کے بعد وہ پہلا موقع تھا جب چڑیا نے باربی ڈول سے ہاتھ ملایا، اس کے چہرے پر نظر ڈالنے کی ہمت کی، اس کی آنکھوں میں دیکھا..... جہاں اسے اپنا عکس نظر آیا تھا..... ہمیشہ ہی آتا تھا۔

☆☆☆

عکس کی نظروں میں شیر دل کو اپنے لیے ملامت نظر آتی تھی لیکن شیر دل نے اسے ڈھٹائی سے نظر انداز کیا۔ وہ ان



ملا متنی نظروں کا عادی تھا بالکل اسی طرح جس طرح عکس اس کی ڈسٹائی کی عادی تھی۔ وہ دونوں چیف سیکریٹری کی ہنگامی طور پر بلانی جانے والی کسی میٹنگ کے لیے لاہور میں موجود تھے اور میٹنگ سے فراغت پانے کے بعد شیردل ہمیشہ کی طرح جم خانہ کے ٹینس کورٹس پر ٹینس کے لیے جا پہنچا تھا۔ وہ رات لاہور میں ہی رکنے والا تھا کیونکہ شہر بانو اور مثال بھی اس کے ساتھ ہی لاہور آگئی تھیں۔ وہ دونوں اگلی رات کی فلائٹ سے امریکا جانے والی تھیں۔

عکس نے اتفاق طور پر لاہور میں قیام کیا تھا۔ وہ اپنے شہر کے کچھ انتظامی معاملات کے حوالے سے ہونے والے ایک اجلاس میں اگلے دن بھی لاہور میں کسی وفاقی وزیر سے ملنے والی تھی جو اس کے شہر سے تھا اور اگلے دن لاہور آنے والا تھا۔ وہ اس شام فری تھی اور اسے جم خانہ شیردل نے ہی انوائٹ کیا تھا۔

”مجھے تمہاری ٹینس skill سے متاثر ہونے کا کوئی شوق نہیں ہے اس لیے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھے کہاں ملو گے؟“ سیکریٹریٹ سے میٹنگ کے اختتام پر وہاں سے جاتے ہوئے شیردل کی دعوت پر عکس نے اس سے پوچھا تھا۔ ”میرا اب تمہیں اپنی کسی بھی چیز سے متاثر کرنے کا ارادہ بھی نہیں ہے۔“ شیردل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وقت کے ساتھ ساتھ تم میں بہتری آتی جا رہی ہے۔ لگتا ہے شہر بانو کی محنت رنگ لا رہی ہے۔“ عکس نے اطمینان سے تبصرہ کیا تھا۔

”نہیں میں نے ویسے ہی تمہیں متاثر کرنے کا ارادہ ختم کر دیا ہے۔“ شیردل نے اس کی بات کے جواب میں گہری سانس لی تھی۔

”بڑی جلدی ہمت ہار دی..... ابھی تو چند ماہ ہیں میری شادی میں۔“ عکس نے جیسے اس کے جواب سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

”تم شادی کر رہی ہو اور میں بہت خوش ہوں۔“ شیردل نے اس کی بات کا نئے ہوئے دونوں انداز میں کہا۔ ”اور اس خوشی کی کیا وجہ ہے؟“ عکس نے جیسے مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا۔

”دیکھو میں اس لیے خوش ہوں کہ تم شادی کرو گی تو میرے بیٹے کو تمہاری بیٹی کے ساتھ رومانس کا موقع مل سکے گا..... تم جس طرح شادی کو مالتی آ رہی تھیں وہ میرے بیٹے کے ساتھ بھی زیادتی تھی..... میں واقعی یہ چاہتا ہوں کہ تم جلد از جلد شادی کرو ورنہ اس طرح delay کرتی رہیں تو یہ نہ ہو کہ میرے بیٹے کے بجائے میرے پوتے کو تمہاری بیٹی سے رومانس کرنا پڑے۔“ عکس کو ہنسی آئی تھی اور وہ ہنستی ہی چلی گئی۔ وہ غصہ دلانے کی ایک واضح کوشش تھی شیردل کی طرف سے جو ضائع ہوئی تھی۔

”تو تمہاری اور جوادی شادی میں، میں صرف اس حد تک انٹرنل ہوں۔“ شیردل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس نے عکس کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے لیے عکس کو دیکھنا بھی ایک آزمائش کا کام تھا اور اس طرح ہنسنے دیکھنا ایک بڑی آزمائش..... وہ بہت کم اس طرح ہنستی تھی جس طرح اس وقت ہنس رہی تھی۔ بار بار اپنی ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے اور اس میں ناکام ہوتے ہوئے..... پتا نہیں وہ اس کی بات سے محظوظ ہوئی تھی یا آج ویسے ہی اچھے موڈ میں تھی۔

”شیردل تم ایک انتہائی.....“ وہ بات کرتے کرتے پھر ہنس دی تھی۔ وہ شیردل کے اس طرح کے سنیس آف ہیومر سے اکیڈمی کے دنوں سے واقف تھی۔ وہ عکس مراد علی سے جھلاہٹ میں اسی طرح کی باتیں کیا کرتا تھا۔

”لگتا ہے صدمے سے تم پر اس طرح کے اثرات ہو رہے ہیں۔“ عکس نے بالآخر خود پر قابو پا لیا تھا۔ ”شکر ہے تم نے یہ نہیں کہا کہ لگتا ہے صدمے سے تمہارا ذہنی توازن خراب ہو گیا ہے۔“ شیردل نے تبصرہ کیا۔ ”ذہنی توازن تو خیر تمہارا ہمیشہ سے خراب تھا۔“ ”نہیں تم سے ملنے کے بعد ہوا۔“

”ویسے تمہارا بیٹا میری بیٹی سے صرف رومانس کرے گا؟“ عکس نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے بات بدلی تھی۔

”ہاں صرف رومانس۔“ شیردل نے بے حد سنجیدگی کے ساتھ دونوں انداز میں کہا۔ عکس کو ایک بار پھر ہنسی آئی۔ ”تم اس طرح ہنس کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟“ شیردل اس یار بالآخر جھلا یا تھا۔ ”یہی کہ تمہارا بیٹا باپ سے زیادہ سمجھدار ہے..... ویسے تمہارا یہ بیٹا ہے کہاں؟“ وہ اب اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

”شہر بانو expect کر رہی ہے کیا؟“ ”نہیں ہے لیکن ہو جائے گا..... اونہیں یا وہ expect نہیں کر رہی فی الحال تو وہ امریکا جا رہی ہے کل۔“ شیردل نے اسے بتایا۔ وہ دونوں اب پارکنگ کی طرف جانے کے بجائے رستے میں ہی ایک طرف کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ دل نے اسے بتایا۔ وہ دونوں اب پارکنگ کی طرف جانے کے بجائے رستے میں ہی ایک طرف کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ بھی ان کی پرانی عادت تھی وہ جہاں بھی ملتے اسی طرح مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کی طرف کھینچے چلے آتے..... اور ہر ملاقات میں وہ ایک دوسرے کو جیسے اس دن اور اس وقت تک کے اپنے تمام حالات زندگی گوش گزار کر کے ہی جاتے..... شہر بانو کو زندگی میں شامل کرنے کے بعد اور عکس کے ساتھ کچھ اختلافات کے بعد شیردل نے اپنی اس عادت اس روٹین کو بدلنے کی بہت کوشش کی تھی اور وہ اس میں کامیاب رہا تھا صرف تب تک جب تک وہ دوبارہ عکس سے نہیں ملا تھا..... اور یہی کوشش عکس نے بھی کی تھی لیکن وہ دونوں آمتنا سامنا ہونے پر ”صرف کام کی باتیں“ کرنے کے ٹاسک کو بھی پورا نہیں کر سکے تھے۔ عکس اپنے گرد ہر دفعہ تحفظات اور احتیاطوں کی نئی دیواریں چن کر آتی تھی اور ہر بار شیردل سے ملاقات کے بعد اسے ملے کے ایک نئے ڈھیر کا سامنا کرنا پڑتا۔

وہ عورتوں سے لچھے دار باتیں کرنے کا کبھی عادی نہیں رہا تھا۔ اسے کسی عورت کو اپنی انگلیوں کے گرد گھمانے کے لیے اس طرح کے حربوں یا طریقوں کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ وہ کسی بھی عورت کو flatter کے بغیر بھی چارم کر سکتا تھا..... اپنی طرف بڑی آسانی سے اٹریکٹ کر سکتا تھا اور اس آسانی نے بعض حوالوں سے صنف نازک کے لیے شیردل کی رغبت کو کم کر دیا تھا۔ لڑکیوں سے دوستی، پھر نا پھرانا، گپ شب اور اچھا وقت گزارنا ایک چیز تھی لیکن شیردل نے بھی لڑکیوں کے بارے میں سوچنے میں وقت اور انرجی صرف نہیں کی تھی..... اپنی گرل فرینڈز کے بارے میں بھی، ان چند لڑکیوں کے بارے میں بھی جن میں وقتاً فوقتاً اس کی دلچسپی دوستی سے کچھ زیادہ بڑھی تھی۔ عکس مراد علی وہ پہلی لڑکی تھی جس نے شیردل کو زچ کیا تھا، خواہ کیا تھا، متاثر کیا تھا اور جس کے بارے میں سوچنے میں اس نے گھنٹوں برباد کیے تھے، راتیں جاگ کر گزار دی تھیں اور یہ سب اس وقت سے تھا جب وہ اپنے اور عکس کے تعلق کی نوعیت کو کوئی نام بھی نہیں دے سکا تھا۔

اس کے لیے کبھی بھی عکس مراد علی کو نظر انداز کرنا، اس سے بات چیت کو صرف ہیلو ہائے تک رکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ کوشش کرنا ایک بات تھی کوشش میں کامیاب ہونا ایک دوسری بات وہ لڑکیوں سے وہ سب بھی نہیں کہا کرتا تھا جو وہ عکس سے کہا کرتا تھا۔ وہ اس کے سامنے جھلا تا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن ہر بار کسی نہ کسی طرح شیردل، عکس مراد علی کے سامنے بس جھلا کر رہ جاتا تھا۔ اس عورت پر اس کا بس نہیں چلتا تھا..... اور اس عورت پر اس کا بس کیوں نہیں چلتا تھا شیردل نے اس پر سوچنے میں بھی گھنٹوں لگائے تھے..... عکس مراد علی کو کیسے مرد اچھے لگتے تھے؟ مردوں میں کیا اچھا لگتا تھا؟ اسے یاد ہے اس نے ایک بار اکیڈمی میں دو دن ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے بعد زچ ہو کر بالآخر سیدھا جا کر عکس مراد علی سے ہی یہ سوال کر لیے تھے۔

”بیٹا تمہارا ہے نہیں..... اور تم یہ فوجی پلان کر رہے ہو اس کے لیے۔“ عکس نے اس سے کہا تھا۔ ”بے نہیں تو ہو جائے گا۔“ شیردل کا اطمینان لا جواب تھا۔ ”One never knows“ عکس نے اسے tease کیا۔

”مجھے دوسروں کا نہیں پتا لیکن ہماری فیملی میں بیٹے ضرور ہوتے ہیں..... سیکنڈ چائلڈ بیٹا ہی ہے میرا۔“ شیردل نے بلا کی خود اعتمادی سے کہا تھا۔

”تمہیں کسی نجوی نے لکھ کر دیا ہے؟“ عکس نے مذاق اڑایا۔

”تم دیکھ لینا۔“ شیردل نے اطمینان سے کہا۔

”ہو سکتا ہے اس سے پہلے میرا بیٹا ہو جائے..... اور ہو سکتا ہے کہ میرا بیٹا رومانس کرنا پسند کرے تمہاری بیٹی کے ساتھ۔“ عکس نے جتانے والے انداز میں کہا۔

”نہیں، تمہارا بیٹا میرے بیٹے کی طرح cheap تھوڑی ہو سکتا ہے۔ وہ رومانس وغیرہ تھوڑی کرے گا وہ اپنی ماں کی طرح صرف شادی کرے گا۔“ شیردل نے اس کو تپایا وہ ایک بار پھر قہقہہ مار کر ہنس دی۔ آج شیردل اسے واقعی لاجواب کرنے پر اتر ا ہوا تھا۔

”یہ رومانس وغیرہ صرف شیردل clan کام ہے، عکس مراد علی تمہارا بیٹا اپنی ماں کی طرح صرف best conduct کی ٹرائی لے گا۔“ ہنستے ہوئے عکس کا چہرہ اب سرخ ہو گیا تھا۔

”اس کی ماں نے صرف best conduct کی ٹرائی نہیں لی تھی شیردل..... لگتا ہے تمہارے زخم ابھی تک بھرے نہیں۔“ اس نے جتنے ہوئے ہی شیردل کو چھیڑا تھا۔

”میں ماضی بھول چکا ہوں خاص طور پر اکیڈمی سے پاسنگ آؤٹ ceremony“ شیردل نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”یہ بہت اچھا کیا تم نے..... ورنہ اب تک دل کی بیماری ہو چکی ہوتی تمہیں۔“ وہ اب اس پر طنز کر رہی تھی۔ اس بار شیردل ہنس دیا۔

”دل کی بیماری تو خیر اب بھی ہے مجھے۔“

”شیردل clan کی اپنی legacy ہے..... میرے clan کی اپنی ہوگی۔“ عکس نے اس کے معنی خیز انداز میں کہہ ہوئے جملے کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”تم آج کل بہت اچھے موڈ میں ہو؟“ شیردل نے بالآخر اس سے کہا۔

”تمہیں کیسے پتا؟“ وہ چونکی۔

”تمہارے ہنسنے سے۔“

”میں ہمیشہ ہنستی ہوں۔“ عکس نے اس کا مذاق اڑایا۔

”ہاں مجھ پر تو تم ہمیشہ ہنستی ہو لیکن میں بے مقصد ہنسنے کی بات کر رہا ہوں۔“

”میں بھی بے مقصد نہیں ہنستی شیردل۔“ عکس نے اسے جتایا۔

”جو ادکیسا ہے؟“ شیردل نے جواباً اس سے بات بدلتے ہوئے کہا۔

”وہ اچھا ہے۔“ جو اد کا ذکر آنے پر عکس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

”اسے ابھی لے آؤ شام کو۔“ شیردل نے بڑی فیاضانہ آفر کی۔

”اسے لے آؤں، تم سے ملوانے کے لیے.....؟ شیردل میں واقعی شادی کرنے کے سوڈ میں ہوں۔“ وہ ایک بار پھر ہنسی تھی۔

”تم کیا سمجھتی ہو میں کیا کہوں گا اس سے؟“ شیردل نے اس کی بات کا برا منایا تھا۔ ”تم سمجھتی ہو میں نہیں چاہتا کہ تم شادی کر لو۔“ شیردل اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا شیردل، تم خواجواہ کے نتیجے مت نکالو۔“ عکس بھی ایک دم محتاط ہو گئی تھی۔

”میں تم سے منسلک کسی بھی شخص کو عزت دینا چاہتا ہوں۔“ وہ اب اسے جتارہا تھا۔

”میں جانتی ہوں تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔“ عکس نے بے ساختہ کہا۔

”پھر تم نے ایسی بات کیوں کی؟“ شیردل اب بھی سنجیدہ تھا۔ عکس نے بہت نرمی سے دوستانہ انداز میں شیردل کا بازو تھپتھپایا تھا۔

”ہیلو کیا ہوا ہے تمہیں؟ کس بات کا غصہ آ رہا ہے؟“ عکس نے مسکراتے ہوئے مصالحتانہ انداز میں کہا۔ شیردل جھاگ کی طرح بیٹھا تھا۔

”شام کو مل رہے ہیں ہم۔“ اپنی شرمندگی کا اظہار کرنے کے بجائے شیردل نے ایک دم بات بدل دی تھی۔ عکس سر ہلاتے ہوئے مسکرا دی۔

وہ شام کو مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی جم خانہ کے ٹینس کورٹس پر شیردل کو ڈھونڈتے ہوئے آگئی تھی۔ شیردل کسی دوست کے ساتھ بیچ میں مصروف تھا اور اس نے فوری طور پر عکس کو نہیں دیکھا تھا۔ عکس نے بھی اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خاموشی سے پانی کی ایک بوتل لیے کورٹ کے گرد پڑی کرسیوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔ پانی کے گھونٹ لیتے ہوئے وہ بڑی دلچسپی سے شیردل کو کھیلتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وقت نے شیردل کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ عمر میں شامل ہونے والے کچھ اور سالوں نے شیردل کو پہلے سے زیادہ اثریکٹو بنا دیا تھا۔ سفید شارٹس اور بلو شرٹ میں ریکٹ ہاتھ میں لیے کورٹ پر گیند کے آگے پیچھے بھاگتے شیردل کو آج بھی کورٹ پر ٹینس کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اکیڈمی میں بھی شام کو اسی جنونی انداز میں ٹینس کی پریکٹس کرتا نظر آتا تھا اور بہت سی خواتین تماشا شاعی اس پریکٹس سیشن کو انبند کرنے میں بے حد شغف رکھتی تھیں۔ عکس ان میں سے نہیں تھی لیکن وہ شیردل کو اسپورٹس میں یوں مرکوز نگاہ سے دیکھ کر بہت محظوظ ہوئی تھی۔ کیوں ہوتی تھی یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا لیکن بہر حال شیردل پر لڑکیوں کی نظریں جمی دیکھنا عکس مراد علی کے لیے ایک بے حد دلچسپ منظر تھا۔

ایک گیند کو واپس ہٹ کرتے ہوئے شیردل نے عکس مراد علی کو سامنے والے کورٹ کے داہنی طرف رکھی کرسیوں پر بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے چونکا تھا اور بالکل اس لمحے اس کے سامنے والے کورٹ سے گیند ریٹرن ہوتی ہوئی اس کے سر کے اوپر سے اس کے عقب میں جا گری تھی۔ اس کے ساتھ کھیلتے ہوئے فرید ہمایوں کو ایسا حلوہ شاٹ کھیلنے کا موقع پورے بیچ میں نہیں ملا تھا۔ شیردل کی صرف نظر گیند سے نہیں ہنسی تھی اسے چند لمحوں کے لیے یہ طے کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا کہ وہ گیند کو ڈھونڈے یا عکس مراد علی پر نظریں جتانے کی کوشش کرے۔ بیچ سے اس کا انہماک سیکنڈز کے اندر غائب ہوا تھا۔ اس نے دور سے ہی عکس کو ہاتھ ہلایا تھا اور پھر فرید ہمایوں کے پاس جا کر اس سے بیچ کو ادھر اور اچھوڑنے کے بارے میں بتایا۔ فرید کو عکس سے متعارف کروانے کے بعد چند منٹوں تک وہ تینوں گپ شپ کرتے رہے پھر فرید نے کھیلنے کے لیے جم خانہ کے کسی ملازم کو بلوالیا تھا۔

شیردل اپنی سانس بحال کرنے کے لیے عکس کے پاس ہی اپنی کٹ اٹھا کر آ گیا تھا۔

”تم ہمیشہ میرے دشمن کے کورٹ میں ہی جا کر بیٹھنا۔“ تو لیے سے اپنے بازو، چہرہ، سر اور گردن خشک کرتے ہوئے شیردل نے جتانے والے انداز میں اس سے کہا۔

”تمہیں کچھ بھولنا کیوں نہیں شیردل؟“ عکس کو اس بار بھی اس کے تبصرے پر ہنسی آئی تھی لیکن اس نے اپنی ہنسی پر قابو پا لیا تھا۔ اس کا ریفرنس کدھر تھا وہ ایک سیکنڈ میں جان گئی تھی۔

کیا کیا بھولوں میں؟“ شیردل نے جواباً کہا۔ عکس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی پانی کی آدمی استعمال شدہ بوتل اسے تھما دی۔ اس نے شیردل کی پانی کی بوتل کو خالی دیکھ لیا تھا۔ شیردل نے بڑے معمول کے سے انداز میں پانی کی بوتل اس سے لیتے ہوئے اپنا تو لیا گھٹنوں پر پھیلا لیا تھا۔ کرسی کی پشت سے ٹپک لگاتے ہوئے عکس کی دی ہوئی بوتل سے

سب لیتے ہوئے اس نے کہا۔  
”تم آئی کب ہو؟“

”دس پندرہ منٹ ہو گئے۔“ عکس نے بتایا۔

”جلدی آگئیں؟“ شیردل نے گہری سانس لیتے ہوئے ایک اور سب لیا۔

”ہاں فارغ بھی سوچا تمہارے ساتھ ہی وقت ضائع کیا جائے۔“ عکس نے اب اپنے بیک سے ایک چیونگم ڈھونڈ کر نکالتے ہوئے شیردل کو اس کا آدھا ٹکڑا دیا اور باقی آدھا ٹکڑا اپنے منہ میں ڈال لیا۔

”اچھا کیا..... میں بھی ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔“ شیردل نے پانی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے بوتل خالی کی اور پھر چیونگم اسٹک کا رپر اتارتے ہوئے کہا۔

”جھوٹ کی حد ہوتی ہے ویسے۔“ وہ ہنسی تھی اس کی بات پر وہ چونکا۔  
”کیوں؟“

”شیردل تم ٹینس کھیلتے ہوئے کبھی کسی کے بارے میں نہیں سوچ سکتے..... میں یہ مان ہی نہیں سکتی۔ تم ٹینس کھلتے ہوئے صرف ٹینس کے بارے میں سوچتے ہو۔“ عکس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ شیردل نے چیونگم چباتے ہوئے مسکراتے ہوئے سر کھجایا۔

”جیسے ایک لمحے کے لیے سوچا۔“ شیردل نے بڑے آرام سے اس بار عکس کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے اپنی بات کی تصحیح کی تھی۔

”ہاں یہ کہو کہ ایک بار خیال آگیا۔“ عکس مسکرا رہی تھی۔

”ہاں چلو یہی سہی کہ مجھے تمہارا خیال آیا اور بالکل اسی وقت مجھے یہاں کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھی تم نظر آگئیں..... اور مجھے یقین نہیں آیا..... مجھے لگا مجھے کوئی وہم ہوا ہے۔“

”حالانکہ وہم والی کیا بات تھی.....؟ آنا تو تھا میں نے۔“ عکس نے بے پردائی سے کہا اور اس وقت ہی اس نے پہلی دفعہ محسوس کیا تھا کہ وہ اور شیردل تقریباً ایک ہی رنگ کے کپڑوں میں ملیں تھیں۔ وہ رائل بلو اسپورٹس شرٹ اور وائٹ شارٹس میں تھا اور وہ رائل بلو اور وائٹ چیکرڈ کالر والی شرٹ اور سفید شلوار اور دوپٹے میں۔ شیردل کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا اپنا مذاق اڑانے کے برابر تھا۔ اس کا اور شیردل کا مزاج نہیں ملتا تھا لیکن اس کے اور شیردل کے درمیان بہت سی باتیں اور عادتیں کا من تھیں..... یہی حال لباس اور اس کے رنگ کے حوالے سے ان کی چوائس کا بھی تھا۔

جم خانہ کے اوپن ائریٹورمنٹ میں بیٹھے باربی کیونڈننگ آرڈر دینے کے بعد..... دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے سے اپنی پوسٹ کے حوالے سے بات کرنے لگے تھے۔ بات کرنے کے دوران ہی شیردل نے اس سے گھر کے بارے میں جیسے بڑے فخر یہ انداز میں پوچھا تھا۔

”گھر تو اچھا ہے، ہوا مہیں..... کچھ نہیں کرنا پڑا ہوگا تمہیں وہاں..... شہر بانو اور میں نے بڑی جان لگائی ہے وہاں۔“ عکس اس کی بات پر مسکرا رہی تھی۔

”مجھے تم لوگوں کی جان تو وہاں کہیں نظر نہیں آئی لیکن سرکاری پیسے کا بے دریغ استعمال ضرور نظر آیا۔“ اس کے جواب نے شیردل کو جیسے کچھ نادم کیا تھا لیکن وہ نالائے والے انداز میں بات گولی کر گیا۔

”خیر اتنا بھی بے دریغ استعمال نہیں ہوا پیسے کا..... اس گھر کی حالت بہت تراب تھی جب ہم وہاں شفٹ ہوئے تھے۔ ہم نے تو مرتیں کروائیں بہت زیادہ..... اتنے بڑے گھر کی maintenance پیسے کے..... نہیں ہوسکتی اور کیا ہوا میں نے تھوڑا بہت سرکاری پیسہ اس کام میں استعمال کر لیا، سرکار کے پاس بہت پیسہ ہے۔“ شیردل نے اطمینان سے

کہا۔ عکس مسکرا دی۔

”تھوڑا بہت..... شیردل تمہارا بس نہیں چلا وہاں تم اس گھر میں بارہ دریاں بھی بنوا دیجے۔“ عکس نے جتانے والے انداز میں کہا۔ شیردل اس کی بات پر ایک بار پھر ہنس دیا۔

”یار کیا کروں میں..... میں۔“ ”دو“ عورتوں کو refuse نہیں کر سکتا۔“ عکس نے اس کے جملے پر کسی کاؤنٹر کوئچن سے بچتے ہوئے اس سے کہا۔

”تم اگر مغلوں کے زمانے میں ہوتے تو کیا ہوتے شاہ جہاں یا جہانگیر؟“ عکس کے سنجیدگی سے پوچھے ہوئے سوال پر شیردل کو بے اختیار ہنسی آئی تھی۔ وہ جوتے لپیٹ کر مارنے کی عادی تھی لیکن مارضیہ وردیتی تھی۔ اب وہ اس کے شاہانہ اخراجات کے ساتھ ساتھ اس کے کسی عورت کے کنٹرول میں ہونے کا طعنہ دے رہی تھی۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ شیردل نے جواب دینے کے بجائے اس سے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔  
”جہانگیر۔“ جواب کھٹ سے آیا تھا۔

”مجھے بھی جہانگیر ہی پسند تھا۔“ جواب ڈھٹائی سے ملا تھا۔  
”تم نے پورے سال کا بجٹ اڑا دیا ہے گھر میں..... ہر چیز کے بجٹ میں سے گھر کی maintenance پر پیسہ لگا دیا ہے اب میں کیا کروں.....؟ رپورٹ لکھوں ایک تمہارے خلاف مالی بے ضابطگی کی۔“ عکس بڑی سنجیدگی سے اس سے کہہ رہی تھی۔ شیردل کے سر پر جوں تک نہیں رہتی تھی۔

”لکھ دو..... تم ویسے بھی میری بیوی سے جیلس ہو۔“ باربی کیو کے ساتھ سر دھونے والی چٹنیوں میں سے ایک میں کانٹے کے ساتھ سلاو کے چند ٹکڑوں کو ڈبو کر کھاتے ہوئے شیردل نے اطمینان سے اسے کہا تھا۔ عکس نے ملا متی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”ہاں بس اب یہی تو ایک کام رہ گیا ہے میرے پاس کہ میں تمہاری بیوی سے جیلس ہوتی پھروں جس کے پاس ایک ایسا شوہر ہے جو بیوی کو خوش کرنے کے لیے عوام کے خون پسینے سے اکٹھا ہونے والے ٹیکسز سے لان میں ٹینس کورٹ بنوا سکتا ہے۔“ وہ جھلائی تھی۔

”یار ٹینس کورٹ تو میرا شوق تھا اس میں تو میری بیوی بے چاری نے کچھ کہا تک نہیں۔“ شیردل نے احتجاج کیا تھا۔

”وہ جولان میں عجیب و غریب قسم کی decorative لائٹس وغیرہ ہیں.....“ شیردل نے اس کی بات کاٹ دی۔

”ہاں وہ میری بیوی کا شوق تھا۔ وہ فاؤنٹین وغیرہ بھی۔ لیکن یار عجیب و غریب تو کچھ بھی نہیں تھا..... aesthetically کیا گیا تھا جو بھی کیا گیا تھا۔“ شیردل نے شہر بانو کو اس کی عدم موجودگی میں defend کیا۔

”جیسے بھی کیا گیا تھا اس کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ تم لوگوں کا ذاتی گھر نہیں تھا وہ۔“ عکس نے بھی اسی انداز میں کہا۔

”ہم ویسے شروع کرنے والے ہیں اس سال لاہور میں اپنا گھر۔“ شیردل نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ عکس جانتی تھی اس کی مذمت اور لعنت ملا مت شیردل پر کوئی اثر نہیں کرنے والی تھی۔ وہ پورو کر سکی کے جس اور والے حصے سے تعلق رکھتا تھا وہاں پبلک فنڈز کا اس طرح کا استعمال کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ وہ

technically کرپشن نہیں تھی کیونکہ وہ روپیہ کسی کی جیب میں نہیں جا رہا تھا جو کچھ بھی لگ رہا تھا وہ ایک سرکاری عمارت پر ہی لگتا تھا اور وہاں کی کوئی چیز وہ اپنے ذاتی گھروں میں نہیں لے جاتے تھے لیکن اس کے باوجود فنڈز

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2012ء

28

Scanned and Uploaded By Muhammad Nadeem

29

mis-use ہوتے تھے۔ شیردل elite کلاس سے تعلق رکھتا تھا اور اسی طرح کالائف اسٹائل رکھتا تھا۔ اس کے یا شہر بانو کے لیے سادگی اپنانا بہت مشکل کام تھا، یہ بات عکس بخوبی جانتی تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اس طرح کالائف اسٹائل رکھنے والا پہلا یا واحد بیوروکریٹ نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی مختلف پوسٹنگز کے دوران جن سینئر آفیسرز سے ملتی رہی تھی اس نے ان کے گھروں میں سرکاری خرچ پر اسی طرح کی تزئین و آرائش اور سہولیات دیکھی تھیں۔

”اوہ اچھا! great..... کہاں..... یہاں لاہور میں؟“ عکس نے اس کی اطلاع پر دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ وہ بھی اب کھانا کھانے لگی تھی۔ شیردل اسے گھر کے حوالے سے اپنی اور شہر بانو کی مجوزہ پلاننگ بتانے لگا تھا۔ وہ دلچسپی سے سنتی رہی اور وقتاً فوقتاً اس پر تبصرہ کرتی رہی۔ وہ دونوں گھر کو ڈسکس کرنے کے بعد سنگاپور میں ہونے والے اس کورس کو ڈسکس کرنے لگے جہاں جانے والے سات آفیسرز میں عکس بھی شامل تھی۔ وہ بیرون ملک ہونے والا ان کا پہلا کورس تھا۔

ڈنر کے بالکل آخر میں شیردل کا فون بجنے لگا۔ اس نے سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ شہر بانو کی کال تھی۔ کال ریسیو کرتے ہوئے اس نے عکس کو بھی انفارم کیا۔

”تم کہاں ہو شیردل؟“ کال ریسیو کرتے ہی شہر بانو نے اس سے پوچھا تھا۔  
”میں date پر ہوں۔“ شیردل نے مسکراتے ہوئے سامنے بیٹھی عکس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ سوئٹ ڈرنک کا آخری سپ لیتی عکس کے چہرے پر مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ شیردل نے اس کے چہرے کے بدلنے ہوئے تاثرات کو نوٹس نہیں کیا۔ وہ شہر بانو کی طرف متوجہ تھا جو اس کی بات پر ہنس دی تھی۔

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ اس نے کمال کی خود اعتمادی کے ساتھ کہا تھا۔ شیردل نے عکس کو اپنا بیگ سنبھال کر اٹھتے دیکھا۔ اس نے نوٹس نہیں لیا تھا وہ سمجھا وہ ریست روم جانے کے لیے ابھی تھی۔

”You are underestimating me“ وہ مسکراتے ہوئے شہر بانو کے ساتھ بات کرتا رہا۔  
اس نے ساتھ ہی ویز کو سائن کرنے کے لیے بل لانے کا اشارہ کیا تھا۔

”date خوب صورت ہے؟“ شہر بانو نے اب اس مذاق میں عملی طور پر حصہ لیتے ہوئے کہا۔  
”بہت زیادہ۔“ شیردل نے اطمینان سے کہا۔

”مجھ سے بھی زیادہ؟“ شہر بانو نے پوچھا۔

”مجھ کو لگتی ہے۔“ شیردل نے مسکرا کر کہا۔

”کوئی تمہیں مجھ سے زیادہ خوب صورت لگ سکتا ہے شیردل؟“ شہر بانو نے کہا۔

”خوب صورت کب کہا ہے۔ اچھی کہا ہے۔“ شیردل اس بار ہنسا تھا۔

”تم ویسے ہو کہاں؟“ شہر بانو نے بالآخر سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”جم خانہ میں ایک دوست کے ساتھ ڈنر کر رہا ہوں۔ تمہیں بتایا تو تھا میں نے آنے سے پہلے۔“

”ہاں لیکن میرے ذہن سے نکل گیا..... میں تو یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ ٹینس کھیلنے گئے تھے اور ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے۔“ اس کی بات سنتے ہوئے بالکل اسی وقت ویز نے اس کے قریب آ کر موڈ بانہ انداز میں جھکتے ہوئے اس سے کہا۔

”آپ کا بل کاؤنٹر پر pay کر دیا گیا ہے۔“ شہر بانو سے بات کرتے کرتے شیردل بری طرح چوٹا ہوا تھا۔ اس نے شہر بانو سے بات کرتے ہوئے خود ویز کو جھٹک کر کے بل کے بارے میں دوبارہ استفسار کیا تھا اور ویز اس کی کال کے ختم ہونے کا انتظار کرتا۔

”کس نے pay کر دیا؟“ شیردل بے حد حیران ہوا تھا۔ دوسری طرف لائن پر موجود شہر بانو یہ ساری گفتگو سن

رہی تھی۔

”میڈم نے۔“ شیردل کو اب جیسے کرنٹ لگا تھا اور ایسا ہی کرنٹ دوسری طرف لائن پر موجود شہر بانو کو بھی لگا تھا۔ وہ کیا واقعی کسی لڑکی کے ساتھ وہاں ڈنر کر رہا تھا؟

”میں تم سے تھوڑی دیر میں بات کرتا ہوں شہی۔“ اس سے پہلے کہ شہر بانو اس سے کوئی سوال کرتی شیردل نے ایک دم اس سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

”اور میڈم کہاں ہیں؟“ شیردل نے بے حد سنجیدگی سے کرسی پر سیدھا ہوتے ہوئے ویز سے پوچھا۔

”وہ تو چلی گئی ہیں۔“ شیردل کو ایک لمحے کے لیے یقین نہیں آیا کہ اس نے ویز سے یہ جملہ سنا تھا۔ اسے لگا تھا ویز کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔ ویز سے کوئی سوال جواب کیے بغیر اس نے سیل فون اٹھاتے ہوئے عکس کو کال کی سیل فون آف تھا اور یہ شیردل کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ وہ بے حد اضطراب کے عالم میں اپنی کرسی کھینچتے ہوئے کھڑا ہوا تھا اور بے حد تیز قدموں سے وہ ریسیورنٹ سے باہر پارکنگ تک آیا تھا لیکن پارکنگ تک آتے ہوئے وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عکس کو یا اس کی گاڑی کورات کے اس وقت وہاں موجود سیکڑوں گاڑیوں میں سے ڈھونڈھ لینا ناممکن تھا۔ سمجھا اسے یہ نہیں آتی تھی کہ عکس نے ایسا کیا کیوں تھا۔ عکس جہاں ٹھہری ہوئی تھی وہ اس جگہ سے واقف تھا اور پارکنگ میں پہنچ کر اس نے ڈرائیور کو سیدھا وہاں چلنے کے لیے کہا۔ دس منٹ میں وہ اس کلب میں تھا جس کے ایک رہائشی کمرے میں وہ رکی ہوئی تھی۔ ریسپشن سے اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ بھی ابھی چند منٹ پہلے ہی وہاں پہنچی تھی۔ اس نے receptionist کو اس کے کمرے کا نمبر ملانے کے لیے کہا اور عکس کے ریسیور اٹھاتے ہی receptionist کے ہاتھ سے انٹرکام لے لیا۔

”میڈم آپ ذرا باہر تشریف لائیں گی یا میں اندر آ جاؤں؟“ چند سیکنڈز کے لیے عکس بالکل بول نہیں سکی۔ شیردل کی آواز اس کے لیے اتنی ہی غیر متوقع تھی۔ اسے پتا تھا وہ اس کے اس طرح اٹھ آنے پر اب سیٹ ہو گا، خفا بھی ہو گا لیکن وہ اس کے پیچھے آ جائے گا اسے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ اس وقت خود شیردل سے اس قدر خفا تھی کہ وہ اس سے ملنا یا بات کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن اسے یہ بھی پتا تھا کہ وہ اگر اس کے پیچھے وہاں آ سکتا تھا تو اس کے لیے اس کے کمرے میں آ جانا کیا مشکل تھا۔ وہ وہاں کوئی شرمندہ کر دینے والی صورت حال نہیں چاہتی تھی۔

”میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔“ اس نے بالآخر شیردل سے کہا۔

”تھینک یو۔“ شیردل نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہہ کر فون بند کر دیا۔

وہ پانچ منٹ کے بجائے دو منٹ بعد ہی ویز ڈرائیو میں آ گئی تھی۔

”باہر لان میں چلتے ہیں۔“ شیردل اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ عکس کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ چل پڑی۔ کلب کے دروازے سے باہر نکلتے ہی شیردل نے بے حد خفگی کے عالم میں اس سے کہا۔

”میں نے کسی عورت کو اس سے زیادہ بچکانہ حرکت کرتے نہیں دیکھا..... تم یہ کیسے کر سکتی ہو عکس؟“

”ہم نے ڈنر کر لیا تھا اور بل دینا کوئی گناہ نہیں ہے۔“ عکس نے اسی ٹھنڈے انداز میں کہا۔ وہ دونوں اب لان میں نکل آئے تھے اور لان میں آتے ہی شیردل نے رکتے ہوئے اس سے کہا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ وہ اتنا بے وقوف بہر حال نہیں تھا کہ اب بھی سمجھ نہ سکتا کہ عکس کو کچھ برا لگا تھا جس پر وہ خفا تھی۔

”شیردل میں تمہاری date نہیں ہوں۔“ عکس نے اس کے سوال پر کسی توقف کے بغیر بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔ وہ چند لمحے اس کا چہرہ بے یقینی سے دیکھتا رہا پھر ہنس دیا۔

”تم اس بات پر ناراض ہوئی ہو.....؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ اس کا سرد واقعی گھوم کر رہ گیا تھا۔ وہ اتنی بڑی

بات نہیں تھی جس پر عکس یوں ری ایکٹ کرتی۔

”میں تمہیں دوست سمجھ کر تمہارے ساتھ وہاں ڈنر کے لیے گئی تھی..... تمہیں اگر dating کا شوق ہے تو اس کے لیے لاہور بھرا پڑا ہے لڑکیوں سے۔ بلکہ وہ تمہیں وہاں جم خانے میں بھی مل جاتیں۔“ عکس نے اس کی ہلکی کونظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”میں مذاق کر رہا تھا عکس۔ تم جانتی ہو۔“ شیردل اس کے انداز پر ایک بار پھر حیران رہ گیا تھا۔

”مذاق میں بھی مجھے تمہاری بات بہت insulting لگی۔“ عکس نے اسی انداز میں کہا۔

”I am sorry“ میں نے کہانا میں مذاق کر رہا تھا..... تم جانتی ہو میری عادت کو..... اور تم سوچ سکتی ہو کہ میں تمہیں date سمجھ رہا تھا۔“ شیردل نے بے حد تحمل سے کہا تھا لیکن وہ عکس کے رویے پر بے حد حیران تھا۔ وہ مذاق میں اس سے بھی بڑی بڑی باتیں کہہ جاتا تھا اور وہ انہیں کر دیا کرتی تھی پھر اب اتنی چھوٹی سی بات پر اتنی خفگی.....

”ہر بات مذاق میں کہنے والی نہیں ہوتی۔“ عکس نے دونوں انداز میں کہا۔ ”تم میرے دوست ہو تو اس کا یہ بالکل بھی مطلب نہیں کہ تم اپنی اور میری دوستی کو ہمیشہ مرد بن کر دیکھو۔“ وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

”تم مجھے صرف ایک بات بتاؤ، تم سوچ سکتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ dating کر رہا تھا وہاں؟“ شیردل نے اس کی بات کاٹ کر اپنا سوال دہرایا۔

”میں نیتوں کا حال نہیں جانتی شیردل۔“ اس کی بات پر شیردل بری طرح ہتھے سے اکھڑا۔

”تم میری نیت نہیں جانتیں..... تو تم مجھے بدنیت کیسے سمجھ سکتی ہو؟“ وہ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے بولی۔

”میرا خیال ہے کہ اب اس بات کو نہیں ختم کرتے ہیں۔“ شیردل کو اس کے اس انداز نے اور تپا دیا۔

”نہیں! اب یہ بات ختم نہیں ہوگی..... تم کو میری بات بری لگی ہے تو مجھے بھی تمہاری بات بری لگی ہے۔ اتنے سالوں کے بعد بھی تمہیں میری نیت پر شبہ ہے اور تم مجھ کو کہہ دیتے ہو کہ میں اپنی اور تمہاری دوستی کو ایک مرد کے طور پر biased ہو کر دیکھتا ہوں..... حالانکہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے تمہیں کبھی دوست نہیں سمجھا۔“

”شیردل اب ہم فضول باتیں کر رہے ہیں۔“ عکس نے اسے ٹوکا تھا۔ ”تم بھی جاؤ اور مجھے بھی جانا ہے کل کی مشنگ کی تیاری کرنی ہے میں نے۔“ عکس نے بات کہہ کر وہاں سے جانے کے لیے قدم بڑھایا اور شیردل نے بہت خفگی سے اس کو بازو سے پکڑ کر روکا تھا۔

”ہم میں سے کوئی یہاں سے نہیں جا رہا..... میں تم سے بات کر رہا ہوں اور تمہیں اگر جانا بھی ہے تو تم میری پوری بات سن کر جاؤ گی۔“ ایک لمحے کے لیے وہ اس طرح روکے جانے پر حواس باختہ ہو گئی تھی۔ ”میں تمہارے لیے کس طرح کے جذبات رکھتا ہوں اور تمہیں کیا سمجھتا ہوں وہ تم اچھی طرح جانتی ہو اگر دوبارہ سننا چاہتی ہو تو میں دہرا دیتا ہوں..... میں تم سے محبت کرتا تھا..... کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا اور میرے لیے یہ بات بے حد insulting ہے کہ تم یہ سوچو کہ میں تمہارے حوالے سے کسی بد نیتی کا شکار ہوں یا تمہیں date سمجھ کر تمہارے ساتھ گھومتا پھرتا ہوں۔“

”شیردل میرا بازو چھوڑو۔“ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے عکس نے بے حد خفگی سے اس سے کہا۔ شیردل نے بے اختیار اس کا بازو چھوڑ دیا۔ اسے شاید یہ اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ اب تک عکس کا بازو پکڑے ہوا تھا۔

”مجھے تم دوبارہ اپنی شکل بھی مت دکھانا۔“ اس نے اپنا بازو ورتتے ہوئے شیردل سے کہا۔

”تم اگر یہاں سے میری بات سننے بغیر جاؤ گی تو میں تمہیں دوبارہ اسی طرح روکوں گا۔“ شیردل نے اسی طرح کہا۔ وہ جانے کے لیے قدم بڑھا چکی تھی لیکن شیردل کی بات پر اس نے یک دم واپس پلٹتے ہوئے پہنچ والے انداز میں شیردل سے کہا۔

32 ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2012ء

”تم اب مجھے ہاتھ لگا کر دکھاؤ۔“ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے رہے۔ شیردل کے چہرے کا رنگ سرخ سے مزید سرخ پھر دوبارہ نارمل ہوتا گیا۔

”مجھے زندگی میں بہت کم عورتوں پر غصہ آیا ہے اور مجھے تم پر بہت غصہ آتا ہے۔“ عکس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بالآخر اسے بولتے دیکھا۔

”مجھ سے زیادہ غصہ تو نہیں آ سکتا تمہیں..... تم مذاق میں بھی مجھے اپنی date کیسے کہہ سکتے ہو؟“ دونوں طرف اب پارا پنچے آ رہا تھا۔

”جو تمہیں کہنا چاہتا تھا میں اس کا موقع تم نے نہیں دیا..... میں تمہیں date کہوں تو برا ہوں، تم سے اظہار محبت کروں تو برا ہوں..... اور دوست تمہیں میں نے مر کے بھی نہیں کہنا.....“ شیردل نے اس کے ماتھے کے بل دیکھتے ہوئے دونوں انداز میں کہا۔

”میرا خیال ہے اس صورت میں آج کی اس ملاقات کو تم آخری ملاقات سمجھو..... مجھے شادی شدہ مردوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ عکس نے سنجیدگی سے کہا۔

”تمہیں تو خیر مجھ میں تب بھی دلچسپی نہیں تھی جب میں شادی شدہ نہیں تھا۔ تمہیں اس وقت بھی میرے علاوہ دنیا کے ہر مرد میں دلچسپی تھی..... عتیٰ حمید، عثمان علی، لقمان آفاق.....“

”shut up“ عکس نے اس بار سرخ چہرے کے ساتھ اس کی بات کاٹی تھی۔ ”تم اب آؤٹ ہو رہے ہو..... تم یہاں سے جاؤ۔“

”میں دوبارہ تم سے کبھی نہیں ملوں گا۔“ شیردل کا چہرہ بھی سرخ ہوا۔

”good for both of us“ اس نے ترکی بہ ترکی کہا۔

”اب تم دوبارہ کبھی میری شکل بھی نہیں دیکھو گی۔“

”ok“ عکس نے جوابا کہا۔

”عکس تمہیں انسانوں کی پہچان نہیں ہے۔“ شیردل نے اس بار بے حد خفگی سے کہا۔ وہ اس کی بات پر چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئی پھر اس نے ٹھنڈے لیکن کچھ عجیب سے انداز میں شیردل سے کہا۔

”مجھے انسانوں کی پہچان نہیں ہے؟ good joke“

”مذاق نہیں ہے یہ۔“

”انسان واحد پھر ہے جس کی پرکھ ہے مجھے۔“

”نہیں ہے۔“ شیردل مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے چل پڑا تھا اس نے پیچھے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ اس کی بات پر عکس کا رویہ کیا تھا۔

☆☆☆

گھر پہنچنے کے بعد بھی اس کا موڈ اسی طرح آف تھا اور شہر بانو کو اس کا اندازہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ویشر اور اس کی گفتگو شہر بانو نے فون پر سن لی تھی۔ کسی میڈم کے ساتھ بھی ڈنر کرنے پر شہر بانو کو کسی قسم کی کوئی مینشن نہیں تھی..... واحد تجسس جو اسے تھا وہ یہ کہ وہ میڈم کون تھی۔ عکس مراد علی کی طرف کم از کم اس وقت اس کا ذہن نہیں گیا تھا لیکن شیردل کا موڈ آف دیکھ کر وہ فوری طور پر اس سے اس میڈم کے کوائف کے بارے میں کچھ نہیں پوچھ سکی۔ وہ لوگ شیردل کے پرنس کے گھر پر ٹھہرے ہوئے تھے اور فیملی کے کچھ لوگ بھی اس وقت وہاں تھے جن کی وجہ سے شہر بانو کو فوری طور پر شیردل سے کوئی بات کرنے کا موقع نہیں ملا مگر وہ وقتاً فوقتاً لاؤنج میں فیملی ممبرز میں بیٹھے شیردل کو دیکھتی رہی۔ وہ بہت کم بات کر رہا تھا اور بار بار کچھ سوچتا نظر آ رہا تھا۔

رات کو ایک بجے کے قریب انہیں اپنے بیڈروم میں جانے کا موقع ملا اور اس وقت پہلی بار شہر بانو نے اس سے اس کی پریشانی کی نوعیت جاننے کی کوشش کی تھی۔

”کچھ نہیں ہوا..... بس تھکن ہے..... آج بہت دنوں کے بعد ٹینس کی اتنی لمبی چوڑی پریکٹس کی ہے اس لیے۔“ شہر دل نے بڑے آرام سے اسے موضوع سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ وہ فی وی پر کوئی فلم لگائے بیٹھا تھا اور شہر بانو سے نظریں تک نہیں ملا رہا تھا۔ شہر بانو چند لمحے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

”کس کے ساتھ ٹینس کھیلتے رہے آج؟“ بہت سوں کے ساتھ..... تم نے پینگ کر لی کیا؟“ شہر دل نے شہر بانو کے اگلے سوال سے بچنے کے لیے اس سے سوال کر ڈالا۔

”شہر دل میں پینگ کر کے ہی لاہور آئی ہوں..... اب یہاں تھوڑی پینگ کروں گی میں۔“ شہر بانو نے اسے جتایا تھا۔

”میں ان گفٹس وغیرہ کی بات کر رہا ہوں جو تم نے آج لاہور سے اپنی فیملی کے لیے خریدے ہیں..... شاپنگ کر لی تھی یا؟“ شہر دل نے پھر کہا۔

”اتنی لمبی چوڑی شاپنگ نہیں تھی وہ..... بس چھوٹی موٹی چیزیں تھیں..... دو، تین گھنٹوں میں خرید لی تھیں..... اور وہ بھی ساری ایک ہی بیگ میں پیک کی ہیں میں نے۔“

”گڈ!“ شہر بانو کو کچھ نہیں آیا شہر دل نے اسے کس بات پر سراہا تھا۔ شہر دل اب بیڈ پر سوئی ہوئی مثال کو کہنی کے بل نیم دراز ہوتے ہوئے پیار کرنے لگا تھا۔ فلم سے اس کی توجہ ہٹ گئی تھی۔ وہ اب مثال کے بالوں کو سہلا رہا تھا..... اس کے ہاتھوں، گالوں اور ماتھے کو بار بار چوم رہا تھا۔ شہر بانو بیڈ پر دوسری طرف لیٹھی بالکل سسرا کر ڈی سی اسے اور مثال کو دیکھتی رہی۔ اسے اپنا باپ یاد آیا تھا..... اسے یاد تھا وہ بھی اسے بالکل اسی طرح پیار کرتا تھا جیسے شہر دل مثال کو..... اسی طرح باری باری اس کے ہاتھ، گال، ماتھا، سر چومتا رہتا تھا..... وہ شہر بانو کے بارے میں obsessed تھا اور پروٹیکٹو تھا..... اس کی ماں کے لاکھ اصرار کے باوجود وہ کبھی شہر بانو کو دوسرے بیڈروم میں سلانے پر تیار نہیں ہوا تھا..... وہ اپنے باپ کی گود میں دنیا میں سب سے زیادہ محفوظ محسوس کرتی تھی اور ویسا تحفظ اس نے اس کے بعد کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے بجائے ہمیشہ اپنے باپ کے پاس سوئی تھی..... اس سے لپٹ کر..... اس کے سینے پر..... اس کے بازوؤں کے گھیرے میں..... اس سے کہانیاں سنتے ہوئے..... اور شرمین اور اس کے باپ کی طلاق کے بعد امریکا چلے جانے پر بہت عرصے وہ بستر پر اکیلے سو نہیں پاتی تھی..... اسے یہ سمجھ نہیں آ پاتی تھی کہ وہ بستر میں کہاں سوئے گی تو نیند میں کروٹ لینے پر بھی وہ بستر سے نہیں گرے گی..... اپنے باپ کے ہوتے ہوئے اسے یہ calculations کبھی نہیں کرنی پڑیں۔ وہ جانتی تھی وہ کہیں بھی سوئے گی اس کا باپ اسے کبھی بستر سے گرنے نہیں دے گا کیونکہ بستر کے سرے پر ہمیشہ وہ ہوتا تھا اور بستر کے دوسرے سرے پر اس کی ماں..... وہ جیسے ایک حصار میں محفوظ تھی..... شہباز کے زندگی سے نکل جانے کے بعد شرمین کے ساتھ سوتے ہوئے بھی وہ ایک عجیب سے خوف کا شکار رہتی تھی کہ وہ بستر سے ضرور گر جائے گی اور اس کا یہ خوف بھی بھی غلط ثابت نہیں ہوا تھا..... اس نے نیند میں گر کے بہت بار چوٹیں کھائی تھیں بہت سالوں بعد یہ شہر دل تھا جس نے اسے شہباز کی طرح تحفظ دینے کی کوشش کی تھی۔

”یار تم اسے چھوڑ جاؤ میرے پاس۔“ مثال کو چوتے ہوئے اس نے یک دم شہر دل کو کہتے سنا۔ شہر بانو مسکرا دی۔

”اور میں چلی جاؤں؟ اس نے شکایتا شہر دل سے کہا۔ شہر دل نے مثال کے اوپر سے ہاتھ بڑھا کر شہر بانو کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پیار سے کہا۔

”No sweet heart تم بھی مت جاؤ۔“

”نہیں تم صرف مثال کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میرے بغیر تو رہ سکتے ہو۔“ شہر بانو نے مصنوعی غصے سے اس سے کہا۔

”You really think so“ شہر دل نے جتانے والے انداز میں اس سے کہا۔

”Yes I do“ شہر بانو نے اسی انداز میں اس سے کہا۔

”You are so wrong“ شہر دل نے اس بار بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔

”تم ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے؟“ شہر بانو نے یک دم اس سے کہا۔

”نہیں یار..... اگر کورس نہ ہوتا تو کوشش کرتا ساتھ جانے کی۔“ شہر دل نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ وہ

اب دوبارہ مثال کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کے بال سہلا رہا تھا۔

”پہلی بار تمہارے بغیر کوئی اتنا لمبا سفر کرنے والی ہوں میں شادی کے بعد۔“ شہر بانو نے سنجیدگی سے کہنا شروع کر دیا۔

”تو مت جاؤ نا۔“ شہر دل نے اطمینان سے کہا۔ وہ ہنس دی۔

”اب سیٹس بک نہ کروانی ہو تم تو میں نہ جانی۔“

”سیٹس کینسل کروانی جاسکتی ہیں۔“ وہ اسی اطمینان سے کہہ رہا تھا یوں جیسے دانستہ طور پر اسے مشکل میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم کورس پر مت جاؤ۔“ شہر بانو نے جواباً اسے مشکل میں ڈالا۔ شہر دل بے ساختہ ہنس دیا۔

”میری مجبوری ہے وہاں جانا..... تمہاری تو نہیں ہے۔“

”تم اپنے ساتھ لے جاؤ سنگا پور تو میں امریکا نہیں جاتی۔“ شہر بانو نے کہا۔

”یار پہلے کہنا تھا نا..... اب بتا رہی ہو..... اب نہیں کر سکتا میں یہ اتنے short notice پر۔“ شہر دل نے کہا۔

”اب تم امریکا ہی جاؤ۔“ وہ اب دوبارہ ریموٹ اٹھا کر TV کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ شہر بانو یک دم اپنے بستر سے اٹھتے ہوئے اس کے پاس آگئی۔ بچوں کی طرح شہر دل کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے وہ اس سے لپٹ گئی تھی۔

”شہر دل اب تم رونا مت۔“ شہر دل نے جیسے پلک جھپکتے میں اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے اسے وارن کیا۔

”لیکن میں اتنے بہت سارے دن تمہارے بغیر کیسے رہوں گی؟“ شہر بانو واقعی ہی اب رو پائی ہو رہی تھی۔

”دیکھو تم واپس آ جاؤ گی تین ہفتے کے بعد اور آئی کتنا خوش ہوں گی تمہیں دیکھ کر..... تم کتنی مدت کے بعد ان سے ملو گی۔“ شہر دل اب بالکل اسی طرح اس کے بال سہلا رہا تھا جیسے کچھ دیر پہلے مثال کے سہلا رہا تھا۔ شہر بانو بعض دھماکے کے لیے ایک دوسرا بچہ ہوتی تھی۔

”لیکن میں پھر بھی تمہیں miss کروں گی۔“

”I know honey“

”تم miss کرو گے مجھے؟“ شہر بانو نے یک دم اپنا سر اٹھا کر شہر دل کا چہرہ دیکھا۔

”میں کوشش کروں گا۔“ شہر دل نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

”یعنی نہیں۔“ وہ خفا ہوئی۔

”یار کیسے miss نہیں کروں گا میں..... آف کورس کروں گا۔“ اس نے شہر بانو کو ایک بار پھر بچوں کی طرح اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ وہ مطمئن سی ہو گئی۔

”تم دونوں کے پاسپورٹس اور گفٹس میرے بریف کیس میں ہیں..... کچھ کرنسی بھی exchange کروانی ہے آج۔ وہ تم اپنے پاس رکھ لینا۔ پاسپورٹس اور گفٹس میں کل انر پورٹ پر ہی دوں گا تمہیں۔“ وہ اب اسے ہدایات دے رہا تھا سفر کے حوالے سے..... ساتھ بالکل اسی طرح اس کا سرو قفے وقفے سے چوم رہا تھا جیسے کچھ دیر پہلے مثال کا

چوم رہا تھا۔ وہ جانتا تھا شہر بانو کو اس طرح کی pampering کی ضرورت پڑتی تھی وقفے وقفے سے..... وہ یقیناً اداس ہو رہی تھی اس سے الگ ہونے کے خیال سے اور اسے اس وقت تسلی کی ضرورت تھی۔  
 ”تم سنگا پور سے مجھے روز فون کرو گے؟“ شہر بانو نے اسے یاد دہانی کرائی۔  
 ”روز فون کروں گا۔“  
 ”اور روز ای میل کرو گے؟“

”اوکے۔“ شیردل بڑے آرام سے اس کے سارے مطالبات ماننا گیا تھا۔ ”تمہیں کچھ چاہیے سنگا پور سے؟“  
 شیردل کو خیال آیا۔  
 ”کچھ بھی نہیں۔“  
 ”یار کچھ تو۔“

”بس اپنا شوہر۔“ شیردل ہنسا۔  
 ”وہ تو ہر بار ہی مل جاتا ہے واپس صبح سلامت۔“ اور بالکل اسی لمحے شہر بانو کو دوبارہ اس میڈم کا خیال آیا تھا۔  
 ”شیردل! تم نے آج کس کے ساتھ کھانا کھایا؟“ شہر بانو نے اس کے سینے میں منہ چھپائے آنکھیں بند کیے ہوئے پوچھا اور اسے لگا اس کے سوال پر یک دم اس کے گرد شیردل کے بازوؤں کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑی تھی۔ کچھ دیر شیردل خاموش رہا تھا پھر اس نے کہا۔  
 ”ایک دوست تھا پرانا۔“

”دوست تھا یا تھی؟“ شہر بانو نے اسی طرح پوچھا۔ ایک بار پھر اس نے شیردل کو خاموش ہوتے ہوئے پایا پھر چند لمحوں کے بعد شیردل نے دوبارہ اس سے کہا۔  
 ”دوست تھے..... اور تمہیں..... ایک سے زیادہ لوگوں کے ساتھ ڈنر کیا تھا۔ ارادہ ایک کے ساتھ تھا لیکن پھر کچھ اور لوگ بھی اتفاقاً آگئے وہاں۔“

”اوہ اوکے۔“ شہر بانو نے اطمینان سے سر ہلا دیا۔ ”عکس بھی تھی؟“ اسے پتا نہیں یک دم کیوں یہ خیال آیا تھا پوچھنے کا..... شیردل کو چند لمحے سمجھ نہیں آیا کہ وہ سچ بولے یا جھوٹ۔ اور شہر بانو سے عکس کے بارے میں جھوٹ بولنے کا خیال بھی اس کے ذہن میں پہلی بار ہی آیا تھا ورنہ اس سے پہلے ایسی کوئی صورت حال پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ شہر بانو سے کچھ چھپانا چاہتا۔

”ہاں۔“ ایک لمحہ چپ رہ کر بالآخر اس نے سچ ہی بولنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے سینے پر سر رکھے ہوئے شہر بانو نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں، پتا نہیں اسے کیوں یہ توقع تھی کہ شیردل کا جواب نہیں میں ہوگا۔  
 ”اور ڈنر کا مل اس نے دیا؟“ چند سیکنڈز میں وہ اس ”میڈم“ کو شناخت کر گئی تھی جس کے بارے میں اس نے فون پر سنا تھا۔ شیردل اس بار حیران ہوا تھا۔  
 ”تمہیں کیسے پتا؟“

”میں نے فون پر سنا تھا ورنہ کب رہا تھا۔“ شیردل نے جواب نہیں دیا۔ عکس مراد علی ایک بار پھر اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ مرد تھا۔ چمک محسوس کرنا چاہتا تھا رنج نہیں..... لیکن وہ رنج محسوس کر رہا تھا..... اس کی زندگی کی کچھ بے خواب اور پریشان راتیں عکس مراد علی کی وجہ سے بھی تھیں۔

چند گھنٹے پہلے ہونے والی ٹکر ایک بار پھر اس کے ذہن میں آنے لگی تھی۔ شہر بانو کو اندازہ نہیں ہوا اس کے چند سوالوں نے رات کے اس چپھلے پہر اس کے شوہر کو اس کا نہیں رہنے دیا تھا..... وہ شہر بانو کے بارے میں سوچتے سوچتے عکس مراد علی کے بارے میں پریشان ہونے لگا تھا۔

عکس مراد علی سے یہ اس کا پہلا جھگڑا نہیں تھا۔ ان کے بہت سے جھگڑے پہلے بھی ہو چکے تھے اور شیردل کو یہ ماننے میں عار نہیں تھی کہ ان میں سے 70 فیصد جھگڑے شروع کرنے میں اس کا ہاتھ تھا لیکن تقریباً سو فیصد جھگڑے ختم کرنے میں پہل اس نے کی تھی۔ وہ عکس سے بات کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا..... عکس رو سکتی تھی، یہ اس نے دیکھ لیا تھا۔  
 وہ اس کی La Belle Dame Sans Mercy تھی..... بے رحم حسینہ..... یا کم از کم شیردل اس کو یہی نام دیتا تھا۔ شہد کی دلدل اسے کامن کے دوسرے لوگ کہتے تھے۔ شیردل اسے La Belle Dame Sans Mercy کہتا تھا۔ پہلے وہ اس کا یہ نام اس کے منہ پر نہیں لیتا تھا لیکن بعد میں وہ اسے اسی نام سے پکارتا تھا اور عکس نے کبھی اس پر کسی قسم کا کوئی رد عمل نہیں دیا تھا۔ وہ شیردل کی ”بکواس“ پر کبھی دھیان نہیں دیتی تھی اور وہ اسے یہ openly بتا بھی دیتی تھی۔

عکس مراد علی سے اکیڈمی میں اس کا پہلا جھگڑا اس حسد کی وجہ سے ہوا تھا جو شیردل نے تب محسوس کیا تھا جب عکس مراد علی نے غنی حمید کے ساتھ مکسڈ ڈبزلز کے لیے پارٹنرشپ کی تھی۔ اکیڈمی میں اگر شیردل کو کسی سے نفرت تھی تو وہ غنی حمید تھا۔ وہ اپنی سن میں اس کا کلاس فیلو رہ چکا تھا اور اپنی سن کے ہر نصابی غیر نصابی مقابلے میں وہ شیردل کا سب سے بڑا حریف تھا۔ وہ بھی شیردل ہی کی طرح ایک سول سرونٹ کا بیٹا تھا اور اس کی پوری فیملی کئی نسلوں سے اسی پیشے سے منسلک تھی۔ پنجاب کے وہ دو بڑے بیوروکریٹس کے خاندان آپس میں شدید خاور رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک پاکستان کی دو بڑی پولیٹیکل پارٹیز میں سے ایک کی good books میں تھا اور دوسرا دوسری پارٹی کی..... دونوں خاندانوں کی یہ رقابت اگلی نسل تک شاید نہ جاتی اگر غنی حمید اور شیردل اتنے قریبی حریف نہ بن جاتے اور یہ رقابت اس لیے زیادہ بڑھ گئی کیونکہ اپنی سن میں بہت سی جگہوں پر شیردل کا مکمل چلتا تھا اور یہ وہ کر سکتی تھی جو غنی حمید بدلنے کی کوشش میں رہتا تھا۔ اپنی سن میں گزارے ہوئے تمام سالوں میں غنی حمید یہ نہیں کر سکا لیکن اس نے شیردل کی سبقت اور برتری کبھی تسلیم نہیں کی۔ وہ ان تمام سالوں میں ایک چیلنجر تھا اور چیلنجر ہی رہا اور شیردل کو یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں تھی کہ اس نے اپنی سن میں غنی حمید سے زیادہ مشکل حریف اور کوئی نہیں دیکھا۔ وہ بے انتہا قابل، مخلص اور حد درجہ گھٹیا اور کمینہ تھا..... اور شیردل کو ایسا combination زندگی میں دوبارہ کبھی دیکھنے کو نہیں ملا۔

یہ شیردل کی بد قسمتی تھی کہ اپنی سن کے وہ دونوں rivals سول سرونٹز اکیڈمی میں بھی ایک ہی سال میں ایک ہی ڈپارٹمنٹ میں منتخب ہو کر آئے تھے۔ اور اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات شیردل کے لیے یہ تھی کہ عکس مراد علی نے یہ جاننے کے باوجود کہ پورے کامن میں شیردل سے زیادہ اچھی ٹینس کھیلنے والا کوئی نہیں تھا غنی حمید کے ساتھ پارٹنرشپ کو ترجیح دی تھی۔ اس نے خود مکسڈ ڈبزلز کے بجائے سنگلز اور ڈبزلز کو ہی اپنے لیے کافی سمجھا تھا۔ لیکن اسے یہ حیرت ضرور تھی کہ غنی حمید مکسڈ پر کیسے تیار ہو گیا تھا جبکہ وہ سنگلز اور ڈبزلز میں پہلے ہی تھا اور تیسرے میچ کا مطلب کیا تھا اسے حیرانی تھی غنی حمید کو کیوں سمجھ نہیں آیا تھا۔ عکس مراد علی کے علاوہ اس pairing کی کوئی اور وجہ شیردل کو سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ اس سے بھی آکر ٹیم بنانے کا کہتی تو انکار وہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

عکس مراد علی نے ایسی ہی ایک جوڑی بیڈمنٹن میں عثمان علی کے ساتھ بنائی تھی۔ وہ اس کامن میں بیڈمنٹن کا سب سے اچھا پلیئر تھا اور اس پورے کامن میں یک دم وہ دونوں مرد ہر ایک کی نظروں کا مرکز بن گئے تھے۔ وہ دو مرد عکس مراد علی کا انتخاب تھے اور اس کے ساتھ ہر روز ٹینس اور بیڈمنٹن کھیلنے کا اعزاز حاصل کرتے تھے۔ اس سے بے تکلفی کے ساتھ بات چیت کرتے تھے۔ ان کی قسمت پر ہر مرد کا منر کور شک آتا تھا۔ صرف شیردل تھا جس کو فی الحال یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ عکس مراد علی نے بیٹھے بیٹھے سنگلز اور ڈبزلز مقابلوں میں کھیلنے کے بجائے سیدھا مکسڈ ڈبزلز میں کھیلنے کا فیصلہ کیوں کر لیا تھا۔ اکیڈمی میں بہت کم ٹینیس کا منرز مکسڈ ڈبزلز کے مقابلوں میں حصہ لیتی تھیں۔ زیادہ تر سنگلز اور ڈبزلز کے مقابلوں میں ہی حصہ لیتی تھیں۔



جب شیردل کے خاندان کے کسی فرد کے کسی کامن کا حصہ ہوتے ہوئے بھی best probationer کا ایوارڈ نہیں اور گیا تھا۔

☆☆☆

”زندگی میں ایوارڈز اور ٹرائفز سب کچھ نہیں ہوتے لیکن ان کو حاصل کرنے کی قابلیت رکھتے ہوئے بھی حاصل نہ کر پانا بد قسمتی ہے۔“ چڑیا کو ٹھیک سے یاد نہیں تھا خیر دین نے اس سے یہ بات کب کہی تھی لیکن اسے یہ ضرور یاد تھا کہ اسے یہ بات خیر دین نے ہی کہی تھی۔ خیر دین کی باتیں اس کے لیے باتیں نہیں تھیں وہ اس کے لیے quotations تھیں۔ زندگی گزارنے کے گُر..... وہ اس کی زندگی کا پہلا ”بڑا آدمی“ تھا جسے اس نے کبھی ”چھوٹا“ بتے نہیں دیکھا۔

”بڑا آدمی بننا بہت بڑا کام ہے لیکن بڑا آدمی بننے کے بعد چھوٹا آدمی نہ بننا اس سے زیادہ بڑا کام ہے۔“  
”نانا آپ مشکل باتیں کرتے ہیں۔“ چڑیا نے اس کی بات سننے کے بعد خیر دین سے کہا۔ وہ مسکرا دیا۔ ”مشکل باتیں زندگی میں بڑی آسانیاں پیدا کر دیتی ہیں۔“ خیر دین نے اس سے کہا تھا۔

وہ چھ سیاح مینیہ اب آہستہ آہستہ ان کی زندگی اور رشتے سے اپنی تاریکی اور نحوست کے سائے سمیٹنے لگے تھے..... وہ ڈی سی وہاں سے ٹرانسفر ہو گیا تھا اور اس کے جانے کے بعد خیر دین کا وہ خوف بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر بالکل اسی جگہ پر اپنی ریڑھی دوبارہ لگانی شروع کر دی تھی جہاں وہ پہلے لگاتا تھا۔ اور کچھ عجیب سی برکت تھی جو ان کے رزق میں آنا شروع ہوئی تھی۔ اس ریڑھی سے اتنا کچھ بچنے لگا تھا کہ حلیمہ کو گھر میں سلائی کڑھائی کا وہ کام نہیں کرنا پڑتا تھا جو اس نے شہر میں آنے کے بعد شروع کیا تھا۔

دو سال میں خیر دین نے ریڑھی کے بجائے اسی علاقے میں ایک چھوٹی سی دکان لے لی تھی۔ چڑیا اب ٹڈل میں آگئی تھی اور وہ اب خیر دین کے ساتھ اس ریڑھی پر بیٹھنا چھوڑ چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی خیر دین نے پھلوں کا کاروبار بھی ختم کر دیا تھا۔ اس کی دال اب اتنی تنگے لگی تھی کہ اس کے پاس پھلوں کا کاروبار کرنے کا نہ تو وقت تھا نہ ضرورت۔

ایک کمرے کے کرائے کے مکان سے وہ اب دو کمروں کے ایک بہتر مکان میں کرائے پر رہنے لگے تھے اور انہی دو سالوں میں خیر دین کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کرنا پڑا تھا..... حلیمہ کی دوبارہ شادی کا..... وہ اسی محلے میں رہنے والا ایک خاندان تھا جس کا ایک بٹاکہ مت ملے گا، سالوں سے مقیم تھا..... ایک کار ایکسڈنٹ میں اس

شیردل نے اکثر شام کو پریکٹس سیشن کے دوران عکس کو کھیلنے دیکھا تھا۔ وہ ایک average پلیئر تھی، یہ کوئی اس کی ہیڈ منٹن اور ٹینس skill کو پانچ منٹ دیکھ کر بھی judge کر سکتا تھا۔

لیکن شیردل کے طوطے کیوٹر اس وقت اڑ گئے تھے جب اس نے مکسڈ ڈبلز میں عکس مراد علی اور غنی حمید کو جیتنے دیکھا تھا۔ غنی حمید اپنی سن کی ٹینس ٹیم کا شیردل کے بعد سب سے اچھا پلیئر تھا اور عکس مراد علی کے ساتھ مل کر اس نے اورنگ زیب اسحاق اور صوفیہ بدرالدین کی ٹیم کو عکس کی برائے نام participation کے بھی جیت لیا تھا۔ عکس مراد علی نے خود کم کھیلا تھا غنی حمید کو زیادہ کھیلا تھا اور ونک شاٹ سے بہت پہلے شیردل کو یہ پہچتا ہوا ہونا شروع ہو گیا تھا کہ اس نے غنی حمید کو واقعی ہی اپنی سن میں Shoot کیوں نہیں کر دیا تھا یا کم از کم لکڑا کر دیتا۔ اس الو کے پٹھے نے اکیڈمی کی اس ہیلن آف ٹرائے کو مکسڈ ڈبلز کی ٹرائی پلیٹ میں رکھ کر پیش کر دی تھی۔ اس ہیلن آف ٹرائے کو جو اکیڈمی میں ٹینس پریکٹس کے سیشنز کے دوران اپنا سارا وقت صرف اپنی سروں ٹھیک رکھنے پر صرف کرتی رہی تھی اور اس نے میچ میں صرف کچھ aces لیے تھے یا پھر وہ کورٹ کے ایک کونے میں کھڑی اپنا ریکٹ گھماتی رہی تھی اور غنی حمید نے اپنے کورٹ کے چاروں کونوں میں کسی spider کی طرح بھاگ بھاگ کر اپنا حشر تو کر لیا تھا لیکن اس نے مکسڈ ڈبلز کی ٹرائی تقریباً تنہا اسے جتوا دی تھی۔ شیردل نے سنگلز اور ڈبلز کے مقابلوں میں غنی حمید کا مار مار کر بھر کس نکال دیا تھا اور دونوں مقابلے جیتنے کے باوجود اس کا صدمہ اور غصہ ختم نہیں ہوا تھا۔

دو دن بعد ہیڈ منٹن کے مکسڈ ڈبلز میں اگرچہ ٹینس والی تاریخ نہیں دہرائی گئی لیکن وہ میچ جیتنے میں بھی عثمان علی کا رول ستر فیصد تھا۔

شیردل نے اس میچ کے بعد جو تالیاں بجائی تھیں وہ اس ہیلن آف ٹرائے کی ذہانت پر بجائی تھیں جسے اکیڈمی میں دو الو کے پٹھے مل گئے تھے جنہوں نے اسے اسپورٹس میں وہ پوائنٹس دلوا دیے تھے جو GTP کی ٹریننگ ختم ہونے کے بعد best probationer کی ٹرائی جیتنے کے لیے ضروری تھے۔

عکس مراد علی ٹینس اور ہیڈ منٹن دونوں میں ایک average player تھی۔ وہ اکیڈمی میں لڑکیوں کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہاں بہت سی ایسی لڑکیاں موجود تھیں جو ایسے اداروں سے تعلیم حاصل کر کے وہاں پہنچی تھیں جہاں نہ صرف مختلف کھیلوں کی سہولیات تھیں بلکہ وہ کھیلتی رہی تھیں..... وہ لڑکیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے کسی مقابلے کے فائنل تک کبھی نہیں پہنچتی لیکن اس نے بے حد ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے مکسڈ ڈبلز مقابلوں کے لیے ان دو کھیلوں کے سب سے اچھے کھلاڑیوں کے ساتھ pairing کر لی تھی۔ وہ دو ٹرائفز نہ بھی جیتتے پھر بھی فائنل تک ضرور پہنچا دیتے اس کو..... وہ شیردل کے ساتھ pairing بھی کر لیتی اگر best probationer کے لیے وہ اس کا سب سے قریبی حریف نہ ہوتا..... یہ شیردل کا اندازہ تھا۔

وہ جیسے مودھی..... سوچ سمجھ کر ایک کی جانے والی knight (گھوڑے) کی میزھی چال..... بظاہر سادہ لیکن بے حد دور اندیش اور سمجھداری سے چلی جانے والی..... جو کم از کم شیردل کے لیے کاری ثابت ہوئی تھی۔ شیردل ذہانت کے اس مظاہرے پر دانت پیسنے کے بعد عکس کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

غنی حمید نے میکا ولی کی اس فلاسفی پر عمل کیا تھا کہ دشمن کا دشمن آپ کا دوست ہوتا ہے۔ وہ اس کامن میں خود ٹاپ نہیں کر سکتا تھا اور شیردل کو ٹاپ کرتے دیکھ نہیں سکتا تھا..... عکس مراد علی وہ واحد لڑکی تھی جو شیردل کو ہرا سکتی تھی اور غنی حمید نے ہیلن آف ٹرائے کا گھوڑا اپنے میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں کی تھی۔

عکس مراد علی اور غنی حمید کی دوستی اور شیردل اور عکس مراد علی کی دشمنی کا وہ باقاعدہ آغاز تھا۔ عکس مراد علی نے اس کامن کی best probationer کا اعزاز بے حد آرام سے جیتا تھا۔ best conduct کی ٹرائی بھی اسی کے حصے میں آئی تھی۔ شیردل صرف best sportsman کی ٹرائی حاصل کر سکا تھا۔ وہ پہلا سال تھا

آدمی کی بیوی تین چھوٹے بچے چھوڑ کر مر گئی تھی اور وہ تین بچے اب مختلف مسائل کا شکار تھے۔ وہ آدمی نہ تو انہیں اکیلا اپنے پاس رکھ پارہا تھا نہ ہی پاکستان میں ان کی دیکھ بھال سے مطمئن تھا اور بھی محلے کے ایک شخص کے توسط سے خیر دین سے حلیمہ کا ہاتھ مانگا گیا۔ جس نے کچھ عرصہ اس آدمی کے گھر کی عورتوں کے لیے سلائی کڑھائی کا کام کیا تھا۔ خیر دین کے لیے یہ ایک عجیب آزمائش کا موقع تھا۔ اس نے کبھی حلیمہ کی تیسری شادی کا نہیں سوچا تھا۔ اس کے ذہن میں شوہر کی وفات کے بعد حلیمہ خود بھی ایک بار پھر ایسے رشتے میں بندھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تینوں ایک فیملی کے طور پر اپنی زندگی سے مطمئن تھے لیکن چڑیا کے بعد آنے والے کرائس میں خیر دین کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اس کو کچھ ہو جانے کی صورت میں حلیمہ اور چڑیا کتنے مسائل کا شکار ہو سکتی تھیں۔ فکر مندی کا یہی احساس تھا کہ اس آدمی کے رشتے کی بات کرنے پر خیر دین نے فوری انکار کرنے کے بجائے غور کرنے کے لیے کچھ وقت مانگا تھا لیکن خیر دین نے حلیمہ سے بھی پہلے اس مسئلے پر چڑیا سے بات کی تھی۔

وہ اسے ایک دن اسکول کے بعد گھر لانے کے لیے ایک پارک لے گیا تھا اور وہاں اسے آکس کریم کھلاتے ہوئے خیر دین نے اس سے پوچھا تھا۔

”بنا اگر تمہاری امی کی شادی ہو جائے اور وہ پاکستان سے چلی جائیں تو تمہیں کیا لگے گا؟“ چڑیا خیر دین کے اس بے رنگی سے کیے ہوئے مبہم سوال پر آکس کریم کا کپ ہاتھ میں پکڑے کچھ ہٹکا بکا رہ گئی تھی۔

”ہاں تمہیں۔“ خیر دین نے متانت سے کہا۔

”آپ امی کی شادی کر رہے ہیں؟“ چڑیا کی زندگی میں خوف کا ایک اور لمحہ آیا تھا۔

”تمہیں برا لگے گا اگر میں ان کی شادی کر دوں تو؟“ خیر دین نے اس کے سوال پر چڑیا سے ایک اور سوال کیا۔

”لیکن وہ کیوں شادی کریں گی.....؟ ہم سب خوش ہیں۔“ چڑیا نے خیر دین کی طرف دیکھا۔

”تمہارا نانا بہت بوڑھا ہے چڑیا اور تمہاری امی نے زندگی میں بھی اپنا گھر خوشی نہیں دیکھی۔ ہماری زندگی کی واحد خوشی صرف تم رہی ہو..... لیکن میں بعض دفعہ سوچتا ہوں کہ اگر آج مجھے کچھ ہو گیا تو تمہارا اور حلیمہ کا کیا ہوگا؟ میرے بعد تم دونوں وال کی وہ دکان تو نہیں چلا سکتیں..... رشتے دار جیسے ہیں میرے وہ تم پہلے ہی دیکھ چکی ہو..... میں تم دونوں کے لیے بہت ڈرتا ہوں۔“

خیر دین اب اس کے ساتھ اپنے وہ خدشات شیر کر رہا تھا جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کیے تھے اور اس کی باتیں چڑیا کو رنجیدہ کرنے لگی تھیں۔ اس نے بھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کا بہادر نانا اس کے اور اس کی ماں کے حوالے سے کچھ خدشات بھی رکھ سکتا تھا۔ خیر دین اسی رسائی سے اس سے کہہ رہا تھا۔

”اب ایک موقع مل رہا ہے کہ میں تمہاری امی کی شادی کر کے ان کا ایک گھر بنا سکوں تو میں اسے ضائع نہیں کروں گا۔ اس لیے ضائع نہیں کروں گا تاکہ اگر کل کو مجھے کچھ ہو جائے تو تمہاری اور تمہاری امی کی دیکھ بھال کے لیے کوئی ہو۔“ چڑیا نے یک دم خیر دین کا بازو پکڑ لیا۔

”نانا آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔“ چڑیا نے جیسے بہت خوفزدہ ہو کر خیر دین سے کہا۔

”ہاں بیٹا مجھے کچھ نہیں ہوگا..... لیکن اگر کچھ ہو گیا تو.....؟“ خیر دین نے اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔

”آپ امی کی شادی کر دیں گے تو پھر وہ تو چلی جائیں گی ہمارے گھر تو نہیں رہیں گی۔“ چڑیا اب رنجیدگی سے خیر دین کو جیسے وہ تصویر دکھانے کی کوشش کر رہی تھی جو اسے خوفزدہ کر رہی تھی۔

”ہاں وہ ہمارے گھر ہمارے ساتھ نہیں رہیں گی لیکن ان کا اپنا ایک بہت اچھا سا گھر ہوگا جیسے سب عورتوں کا

ہوتا ہے۔“

”لیکن نانا ہمارا بھی تو گھر ہے نا وہ امی کا ہی تو گھر ہے۔“ چڑیا نے خیر دین کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”ہاں یہ بھی تمہاری امی کا گھر ہے لیکن یہ کرائے کا گھر ہے..... شادی کے بعد ان کا اپنا گھر ہوگا، ان کا شوہران کا خیال رکھے گا۔ ان کی ذمے داریاں اٹھائے گا پھر تمہاری امی اور تمہارے تین ابو تمہاری ذمے داری بھی اٹھا سکتے ہیں۔“ چڑیا کو خیر دین کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں لیکن وہ سنتی رہی۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ ناخوش تھی خیر دین کو یہ جاننے میں نہ تو زیادہ وقت ہوئی تھی نہ ہی تعجب..... اس کی جگہ کوئی بھی بچہ ہوتا جس نے ساری عمر اپنی زندگی صرف دو لوگوں کے ساتھ گزاری ہوئی تو وہ اس صورت حال میں ناخوش ہی ہوتا بلکہ اس سے کہیں زیادہ ناخوش جتنا چڑیا ہوئی تھی۔ آکس کریم کا پورا کپ اس دن چڑیا کے ہاتھ میں ہی پھسل کر گرم اور پھر بے مزہ ہو گیا تھا۔

وہ اس دن واپس گھر جاتے ہوئے بے حد اداس تھی اور اس اداسی کے ساتھ بھی اس نے حلیمہ کو گھر جا کر بڑے غور سے دیکھا تھا..... کیا اس کی امی واقعی شادی کرنا چاہتی تھیں.....؟ اسے چھوڑ کر کسی دوسرے آدمی کے ساتھ چلی جانا چاہتی تھیں؟ اسے حلیمہ کو دیکھتے ہوئے یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ واقعی اس گھر سے جانا چاہتی تھیں لیکن بہت آہستہ آہستہ ابتدائی شاک سے ابھرنے کے بعد چڑیا نے جیسے اپنی ماں کے لیے اس سے بہتر گھر اور بہتر زندگی کا خواب دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ لاشعوری طور پر اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنی ماں کے لیے ویسا ہی گھر تصور کر رہی تھی جس گھر میں وہ ساری زندگی رہتی رہی تھی..... تو اس کی امی بھی ایک ڈی سی ہاؤس جیسے گھر میں رہیں گی اور ان کے ساتھ رہنے والا ان کا شوہران کا ویسے خیال رکھے گا جیسے..... اور اس جیسے کے بعد چڑیا کی آنکھوں کے سامنے وہ تمام آفیسرز اور ان کی بیویاں گھومنے لگی تھیں جن کے ساتھ وہ رہ چکی تھی..... اس کا دل عجیب طرح سے ماں کے حق میں موم ہوا تھا..... اس کی ماں کے لیے بھی نوکر ہوں گے جو اس کے لیے سارے کام کیا کریں گے اور وہ صرف آرام کرے گی یا پھر حکم دے گی..... اور اس کی ماں کے پاس بہت سارے اور اچھے کپڑے اور زیور ہوں گے اور وہ بھی ایک گاڑی میں گھوما کرے گی۔

خیر دین کو یہ نہیں پتا تھا کہ چڑیا ساری رات کیا سوچتی رہی تھی لیکن چڑیا نے اگلے دن صبح سویرے اسکول جانے سے پہلے خیر دین سے کہا تھا۔

”نانا آپ امی کی شادی کر دیں..... مجھے بہت اچھا لگے گا جب امی کے پاس بہت ساری چیزیں، ایک بڑا سا گھر اور گاڑی ہوگی تو.....“ اس کی آواز بات کرتے کرتے غیر محسوس انداز میں بھرائی گئی، خیر دین کا دل بھی بھر آیا

تھا۔ وہ ایک بچے کے طور پر ایثار کے مفہوم سے آشنا نہ ہونے کے باوجود اپنی ماں کے لیے ایثار کرنے پر تیار تھی۔ اپنی ماں کی اچھی اور بہتر زندگی کے لیے..... خیر دین جانتا تھا کہ چڑیا عام بچوں جیسی نہیں تھی اس کے لیے پھر بھی یہ ماننا مشکل تھا کہ وہ اتنے آرام سے اپنی ماں کی زندگی میں سے خود کو نکالنے پر تیار ہوگئی تھی لیکن حلیمہ اتنی آسانی سے ان لوگوں کی زندگی میں سے نکلنے پر تیار نہیں ہوئی تھی۔ اسے منانے پر خیر دین کو ہفتوں لگ گئے تھے اور شاید مہینوں لگنے کے بعد بھی حلیمہ بھی ایک اور شادی پر تیار نہیں ہوتی اگر اس نے خیر دین کے گاؤں میں چند مہینے نہ گزارے ہوتے اور اپنے رشتے داروں کے ہاتھوں اپنے مستقبل کی ایک بھیاں تک تصویر نہ دیکھ لی ہوتی۔ کہیں نہ کہیں اس کے لاشعور میں بھی یہ خوف تھا کہ خیر دین اگر ان کی زندگی سے چلا گیا تو کیا ہوگا اور خاص طور پر چڑیا کا کیا ہوگا۔ وہ اکیلی تنہا عورت کے طور پر اسے کیسے بالے گی۔ وہ روتے دھوتے اور بادل نا خواستہ ہی سہی پر اس شادی پر تیار ہوگئی تھی جس کے بعد اسے کم از کم اپنے لیے زندگی اچھی نظر آرہی تھی لیکن وہ جانے سے پہلے چڑیا سے بہت سارے وعدے کر کے گئی تھی..... اسے بہت ساری یقین دہانیاں کروا کر گئی تھی۔

”چڑیا تم میری واحد اور پیاری اولاد ہو..... میرے دل کا ٹکڑا ہو..... میں ایک اور گھر میں جا رہی ہوں لیکن مجھے جتنی محبت تم سے ہے دنیا میں کسی سے نہیں..... کبھی کسی اور سے نہیں ہو سکتی۔“ وہ شادی سے ایک رات پہلے بلک بلک کر روتے ہوئے چڑیا سے کہہ رہی تھی۔ چڑیا ماں کی باتوں سے زیادہ اس کے رونے کی وجہ سے رورہی تھی..... پتا نہیں کیوں اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ حلیمہ شادی کی بات پر خوش ہو جائے گی۔ ایک اچھا سا گھر ملنے کی امید پر وہ پھولے نہیں سمائے گی پر وہ جس طرح ان چند ہفتوں میں اس گھر میں روتی اور بولاتی پھرتی تھی اس نے چڑیا کو عجیب انداز میں پریشان کیا تھا..... کہیں نہ کہیں اس نے اپنے ذہن میں ایک بڑے سے گھر کے تصور پر بھی غور کرنا شروع کر دیا تھا..... کہیں نہ کہیں گھر کی اس تعریف میں کچھ خامی تھی جو چڑیا کے ذہن میں تھا اور چڑیا یہی دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کیا خامی تھی لیکن اس کی عمر میں وہ خامی نظر اور سمجھ نہیں آ سکتی تھی۔ گھر اور خاندان کا فرق سمجھنا آسان نہیں ہوتا..... بڑوں کے لیے بھی اور وہ تو محض ایک بچی تھی۔

”میں تم سے روز بات کروں گی فون پر، روز ملنے آیا کروں گی تم سے اور جب میں نہیں آؤں گی تب تمہیں اپنے پاس بلا لوں گی..... یہاں پاس ہی تو گھر ہوگا میرا۔“ حلیمہ اس سے کہتی جا رہی تھی وہ جیسے چڑیا سے زیادہ خود کو فریب دے رہی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شادی کے شاید کچھ ہی ہفتوں کے بعد اسے مستقل طور پر اپنے شوہر کے ساتھ کویت چلے جانا تھا اپنے شوہر کے تین بچوں کی دیکھ بھال کے لیے اور پاکستان سے چلے جانے کے بعد زندگی کے اس بہاؤ میں وہ چڑیا کے لیے کہاں سے اور کیسے وقت نکال سکتی تھی۔ کہیں نہ کہیں یہ تلخ حقیقت ہی بھوت بن کر اسے ڈرا اور رُلا رہی تھی لیکن وہ اسے سچ مانتے پر تیار نہیں تھی وہ بھوت کو وہم ہی رکھنا چاہتی تھی وہم ہی ماننا چاہتی تھی۔

چڑیا نے حلیمہ کے ہر وعدے پر سر ہلا دیا تھا۔ اس وقت اسے بھی یقین تھا کہ حلیمہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ یقیناً کر پائے گی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اسے احساس ہو گیا تھا کہ قاصد زندگی میں بہت سی چیزوں کا مفہوم بدل دیتا ہے، بہت سی چیزوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ رشتوں پر، ان کی گہرائی پر، ان کی ضرورت پر، ہر چیز پر۔

حلیمہ جب تک پاکستان میں رہی تھی وہ واقعی چڑیا پر بہت توجہ دیتی رہی تھی شادی کے بعد بھی۔ اس کا شوہر بھی ایک کم پڑھا لکھا لیکن اچھا آدمی تھا۔ وہ کویت میں ایک انٹرکنڈ شنگ پلانٹ میں بہت عرصے سے کام کر رہا تھا اور بہت اچھا کما تھا۔ شادی کے دو مہینے کے بعد حلیمہ اس کے اور اس کے تین بچوں کے ساتھ پاکستان سے چلی گئی تھی۔

چڑیا کی زندگی میں اداسی اور تنہائی نئے سرے سے آئی تھی۔ حلیمہ اسے کویت سے باقاعدگی سے فون کیا کرتی تھی وہ اپنی نئی زندگی سے بہت خوش تھی اور اس کی خوشی نہ چاہنے کے باوجود بھی چڑیا کو اداس کرتی تھی۔ خیر دین نے حلیمہ کے چلے جانے کے بعد چڑیا پر پہلے سے بھی زیادہ توجہ دی تھی۔ اب ان دونوں کی زندگی میں صرف وہی تھے ایک

دوسرے کے لیے۔ کوئی تیسرا نہیں تھا اور جوں جوں چڑیا بڑی ہو رہی تھی خیر دین پہلے کی نسبت کچھ مطمئن ہو رہا تھا۔ وہ اب گھر خود سنبھال لیتی تھی خیر دین کو اس کے اور گھر کے ہر کام کے بارے میں پریشان نہیں ہونا پڑتا تھا۔ اس کا کاروبار آہستہ آہستہ بہت مستحکم ہوتا جا رہا تھا۔ خیر دین کی دال اس شہر میں اپنی پہچان بنا چکی تھی اور جب تک چڑیا نے میٹرک کیا خیر دین پانچ مرلے کا ایک گھر خرید چکا تھا۔ ان کے سر پر بالآخر اپنی چھت آگئی تھی۔

چڑیا کو کنٹرولڈ میں تعلیم کے لیے بھیجنا خیر دین کا ایک اور خواب تھا اور چڑیا نے خیر دین کا یہ خواب کسی مشکل کے بغیر پورا کر دیا۔ وہ میٹرک بورڈ میں پوزیشن لینے کے بعد کسی بھی ادارے میں آرام سے اسکا لرشپ پر پڑھ سکتی تھی لیکن وہ خیر دین کو چھوڑ کر ہاسٹل جانے سے ہچکچا رہی تھی۔

”کتنی لڑکیوں کو اس کالج میں اسکا لرشپ پر جا کر پڑھنے کا موقع ملتا ہے چڑیا..... تم نے کبھی سوچا ہے اور اب تمہیں موقع مل رہا ہے تو تم اسے میرے لیے ضائع کرنا چاہتی ہو۔“ خیر دین نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”نانا میں آپ کو یہاں اکیلا کیسے چھوڑ دوں؟“ چڑیا نے خیر دین سے کہا۔

”کل کو جب تم میڈیکل کالج میں جاؤ گی تب بھی تو میں اکیلا ہی رہوں گا اور میں اکیلا نہیں ہوں چڑیا..... تم ہر وقت میرے ساتھ میرے پاس ہوتی ہو۔“ خیر دین اسے پیار سے سمجھا رہا تھا..... ”میں چاہتا ہوں تم بہت بڑھو، پاکستان کی ایک بڑی ڈاکٹر بنو۔ پاکستان سے باہر تک اسپشلائزیشن کرنے جاؤ۔ تم اپنے نانا کے لیے کب تک اس شہر میں رکی رہو گی۔“ چڑیا نے ایک بار پھر خیر دین کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس نے زندگی میں خیر دین سے کبھی اگر ضد کی بھی تھی تو نو سال کی عمر میں ہونے والے اس حادثے کے بعد کبھی نہیں..... اس نے جیسے اپنا یہ حق ان تکلیفوں کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا جو خیر دین کو اس نے اپنی وجہ سے اٹھاتے دیکھا تھا۔ اس حادثے کے بعد کے چھ سالوں نے چڑیا کو بہت خاموش کر دیا تھا۔ وہ traumatized نہیں تھی نہ ہی نفسیاتی طور پر بہت زیادہ مسائل کا شکار ہوئی تھی اور اس کا سارا کریڈٹ خیر دین کے بعد سسٹر ایکنس کو جاتا تھا جنہوں نے میٹرک تک اس اسکول میں چڑیا پر ہمیشہ ذاتی توجہ دی تھی۔ خیر دین میں کبھی اتنی ہمت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ چڑیا سے اس حادثے کے حوالے سے بات کر پاتا۔ چڑیا سے بہت قریب ہونے کے باوجود خیر دین کبھی اس سے اس ایٹو پر کھل کر بات نہیں کر سکا تھا۔ سسٹر ایکنس نے یہ کام ایک بار نہیں بہت بار کیا تھا۔

”جو کچھ ہوا وہ تمہاری کسی mistake کی وجہ سے نہیں ہوا اور جو کچھ ہوا وہ ایک حادثہ تھا، بہت برا اور تکلیف دہ لیکن it was just an accident حادثوں کو بھول جانا چاہیے۔“ انہوں نے پہلی بار ایک لرزتی کا ہمتی زرد چہرے والی چڑیا سے کہا تھا۔

”یہ جو کچھ ہوا یہ بس اتنا ہی تکلیف دہ ہے جس طرح کوئی ہمیں کوئی اور چوٹ لگا دے..... کوئی انجری ہو جائے ہمیں..... اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں ہے اس کی..... کوئی عزت کم زیادہ نہیں ہوتی اس سے اور تم بہت بہادر لڑکی ہو تمہیں بس ہمیشہ یہی یاد رکھنا ہے۔“ سسٹر ایکنس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا تھا۔ پتا نہیں چڑیا کو الٹا باتوں کی سمجھ آئی یا نہیں آئی لیکن جو صلہ اسے صرف ایک بات سے ملا تھا اور وہ یہ کہ وہ اب بھی چھوٹ کی بیماری نہیں بنی تھی۔ سسٹر ایکنس کے لیے۔ اور انہیں اس کے زخم کریدنے میں دلچسپی نہیں تھی صرف مرہم رکھنے میں تھی۔ خیر دین کا وہ راز سسٹر ایکنس، خیر دین اور چڑیا کے درمیان ہی رہا تھا..... کانونٹ کی کوئی اور ٹیچر یا سسٹر کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ چڑیا کو کبھی کانونٹ میں کسی سے نظریں چرا کر یا سر جھکا کر نہیں رہنا پڑا۔

سسٹر ایکنس نے چڑیا کو کانونٹ کے ہر نصابی غیر نصابی مقابلے میں ہمیشہ شیر کی طرح اتارا تھا اور چڑیا ہمیشہ شیر کی طرح مقابلہ کرتی رہی تھی۔ کانونٹ کے کسی اسٹوڈنٹ نے اس سے پہلے کانونٹ میں انٹر اسکول مقابلوں کی شیلڈز

اور ٹرائفک کراؤ ڈھیر نہیں لگایا تھا جو چڑیا نے لگا دیا تھا۔ بہت کم ہی ایسا ہوا تھا کہ وہ کسی مقابلے میں جاتی اور پہلی پوزیشن کے علاوہ کسی اور پوزیشن کی حقدار ٹھہرتی۔

چڑیا کی زندگی میں اس کا نوٹ کا اور سسٹر ایکس کا جو رول تھا وہ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس کے لیے مسیحا کی حیثیت رکھتے تھے۔ کچھ ایسا ہی فرسٹر ایکس بھی اپنی اس اسٹوڈنٹ پر رکھتی تھیں۔ انہوں نے چڑیا پر جتنی توجہ دی تھی چڑیا نے انہیں اس سے بڑھ کر رزلٹ دیے تھے۔

تین سال بعد سسٹر ایکس کا وہاں سے فرانسفر ہو گیا تھا لیکن جانے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر چڑیا کے ساتھ بہت ساری باتیں کی تھیں۔

”زندگی میں ہونے والے یہ حادثے شرم سے مر جانے والے ان کے لیے ہونے چاہئیں جو ان کے ذمے دار ہیں، ان کے لیے نہیں جو نشانہ بنے ہوں۔ کبھی بھی اس تکلیف دہ واقعے کو اپنی زندگی کا وہ کنواں مت بنے دینا جس کی گہرائی اور تاریکی تمہاری پر سنائی تمہاری positivity تمہارے سارے ٹیلنٹ کو کھا جائے گا۔ کبھی اپنے آپ پر اس ایک واقعے کی وجہ سے ترس مت کھانا، بھی نہیں۔ تم اس کا نوٹ کی سب سے برائٹ اسٹوڈنٹس میں سے ایک ہو۔“ one day you will make us proud of you سنٹی رہی تھی۔ اس نے سسٹر ایکس کی باتوں کو ہمیشہ اسی طرح سنا تھا۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا جب اسے سسٹر ایکس کی باتوں کی پہلے سے زیادہ سمجھ آئی تھی۔ سسٹر ایکس نے اس کے ساتھ گزارے ہوئے سالوں میں چڑیا کے زخموں پر ایسے بہت سے مرہم وقتا فوقتار کھے تھے لیکن اس کے باوجود بہت ساری چیزیں ایسی تھیں جنہیں وہ چڑیا کے اندر سے ختم نہیں کر سکی تھیں۔ وہ بہت ریزروڈ بہت خاموش طبع تھی۔ کسی کو بہت قریبی دوست بنانا اس کی زندگی کا جیسے مشکل ترین کام تھا۔ اس کے لیے لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارنا اور خاموشی سے ان کی بات چیت سن لینا آسان تھا لیکن اس کے لیے کسی کے ساتھ بھی ایک خاص حد سے زیادہ بے تکلفی پیدا کرنا بہت مشکل تھا اور ایسا کیوں تھا یہ چڑیا خود بھی کبھی نہیں سمجھ سکی اور یہ وقت اسے گنہگار میں بھی رہی تھی۔

انہیں نہ کہیں فاطمہ کو لوگوں پر اعتبار کرنے میں مشکل کا سامنا تھا اور یہ مشکل کیوں تھی۔ اس کے پاس وجوہات کی لمبی فہرست تھی۔ حالانکہ کنفر ڈنک پہنچتے پہنچتے زندگی اس کے بہت سے مسئلے حل کر چکی تھی۔

خیروین شہر کے بارونق ترین علاقے میں ایک دکان چلا رہا تھا جس کی دال کھانے کے لیے لوگ بہت دور دور سے آتے تھے اور جس کا پکا ہوا کھانا شام ہونے سے پہلے ختم ہو جاتا تھا۔ اب اس دکان پر خیروین کے پاس پانچ کام کرنے والے ملازم تھے۔ اس کے باوجود رش اتنا رہتا تھا کہ خیروین بے انتہا کوشش کے باوجود بھی ایک خاص تعداد سے زیادہ گاہک نہیں بھگتا سکتا تھا۔

خیروین کا پانچ مرلے کا خریدا ہوا گھرا ب ڈبل اسٹوری ہو چکا تھا۔ اس کی اوپر والی منزل اب کسی کرائے دار کے پاس تھی۔ خیروین کے لیے چڑیا کے چلے جانے کے بعد نیچے والا حصہ بھی ضرورت سے بہت زیادہ تھا اور اس گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔

زندگی کا وہ مشکل دور بہت جدوجہد سے ہی سہی لیکن آہستہ آہستہ گزر گیا تھا لیکن اس کے نقوش اور اثرات ان تمام لوگوں کی زندگیوں پر تھے جو اس میں سے گزرے تھے اور ان تمام سالوں کے بعد اپنے زندگی کے پرسکون ترین دنوں میں فاطمہ کو اپنی زندگی کے بدترین دنوں کا خیال نہ آتا اگر اس نے کالج کے اس تقریری مباحثے میں ایک کوندہ دیکھ لیا ہوتا۔۔۔۔۔۔ فاطمہ نے ایک کو اس کے نام سے پہچانا تھا۔ وہ نام اس کی یادداشت کے ہر خانے پر جیسے نقش تھا۔ اس نے ایک کو اس کے چہرے سے پہچانا تھا۔ وہ آج بھی اس کے چہرے کو بھول نہیں پائی تھی اور اس نے ایک کو اپنی سن کے حوالے سے پہچانا تھا۔۔۔۔۔۔ صرف سات سال ہی تو گزرے تھے گرمیوں کے اس ایک مہینے کو جو ایک نے اس ڈی سی

ہاؤس میں اسے ٹینس سکھاتے اور اس کے ساتھ چھپس کھیلتے ہوئے گزارے تھے۔ سات سال اتنا لمبا عرصہ تو نہیں ہوتا کہ وہ اسے پہچان نہ لیتی۔۔۔۔۔۔ اور اگر وہ اسے پہچان سکتی تھی تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک اسے نہ پہچان پاتا۔

وہ فاطمہ کی زندگی کا پہلا مقابلہ تھا جس میں فاطمہ نے کوئی انعام حاصل نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ صرف بالیاں بجانے والوں میں شامل تھی یا اس کی نظریں بار بار ایک پر پڑتی رہی تھیں لیکن اس نے ایک کو ایک بار بھی اپنی طرف متوجہ نہیں پایا تھا۔ اسے اطمینان ہوا تھا وہ اسے نہیں پہچانتا تھا۔۔۔۔۔۔ اور اگر پہچان گیا تھا تو۔۔۔۔۔۔

اس دن بائٹل میں واپس آ کر فاطمہ نے اپنے سامان میں سے کئی سال پہلے ایک کی دی ہوئی ایک ٹینس بال نکال کر دیکھی تھی جس پر ایک نے اپنے سکپٹر کر کے دیے تھے اور ان سکپٹر کے ساتھ ایک جملہ اور بھی تھا۔

”I win coz I can“ وہ اس گیند کو پکڑے بہت دیر اس پر لکھی وہ تحریر دیکھتی رہی یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں نمی آنے لگی تھی۔

”اس ٹینس بال کو بہت carefully رکھنا اپنے پاس۔۔۔۔۔۔ کیونکہ ایک دن میں بہت بڑا ٹینس اسٹار بن جاؤں گا پھر تو میں کسی کو بھی اس طرح اپنے آئو گرافس نہیں دوں گا۔ but I like you...and are a friend تو اس لیے میں تم کو دے رہا ہوں۔“ ایک نے یہ گیند اس کے لیے سائن کرتے ہوئے بلا کی خود اعتمادی کے ساتھ کہا تھا۔ چڑیا نے تب اس سے یوں عقیدت کے ساتھ بے حد مرعوب ہوتے ہوئے وہ گیند لی تھی جیسے وہ واقعی کسی مستقبل کے سپر اسٹار سے وہ گیند لے رہی تھی۔

اس نے نم آنکھوں کے ساتھ وہ گیند واپس اسی بیگ میں ڈال دی جس میں ایک کی دی ہوئی اور بہت ساری چیزیں تھیں۔ ایک کی جینن، دو بال پوائنٹ، ایک جیب کی شکل کا شاپر، ایک کی بناکی ہوئی چند ڈرائنگز اور چڑیا کا پینسل سے بنایا ہوا ایک اسٹچ۔۔۔۔۔۔ چند تیلیاں جو ایک ڈائری کے اندر رکھی ہوئی تھیں اور شیشے کے ایک جار میں پڑے چند کیڑے مکوڑے جن کی حالت اب اتنے سالوں بعد کچھ کی کچھ ہو گئی تھی۔ فاطمہ کو ہمیشہ چیزیں بہت احتیاط سے رکھنے کی عادت تھی چاہے وہ کسی کی بھی دی ہوئی ہوتیں اور یہ تو ایک کی دی ہوئی چیزیں تھیں۔ اس ڈی سی ہاؤس سے باہر پھینکے جانے والے سامان میں چڑیا کا واحد اثاثہ بھی ایک بیگ تھا۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا دوست تھا اور آخری بھی۔ چڑیا کو زندگی میں دوبارہ بھی کوئی ایک نہیں ملا تھا جس سے وہ باتیں کر پاتی جو وہ ایک سے کرتی تھی۔

☆☆☆

”سر وہ ڈی سی او آپ سے فوری طور پر بات کرنا چاہتی ہیں۔“ آپریٹر کی آواز شیردل کو جیسے کسی خواب میں آنے والی آواز لگی تھی۔ وہ چند سیکنڈ پہلے انٹر کام کی آواز سے ہی ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ پچھلی رات شہر بانو اور مثال کوائر پورٹ پر سی آف کر کے لاہور سے سیدھا اپنے گھر آ گیا تھا۔ لاہور میں دو دن کے stay کے دوران اس کی خیندہ ہونے کے برابر ہی تھی اور واپس آتے ہی وہ گہری نیند سو گیا تھا۔

نیم تاریکی میں ہی کسی میکا کی انداز میں اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک ہاتھ سے لیٹے لیٹے فون اٹھایا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی رسٹ وائچ اٹھا کر وقت دیکھا تھا۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ کسی ایئر جنسی کے علاوہ آپریٹر اسے کال نہیں کر سکتا تھا۔

”سر ڈی سی او آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ Its emergency“ اس کے ریسپور اٹھاتے ہی آپریٹر نے عکس مراد علی کی designation اور شہر کا نام لیتے ہوئے اسے ایک بار پھر کہا تھا۔

”عکس مراد علی؟“ شیردل کو لگا اس نے خیندہ میں کچھ غلط سنا تھا۔

”yes sir“ آپریٹر نے تصدیق کی۔ شیردل بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”کال ملاؤ۔“ اس نے آپریٹر کو ہدایت کرنے کے بعد فوری طور پر سائنڈ میبل یسپ آن کیا۔ اس کی آنکھیں نیند

سے پوچھ لیں لیکن اس کا دماغ یک دم الارٹ ہو گیا تھا۔ ایسی کیا ایمرجنسی ہو سکتی تھی کہ وہ اسے رات کے اس پہر کال کر رہی تھی۔ ابھی پچھلی ہی رات وہ کچھ اور نہیں سوچ سکا۔ اس نے عکس کی آواز فون پر سنی تھی۔  
”ہیلو۔“

”ہیلو۔“ تمہارے بیڈروم میں TV ہے؟“ عکس نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے بری طرح الجھا۔

”ہاں ہے۔“

”تو پھر TV کاؤ۔“ وہ اسے ایک نیوز چینل کا نام بتاتے ہوئے ٹی وی لگانے کا کہہ رہی تھی۔ شیردل نے کچھ پریشانی کے عالم میں بیڈ سائڈ ٹیبل پر ریسیوٹ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

”خیریت ہے؟“ اس نے اس تلاش کے دوران عکس سے پوچھا اسے اس کی آواز بے حد بھیجی ہوئی لگی تھی۔  
”نہیں ہے خیریت۔ I'm in a big mess۔“ وہ اسے بتا رہی تھی اور بالکل اسی وقت شیردل نے ریسیوٹ ڈھونڈ کر سامنے لگی LCD آن کی۔ ایک نیوز چینل پر کسی پولیس اسٹیشن پر ایک بے حد قیمتی گاڑی اور اس میں سے نکل کر پولیس کی حراست میں اندر جانے والے ایک مرد کی فوج بار بار چل رہی تھی۔ جسے شراب نوشی کرتے ہوئے کچھ دیر پہلے کسی سٹپل پر پولیس کی کسی موبائل نے اپنی حراست میں لے لیا تھا۔ وہ ایک معروف سیاست دان کا بیٹا تھا اور اس کا نام جو ادملہ تھا۔ لیکن شیردل کا ذہن جو چیز دیکھ کر بھک سے اڑا تھا وہ TV اسکرین پر چلتی پٹی پر آنے والی اس دانتے کے حوالے سے ایک خبر تھی جس میں ملزم کی منگیت کے طور پر عکس مراد علی کا نام اس کے عہدے کے ساتھ چل رہا تھا۔

”میں تمہیں کچھ دیر بعد فون کرتا ہوں۔“ شیردل نے TV اسکرین پر اس فونچ اور پٹی پر چلنے والی خبر پر ایک نظر ڈالنے کے بعد عکس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اسے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

خیر دین نو سال بعد اپنے گاؤں پہلی بار تباہ کیا تھا جب قاطعہ کونگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ملا تھا۔ وہ اپنا یہ فخر جیسے اپنے پورے گاؤں میں بانٹنے اور بتانے گیا تھا۔ اس کی نواسی اس علاقے اور اس گاؤں کی پہلی ڈاکٹر بننے والی لڑکی تھی جو ایف ایس سی میں بورڈ کوٹاپ کرتے ہوئے وہاں پہنچی تھی۔ وہ نو سال پہلے اس گاؤں سے دھکے کھاتے ہوئے سر جھکائے روتا ہوا اپنے دل میں یہ حسرت لیے وہاں سے گیا تھا کہ اس کی نسل میں کوئی مرد ہوتا تو شاید۔۔۔۔۔ اور اس شاید کے آگے کا جواب خود خیر دین کو کبھی نہیں آیا تھا۔ اس کی نسل میں ایک مرد ہوتا تو خیر دین کے لیے کیا کرتا؟ اس طرح لڑتا جس طرح اس کے اجڈ اور جاہل بھتیجے اس سے لڑ رہے تھے؟ اس کے ساتھ مار کھانے کے لیے ہر اس جگہ جاتا جہاں خیر دین گیا تھا اور ذلیل ہو کر آیا تھا یا اس کا نام روشن کرتا اور نام روشن کرنے کے لیے خیر دین کو کسی مرد کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہ کام تو چڑیا نے بھی کر لیا تھا۔۔۔۔۔ خیر دین نے ساری عمر یہی ایک خواب دیکھا تھا۔۔۔۔۔ چڑیا کو ایک بہت بڑی ڈاکٹر بنانے کا خواب اور پھر اس گاؤں میں ایک اسپتال بنانے کا خواب۔۔۔۔۔ گاؤں میں اس بار بھی اس کا استقبال مختلف طریقے سے ہوا تھا۔

☆☆☆

”شہر بانو اگر میں کبھی دوسری شادی کرنا چاہوں تو تم کیا کرو گی؟“ Emirates ائر لائنز میں بیٹھے ایک فلم دیکھتے ہوئے شہر بانو کو پتا نہیں کیوں شیردل کا سوال یاد آیا تھا۔ وہ پچھلی رات کی بات تھی جب وہ اس سے عکس کے حوالے سے پوچھ رہی تھی اور بہت دیر خاموش رہنے کے بعد شیردل نے یک دم اس سے پوچھا تھا۔

اس آئینے نے کئی سال پہلے کی طرح آج بھی اس کی نظر کو خود سے ہٹنے نہیں دیا۔ گزر جانے نہیں دیا۔ وہ آئینے کے سامنے رک گئی۔ وقت نے اس آئینے پر اپنے نشانات بڑھا دیے تھے۔ ہلکی سی بوسیدگی، چند داغ، کئی نئی لکیریں، آب و تاب کھوتی چمک، بجھی ہوئی رنگت۔ وقت نے ایسے ہی بہت سارے نشان اس کے اپنے وجود اور اس کے چہرے پر چھوڑے تھے جس کا عکس آئینے میں دیکھنے پر شناخت کرتے ہوئے اسے چند لمحے لگے تھے۔

ایک نظر اس نے خود کو دیکھا پھر اپنے عقب میں نمودار ہونے والے مرد کو آئینے میں دونوں کی نظریں لمحے بھر کے لیے ایک دوسرے سے ٹکی تھیں پھر دونوں ہی نے ایک دوسرے سے آنکھیں چرا لی تھیں۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے ایک دوسرے سے اسی طرح آنکھیں چراتے ہوئے ہی پھر رہے تھے۔ آئینے میں ایک لمحے کے لیے جیسے ان کی زندگی جھلکی تھی۔ وہ زندگی جو

20 ماحنامہ پاکیزہ — اپریل 2012ء

☆☆☆

”ایک گھر میں صرف ایک ملکہ ہوتی ہے۔ بادشاہ کے محل میں ایک سے زیادہ ہوتی ہوں گی اور تم بادشاہ نہیں ہو۔“

”تم imagine کرو۔“ شیردل اس کی بات پر مسکرایا لیکن اس نے پھر بھی اپنے سوال کے جواب کے لیے اصرار کیا تھا۔

”تم اپنے گھر میں میری جگہ ایک اور عورت لے آؤ گے؟ اپنی زندگی میں سے مجھے نکال کر کسی دوسری عورت کو شامل کر لو گے؟ یہ impossible ہے۔“ شہر بانو نے اسی انداز میں کہا۔ شیردل اسی انداز میں مسکرا دیا تھا۔ شہر بانو اب بھی اس کے سینے پر بچوں کی طرح سر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ شیردل نے اس کے گرد اپنے بازوؤں کے حصار کو توڑتے ہوئے ایک ہاتھ سے بہت نرمی سے اس کے بالوں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔

”ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔“ شہر بانو نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد یک دم اس سے کہا۔ شیردل ٹھنکا۔  
”کس بات کی؟“ اس نے شہر بانو کے بالوں کو سمیٹنا جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ مردوں کو بیویوں سے آخر یہ سوال کرنے کا شوق کیوں ہوتا ہے؟“ شیردل بے اختیار ہنسا تھا۔

”اے آپشنز چیک کرتے رہنا کوئی غلط بات تو نہیں۔“ اس نے برنگسلی سے کہا۔  
 ”ہذا حق نہیں کر رہی ہیں۔“ شہر بانو سنجیدہ تھی۔ ”ویسے اگر تم شادی کرتے دوسری..... تو کس سے کرتے؟“ شہر بانو کو

"Hmmm....." شہر دل نے بے اختیار گہری سانس لی۔

”Hmmm.....“ سیر دل نے بے اختیار لہریں ساس ڈالی۔  
 ”interesting question“ وہ ایک لمحے کے لیے سوچتے لگا تھا یا کم از کم شہر بانو کو لگا۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ شہر دل کو اس سوال کا جواب سوچنے کی ضرورت تک نہیں تھی۔

شیر دل اس عجیب اور بے وقت کی غیر متوقع ٹیلی پیٹھی پر جیسے دم بخود ہوا تھا اور اس کی خاموشی نے شہر بانو کو عجیب سے

اندااز میں مضطرب کیا تھا۔ شیر دل کے سینے پر ہیر نکائے اس نے نیک دم چہرہ سیدھا کر لیا تھا۔ بیڈ کے کراؤن سے ٹیکے لگائے نیم دراز شد دل جانتا تھا وہ کیا کرنے والی تھی۔

لگائے نیم دراز شیر دل جانتا تھا وہ لیا کرے والی سی۔  
 "That's quite a silly statement" اس نے شہربانو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔  
 تھا۔

تھا۔  
 "statement" نہیں ہے "it's just a wild guess"۔ "شہر بانو نے شیر دل کی آنکھوں اور چہرہ کو پھر کسی مائیکرو اسکوپ کی طرح بڑھنے کی کوشش کی۔"

کو پھر کسی مائیکرو اسکوپ کی طرح پڑھنے کی کوشش کی۔  
 ”تم کو سونا نہیں ہے؟“ شیردل نے اسی طرح اس کو موضوع سے ہٹانے کی کوشش کی تھی جس طرح وہ ہمیشہ کرتا  
 ماہنامہ پاکیزہ — اپریل 2012ء (21)



”تم بتاؤ نا، شہر بانو نے اصرار کیا۔ وہ اب شیردل کے سینے پر اپنی کہنیاں ٹکائے ہوئے تھی۔

”دنیا کے سمجھدار مرد ایک شادی کرتے ہیں..... بے وقوف دو کرتے ہیں..... اور خوش قسمت ایک بھی نہیں۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

”تم سمجھدار ہو لیکن خوش قسمت نہیں لیکن.....“ شیردل نے اس کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔

”یار میں نے بہت غلط سوال کر لیا تم سے..... چھوڑو اب اسے..... ہر مرد کو بڑی fantasy ہوتی ہے دوسری شادی کی..... اور کوئی بات نہیں۔“ شیردل ایک بار پھر اسے الجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم ویسے عکس کو بہت پسند کرتے ہو؟“ شہر بانو نے اس کی کوشش پر پانی ڈالا۔

”کوئی بھی کر سکتا ہے۔“ شیردل نے نظر ملائے بغیر وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”کوئی بھی مرد۔“ شہر بانو نے جیسے اسے کچھ بتایا۔

”ہاں کوئی بھی مرد۔“ شیردل نے اس کے انداز سے اور شاید بے کو جھٹلایا نہیں تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔ شیردل نے جیسے اس کی سوچوں کو پڑھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ کامیاب نہیں ہوا۔ وہ ایک عورت کی سوچ تھی۔ شہر بانو نے مزید بحث کیے بغیر اس کے سینے پر دوبارہ سر ٹکا دیا۔ شیردل نے اس مائیکرو اسکوپ کے سامنے سے ہٹ جانے پر جیسے شکر ادا کیا تھا۔

جہاز کی سیٹ پر بیٹھے ایک فلم دیکھتے ہوئے پتا نہیں شہر بانو کو شیردل اور اپنی یہ گفتگو کیوں یاد آئی تھی۔ کوئی خدشہ..... کوئی خوف..... کوئی سائزن نہیں بجا تھا۔ شیردل پر اسے ایسا ہی اندھا اعتماد تھا۔ ان دونوں کو دور ہوئے صرف چند گھنٹے گزرے تھے۔ اور وہ ان تمام گھنٹوں میں شیردل کے علاوہ اور کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی۔ وہ اس وقت کیا کر رہا ہوگا؟ کہاں ہوگا؟ کچھ کھا رہا ہوگا۔ شیردل کی روٹین اس کی فنگر ٹیس پر تھی اور سیکڑوں میل دور اور ہزاروں فٹ کی بلندی پر بھی شیردل جیسے اس کے سامنے چل پھر رہا تھا۔ وہ شادی کے اتنے سالوں بعد بھی شیردل کے بارے میں جیسے جاگتے ہیں خواب دیکھنے کی عادی تھی بالکل اسی طرح جیسے وہ شیردل سے شادی سے پہلے اس کے بارے میں سوچتی تھی۔

”مہی، پایا کہاں ہیں؟“ اس کی سوچوں کا تسلسل مثال کے سوال پر ٹوٹا تھا۔ اس کے برابر کی سیٹ پر وہ ابھی ابھی نیند سے ہڑبڑا کر اٹھی تھی اور اس نے آنکھیں کھولتے ہی شیردل کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ شہر بانو نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ یہ مثال کی پرانی عادت تھی، وہ نیند سے جاگتے ہی سب سے پہلے شیردل کو ڈھونڈتی تھی۔ یہ اس کی بھی عادت تھی، وہ بھی اپنے باپ کی زندگی میں اس کے ساتھ رہتے ہوئے آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلا سوال اپنے باپ کے بارے میں ہی کرتی تھی۔ مثال کو تھکتے ہوئے اس نے پچھلے کئی گھنٹوں میں بلاشبہ کوئی دسویں بار مثال کو شیردل کا نخل وقوع بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی اور یہ بھی کہ وہ ان کے ساتھ کیوں نہیں آسکا۔

”Can you tell him that Misal is missing him?“ مثال نے اس کی بات سننے کے بعد پک دم اس سے کہا۔

”I would definitely do that“ شہر بانو نے اسے مزید تھپکا۔

”Mummy is also missing him“ شہر بانو نے بھی اس کے ساتھ شہرنگ کی۔

”لیکن آپ میرے جتنا تو miss نہیں کرتیں نہیں۔“ مثال نے فوراً اعتراض کیا۔ شہر بانو مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی مثال باپ کے بارے میں اسی طرح پوچھتی تھی جس طرح باپ اس کے بارے میں تھا۔

”ہاں تمہارے جتنا تو miss نہیں کرتی میں تمہارے پایا کو۔“ شہر بانو نے جیسے اسے یقین دلایا۔ مثال نے اختیار کچھ مطمئن ہو گئی۔

”سو جاؤ۔“ شہر بانو نے اسے دوبارہ سلامانے کے لیے سیٹ کی پشت سے نکالیا۔ مثال نے مطمئن انداز میں اس کا

ہاتھ پکڑے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ شہر بانو اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ اب تک اس کی اور شیردل کی زندگی کا سب سے قیمتی اکاش تھا..... واحد اکاش کہنا شاید زیادہ مناسب ہوتا۔ چار سال سے وہ ان دونوں کی زندگی کو بانٹنے والا واحد ساتھی تھا..... لیکن اس سال وہ اپنی فیملی میں مزید اضافہ کرنے کی پلاننگ کر رہے تھے۔ مثال کے بہن یا بھائی کے دنیا میں آنے کا اس سے زیادہ موزوں وقت کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

عکس مراد علی کے لیے ٹی وی اسکرین پر بار بار گزرنے والے اس ticker کے چلنے کا اس سے زیادہ غیر موزوں، تکلیف دہ اور خطرناک وقت کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ شیردل کو بیڈ روم میں صوفے پر بیٹھے برقی رفتار سے ایک کے بعد ایک کال ملتے اور متعلقہ افراد سے بات کرتے ہوئے بھی اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ اور احساس تھا۔ رات کے پچھلے پہر بھی ٹی وی پر آنے والی ایک ایسی خبر کا حصہ ہونا ذاتی حیثیت میں جتنا تکلیف دہ تھا پروفیشنل عکس کے لیے اس سے زیادہ نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد ٹی وی اسکرین کے نیچے چلنے والے tickers میں سے صرف عکس مراد علی کے حوالے سے چلنے والی خبر غائب ہو گئی تھی..... لیکن شیردل کو اندازہ تھا کہ تب تک بھی عکس کے لیے خفت اور رسوائی کا کافی سامان اکٹھا ہو چکا تھا۔

”Thank you“ شیردل کی کال ریسیو کرتے ہی اس نے ہیلو کے بجائے اسے کہا۔

”جواب سے بات ہوئی ہے تمہاری؟“ شیردل نے اس کے Thank you کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں..... فون بند ہے اس کا۔“ شیردل کو اس کی آواز ٹھکی ہوئی اور بھاری محسوس ہوئی۔ وہ اگلا سوال کرتے کرتے ٹھٹھک گیا۔ پتا نہیں اسے کیوں یہ احساس ہوا کہ وہ شاید روٹی تھی..... یا پھر روٹی تھی۔

”تم تو ٹھیک ہو؟“ شیردل بے اختیار ٹیس ہوا تھا۔

”ہاں۔“ وہ کوئی سوال کرنا چاہتا تھا مگر نہیں کر سکا۔

”تم اب سو جاؤ۔“ اس نے بے اختیار عکس سے کہا۔

”اوکے۔“ وہ جیسے خود بھی اس وقت بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دینے کے بعد دوبارہ سونے کے لیے بستر پر لیٹ جانے کے بعد بھی شیردل دوبارہ نہیں سو سکا۔ اسے بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ فجر کے قریب وہ بالآخر نہیں رہ سکا۔ اس نے سیل فون پر اسے میسج کیا۔ ”awake?“ چند سیکنڈ کے بعد اس کے سیل پر ایک blank message آیا۔ ایک گہری سانس لے کر شیردل نے اسے کال کی۔

”پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہونے والا اور نہ ہی ساری رات اس طرح بیٹھے رہنے سے یہ پریشانی ختم ہوگی۔“ عکس نے جی پی تیل پر کال ریسیو کی اور شیردل نے بغیر کسی ہیلو ہائے کے اس سے کہا۔

”جواد کے والد بے کچھ دیر پہلے میری بات ہوئی ہے۔“ عکس نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

”پھر؟“ شیردل ٹھٹھا۔

”وہ کہہ رہے ہیں ان کے political career کو نقصان پہنچانے کے لیے سازش کی گئی ہے۔ جواد تو شراب پیے ہوئے تھا نہ ہی اس کی گاڑی میں شراب تھی۔ وہ کسی دوست سے ملنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپسی پر دیر ہوئی اور کسی نے میڈیا اور پولیس کے ذریعے اسے trap کرنے کے لیے انتظام کیا ہوا تھا اور.....“ شیردل نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تم نے ان سے کیا کہا؟“ وہ چند لمحوں تک خاموش رہی پھر شیردل نے اس کی تھکی ہوئی آواز سنی۔

”کچھ نہیں، میں انہیں کیا کہتی؟ لیکن ہو سکتا ہے یہ سب سچ ہو..... آج کل یہی سب کچھ تو ہو رہا ہے۔“ شیردل نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔

”تم بے وقوف ہو یا بننا چاہ رہی ہو؟“ بہت دیر تک دوسری طرف خاموشی رہی پھر شیردل نے اسے کہتے سنا۔

”میرا نام ایک ہے۔“ فاطمہ چند لمحوں کے لیے فریز ہو گئی تھی۔ کنگ ایڈورڈ میں یہ اس کا پانچواں دن تھا جب اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ وہ اس دن پہلی بار کالج آیا تھا۔۔۔۔۔ یا پھر۔۔۔۔۔ وہ اپنے آپ میں اتنی گمن تھی کہ اس نے ایک کو نوٹس ہی نہیں کیا تھا اور نوٹس تب کیا تھا جب وہ کارڈ بورڈ میں آ کر اس کے بالقابل کھڑا ہو گیا تھا۔ فاطمہ اگر اہل نہیں سکتی تھی تو یہ غیر معمولی نہیں تھا۔ یہ ایک نام ایسا تھا اس کی زندگی میں جو کبھی بھی کہیں بھی اسے اسی طرح نروس۔۔۔۔۔ اسی طرح فریز کر سکتا تھا۔

وہ اس کے سامنے کھڑا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہا تھا۔ فاطمہ نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ پھر اس نے مسکرانے کی بھی کوشش کی۔ وہ بڑے دوستانہ انداز میں اس کے بالقابل کھڑا تھا۔

”میں نے آپ کو پریشان کر دیا شاید؟“ وہ اب محذرت کر رہا تھا۔ فاطمہ کو جیسے ذرا سی شرمندگی ہوئی۔ اس کی ذہنی کیفیت اس کے چہرے پر کیوں آ گئی تھی۔

”نہیں تو۔“ اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

وہ اب اپنا تفصیلی تعارف دے رہا تھا۔ فاطمہ کو حیرت ہوئی وہ اس کی طرف متوجہ کیوں ہوا تھا۔ پوری کلاس میں اسے تعارف کے لیے ایک ہی لڑکی ملی تھی یا وہ ہر لڑکی ہے اسی بے تکلفی کے ساتھ بات کر لیتا تھا۔۔۔۔۔ وہ فی الحال اندازہ نہیں کر سکتی تھی لیکن اس نے مدہم مسکراہٹ کے ساتھ اس کا تفصیلی تعارف سنا۔

وہ ایک سلطان کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات تھی اور کالج سے ہاسٹل تک ایک اس کے سر پر سوار رہا تھا۔ اور اس کی وجہ اسے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی۔

ایک سلطان فاطمہ کی پہلی محبت تھی۔ پہلی غلطی۔۔۔۔۔ پہلا تجربہ۔۔۔۔۔ پہلا زخم۔۔۔۔۔ بہت سارے سبق تھے جو اس پہلے تجربے نے اسے دیے تھے جو اس نے محبت کے نام پر کیا تھا۔۔۔۔۔ یا شاید اسے ہوا تھا۔

لاہور آنے کے بعد وہ کسی لڑکے کے ساتھ پہلی بار انوالو ہوئی تھی۔ لیکن اس انوالومنٹ کا آغاز اس کی طرف سے نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک تھا جو خود اس کی طرف بڑھا تھا۔ کلاس کی تمام لڑکیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے۔۔۔۔۔ اسے خوشی سے پھولنا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ کچھ غرور آنا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ ساتویں آسمان پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکا اس میں اس طرح کی دلچسپی دکھا رہا تھا لیکن اس کے برعکس وہ بہت عجیب سی ٹیلنٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ اس نے اتنے سال اکیلے محتاط اور ہر ایک سے دور رہ کر اپنے خول میں زندگی گزار لی تھی کہ کنیر ڈکے دو سالوں نے بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ وہ صرف جسمانی طور پر ہاسٹل اور کالج کی لڑکیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگی تھی لیکن ذہنی طور پر وہ اب بھی ان سے بہت دور تھی۔ وہ خول جو بچپن کے اس حادثے نے اس کے گرد بنا دیا تھا وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ مضبوط اور سخت ہوتا گیا تھا اور فاطمہ نے ہمیشہ خود کو اس خول کے اندر بے حد محفوظ تصور کیا تھا تب بھی نہیں۔

ایک سلطان کی آمد نے پہلی بار اس خول پر ضرب لگا کر دراڑیں ڈالی تھیں۔ وہ کالج میں اس کی طرف کیوں متوجہ ہوا تھا؟ اس کی اس غیر معمولی توجہ کا مقصد کیا تھا۔۔۔۔۔ ان دو سوالوں سے زیادہ پریشان کن سوال فاطمہ کے لیے یہ تھا کہ وہ ایک کی توجہ کو resist کیوں نہیں کر پار ہی تھی۔ وہ ایک لالہ ابالی، کھلنڈرا، ہنس مکھ، بے پروا لڑکا تھا اور فاطمہ ہر چیز میں اس کے برعکس تھی۔ اس کے باوجود ایک کا اسی کی طرف متوجہ ہونا اور فاطمہ کا چاہنے کے باوجود اس احتیاط کا مظاہرہ نہ کر پانا جو اس کی زندگی کا حصہ تھی۔۔۔۔۔ فاطمہ کے لیے عجیب سہی لیکن اس کی زندگی میں آنے والی ایک بے حد خوشگوار تبدیلی تھی۔ ایک کی ای اسی میڈیکل کالج میں اسٹنٹ پروفیسر کے طور پر کام کر رہی تھیں۔ وہ ایک انتہائی دوستانہ مزاج رکھنے والی بے حد نفیس سی خاتون تھیں۔ ایک سے بھی ملنے سے پہلے فاطمہ ان سے مل چکی تھی۔ وہ ان لوگوں کی ایک کلاس لیتی تھیں اور ان کے چند میچرز میں سے ایک تھیں جنہیں اسٹوڈنٹس بہت پسند کرتے تھے۔ ایک اور اس کی دوستی چند ہفتوں میں ہی ان کے نوٹس میں آ گئی تھی۔ فاطمہ کو کچھ تحفظات تھے ان کے رد عمل کے حوالے سے۔ لیکن اس کی توقعات کے برعکس مسز سلطان کا رویہ اس کے ساتھ بہت دوستانہ اور حوصلہ افزا تھا۔ وہ ایک کے ساتھ اکثر اوقات ان کے آفس چلی جایا کرتی تھی اور

ماہنامہ پاکیزہ — اپریل 2012ء

Scanned and Uploaded By Muhammad Nadeem

خیر دین زمانہ شناس انسان تھا۔ فاطمہ کو اپنے ہاتھ کی پشت کی طرح جانتا تھا۔ اس میں آنے والی کوئی بھی تبدیلی نوٹ نہ کرنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ جب بھی ہاسٹل سے واپس گھر آتی تو واپس جانے کے لیے بے حد بے قرار رہتی اور خیر دین کے لیے یہ اس میں آنے والی ایک بہت بڑی اور عجیب تبدیلی تھی۔ اس سے پہلے وہ ہمیشہ گھر آنے کے لیے بے چین رہتی تھی۔ خیر دین نے اسے اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کیا..... لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ وہمی نہیں تھا اور اب اسے بار بار وہم ہو رہے تھے۔ فاطمہ ہمیشہ سے خوش لباس تھی یہ عادت اس نے خیر دین سے لی تھی۔ اچھا، صاف ستھرا اور زمانے کے رواج کے مطابق لباس لیکن اب یک دم فاطمہ ضرورت سے زیادہ اور خلاف عادت اپنے آپ پر توجہ دیتی نظر آتی تھی۔ اسے ایک دم کا سمپٹلس اور جیولری میں بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی..... اور وہ بہت خوش رہنے لگی تھی۔ خیر دین بار بار خود کو یہی یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ چڑیا جوان ہو چکی تھی ڈاکٹر بن رہی تھی، بڑے شہر میں تھی..... ہر طرح کے لوگوں سے میل ملاپ تھا اس کا، اس کو خود پر توجہ دینی ہی چاہیے تھی..... لیکن بار بار کچھ نہ کچھ کھٹکتا تھا اسے چڑیا سے اپنے ان واہموں کے حوالے سے کوئی سوال خیر دین کے لیے بہت مشکل تھا لیکن ان چیزوں کو بھی ہضم کرنا آسان نہیں تھا جو وہ دیکھ رہا تھا اگر اطمینان اسے تھا تو صرف یہ تھا کہ چڑیا بھی بھٹک نہیں سکتی تھی۔ وہ بھی کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ خیر دین کا سر جھکا دینے والا کوئی کام نہیں کر سکتی تھی اور اس یقین اور اعتماد نے خیر دین کی عیندیں کبھی اڑنے نہیں دیں۔

ابنک سلطان خیر دین سے بہت دیر چھپائیں رہ سکا تھا۔ ایک بار چھٹیوں میں گھر آنے پر کسی بات پر غیر محسوس طور پر فاطمہ نے خیر دین کے سامنے اس کا نام لیا۔ خیر دین نے اس کی زبان سے کسی لڑکے کا نام پہلی بار نہیں سنا تھا۔ وہ گواہجو کیشن میں پڑھی تھی اور اب پھر گواہجو کیشن میں ہی پڑھ رہی تھی۔ کسی لڑکے کا ذکر آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن جس طرح چڑیا ایک کا نام لیتی تھی وہ غیر معمولی تھا۔۔۔۔۔ اور خیر دین اسے جتائے بغیر بغور یہ نوٹس کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ ایک کا ذکر کتنے تو اتر سے اس کی گفتگو کا حصہ بن رہا تھا اور جب خیر دین کو یقین ہو گیا کہ اب ایک کے بارے میں اس کا کوئی سوال چڑیا کو بولھلائے گا نہیں تو اس نے چڑیا سے ایک کے بارے میں پوچھ ہی لیا تھا۔ فاطمہ خیر دین کے سوال پر چند لمحوں کے لیے کیفور و انداز میں نانا کو دیکھتی رہی۔ وہ پہلا موقع تھا جب خیر دین خود اس کے کسی کلاس فیلو کے بارے میں سوال کر رہا تھا اور وہ بھی ایک کے بارے میں۔۔۔۔۔ ورنہ اس سے پہلے وہ خود ہی خیر دین کو کسی کلاس فیلو کے بارے میں بتاتی تو جاتی خیر دین خود کسی کسی کے بارے میں نہیں پوچھتا تھا۔

”کلاس فیلو ہے میرا۔“ فاطمہ نے بظاہر لہجہ نارمل رکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے خیر دین سے کہا تھا لیکن غیر ارادی طور پر اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ خیر دین کی نظر سے وہ رنگت کی تبدیلی چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ اپنا لہجہ نارمل رکھتے ہوئے ایک کے بارے میں تمام معلومات لپٹا گیا تھا اور جب وہ سوال جواب ختم ہوئے تو خیر دین بھی چڑیا کی طرح بے حد مطمئن اور خوش تھا۔ اس نے چڑیا سے بھی یہ نہیں کہا تھا کہ اب وہ اس کے مستقبل اور اس کی شادی کے حوالے سے سوچتا اور فکر مند ہوتا رہتا تھا۔ حلیمہ سے اس سلسلے میں اس کی اکثر بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ اوپر تلے دو بیٹوں کی پیدائش کے بعد اس کا پاکستان آنا جانا کچھ کم ہو گیا تھا لیکن فون پر وہ اب بھی بہت باقاعدگی سے خیر دین اور چڑیا کے ساتھ رابطے میں تھی۔

26 ماہنامہ پاکیزہ — اپریل 2012ء

”تمہیں پتا نہیں تھا کہ جواد ڈرنک کرتا ہے؟“ شیردل نے عکس سے پوچھا تھا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس کے شہر پہنچا تھا اور اب وہ دونوں عکس کے آفس میں بیٹھے تھے۔

”دو سال سے جان پہچان تھی تم دونوں کی..... پتا ہونا چاہیے تھا تمہیں۔“ شیردل نے چیخ کے گردنی بیک کے دھاکے کو پھینکے ہوئے اس کو پھوڑ کر کپ سے نکالتے ہوئے کہا۔ عکس کچھ دیر بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ سوال شرمندہ کرنے کے لیے نہیں تھا لیکن اسے شرمندہ کر گیا تھا۔ شیردل اب چائے کا سب لیتے ہوئے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

”میں نے اس سے پوچھا تھا ایک آدھ بار..... اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ وہ ڈرنک وغیرہ نہیں کرتا..... سگریٹ تک نہیں پیتا..... اکثر وہ شراب کے خلاف بات بھی کرتا تھا..... میرے لیے یہ یقین کرنا ناممکن تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ یہ تو اب بھی نہیں مان رہا کہ وہ شراب پیتا ہوا پکڑا گیا ہے..... اپنے قادر کی طرح اس نے بھی مجھے یہی کہا ہے کہ میڈیاٹر اکل کیا گیا ہے اس کا کیونکہ اگلے ایکشنز میں اس کی فیل اسے صوبائی اسمبلی کے امیدوار کے طور پر سامنے لانا چاہتی تھی۔“ عکس نے بالآخر گہری سانس لیتے ہوئے چائے میں سے ٹی بیک نکال کر رکھ دیا۔

”جواد سے کب بات ہوئی ہے تمہاری؟“ شیردل نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”آج صبح..... اس کی bail ہو گئی تھی کل رات ہی لیکن مجھ سے بات نہیں ہو سکی اس کی..... کہہ رہا تھا طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے مجھ سے خود بات نہیں کر سکا۔“ عکس اب کچھ سوچتے ہوئے چائے کے سب لے رہی تھی۔ ”میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اس نے اپنی منگیت کے طور پر میرا نام کیوں لیا؟ اس نے کہا اس نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ میڈیا نے خود ہی یہ خبر ڈھونڈ نکالی اور چلا دی ورنہ اس کی فیل کہاں اپنی عورتوں کا نام اس طرح فی وی اسکرین پر دیکھتی اور خوش ہوتی ہے۔“ شیردل نے چائے کا کپ رکھ دیا تھا۔

”تم کو اس کی باتوں پر یقین آ گیا؟“ عکس نے نظر میں اٹھا کر شیردل کو دیکھا۔

”میرے پاس یقین کرنے کا آپشن نہیں ہے..... کم از کم اس سٹیج پر..... اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”عکس اس نے پولیس اسٹیشن میں خود تمہارا نام لیا تھا..... ایک بار نہیں بار بار..... وہ پولیس کو پہلے اپنے باپ کا نام لے کر دھمکا رہا تھا بعد میں تمہارا نام لے کر..... ایف آئی آر میں پولیس نے یہ بھی لکھا ہے..... مجھے اگر جواد کی کسی چیز پر اعتراض ہے تو وہ یہی ہے..... کچھ بھی ہوتا اسے اس سارے معاملے میں تمہارا نام نہیں لانا چاہیے تھا..... اس میں اتنی بہادری اور غیرت ضرور ہونی چاہیے تھی کہ وہ تمہارے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتے ہوئے تمہاری عزت کا خیال کر لیتا..... That's the only point that bothered me..... ورنہ مجھے اس کے ڈرنک کرنے یا کسی عورت کے ساتھ بھی پکڑے جانے پر کوئی اعتراض نہیں..... اور وہ بالکل جھوٹ بول رہا ہے کہ وہ ڈرنک نہیں کرتا..... وہ نشے میں بالکل آؤٹ تھا جس وقت پولیس نے اس کی گاڑی کو روکا تھا..... پولیس والوں نے تو انسانی ہمدردی اور اس کی جان کی تحفظ کے لیے اسے روکا تھا کہ کہیں گاڑی مار نہ دے..... ورنہ اس سے ابتدائی بات چیت میں اس کا فیل بیگ گراؤ غلط جاننے کے بعد انہیں کوئی شوق نہیں تھا اس پر کوئی ایف آئی آر وغیرہ رجسٹر کرنے کی کوشش کر کے اپنا منہ کالا کرنے کا..... وہ بے چارے تو اس کے گھر والوں کو اطلاع دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس کو آ کر لے جائیں لیکن ان موصوف نے نشے کی حالت میں وہاں سڑک پر ہی اتنا ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ اس پاس سے گزرنے والوں میں سے کسی نے کسی چینل کو اطلاع کر دی اور میڈیا کے وہاں پہنچنے کے بعد پولیس کو مجبوراً اس کے خلاف ایف آئی آر رجسٹر کرنی پڑی۔“ شیردل اسے بے حد سنجیدگی سے واقعے کی تفصیلات بتا رہا تھا۔

”اور تم سے کل رات کو بات نہ کرنے کی وجہ طبیعت کی خرابی سے زیادہ نشے کی وجہ سے بات کرنے کے قابل نہ ہونا ہوگا..... لیکن خیر مسئلہ تو حل ہو گیا ہے اب..... اور ہو ہی جاتا تھا اشیائے بیچ تو تمہارے سسرال والوں کی ہے ہی کہ اتنی چھوٹی سی بات پر پکڑے جانے پر اپنے بیٹے کو رات بھی پولیس اسٹیشن میں گزارنے دیتے۔“ شیردل نے چائے کا کپ دوبارہ اٹھا لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ عکس کچھ ہنسی شیردل کے سبب فون پر کوئی کال آنے لگی تھی۔ چائے کا کپ واپس رکھتے ہوئے شیردل

نے بے حد برق رفتاری سے فون اٹھایا تھا اور فون پر ایک نظر ڈالتے ہی عکس نے اس کے چہرے پر اطمینان بھری ایک مسکراہٹ پھیلنے دیکھی تھی۔ پتا نہیں کیا تھا اس مسکراہٹ میں کہ عکس شیردل کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکی۔ وہ اب فون پر شہر بانو سے بات کر رہا تھا۔

”تم نیویارک پہنچ گئیں؟“

”ہاں ابھی سامان وغیرہ لینا ہے ہم لوگوں کو.....“ شہر بانو کی آواز تھکی ہوئی تھی۔

”اگلی فلائٹ کا پتا کیا؟“ شیردل نے اس سے پوچھا۔

”نہیں ابھی نہیں سامان وغیرہ لینے کے لیے کھڑے ہیں فی الحال تو..... ویسے بھی اگلی فلائٹ میں چار پانچ گھنٹے ہیں ابھی اور میں اتنی تھک چکی ہوں کہ میں تمہیں بتا بھی نہیں سکتی..... تمہیں ساتھ آنا چاہیے تھا شیردل۔“ شہر بانو نے شکایت کی۔ شیردل نے مسکراتے ہوئے اس کو بہلانے والے انداز میں کہا۔

”I know yaar..... میں پہلے ہی بہت مس کر رہا ہوں کل رات سے تم دونوں کو.....“

”مس تو تمہاری بیٹی کر رہی ہے تمہیں..... میری جان کھالی ہے اس نے پورے راستے میں بار بار تمہارا پوچھ کر.....“

اب تم بات کرو اس سے۔“ شہر بانو نے مثال کو دیکھتے ہوئے فون کو بالآخر اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ جو شیردل کا نام لیے جانے پر بے حد impatient ہو رہی تھی۔ اس کی آواز فون پر سنائی دیتے ہی شیردل کو جیسے کچھ دیر کے لیے واقعی یہ بھول گیا تھا کہ وہ کہاں تھا۔ عکس مدھم مسکراہٹ کے ساتھ فون پر مثال کے ساتھ ہونے والی اس کی گفتگو سنتی رہی۔ ایک عجیب سا رشک آیا تھا اسے شہر بانو اور مثال پر اور شیردل پر..... وہ ایک پرنسٹن ٹکون تھی..... ایک مکمل خوب صورت چمکی..... جس پر کسی کو بھی رشک آ سکتا تھا۔

”بیٹا مئی کو بالکل ٹھیک نہیں کرنا اب تم نے..... مئی کا خیال رکھنا ہے۔“ شیردل اب الوداعی کلمات کہہ رہا تھا مثال سے اور اس سے ایک کے بعد ایک وعدہ لے رہا تھا۔

”مئی کو فون دو۔“ اس نے مثال کو آخری ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

”شیردل تم بیٹی سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ مجھے بھول جاتے ہو۔“ شہر بانو نے فون پکڑتے ہی کچھ خفگی سے اس سے کہا اور اس کا یہ شکوہ غلط نہیں تھا۔ شیردل ہنس پڑا تھا۔

”میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں سویٹ ہارٹ؟“ عکس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے چند لمحوں کے لیے شیردل سے نظر ہٹائی تھی اور بالکل اس لمحے شیردل کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ کہاں تھا۔

شہر بانو کو اگلی فلائٹ کے حوالے سے کچھ ہدایات دیتے ہوئے اس نے الوداعی کلمات کہتے ہوئے فون بند کیا اور پھر معذرت خواہانہ انداز میں عکس سے کہا۔

”سوری یار..... بس وہ دونوں نیویارک پہنچ گئی ہیں۔ شہر بانو پہلی بار مثال کے ساتھ اکیلے اتنا لمبا سفر کر رہی ہے اس لیے میں تھوڑا بے چین ہوں۔“ عکس نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

”میں نے کچھ کہا؟“

”نہیں تم نے کہا تو نہیں..... لیکن میں پھر بھی سوچ رہا تھا کہ کچھ زیادہ ہی لمبی بات ہو گئی ان لوگوں کے ساتھ میری۔“ وہ سب فون واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”تم کیا سوچ رہی ہو.....؟“ شیردل کو اچانک خیال آیا جیسے وہ کسی سوچ میں گم تھی۔

”شہر بانو اور مثال پر رشک آ رہا تھا مجھے۔“ عکس نے اپنی گفتگو کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک لمحوں کے لیے شیردل حیران ہوا۔ عکس سے ایسا جملہ آنا بے حد غیر متوقع تھا۔

”اچھا؟ اور کس لیے؟“ وہ پہلے استعجابی انداز میں ذرا سا ہنسا پھر اس نے کہا۔

”تم بہت اچھے شوہر اور باپ ہو شیردل۔“ عکس نے مسکراتے ہوئے اسے compliment دیا۔ شیردل ہنس

پڑا تھا۔ اسے واقعی سمجھ نہیں آیا تھا کہ اس تعریف کے جواب میں وہ کیا کہے۔

”جانتی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”ہاں تم سے زیادہ تو کوئی نہیں جانتا ہوگا۔ تمہارا ہی تو انتخاب تھی وہ۔“ شیردل نے مسکرا کر جیسے اسے کچھ یاد دلایا تھا۔

عکس مسکرا دی۔

”میں نے کب کہا؟ ہم کیا بات کر رہے تھے؟“ شیردل نے اس کی بات پر تبصرہ کیا اور پھر موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے کہ عکس کچھ کہتی آفس کا دروازہ کھول کر ایک دراز قد آدمی اندر داخل ہوا تھا۔ شیردل اور عکس دونوں بے اختیار چوکنے لگے۔ شیردل نے ماتھے پر کچھ مل لیے اس آدمی کو دیکھا۔ اس کا اس طرح بغیر اطلاع کیے اندر آنا اسے بے حد کھلا تھا۔ اس آدمی نے اندر آتے ہی بے حد خوش دلی سے سلام کرنے کے بعد شیردل کو بغور دیکھا۔

”اوہ تم..... مجھے بتایا ہی نہیں کہ تم آرہے ہو؟“ شیردل نے عکس کو پہلے حیران ہوتے اور پھر خیر مقدمی مسکراہٹ کے ساتھ اس آدمی سے کہتے سنا تھا۔

”بس ایک دم سے پروگرام بتالیا تم سے ملنے کا۔“ اس آدمی نے مسکراتے ہوئے عکس سے کہا۔

”شیردل یہ جو ادب اور جواد یہ میرے بیچ میٹ.....“ عکس اب جواد کا تعارف کروانے کے بعد جواد سے شیردل کا تعارف کروا رہی تھی۔ شیردل جواد کا نام سنتے ہی ایک دم اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ عکس کے تعارف کروانے سے بھی پہلے اس نے بے حد گرم جوشی کے ساتھ جواد سے ہاتھ ملایا تھا جس نے خود بھی اسی گرم جوشی کے ساتھ اس سے علیک سلایک کرتے ہوئے کہا۔

”آپ جہاں پوسٹڈ ہیں وہاں تو اکثر کام پڑتا رہتا ہے ہم لوگوں کو..... میرا خیال ہے آپ سے تو ملاقات رہے گی اب میری۔“ جواد نے ڈویر ٹل ہیڈ کوارٹر میں اس کی پوسٹنگ کا سنتے ہی بڑی گرم جوش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”اپنی نام۔“ شیردل نے بھی جواباً اسی گرم جوشی کے ساتھ اس سے کہا۔ دوبارہ اپنی نشست سنبھالنے کے بعد شیردل نے ایک بار پھر جواد کا بغور جائزہ لیا تھا۔ اس کا پہلا امپریشن جو اس پر پڑا تھا دوسرا بھی وہی رہا تھا..... وہ جواد ملہی کو پسند نہیں کر سکا تھا۔ چند منٹ وہ مزید وہاں بیٹھا رہا تھا اور ان چند منٹوں میں بھی اس نے عکس اور جواد کے درمیان تناؤ کی ایک عجیب سی کیفیت محسوس کی تھی۔ چائے کا ایک اور کپ جواد اور عکس کے ساتھ مختصر ترین وقت میں پینے کے بعد شیردل اٹھ کر وہاں سے نکل آیا تھا۔ واپسی کا پورا راستہ وہ صرف جواد اور عکس کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا۔ عکس کے ساتھ جواد کی بے تکلفی اسے بہت ہی عجیب انداز میں چبھی تھی اور یہ نہیں تھا کہ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ عکس کے ساتھ کسی کی بھی بے تکلفی اسے ایسے ہی چبھتی تھی اور یہ تب بھی تھا جب وہ اکیڈمی میں غنی حمید کے بہت قریب تھی یا کم از کم شیردل کو لگتی تھی۔ عکس اکیڈمی میں جس دن بھی جس بھی مرد کے ساتھ شیردل کو کتنی نظر آ جاتی شیردل کو کم از کم ایک دن کے لیے اس مرد سے نفرت ہو جاتی تھی اور وہ وجوہات سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ خود اس کو بھی ناپسند کرتا تھا لیکن وہ ان لوگوں کو بھی قبول کرنے پر تیار نہیں تھا جو اس کے آس پاس نظر آتے تھے اور ان لوگوں کی فہرست میں سب سے اوپر غنی حمید کا نام تھا۔

سرکاری گاڑی کی عقی نشست پر بیٹھے جی ٹی روڈ پر شام کے دھندلکے میں کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی عکس کے بارے میں سوچ رہا تھا..... اور جواد کے بارے میں..... جو اس وقت عکس کے پاس تھا..... اکیلا..... اس کی زندگی میں وہ جگہ لینے والا تھا جو شیردل چاہنے کے باوجود نہیں لے سکا تھا۔ اسے جواد ملہی سے حسد نہ ہوتا تو کیسے نہ ہوتا..... اسے بھی عکس کی زندگی میں آنے والے کسی مرد پر رشک نہیں آیا تھا۔ اسے صرف حسد ہوتا تھا۔

☆☆☆

”مجھے تو حسد ہوتا اگر میں وہاں انوائٹڈ ہوتی اور میں تمہارے بجائے کسی اور کو best probationer کا

ایوارڈ لے کر جاتا دیکھتی..... ہماری فیملی کے لیے اس سے زیادہ embarrassing بات کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔“ شیردل کی مہی نے اس کی پاسنگ آؤٹ کی تقریب کی رات اس کے گھر واپس آنے پر اس سے کہا تھا۔ CTP کے اختتام پر ہونے والی اس پاسنگ آؤٹ پر کچھ وجوہات کی وجہ سے پیرٹس انوائٹڈ نہیں تھے۔ اور شیردل فیملی کے لیے یہ بھی جیسے ایک face saving تھی۔ اپنے لاؤنج میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے شیردل ماں کی باتیں سنتا ہوا کن انھیوں سے اپنے باپ کو دیکھتا رہا جو بے تاثر چہرے کے ساتھ چائے کے سب لیتے رہے تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کی طرح شیردل کی اس ”ناقص“ کارکردگی پر کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

”STP ابھی باقی ہے مہی۔“ شیردل نے جیسے اپنے ماں باپ کو assurance دینے کی کوشش کی۔

”وہاں عکس مراد علی نہیں ہوگی کیا؟“ شیردل کے باپ نے فیملی بار بڑے محل اور رسائیت سے چائے کا کپ رکھتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔ شیردل بے اختیار کچھ کھسیانا ہوا تھا۔ یہ اس کے باپ کے جوتے مارنے کا پرانا انداز تھا۔ وہ جانتا تھا وہ سوال نہیں سمجھتی تھی۔

”ویسے کیا بیک گراؤنڈ ہے اس کا؟..... کس فیملی کی ہے یہ لڑکی؟“ شیردل کی ماں کو یک دم عکس مراد علی میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ شیردل نے ڈیٹیلز شیرکیں جو ہر کام کی طرح اسے بھی عکس کے بارے میں معلوم تھیں۔

”اوہ۔“ اس کی مہی کو جیسے کچھ مایوسی ہوئی۔ ان کا خیال تھا وہ شاید کسی بیورو کریٹ کی اولاد تھی۔ پشت در پشت بیورو کریسی کا حصہ رہنے والے کسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور انہیں اپنے اس اندازے کے غلط ہونے پر جیسے کچھ مایوسی ہوئی۔ کسی کاروباری گھرانے کو تو شیردل کی فیملی بہت بچلا درجہ ہی دے سکتی تھی۔

”میں سوچ رہی تھی ہماری جان پہچان کی کسی فیملی سے تعلق ہے تو کچھ اور بھی پلان کیا جاسکتا ہے۔“ شیردل کی مہی نے مسکراتے ہوئے پہلے بیٹے اور پھر شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ملازم اب ان کی چائے کے کپ میں کچھ اور چائے ڈال رہا تھا۔

”مثلاً کیا؟“ شیردل نے کچھ حیران ہو کر ماں سے پوچھا۔

”تمہاری شادی وغیرہ کا کوئی سلسلہ شرع کیا جاسکتا تھا..... لڑکی دیکھنے میں کیسی ہے؟“ شیردل کو ماں کی بات پر یقین نہیں آیا۔

”مہی آپ مذاق کر رہی ہیں۔“ وہ ہنس پڑا۔ اس کی ماں کا سنسن آف ہیو مر بہت اچھا تھا اور شیردل ہمیشہ اس سے محفوظ ہوتا تھا..... اب بھی ہوا تھا۔

”ہاں، ہو سکتا تھا۔“ اس بار شیردل نے اپنے باپ کو بے حد سنجیدگی سے اپنی بیوی کی ہاں میں ہاں ملائے دیکھا۔ شیردل کی ہنسی کو بے اختیار بریک لگا۔

”You can't be serious“ (آپ یقیناً سنجیدہ نہیں ہیں۔) اس نے بے یقینی سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”اتنی بری ہے وہ کیا؟“ اس کی ماں نے سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

”وہ اچھی کہاں سے ہے مہی.....؟ سی ایس ایس ایس میں ٹاپ کر لینے والا best Probationer ایوارڈ لے لینے کا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی بھی لڑکی سے شادی کرنے چل پڑوں۔“ شیردل کو ماں کی بات اب بری لگی جب اسے یہ اندازہ ہوا کہ وہ مذاق نہیں تھا۔

”ایسے ہی سوچا ہے ہم کون سا تمہاری شادی واقعی اس کے ساتھ طے کرنے جا رہے ہیں۔“ اس کی ماں نے اسے خفا ہونے دیکھ کر مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”مہی آپ بھی بعض دفعہ حد کرتی ہیں ویسے..... میری شادی کروا رہی ہیں اس سے..... کہاں میں..... کہاں عکس مراد علی..... کوئی فیچ ہی نہیں ہے ہم دونوں کا۔“ شیردل نے بے حد سنجیدگی سے اپنی چائے ختم کرتے ہوئے کپ رکھا۔



”وہ اتنی بری ہے؟“ اس کی ماں کو ایک عجیب سی کرپڈ ہوئی عکس کے بارے میں۔

”she is just average“ (وہ بس ٹھیک ہی ہے) شیردل نے بے حد خفگی سے کہا۔  
 اور اس نے اضافہ کیا۔ ”I mean below average عام معیار سے بھی کم ہے۔“ شیردل کو جیسے اپنی ہی وضاحت سے تسلی نہیں ہوئی  
 تصور میں آئی تھی اور اسے لگا اس کی وضاحت کچھ مناسب نہیں تھی۔  
 ”very ordinary“ دوسرے اضافے پر ایک لمحے کے لیے وہ سوچ میں پڑا۔ عکس اس کے

”I mean she is not that bad but she is not my kind of a girl“  
 (میرا مطلب ہے کہ وہ اتنی بری لڑکی نہیں ہے لیکن وہ میرے مزاج کی لڑکی نہیں ہے۔) چند لمحوں میں ہی اس نے گڑبڑا  
 کر اپنے ہی جملے کی کچھ سمجھ کی۔

”ویسے تم کو کیسی لڑکیاں پسند ہیں؟“ شیردل کی ماں کو یک دم جیسے اس موضوع پر اس سے تفصیل سے بات  
 کرنے میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔

”عکس مراد علی کے علاوہ مجھے ہر لڑکی پسند ہے۔“ اس بار شیردل نے کندھے اچکا کر جیسے مذاق میں ایک بات کہی۔  
 ”عکس کی تو ہم بات ہی نہیں کر رہے۔۔۔۔۔ تم اس کا ریفرنس کیوں دے رہے ہو؟“ اس کی ماں نے کہا۔

”ایسے ہی کہہ دیا میں نے۔۔۔۔۔ اور پلیز آپ پہ لکھی پتویشن create کرنے کی کوشش نہ کریں فی الحال۔۔۔۔۔ مجھے  
 ابھی STP پوری کرنی ہے۔۔۔۔۔ پھر اپنی پہلی پوسٹنگ کے دوران تو کم از کم اس طرح کے کسی سلسلے میں دلچسپی نہیں ہے۔“  
 شیردل ماں کے ارادے بھانپتے ہوئے بولا۔  
 ”میں صرف انجینئرنگ کا سوچ رہی تھی۔“

”آپ اس کا بھی مت سوچیں best Probationer کا ایوارڈ نہ لینے کی اتنی بڑی سزا تو نہیں ملتی چاہیے  
 مجھے۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ماں باب مسکرا دیے تھے۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بھی شیردل کو اپنے  
 باپ کی خاموشی بری طرح چھبی تھی۔ انہوں نے گفتگو میں بہت کم حصہ لیا تھا اور وہ مسلسل سنجیدہ رہے تھے جو ایک  
 جملہ انہوں نے بولا تھا وہ شیردل کو کائنات کی طرح چھہ گیا تھا۔ STP کے best Probationer کا ایوارڈ  
 اب اس کے لیے عزت کا مسئلہ بن گیا تھا۔

☆☆☆

”وہ زمین کا ٹکڑا میرے لیے عزت کا مسئلہ نہیں ہے چڑیا۔۔۔۔۔ وہ 20 سال کی حق حلال کی کمائی ہے میری۔۔۔۔۔ خون  
 پینے سے کمائی جانے والی ایک ایک پائی اکٹھی کر کے خریدی گئی تھی وہ زمین۔۔۔۔۔ میں اسے اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتا۔“  
 چڑیا نے عجیب تکلیف کے احساس کے ساتھ اپنے نانا کو دیکھا۔

وہ ابھی کچھ دیر پہلے حوالات سے نکلا تھا اور اب وہ اور چڑیا بس پر بیٹھے واپس شہر جا رہے تھے۔ خیردین کے کندھے  
 ایک بار پھر عجیب سی شکست خوردگی کے عالم میں جھکے ہوئے تھے۔ چڑیا نے ہمدردی سے اپنے نانا کو دیکھا۔ وہ خیردین کے  
 لیے آج بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔۔۔۔۔ لیکن اب کم از کم سمجھا سکتی تھی اور وہ اس وقت وہی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔  
 ”ہمیں اب اس زمین کی ضرورت نہیں ہے نانا۔۔۔۔۔ اس کو بیچ کر بھی ہمیں اتنے پیسے نہیں ملیں گے جن سے ہماری

زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی آجائے۔ ہمارے پاس گھر ہے۔۔۔۔۔ آپ نے اپنی دکان بھی خرید لی ہے۔۔۔۔۔ میڈیکل کالج  
 جاری ہوں۔۔۔۔۔ ہمیں اس زمین کے لیے اب ذلیل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ چڑیا نے خیردین کا ہاتھ اپنے دونوں  
 ہاتھوں میں لیتے ہوئے بس کے شور میں قدرے بلند آواز میں کہا۔

”ہر چیز کو پیسے سے تھوڑی ناپا جاتا ہے۔ بعض چیزوں کی قدر پیسے کی وجہ سے نہیں ہوتی چڑیا۔۔۔۔۔ وہ میری حق حلال کی  
 کمائی ہے۔۔۔۔۔ میں کسی کا حصہ چھیننے تو نہیں گیا تھا۔۔۔۔۔ اپنی چیز لینے گیا تھا۔۔۔۔۔ اتنا بھی حق نہیں مجھے کہ اپنی چیز لینے کے لیے  
 میں قانون کا سہارا مانگ سکوں۔“ خیردین بات کرتے کرتے رو پڑا، چڑیا نے بے حد تکلیف سے اپنے نانا کو دیکھا۔ اسے

32 ماحولیات کا کتبہ۔۔۔۔۔ اپریل 2012ء

نوسال پہلے کی تکلیف اور بے بسی یاد آئی تھی۔۔۔۔۔ اور پچھلے دونوں سے بار بار یاد آ رہی تھی۔  
 ”مست رو میں نانا۔“ اس نے گلوگیر آواز میں خیردین سے کہا۔ خیردین نے یک دم خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ  
 چڑیا کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا۔ بے بسی کا کوئی اظہار نہیں چاہتا تھا۔

نوسال کے بعد خیردین چڑیا کے ساتھ بڑے فخر سے گاؤں آیا تھا۔ اب اس کی جیب میں پیسے بھی تھے اور اس کے سر  
 پر نوسال پہلے کی طرح ایک جوان بنی اور ایک چھوٹی بچی کا بوجھ نہیں تھا۔ وہ گاؤں آ کر اپنے اسی دوست کے پاس ٹھہرا تھا  
 جس نے کئی سال پہلے گاؤں سے شہر جاتے ہوئے اس کی مالی مدد کی تھی۔ خیردین نے اپنے رشتے داروں سے ملنے کی  
 کوشش نہیں کی تھی نہ ہی اس کے رشتے داروں نے اسے متہ لگایا تھا۔ گاؤں میں اب خیردین کی عزت تھی کیونکہ خیردین  
 وہاں اسی طرح بس چند دن رہنے آیا تھا جس طرح سرکاری نوکری کے دوران آیا کرتا تھا۔ اس کے میل جول اور گاؤں  
 والے اس کی جتنی عزت کر سکتے تھے انہوں نے کی۔ وہ اس گاؤں کی پہلی ڈاکٹر لڑکی کی جو کافی لگا کر آیا تھا وہ کسی کو زیادہ نظر  
 نہیں آئی۔ شاید اس لیے کیونکہ چڑیا ابھی میڈیکل کالج میں گئی تھی ڈاکٹر بنی نہیں تھی اور اس لیے بھی کیونکہ وہ ایک لڑکی  
 تھی۔۔۔۔۔ وہ بھی ایسی لڑکی جس کا دادا دار بچپن گاؤں کے ہر بڑے بوڑھے کو ازبر تھا۔

خیردین کو شہر میں ساری زندگی گزارنے کے بعد اگر تعلیم پر کوئی فخر یا ناز تھا تو گاؤں والوں نے اسے چکنا چور کرنے  
 میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لوگوں کو اس سے یہ جاننے میں تو دلچسپی تھی کہ اس نے حال ہی میں جو بڑھی سے دال کی  
 دکان بنالی تھی وہ کیسی چل رہی تھی وہ روز کے کتنے کما اور کتنے بچا لیتا تھا۔۔۔۔۔ اور کیا گاؤں میں سے کسی اور کے شہر جا کر دال  
 کی کوئی ریڑھی لگانے میں ویسا اسکو پ تھا جیسا خیردین کے لیے بنا تھا۔۔۔۔۔ لیکن کسی نے خیردین کی ڈاکٹری پڑھنے والی  
 نواسی کے بارے میں زیادہ نہیں پوچھا تھا کیونکہ وہاں کسی کو اپنی بیٹیوں یا اگلی نسل کی لڑکیوں کو ڈاکٹر تو کیا ابتدائی تعلیم سے  
 زیادہ پڑھانے کی بھی خواہش نہیں تھی۔ وہ عورت کے اسی رول اور حیثیت سے خوش تھے جو صدیوں سے ان کے علاقے  
 میں عورت کی تھی۔ چڑیا ڈاکٹر بن کے وہاں آئی ہوتی تو شاید پھر بھی وہاں اس کی قدر ہوتی۔ مفت دوا اور علاج کی غرض  
 بہت سے لوگوں کو غرض مند بنا کر ان کا احسان مند کر دیتی لیکن فی الحال خیردین کا وہ فخر گاؤں والوں کے نزدیک کسی کام کا  
 نہیں تھا۔۔۔۔۔ ان کے نزدیک شہر میں خیردین کے کام میں ہونے والی ترقی زیادہ بڑی چیز تھی۔ یہاں تک کہ اپنی بیٹی کو کویت  
 اچھی جگہ دوبارہ بسا دینا بھی قابل تحسین تھا۔۔۔۔۔ لیکن چڑیا کی وہ ایک ڈگری نہیں جس کے لیے خیردین نے بچپن سے خواب  
 دیکھے تھے۔ جس کے لیے خیردین نے راتیں محنت کرتے کافی تھیں۔

خیردین نے گاؤں آتے ہی جو حرکت کی تھی اس نے یک دم اس کی فیملی کی سالوں پرانی کمزورت اور دشمنی کو جیسے جگا  
 دیا تھا۔ خیردین نے گاؤں آتے ہی چڑیا کے منع کرنے کے باوجود اپنے خاندان پر جھلساڑی کے ذریعے اپنی زمین ہتھیا  
 لینے کی ایف آئی آر کٹوا دی تھی اور تھانے دار نے اس کے حلیے اور رول چال سے متاثر ہوتے ہوئے کچھ لیے دیے بغیر ہی  
 ایف آئی آر نہ صرف رجسٹر کر لی تھی بلکہ اس پر فوراً کارروائی کرنے کی کوشش بھی کی تھی اور یہ کوشش جیسے ایک پینڈورا باکس  
 کھولنے کے برابر تھا۔

☆☆☆

”فی الحال تو شادی کی بات کرنا اور سوچنا بھی پینڈورا باکس کھولنے کے برابر ہے۔“ ایک نے فاطمہ کے اس  
 مطالبے پر کہ وہ اپنی امی اور فیملی کو اس کے گھر رشتہ مانگنے کے لیے لائے جواب دیتے ہوئے کہا۔ فاطمہ اس کی بات پر کچھ  
 دیر کے لیے جیسے کچھ بول نہیں سکی۔

”پینڈورا باکس کس اعتبار سے کہہ رہے ہو؟“ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ ایک چند لمحے بڑی سنجیدگی سے اس کا  
 چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔  
 ”میری پچھلے سال اپنی کزن سے انجمنٹ ہوئی ہے۔“ فاطمہ کو لگا اسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی تھی۔  
 ”تم نے کیا کہا؟ میں نے سنا نہیں۔“

ماحولیات کا کتبہ۔۔۔۔۔ اپریل 2012ء

اوندھالٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے کو..... اور کسی کے کندھے پر سر رکھ کر ایک سے ہونے والی تمام شکایتیں دہرائے تو۔ وہ ایک امید جو ایک نے اسے تھامنے کی کوشش کی تھی اس کا دل اسے کبھی تھامنے پر تیار نہیں ہو رہا تھا۔ کہیں نہ کہیں اس کی چٹختی حس اسے وارن کر رہی تھی کہ ایک اس سے جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ نہ تو اپنی چٹختی کو اس کے لیے توڑے گا نہ ہی اس سے شادی کرے گا اور یہ وارننگ اس کی اذیت کو بڑھا رہی تھی۔ چار میں کھایا جانے والا پہلا دھوکا ایسا ہی ہوتا ہے۔ دھوکے کے علاوہ سب کچھ لگتا ہے..... دل یہ نہیں مانتا کہ ہم اتنے معمولی ہو گئے کہ کسی کا دل بھی میں نہیں کر سکے..... اور دماغ یہ بات تسلیم نہیں کرتا کہ کسی کی دنیا ہمارے علاوہ بھی کسی دوسرے وجود سے مکمل ہو سکتی ہے حقیقت بہت دیر تک حقیقت نہیں آزمائش، پریشانی، غلط فہمی، بددعا لگتی ہے..... بس حقیقت بن کر نظر نہیں آتی۔ قاطعہ کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا وہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو ایک کے اس رویے کی کوئی توجیہ دے کر بہلانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ اس میں بری طرح ناکام ہو رہی تھی۔ چار سال اس نے جو خواب دیکھتے ہوئے گزارے تھے وہ منٹوں میں ختم ہو گئے تھے۔ ایک بہت کم عمر، نا تجربہ کار، نو جوان لڑکی کے طور پر دیکھے جانے والے خواب..... ایک مین پسند جیون سا بھی..... ایک اچھا سا گھر اور ایک پرسکون زندگی جس میں وہ سب کچھ ہوتا جو قاطعہ کی اپنی ساری زندگی میں نہیں رہا تھا۔

زندگی کا ہر امتحان انسان ذہانت اور محنت سے پاس نہیں کر سکتا بعض امتحانوں کے لیے قسمت کے علاوہ اور کوئی چیز درکار نہیں ہوتی..... یہ فاطمہ کی زندگی کا ایک اور تکلیف دہ سبق اور نتیجہ تھا جو اس رات اس نے بیٹھ کر اخذ کیا تھا..... وہ خود کو ذہین سمجھدار، مخلص، قابل ماننی تھی لیکن اس نے کبھی خود کو خوش قسمت نہیں مانا تھا، یہ ایک چیز تھی جس پر اس کا یقین خیر دین کی تربیت کے باوجود بھی متزلزل ہی رہا تھا..... اور اس کی زندگی میں وقتاً فوقتاً ایسا کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا تھا جو اس کے اس یقین کو بچتہ نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ اچھی قسمت لے کر پیدا ہوئی تھی۔

زندگی میں ہونے والے اس پہلے ہارٹ بریک کا اگلا دن ایک مشکل دن تھا..... ہر اعتبار سے ایک مشکل دن۔  
اسے ایک کا سامنا کرنا تھا..... اسے اسٹڈیز اور کلاسز میں اپنا فو کس رکھنا تھا..... اور اسے خیر دین کو فون پر اپنی اور ایک کی  
گفتگو سے آگاہ کرنا تھا..... اور..... سب کے ساتھ اسے ایک معمول کا دن نارمل انداز میں گزارنا تھا۔  
”ہم اب دوبارہ نہیں ملیں گے۔“ قاطعہ نے اگلے دن ایک سے سامنا ہوتے ہی کہا تھا۔

”کیا مطلب؟“ ایک ہکا بکارہ گیا تھا۔  
 ”میں نے تم سے کہا ہے میں وہ منگنی ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ وہ بہت بے چلین تھا۔  
 ”نہیں ایک میں اس سب کا حصہ نہیں بنوں گی۔ میں تم سے ملتی رہوں گی تو میری تکلیف بڑھتی رہے گی کیونکہ میں  
 نے تمہیں ایک دوست سمجھی نہیں سمجھا اور میں اس احساس جرم کے ساتھ بھی نہیں رہنا چاہتی کہ میں کسی اور لڑکی کے ساتھ  
 تمہاری منگنی تڑوانے کی کوشش میں تمہاری حصے دار بنی رہی۔“ فاطمہ نے بہت سنجیدگی سے اسے کہا۔  
 ”میں اس سے محبت کرتا ہی نہیں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم ہی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ ایک نے اس کی  
 بات کاٹ کر کہا۔

”اگر ایسا ہے تو تم اس مشکلی کو تروا کر اپنی فیملی کو لے کر میرے گھر آ جانا میں ضرور تم سے شادی کر لوں گی۔“ فاطمہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”میں یہی تو کر رہا ہوں..... تھوڑا وقت دے دو مجھے۔“ فاطمہ نے تحمل سے اس کی بات کاٹی۔

”تم جتنا وقت لینا چاہتے ہو لو..... بس میں اس عرصے کے دوران تم سے ملنا نہیں چاہتی۔“

”لیکن کیوں؟ ہم دوستوں کی طرح مل سکتے ہیں۔ اکٹھے اسٹڈی کر سکتے ہیں..... میں تم پر اتنا ڈیپنڈنٹ ہوں کہ میں تو خود اپنے نوٹس تک نہیں بنا سکتا۔“ ایک بہت پریشان تھا۔ فاطمہ جانتی تھی وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ چار سال کے دوران اگر فاطمہ اس کے ساتھ نہ ہوتی تو ایک کلاس کی پہلی دس پوزیشنز میں کبھی نہیں آ سکتا تھا۔ وہ اس کے کہے بغیر اس کے ہر کام کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے کیا کرتی تھی۔ اس کے فولڈر میں ہر کام کے دو شیڈول بنتے تھے ایک اس کا اپنا اور دوسرا ایک

”تم نے مجھ سے ذکر نہیں کیا؟“ اس نے بالآخر ایک سے شکایت کی۔  
 ”تم سے کیا ذکر کرتا یار..... تم خود خواہ میں اپ سیٹ ہو تیں اور اگر تم اپ سیٹ ہو تیں تو میں بھی کہاں خوش رہ سکتا تھا۔“ ایک نے بڑی سنجیدگی سے اس سے کہا۔

”لیکن ایک یہ بہت بڑی بات تھی۔ ایک سال ہو گیا تمہاری منگنی کو۔ اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔“

”میں نے کہا نایار، میں اس رشتے سے خوش ہوں ہی نہیں اور نہ ہی مجھے وہاں شادی کرنی ہے..... پھر منگنی کا ہونا نہ ہونا اور اس کے بارے میں بتانا یا نہ بتانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔“ ایک نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

”میرے لیے رکھتا ہے ایک۔ مجھے بے خبری میں رکھنا اور کہو تر بے رہنا کبھی اچھا نہیں لگتا۔“ فاطمہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

”میں منگنی ختم کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔“ ایک نے کچھ گزردہ آواز میں اسے وضاحت دی۔  
 ”پھر بھی بتانا چاہیے تھا۔“ فاطمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔  
 ”مجھے خدشہ تھا کہ تم خفا ہو کر مجھ سے الگ ہو جاؤ گی۔“ اس کی وضاحت نے کچھ دیر کے لیے فاطمہ کو جیسے لا جواب کر دیا تھا۔ کچھ کہنے کے بجائے اس نے اپنی کتابیں سمیٹنا شروع کر دیں۔  
 ”تم اس طرح مجھ سے خفا ہو کر جاؤ گی تو میں بہت اپ سیٹ رہوں گا۔“ ایک نے اس کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں بخانا نہیں ہوں..... ہرٹ ہوئی ہوں اور میرا خیال ہے مجھے اس کا حق ہے.....“ وہ کہتے ہوئے کرسی دھکیل کر ابھری کی میز پر پڑی اپنی کتابیں اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ایک بھی کھڑا ہو گیا۔

ہاں سے نکل آئی۔ دل ٹوٹنے جیسے جملے اس نے پہلے کئی بار سنے تھے اور وہ سن کر ہستی رہتی تھی۔ میڈیکل کاسٹوڈنٹ نے فاطمہ کو پہلی بار اس تکلیف دہ احساس سے گزرنا پڑا۔ کالج اور ہاسٹل میں وہ لڑکیوں کی منگنیاں ہوتے اور ٹوٹتے رہتی تھیں۔ افیئر چلتے اور پھر اسی طرح بریک اپ ہو جاتے اور زندگی چلتی رہی لیکن کچھ نہیں بدلتا تھا۔ لڑکیاں کچھ دیر تکی دھونی تھیں پھر ٹھیک ہو جاتی تھیں..... بہل جاتی تھیں..... ان کی گفتگو میں آنے والے مرد کا نام کبھی بہت جلدی اور کبھی بہت دیر سے لیکن تبدیل ہو جاتا تھا..... اور ایسی چیزوں کو بہت بار دیکھتے رہنے کے بعد بھی وہ اپنے اندر ایسا حوصلہ رکھتی تھیں کہ اپنی زندگی میں سے مائنس کر کے دیکھ سکتی یا اپنی زندگی میں ایک کے بجائے کسی دوسرے مرد کا تصور بنا لیتی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کے ساتھ کی خواہش کی تھی۔ کسی کے ساتھ کی خواہش کے لیے اپنے گرد کھڑی لڑکیوں کو دیکھتی تھیں اور اب اس کے یوں قدم پیچھے ہٹا لینے پر کچھ دیر کے لیے فاطمہ کو ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بھیڑی بچوں کی لڑکی کی طرح تھی۔

ہاسٹل آنے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک سن و ماغ کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی رہی تھی۔ اس کا ذہن ابھی تک یہ نئے کونجیاں نہیں ہو رہا تھا کہ یہ سب اس کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو عام لڑکیوں کی طرح کمزور سمجھنا نہیں چاہتی تھی کہ اس کے کسی کمرے میں بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر روتی اور لڑکیوں کا ایک مجمع اکٹھا کر کے ان کے ساتھ اپنے ساتھ ہونے لے دھوکے کو شیر کرتی لیکن عجیب بات تھی اب اس تکلیف سے گزرتے ہوئے اس کا دل بھی یہی چاہ رہا تھا..... بستر پر



کے لیے اور ایک کی آنکھوں کے سامنے فاطمہ کے ساتھ ہونے والے بریک اپ کے نتیجے میں اندھیرا چھانا نظر آ رہا تھا تو وہ اپنی فیلنگوں میں بالکل ٹھیک تھا۔

”تم بہت ذہین اور لائق اسٹوڈنٹ ہو۔ میرے بغیر بھی سب کچھ کر سکتے ہو ایک۔۔۔۔۔ پھر تمہاری مٹی بھی ہیں تمہاری مدد کے لیے۔“ فاطمہ نے کہہ کر وہاں سے جانے کی کوشش کی۔ ایک بہت دور تک اسے منانے کی کوشش کرتا ہوا اس کے ساتھ چلتا رہا لیکن فاطمہ نے اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا تھا اس دن واپس ہاسٹل آکر وہ پہلی رات سے بھی زیادہ اپ سیٹ اور اداس تھی۔ پچھلی رات ایک کا وہ رویہ تھا جس نے اسے پریشان کیا تھا لیکن اسے امید بھی دلائی تھی اور آج یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا جو اسے پریشان کیے ہوئے تھا اور ایک سے تمام تعلقات ختم کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ آسان نہیں تھا وہ بری طرح کمزور پڑ رہی تھی۔۔۔۔۔ قطع تعلق کر لینا اس قدر آسان نہیں تھا جتنا اس نے سمجھ لیا تھا۔ اس رات اس نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ایک عام لڑکی کی طرح وہ ساری رات بیٹھ کر روتی رہی تھی اور اگلے دن اس نے کالج سے بغیر کسی وجہ کے پہلی چھٹی کی۔

”کیا ہوا چڑیا؟“ خیر دین نے ہاسٹل سے کی جانے والی کال پر اس کی آواز سنتے ہی بے حد تشویش سے کہا۔ وہ جھوٹ بولنا چاہتی تھی کہنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ نانا کچھ نہیں۔۔۔۔۔ لیکن وہ جھوٹ نہیں بول سکی۔ وہ رو پڑی تھی اور پھر روتی ہی گئی تھی۔ خیر دین بہت دیر چپ چاپ اس کی سسکیاں اور ہچکیاں سنتا رہا پھر اس نے کہا۔

”ایک کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا ہے؟“

”نانا اس نے پچھلے سال منگنی کر لی اور مجھے اس نے بتایا تک نہیں۔“ فاطمہ نے سسکیوں کے ساتھ خیر دین کو بتایا۔ بہت دیر خیر دین صدمے سے لگ رہا۔ سارے سوال جواب یک دم جیسے دم توڑ گئے تھے اس کے لیے۔ چڑیا کی تکلیف کو کوئی اس سے زیادہ کیسے سمجھ سکتا تھا۔ چڑیا بہت زیادہ دیر تک اس سے بات نہیں کر سکی۔ کال ختم ہو گئی تھی لیکن اس رات وہ سو نہیں پائی۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے بھی وہ اپنی روم میٹس کے کمرے میں ہونے کے باوجود بھی بستر میں گھس کر منہ چھپا کر روتی رہی تھی۔

اگلی صبح وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کالج جانے کے لیے تیار ہو کر ہاسٹل سے نکلی تھی اور تب اس نے ہاسٹل کے دروازے پر صبح سویرے چادر کی بکلی مارے اوگھتے ہوئے خیر دین کو بیٹھے دیکھا۔ وہ بے اختیار اس کی طرف آئی تھی۔

”نانا آپ اس وقت یہاں۔۔۔۔۔؟“ خیر دین اس کی آواز پر ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر چڑیا کو دیکھ کر وہ جیسے یک دم مطمئن ہوا۔

”بس کل رات تم سے بات کرنے کے بعد مجھے چین نہیں آیا۔ میں رات کو ہی نکل آیا تھا تم سے ملنے کے لیے لیکن اجازت نہیں ملی تم سے ملنے کی۔۔۔۔۔ کیونکہ بہت رات ہو گئی تھی۔“ خیر دین نے اسے اپنے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ فاطمہ کا دل بے اختیار بھر آیا۔ وہ اس عمر میں اس کے لیے سردیوں کی وہ رات ہاسٹل کے اس گیٹ کے پاس کھلے آسمان کے نیچے گزار رہا تھا۔ پتا نہیں زندگی میں اس کو کتنی بار خیر دین کے لیے تکلیف کا باعث بننا تھا۔ فاطمہ کو اپنے آپ پر جیسے شرم آئی تھی۔

وہ اس دن کالج جانے کے بجائے خیر دین کے ساتھ ریس کورس میں چلی گئی تھی۔ وہ سارا دن اس نے ریس کورس کی ایک میچ پر خیر دین کے ساتھ بیٹھے ہوئے گزار دیا۔ انہوں نے بہت ساری باتیں کیں لیکن ان میں سے کسی بات میں ایک کا ذکر نہیں تھا۔

”تمہیں بہت اچھا جیون ساتھی ملے گا چڑیا۔“ جانے سے کچھ دیر پہلے خیر دین نے یک دم بنا کسی تمہید کے اس سے کہا۔ فاطمہ نے چونک کر خیر دین کو دیکھا پھر ایک رنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے خیر دین سے کہا۔

”آپ کو کیسے پتا؟“

”کیونکہ تم بہت اچھی ہو۔“ خیر دین نے اس سے محبت سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”اور تم بہت بہادر ہو، مجھدار ہو۔۔۔۔۔ تم زندگی بنانا جانتی ہو پتا۔“

”نانا زندگی میں ایک چیز قسمت بھی ہوتی ہے۔“ فاطمہ نے بڑی رنجیدگی سے خیر دین کی بات کاٹ دی تھی۔ ”آپ ہی کہتے تھے قسمت بڑی چیز ہوتی ہے۔“ اس نے تم آنکھوں کے ساتھ خیر دین کو کچھ یاد دلانے کی کوشش کی۔ خیر دین ایک لمحے کے لیے بول نہیں سکا پھر اس نے چڑیا سے کہا۔

”اور تم کہتی تھیں نانا جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو میں ایک کھیل بناؤں گی پیس کی طرح کا جس میں کوئین ہی بادشاہ ہوگی۔“ چڑیا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”زندگی اور کھیل میں بہت فرق ہوتا ہے نانا۔۔۔۔۔ کھیل کو ہم کھیلتے ہیں لیکن زندگی ہمیں کھیلتی ہے۔ ہم زندگی کے مہرے ہوتے ہیں زندگی کو مہرہ نہیں بنا سکتے۔“ خیر دین بہت دیر اس کا چہرہ دیکھتے دیکھتے یک دم مسکرا دیا۔

”ایک زمانہ ہوتا تھا چڑیا جب تم میری ہر بات مان لیتی تھیں۔“ خیر دین نے گہری سانس لے کر کہا۔

”میں اب بھی آپ کی ہر بات مان لیتی ہوں۔“ چڑیا نے کہا۔

”ہاں لیکن اب تم قبض و فضا ایسی باتیں کرتی ہو جس کا جواب میرے پاس نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ لیکن ایسی باتیں تو تم تب بھی کرتی تھیں جب بہت چھوٹی ہو کر تھی۔“ خیر دین کو بات کرتے ہوئے جیسے کچھ یاد آیا اور وہ ہنس دیا۔ فاطمہ نہیں ہنس سکی تھی۔ وہ جانتی تھی خیر دین اس کا ذہن اور دھیان بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم نے یہ دھوپ چھاؤں دیکھی ہے؟“ خیر دین نے یک دم چڑیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ چڑیا نے پارک میں ڈھلتی دھوپ کی سرخی کو دیکھا جواب پارک کے ایک کونے میں سمٹ رہی تھی۔

”یاد ہے جب ہم صبح یہاں اس میچ پر آ کر بیٹھے تھے تو یہاں دھوپ بھی پھر آہستہ آہستہ دھوپ یہاں سے وہاں چلی گئی اور یہاں چھاؤں آ گئی۔۔۔۔۔ بھی تم نے سارا دن دھوپ اور چھاؤں کو ایک جگہ جے دیکھا ہے؟“ اس نے نرم آواز میں چڑیا سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”زندگی بھی ایسی ہی ہوتی ہے اس میں بھی دھوپ چھاؤں ایک جگہ نہیں رہتی۔ کبھی برے دن ہوتے ہیں پھر اچھے آ جاتے ہیں پھر اچھے گزر جاتے ہیں اور برے آ جاتے ہیں۔۔۔۔۔ پراچھا برا کوئی وقت کبھی کسی انسان کے لیے مستقل نہیں رہتا۔“ فاطمہ نے بے اختیار گہری سانس لی اور اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے خیر دین سے کہا۔

”باقی سب ٹھیک ہے نانا لیکن میں نے اب بھی کسی سے محبت نہیں کرنی۔۔۔۔۔ یہ جو تکلیف آج سہی ہے تا میں نے۔۔۔۔۔ یہ دوبارہ سہنا نہیں چاہتی میں۔“ فاطمہ نے اٹھتے ہوئے دو ٹوک انداز میں خیر دین سے کہا۔ وہ اب کھانے پینے کی وہ چند بچی چھپی چیزیں سمیٹ رہی تھی جو وہ سارا دن استعمال کرتے رہے تھے۔

”کل میری دکان پر ایک لڑکا آیا وہ مجھے بڑا اچھا لگا۔“ خیر دین نے اچانک اٹھتے ہوئے ایک گہری سانس لے کر فاطمہ سے کہا۔ فاطمہ نے عدم دلچسپی سے اس کی بات سنی۔

”اونچا لمبا گورا چٹا تھا، کسی بڑے اچھے خاندان کا تھا۔۔۔۔۔ سرکاری گاڑی میں آیا تھا اپنے کسی دوست کے ساتھ۔۔۔۔۔ شاید باپ وغیرہ سرکاری افسر ہے۔۔۔۔۔ مجھے پہلی نظر میں ہی اتنا اچھا لگا کہ میرا دل چاہا تمہاری شادی اس کے ساتھ ہو۔“

فاطمہ نے ٹھیک کر خیر دین کو دیکھا۔ خیر دین کے لہجے میں ایک عجیب سی محسوس خواہش تھی۔ اپنی چڑیا کو ہمیشہ کی طرح سب سے اچھی نظر آنے والی چیز دینے کی خواہش۔۔۔۔۔ وہ چڑیا کا نصیب کس قلم سے لکھنا چاہتا تھا چڑیا کو بھی سمجھ نہیں آئی تھی لیکن آج ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ خیر دین نے دکان پر وال کھانے کے لیے آنے والے کسی مرد کو دیکھ کر اسے چڑیا کا نصیب بنے دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ چند لمحے وہ خیر دین کو دیکھتی رہی پھر وہ اپنے نانا کی محسوسیت پر ہنس پڑی تھی۔

”آپ بعض دفعہ عجیب باتیں بھی کرنے لگے ہیں نانا۔“ چڑیا نے اس سے کہا۔

”تمہیں پتا ہے اس کا نام کیا تھا؟“ خیر دین نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے جیسے ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ چڑیا سے کہا۔ چڑیا کو اور ہنسی آئی۔

”نانا آپ اس سے نام بھی پوچھنے بیٹھے گئے؟“ اسے جیسے خیر دین کی جذباتیت پر یقین نہیں آیا تھا۔

37 ماہنامہ نیا کیڑہ اپریل 2012ء

ہاں۔۔۔۔۔ تم سے کہہ رہا ہوں نا وہ مجھے بڑا اچھا لگا تھا۔۔۔۔۔ چھٹ لبا تھا۔۔۔۔۔ بو اتیز والا لگ رہا تھا۔  
مجھے کہہ رہا تھا کہ اسے میری شکل جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ خیر دین مسکراتے ہوئے چڑیا کے ساتھ چلتے ہوئے اسے بتانے لگا۔  
”کیا نام تھا اس کا؟“ چڑیا نے اچانک پوچھا۔

☆☆☆

شیردل نے اسے گھوڑے سے گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ گھوڑا دوڑاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے وہ غیر ارادی طور پر گھوڑے کی باگ کھینچنے کھینچنے رک گیا تھا۔ اس کا گھوڑا چند لمحوں کے لیے ہلکا ہوا پھر اسی طرح دوڑتا ہوا رنگ کے دوسرے سرے پر پہنچ گیا جہاں شیردل نے بالآخر اسے روک لیا تھا۔ چہل قدمی والے انداز میں گھوڑے کو چلاتے ہوئے وہ اسے وہاں لے کر آیا جہاں عکس مراد علی اپنے ساتھی مرد کا منرز، رائیڈنگ انسٹرکٹر اور پیرامیڈیک اسٹاف کے گھر سے میں زمین پر بالکل بے حس و حرکت چپت پٹی ہوئی نظر آرہی تھی اور اس کے بالکل قریب غنی حمید ایک گھٹنا زمین پر ٹکائے بیٹھا نظر آرہا تھا۔ عکس کے گھوڑے سے گرتے ہی وہ کامنرز میں سے پہلا آدمی تھا جو اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کے پاس پہنچا تھا اور اس کے عکس کے پاس پہنچنے پر شیردل کا اضطراب عجیب سی شکل میں بدلتا تھا۔ رنگ کے باہر کھڑی ایوبولنس سے بھاگ کر عکس کے پاس پہنچنے والے پیرامیڈیکل اسٹاف کے ساتھ ہی دوسرے مرد کامنرز اور رائیڈنگ انسٹرکٹر بھی اپنے گھوڑوں سے اتر کر اب عکس کے گرد دائرہ بنائے کھڑے تھے صرف شیردل تھا جو گھوڑے پر کچھ فاصلے پر بیٹھا اس صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔

وہ لوگ صبح کے وقت ہارس رائیڈنگ کے لیے نکلے ہوئے تھے جب یہ حادثہ ہوا تھا۔ وہ DMG گروپ کی STP کے آغاز کا چوتھا دن تھا اور صبح سویرے کلاسز کے آغاز سے پہلے رائیڈنگ کا یہ سیشن سردیوں کے اس کبر آلود موسم میں ان سب کے لیے عذابِ جان تھا۔ شیردل اور غنی حمید سمیت DMG کے چند دوسرے آفیسرز اپنی بن اور اس جیسے دوسرے اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والوں کے لیے گھڑ سواری جیسے باتیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ رنگ میں اپنا اپنا گھوڑا لیتے ہی وہ تین چار لوگ گھوڑے کو بڑے اطمینان سے ادھر ادھر ٹھیلانے میں مصروف ہو گئے تھے اور باقی کا سارا گروپ ہر روز کی طرح آج بھی گھوڑے پر درست طریقے سے چڑھنے اور بیٹھنے کی ڈرل کرنے میں مصروف تھا۔ چند منٹوں پہلے گھوڑوں پر بیٹھے بیٹھے روز کی PT ڈرل کرنے کے بعد وہ سب اپنے گھوڑوں کو trotting (آہستہ آہستہ دوڑانا) کے لیے انسٹرکٹر کے ساتھ ایک دائرے میں دوڑا رہے تھے۔ عکس اور غنی کے گھوڑے شیردل کے گھوڑے سے چار یا پانچ گز کے فاصلے پر تھے۔ ان کے درمیان عباس شیرازی اور عرفان محمود کے گھوڑے تھے۔ اس گروپ میں عکس واحد لڑکی تھی اور رائیڈنگ انسٹرکٹر ہر روز اس کے گھوڑے کو سب سے پہلے ایڑ دینے کے لیے کہتا تھا۔ دائرے میں گھوڑے دوڑاتے دوڑاتے ایک مرحلے پر تمام گھوڑے یوں ایک مکمل دائرہ بنا لیتے تھے کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا تھا کہ دائرے کا سر اکون تھا اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ عکس trot کرتی ہوئی پہلے نکلی تھی۔ چھ نمبر پر گھوڑا دوڑاتے ہوئے شیردل کی نظر میں ہمیشہ کی طرح اس پر رائیڈنگ سے زیادہ عکس پر مرکوز رہتی تھی جو گھوڑے پر قابو پانے کی کوشش میں بے حال نظر آتی تھی۔ چوتھے دن تک وہ گھوڑا بہتر انداز میں کنٹرول کر رہی تھی اور شیردل اس وقت بھی اسے دیکھتے ہوئے اسی ایک چیز پر غور کر رہا تھا جب اس نے عکس کے پاؤں کو رکاب سے باہر نکلتے دیکھا۔ وہ ذرا سا بائیں طرف پھسل کر چھکی پھر اس نے گھوڑے کی گردن سے لپٹ کر جیسے اپنا توازن ٹھیک کرنے کی کوشش کی۔ غنی حمید تب تک اپنا گھوڑا تیزی سے بھگاتے ہوئے اس کے برابر لے آیا تھا۔ اس نے عکس کے گھوڑے کے برابر گھوڑا بھگاتے ہوئے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کی جو تب تک اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے جھول رہی تھی۔ عکس کا گھوڑا غنی کے گھوڑے کے بالکل قریب آنے پر یک دم بدکا تھا اور اس نے بھاگتے ہوئے دائرہ توڑنے کی کوشش کی اور بالکل اس وقت شیردل نے عکس کو توازن مکمل طور پر کھو کر گھوڑے کے

بائیں جانب گرتے دیکھا۔ وہ گھوڑے کے ذرا سا لڑکھڑا جانے کی وجہ سے بالکل سیدھا پشت کے بل زمین پر گر رہی تھی۔ خوش قسمتی سے اس کا گھوڑا لڑکھڑاتے ہوئے بھی سنبھل گیا ورنہ وہ یا تو اس کے اوپر گرتا یا وہ اس کے پیروں سے زخمی ہو جاتی۔ وہ جس انداز میں گری تھی شیردل کو یقین تھا وہ اٹھ کر رنگ سے چلتے ہوئے نہیں جاسکتی تھی۔ رائیڈنگ رنگ میں زمین پر ریت تھی اس کے باوجود چٹنی اونچائی سے وہ گری تھی ایسا ممکن نہیں تھا کہ وہ گرتے ہی اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ چند لمحوں کے لیے شیردل کو بھی واقعی سمجھ نہیں آیا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ گھوڑے سے اتر کر اس کے پاس دوسروں کی طرح جانا چاہیے یا اسی طرح گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اس دائرے کے گرد گھومنا چاہیے جو عکس مراد علی کے گرد بنا ہوا تھا اور جس میں سے اب اسے عکس نظر نہیں آرہی تھی۔ ایک منٹ، دو منٹ، تین منٹ، چار منٹ۔۔۔۔۔ پانچویں منٹ پر شیردل نے اس دائرے کو ٹوٹتے دیکھا۔ مرد کا منرز آہستہ آہستہ اپنے گھوڑوں کی طرف جانے لگے تھے اور اس نے اس چھتے ہوئے ہجوم کے درمیان عکس مراد علی کو زمین پر بیٹھا دیکھا تو وہ ٹھیک تھی۔ اطمینان کی ایک سانس اسے بھی آئی تھی۔ وہ اب سر پر پہنا ہوا ہیلمٹ دوبارہ پہنتے ہوئے اس کی پلٹ کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے کس رہی تھی۔ شیردل کچھ فاصلے پر اپنا گھوڑا روکے اسے دیکھتا رہا۔ دوسرے کامنرز اپنے گھوڑوں پر سوار ہو رہے تھے۔ پیرامیڈیک اسٹاف فرسٹ ایڈ بائیں زمین پر رکھے عکس کے پاس کھڑے تھے۔ دونوں رائیڈنگ انسٹرکٹر اور غنی حمید بھی وہیں تھے۔ وہ اب ہاتھوں میں پہنے پروٹیکٹو گلوز ٹھیک کر رہی تھی۔ شیردل نے اسے اپنے بازو سے چہرے پر لگی ریت صاف کرتے دیکھا پھر اس نے رائیڈنگ بوتس کے اندر اپنے پیروں کی پوزیشن ٹھیک کرتے ہوئے ان کی زپ نیچے کر کے دوبارہ بند کی۔

ساتویں منٹ میں شیردل نے اسے غنی حمید کا بڑھا ہوا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہوتے دیکھا۔ وہ اب اپنے دونوں پیروں پر کھڑی اپنی گرے رائیڈنگ ٹراؤزرز سے ریت جھاڑنے کے بعد اپنے گلے اور بلیو کورٹ کے گرد لپٹے اسکارف کو ٹھیک کرتے ہوئے کوٹ کے بٹن بند کر رہی تھی جب اس نے اپنے بالکل بائیں پانچ گز کے فاصلے پر گھوڑے پر بیٹھے شیر ٹھیک کر کے دل کو دیکھا۔ صرف چند لمحوں کے لیے دونوں کی نظریں ملی تھیں، صرف چند لمحوں کے لیے وہ چٹکی تھی پھر اسی سرعت سے اس نے نظریں چرا لیں۔ ایک پیرامیڈیک اسٹاف کے ہاتھ سے پانی کی بوتل لے کر دو گھونٹ پی کر بوتل واپس کی اور پھر شیردل نے اسے دائرے کے وسط میں کھڑے اپنے گھوڑے کی طرف جاتے دیکھا جس کی باگ ایک سائیس پکڑے کھڑا تھا۔ شیردل کو اگر اس کے قدموں میں کوئی لڑکھڑاہٹ اور چہرے پر تکلیف کے کوئی آثار دیکھنے کی خواہش تھی تو اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔

دسویں منٹ میں شیردل سمیت 16 پروفیشنرز نے عکس مراد علی کو ایک عجیب سی خاموشی اور تعظیم و تحسین کے عالم میں بے حد پُر اعتماد انداز اور مہارت سے اپنے گھوڑے پر دوبارہ سوار ہوتے دیکھا۔ اس نے رائیڈنگ انسٹرکٹر کو رکاب میں پاؤں پھنسانے کے لیے رکاب کو ہاتھ لگانے دیا تھا تب ہی باگ پکڑنے میں اس کی مدد لی تھی۔ وہ باگ پکڑ کر پہلی ہی

کوشش میں بے حد ہموار انداز میں گھوڑے پر سوار ہوئی تھی۔ اپنے گھوڑے کو چند قدم چلاتے ہوئے۔ دائرے کے وسط سے دائرے کے اس سرے پر لے آئی تھی جہاں سے وہ لوگ ہمیشہ trotting کا آغاز کرتے تھے اور شیردل نے اسے ایک بار پھر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتے دیکھا۔ اس عورت کی برداشت اور بے جگری نے شیردل کو پانی کیا تھا، وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ وہ خود درجنوں بار گھوڑے سے گر چکا تھا اور اچھی طرح ان تجربہ اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تکلیف سے واقف تھا۔ عکس مراد علی سے زیادہ ہمت اور حوصلہ کسی میں نہیں تھا۔ یہ اعتراف صرف شیردل نے نہیں کیا تھا ان سترہ کے سترہ DMG پروفیشنرز نے کیا تھا جن کو لیڈ کرتے ہوئے وہ وہاں پہنچی تھی۔

اور شیردل کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ عکس مراد علی نے ایسی تکلیف اور اذیت برداشت کرتے ہوئے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا مظاہرہ پہلی بار کیا تھا۔ اس کی کمر کا نیچا حصہ ایک پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور اس میں سے کرنٹ کی طرح نکلنے والی ٹیسوں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ نہ صرف باقی کا پورا وقت رائیڈنگ کرتی رہی تھی بلکہ اس نے اس دن معمول کی طرح ہر کلاس لی۔ وہ اس گروپ میں واحد عورت تھی اور ان 17 مردوں کے سامنے اسے ایک مرد کی طرح کھڑے رہنا تھا۔ وہ اس سال پاکستان کے 17 ذہین ترین ذہنوں کے ساتھ اس DMG کیمپس میں تھی جن میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے مگرچھ تھا اور وہ ان سب کے لیے شارک چھلی بننا چاہتی تھی۔ اس رائیڈنگ رنگ میں چوتھے دن گر کر زمین پر گرے رہنے کا آپشن قابل قبول نہیں تھا۔ وہ اگلے ساتھ آٹھ مینیجنگ DMG کیمپس کے کامن روم میں سناٹے جانے والے جو کس کا موضوع نہیں بننا چاہتی تھی۔

رات کو ڈاننگ ہال میں ڈنر کے بعد شیردل اس کے پاس گیا تھا۔ وہ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں وہ رہ نہیں سکا۔ وہ اس وقت ویٹر سے کچھ کہہ رہی تھی جب شیردل اس کے پاس آگیا۔

”I hope you are alright now“ اس نے عکس کے متوجہ ہونے پر اس سے کہا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ہنسی پھر شیردل نے اسے مسکراتے دیکھا۔

”I am absolutely alright“

شیردل اور وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب کھڑے تھے کہ شیردل کو اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ عکس کی آنکھوں میں نمی امتیازی تھی جسے اس نے نظریں چرا کر اور سر جھکا کر چھپایا تھا۔ وہ اب ہاتھ میں پکڑے سوئفٹ کے کچھ دانوں کو چھلی پر ہلکا سا رگڑتے ہوئے مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شیردل کو لگا اسے وہم ہوا تھا۔ عکس کی آنکھوں میں نمی اور کس لیے؟ عکس نے پاؤں بیرونی دروازے کی طرف بڑھا دیے۔ شیردل بھی پیچھے نہیں رکا۔ بہت خاموشی سے وہ ڈاننگ ہال سے برابر چلتے ہوئے نکلے تھے۔ ہاسٹل کی طرف جاتے ہوئے شیردل نے اس سے کہا۔

”گھوڑے سے دو چار واقعہ گرتا ضروری ہوتا ہے۔“ عکس نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیوں؟ اس سے انسان کا کانفیڈنس بڑھتا ہے۔“ وہ مسکرا دی۔

”کانفیڈنس میں اضافے کے لیے اس سے زیادہ مناسب اور کم خطرناک طریقے بھی ہوتے ہیں۔“

”زندگی اور گھوڑا دونوں گراتے ہیں اور گرے بغیر دونوں کی سمجھ نہیں آتی۔“ عکس یک دم ہنس پڑی۔ شیردل نے یک دم پھر اسے دیکھا تھا۔ اس کی ہنسی کی کھنک نے عجیب سے انداز میں اس کے دل کو چھوا تھا۔

”آپ کو میری بات اچھی نہیں لگی؟“ شیردل نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”میں نے انجوائے کیا ہے آپ کی بات کو۔“ عکس نے جواباً کہا۔

”آپ دوسرے آدمی ہیں جو ایسی فلاسفی بول رہا ہے۔“

”اور پہلا آدمی کون ہے؟“ شیردل نے عجیب سے عکس کے ساتھ اس سے پوچھا۔

”مجھے کیوں نہیں پوچھنا چاہیے یہ؟“ وہ اس دن جواد کے ساتھ اپنی دو سالہ کورٹ شپ اور منگنی کے بعد کا پہلا آرگيومنٹ کر رہی تھی اور اس آرگيومنٹ کا آغاز اس نے نہیں کیا تھا۔ یہ کام جواد نے کیا تھا۔

”تمہیں میری ہر بات پر اعتبار کرنا چاہیے۔“ جواد کی گفتگو کی ٹیگ لائن تھی اور عکس زندگی میں پہلی بار اس سے گفتگو کر کے اس قدر مایوس ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا اس کے آفس میں یوں اچانک آ جانے کا مقصد صرف اس معاملے پر اسے وضاحت دے کر صورت حال کو سنبھالنا تھا لیکن جواد کی گفتگو سے ہونے والا احساس اس کے برعکس تھا۔ اسے لگا وہ جیسے بلا واسطہ اسے ذہنی طور پر آئندہ بھی ایسی ہی کسی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے آیا تھا کیونکہ وہ سیاست میں آنے کی تیاری کر رہا تھا اور میڈیا اور مخالف پارٹی اسے اور اس کے خاندان کو بدنام کرنے کے لیے اب کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ وہ بار بار اسی ایک بات کو دہرا رہا تھا اور یہ بات اس نے اتنی بار دہرائی تھی کہ بے حد شہدے مزاج کی ہونے کے باوجود عکس کو غصہ آ گیا تھا۔

”میڈیا کسی ٹھوس وجہ کے بغیر کیوں تمہیں بدنام کرنا چاہے گا؟ تم پاکستان کے کوئی بہت بڑے سیاست دان نہیں ہو جواد..... اور میری سمجھ میں تو یہ نہیں آ رہا کہ بیٹھے بٹھائے تمہیں سیاست میں آنے کا شوق کیسے ہو گیا۔ تم نے ہمیشہ مجھ سے یہی کہا کہ تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اور.....“ جواد نے کچھ حلقی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

”اب مجھے اپنی زندگی کا ہر فیصلہ تم سے پوچھ کے تو نہیں کرنا اور پھر میں نے کل رات تمہارا attitude (رویہ) اور اپنے ساتھ تمہاری loyalty (وفاداری) دیکھ لی ہے۔“ جواد نے بے حد طنز یہ انداز میں اس سے کہا۔

”میری loyalty اور میرا attitude عکس جیسے کچھ ہٹکا ہوا ہو۔“

”میں وہاں پولیس اسٹیشن میں تھا تو تم نے میرے لیے کیا کیا؟ تم ابوکوفون کر کے صرف یہ پوچھتی رہیں کہ کیا میں واقعی شراب پیتے پکڑا گیا ہوں..... اور یہ سب کیسے اور کیوں ہوا؟ تم نے ایک دفعہ بھی انہیں کسی قسم کی مدد کی آخر نہیں کی۔“

”میں جانتی تھی اگر تم بے گناہ ہو گے تو تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ چند لمحے کے لیے جواد کو کوئی جواب نہیں سوچا پھر جیسے وہ بہت خفا ہو کر بولا۔

”میری پوری فیملی تمہاری وجہ سے مجھے ذلیل کر رہی ہے میرا مذاق اڑا رہی ہے۔“ عکس نے اس کی بات کاٹ دی۔

”جواد تم میری وجہ سے پولیس اسٹیشن نہیں پہنچے تھے۔“

”بار بار پولیس اسٹیشن کا ذکر اس طرح کرنا بند کر دو کہ جیسے میں کوئی مرڈر کر کے وہاں پہنچا تھا۔“ اسے جواد کی بات پر انتہائی غصہ ہوا، وہ اتھا جتنا اس کی بلند آواز سے۔ وہ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ اس کا آفس تھا اور وہاں باہر اس کا اسٹاف

موجود تھا جو اندر سے آنے والی ہر آواز پر کان لگائے بیٹھا تھا۔ بلند آواز میں بول رہا تھا۔

”ہمیں اگر اس طرح چلا کر ایک دوسرے سے بات کرنی ہے تو بہتر ہے ہم فی الحال بات نہ کریں جب تم ہوش میں آ جاؤ گے اور تمہیں لگے گا کہ ہم دو بڑھے لکھے مہذب لوگوں کی طرح گفتگو کر سکتے ہیں تو پھر ہم بیٹھ کر اس ایشور پر بات کر لیں گے جس کے لیے تم اتنی دور سے آئے ہو۔“ عکس نے ایک دم اپنی سیٹ سے کھڑے ہوتے ہوئے اپنی فائلز سمیٹتے ہوئے بڑے گل سے اس سے کہا۔ جو ادکار تو عمل اس کے لیے اس سے بھی شاکنگ ثابت ہوا تھا۔ وہ ایک دم کرسی سے کھڑا ہوا تھا اور اس نے غصے سے تقریباً دھاڑتے ہوئے اپنی پوری آواز سے اس سے کہا۔

”میں تمہارا اسٹاف نہیں ہوں تمہارا ہونے والا شوہر ہوں۔۔۔۔۔ تم مجھ سے ڈپٹی کمشنر بن کر بات کرنے کی جرات بھی مت کرنا۔“ وہ چند لمحوں کے لیے جیسے کنگ سی رہ گئی تھی۔ ذہنیت اور توہین کے احساس سے زیادہ وہ جو ادکار وہ نیا روپ دیکھ کر شاکد ہوئی تھی۔ وہ اس جو اد سے آج پہلی بار متعارف ہوئی تھی۔ اتنے عرصے سے وہ ایک سوفٹ اسپوکن، بے حد تہذیب اور شائستگی سے بات کرنے والے ایک بہت خوش مزاج اور نفیس آدمی سے آشنا تھی جس کے ساتھ زندگی کا سفر کرنا اسے بہت آسان لگ رہا تھا۔

”تم“ ہونے والے شوہر ہو۔۔۔۔۔ شوہر ہو نہیں اس لیے رعب جھاڑنے کی کوشش مت کرو۔ کم از کم اس طرح گلا پھاڑ کر نہیں۔۔۔۔۔ رشتہ صرف ایک انگوٹھی تک کا ہے جسے میں اگر ہاتھ سے اتار کر تمہارے منہ پر مار دوں تو تمہیں اس آفس سے اٹھوا کر باہر پھینکوا سکتی ہوں اور کبھی بھی یہ مت سوچنا کہ میں یہ نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ چاہے میں منگیتر ہوں یا تمہاری بیوی۔۔۔۔۔“ اس نے بڑے گل سے ٹھنڈے لہجے میں جو اد سے کہا اور فون کا ریسیور اٹھا کر گاڑی لگوانے کی ہدایت دی۔ جو اد کا پارا سیکنڈز میں نیچے آیا تھا۔

”میرا خیال ہے ہمیں کہیں اور چل کر بیٹھ کر بات کرنی چاہیے۔“ اس نے اپنا اگلا جملہ مدہم آواز کے ساتھ بدلے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ کم از کم آج کے اس مظاہرے کے بعد میں آج کہیں بھی تم سے بیٹھ کر بات نہیں کروں گی۔ مرو کی مردانگی طاقت رکھنے کے باوجود اپنی آواز کو مدہم رکھنے میں ہے، ایک عورت کے سامنے گلا پھاڑنے میں نہیں۔۔۔۔۔ وہ عورت کو بھی آتا ہے۔۔۔۔۔ تم چائے پیو، میں جارہی ہوں۔“

”I am sorry“ وہ لمحوں میں اپنے اسی روپ میں آیا تھا جس سے وہ واقف تھی۔

”اچھی بات ہے لیکن ہم پھر بھی آج کوئی بات نہیں کریں گے۔“ وہ کہہ کر آفس سے نکل آئی تھی۔ اس وقت اس کا ذہن سنسنار رہا تھا۔ ایک شادی شدہ زندگی کے کیا چینل بن سکتے تھے اور کیا ہو سکتے تھے اس کا ایک مظاہرہ عکس نے دیکھ لیا تھا۔ ”طاقتور ہوتے ہوئے بھی کچھ دیر کے لیے وہ عجیب بے بسی اور تجھے کا شکار ہو کر بیٹھی رہ گئی تھی اور جو اد ایک روایتی مرد کی طرح اسے اسی احساس سے دوچار کرنے آیا تھا۔ ایک طاقتور عورت کے کام کی جگہ پر اس کی تذلیل کی کوشش۔۔۔۔۔ اسے نفسیاتی طور پر ہلانے اور خوفزدہ کرنے کا سب سے مؤثر اور کارآمد طریقہ یا شاید جو اد کے لیے ایک رات پہلے ہونے والے واقعے کے بعد اپنی عزت نفس کو اپنے اور اس کی نظروں میں بحال کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں تھا یا پھر شاید یہ غصے کا وہ احساس تھا جو جو اد کو پچھلی رات کے قضیے میں عکس مراد علی کے بالکل نیوٹرل رہنے سے ہوا تھا۔۔۔۔۔ ایک ڈیفنس میکنزم کے تحت وہ اپنے آپ کو مزید وضاحتوں اور صفائیوں سے بچانے کے لیے عکس پر الٹ پڑا تھا۔۔۔۔۔ وہ وقتی اشتعال تھا یا سوچا سمجھا پلان۔۔۔۔۔ وہ جو کچھ بھی تھا اس کے نتائج وہ نہیں نکلے تھے جو جو اد چاہتا تھا لیکن اس واقعہ نے عکس کو بہت اپ سیٹ کیا تھا۔۔۔۔۔ پچھلی رات سے بھی زیادہ۔

”مردوں کے بارے میں میرے اندازے ہمیشہ غلط ثابت ہوتے ہیں۔“ شیردل نے رات کو عکس کو دوبارہ کال کی تھی اور وہ چاہنے کے باوجود اس سے جو اد کے ساتھ ہونے والی تلخ کلامی اور اپنی مایوسی چھپا نہیں سکی تھی۔ ”یہ تو تم نے ٹھیک کہا، تم واقعی بڑے غلط اندازے لگاتی ہو مردوں کے بارے میں۔“ شیردل نے اس کی بات کی

معنی خیر انداز میں تائید کی۔ عکس نے اس کے انداز اور جج کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔  
 ”ہر بار میری judgement بہت flawed (ناقص) نکلتی ہے۔“ وہ واقعی کافی دل شکستہ تھی، شادی سے  
 چند ہفتے پہلے ایسی کوئی صورت حال کسی بھی لڑکی کو اسی طرح دل شکستہ کرتی اور وہ بہر حال ایک لڑکی تھی۔

”میری سمجھ میں صرف یہ نہیں آیا کہ تمہیں جو آدمی میں نظر کیا آیا تھا..... مجھے ایک نظر دیکھنے پر ہی وہ اچھا نہیں لگا  
 تھا۔ تم دو سال اس سے ملتے جلتے رہنے کے بعد بھی یہ نہیں جان سکیں کہ وہ ایک short tempered (غصے والا)  
 آدمی تھا جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود عورت کے ساتھ ہر طرح کی جہالت کا مظاہرہ کر سکتا تھا..... میں یہ تو نہیں مان سکتا  
 کہ تم محبت میں اندھی ہو گئی تھیں کیونکہ عکس مراد علی تم کو کوئی محبت میں اندھا کر سکتا تو ٹیلیفون کی اسپیکنگ یہ اعزاز صرف مجھے  
 حاصل ہونا چاہیے تھا اور اگر یہ کام میں بھی نہیں کر سکتا تو کوئی دوسرا اس کا اہل نہیں ہو سکتا..... تو واقعی سوچنے والی بات ہے یہ  
 کہ تم نے اس آدمی کو اتنا misread کیوں کیا، اس کے مزاج کے حوالے سے“ عکس نے اس کے ابتدائی جملوں کو  
 ایک بار پھر نظر انداز کرتے ہوئے اس کے آخری جملے پر کہا۔  
 ”مجھے تو یہ تک پتا نہیں چل سکا کہ وہ ڈرنک کرتا ہے۔“  
 ”خیر وہ میرے لیے کوئی اتنا قابل اعتراض کام نہیں ہے۔“ شیردل نے اسے ٹوکا۔  
 ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ یہ ایسی بات نہیں ہے جس پر تم کسی کو شادی کے لیے رجسٹرڈ کر دو۔ عادی ڈرنک ہونا اور بات ہے  
 اور سوئشل ڈرنک کرنا ایک بالکل الگ..... بہت سارے مرد سوئشل ڈرنک کرتے ہیں لیکن وہ بہت اچھے شوہر بھی ثابت  
 ہوتے ہیں۔“ شیردل نے بڑی سنجیدگی سے اس سے کہا۔ عکس نے یک دم اس کی بات کاٹتے ہوئے اس سے کہا۔  
 ”تم ڈرنک کرتے ہو شیردل؟“ شیردل اس سوال کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔ وہ کچھ حیرانی سے ہنسا تھا۔  
 ”یہ کیا سوال ہوا؟“

”تم ڈرنک کرتے ہو شیردل؟“ عکس نے اپنا سوال دہرایا۔  
 ”یہاں میری بات نہیں ہو رہی۔“ شیردل نے ایک بار پھر جواب سے بچنا چاہا۔  
 ”تم ڈرنک کرتے ہو؟“ عکس اب بھی ڈائریکٹ تھی۔  
 ”اگر کرتا ہوں تو تم کیا کرو گی؟“ شیردل نے جواب دینے کے بجائے الٹا پوچھا۔  
 ”تم ڈرنک کرتے ہو؟“ اپنی اتنی طویل دوستی کے دوران آج پہلا موقع تھا جب شیردل نے عکس کو کسی بات کو اس  
 قدر اصرار سے پوچھتے دیکھا تھا۔  
 ”نہیں۔“ شیردل نے بالآخر کہا۔  
 ”میں جانتی تھی۔“ اس نے دوسری طرف عکس کے انداز میں ایک عجیب سا اطمینان محسوس کیا۔  
 ”لیکن میں اسے برا نہیں سمجھتا۔“ شیردل نے ساتھ ہی کہا۔  
 ”میں سمجھتی ہوں۔“

”کون سی چیز زیادہ قابل اعتراض ہے تمہارے نزدیک، بد تمیز اور شارٹ لمیر ڈھونایا شراب پینا؟“ شیردل نے  
 جیسے ایک عجیب احساس کے تحت اس سے پوچھا تھا۔  
 ”شراب پینا۔“ عکس نے جواب دینے میں ایک لمحہ نہیں لیا تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا۔  
 ”مجھے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ تم شراب پینے والوں سے اتنی نفرت کرتی ہو..... کیوں؟“ عکس اس بار چند لمحے خاموش  
 رہی پھر اس نے کہا۔  
 ”بہت سی چیزیں ہمیں پسند ہوتی ہیں اور کچھ پسند نہیں ہوتیں..... ہر پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے لیے وجہ کا ہونا  
 ضروری ہے کیا؟“

”میں تمہیں بھی ایک فرق سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا جب تم جوادی کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر رہی تھیں جو تم میں اور جوادی میں ہے۔ وہ جیسی فیملی سے تعلق رکھتا ہے وہاں اس طرح کے رویے کوئی بہت بڑی بات نہیں ہوتی۔ تمہیں پتا اور اندازہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ اگر اتنی بڑی پولیٹیکل فیملی سے تعلق رکھنے کے باوجود تم سے شادی کر رہا تھا تو اس کا تھوڑا ساج تو تمہارے سر پر آنا ہی تھا۔“

”تمہیں لگتا ہے میں نے سوچے سمجھے بغیر جوادی کا پروپوزل قبول کر لیا تھا؟“ وہ بے حد سنجیدگی سے بولی۔

”سوچے سمجھے بغیر اگر کوئی پروپوزل تمہیں قبول کرنا چاہیے تھا تو میرا کرنا چاہیے تھا۔“ شیردل اس بار بھی سنجیدہ تھا۔

”میں بہت کنفیوزڈ ہوں شیردل۔۔۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔۔۔ جوادی کو ایک موقع اور دینا چاہیے یا وہ سنا چاہیے جو میری چھٹی حس مجھ سے کہہ رہی ہے۔“ اس نے ایک بار پھر شیردل کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اس سے جیسے اپنی انجمن شیر کی تھی۔

”میں تمہیں اس بارے میں کوئی مشورہ دیتے سے پہلے تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”تم نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کیوں کیا تھا؟“

”اس وقت ہم کوئی اور مسئلہ ڈسکس کر رہے تھے۔“ ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے عکس مراد علی کو کہتے سنا۔

”تم نے اس وقت مجھے کہا تھا تم کبھی نہ بھی انکار کی وجہ مجھے بتاؤ گی؟“ شیردل نے اسے یاد دلایا۔

”وہ وقت ابھی نہیں آیا۔“ عکس نے تدم آواز میں کہا۔

”اور کب آئے گا؟“

”بہت جلد۔۔۔ اس کے بعد تم شاید میری شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرو گے۔“ عکس نے بے حد عجیب سے انداز میں اس سے کہا۔

”یہ کام تو میں سر کر بھی نہیں کر سکتا۔ la belle dame sans merci۔ میں تمہیں انور نہیں کر سکتا۔“

شیردل نے جیسے احتجاج کیا تھا۔

”ہاں انور تم مجھے نہیں کر سکو گے لیکن۔۔۔“ وہ بات کہتے کہتے رک گئی تھی۔ شیردل کو وہم ہوا اس کی آواز کو آنسوؤں کا

پھندا لگا تھا۔

”عکس۔۔۔ اس نے اسے پکارا۔

”زندگی میں بہت سارے فیصلے اپنی عزت کے لیے کرنے پڑتے ہیں۔“ وہ چند لمحوں کے بعد بولی تھی۔ اس کی آواز صاف تھی۔ شیردل کو لگا اس کا وہم و ہم ہی تھا لیکن اس کا جملہ وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔

”ہاں لیکن صرف عزت کی خاطر ہم کسی کنوئیں میں نہیں کود سکتے۔“ اسے لگا تھا شاید عکس کا ریفرنس جوادی کی طرف تھا۔

”میں کوئی ہوں۔“ اس کے جواب نے کچھ دیر کے لیے شیردل کو لا جواب کر دیا۔

”میں پھر تمہیں عقل مند نہیں کہوں گا۔“

”ٹائٹلز میٹر نہیں کرتے پرائڈ میٹر کرتی ہے۔“

”یہ کون سی پرائڈ ہے جو تمہیں احقانہ فیصلے کرنے کے لیے مجبور کر رہی ہے؟“ وہ اس کے جواب سے حریہ

ناخوش ہوا تھا۔

”زندگی میں وہ فیصلے کرنے چاہئیں جو زندگی کو پرسکون کر دیں۔“

”میں بھی یہی کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔۔۔ بہت دیر بعد ہمت کر پار ہی ہوں اس فیصلے کی۔۔۔ لیکن مجھے لگتا ہے یہ میری زندگی میں سے ایک بہت بڑی غلطی نکال کر مجھے پرسکون کر دے گا۔“

”ایک اور error of judgement“ شیردل نے تنقیدی انداز میں اسے وارن کیا۔

”دیکھتے ہیں۔“ اس نے مختصراً کہا۔

”میں زندگی میں تمہیں اگر کبھی بزدلی کا مظاہرہ کرتے دیکھوں گا تو مجھے تم پر بہت غصہ آئے گا۔ عکس مراد علی میں کم از کم تمہیں ایک روایتی، کمزور، دیو، مصلحت پرست، exploited عورت کے روپ میں دیکھنا نہیں چاہتا۔“ شیردل نے

بہت غصے سے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ وہ بہت دیر کچھ نہیں بولی پھر اس نے شیردل سے کہا۔

”اور میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔“ شیردل بے اختیار مسکرایا۔

”میں چاہتا ہوں تم زندگی ایسے مرد کے ساتھ گزارو جو تمہیں ویلو کرے۔۔۔ شادی کے نام پر ایک لیبل اور پھندا اپنے گلے میں مت لٹکاؤ۔“ اسے سمجھاتے ہوئے شیردل کو احساس نہیں ہوا تھا کہ زندگی میں پہلی بار وہ اس کے سارے

ریفرنسز غلط سمجھا تھا۔۔۔ وہ جوادی ملہی کے بارے میں اس سے مشورہ نہیں کر رہی تھی وہ کس چیز کے بارے میں اس سے مشورہ کر رہی تھی وہ اسے دو دن بعد پتا چلا تھا۔۔۔ عکس مراد علی نے اسے ہلا ڈالا تھا۔

☆☆☆

اپنے نانا کو حوالات کے پیچھے دیکھ کر چڑیا بل کر رہ گئی تھی۔ اس کی زندگی کی تکلیف دہ یادوں میں ایک اور یاد کا اضافہ ہو گیا تھا۔

تھانے دار نے زمین کی جھلی رجسٹری کے کاغذ بھاڑتے ہوئے بڑے فشر سے چڑیا سے کہا تھا۔ ”اس بڑھے کو سمجھا دینا کہ وہ دوبارہ اس گاؤں میں مت آئے، زمین تو اسے ملنی نہیں ہے اگلی بار اپنی ”عزت“ سے بھی ہاتھ گنوا کر جانے گا۔ وہ

کس ”عزت“ کی طرف اشارہ کر رہا تھا چڑیا کو وہ اشارہ سمجھنے کے لیے کسی ڈکٹری کی ضرورت نہیں تھی۔ تھانے میں ایس

اچھ او کے کمرے میں تھانے کے آدھ درجن مرد عملے کی اوپر سے نیچے تک ایک سرے کی طرح چادر کے اندر لیٹے اس کے

وجود کو کھنگالتی ہوئی غلیظ نظریں اور مکروہ مسکراہٹیں فاطمہ کو ہر مفہوم سمجھانے کے لیے کافی تھیں۔ تھانے دار کی میز کے

بالمقابل کسی سائل کی طرح کھڑے لرزتے کانپتے خیر دین کے لیے گندی گالیاں سنتے ہوئے فاطمہ نے ویسا ہی خوف،

ویسی ہی ذلت محسوس کی تھی اس دن بھی جیسے اس روز ڈی سی ہاؤس میں کپڑے اتار کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ آج بھی ویسی ہی

دہشت زدہ اور گنگ تھی۔ ویسے ہی لرزتی کانپتی سکیاں، ہچکیاں جیتی ہوئی۔۔۔ وہ وہاں خیر دین کو چھڑانے آئی تھی بالکل

اسی طرح جیسے کئی سال پہلے اس رات خیر دین اسے بچانے آیا تھا۔

دو دن پہلے گاؤں میں آتے ہی خیر دین نے اپنی زمین پر نا جائز قبضے کے لیے اپنے خاندان کے خلاف ایف آئی آر

رجسٹر کروائی تھی اور اس وقت اس ایس اچھ او نے بڑی عزت اور احترام کے ساتھ رشوت کے کچھ پیسے لینے کے بعد اس

کے خاندان کے خلاف ایک بڑی مضبوط ایف آئی آر رجسٹر کی تھی اور خیر دین کو بھرپور کارروائی کا یقین دلا دیا تھا۔ خیر دین

ایک عجیب سی خوشی اور سرشاری کے عالم میں واپس گھر آیا تھا اور تقریباً ساری رات بے حد خوشی کے عالم میں چڑیا کے ساتھ

وہ سارے منصوبے بشیر کرتا رہا جو وہ اس زمین کی واپسی کے بعد اس زمین کے حوالے سے بن رہا تھا۔ فاطمہ نے اپنے

میڈیکل کالج میں ایڈمیشن کے بعد اسی دن پہلی بار خیر دین کو ایسا خوش اور پر جوش دیکھا تھا۔

اگلی صبح فجر کے فوراً بعد چند پولیس والے آ کر خیر دین کو گاؤں کے اس کے دوست کے گھر سے اس کے دوست کے

ہمراہ ہتھکڑیاں پہنا کر گھسیٹے ہوئے لے گئے تھے۔ فاطمہ جب تک گھر کی خواتین کے ہنگامے پر بیدار ہوئی خیر دین وہاں

سے لے جایا جا چکا تھا۔ ایک عجیب سی سراسیمگی اور خوف کے عالم میں وہ جیسے بے اختیار ہو کر اس خاندان کی عورتوں کے

ساتھ تھانے گئی تھی جہاں اسی تھانے دار نے اسے ان تمام عورتوں سے الگ کر لیا تھا۔ اس نے چڑیا کو خیر دین سے ملنے نہیں

دیا۔

ماہنامہ پاکیزہ۔۔۔ اپریل 2012ء۔ 49

دیا لیکن تھانے میں اپنے رہائشی کمرے میں کمر بند کرتے ہوئے دھمکاتے ہوئے زمین کی رجسٹری لانے کا حکم دیا تھا اور اسے نہ لانے کی صورت میں جن نتائج کی دھمکی دی تھی وہ فاطمہ اس کمرے سے باہر آنے کے بعد کسی کے سامنے دہرانے کے قابل بھی نہیں تھی۔ عجیب دہشت کے عالم میں وہ واپس گھر گئی تھی اور رجسٹری لے کر واپس تھانے آ گئی تھی۔ وہ پاکستان کے بہترین اسکول، کالج سے پڑھتے ہوئے پاکستان کے ایک بہترین میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھی۔ غیر معمولی ذہانت کی حامل ایک روشن مستقبل رکھنے والی لڑکی تھی۔ لیکن وہ پاکستان کے ایک دور افتادہ علاقے میں ایک لوہار کی کمین کی نواسی تھی۔ جو کمزور اور نوجوان تھی اور بھیریوں کے جنگل میں تھی۔ گوشت خورد گوشتکار کرتے ہوئے صرف بھوک سے مجبور ہو کر گوشت کھانے کی ترغیب پاتا ہے۔ انسان وہ واحد جانور ہے جو بھوک نہ ہونے کے باوجود بھی کسی دوسرے انسان کی ہڈیاں بھنبھوڑ سکتا ہے۔ اگر وہ اسے کمزور، اکیلا اور نہتہ نظر آتا ہو..... انسان صرف اسی وجہ سے زیادہ خطرناک اور کم ظرف جانور ہے۔

بہت سال پہلے ایسا ہی ایک سمجھوتا خیر دین نے کیا تھا جو حوالات سے باہر آنے کے لیے..... اپنی زندگی کے بلے میں سے وہ سامان نکالنے کے لیے جس سے وہ دوبارہ اپنی زندگی بنا پاتا..... نو سال بعد وہ رجسٹری اس ایس ایچ او کو تھاتے ہوئے ویسا ہی ایک سمجھوتا فاطمہ نے کیا تھا..... اپنی اور خیر دین کی زندگی کو ایک بار پھر بلے کا ڈھیر بن جانے سے بچانے کے لیے..... وہ جانتی تھی اس رجسٹری کے ضائع ہو جانے کے بعد زمین کا وہ ٹکڑا خیر دین کبھی نہیں لے سکتا تھا لیکن زمین کے ٹکڑے زندگی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا باعث نہیں بننے چاہئیں۔

حوالات میں خیر دین اور چڑیا کا آمناسا مناس رجسٹری کو دے دینے کے بعد ہوا تھا اور حوالات کے دروازے کے سامنے چڑیا کے نمودار ہوتے ہی خیر دین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا حوالات کے اس کھلنے والے دروازے کی قیمت کیا تھی۔

خسارے کا ایک اور سودا اور دل پر ایک اور داغ لے کر وہ دونوں اپنی عزت کو جیسے ایک گٹھڑی میں باندھے ہمیشہ کے لیے اس گاؤں سے نکل آئے تھے اب پیچھے واقعی کچھ نہیں رہا تھا۔ اس کے خاندان نے خیر دین کی ایف آئی آر کے جواب میں اس مقامی ایم پی اے کی مدد لی تھی جس کے حلقے میں وہ وہڑتھے اور جس کے لیے ایک ایف آئی آر کا صفحہ تھانے داری لاگ بک سے عائب کرنا جیسے ایک چھو منتر کی طرح تھا۔

خیر دین کو حوالات سے نکلوانے کے بعد چڑیا اور وہ گاؤں میں نہیں رکے تھے۔ ایک بس میں آٹھ گھنٹے کا سفر کرتے ہوئے وہ واپس آ گئے تھے لیکن آٹھ گھنٹے کا وہ سفر فاطمہ کے لیے انگاروں کا ایک سفر تھا۔ خیر دین بس کی کھڑکی سے باہر دیکھتا چادر میں منہ چھپائے روتا رہا تھا اور فاطمہ اس تجربے سے کچھ نئے سبق لیتی اور اندازے لگاتی رہی تھی..... اور اس سفر میں جو پہلا سبق اس نے لیا تھا وہ یہ تھا کہ نانا کی ہر بات ہمیشہ ٹھیک نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کی بہت ساری باتیں صرف کتابی ہو سکتی تھیں۔ زندگی میں اچھائی برائے اچھائی ہو تو سکتی ہے لیکن یہ ہر وقت نہیں ہو سکتا۔ تھوڑا سا مزید رہا تھا جو اس نے پیا تھا اور وہ پہلا موقع تھا جب خیر دین کی محبت کا منکا اس کے اندر سے وہ چوسنے میں ناکام رہا تھا۔

وہ ان پیپرز میں لکھی تحریر کا سر جھیر سمجھنے میں ناکام ہو رہا تھا..... سرد ہاتھوں اور زرد چہرے کے ساتھ ان کو تین بار پڑھنے کے بعد بھی..... وہ ابھی ایک گھنٹے پہلے اپنی ماں کی ایمر جنسی کال پر بھاگم بھاگ لاہور آیا تھا لیکن جو کچھ وہ دیکھ اور سن رہا تھا وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا..... یہاں نہیں آتش فشاں پھٹ چکا تھا یا پھٹنے والا تھا..... مگر شیر دل اپنے پیروں کے نیچے زمین کی گڑ گڑاہٹ سن رہا تھا..... کسی زلزلے کے آثار تھے یا پھر روز جزا اور مکافات عمل کا آغاز.....

”پہ تمہارا mess ہے اسے تمہیں ہی ٹھیک کرنا ہے۔“ اس کی ماں نے اسے کہا تھا۔ وہ دونوں جانتے تھے وہ mess نہیں تھا وہ دلدل تھی جس میں ان کی فیملی پھنسنے والی تھی..... دلدل شہد کی ہو یا کیچڑ کی..... وہ اپنے اندر سے نکلنے نہیں دیتی جب تک انسان غرق نہ ہو جائے۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



آئینے میں اُبھرنے والے عکس نے چڑیا کو روک لیا تھا۔ کسی پرانے، مہربان واقفِ حال، غمگسار دوست کی طرح اس کے دل اور قدموں دونوں پر بیک وقت کند ڈالی تھی..... ایسا دوست جس نے اس گھر میں اس کی زندگی کے بہترین دن اور بدترین رات دیکھی تھی۔

چڑیا بہت دیر تک نم آنکھوں کے ساتھ اس آئینے میں عکس کو دیکھتی رہی۔ آخری بار اس نے یہاں کھڑے ہو کر اس آئینے میں ایک پنک فرائک والی ایک ریشمی سیاہ بالوں والی سانولی چمکدار آنکھوں والی ایک پری کو دیکھا تھا وہ اس حادثے سے ایک شام پہلے کی بات تھی۔ اس دن اس نے اپنا دودھ کا تیسرا دانت گنوا یا تھا اور اس آئینے میں وہ اور ایک ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے تھے۔ وہ جانتی تھی ایک اس کے دانت کا خلا دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا لیکن وہ ایک کو اس طرح ہنستا دیکھ کر اپنے دانتوں کی مضحکہ خیز حالت بھول گئی تھی۔

اس آئینے میں وہ بونوں کو ڈھونڈا کرتی تھی۔ آج اس نے اس آئینے میں اپنے بچپن کو کھوجنے کی کوشش کی تھی۔ آئینہ اب اسے ایک سفید کوٹ کا لرڈاے لائن لانگ شرٹ، سیاہ چوڑی دار پا جامہ اور سیاہ جیکٹ میں ملبوس بے حد اسمارٹ اور ویل ڈریسڈ لڑکی دکھا رہا تھا جس کے کانوں کے ڈائمنڈ اسٹنڈ اور سفید شرٹ کے کھلے کالرز سے بہت نمایاں طور پر ابھری ہوئی کالر بون کے درمیان سنہری زنجیر میں چمکتا ایک ڈائمنڈ پینڈنٹ کسی بھی پرائس ٹیگ کے بغیر بھی اس کے متمول ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ اس عکس میں اس سے پنک فرائک اور کسی ریڈھی سے دو روپے میں ملنے والے ایک اتنے ہی سستے تیلیوں والے پنک ہیئر بینڈ والی اس آٹھ سالہ بچی کو ڈھونڈنا مشکل تھا۔ صرف وہ تھی جو اس ”عکس“ میں ”چڑیا“ کو کھوج رہی تھی اور کھوج پا رہی تھی۔ صرف وہ تھی جو اس آئینے میں وہ دیکھ رہی تھی جو دوسرا کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس آئینے میں اس نے وہ بونا دیکھا تھا جسے دیکھنے کی تمنا میں وہ گھنٹوں اس میں جھانکتی رہتی تھی اور پہلی بار وہ بونا نظر آ جانے پر وہ خوف سے فریز ہو گئی تھی۔ وہ اس کی بد صورتی سے ڈر گئی تھی۔ زندگی نے اسے سکھایا تھا کہ ظاہری بد صورتی خوف کھانے والی شے نہیں ہوتی۔ یہ انسان کے اندر کی بد صورتی ہوتی ہے جس سے ڈرنا چاہیے۔ اس آئینے میں اسی دن اس نے انسان نام کا ایک بے حد خوب صورت بونا بھی دیکھا تھا جس سے خوف اور گھن نام کی کوئی شے اسے محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس بونے نے اس کی زندگی تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ زندگی میں بعض ولن ہیرو کی شکل میں اور بعض ہیرو ولن کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں لیکن ہم ان کی شناخت بہت دیر سے کر پاتے ہیں۔

چڑیا نے اس آئینے میں نظر آنے والے اس بد صورت بونے کو اس گھر میں دوبار دیکھا تھا۔ ایک اس آئینے میں جب وہ اسے دیکھ کر خوف کے عالم میں ہل بھی نہیں سکی تھی اور دوسری بار اس بونے نے کسی اور کوفریز کر کے.....

چڑیا نے یک دم آئینے سے نظر ہٹائی تھی۔ وہ سات بونے یک دم اتنے سالوں کے بعد اسے اپنے الیا اپنے گھر میں دیکھ کر خوشی سے جیسے پاگل ہو گئے تھے کتنا اس ہیل والے بند جوتے پر چھلانگ مار کر ہانسا تھا اور اس کی پنڈلی سے لپٹ گیا تھا۔ وہ اپنی خوشی کا اظہار ہمیشہ ایسے ہی کرتا تھا۔ منٹا اچھل کر اس

کی جیکٹ کی آستین سے لٹک گیا تھا۔ اسے ہمیشہ اس طرح جھولنے میں مزہ آتا تھا۔ سب سے موٹا بونا ٹوکوا اپنے ہر تھراتے ہوئے پیٹ کے ساتھ اور پھولے سانس کے ساتھ اس کے ارد گردنا چتا پھر رہا تھا۔ آنکھیں گھمانے والا کٹو خوشی سے بے حال اپنی ہی جگہ دروازے کی دہلیز پر پھر کی طرح ایک ہی جگہ گھومتا جا رہا تھا۔ ٹٹو نے اس کے دوسرے جوتے پر چڑھنے کی کوشش میں چھینک چھینک کر خود کو بے حال کر لیا تھا۔ ٹو فو بھاگتے ہوئے اپنی عینک کہیں گرا بیٹھا تھا اور اپنے بازو پھیلائے چڑیا کو ڈھونڈنے کی کوشش میں ادھر ادھر چیزوں سے ٹکراتا پھر رہا تھا۔ اور چڑیا کا فیورٹ ڈیڈ وہ بس اس کے پیروں میں کھڑا بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا ہی جا رہا تھا۔ سب کچھ وہیں تھا جہاں وہ چھوڑ کر گئی تھی یا اسے جانا پڑا تھا۔ ایس اپنے ونڈر لینڈ میں لوٹ آئی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک کی بات پر اس کے قریب سے گزرتے گزرتے جیسے واپس لوٹ آئی تھی۔ اس کی اطلاع نے فاطمہ کو جیسے اسی طرح حیران کیا تھا۔

”آئی مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟“ اس نے کالج کے کاریڈور کی دیوار سے نکلے ایک کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ خلاف توقع بہت سنجیدہ تھا۔

”یہ تو تمہیں می ہی بتا سکتی ہیں، مجھے تو انہوں نے صرف تمہیں یہ میج دینے کے لیے کہا تھا۔“ فاطمہ کچھ دیر اچھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے اور ایک کے درمیان اتنی سی بات بھی کئی دنوں کے بعد ہو رہی تھی۔ وہ کالج میں ایک کو مکمل طور پر نظر انداز کیے ہوئے تھی اور اس کی اس کوشش نے ایک کو جیسے بری طرح زچ کر دیا تھا اور اب یک دم وہ اس کے سامنے یہ مطالبہ لے کر آ گیا تھا کہ مسز سلطان اس سے ملنا چاہتی تھیں۔

الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ اگلے دن مسز سلطان کے آفس میں آئی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس سے انتہائی گرم جوشی اور شفقت کے ساتھ ملی تھیں۔

”کتنے دن ہو گئے تم سے ملاقات ہوئے۔ میں نے کئی بار ایک سے تمہارے بارے میں پوچھا لیکن اس نے کہا تم اس سے کچھ خفا ہو۔“ وہ اپنے آفس میں اپنی ٹیبل سے.... فائلز سمیٹتے ہوئے بولیں۔ چند لمحوں کے لیے فاطمہ کو عجیب سی شرمندگی ہوئی۔ اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ ایک اپنی ماں سے اس کی خفگی کو اتنے کھلے طریقے سے شیئر کرے گا۔

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ گڑبڑا کر صفائی دینے والے انداز میں بولی۔

”تو پھر تم دونوں نے کبائٹ اسٹڈی کیوں بند کر دی۔ آپس میں ملنا جلنا کیوں چھوڑ دیا؟ ایک تمہارے اس رویے کی وجہ سے بے حد آپ سیٹ ہے اور اسی وجہ سے میں نے سوچا کہ میں تم سے خود بات کروں۔“ فاطمہ کو بڑی مشکل ہوئی مسز سلطان کے سوالوں کا جواب ڈھونڈنے میں۔ وہ بھی مسز سلطان سے اپنے اور ایک کے تعلق کا اعتراف نہیں کر سکتی تھی۔ خاص طور پر اب جبکہ ایک کی زندگی میں اس کی فیملی کی منتخب کردہ ایک اور لڑکی آچکی تھی لیکن اس کی مشکل کو مسز سلطان نے خود ہی حل کر دیا تھا۔

”ایک تمہیں بہت پسند کرتا ہے اور یہ پسندیدگی ایک کلاس فیلو اور دوست کی حیثیت سے نہیں ہے۔“ فاطمہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔ جو آخری شے وہ مسز سلطان سے توقع کر سکتی تھی وہ بات تھی جو انہوں نے ابھی کی تھی۔

”ایک نے مجھ سے اس پسندیدگی کو کبھی نہیں چھپایا لیکن کچھ فیملی پرابلمز ایسی ہو گئیں کہ ایک کی بات طے کرنی پڑی مجھے۔ لیکن بیٹا ہم لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ خوش اسلوبی کے ساتھ یہ معاملہ ختم ہو جائے۔ ایک اور میری بیٹی میں کسی قسم کی کوئی compatability نہیں ہے اگر فیملی کا معاملہ نہیں ہوتا تو یہ رشتہ بہت پہلے ختم کر دیتی میں کیونکہ مجھے اپنے بچوں کی خوشی سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہیں ہے لیکن بس فیملی کی کچھ مجبوریوں ہیں جن کی وجہ سے یہ رشتہ لٹک ہی گیا ہے۔“ فاطمہ بے یقینی کے عالم میں مسز سلطان کی باتیں سن رہی تھی۔ آسمان اس کے سر پر گر جاتا تو اسے اس قدر شک نہیں پہنچتا جتنا ابھی پہنچ رہا تھا۔ مسز سلطان اس کے اور ایک کے بارے میں پہلے ہی سارے اندازے اور قیاس لگائے بیٹھی تھیں جو سو فی صد ٹھیک تھے اور اب وہ اسے اس پچھتاوے سے آگاہ کر رہی تھیں جو اس رشتے کی صورت میں انہیں ہوا تھا۔

”بیٹا میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اور ایک اپنی دوستی پہلے کی طرح رکھو، اکٹھے پڑھو۔۔۔۔۔ ساتھ گھومو پھرو جیسے پہلے تھے۔ میں تمہیں یقین دلا رہی ہوں کہ ہاؤس جاب ختم ہونے تک یہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ میں ایک کی شادی وہیں کروں گی جہاں وہ چاہتا ہے اور میں جانتی ہوں کہ وہ کہاں شادی کرنا چاہتا ہے۔“ انہوں نے آخری جملہ بے حد معنی خیز انداز میں کہا۔ ایک عجیب الجھنے کے عالم میں فاطمہ اس دن ان کے آفس سے اٹھ کر آئی تھی۔ مسز سلطان نے اسے صرف یہی نہیں کہا تھا۔ انہوں نے اس سے اور بھی بہت سی باتیں کی تھیں۔ بہت ساری یقین دہانیاں، خوش گمانیاں، بہت ساری تسلیاں اور آخر میں بار بار ایک ہی ریکوریٹ کہ وہ ایک کے ساتھ کبائٹ اسٹڈی جاری رکھے۔ وہ اس کی عدم توجہی کی وجہ سے اپنی اسٹڈیز پر فوکس نہیں کر پا رہا تھا اور مسز سلطان کے لیے یہ بہت تکلیف دہ اور ناقابل برداشت بات تھی خاص طور پر اس صورت میں جب وہ ایک کو آگے اسپیشل ٹرینیشن کے لیے باہر بھجوانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

فاطمہ بہت الجھے ذہن کے ساتھ مسز سلطان کے آفس سے واپس آئی تھی۔ اسے ایک عجیب سی صورت حال میں ڈال دیا تھا انہوں نے۔ ایک طرف جہاں اسے مسز سلطان کی بات پر بے حد خوشی ہوئی تھی دوسری طرف وہ ایک عجیب ذہنی کشاکش کا شکار بھی ہو گئی تھی۔ بتائیں یہ سب ٹھیک تھا یا نہیں۔ بتائیں یہ سب اسے کرنا بھی چاہیے تھا یا نہیں۔ وہ خیر دین سے یہ مسئلہ ڈسکس کرنا چاہتی تھی لیکن وہ متاثر تھی۔ اسے خیر دین کے جواب کا اندازہ تھا اور کہیں نہ کہیں چڑیا خیر دین سے وہ جواب نہیں چاہتی تھی۔ ان خیر دین سے مسئلہ ڈسکس کیے بغیر اس مسئلے کا کوئی حل بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

”تمہیں میری بات پر یقین کیوں نہیں آ رہا۔۔۔۔۔ خاص طور پر اب جب ممی کے منہ سے تم نے سن لیا ہے۔ وہ بھی یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہیں۔“ اگلے دن ایک بڑے معمول کے انداز میں بے تکلفی سے اس نے اسے اس کے بارے میں ہمیشہ کی طرح اس سے بڑے گرم جوش انداز میں بات چیت کا آغاز کیا تھا۔

نہ چاہنے کے باوجود چڑیا اس سے بات کرنے لگی تھی لیکن اس کے انداز میں ایسا کچھ ضرور تھا جس نے کچھ دیر کے بعد ایک کوزج کر دیا تھا۔

”ایک مجھے یوں لگ رہا ہے میں کسی کی زندگی کے ساتھ کھیل رہی ہوں۔“ فاطمہ نے بے حد سنجیدگی سے ایک سے بالآخر اپنی ذاتی کیفیت شہر کی تھی۔ وہ جیسے حیران رہ گیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کس کی زندگی کے ساتھ کھیل رہی ہو تم؟“

”تمہاری منگیتری..... اور جانتے بوجھتے۔“ ایک اس کے احساس جرم پر قہقہہ مار کر ہنسا تھا۔

”تم بھی بہت عجیب ہو، اس ساری صورت حال میں تم کہاں سے قصور وار ہو گئی ہو۔“

”میں درمیان میں نہ آتی تو تمہیں اس منگنی پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔“ فاطمہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”تم میری زندگی میں ناجیہ سے پہلے آئی تھیں۔ ناجیہ سے پہلے سے ہو پھر تم اس طرح کیوں سوچ رہی ہو؟“ ایک نے جیسے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ فاطمہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ وہ بچی نہیں تھی کہ اس معاملے کی نزاکت کو نہ سمجھ پاتی اور کہیں نہ کہیں ایک سے محبت کرنے کے باوجود اسے اندازہ تھا کہ ایک اس معاملے میں بے حد خود غرضی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ پہلے اس نے بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا جب اس نے اپنی فیملی کے دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے فاطمہ کے ساتھ اپنے تعلق کو مکمل طور پر فراموش کرتے ہوئے ناجیہ سے منگنی کر لی تھی اور نہ صرف اس نے منگنی کر لی تھی بلکہ اس نے اس منگنی سے اس کو مکمل طور پر بے خبر بھی رکھا تھا اور اب وہ اس کے ساتھ اسی طرح کے تعلقات استوار رکھے ہوئے اس لڑکی کی زندگی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

”ناجیہ جانتی ہے کہ تم یہ رشتہ ختم کرنا چاہتے ہو اور کہیں اور انٹرنیٹ ہو؟“ فاطمہ نے یک دم بے حد سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔ ایک ایک بار پھر جواب دینے میں متامل ہوا پھر بالآخر اس نے کہا۔

”ہاں وہ جانتی ہے، میں نے اسے تمہارے بارے میں بتا دیا ہے اور وہ تمہارے بارے میں جاننے کے بعد خود بھی اس رشتے میں زیادہ انٹرنیٹ نہیں ہے۔ یہ اب صرف دو فیملیز کی انا کا زیادہ مسئلہ ہے اور کچھ نہیں..... اسی لیے تو میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ بس تم تھوڑا وقت دے دو مجھے۔ یہ رشتہ ختم ہو جائے گا کیونکہ میں اور ناجیہ دونوں خود بھی اس رشتے کو قائم رکھنے میں انٹرنیٹ نہیں ہیں۔“ ایک نے اسے بے حد تفصیل سے بتایا۔

”فاطمہ بے اختیار پرسکون ہوئی۔ ایک عجیب سا بوجھ تھا جو اس کے دل اور کندھوں سے ہٹا تھا۔ ناجیہ اس ساری صورت حال سے واقف تھی..... مطلب فاطمہ کسی ایسے کھیل کا حصہ نہیں تھی جس میں ناجیہ کی زندگی خراب ہوتی۔ وہ ایک کا انتظار کر سکتی تھی۔ اسے موقع دے سکتی تھی کہ وہ اس تمام مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کر لے۔ اس دن کالج گراؤنڈ میں ایک کے ساتھ بیٹھے اس نے یہی فیصلہ کیا تھا۔ زندگی ایک بار پھر اسی پرانی ڈگر پر آگئی تھی..... وہی خواب..... وعدے..... خواہشات، یقین دہانیاں، خوش گمانیاں..... فاطمہ ایک بار پھر اپنے مستقبل کو انہی سارے دھاگوں سے منبٹنے لگی تھی۔ خیر دین کو اگلے کئی ہفتوں تک ایک کے ساتھ اس کے patch up کے بارے میں پتا نہیں چلا لیکن پھر آہستہ

آہستہ فاطمہ نے ایک بار پھر خیر دین کو باور کروانا شروع کر دیا تھا کہ وہ اور ایک ایک بار پھر سے اکٹھے ہو گئے تھے۔ خیر دین شروع میں اس سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ وہ صرف دوستی تھی یا..... اسے تو قیاس تھا کہ یہ صرف دوستی ہی ہو سکتی تھی۔ چڑیا ایک کی منگنی ہو جانے کے بعد کیسے اس کے ساتھ کوئی جذباتی تعلق بحال کر سکتی تھی۔ خیر دین بہت دیر سے سہی فاطمہ سے یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا اور فاطمہ کے جواب نے اسے بھی اسی طرح الجھا ہوا چھوڑا تھا جس طرح فاطمہ خود شروع میں الجھی تھی۔ فاطمہ سے اس نے بہت سارے سوال جواب کیے تھے اور فاطمہ نے بہت مدافعتانہ انداز میں ایک کا دفاع کرتے ہوئے اس کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ خیر دین فاطمہ کے جوابوں میں دکنے والے پیوندوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی باتیں سنتا اور سر ہلاتا رہا تھا۔ وہ کچی عمر کی پہلی محبت تھی اور وہ اپنی نواہی کو بے رحمی اور بے حس سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ دنیا بہت ظالم، خود غرض اور جھوٹی ہوتی ہے..... فریب در فریب کے جال بنتی اور پھٹتی رہتی ہے..... اور یہ کہ لوگوں کی زبانوں کے کھن میں بہت ساز ہوتا ہے جو سنکھیا نہیں ہوتا کہ فوری اثر کرے لیکن مارنے ہی کے لیے ہوتا ہے۔ دنیا کی ایک بھیا نک تصویر اس کی نواہی بچپن میں دیکھ چکی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی دنیا کو ایک بار پھر کالے اور گہرے رنگوں سے خراب کرے۔ خیر دین چڑیا کا اعتبار رشتوں، دوستوں، انسانوں سے نہیں اٹھانا چاہتا تھا..... پر اب اس کے لیے پریشانی یہ تھی کہ وہ اپنی عزیز نواہی کو کسی آنے والی تکلیف کی طرف بڑھتے دیکھ کر کیسے بچائے۔

”ایک بات بتاؤ چڑیا..... اگر ایک کی منگنی ختم نہیں ہوئی تو؟“ فاطمہ خیر دین کی بات پر حیران رہ گئی تھی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا نا..... میں نے آپ کو بتایا ہے وہ اور اس کی منگیتریوں یہ رشتہ ختم کرنا چاہتے ہیں۔“ اس نے بے حد یقین سے کہا۔

”ایک سال سے وہ یہ کوشش کر رہے ہیں ابھی تک تو ختم نہیں کر سکے۔“ وہ کچھ دیر خیر دین کی بات کا جواب نہیں دے سکی۔

”لیکن وہ کوشش کر رہے ہیں۔“ اس نے مدافعتانہ انداز میں کچھ دیر کے بعد کہا۔

”ہاں لیکن وہ کوشش ابھی تک کامیاب نہیں ہوئی۔ بعض کوششیں کبھی کبھار کامیاب نہیں بھی ہوتیں۔“ اس نے دھیمے لہجے میں اسے آگے آنے والے گڑھے سے خبردار کیا۔ ”تم نے یہ سوچا ہے اگر یہ کوشش بھی کامیاب نہیں ہوئی تو تم کیا کرو گی؟“ فاطمہ الجھے انداز میں خیر دین کو دیکھتی رہی۔

”میں کیا کروں گی؟“ اس نے جیسے حیرانی سے خیر دین کے سوال کو دہرایا تھا۔

”زندگی میں ہمارے پاس ہمیشہ ایک پلان بی ہونا چاہیے۔ ہر بڑی ناکامی کے بعد زندگی میں اگلے بڑھتے رہنے کے لیے ایک متبادل راستہ..... اگر ہم زندگی میں وہ نہ پاسکیں یا وہ نہ کر سکیں جو ہمارا مارکٹ ہے تو پھر ہمارے پاس ایک دوسرا آپشن ہونا چاہیے اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے۔“

فاطمہ نے خیر دین کی بات بڑی لچکی سے سنی تھی۔ وہ دنیا کا پہلا نانا تھا جو اپنی نواہی کو محبت میں ناکامی کے بعد ایک متبادل آپشن ڈھونڈ کر رکھنے کی ہدایت دے رہا تھا۔ فاطمہ ہنس پڑی تھی ایک typical بات ادھ لڑکی کی طرح جسے یقین تھا کہ کم سے کم زندگی میں اسے کسی متبادل آپشن کی ضرورت نہیں

پڑے گی۔ خیر دین اس کے ہنسنے پر مسکرا دیا تھا اسے اس سے اس عمر میں اس مسئلے پر اسی غیر سنجیدگی کی توقع تھی۔

”زندگی میں ہم نقصان کسی بھی کام میں ناکام ہونے کی وجہ سے نہیں اٹھاتے..... ایک اچھا پلان بنی نہ ہونے کی وجہ سے اٹھاتے ہیں۔“ خیر دین اسے سمجھانے لگا تھا۔ وہ خیر دین کی بات بخور سنتی رہی تھی۔ ایک کے معاملے پر وہ فارمولہ پلائی کرتی نہ کرتی زندگی کی اور بہت سی چیزوں پر وہ فارمولہ لگ سکتا تھا۔ فاطمہ بڑی روائی سے وہی گھسا پٹا جملہ خیر دین سے بولنا چاہتی تھی..... نانا ایک ایسا نہیں ہے لیکن پھر وہ رک گئی تھی۔ ایک ایسا نہیں تھا اس کے باوجود ایک سال پہلے اس نے چپ چپاتے اپنی کزن سے ملگنی کر لی تھی۔ ایک سال میں ایک بار بھی فاطمہ کو اس بات کا علم ہونے نہیں دیا تھا..... نہ ایک نے نہ ہی مسز سلطان نے..... وہ نہ چاہتے ہوئے بھی واہموں کی ڈور سے الجھ گئی تھی۔

”آپ کیا چاہتے ہیں نانا؟“ اس نے مبہم انداز میں خیر دین سے پوچھا۔

”میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی دوسرے کی ناکامی اور کوتاہی کے لیے خود کو کبھی مجرم مت ٹھہرانا۔ زندگی آن ہو نیوں اور معجزات کا دوسرا نام ہے۔“ فاطمہ خیر دین کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔ اس کے الفاظ اس رات اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے تھے۔

صبح ہونے تک اس نے خیر دین کی تنبیہ کم نصیحت کو بھلا دینے کی کوشش کی تھی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ایک کا چہرہ دیکھتے ہی خیر دین کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگتے تھے۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اسے اس شخص کے لیے خیر دین کی ہدایات کی ضرورت تھی۔ وہ خیر دین کو اس شام کہنا چاہتی تھی کہ اندھی محبت واحد چیز ہوتی ہے جس میں ناکام ہونے کے بعد کوئی پلان بنی کام نہیں آتا..... اور دراصل محبت کرتے وقت بھی انسان کوئی پلان بنی نہیں رکھتا..... اندھی محبت زندگی میں انسان کو صرف ایک بار ہوتی ہے..... بعد میں گزارہ ہوتا ہے بعض دفعہ عادت اور زیادہ تر ضرورت..... لیکن پھر اندھی محبت نام کی شے انسان کو عقل سے پیدل نہیں کرتی۔

ایک سلطان کو میڈیکل کے آخری تمام سال کے دوران وہ صرف اسی ترازو میں تولتی رہی تھی۔ کیا اسے اس سے اندھی محبت تھی.....؟ کیا وہ اس کے بغیر زندہ رہ سکے گی اس طرح جس طرح رہتی آئی تھی؟ کیا وہ اس کے بعد کسی دوسرے مرد کو اپنی زندگی میں قبول کر سکے گی؟ کسی ایک سوال کا جواب اسے واضح نہیں مل پاتا تھا۔ کوئی ایک کا نٹا تھا جو خیر دین کے لفظوں نے اس کے اندر گاڑ دیا تھا اور اس سے اٹھنے والی ٹیسس اسے حواس سے باہر نہیں ہونے دیتی تھیں۔

وہ دونوں ہاؤس جاب کر رہے تھے جب تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد بالآخر فاطمہ نے ایک بار پھر ایک سے اپنے اور اس کے رشتے کے حوالے سے کوئی حتمی فیصلہ کرنے کے لیے کہا تھا اور اس کے جواب نے فاطمہ کو سن کر دیا تھا۔ اس کے اور ناجیہ کے نکاح کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور ایک نے بے حد معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ فاطمہ کو اس بار پہلے سے زیادہ بے یقینی ہوئی تھی کیونکہ اس بار ایک کے لہجے میں کوئی پریشانی کوئی اضطراب نہیں تھا۔ وہ بے حد مطمئن اور پرسکون تھا یوں جیسے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ ایک عجیب سی ہنک محسوس کی تھی فاطمہ نے اس

کے انداز سے۔ اس نے ایک سلطان سے کوئی اگلا سوال جواب نہیں کیا تھا۔ کوئی بحث و مباحثہ نہیں۔ نہ وہ اس پر چلائی تھی نہ اس نے ایک سلطان کو برا بھلا کہا تھا۔ وہ شکل ہوتے اعصاب کے ساتھ ہاسٹل واپس آ گئی تھی۔

اسے زندگی میں کبھی شادی کی خواہش تھی نہ ہی کوئی جلدی..... ایک سلطان نے ہی اس کے اندر شادی کی خواہش پیدا کی تھی اور خیر دین اور اس کی ماں کے بار بار کے تقاضوں اور دباؤ سے شادی کی جلدی کا مطالبہ..... اور اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا صرف تکلیف کا ایک عجیب سا احساس تھا جو باقی رہ گیا تھا۔ ڈیڑھ سال پہلے کی طرح وہ دنوں نہیں روئی تھی نہ ہی اس نے پہلے کی طرح خیر دین کو پریشان کیا تھا۔ اس نے ایک سلطان اور اس کے ساتھ تمام یادوں سے اپنے آپ کو cut off کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہی مینٹل بلاک جو اس نے بچپن کے اس حادثے کو بھلانے کے لیے اپنے آپ پر لگایا تھا وہ اب بھی کام آیا تھا..... لیکن یہ کام آسان نہیں تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں جب وہ ہر روز ایک سلطان سے ملتی تھی۔ اس سے بات بھی کرتی تھی اور اس نے بڑے محل کے ساتھ اس سے اس کے نکاح کی تقریب کا دعوت نامہ بھی لے لیا تھا۔

”میں تو سمجھ رہی تھی تم دونوں committed ہو اور وہ تم سے شادی کرے گا۔“ اس کی روم میٹ فائزہ نے ایک سلطان کے نکاح کی خبر سننے پر جیسے بے حد شاک کے عالم میں فاطمہ سے کہا تھا۔ ”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں تھی..... ہم صرف دوست تھے۔“ اس نے بڑے محل کے ساتھ بات کو گول مول کیا تھا۔ وہاں کسی کے ساتھ بیٹھ کر اپنی تکلیف اور تذلیل شیر کرنے کا مطلب ہاسٹل کی دیواروں پر اپنا اشتہار لگانا تھا اور فاطمہ کو اس ”ناموری“ کی خواہش نہیں تھی۔

”تم نے اس کے لیے بہت کچھ کیا ہے..... اگر ایک کی کوئی پوزیشن آتی ہے تو یہ صرف تمہاری وجہ سے ہوگی۔“ اس نے فائزہ کو ٹوک دیا۔

”نہیں، میں نے اس کے لیے کچھ نہیں کیا..... وہ خود بہت لائق ہے۔“ ”ہوگا لیکن ایک سلطان پیراسائٹ ہے اس نے ساری زندگی یہی کیا ہے، اسکول میں تھا تو سب سے لائق لڑکی کے ساتھ فرینڈ شپ کروائی ہوئی تھی اس کی ماں نے..... کالج کے دو سال ایک اور لڑکی کے ساتھ چیک کر گزارے اس نے..... اور پھر میڈیکل کے پانچ سالوں کے لیے تو تمہاری شکل میں اس کی لائٹری نکل آئی۔“ وہ بے حس و حرکت فائزہ کی شکل دیکھتی رہی۔ اسے کچھ دیر کے لیے اس کی بات کی سمجھ ہی نہیں آئی تھی۔

”اس کا بھائی میری بہن کا کلاس فیلو تھا اور اس کا بھی یہی طریقہ تھا۔ مسز سلطان نے اپنی اولاد کو پیراسائٹس کی طرح پالا تھا..... جو نکلیں نہیں ہوتیں جو دوسروں کا خون چوس چوس کر پلتی ہیں بالکل ویسے دوسروں کی قابلیت کا خون چوس کر اپنی اولاد کو قابل بنایا ہے انہوں نے۔“ اس نے آج پہلی بار فائزہ کو بولتے سنا تھا۔

”اب فیملی کی امریکن نیشنل لڑکی مل گئی ہے۔ اس کے سر پر امریکا میں ریزیڈنسی اور اسپیشلائزیشن ہوگی۔“ فاطمہ، فائزہ کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا تھا۔



”اس کی فیملی کو..... میں تو ان کی سات پشتوں کو جانتی ہوں اور خاص طور پر مسز سلطان کو..... ان کی شفقت محبت اور نرم مزاجی کے سارے ڈھکوسلوں سے واقف ہوں میں۔ میری کزن کے ساتھ تین سال ایک کے چھوٹے بھائی کا افیر رہا تھا..... topper تھی وہ بھی اور اس نے اپنا بیڑا غرق کر لیا تھا ایزد سلطان کے چکر میں..... دونوں بیکن میں تھے..... اب ایزد صاحب تو اطمینان سے علامہ اقبال میڈیکل کالج میں پہنچ گئے ہیں اور میری کزن کو بہ مشکل فیصل آباد میں ایڈمیشن ملا ہے اور اب ایزد صاحب کا ایک اور topper لڑکی کے ساتھ افیر زوروں پر ہے اور میری کزن نے بریک اپ کے بعد خود کشی کی بھی کوشش کی اور ایزد صاحب اب اس سے چھپتے پھرتے ہیں۔“ فائزہ بڑی تلخی سے کہہ رہی تھی۔

”مسز سلطان اے لیوئر تک میرے خالو کی فیملی کو یہی جھانسا دیتی رہیں کہ انہوں نے ایزد کی شادی نکلیں سے ہی کرنی ہے بس ذرا ایزد میڈیکل میں چلا جائے پھر دونوں کی منگنی یا نکاح کر دیں گے اور میڈیکل میں ایزد کے پہنچتے ہی انہوں نے میری کزن پر ہر طرح کے الزام لگانے شروع کر دیے۔ یوں جیسے میری کزن کوئی بڑی بدکردار لڑکی تھی جس نے ان کے پانچ وقت کے نمازی بیٹے کا کردار اور ایمان خراب کر دیا..... انتہائی گھٹیا خاندان ہے مسز سلطان کا۔“ فاطمہ ہونٹوں کی طرح فائزہ کی شکل دیکھ رہی تھی۔

”تم نے پہلے کبھی مجھ سے یہ سب ڈسکس نہیں کیا۔“ ایک لمبی خاموشی کے بعد فاطمہ نے بالآخر اپنی خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ اس کے گلے کو عجیب گرہ لگ گئی تھی۔

”میں نے چند بار تم سے ذکر کیا تھا لیکن تم نے ایک کے بارے میں یا مسز سلطان کے بارے میں کسی قسم کی بات چیت میں دلچسپی نہیں لی تو پھر میں نے بھی سوچا کہ میں کیوں خواہ مخواہ تمہارے سامنے یہ قصے لے کر بیٹھوں..... ویسے بھی اگر تمہاری کوئی ایسوشنل انوالومنٹ نہیں تھی اس کے ساتھ تو پھر تمہیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا..... لیکن میں پھر بھی سمجھتی ہوں کہ تم نے ایک کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔“

زندگی میں وہ پہلا موقع تھا جب فاطمہ کو اپنے آئی کیو لیول پر شبہ ہوا۔ اپنی ذہانت صرف ایک وہم لگی اور اپنا آپ چغدا اور احق۔ فائزہ غلط نہیں کہہ رہی تھی اس نے ایک کے لیے واقعی ضرورت سے بڑھ کر کیا تھا۔ ایک دوست کی طرح نہیں..... وہ اسے اپنا مستقبل سمجھ کر اپنا ہونے والا جیون ساتھی سمجھتے ہوئے اسے مدد دینے کی کوشش کرتی تھی۔ ایک سلطان نے پانچ سال اسٹڈیز کے معاملے میں اپنا سارا بوجھ فاطمہ پر ڈالے رکھا تھا۔ فاطمہ کو اب یاد آ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ اس کا بیسٹ فرینڈ ہمیشہ ایک ٹاپر ہی رہا ہے۔ فائزہ نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ اسکول میں عائشہ نامی ایک لڑکی کے بہت قریب رہا تھا اور کالج میں ربیعہ نامی ایک اور لڑکی کے ساتھ..... فاطمہ نے اکثر اس کے منہ سے ان کا ذکر سنا تھا۔ وہ اس کے لیے جو جو کیا کرتی تھیں اس نے ان کے قصے بھی سنے تھے لیکن وہ دونوں لڑکیاں میڈیکل کے پانچ سالوں میں ایک کی زندگی میں کبھی بھی نمودار نہیں ہوئیں۔ وہ اس کی بیسٹ فرینڈ تھیں۔ اور ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی کنگ ایڈورڈ تک نہیں پہنچ سکی تھی اور ایک کے لیے ان کی یوٹیلٹی ختم ہو گئی

نہی۔ میڈیکل کے پانچ سال اس نے فاطمہ کو ٹشو پیپر کے طور پر استعمال کیا تھا اور اسے کبھی اندازہ نہیں ہوا وہ اسے محبت سمجھتی رہی۔ پتا نہیں یہ خوش فہمی کی حد تھی یا بے وقوفی کی۔ ایک سلطان کا معما اس نے بہت دیر سے حل کیا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی کوئی گتھی سلجھانے میں پانچ سال نہیں لیے تھے۔ ایک ہوتی ہے محبت میں ناکامی..... ایک ہوتا ہے محبت کے نام پر الوہنا..... وہ محبت میں ناکام نہیں ہوئی تھی الوہنی تھی۔ اس نے ایک بار کسی سے سنا تھا دنیا میں سب سے کارگر اور بدترین exploitation محبت کے نام پر ہوتی ہے اور اسے پہلی بار اپنی زندگی کے ایک تلخ تجربے نے سمجھایا تھا کہ یہ کیسے ہوتا تھا۔

خیر دین کا تجربہ ایک بار پھر جیت گیا تھا۔ چڑیا کے یقین کو ایک بار پھر مات ہوئی تھی اور اس مات نے ایک بار پھر چڑیا کو خیر دین کی نصیحت پر غور کرنے پر مجبور کر دیا تھا..... ”پلان بی“ اسے اب ایک پلان بی کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

اپنے تھے ہوئے جسم کو حتی الامکان ریلیکس کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک نے پہلی بار اس آئینے کو دیکھا..... وہ اب بھی ویسے ہی وہاں کھڑا تھا..... اپنے اسی استقبالی، خیر مقدمی انداز میں..... اسی غرور اور طنطنے کے ساتھ..... اسی پراسراریت میں لپٹے جس نے پہلی بار ایک کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ برآمدے میں قدم بڑھاتے ہوئے اس نے آئینے پر ایک نظر اور دوڑائی تھی۔

اس گھر میں اس کی آمد 26 سال بعد ہوئی تھی اور ان 26 سالوں کو اس نے جیسے ایک مونوسکینڈ میں کیلکولیٹ کر لیا تھا۔ گھر کے اندرونی دروازے کو اس کے انتظار میں کھڑے ملازم نے کھولتے ہوئے اسے سلام کیا تھا۔ اس نے سانس روک کر اس دروازے سے اندر قدم رکھا تھا۔ اس کا ماتحت عملہ اس کے ہمراہ تھا۔ اس کا پی اے اس گھر کی تفصیلات سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ایک کا دل چاہا وہ اسے روک دے..... اسے اس گھر کے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ گھر اس کی یادداشت کا وہ انمٹ حصہ تھا۔ جسے کھرچ کھرچ کر مٹا دینے کی ہر کوشش ناکام رہی تھی۔

ہال میں پہنچ کر چند لمحوں کے لیے اس کے قدم فریز ہو گئے تھے۔ وہ سیڑھیاں اب اس کے سامنے تھیں۔ سیڑھیاں چنچیں اور.....

”وہ وہاں کچن کا دروازہ ہے۔“ پی اے کا جملہ اسے جیسے کرنٹ کی طرح لگا تھا جو اسے حال میں واپس لے آیا تھا۔ اس نے چونک کر ان سیڑھیوں سے نظریں ہٹائیں اور پی اے کو دیکھا۔

”پانی مل سکتا ہے؟“ اپنے اعصاب اور حواس پر بیک وقت قابو رکھنے کی کوشش میں اس نے لگا تار کہہ لیتے ہوئے پی اے کو ٹوکا۔ پی اے فوری طور پر اس کی پیاس بجھانے کے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ اسے اپنے گرد جو خاموشی چاہیے تھی وہ چند منٹوں کے لیے ہی سہی لیکن مل گئی تھی۔ جسم میں سے کڑواہٹ کی خوف کی ایک لہر کو اس نے جیسے خود کو ساکت رکھتے ہوئے earth کیا۔ غیر محسوس انداز میں اپنی ہاتھوں کی مٹھیاں سمجھتے ہوئے اس نے ایک نظر اپنی کلائی پر ڈالی..... اس کے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے۔ اسی غیر محسوس انداز میں ہاتھ جھٹکتے اور نظریں چراتے ہوئے اس نے پانی کا وہ گلاس تھا

جو اس کے سامنے ایک ٹرے میں پیش کیا گیا تھا۔ اس نے ایک سانس میں وہ گلاس خالی کیا تھا۔ وہ گھرایک کو کس طرح بہت زدہ کرنے والا تھا یہ اس کے لیے کوئی اچھے کی بات نہیں تھی۔۔۔۔۔ اس نے وہاں پوسٹ نہ ہونے کی مقدور بھرکوشش کی تھی مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ آسب زدہ گھر 26 سالوں کے بعد جیسے اسے ایک بار پھر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

”مجھے اس گھر کو ایک نظر دیکھنے دیں۔“ اختر نے اس کے پانی کا گلاس رکھتے ہی دوبارہ بولنا شروع کیا ہی تھا جب اس نے اسے ٹوک دیا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ ماتحت عملے نے کچھ حیران نظروں کا تبادلہ کیا لیکن پھر کچھ کہے بغیر اس کے ہمراہ ہو لیے۔

گھر بہت تبدیل ہو چکا تھا لیکن وہاں موجود پرانی چیزوں میں سے کوئی بھی ایسی نہیں تھی جسے ایک نے ایک ہی نظر میں نہ پہچان لیا ہو۔ اسے رہائشی عمارت کا جائزہ لینے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس گھر نے اس کی زندگی میں ideal اور idealism نام کی چیز کو چھین لیا تھا اور بہت سارے سوال دے دیے تھے جنہیں اس کا دماغ بہت سالوں تک کھوجتا رہا۔۔۔۔۔ اکتھارہا۔۔۔۔۔ ناکام ہوتا رہا۔۔۔۔۔ اور پھر جب بالآخر اسے جواب ملا تھا تو بے یقینی کی ایک عجیب سی کیفیت نے اگلے کئی سال اسے اپنے حصار میں رکھا اور بے یقینی وہ واحد شے نہیں تھی جو بہت عرصے اس کے ہمراہ رہی تھی۔۔۔۔۔ ایک ناقابل بیان اذیت بھی۔۔۔۔۔ شرم اور دکھ کا ایک عجیب احساس بھی اور ان تمام احساسات کے درمیان چڑیا کا چہرہ بھی جو اپنی آنکھوں میں خوف اور دہشت لیے اسے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔ صرف چند سیکنڈز کے لیے ملنے والی وہ نگاہ جس کا تصور بھی اسے ٹھنڈے پسینے دلانے کے لیے کافی تھا۔

اوپر والے فلور کے تقریباً تمام کمرے لاکڈ تھے۔ اس نے کسی کمرے کو نہیں کھلوا یا۔۔۔۔۔ وہاں اب ایسا کچھ نہیں تھا جسے دیکھنے کی اسے خواہش تھی۔ اس گھر کا ماسٹر بیڈروم بھی لاکڈ تھا اور صرف وہ واحد کمرہ تھا جس کے دروازے کے باہر اس کے قدم چند لمحوں کے لیے فریز ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اس کمرے میں جانے کی شدید خواہش نے اسے آن گھیرا تھا پھر اس نے اسی رفتار سے اس خواہش کو جھٹک دیا تھا۔

”باہر چلتے ہیں۔“ اس نے جیسے منٹوں میں عمارت کے اندرونی جائزے کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ وہاں اندر کھڑے بہت سی چیزوں اور یادوں کا ایک سیلاب تھا جو اسے بہائے لیے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے وجود کو غرق ہونے سے بچانے کی جیسے ایک اور کوشش کی تھی۔

عمارت کے ارد گرد موجود لان پہلی نظر میں اسے ویسا ہی لگا تھا۔۔۔۔۔ اور دوسری نظر نے اسے وہ خار دار جھاڑیاں، کھوکھلے ہوتے تنے اور سوکھے ہوئے پیڑ پودے دکھانے شروع کر دیے تھے جو بظاہر اس تراش خراش کے دم پر کھڑے تھے جو یقیناً اس کی آمد سے ایک دن پہلے کی گئی تھی۔ 26 سال پہلے وہ لان اس حالت میں نہیں تھا۔۔۔۔۔ نہ وہ لان نہ وہاں کے درخت اور پودے اور نہ ٹینس کا وہ کورٹ جس پر آخری میچ یقیناً سالوں پہلے کھیلا گیا تھا۔۔۔۔۔ سب کچھ بوسیدہ اور خستہ حال تھا ان تکلیف دہ یادوں کی طرح جو اس کے اندر سرکنڈوں کی طرح سرنگالے ہمہ وقت موجود رہنے کے باوجود ایک لمبے عرصے سے وہ کاٹ اور چھین کھو چکی تھیں جس نے اس کے بچپن کے ایک بڑے حصے کو بے حد بے رحمی سے لہو لہان اور

سنگریہ کیا تھا۔

”اس طرف سرونٹ کو اڑھڑ ہیں۔“ پی اے نے اسے کسی رہنمائی کا انتظار کیے بغیر لان کے عقبی حصے میں کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح جاتے ہوئے دیکھ کر کچھ حیرانی کے ساتھ کہا۔ اس کو ایک کے انداز میں اس عمارت کے لیے ایک عجیب سی familiarity مانوسیت، واقفیت نظر آرہی تھی۔

”چتا ہے۔“ اس کے انداز میں واقعی ایک عجیب سی مانوسیت تھی اس گھر کے لیے۔۔۔۔۔ کوئی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا تب بھی اس کے لیے عمارت کے عقبی حصے میں اس جگہ جانا دشوار نہ ہوتا۔۔۔۔۔ اس کے قدم اب جس رستے پر تھے وہاں اس کی زندگی کی بہترین اور بدترین یادیں بکھری تھیں۔

کچن کے عقبی دروازے سے کئی فرلانگ دور۔۔۔۔۔ عمارت کے بالکل عقب میں۔۔۔۔۔ وہاں اب وہ کو اڑھڑ نہیں تھا۔۔۔۔۔ چند لمحوں کے لیے اس نے اپنے آپ کو اسی شاک اور بے بسی کی حالت میں پایا جو اس نے 26 سال پہلے اس رات محسوس کی تھی۔ وہ closure اب بھی نہیں ہوا تھا جس کی خواہش اسے وہاں تک لے آئی تھی۔۔۔۔۔ وہ آسب اب بھی اس کے وجود کے اندر ہی رہنے والا تھا۔

☆☆☆

شیردل پورا راستہ ایک پلان بی ڈھونڈتا آیا تھا اس آسب سے لڑنے کے لیے جو اتنے سال ایک وہم نما خوف کی صورت میں اس کے وجود کے اندر پلتے رہنے کے بعد اب یک دم اس کے مد مقابل آ گیا تھا۔۔۔۔۔ ایک بھیاں خواب کی صورت میں۔۔۔۔۔ وہ شاکڈ تھا۔۔۔۔۔ اسے شاکڈ ہی ہونا چاہیے تھا۔ بے یقینی کے عالم میں تھا۔۔۔۔۔ وہ بھی فطری بات تھی لیکن اس صدمے اور اذیت کی کیفیت کو وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا جس نے یک دم اسے جکڑ لیا تھا۔ اس کی فیملی ایک بہت بڑے کرائس کا سامنا کرنے والی تھی اور اس کرائس کی تمام جڑیں اس کی اپنی طرف جاتی تھیں۔

واپسی کا پورا راستہ وہ ماضی کے بارے میں سوچتا آیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں دنیا گول ہے اور دنیا اس کے لیے واقعی گول ثابت ہوئی تھی۔

عکس مراد علی۔۔۔۔۔ اس ایک نام سے آگے وہ کچھ سوچ نہیں پاتا۔ اس کے ساتھ سالوں گزرنے کے بعد وہ اتنا بے وقوف کیسے ثابت ہوا تھا کہ اسے کبھی پہچان نہیں سکا۔ اس کے ایجنڈے کو کبھی نہیں جان سکا۔ ایجنڈا؟ وہ شاید اس کے لیے ایک بہت سخت لفظ استعمال کر رہا تھا لیکن اس کے پاس جیسے اسے اپنا دشمن سمجھنے کے علاوہ وقتی طور پر کوئی آپشن ہی نہیں تھا۔۔۔۔۔ اس عورت کو اپنا دشمن سمجھنا جسے وہ بے انتہا چاہتا تھا۔ اس کا دل کچھ اور بوجھل ہو گیا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس کے سیل فون پر شہر بانو کا ٹیکسٹ آیا تھا۔ وہ اسے skype پر آنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ جسمانی طور سے زیادہ یہ ذہنی تھکن تھی جو اسے بے حال لے ہوئے تھی اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو شہر بانو سے بات کرنے سے نہیں روک سکا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ اپنا لیپ ٹاپ لے کر اپنے بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسکرین پر شہر بانو کا چہرہ دیکھتے ہی اس کا ایک عجیب سی تکلیف ہوئی تھی۔ وہ کافی کا ایک گپڑے لاؤنج کے ایک وسیع و عریض صوفے پر لیٹی ہوئی تھی پھر اس نے لیپ ٹاپ سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ شیردل اس کے عقب میں کھڑکی کے

شیشوں پر بارش کی بوندیں دیکھ رہا تھا۔ کیلی فورنیا میں اس وقت بارش ہو رہی تھی شہر بانو کو بارش پسند تھی۔ شیردل جانتا تھا کہ وہ اب گھنٹوں کھڑکی کے سامنے اسی طرح کافی کا ایک گک تھا مے بیٹھی رہ سکتی تھی۔ شہر بانو اب مثال کو پاس لے آئی تھی۔ شیردل کا دل اپنی اولاد کو دیکھ کر جیسے کسی پرندے کی طرح خوشی سے پھڑ پھڑایا تھا۔ مثال بڑے ایکساٹنڈ انداز میں اسے امریکا میں اپنی مصروفیات کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ سارا دن کیا کرتی تھی، وہ اور اس کی مٹی کہاں کہاں گئیں، کون کون آئے سے ملنے آیا، کس کس نے اسے کیا کیا تحفہ دیا۔۔۔۔۔ اور یہ کہ ان سب کے باوجود وہ شیردل کو مس کر رہی تھی اور چاہتی تھی کہ باپ فوراً اس کے پاس آجائے۔ اپنی چار سالہ بے حد خوب صورت اور معصوم بیٹی کی باتیں سنتے ہوئے شیردل کو کوئی اور یاد آیا تھا۔۔۔۔۔ ایک اور ایسا ہی خوب صورت چمکتا، کھلکھلاتا وجود۔۔۔۔۔ اس کے دل پر کسی نے منوں برف ڈالی تھی۔ ملال کسی بارش کی پھوار کی طرح اس کے وجود کو بھگو گیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی کھلکھلاہٹ میں چڑیا کی چچھاہٹ سن رہا تھا۔ اس کی بیٹی کی عمر میں اور چڑیا کی عمر میں چار سال کا فرق تھا۔ شاید پانچ سال کا فرق۔ وہ کسی میکا کی انداز میں نہ چاہتے ہوئے بھی چڑیا کے بارے میں سوچتا جا رہا تھا۔ مثال سے اس کا موازنہ کرنے لگا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، کوئی اس کی بیٹی کو نقصان پہنچانے کی کوشش بھی کرتا تو شیردل اس کو شوٹ کر دیتا۔ یہ ایک چیز تھی جس پر شیردل کی ڈکٹری میں کسی کے لیے کوئی معافی نہیں تھی اور یہی ایک چیز تھی جس کا خوف عجیب طرح سے اسے اپنے حصار میں لیے رہتا تھا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ وہ شہر بانو کے سوال پر بری طرح چونکا تھا۔

”ہاں کیوں؟ کیا ہوا؟“ وہ اسکرین پر مثال کو دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ اسے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ شہر بانو کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ مثال اب لاؤنج میں ادھر سے ادھر کچھ toys پکڑے وقتاً فوقتاً آتی جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی اور ہر بار اس کی جھلک نظر آنے پر شیردل کی نظر عجیب طرح سے اس کے تعاقب میں جاتی تھی۔

”تم بہت تھکے ہوئے اور پریشان لگ رہے ہو۔“ شہر بانو نے بے ساختہ کہا۔ ہزاروں میل کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے ایک کمرے کی آنکھ سے شیردل کو Scan کر لیا تھا۔ شیردل نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”ہاں یار تھکن ہے کافی۔۔۔۔۔ ابھی ابھی لاہور سے آیا ہوں۔۔۔۔۔ سارا دن بڑی مصروفیت رہی۔“ شیردل نے اسے ٹالنے کے بجائے جھوٹ بولنا زیادہ بہتر سمجھا تھا۔

”اچھا تو سو جاتے پھر بلکہ ابھی سو جاؤ۔“ شہر بانو نے فوری طور پر جیسے اپنے شوہر کی فکر کی۔

”ہاں سو جاؤں گا ابھی۔“ شیردل نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ نیند تو آج اسے سر کر بھی نہیں آنے والی تھی۔ خالی گھر میں ماضی کی بازگشتوں کے گرداب میں چکرانے سے شہر بانو اور مثال سے باتیں کرتے رہنا بہتر تھا کم از کم عارضی طور پر ہی لیکن وہ خود کو کچھ پرسکون رکھ پارہا تھا۔

”سو جاؤ۔“ شہر بانو نے ایک بار پھر ایسے ہدایت کی۔

”سو جاؤں گا۔“ شیردل نے پھر ٹالا اور بھی اس نے شرمین کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔

”مئی سے بات کرو گے؟“ شہر بانو کو ایک دم پتا نہیں کیا خیال آیا۔ شیردل فوری طور پر ”نہیں“ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکا۔

”ہاں کروادو۔“ اس نے اپنے لہجے میں کچھ گرم جوشی پیدا کرنے کی کوشش کی جو اس کے اور شرمین کے درمیان کبھی بھی نہیں رہی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ شرمین کے لیے اس کی مٹی کی ناپسندیدگی تھی۔ ان کی شادی کے اتنے سال بعد بھی شرمین اور اس کی فیملی میں عجیب سی غیریت اور اجنبیت کی دیواریں تھیں اور یہ دونوں طرف سے تھیں اور دونوں طرف سے ہی اسے گرانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ شیردل کی فیملی خاص طور پر اس کی ماں شرمین کو اپنے اکلوتے بھائی کی موت کا ذمے دار سمجھتی تھی۔۔۔۔۔ شیردل کی رائے اس بارے میں بالکل محفوظ تھی۔ وہ نیوٹرل تھا یا نہیں لیکن اس نے شہباز کی موت کے حوالے سے ہونے والی کسی گفتگو میں کبھی حصہ نہیں لیا تھا۔ کبھی کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ شادی سے پہلے اس کی خاموشی کی وجوہات اور تھیں۔ شادی کے بعد ان وجوہات میں شہر بانو کی اپنے باپ سے attachment اور کسی تبصرے سے اس کی ممکنہ طور پر ہرٹ ہو جانے کی وجہ بھی شامل ہو گئی تھی۔ شہر بانو اور شیردل کے درمیان اتنے سالوں میں شہباز کا ذکر بہت کم آیا تھا بلکہ نہ ہونے کے برابر آیا تھا۔ شیردل جانتا تھا شہباز اپنی اکلوتی بیٹی کے بارے میں جنون کی حد تک پوزیسو تھے اور شہر بانو بھی شہباز کی شیردل سے خاص attachment کے حوالے سے تھوڑی بہت یادیں رکھتی تھی اس کے باوجود ان دونوں نے کبھی شہباز کو ڈسکس نہیں کیا تھا۔

”کیسے ہو بیٹا؟“ شرمین نے علیک سلیک کے بعد شیردل سے وہی رسمی سوال کیا۔ شیردل نے ہمیشہ والی تمیز اور احترام کے ساتھ جواب دیتے ہوئے اُن سے اُن کا حال پوچھا۔ چند منٹ دونوں کے درمیان بات چیت ہوئی رہی پھر شہر بانو کو ایک بار پھر شیردل کے آرام کا خیال آ گیا تھا۔ اس بار شیردل نے اسے ٹالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اسے خدا حافظ کہہ کر آف لائن ہو گیا تھا۔

شرمین شیردل سے بات کرنے کے بعد بھی وہیں بیٹھی رہی تھی۔ ایک عجیب سی تکلیف اور اذیت تھی جو ہر بار اسے شیردل کو دیکھتے ہی ہوتی تھی۔ وہ شکل صورت اور قد کاٹھ میں شہباز سے بہت مماثلت رکھتا تھا اور ہر بار اسے دیکھتے ہوئے اسے شہباز یاد آتا تھا۔ اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی۔۔۔۔۔ ایک دوسرے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود بھی۔۔۔۔۔ اور شہباز کے گھناؤنے روپ کے بارے میں جاننے کے بعد بھی وہ شہباز سے نفرت نہیں کر سکی تھی۔ بس اس نے اسے زندگی سے نکال دیا تھا کیونکہ اس کے ساتھ رہنا شرمین کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اس سے بیک وقت محبت اور نفرت کر رہی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھودیتی وہ اس کی زندگی سے نکل آئی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہیں مئی؟“ وہ شہر بانو کی آواز پر یک دم چونکی تھی۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ شیردل پہلے سے زیادہ اسمارٹ ہو گیا ہے۔“ شہر بانو نے مسکرا کر اپنے ہینڈ سم میاں کے بارے میں ماں کا تبصرہ فخریہ انداز میں سنا۔ وہ جانتی تھی شیردل سے شادی کی شدید مخالفت کرنے لے باوجود شرمین شیردل کو پسند کرتی تھی اور شادی کے اتنے سال گزرنے کے بعد یہ پسندیدگی بہت کم ہو گئی تھی۔ شیردل نے شہر بانو کو بہت خوش رکھا ہوا تھا اور شرمین کے لیے اس سے زیادہ مطمئن کرنے



”تم اس کے ساتھ بہت خوش ہونا؟“ وہ شرمین کے سوال پر مسکرا دی تھی۔

”بہت ایک ایسا لفظ ہے جو میری خوشی کے لیے بہت چھوٹا ہے می۔ میں جانتی ہوں آپ کہیں گی آئیڈیل کچھ نہیں ہوتا لیکن میں اس کے ساتھ ایک آئیڈیل زندگی گزار رہی ہوں۔ ویسی زندگی جیسی کہیں میں پایا کے ساتھ گزارتی تھی۔“ وہ یہ مثال نہیں دینا چاہتی تھی لیکن شہر بانو کو احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کے لاشعور نے اسے دھوکا دے دیا تھا۔ شرمین کے چہرے پر مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی تھی۔ لاؤنج میں کچھ دیر کے لیے ایک عجیب مجرمانہ خاموشی چھائی رہی پھر شرمین نے کہا۔

”اللہ نہ کرے تم بھی اس کے ساتھ ویسی زندگی گزارو جیسی میں نے تمہارے پایا کے ساتھ گزارا تھی۔ اللہ نہ کرے شیردل بھی تمہارے پایا جیسا نکلے۔“

”داؤد آج آرہا ہے؟“ شہر بانو نے یک دم ماں کی بات کاٹ دی تھی۔ شرمین جانتی تھی وہ اس کا احتجاج تھا وہ شہباز کے بارے میں اگر کوئی اچھی بات نہیں سنتی تھی تو پھر کوئی بری بات بھی نہیں سن سکتی تھی۔ شہباز حسین ان کے درمیان خاموشی کی ایک بڑی اونچی دیوار کھڑی کر دیتا ہے جس کے پار ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ پارہی تھیں۔

”ہاں آج رات کو ڈنر پر انوائٹڈ ہے یہاں، پرسوں کی فلائٹ سے ڈلاس جا رہا ہے۔“ شرمین نے موضوع بدل کر جیسے اس کے احتجاج کے سامنے گھٹنے ٹیکے تھے۔

”divorce ہو گئی ہے اس کی؟“ شہر بانو نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”دو ہفتوں تک ہو جائے گی۔“ شرمین نے بتایا۔ داؤد شرمین کے دوسرے شوہر فاروق کا بھانجا تھا۔ شہر بانو اور وہ ہائی اسکول تک کلاس فیلو رہے تھے اور شیردل سے شادی کے تنازعے پر اس کے لیے جس most eligible bachelor کا نام آیا تھا وہ اسی کا تھا۔ وہ شرمین کا چھیتا تھا۔ شہر بانو کو یہ ماننے میں عار نہیں تھا کہ داؤد کسی کا بھی چھیتا ہو سکتا تھا۔ شیردل اگر اس کی زندگی میں نہ آیا ہوتا تو وہ داؤد جیسے لڑکے کے ساتھ خوشی خوشی شادی کر لیتی۔ ان دونوں کی آپس میں اتنی واضح ذہنی مطابقت تھی لیکن شیردل اس کی زندگی میں بڑے صبح وقت پر آیا تھا۔ وہ شادی ہو جانے کے بعد بھی کبھی داؤد سے ٹوک جھوک میں یہ بات کہہ دیتی تھی اور داؤد جواباً اسے کہا کرتا تھا۔ ”صبح وقت پر یا غلط وقت پر؟“ اس بار بڑے لمبے عرصے کے بعد داؤد سے اس کی ملاقات ہونے والی تھی۔

”مجھے کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ داؤد جیسے شخص کی شادی بھی ناکام ہو سکتی ہے۔“ شہر بانو نے کہا۔

”قصور کس کا تھا؟“ اسے جیسے عجیب سی کرید ہوئی تھی۔

”شادی کبھی بھی صرف ایک شخص کی وجہ سے ناکام نہیں ہوتی زارا اور اس کی اچھی بھڑھری تھی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا اچانک سے ہم لوگوں نے جھگڑوں کے بارے میں سننا شروع کر دیا اور پھر یک دم پتا چلا کہ زارا نے divorce کے لیے کیس فائل کر دیا۔“ شرمین نے اسے تفصیلات بتانی شروع کیں۔

”داؤد پچھلے کئی سالوں میں کچھ زیادہ ہی کیریئر اور پیسہ ہو گیا تھا اس کا اثر اس کی شادی پر پڑنا ہی تھا خاص طور پر اگر بیوی بھی اسی طرح کی ہانی پرو فائل جاب پر ہو تو.....“ شہر بانو اس کی بات سننے

نے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ شرمین کچھ عرصے پہلے ہی کیلی فورنیا کے اس علاقے میں شفٹ ہوئی تھی اور شہر بانو، فاروق اور شرمین کے اس سنے اور بے حد وسیع و عریض گھر میں پہلی بار آئی تھی۔ قد آدم لڑکیوں سے باہر برسنے والی اس بارش سے وہ بے حد عجیب انداز میں محفوظ ہو رہی تھی۔

شرمین اب مثال کی طرف متوجہ ہو گئی جو ایک گیم پکڑے اس کے پاس کچھ دکھانے آئی تھی۔ شرمین نے اس کا چہرہ چومتے ہوئے اسے گود میں بٹھالیا۔

”اس کی شکل بالکل تم سے ملتی ہے جب تم چار سال کی تھیں تو تم بھی بالکل مثال کی طرح لگتی تھیں۔“ شرمین نے مثال کے اصرار پر TV آن کرتے ہوئے شہر بانو سے کہا۔ شہر بانو مسکرا دی۔

”شیردل بھی یہی کہتا ہے..... وہ تو کہتا ہے مثال اور میں اب بھی بالکل ایک جیسی لگتی ہیں اسے..... بلکہ اسے لگتا ہے مثال مجھ سے زیادہ سمجھدار ہے۔“ شرمین شہر بانو کے پیار بھرے شکوے پر

ہنس دی۔ ٹی وی پر بچوں کے چینلوں پر مثال کے لیے کوئی موزوں کارٹون پروگرام ڈھونڈتے ہوئے وہ ایک چینل پر چلنے والی سنو وائٹ اور سات بونوں کی animated فلم پر رک گئی تھی۔ مثال گیم چھوڑ کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ کھڑکیوں سے باہر جھانکتی ہوئی شہر بانو نے بھی سنو وائٹ کے کسی جملے پر

گردن موڑ کر ٹی وی دیکھا اور پھر اسے جیسے یک دم کچھ یاد آیا تھا۔

”ممی آپ کو بتا ہے ہماری پچھلی پوسٹنگ جہاں تھی اس گھر میں بونے تھے..... real life dwarfs“ شرمین کا چہرہ منتوں میں زرد پڑ گیا تھا۔

”کس گھر کی بات کر رہی ہو تم؟“ شہر بانو نے بے حد حیرت سے ماں کا چہرہ دیکھا۔ اس نے ماں کے چہرے پر جو تاثرات دیکھے تھے وہ انہیں کبھی بھول نہیں سکتی تھی۔

”آپ کو بتایا تو تھا میں نے شیردل کی پچھلی پوسٹنگ کے بارے میں۔“

”تم نے کہا تھا تم لوگ ریٹ ہاؤس میں رہو گے جب تک متبادل انتظام نہیں ہو جاتا۔“ شرمین فق رنگت کے ساتھ اس سے کہہ رہی تھی۔

”ہاں لیکن پھر ہم اسی سرکاری گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ شیردل نے مجھے کہا تھا کہ میں آپ سے بسوٹ بول دوں کہ ہمیں کوئی اور گھر مل گیا ہے رہنے کے لیے۔“ شہر بانو کو بات کرتے ہوئے اندازہ ہوا کہ شرمین عجیب گم صم حالت میں اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کی بات سن رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔

”کچھ نہیں..... میں اس گھر کے بارے میں سب جانتی ہوں۔“ شہر بانو نے یک دم شرمین کو

دبا دبا کر ہاتھ دے کر اس کی بات پر جھٹکا لگا تھا۔

”آپ کیسے جانتی ہیں؟“ اس نے بے ساختہ ماں سے پوچھا اور پھر ماں کے کچھ کہنے سے بھی پہلے

سے جواب مل گیا تھا۔

”پاپا وہاں پوسٹڈ رہے تھے کیا؟“ اس نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔

شرمین نے جواب نہیں دیا تھا لیکن شہر بانو نے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سیلاب دیکھا تھا۔

آئینے پر ایک اور نظر ڈالتے ہوئے اندر جانے سے پہلے چڑیا نے پلٹ کر ایک نظر برآمدہ کے سامنے پھیلے ہوئے لان کو دیکھا۔ وہ اب اس کا گھر تھا۔ کم از کم تب تک جب تک ”سرکار“ اسے وہاں رکھتی اور اس گھر میں موجود ہر چیز بھی اس کی سرکاری تحویل اور تصرف میں تھی۔

چڑیا نے سامنے لان میں لگے فلیگ پول پر لہراتا جھنڈا دیکھا جو اس گھر کے مالک کی اپنی رہائش میں موجود ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ اس لان میں اس نے سارا بچپن کھیلتے ہوئے گزارا تھا۔ اس فلیگ پول کی اہمیت یا ضرورت سے واقف ہوئے بغیر اس کے گرد گھومتے چکر کاٹتے ہوئے..... یادیں اس گھر کے چچے چچے پر بکھری ہوئی تھیں..... وہ ساری یادیں اچھی تھیں..... اس ایک رات کے علاوہ جو اس کی پوری زندگی پر پھیل گئی تھی۔ اس گھر میں اس نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ اس نے، حلیمہ نے اور خیر دین نے۔

چند منٹ پہلے اسی پورچ میں اسٹاف کار سے اترتے ہوئے اس کے عملے نے اس کا استقبال کیا تھا۔ وہ اس شہر میں تعینات ہونے والی پہلی ڈپٹی کمشنر تھی اور اس کی ذات میں اس کے عملے کا تجسس اور دلچسپی ایک لازم سی بات تھی۔ وہیں پورچ میں اس گھر میں کام کرنے والے عملے سے چڑیا کی پہلی ملاقات اور تعارف ہوا تھا۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اُن میں سے کوئی بھی ایسا چہرہ یا نام نہیں تھا جو چڑیا کے ماضی سے وابستہ تھا۔ وہ سب زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال سے وہاں کام کر رہے تھے۔ گھر کا سب سے پرانا ملازم 18 سال سے وہاں تھا۔ کوئی پرانا چہرہ پہچاننے کی کوئی خواہش لے کر وہ وہاں آئی بھی نہیں تھی۔

اس کا ماتحت عملہ اس گھر کی پہلی خاتون آفیسر کو بے حد مروتیت کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے کوئی اس کی ذہنی کیفیت اور اضطراب سے واقف نہیں تھا۔ واقف ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ چڑیا کو اپنے چہرے کے تاثرات اور اعصاب پر قابو رکھنا آتا تھا۔ اسے ماتحت عملے کی رہنمائی میں گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے وہ بالآخر اس ہال کمرے میں آگئی تھی۔ زندگی میں اس سے زیادہ تذلیل اور بے بسی کے احساس سے وہ کہیں دو چار نہیں ہوئی تھی۔ اس جگہ نے اس کی رسوائی کا تماشا دیکھا تھا..... وہ بیڑھیاں..... جن سے بھاگتے ہوئے اس نے اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد کی تھی اور وہ گیلری جہاں کھڑے ایک کے حلق سے نکلنے والی ہڈیانی چیخوں نے اس کی زندگی بچائی تھی۔ اسے اپنے حلق پر کسی کے ہاتھوں کی جان لیوا گرفت محسوس ہوئی اور پھر اس نے پل بھر میں اس گرفت کو ڈھیلا پڑکے دیکھا۔ اس پر جھکے اس کا گلا دبتے شہباز حسین نے کرنٹ کھا کر اوپر گیلری میں کھڑے لکڑی کی ریلنگ پکڑے پاگلوں کی طرح روتے اور چلاتے ہوئے ایک کو خوف اور بے بسی سے دیکھا تھا۔ وہ اس سے اتنی دور تھا کہ وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا نہ اس کو روک سکتا تھا اور بالکل اس لمحے چڑیا نے بھی ایک کو دیکھا تھا۔ زمین پر پڑی چند لمحے پہلے سانس لینے کی جدوجہد کرتی بے دم چڑیا نے..... اور پھر وہ یک دم اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شہباز حسین اسے دوبارہ پکڑا اور گرا نہیں سکا تھا۔ کچن کے دروازے سے تب تک ہڑبڑایا ہوا خیر دین اس ہال کمرے میں آگیا تھا۔

”میڈم اوپر چلیں؟“ ایڈمن آفیسر نے اس کو بالکل ٹھیک وقت پر ٹوکا تھا۔ سر ہلاتے ہوئے اس

اپنی آنکھوں میں آئے پانی کو پلکیں جھپکاتے ہوئے روکا تھا۔ ڈاکٹر عکس فاطمہ اس گھر میں آنے سے پہلے یہاں آ کر نہ رونے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ یہاں چڑیا ان کر رہنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ یہاں ”عکس مراد علی“ بن کر آنا اور رہنا چاہتی تھی۔ اس شہر کی طاقتور ترین عورت۔

☆☆☆

”تم طاقت حاصل کرنا چاہتی ہو؟“ خیر دین نے عجیب افسردگی کے عالم میں چڑیا کو دیکھا اور اس کا جملہ دہراتے ہوئے کہا۔ چڑیا نے کچھ کہے بغیر سر ہلا دیا۔ اس نے کچھ دیر پہلے خیر دین کو یہ بتایا تھا کہ وہ میڈیسن پر ٹیکس نہیں کرے گی وہ سول سروس جوائن کرنا چاہتی تھی۔ اس کا فیصلہ خیر دین کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ اگلے کئی منٹ وہ کچھ بول ہی نہیں سکا تھا۔ وہ جس کیفیت کا شکار تھا چڑیا اس کا اندازہ کر سکتی تھی۔ اس گھر سے نکل آنے کے بعد سے اب تک اس نے خیر دین کو کبھی بھولے سے بھی کسی سے یہ ذکر کرتے نہیں سنا تھا کہ وہ کبھی کسی ڈی سی ہاؤس میں سرکاری ملازم کے طور پر کئی دہائیاں کام کرتا رہا تھا۔ خیر دین نے گاؤں میں اپنے گھر کے باہر سے اپنی نیم پلیٹ کے ساتھ ہی اپنی زندگی میں سے اپنے ماضی کے اس حصے کو بھی اتار پھینکا تھا۔

چڑیا نے نو سال کی عمر تک خیر دین کو ہر جگہ اور ہر شخص کو بے حد فخریہ طور پر اپنی اس سرکاری ملازمت کے بارے میں بتاتے سنا تھا۔ خیر دین کو اپنی ذات اور زندگی کے اس حوالے پر عجیب فخر تھا، عجیب مان تھا اور ایک نو سال کی بچی کے طور پر بھی چڑیا اس اثاثے کی قدر و قیمت سے واقف تھی جو خیر دین نے اس کی وجہ سے گنوا دیا تھا۔ لیکن زندگی میں اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ خیر دین کا یہ اثاثہ لوٹانے کے لیے کبھی کچھ کر پائے گی۔

کئی سالوں سے خیر دین اپنی دال کی وجہ سے اس سارے علاقے میں مشہور تھا۔ اس کے نام کا حوالہ اس علاقے کی بہترین دال کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی زبان پر تھا۔ ایسی شہرت اس نے ڈی سی ہاؤس میں کام کر کے حاصل نہیں کی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس..... ڈی سی ہاؤس سے نکل آنے کے بعد خیر دین نے زندگی میں بڑی ترقی کی تھی۔ چند سو روپے سے ایک ریڑھی پر شروع ہونے والا بزنس بارہ سالوں میں شہر کے ایک گنجان آباد اور بے حد مہنگے کاروباری علاقے میں ایک دکان میں تبدیل ہو چکا تھا جس کی مالیت تقریباً 50 لاکھ روپے تھی۔ اس کے پاس اپنا ڈبل اسٹوری گھر تھا، گاڑی تھی۔ اس کی دکان پر آنے والے بڑے بڑے لوگوں سے اس کی اچھی سلام دعا تھی۔ ایک دال والا ہونے کے باوجود اس کا اٹھنا بیٹھنا بہت اچھے لوگوں میں تھا لیکن اس کے باوجود چڑیا جانتی تھی کہ خیر دین کی زندگی کا سب سے بڑا رنج اس گھر سے اس بے عزتی کے ساتھ بے دخلی اور اس غیر منصفانہ انداز میں لوکری سے برخاستگی کا تھا جو یک طرفہ شنوائی کے نتیجے کے طور پر کی گئی تھی۔ اسے یقین تھا اس کی طرح اس کے نانائے بھی اپنی زندگی کی ان تمام یادوں پر میٹھل ہلاک لگا دیا تھا۔ کوئی اپنی بے بسی اور ذلت کو اس کو بار بار relive نہیں کرنا چاہتا۔

اور اب اتنے سالوں بعد چڑیا کے فیصلے نے اسے جس طرح ہلایا ہو گا وہ چڑیا کے لیے سمجھنا مشکل

بڑھا دیتا ہے، کمزوری کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔“ خیر دین اپنی 23 سالہ نواسی کے منہ سے وہ باتیں سن رہا تھا جو اس نے اسے نہیں سکھائی تھیں جو زندگی اور تجربے جیسے دو ظالم استادوں کی دین تھیں۔

”میں دھکے کھا رہی ہوں ہاؤس جاب کے دوران topper ہونے کے باوجود..... جن کے پاس اثر رسوخ ہے ان کو ابھی سے جاب سیکورٹی ہے، مجھے نہیں پتا مجھے جاب ملے گی یا نہیں..... جن کے پاس پیسہ ہے وہ ہاؤس جاب کے بغیر ہی ریڈیڈی کے لیے امریکا چلے گئے ہیں یا جا رہے ہیں..... وہاں سے اسپتال ٹرینیشن کریں گے..... پانچ دس سالوں میں واپس آکر اپنی پرائیوٹ پریکٹس کریں گے اور million (لاکھوں) بنائیں گے۔ میں پاکستان میں روڈ ہو کر بغیر سہولتوں والی ایک نوکری کروں گی..... دھکے کھا کھا کر مزید پڑھوں گی..... اور پانچ دس سال کے بعد بھی اسی طرح دھکے کھا رہی ہوں گی۔ میرے پاس باہر کی ڈگری نہیں ہوگی اس لیے مریضوں کو میری اہلیت اور خلوص نیت پر شبہ رہے گا۔ ایمانداری سے زیادہ قابل بھروسہ چیز ان کے لیے امریکا یا برطانیہ سے اسپتال ٹرینیشن ہے۔“ وہ بہت کڑوا سچ بہت مٹھاس کے ساتھ بول رہی تھی۔ نئی نہیں تھی بس حقیقت پسندی تھی اس کی زبان میں۔ وہ اپنے عوام کی نفسیات اور ترجیحات کو خیر دین سے زیادہ اچھی طرح جانتی تھی۔

”میں تمہیں آگے پڑھنے کے لیے باہر بھیجوں گا۔“ خیر دین نے یک دم اسے ٹوک کر کہا۔ وہ ہنس پڑی۔

”آپ کو پتا ہے باہر بھیجنے کے لیے آپ کو مجھ پر کتنا پیسہ لگانا پڑے گا..... لاکھوں میں۔“

”میرے پاس اب لاکھوں ہیں۔“ خیر دین نے بے ساختہ کہا۔

”گھر دکان اور گاڑی کی صورت میں..... بینک بیلنس کی صورت میں نہیں۔“ چڑیا نے کہا۔

”میں سب کچھ بیچ دوں گا تمہارے لیے چڑیا۔“ خیر دین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بے حد جذباتی انداز میں کہا۔ چڑیا کو عجیب تکلیف ہوئی تھی محبت کے اس بے لوث اظہار پر۔

”بس یہی میں اب نہیں چاہتی نانا..... میں اب اس عمر میں آپ کو در بدر نہیں کروں گی..... آپ نے جتنا بوجھ اٹھانا تھا اٹھالیا۔ اب مجھے اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر اپنا بوجھ اٹھانے کی عادت ڈالنے

۲۔“ چڑیا نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

نہیں تھا۔

سالگرہ نمید

”میری زندگی کا خواب تھا کہ تم ایک ڈاکٹر بنو۔“ خیر دین نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا تھا۔ وہ چڑیا کی آنکھوں میں کون سی شے دیکھنے سے گریزاں تھا وہ یہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

”میں نے آپ کا خواب پورا کر دیا۔ ڈاکٹر تو بن چکی ہوں میں۔“ چڑیا نے سنجیدگی اور اطمینان سے کہا۔

”میری خواہش تھی کہ تم انسانیت کی خدمت کرو۔“ خیر دین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا وہ چڑیا کے سامنے کتنا گھسا پٹا جملہ دہرا رہا تھا، وہ جو صدیوں سے اخباروں میں پڑھتا اور لوگوں کی زبان سے سنتا آ رہا تھا۔

”انسانیت کی خدمت صرف ڈاکٹر بن کے ہی تو نہیں ہوتی مجھے لگتا ہے میں سول سروس کے طور پر انسانیت کی زیادہ خدمت کروں گی خاص طور پر اس معاشرے میں۔“ خیر دین جانتا تھا وہ چڑیا کو لا جواب نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے چڑیا کو logic کی ٹھٹی دے کر پالا تھا اور اب وہ اس کے منہ سے logic ہی سن رہا تھا۔

”انسانیت کی خدمت سرکار اور اس کے عہدے داروں کی خدمت سے بہتر ہوتی ہے۔“ پتا نہیں خیر دین کے اندر درد کا کون سا آبلہ پھوٹ کر بہا تھا جس کی ٹیس چڑیا تک بھی نہیں پہنچی تھی۔ اس چھوٹے سے جملے میں خیر دین کی زندگی کا نچوڑ نہیں تھا اس کی درد بھری کٹھن تھی۔ اس کا رنج، تکلیف، اس طبقاتی اور غیر مساواتی نظام کے سامنے اس کی بے بسی اور مایوسی جہاں نچلے طبقے کا کوئی شخص انصاف کے لیے پکار سکتا تھا لیکن حق نہیں لے سکتا تھا۔ اس جملے میں بے بسی اور تذلیل کی جو تاریخ چھپی تھی چڑیا بھی اس کا ایک باب تھی وہ اسے پہچانتی تھی۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں نانا۔“ خیر دین نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اپنی نواسی کو کہتے سنا۔ لیکن سرکار اور حکومتی مشینری میں ہماری نمائندگی ہونی چاہیے تاکہ وہاں بھی ”انسان“ نظر آئیں ”خدا“ نہیں۔“

”ایک فرد پورے نظام کو نہیں بدل سکتا۔“

”پھر ایک پھل پورے جل کو گندہ کرنے کی طاقت کیسے رکھتی ہے؟“

”چیزیں تبدیل کرتے کرتے زندگی گزر جاتی ہے انسان کی۔“

”تبدیلی کا حصہ بن کر زندگی گزارنا اور بہتری کی جدوجہد کرنا ایک معاشرے کی برائیاں گنتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے بیٹھے زندگی گزارنے سے بہتر ہے۔“ ایک عمر میں انسان اپنی ہی سکھائی ہوئی logic سے مار کھاتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے ایک ناہی گرامی پہلوان اپنے اکھاڑے میں اپنے ہی کسی پٹھے سے وہ داؤ کھا کر چلتا ہو جو اسی کا سکھایا ہوا تھا۔

”میں پاور حاصل کرنا چاہتی ہوں کیونکہ اس کے بغیر میں اپنی بقا کی جنگ عزت سے نہیں لڑ سکتی میں نے آپ کے ساتھ رہ کر دیکھا ہے زندگی میں..... اچھا اور شریف انسان ہونا بہت اچھی بات ہے نانا لیکن اچھا اور شریف ہونا ایک اچھی زندگی کی گارنٹی نہیں ہوتا اس معاشرے میں..... یہ خطرات کو

”آپ نے ہی ایک بار کہا تھا، زندگی میں کب اور ایوارڈ کچھ نہیں ہوتے لیکن قابلیت رکھتے ہوئے بھی اُن کو حاصل نہ کرنا بد قسمتی ہے۔ مجھے بھی اب اپنی قسمت آزمانے دیں۔۔۔۔۔ آپ نے مجھے ایک بہت اچھا اور مثبت سوچ والا انسان بنایا ہے۔ میں اس کے لیے آپ کی بہت شکر گزار ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ اب آپ مجھے وہ کام کرنے دیں جو زندگی میں مجھے اور آپ کو بے بس اور مجبور نہیں رہنے دے گا۔“ چڑیا خیر دین سے مشورہ نہیں کر رہی تھی نہ ہی وہ اس سے رائے لے رہی تھی۔ خیر دین چڑیا کو اتنا ضرور جانتا تھا کہ وہ اس کے عزم کو پہچان جاتا جو اس کے لیے میں تھا۔ وہ خیر دین سے بات کرنے سے پہلے اپنے اس فیصلے کے بارے میں بہت غور و خوض کر چکی تھی۔

”اور اگر تمہاری یہ ساری باتیں سننے کے بعد بھی میں یہ نہ چاہوں کہ تم مقابلے کا امتحان دو تو؟“ خیر دین نے یک دم اس سے پوچھا۔

”تو میں نہیں دوں گی۔“ جواب ایک لمحے کے تاثر کے بغیر آیا تھا۔ خیر دین دم بخود ہو گیا تھا۔ وہ چڑیا سے اس جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ چڑیا کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے یقین تھا وہ ویسا ہی کرتی جو وہ اسے کہتا۔ ننھا بگلا پہلی پرواز اس سے سیکھنے کے بعد اب اس سے لمبے سفر پر جانے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ خیر دین کا دل بھر آیا۔ یہ کیسے ممکن تھا وہ چڑیا کی خواہش پوری نہ کرتا وہ اس کی زندگی کا فوکل پوائنٹ تھا۔ خیر دین کی پوری زندگی چڑیا کی خوشی، ناخوشی، پسند، ناپسند سے جڑی ہوئی تھی۔ انہی چیزوں کے گرد گھومتی تھی۔

چڑیا کے طفیل خیر دین کی زندگی میں فخر کے بہت سے لمحے آئے تھے۔ ہر بورڈ کے امتحان میں اخبار میں پوزیشن ہولڈرز کی تصویر خیر دین عجیب فخر اور غرور کے ساتھ اپنی دکان پر آنے والے ہر شخص کو کئی کئی دن دکھاتا رہتا۔ CSS کے امتحان میں ڈاکٹر عکس مراد علی کی پہلی پوزیشن کی خبر والا اخبار خیر دین کی زندگی کا وہ پہلا اخبار تھا جسے پکڑے وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر اور ہلکے ہلکے کر رہا تھا۔ اس نے بھی خواب میں بھی اپنی ننھی چڑیا کا ایسا عروج اور ایسا نصیب نہیں دیکھا تھا۔ اس نے یہ کہاں سوچا تھا کہ اس کی چڑیا ایک دن اس کے نام کا اس قدر معتبر حوالہ بنے گی۔ وہ افسروں کا خدمت گار رہا تھا۔ ساری زندگی افسروں کے لیے کھانے پکاتے، کپڑے استری کرتے، جوتے پالش کرتے گزار دی تھی اس نے اور اس کا خیال تھا اس کا عروج بس وہی تھا۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک لوہاروں کے خاندان سے تعلق رکھنے والا اس جماعت پاس آدمی کیا سوچ سکتا تھا۔۔۔۔۔ اپنی اگلی نسل میں وہ افسر دیکھنا جس کے جوتے سیدھے کرتے ہوئے خیر دین نے عمر گزار دی تھی۔ معجزے سے کم نہیں تھا۔۔۔۔۔ اور معجزے قدرت کی طرف سے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ان میں کبھی کبھی انسانی محنت اور عقل کا نمایاں دخل ہوتا ہے۔

کئی ہفتے خیر دین کی دکان پر مبارک باد دینے کے لیے لوگ آتے رہے تھے۔ چند گھنٹوں میں اس بازار میں خیر دین کا اسٹیشن بدل گیا تھا جہاں اس کی دکان تھی۔ پہلے خیر دین کی ایک لائق نواسی تھی اب خیر دین ایک افسر نواسی کا نانا تھا۔۔۔۔۔ تعارف کا حوالہ بدل گیا تھا۔ خیر دین کو پھر بھی خوشی تھی اور اس کا یہ تعارف گاؤں میں اس کے خاندان تک پہنچ گیا تھا۔

کئی سالوں کے بعد اس کے بھائی اور بھتیجے مبارک باد دینے کے لیے اسے ڈھونڈتے ہوئے اس کی دکان پر پہنچے تھے۔ خیر دین صدیوں سے دم بخود رہ گیا تھا۔ وقت کیسی ظالم شے ہے۔ دنوں کو پلٹاتا ہے تو انسانوں کا اصل دیکھ کر اُن سے گھن کھانے کو جی چاہتا ہے۔ خیر دین کو بھی بہت دیر سمجھ نہیں آئی تھی وہ ان خونی رشتے داروں کے ساتھ کیسے پیش آئے جو سورج مکھی کی طرح اس کے اچھے دن دیکھتے ہی اس کی طرف لوٹ کر آنے لگے تھے۔ اس نے انہیں دکان پر بٹھا کر کھانا کھلایا ان کی مبارک باد وصول کی لیکن انہیں چڑیا سے ملوانے گھر نہیں لے کر گیا۔ گھروں تک لے جانے والی اب کوئی بات رہ ہی نہیں گئی تھی۔

اس رات چڑیا اور خیر دین پھر جاگتے رہے تھے۔ گاؤں میں گزارہ ہوا وہ سارا وقت نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دُہراتے رہے تھے۔ خیر دین نے چڑیا کو اپنے خاندان والوں سے ملنے والی اور بہت سی تکلیفوں اور باتوں کو پہلی بار چڑیا کے ساتھ بانٹا تھا اور ان کاٹوں جیسی باتوں کو دُہراتے ہوئے بار بار رویا تھا۔ چڑیا اسے ٹھیکتی بہلاتی رہی تھی۔ اس کا نانا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بوڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ جلد ہنس پڑتا تھا اور اس سے بھی جلد رو پڑتا تھا۔

”دیکھو چڑیا زندگی میں نام اور رتبہ بہت کم لوگوں کو ملتا ہے لیکن اس سے بھی کم لوگ اس نام اور رتبے کو سنبھال پاتے ہیں۔ رتبہ ملنا اعزاز کی بات ہے لیکن یہی سب سے بڑا امتحان بھی ہے۔“ چڑیا کو سول سروسز اکیڈمی ٹریننگ کے لیے چھوڑنے جانے سے ایک رات پہلے خیر دین نے اسے بہت ساری نصیحتیں کی تھیں۔ چڑیا ہمیشہ کی طرح خیر دین کی باتیں سنتی رہی تھی۔

”یہ جو طاقت اور افسری ہوتی ہے یہ انسان کو اندھا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، عقل والے اچھے انسانوں کو بھی۔۔۔۔۔ تم عاجز رہنا، اپنے ماضی کو بھی مت بھولنا اور اس ملک کی خدمت کرنا۔“ خیر دین بات کرتے کرتے رکاتے ”تم مردوں کے ساتھ اور ان کی طرح کام کرو گی لیکن چڑیا تم مرد مت بن جانا۔ مردوں کی طرح دلیری اور بہادری دکھانا لیکن اپنی فطرت کی نرمی اور نسوانیت کھوئے بغیر عزت اور وقار سے کام کرنا۔ یہ نام و نسب سے زیادہ بڑی چیزیں ہیں۔“ چڑیا سر جھکائے خیر دین کی ایک ایک بات پر سر ہلاتی گئی تھی۔



”آپ کو پتا ہے جاب ملنے کے بعد میں پہلا کام کیا کروں گی؟“ اس کی باتیں سنتے ہوئے چڑیا نے یک دم خیر دین سے پوچھا تھا۔

”کیا؟“ وہ اس سے بات کرتے کرتے چونک گیا۔ وہ بے حد پراسرار انداز میں اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔

”دو کام کرنے ہیں نانا میں نے۔“ خیر دین حیران ہوا تھا۔  
”کون سے دو کام؟“

”وقت آنے پر بتاؤں گی نانا۔“ اس نے بہت عجیب انداز میں خیر دین سے کہا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے خیر دین نے ان تمام ممکنہ کاموں کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی تھی جو چڑیا کر سکتی تھی۔ اس کا ذہن کسی ایسی چیز کے بارے میں نہیں سوچ سکا تھا جس کے بارے میں چڑیا نے کبھی اس سے ذکر کیا تھا۔

چڑیا وہ کام سات سال بعد کر سکتی تھی..... پہلا کام بھی اور دوسرا کام بھی۔ پہلے کام کے لیے اس نے خیر دین سے اجازت لی تھی دوسرے کام کے لیے نہیں۔ وہ چڑیا کی زندگی کی پہلی نافرمانی تھی۔ خیر دین اگر وقت پر اس کے بارے میں جان جاتا تو وہ مرکز بھی چڑیا کو یہ قدم نہ اٹھانے دیتا۔ چڑیا اس سے زیادہ گہری تھی جتنا وہ اسے سمجھتا تھا..... چڑیا اس سے زیادہ ذہین تھی جتنا وہ خیر دین کو ساری زندگی ثابت کرتی رہی تھی..... اور چڑیا اس سے زیادہ شاطر تھی جتنا خیر دین اسے شطرنج کے بورڈ پر مانتا تھا۔



”میں جب بڑی ہو جاؤں گی نانا تو میں ایک کھیل بناؤں گی جیس کی طرح کا..... جس میں سب کوئین کے لیے لڑیں گے اور کوئین ہی بادشاہ ہوگی۔“ سیاہ اسٹاف کار کی کچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے۔ خیر دین نے اس کوئین کو ڈی سی ہاؤس کے وسیع و عریض داخلی گیٹ سے چند قدم آگے دونوں گارڈ پوسٹ کے درمیان کھڑا دیکھا تھا۔ ڈی سی ہاؤس کا گیٹ پورا کھلا ہوا تھا۔ گاڑی ڈی سی ہاؤس سے پہلے آنے والا آخری اسپید بریکر اس کر کے ابھی اس گیٹ کے سامنے آئی تھی۔

عکس مرا علی گھر میں آنے والے اس مہمان کا استقبال وہاں نہیں کر رہی تھی جہاں ڈی سی سب کا کیا کرتا تھا۔ وہ خیر دین کا استقبال وہاں اس دروازے پر کر رہی تھی۔ جس دروازے سے 26 سال پہلے ایک رات ان تینوں کو اٹھا کر باہر پھینکا گیا تھا۔ خیر دین کو یاد تھا اس ڈی سی ہاؤس کے گارڈز اسے گریبان سے پکڑے گھسیٹتے اور دھکے دیتے ہوئے اسی گیٹ کو کھول کر باہر لائے تھے اور باہر کھڑی ایک پولیس موبائل میں ڈال کر لے گئے تھے۔ خیر دین کو یہ بھی یاد تھا اس نے اپنے پیچھے روتے ہوئے بھاگتی چڑیا سے واپس حلیمہ کے پاس جانے کے لیے کہا تھا۔ وہ نو سال کی بچی اس خوف اور سراسیمگی کی حالت میں بھی نانا کے حکم پر رک گئی تھی لیکن خیر دین اس کی پکار کو ساتھ لے کر جیل گیا تھا۔

”میرے نانا کو مت ماریں، میرے نانا کو مت ماریں۔“ کیا ذلت سی ذلت تھی اس جملے میں..... بے بسی کا ایک سمندر تھا..... وہ اس سمندر کے پار آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

خیر دین نے واسکٹ کی جیب سے رومال نکال کر آنکھیں پونچھیں اور سر اٹھا کر فخر سے اسے دیکھا۔

اس کی ہڈیاں اس کھلے گیٹ کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔۔۔۔۔ ویسے ہی مستعد اور مودب گارڈز کے بیچ میں جو گیٹ کے دونوں اطراف میں اب اپنی گارڈ پوسٹ سے باہر تھے۔ ڈرائیور کو جیسے سمجھ نہیں آیا وہ گاڑی آگے بڑھائے یا وہیں روک دے۔ خیر دین جانتا تھا وہ کھلا دروازہ کس بات کا اظہار تھا کس بات کا اعلان کر رہا تھا وہ قلعہ تسخیر کر لیا گیا تھا۔

ڈرائیور کی گاڑی کے رکتے ہی ایک گارڈ نے بڑی مستعدی سے آگے بڑھ کر خیر دین کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔

”آپ جب وہاں آئیں گے تو روئیں گے نہیں.....“ اس نے فون پر خیر دین سے کچھ دیر پہلے کہا تھا۔

”لیکن کہاں بلارہی ہو تم مجھے؟“ خیر دین حیران ہوا تھا۔

”ایک جگہ۔“ ہڈیاں نے اس سے کہا۔

”کھانا کھلانے۔“ خیر دین کو اس کی ٹرانسفر کے بارے میں پتا نہیں تھا نہ ہی یہ پتا تھا کہ وہ آج وہاں آکر چارج لے چکی ہے۔ وہ قریبی شہر میں تھی اکثر اسے گاڑی بھیج کر بلوایا کرتی تھی۔ خیر دین آج بھی یہی سمجھ کر آیا تھا۔ گاڑی اور ڈرائیور دونوں وہ نہیں تھے جو اسے پہلے لینے آیا کرتے تھے۔ وہ پھر بھی نہیں چونکا تھا۔ وہ ڈی سی روڈ پر لیا جانے والا موڑ تھا جس نے خیر دین کو چونکا دیا تھا۔ اس شہر میں اتنے سالوں سے رہنے کے باوجود یہ وہ واحد سڑک تھی جس پر وہ کبھی مجبوری کی حالت میں بھی نہیں آیا تھا۔ اس سڑک پر موجود ایک گھر کے ساتھ اس کی ایسی یادیں وابستہ تھیں کہ وہ اس سڑک پر تھوکتا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے ڈرائیور سے پوچھا تھا۔

”ڈی سی ہاؤس۔“ ڈرائیور نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔ چند لمحوں کے لیے خیر دین کنگ رہ گیا تھا۔ اسے تب بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ وہ وہاں اس گھر کے مالک کے طور پر اسے بلارہی تھی۔ وہ یہی سمجھتا تھا کہ وہ وہاں کسی لٹچ پر آئی تھی۔ وہ خفا ہوا تھا یہ سوچ کر کہ اس نے اس طرح بے خبری میں اسے وہاں بلایا تھا۔

سیاہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ کئی گز دور کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کے چمکدار سیاہ ایلپس میں کٹے ہوئے بال مسلسل چلتی ہوئی نرم ہوا کے جھونکوں سے اس کے ماتھے اور گالوں پر آرہے تھے جنہیں وہ گردن کی ہلکی سی حرکت سے بار بار جھٹک رہی تھی۔ خیر دین کو وہ ایک چھوٹی بچی لگی تھی جو بڑے فخریہ انداز میں اپنے اس پسندیدہ کھلونے کے ساتھ کھڑی تھی جس کو اس نے بڑی محنت اور ضد سے لیا ہو۔

وہ گیٹ سے باہر کھڑا تھا اور کئی گز اندر وہ اس کے بالمقابل کھڑی تھی۔ اسے خیر دین کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کہ وہ وہاں کس حیثیت سے کھڑی تھی۔

پانی کے ایک ریلے نے عکس مراد علی کا چہرہ دھندلا دیا تھا۔ خیر دین نے سر جھکا کر اپنے رومال کے ساتھ اس دھندلاہٹ کو صاف کر کے دوبارہ گردن اوپر اٹھا کر اسے دیکھنا چاہا وہ چند گز کے اس فاصلے کو

سمیٹتے ہوئے اس کے بالکل قریب اس کے سامنے کھڑی تھی یوں کہ خیر دین اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ سکتا تھا پھر اس نے خیر دین کی آنکھوں کی نمی کو بیک وقت اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کی پوروں سے صاف کیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کئی سال پہلے اس گھر کی چھت چڑیا نے بالکل اسی طرح اپنے نانا کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لیا تھا۔ تب خیر دین نہیں رویا تھا نہ ہی اس نے چڑیا کو رونے دیا تھا۔ آج چڑیا نہیں روئی تھی نہ ہی وہ خیر دین کو رونے دے رہی تھی۔ وہ دنیا کا واحد شخص تھا جو اس کے سامنے ٹوٹا تو وہ بھی ٹوٹی اور عکس مراد علی اس گھر اور شہر میں آنے والی پہلی خاتون آفیسر تھی۔ وہ اس گھر کے ماتحت مرد عملے کے سامنے وہ کمزور لمحے نہیں دکھانا چاہتی تھی جو اس کی عدم موجودگی میں اس کا مذاق اڑانے کے لیے استعمال ہوتے۔

خیر دین کی پشت کو تھوڑا سا رگڑتے تھوڑا سا تھکتے ہوئے وہ اس سے الگ ہو گئی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ ڈی سی ہاؤس کے اندر جانے والے اس راستے پر چلنے لگی جو رہائشی عمارت کی طرف جا رہا تھا۔

”یہ تمہارا دوسرا کام تھا جو تم میرے لیے کرنا چاہتی تھیں۔“ خیر دین نے یک دم اس دوسرے کام کو بوجھنے کی غیر متوقع کوشش کی۔ چڑیا نے گردن موڑ کر ساتھ چلتے ہوئے خیر دین کو مسکرا کر دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ خیر دین خیر یہ انداز میں مسکرایا وہ چڑیا کا پہلا کام نہیں بوجھ سکا تھا لیکن دوسرا بوجھ گیا تھا۔ چڑیا ایک بار پھر بہت آرام سے خیر دین کو خوش فہمی کا شکار کر گئی تھی۔

”تمہیں یاد ہے یہاں اس راستے پر میں تمہیں سائیکل پر بٹھا کر اسکول لے کر جایا کرتا تھا۔“ اس ڈرائیوے پر چلتے ہوئے خیر دین کو کیا کیا یاد آنے لگا۔ چڑیا نے اسے بولنے دیا۔ اس شخص نے اپنی جوانی کے پندرہ بہترین سال اس گھر میں گزارے تھے۔ اس کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے اندرونی دروازے کے باہر برآمدے میں لگے اس آئینے کے سامنے آکر رک گئے۔ خیر دین نے آخری بار جب اس آئینے میں اپنا عکس دیکھا تھا تو اس کا لباس..... اس کا چہرہ..... اور اس کا جسم..... اور ان تینوں چیزوں سے بھی بڑھ کر اس کی روح، اس کی زندگی اور اس کے وجود کے پر خچے اڑ گئے تھے..... اب 26 سالوں بعد وہاں اس آئینے کے سامنے کھڑے اپنے آپ کو دیکھنا کیسا صبر آزما کام تھا کوئی اس سے پوچھتا..... لیکن اگر کسی کو یہ پتا ہوتا کہ وہاں اس پر اور اس کے خاندان پر کیا گزری تھی تو کوئی بھی اس سے کچھ بھی نہیں پوچھتا۔

وہ ایک نظر جو اس آئینے کے سامنے سے چیختے چلاتے اس نے اپنے چہرے پر ڈالی تھی..... وہ چند سیکنڈ اس کے اندر سمندر کی کسی شوریدہ سرلہر کی طرح پلٹ کر آئے تھے..... سب کچھ اٹھل پھٹل کرتے..... ایک طوفان تھا جو اس کے اندر آیا تھا اور ایک طوفان تھا جو اس کی آنکھوں میں آیا تھا۔ پانی نہیں تھا وہ جو اس کی آنکھوں سے برس رہا تھا..... پانی ہوتا تو بہہ جاتا..... ہاتھ سے پونچھ لیا جاتا..... وہ تو آبلے تھے جو اس گھر میں داخل ہو کر اس آئینے تک آتے آتے یوں پھوٹے تھے کہ پھوٹتے ہی چلے گئے تھے..... اور کیا کیا تھا جو ان آبلوں سے نہیں بہہ نکلا تھا..... درو کا ایسا سمندر اس کے اندر

نئے سالوں سے یوں قید تھا..... اس کو خود بھی کبھی پتا نہیں چلا تکلیف تو تھی..... اذیت تو تھی..... جس کو اپنے وجود کے اندر مقید کرتے کرتے اس پر خاموشی کے تالے لگاتے لگاتے اس نے بہت سا وقت گزارا ہاتھا..... اور وہ تکلیف وہ اذیت یوں پٹی بڑھی تھی اس کے اندر کہ ایک قطرے سے سمندر ہو گئی تھی۔ وہاں اس گھر کے دروازے پر اس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر رونا خیر دین کی زندگی کی خواہشات میں بھی شامل نہیں تھا۔ اس گھر کو دوبارہ دیکھنا وہاں دوبارہ آنا بھی اس کی زندگی کی خواہشات میں نہیں تھا..... لیکن وقت اسے وہاں لے آیا تھا اور کیسے لے کر آیا تھا..... آبلوں سے رسنے والی اذیت، ذلت، اب تشکر بننے لگا تھا..... عاجزی، احسان مندی، تشکر..... اس کائنات کے حاکم اس ذات کے لیے تشکر اور احسان مندی..... جو دن پلٹا سکتا تھا اور جس نے دن پلٹا دیے تھے۔

زمین پر گھٹنوں کے بل گرتے ہوئے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے خیر دین نے اس گھر کے حاکم کے طور پر پہلا سجدہ کیا تھا..... اور وہ سجدہ بھی ختم نہیں ہوتا اگر چڑیا کا وہ مہربان نرم مضبوط ہاتھ اس کی پشت کو مشفقانہ انداز میں نہ تھکنے لگتا..... اس نے چڑیا کی تمام ہدایات اور نصیحتوں کو یکسر فراموش کر دیا تھا..... چڑیا نے سہارا دے کر اسے اوپر کھینچ لیا تھا۔ ساری زندگی اس ہاتھ نے یہی کیا تھا اس کے لیے..... اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اپنے ساتھ اسے کسی ننھے بچے کی طرح چپکائے وہ دونوں اس گھر کے اندر جا رہے تھے۔ وہ صرف ایک چیز باہر بھول گئے تھے..... بد قسمتی۔

☆☆☆

بد قسمتی..... حماقت..... خوش فہمی..... پتا نہیں کیا چیز تھی جس نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی تھی۔ ایک شیردل نے لاہور ائر پورٹ کے وی آئی پی لاونج میں داخل ہونے سے بھی پہلے بہت دور سے اسے دوسرے ساتھی آفیسرز کے ساتھ خوش گپیاں لگاتے دیکھ کر سوچا تھا۔ وہ سنگاپور روانہ ہونے کے لیے لاہور ائر پورٹ پر اکٹھے ہو رہے تھے۔ آٹھ گھنٹے کے بعد انہیں لاہور سے کراچی پہنچ کر سنگاپور کے لیے روانہ ہونا تھا۔

اپنا ٹرائی بیگ کھینچتے ہوئے ایک شیردل لاونج میں داخل ہو گیا تھا اور اس پر پہلی نظر ڈالنے والی وہی تھی۔ ایک سی گرین سوٹ کے اوپر بیچ کمر کا کوٹ پہنے اور گردن کے گرد ایک ہائل گرین اور بیچ کمر کا پر ہڈ سلک کا اسکارف لپیٹے وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح اسٹائلش تھی۔ اسٹائلش اور اٹریکٹو..... اور شیردل ہمیشہ کی طرح اس سے نظریں نہیں ہٹا پایا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہی گرم جوش، خوب صورت نرم مسکراہٹ جس کے لیے وہ اکیڈمی میں مشہور تھی۔ شیردل کوشش کے باوجود اس مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہیں دے سکا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ عکس مراد علی سے نظریں چرا گیا تھا۔ لاونج میں آگے بڑھتے ہوئے اس نے وہاں بیٹھے دوسرے لوگوں سے ہاتھ ملایا پھر وہ عکس کے پاس آیا تھا۔

”ہمیشہ کی طرح سب سے آخر میں آئے ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے شیردل کو جیسے یاد دلایا۔ وہ ایدی میں ٹریننگ کے دوران ہر فیملی ٹرپ میں سب سے آخر میں پہنچنے والوں میں سے ہوتا تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر اس کے قریب خالی صوفہ پر بیٹھ گیا تھا۔ عکس نے اسے بغور دیکھا اور پھر کہا۔

”خیریت؟“ شیردل نے گردن موڑ کر اس کو دیکھا۔ اس عورت کو جسے وہ زندگی میں سب سے



زیادہ چاہتا تھا جس سے وہ متاثر تھا، مرعوب تھا، fascinated تھا۔ جس سے زیادہ اس نے زندگی میں کسی عورت کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ صوفے پر ایک دوسرے کے برابر بیٹھے وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ بے حد قریب سے۔۔۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے۔۔۔ اور اس دن وہاں بیٹھے ایک شیردل نے پہلی بار اس چہرے کے نقوش میں چڑیا کو کھوجنا شروع کیا۔۔۔ ذہانت سے بھرپور وہ چمکدار کالی گہری آنکھیں۔۔۔ وہ آنکھوں سے آگے کہیں نہیں جاسکا۔ کسی اور مشابہت کی ضرورت ہی نہیں تھی اسے۔۔۔ وہ چڑیا کی آنکھیں تھیں۔ عکس مراد علی آنکھوں کے علاوہ کچھ تھی ہی نہیں۔۔۔ وہ اندھا تھا۔۔۔ شیردل نے اس کے چہرے سے بے اختیار نظریں ہٹائیں اور گردن موڑ کر جیسے اپنے چہرے کو عکس کی نظروں سے بچانے کی کوشش کی۔ وہ چہرہ اسے بار بار کسی سے مشابہت کا احساس دلاتا تھا لیکن وہ کبھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ مشابہت اس کی زندگی کے بھیا نک ترین خواب کے مرکزی کردار سے تھی۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ اس بار اس نے دوبارہ شیردل سے پوچھا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے میں ایک سگریٹ پی کر آتا ہوں۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر یک دم اس کے پاس سے اٹھ گیا تھا۔ عکس نے اسے اسموکنگ ایریا کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ ایک بلو casual چیز اور سفید شرٹ میں تھا۔۔۔ اپنی چیز کی پاکٹس ٹوٹا سگریٹ کا پیکٹ تلاش کرتے ہوئے۔۔۔ عکس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی تھی۔ اس نے زندگی میں کسی کو اس مرد سے زیادہ نہیں چاہا تھا۔۔۔ خیر دین کے بعد۔ اس حقیقت کے باوجود کہ وہ کبھی اس کو حاصل نہیں کر سکتی تھی۔۔۔ وہ اس کے لیے نہیں تھا۔

اس کائناتِ محبت میں ہم مثلِ شمس و قمر کے ہیں  
ایک رابطہ مسلسل ہے ایک فاصلہ مسلسل ہے  
ہم خود کو بچ دیں پھر بھی ہم تجھ کو پا نہیں سکتے  
میں عام سا ہمیشہ ہوں، تو خاص سا مسلسل ہے

لیکن بہت سی چیزوں پر دل کا اختیار نہیں ہوتا۔ وہ ایک شیردل سے 26 سال پہلے ملی تھی اور وہ 26 سال اس سے نہ ملنے کی خواہش رکھنے کے باوجود غیر ارادی طور پر ہر جگہ ہر شخص میں اسے ہی ڈھونڈتی رہی تھی۔ ہر ایک کے لیے لاشعوری طور پر وہ نرم گوشہ رکھتی تھی۔۔۔ ایک سلطان سے ہونے والی طوفانی محبت بھی اس کے نام کی وجہ سے تھی۔۔۔ وہ شعوری طور پر نہ بات ماننے کو تیار نہیں تھی لیکن اس کا لاشعور جانتا تھا وہ ایک کے نام کی طرف کسی مقناطیس کی طرح جالی تھی۔

ایک شیردل اس کا پہلا بیسٹ فرینڈ تھا۔۔۔ بیرونی دنیا میں جھانکنے میں مدد دینے والی وہ کھڑکی جس میں سے دیکھی جانے والی دنیا کو وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ وہ ایک خوف ناک واقعہ رونما نہ ہوا ہوتا تو 26 سال پہلے وہ گرمیوں کی چھٹی کے چند ہفتے اس کی زندگی کی سب سے بہترین چھٹیاں ہوتیں۔ اس نے ایک شیردل کے ساتھ دنیا اور زندگی کے بہت سے حصوں اور چیزوں کو explore کیا تھا۔۔۔ دوستی، ساتھ، وفاداری، بے وفائی، تجدید تعلقات۔۔۔ ایک بچے کے طور پر وہ

ایک کے ساتھ اپنے اس مختصر relationship میں ہر سٹیج سے گزری تھی۔

وہ اسے ایک بار پھر نظر آنے لگا تھا۔ اسی casual انداز میں..... تیز قدم اٹھاتا ہوا..... اس دھیان میں گم..... وہ آج بھی وہاں بیٹھی بہت سی خواتین کی نظروں کو بھٹکانے کا باعث بن رہا تھا۔ وہ اس سے بے خبر تھا۔ عکس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ پتا نہیں کیوں لیکن اسے بھی شیردل کو عورتوں مرکز نگاہ بنتے دیکھ کر حسد نہیں ہوا تھا۔ ہونا چاہیے تھا لیکن نہیں ہوتا تھا۔

وہ دوبارہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا..... دونوں کے درمیان خاموشی تھی..... اور وہ دونوں خاموشی کے عادی نہیں تھے۔

”تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟“ عکس نے بالآخر اس خاموشی کو توڑا۔ شیردل نے کوئی تاویل سوچی لیکن پھر جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔  
”ہاں۔“

”کہو۔“ ایک شیردل نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ شیردل نے یک دم بے حد غیر محسوس انداز میں اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا تھا۔  
”یہ مت کرو چڑیا۔“ اس نے بے حد گہری آواز میں اس سے کہا۔

ندیم

عکس نے گاڑی سے اترتے ہوئے سر اٹھا کر اس آئینے کو دیکھا جو اس گھر کے برآمدے میں دروازے کے پاس رکھا تھا اور جس میں اس وقت شیردل اور شہر بانو کی پشت نظر آرہی تھی ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے وہ کمشنر اور اس کی بیوی کا استقبال کر رہے تھے جن کی گاڑی اس وقت پورچ میں داخل ہوئی برآمدے کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ خود اس کی گاڑی پورچ کی چھت سے باہر تھی۔ وہ وہاں سے اس آئینے کو دیکھ سکتی تھی اور وہ وہاں سے بھی شیردل اور شہر بانو کو بھی دیکھ سکتی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے دل کی دھڑکن پر قابو پایا تھا۔ دوسری گہری سانس میں اس نے اپنے دماغ سے وہ سب غائب کرنے کی کوشش کی تھی جس کی کرچیاں اس گھر کے سامنے بیرونی سڑک پر سامان کے ایک ڈھیر پر اپنی ماں کے ساتھ گزاری ہوئی ایک رات سے یہاں امداد تک چپے چپے پر بکھری ہوئی تھیں۔

سب کچھ غائب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ ایک عام سرکاری رہائش گاہ تھی اب اس کے لیے۔ ایسی درجنوں عمارتوں میں وہ جا چکی تھی رہ چکی تھی۔ اس گھر میں بھی اس کے لیے کچھ غیر معمولی نہیں تھا..... ایک عام پرانی لیکن شاندار عمارت۔۔۔ ویسی ہی ایک تقریب جو وہ کئی دفعہ اٹینڈ کرتی آئی تھی۔ ایک پرانی طرز کا پورچ اور داخلی دروازے کے پاس ایک پرانا آئینہ..... ایک سرسری نگاہ میں اس مینٹل بلاک کے ساتھ اس نے صرف یہ دیکھا تھا..... کسی بھی چیز پر نظر جمائے بغیر ہر چیز سے نظریں چراتے ہوئے۔ لوگ..... جگہ نہیں..... باتیں..... چیزیں نہیں..... میں کوئی تکلیف وہ یاد ذہن میں نہیں لاؤں گی۔ میں ماضی کی کسی چیز کے بارے میں سوچ ہی نہیں رہی۔ میرا کل کا ورک شیڈول کیا ہے؟ یہاں سے ڈنر کے بعد کیا کیا کام کرنے ہیں مجھے۔؟ وہ اپنے ذہن کو مسلسل بھٹکا رہی تھی، بڑی کامیابی کے ساتھ۔ ایک کے بعد ایک رکاوٹ کو عبور کر رہی تھی، جب تک اس نے شہر بانو اور شیردل کو اکٹھا نہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ شہر بانو کو تصویروں میں دیکھ چکی تھی۔ وہ اسے چند فنکشنز میں شیردل کے ساتھ دور سے دیکھ چکی تھی لیکن وہ آج پہلی بار اسے اتنے قریب سے دیکھنے والی تھی، اس سے ملنے والی تھی..... اس بار بی ڈول سے جو اس کے بچپن کی چند facinations میں سے ایک تھی اور جو اس کی زندگی میں سیاہ ترین باب کا اضافہ کرنے والے شخص سے شلک تھی..... اور جو اس شخص کی زندگی کا حصہ تھی جس سے اس نے شدید محبت کی تھی۔

آئینے میں نظر آتے اس عکس سے نظریں ہٹاتے ہوئے عکس مراد علی نے جیسے خود کو سنبھالنے کی ایک اور

کوشش کرتے ہوئے لمبے بھر کے لیے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا جہاں سے ہلکی ہلکی یوندا باندی ہو رہی تھی..... وہ برسات جو اس کی آنکھوں سے نہیں برس پارہی تھی وہ کہیں اور سے برسات شروع ہو گئی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے کچھ بات کرنے کی کوشش کی تھی جو اس کے لیے دروازہ کھولنے کے لیے باہر آیا تھا۔ خود کو سنبھالنے کے لیے وہ ہر چیز کا سہارا لے رہی تھی۔

پانی کی ہلکی سی پھوار نے اس کے چہرے، بالوں اور لباس کو ذرا سا نم کیا اور برآمدے میں کمشنر اور اس کی بیوی کا استقبال کرتے ہوئے شیردل نے بالکل اس لمحے گردن موڑ کر اس کو دیکھا تھا۔ وہ سیاہ موتیوں سے انجم ایئر ڈیٹ ایک فٹنگ والا سیاہ شیفون کا لباس پہنے ہوئے تھی جو اس کے متناسب جسم کو کچھ اور بھی متناسب کر رہا تھا۔ عام طور پر کھلے رہنے والے گھنے سیاہ بال اس وقت ایک سیاہ نیٹ میں ڈھیلے جوڑے کی شکل میں اس کی گردن کے پیچھے سمٹے اس کی پتلی اور لمبی گردن کو نمایاں کیے ہوئے تھے۔ دائیں کندھے پر اسٹول کی شکل میں نشہ شدہ دوپٹا ڈالے وہ بانیں ہاتھ میں ایک بہت چھوٹا اور خوب صورت سیاہ پرس پکڑے ہوئے تھی۔ شیردل نے اس سے نظریں ہٹائیں۔ مشکل کام تھا یہ اور اس نے مشکل سے ہی کیا تھا۔ وہ کمشنر اور ان کی فیملی کے ساتھ آئی تھی۔ کمشنر اور ان کی بیوی گاڑی سے اتر کر اندر جانے کے بجائے چند لمحوں کے لیے وہیں برآمدے میں رک گئے تھے۔ کمشنر کا استقبال کرنے کے بعد شیردل برآمدے سے نکل کر اس کی گاڑی کی طرف بڑھ آیا تھا۔ عکس کی طرف جاتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اس نے اپنی جیب میں پڑاٹھو پیر ٹولا تھا۔ اس کی یہ بے اختیاری شہر بانو نے نوٹس کی تھی جس کے برابر سے وہ یک دم ہٹا تھا۔ اس نے کمشنر کی گاڑی کے پورچ سے ہٹ جانے اور عکس کی گاڑی کے آگے آنے کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔ وہ یہ نہیں دیکھ پائی تھی کہ عکس کے گاڑی سے نکل آنے پر وہ اس کا استقبال کرنے چلا گیا تھا۔ وہ دور جاتے شیردل سے نظریں ہٹانا چاہتی تھی لیکن وہ ہٹا نہیں پائی تھی۔ کمشنر کی بیوی سے بات کرتے ہوئے بھی وہ عجیب بے چین انداز میں شیردل کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اس گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھتی رہی تھی جہاں اس کی طرف پشت کیے ڈرائیور سے بات کرتے ہوئے عکس مراد علی کو اس نے ایک عجیب سے اضطراب کے ساتھ دیکھا تھا۔

ڈرائیور سے بات کرتے ہوئے عکس جب تک پلٹی شیردل اس کے سامنے کھڑا تھا۔ دونوں بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ عکس نے اس سے نظر چرائی..... خود کو سنبھالا..... پھر اسے دیکھا..... وہ بہت بار ایک دوسرے کے اتنے ہی قریب آ کر کھڑے ہو چکے تھے..... بہت بار ایک دوسرے کے بالمقابل اتنے ہی فاصلے پر کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں یونہی جھانکتے بھی رہے تھے..... اور عکس مراد علی نے کبھی ان آنکھوں میں پہچان کی کوئی جھلک نہیں دیکھی تھی..... نہ چڑیا کے لیے..... نہ اس سترہ سالہ عکس مراد علی کے لیے جو ایک انٹر کالجیٹ کے مقابلے میں ایک شیردل کا نام ہی سن کر بدگ گئی تھی۔ جس نے اپنے کیریئر کے بدترین تقریری مقابلے میں اسٹیج پر رومنزم کے پیچھے کھڑے ایک ایک لمحہ اس خوف میں گزارا تھا کہ وہ ابھی..... ابھی چڑیا کو پہچان لے گا..... اور وہ یہ کیوں نہ سوچتی کہ وہ اسے پہچان لے گا۔ چڑیا کی زندگی کے آٹھ سال ایک شیردل کے بارے میں سوچتے گزرے تھے۔ آٹھ سال گزر جانے کے بعد بھی اگر کوئی اس سے ایک کا حلیہ پوچھتا تو وہ سیکنڈز میں اس کے حلیے کی ڈنیل بتا دیتی۔ اس کے نین نقش سے لے کر اس کے زیر استعمال اسٹیکر ز اور اسپورٹس ویئر کے

لیبلز اور برانڈز تک اسے یاد تھے۔ وہ ایک کے ساتھ گزارے ہوئے ان چند ہفتوں کو اپنے ذہن کی ڈائری کی انٹریز کی طرح پڑھ سکتی تھی..... ایک کا ایک ایک جملہ..... ایک ایک بات..... پھر اگر وہ یہ سوچ رہی تھی کہ وہ بھی ایک کو اسی طرح یاد ہوگی تو یہ زیادہ بڑی خوش فہمی نہیں تھی۔ آٹھ سال اتنا طویل عرصہ نہیں ہوتا کہ ایک اس کے چہرے کے نقوش میں کوئی یاد کھوج نہیں پاتا..... لیکن ایک شیردل اسے نہیں پہچانتا تھا۔ وہ نام سے اسے نہیں پہچان سکتا تھا کیونکہ خیر دین اسے چڑیا کہتا تھا یا پھر فاطمہ..... اس کے نام کا دوسرا حصہ جس سے وہ چڑیا کے بعد جانی اور پہچانی جاتی تھی..... عکس کے نام سے وہ اسکول کے علاوہ اور کہیں نہیں پکاری جاتی تھی۔ نہ گھر میں نہ خاندان میں..... فاطمہ اس کے نام کا وہ حصہ تھا جس کا اضافہ اس کی پیدائش کے بعد اس کے خاندان کے افراد نے عکس نام سے اسے پکارنے میں وقت کے بعد کیا گیا تھا۔ خیر دین نے اس کا نام بڑے شوق سے رکھا تھا لیکن چند ہفتوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نام کو اس کے خاندان اور گاؤں والے کبھی بھی صحیح تلفظ سے ادا نہیں کر سکتے تھے۔ خیر دین نے چڑیا کا نام نہیں بدلا صرف اس میں فاطمہ کا اضافہ کر دیا لیکن وہ اسکول، کالج میں عکس مراد علی کے طور پر ہی جانی جاتی رہی۔ ایک بھی خیر دین کی طرح اسے عکس یا فاطمہ کے بجائے چڑیا ہی کہتا رہا تھا۔ چڑیا کو پھر بھی خوش فہمی تھی وہ عکس کا لفظ سنتے ہی چڑیا تک پہنچ جائے گا، وہ اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی اسے پہچاننے لگے گا۔ یہ پہچان چڑیا کو کبھی خوف زدہ نہ کرتی اگر اس رات اس نے ایک کو وہاں ریلنگ کے پاس کھڑے چلائے نہ دیکھ لیا ہوتا۔ خوف اور دہشت کے عالم میں بھی ایک کے سامنے بے لباسی کا احساس چڑیا کو گاڑ دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کی چیخوں نے چڑیا کی جان بچائی تھی مگر ان آٹھ سالوں میں بہت بار چڑیا اس ایک نظر سے نادم رہی جو اس نے ایک کو خود پر ڈالتے دیکھی تھی..... وہ جس حالت میں ایک کے سامنے آئی تھی وہ اس حالت میں کبھی بھی اس کے سامنے آنا نہیں چاہتی تھی۔ اور اسے جیسے خوف بھی یہی تھا کہ وہ اسے پہچانے گا تو اس بے لباسی کے حوالے سے اس ایک رات کے حوالے سے پہچانے گا..... ان چند شاندار ہفتوں میں اکٹھے گزارے ہوئے یادگار وقت کے حوالے سے نہیں۔

اس تقریری مقابلے کے بعد بھی اسے یقین تھا ایک کو اگر فوری طور پر وہ یاد نہیں آئی ہوگی تو گھر جا کر یاد آجاتی..... چند دنوں کے بعد یاد آجاتی..... اور کچھ نہیں تو کم از کم چڑیا کا چہرہ اس کی نظروں میں بھی اٹک جاتا۔ اس کی یہ خوش فہمی اکیڈمی میں دور ہو گئی تھی۔ عکس مراد علی کے حوالے سے ایک شیردل کی کسی قسم کی کوئی یادداشت نہیں تھی..... اسے شروع میں یقین نہیں آیا کہ وہ واقعی اسے یاد نہیں تھی۔ کئی ہفتے وہ اسے انور کرتی رہی صرف اسی ایک خدشے کے تحت کہ وہ اب اسے ضرور پہچان لے گا..... اگر چڑیا کا چہرہ نہ پہچان سکا تو کم از کم سات آٹھ سال پہلے ہونے والے اس تقریری مقابلے کی تو کوئی میموری ہوگی اس کے پاس.....

اور جب عکس مراد علی کو بالآخر یہ یقین آیا کہ ایک شیردل کو اس کے حوالے سے ”کچھ بھی“ یاد نہیں تھا تو وہ ہل کر رہ گئی تھی..... شاک کی ایک عجیب سی کیفیت تھی جس سے وہ دوچار ہوئی تھی۔ ایک شیردل کمزور یادداشت کا مالک نہیں تھا کم از کم عکس کو اس حوالے سے کوئی ابہام نہیں تھا اس کے باوجود اس کا یاد نہ رہنا صرف ایک چیز کا اظہار تھا..... چڑیا ایک کے لیے ناٹم پاس تھی..... وہ اس کے لیے وہ اہمیت نہیں رکھتی تھی جو ایک اس کے لیے رکھتا تھا..... اور کیوں اہمیت رکھتی آخر وہ ایلٹ کلاس سے تعلق رکھنے والے ایک کم عمر بچے کے لیے جس کے

شیردل سے زیادہ خوش لباس مرد نہیں دیکھا۔

عکس نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ ستائشی نظروں سے شیردل کو دیکھا ہوا کے ایک جھونکے نے شیردل کی ٹائی کو اڑایا۔ عکس کی نظر بھٹکی، اس کی ٹائی کو اڑنے سے روک دینے کی خواہش کو اس نے اتنی ہی بے اختیاری کے ساتھ دیا جس طرح وہ ابھری تھی۔

دونوں کے درمیان اب خیر مقدی کلمات کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ وہی رکی جملے..... اور وہی ان کہے مقہوم..... وہ ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بات کر رہا تھا اور وہ کبھی بھی اس کے چہرے سے اس کے دل تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ وہ اسے راستے میں ہی بھٹکا دیتی تھی..... ہمیشہ بڑی کامیابی کے ساتھ..... عکس نے سوچا اس کے چہرے پر نظریں جمائے شیردل کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ اس کے چہرے پر موجود کون سی شکلیں کو ماند کر رہی تھی۔ اس کے کانوں کی لوؤں میں دھکتے سفید موتیوں کے studs اس کی شفاف چمکدار سیاہ آنی لائزر سے بھی آنکھوں کو یا سرخ لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں سے جھلکتی دودھیادانتوں کی قطار کو جو اس کی مسکراہٹ کو اور بھی دلکش کر رہی تھی۔ بارش کی پھوار کے ننھے ننھے قطرے اس کے قطروں کی طرح اس کے بالوں اور چہرے پر چمک رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے شیردل کا دل چاہا وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے صاف کر دے..... صرف ایک لمحے کے لیے..... پھر اس نے نظر جھرائی تھی..... جیب سے ایک ٹشو نکال کر غیر محسوس انداز میں عکس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

”تم نے بڑا رسک لیا۔“ عکس نے وہ ٹشو تھام کر اسی غیر محسوس انداز میں اپنا چہرہ اور سر تھپتھپاتے ہوئے کچھ حیرانی سے اس سے پوچھا۔

”کیا؟“ وہ دونوں اب ساتھ چل رہے تھے۔

”بارش میں گاڑی سے نکل آئیں۔“ قدم بڑھاتے ہوئے شیردل نے اس سے کچھ سنجیدگی سے کہا۔

”تو؟“ وہ الجھی۔

”اگر میک اپ بہہ جاتا تو؟“ اس بار شیردل کے ہونٹوں اور آنکھوں میں شرارت لہرائی تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ایک سیاہ آنی لائزر اور لپ اسٹک کے علاوہ شاید ہی کچھ اور لگائے ہوئے تھی۔

”ہاں رسک تو تھا۔ میک اپ صاف ہو جاتا تو تم اس سے زیادہ گھورٹے مجھے..... جتنا ابھی گھور رہے تھے۔“ عکس نے ہاتھ میں پکڑے ٹشو کو بڑی نفاست سے لپیٹ کر پرس میں بے نیازی سے رکھتے ہوئے کہا۔

جواب بھی دیا ہی آیا تھا جیسا سوال کیا گیا تھا۔ اسے دیکھے بغیر شیردل نے بے اختیار سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ چھپائی۔ وہ اس کی اس حس مزاح کی عادی تھی۔ اسے دیکھ کر شیردل کے لیے خاموش رہنا اور کسی نہ کسی بات پر کوئی نہ کوئی پھڑکتا ہوا تبصرہ نہ کرنا ناممکن تھا۔ وہ بچپن سے اس کی عادی تھی۔ ایک شیردل کے پاس بچپن میں بھی احمقانہ باتوں کا ڈھیر ہوتا تھا اور ڈھیر کا مطلب ڈھیر ہی ہوتا تھا اور وہ ہر احمقانہ بات بے حد سنجیدگی سے کرتا تھا۔ چڑیا اس کے ان چند قریبی ساتھیوں میں سے ایک ثابت ہوئی تھی جو بہت جلد ہی یہ سمجھ گئی تھی کہ وہ ساری باتیں کم از کم ایک کے لیے احمقانہ نہیں تھیں۔ وہ انہیں بڑی سنجیدگی سے کرتا تھا.....

اور چڑیا دوسرے بچوں کے برعکس بڑی سنجیدگی سے انہیں سن لیا کرتی تھی..... اس کی یہ عادت اب بھی قائم

پاس کزنز اور دوستوں کا ایک جرم غیر تھا جو اسی کی طرح کے سوٹل سیٹ آپ سے تعلق رکھتے تھے۔ چڑیا ایک چھوٹے شہر میں آکر بوریت سے بچنے کے لیے ڈھونڈی جانے والی ایک ساتھی ہو سکتی تھی لیکن وہ اس کی وہ دوست نہیں ہو سکتی تھی جسے اس نے واپس اپنی سن اپنے جیسے دوستوں میں جا کر مس کیا ہو..... وہ چڑیا کے بچپن کی بہترین چیزوں میں سے ایک تھا لیکن چڑیا ایک کے لیے ایک بہترین یاد کیسے ہو سکتی تھی۔ بڑے سالوں بعد عکس مراد علی نے بیٹھ کر جذباتیت کی گرد جھاڑ کر اپنے اور ایک کے تعلق کو دیکھا تھا اور عجیب سی ندامت اور رنجیدگی ہوئی تھی اسے۔

ایک شیردل، عکس مراد علی کو اس تقریری مقابلے کے حوالے سے بھی یاد نہیں رکھ پایا تھا..... اسے اپنی شکل و صورت کے حوالے سے کوئی خوش فہمی کبھی نہیں رہی تھی لیکن وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ مرد اسے ان گور نہیں کر سکتے... وہ کم از کم اتنے معمولی خدو خال کی مالک نہیں تھی کہ ایک اسے یاد بھی نہ رکھتا..... اور یہاں اسے اہم سمجھنے کا سوال بھی نہیں تھا یہاں بات صرف یاد رکھنے کی تھی..... صرف اور صرف یادداشت کا حصہ رکھنے کی..... عکس مراد علی وہ بھی نہیں تھی۔

”زندگی میں ہارنے والوں کو بہت کم لوگ یاد رکھتے ہیں..... ہار انسان کے غیر معمولی چہرے کو بھی معمولی بنا دیتی ہے اور جیت معمولی شکل کو غیر معمولی۔“ عکس مراد علی نے اس جملے کو خیر دین سے حل کروانے کی کوشش کی تھی۔

”میرے ساتھ اکیڈمی میں ایک لڑکا ہے نانا..... سات آٹھ سال پہلے ایک انٹر کالجیٹ مقابلے میں اس نے مجھے ہرا کر وہ مقابلہ جیتا تھا لیکن میں حیران ہوں کہ اسے میں یاد تک نہیں حالانکہ وہ مجھے یاد ہے۔“ اس نے خیر دین کو ایک شیردل کا نام لیے بغیر اپنا مسئلہ بتایا۔ ”مجھے لگتا ہے وہ دکھاوا کر رہا ہے مجھے نہ پہچاننے کا ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے میں یاد ہی نہ ہوں۔“ عکس نے اپنا اندازہ بھی اس کے ساتھ شیر کیا۔

”لوگ ہارنے والوں کے چہروں اور ناموں پر غور نہیں کرتے چڑیا۔ تم نے تو دوسری، تیسری پوزیشن بھی نہیں لی اس مقابلے میں..... پھر تمہیں وہ کس حوالے سے یاد رکھتا..... ہارنے والے تو بہت سے ہوتے ہیں۔“ کیا تلخ حقیقت تھی جو خیر دین نے مصری کی ڈلی کی طرح توڑ کر چڑیا کے سامنے رکھ دی تھی۔ ایک شیر دل عام شخص تھا اس کی نفسیات بھی عام شخص جیسی ہی تھی..... جیت اور جیتنے والوں کو یاد رکھنے کی کوشش..... ہار اور ہارنے والوں کو بھول جانے کی..... وہ اوپر دیکھنے کا عادی تھا نیچے نہیں۔

زندگی میں ایک اور سبق عکس مراد علی نے اس دن حاصل کیا تھا۔ وہ زندگی میں ان تمام لوگوں کے چہروں اور ناموں پر بھی غور کرے گی جنہیں وہ زندگی میں ہرائے گی۔ وہ زندگی میں خود کبھی عکس مراد علی جیسے حریف کا سامنا نہیں چاہتی تھی جو یک دم کسی dark horse کی طرح ایک دن اس کے سامنے آکر کھڑا ہو جائے اور اسے اس کے بارے میں کچھ بھی پتا نہ ہوتا۔

بلیک ڈنر سوٹ کے ساتھ ایک سرخ striped ٹائی لگائے، سلور کف لنکس اور ٹائی پر ایک کرٹل کی ٹائی پن لگائے وہ اپنے اس طے میں اس کے سامنے کھڑا تھا جو اس کی ایک بڑی شہرت تھی۔ اکیڈمی میں کوئی اور کامرانی ڈرینگ سینس میں شیردل کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ عکس مراد علی نے اتنے سالوں کی سروس میں بھی

تھی۔

وہ اب باقی لوگوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ شیردل اسے جواباً کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کمشنر کی بیوی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے شہر بانو عکس کے استقبال کے لیے کچھ آگے بڑھ آئی تھی۔ دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

”شہر بانو..... عکس مراد علی۔“ چند لفظوں میں شیردل نے باری باری دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کروایا۔ دونوں ناموں کے ساتھ کوئی سیاق و سباق نہیں تھا پھر بھی دونوں ایک دوسرے کو اس سے کہیں زیادہ جانتی تھیں جتنا شیردل نے ان کا تعارف کروایا تھا۔ سفید شیٹوں کے کلیوں والے کرتے اور چوڑی دار پا جاے میں شہر بانو ایک باری ڈول لگ رہی تھی۔ عکس اس کے لیے کوئی اور تشبیہ نہیں ڈھونڈ سکی تھی۔ وہ آج بھی اس کی باری ڈول تھی۔ ڈاکٹر فرح کی بیٹی کے پاس موجود وہ گڑیا جو اسے ہمیشہ لپٹایا کرتی تھی اور اس جیسی گڑیا خریدنے کے لیے اس نے خیر دین سے بہت اصرار کیا تھا۔

خیر دین اسے لے کر بازاروں میں کھلونوں کی دکانوں پر باری ڈول کی تلاش میں پھرتا رہا تھا۔ جو سستی نقل دکانوں پر مل رہی تھی وہ چڑیا کو پسند نہیں آ رہی تھی وہ اصل اور نقل کا فرق بتا نہیں سکتی تھی لیکن مجھتی ضرور تھی اور جو اصلی باری ڈول اسے چند دکانوں میں نظر آئی تھی اس کی قیمت اتنی تھی کہ خیر دین اسے چڑیا کو دکھا سکتا تھا دلوا نہیں سکتا تھا۔ کئی دن بازاروں کی خاک چھاننے کے بعد بالآخر چڑیا کو پتا چل گیا تھا کہ باری ڈول اس کی استطاعت اور اوقات سے باہر کی چیز تھی اور اس کے لیے ضدیا اصرار کرنا خیر دین کو تکلیف اور شرمندگی کے سوا کچھ نہ دیتا۔ اس نے باری ڈول کی فرمائش ختم کر دی تھی مگر وہ اس کے حواس پر سوار رہی تھی۔ تین سالہ شہر بانو پر پہلی نظر میں بھی اسے خوب صورت ایوننگ گاؤن والی وہ باری ڈول ہی یاد آئی تھی۔ اس کے صرف بال شہری نہیں تھے مگر اس کی خوب صورتی، ناز و نحر، لباس سب اسی باری ڈول جیسا تھا جو اس کے لیے untouchable تھی۔

اسنے سالوں بعد شہر بانو کو دیکھتے ہوئے عکس مراد علی کو آج بھی باری ڈول ہی یاد آئی تھی۔ دودھیا رنگت، سیاہ لمبی خمدار آنکھیں، منھ کی نوک والی ٹیکھی ناک اور بے حد باریک مسکراتے ہونٹ..... عکس کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی تھی اسے دیکھ کر..... اسے آج بھی اس پر ویسا ہی پیار آیا تھا جیسا اس کو پہلی بار دیکھ کر آیا تھا۔ اس کا دل آج بھی اس کی طرف..... اسی طرح ہمکا تھا جس طرح پہلی بار اسے دیکھ کر ہمک کر اس کی طرف گیا تھا۔ شیردل کو اس سے زیادہ پرفیکٹ لڑکی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ واقعی صرف شیردل کے ساتھ جیتی تھی۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے عکس نے سوچا تھا۔ شیردل کے ذہن میں سب سے پہلے شہر بانو کے حوالے سے اس طرح کا خیال ڈالنے والی بھی وہی تھی۔

”میرا خیال ہے وہ تم سے محبت کرتی ہے۔“ اس نے فون پر شیردل سے شہر بانو کے حوالے سے کوئی قصہ سننے کے بعد کہا تھا۔ وہ جواباً ہنستا تھا۔

”یہ کون سی نئی بات ہے جو تم مجھے بتا رہی ہو، میں جانتا ہوں وہ مجھ سے محبت کرتی ہے..... مجھ پر مروتی ہے۔“ اس نے آخری جملہ بڑے اعتماد سے بڑے جتانے والے انداز میں کہا تھا۔ ”کوئی پہلی لڑکی تو نہیں ہے وہ جسے مجھ سے محبت ہوگئی ہو.....“

عکس

مسٹر شیخ چلی اگر تم شیخیاں بگھارنا بند کرو تو میں کچھ کہوں۔“ عکس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اسے ٹوکا۔ ”تم سے زندگی میں پہلی بار کوئی اچھی لڑکی محبت کر رہی ہے۔“

”Now that,s not fair“ شیردل نے اس کی بات کاٹ کر احتجاج کیا۔ ”تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو..... تمہیں کیا پتا مجھ پر کون کون کرتا.....“ عکس نے اس کی بات کاٹی۔

”تم تقریر کرنے کے بجائے ان لڑکیوں کے ناموں کی ایک لسٹ بنا لو جو تم پر مرنے کا شرف حاصل کر چکی ہیں..... ہو سکے تو تصویریں بھی لگالینا ساتھ..... تصویریں تو ہوں گی تاہر لڑکی کی تمہارے پاس؟ عکس نے اسے بظاہر بڑی سنجیدگی سے مشورہ دیتے ہوئے کہا یوں جیسے دونوں اکیڈمی میں کوئی سینڈویچ رپورٹ تیار کرنے کے بارے میں suggestion پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔

”ہر لڑکی کی تصویر ہے میرے پاس سوائے تمہارے۔“ شیردل نے ترکی بہ ترکی کہا۔

”میں تو اس کیلگری میں ویسے ہی نہیں آتی کیونکہ نہ میں تم پر مروتی ہوں، نہ تمہارے ساتھ جی سکتی ہوں۔“ عکس نے بھی اسی انداز میں کہا۔ ”تو اس لیے میں تو تمہاری سوسائز کو لیکشن کا حصہ بن ہی نہیں سکتی..... ویسے ہم شہر بانو کی طرح بات کر رہے تھے۔“ عکس نے بات کے اختتام پر اسے پھر شہر بانو یا دولائی۔

”میں تو مروتا ہوں نا تم پر۔“ شیردل ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔

”تم کس لڑکی پر نہیں مروتے شیردل۔“ عکس نے ٹس کر کہا۔ وہ بھی ہنس دیا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”شہر بانو پر غور کرو..... پرفیکٹ میچ ہے وہ تمہارا۔“ عکس گھوم پھر کر ایک بار پھر اسی موضوع پر آ گئی۔

”تمہیں میری اور شہر بانو کی match making میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟“ شیردل نے یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”جب تمہیں مجھ میں دلچسپی نہیں ہے تو leave it..... میں جس سے چاہے شادی کروں تمہیں کیا.....؟ شیردل نے اسی انداز میں کہا۔

”میں چاہتی ہوں تمہیں کوئی تمہارے جیسی نہ مل جائے۔“ عکس نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ”تم دوست ہو..... اتنی پروا تو ہے مجھے تمہاری کہ میں تمہیں کسی کنویں میں نہ کودنے دوں۔“

”نہیں، نہیں تم مجھے کودنے دو کنویں میں..... تم ٹینشن مت لو۔“ اس نے اطمینان سے کہا عکس کو ہنسی آ گئی۔

”میں تم سے کیا کہہ رہا تھا؟“ شیردل نے موضوع یاد کرنے کی کوشش کی۔

”تم مجھ سے شہر بانو کی بات کر رہے تھے۔“ عکس بات کو پھر وہیں لے آئی..... شہر بانو کی طرف بڑھتے ہوئے عکس کو پتا نہیں کیا کیا یاد آ رہا تھا لیکن ان تمام یادوں میں کوئی تلخ یاد نہیں تھی وہ سب کچھ جیسے فلٹر کرتی جا رہی تھی۔

شہر بانو نے اس سے پہلے عکس مراد علی کا نام سنا تھا یا اس کو شیردل کے گروپ فوٹو گرافس میں دیکھا تھا۔ جہاں وہ لاکھ غور کرنے کے باوجود بھی اس کی شکل و صورت اور حلیے میں وہ خاص چیز کھوجنے میں ناکام رہی تھی جو اس کے ذہن میں کسی اندیشے یا خدشے کو جنم دیتی لیکن آج اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی وہ عکس مراد علی سے جڑی طرح خائف ہوئی..... کیوں ہوئی؟ یہ اسے کئی دن سمجھ نہیں آیا..... نہ اسے شیردل سے کوئی خدشہ تھا نہ عکس مراد علی اس حسن و جمال کی مالک تھی جس سے اسے کوئی احساس کمتری ہونے لگتا لیکن اس کے باوجود

کے طور پر تو یہ کچھ مشکل بات ہی نہیں تھی۔

ان دونوں کے درمیان چند اور جملوں کا تبادلہ ہوا تھا ساتھ چلتے ہوئے..... موسم کے بارے میں..... مہمانوں کے بارے میں..... ڈنر کے بارے میں اور پھر عکس اس کے ساتھ اس ہال کمرے میں داخل ہو گئی تھی جہاں ڈنر کا انتظام تھا۔

اس ہال کمرے میں بیٹھ کر اس رات اس نے گزرے ہوئے کل کی ساری یادوں، ساری آوازوں سے خود کو shut off کر لیا تھا بالکل اسی طرح جیسے سڑک پر خیر دین کے پھلوں کی ریڑھی پر بیٹھی اسکول سے ملنے والا ہوم ورک کرتے ہوئے وہ سڑک پر سے گزرنے والے ٹریفک کے بے ہنگم شور سے خود کو کاٹ لیا کرتی تھی۔

لوگوں کے جھوم کے بیچ بیٹھ کر عکس مراد علی نے اپنے آپ پر اپنی زندگی پر اپنی زندگی میں آنے والی تکلیفوں پر کبھی ماتم نہیں کیا تھا..... کبھی خود پر ترس کھاتے ہوئے خود کو دوسروں سے کمتر اور دوسروں کو برتر نہیں سمجھا تھا۔ خیر دین نے اسے زہر کے گھونٹ پیتے ہوئے بھی جینا اور مسکراتے ہوئے جینا سکھایا تھا اور اس ہال میں اتنے سالوں کے بعد بیٹھے ہوئے وہ زندگی کے زہر آلود حصوں کو چھوئے بغیر گزر رہی تھی..... اور وہ گزر گئی تھی۔

☆☆☆

”تم یہ کیوں کرنا چاہتی ہو؟“ خیر دین نے بے حد حیرانی سے عکس کا چہرہ دیکھا تھا۔ بیرون ملک اپنی ڈگری مکمل کرنے کے بعد وہ چند ہفتے پہلے پاکستان آئی تھی اور اس کی پر مشن ہوئی تھی اور پر مشن کے بعد اس نے آج خیر دین سے جو بات کی تھی اس نے خیر دین کو حیران کر دیا تھا۔ وہ خیر دین کی زمین واپس لینے کے لیے کیس کرنا چاہتی تھی۔ وہ زمین جس کو خیر دین کبھی نہیں بھولا تھا لیکن ہمیشہ بھولنے کی کوشش کرتا رہا تھا..... لیکن رزق حلال پر ڈالا ہوا ڈاکا کسی انسان کو نہیں بھولتا..... خیر دین نے بھی وہ زمین نہیں اپنی ساری زندگی محنت سے کمایا اور بچایا ہوا رزق حلال گنویا تھا..... وہ بھی تب جب وہ پائی پائی کا محتاج تھا..... اور آج اتنے سالوں بعد وہ عجیب اچھے والی بات کر رہی تھی..... اتنے سالوں سے جاب میں آنے کے بعد وہ ایک بار بھی گاؤں نہیں گئی تھی۔ خیر دین اب گاؤں آنے جانے لگا تھا اور گاؤں میں اب وہ اس کا شاندار استقبال ہوتا تھا۔ وہ اپنے بھائیوں اور ان کی اولادوں کے اصرار کے باوجود کبھی ان کے گھر نہیں ٹھہرتا تھا بلکہ اپنے اسی دوست کے پاس ٹھہرتا تھا جہاں اس نے مشکل وقت میں پناہ لی تھی۔ اپنے خاندانی گھر میں نہ ٹھہرنے کے باوجود اس نے وہاں سے گزرتے ہوئے اس گھر کے دروازے پر وہ نیم پلیٹ دیکھ لی تھی جس پر عکس مراد علی کا پورا نام اس کے عہدے کے ساتھ لکھا ہوا تھا اور وہ تختی بڑے نمایاں انداز میں اس گھر کے دروازے پر لگی ہوئی تھی جہاں کبھی اس کے، حلیمہ اور چڑیا کے لیے رہنے کی جگہ تک نہیں تھی۔ خیر دین نے گاڑی رکوا کے نم آنکھوں اور مسکراہٹ کے ساتھ وہ تختی دیکھی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے اسے کئی سال پہلے کی وہ تختی یاد آئی تھی جس پر اس نے بھی ایسے ہی فخریہ انداز میں اپنا نام، اپنا عہدہ اور اپنے صاحب کا نام بھی لکھوایا تھا۔ پتا نہیں وقت زیادہ بے شرم ہے یا انسان..... جو رنگت بدلنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ فخریہ انداز میں تنگی ہوئی وہ تختی دروازے پر نہیں انسان کی بے ضمیری پر لگائی گئی تھی..... خونی رشتے بعض دفعہ طوائف جیسی اور جتنی وقاداری بھی نہیں دکھاتے..... کتابیں لکھ لیں مادہ پرستی پر پانچ بازار میں

اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ عکس مراد علی کو نظر انداز کرنا بے حد مشکل تھا اور اس کو پسند نہ کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار۔

برآمدے کی انٹرنس پر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے وہ دونوں شہر بانو کو کسی فوٹو فریم کا حصہ لگے تھے۔ ایک پرفیکٹ پکچر..... دراز قد، اٹریکٹو، پراعتماد، اسمارٹ..... سیاہ لباس میں ملبوس وہ ایک ایسا پیکل لگ رہے تھے جو گھر سے نکلتے ہوئے top سے toe تک پرفیکٹ میچنگ کر کے آئے تھے۔ کوئی بھی ایک نظر میں دیکھ لیتا کہ عکس کے ہونٹوں کی لپ اسٹک کا رنگ شیردل کی ٹائی کے رنگ کا ایک حصہ لگ رہا تھا..... شہر بانو نے بھی نوٹس کیا تھا..... ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے کسی رشتے اور تعلق کے بغیر بھی ان دونوں کی باڈی لینگویج میں ایک عجیب کیمسٹری تھی..... ایک عجیب سار بٹ اور تعلق تھا۔ جس کو نہ چھپانے کی کوشش کی تھی، نہ دکھانے کی..... لیکن وہ پھر بھی چھپ چھپ کے دکھ رہا تھا۔

شہر بانو ابھی ٹھنکی..... اور پھر چاہنے کے باوجود وہ عکس سے ویسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کر سکی جو وہ کرنا چاہتی تھی جو وہ دوسرے مہمانوں کے ساتھ کر رہی تھی اور عکس نے یہ محسوس کر لیا تھا۔ وہ بچے تلے انداز میں اس کی طرف بڑھی اور عکس نے بھی اس کا ہاتھ اسی احتیاط سے پکڑا تھا جس سے وہ بڑھایا گیا تھا۔ اسے اسکول میں اپنا اور باری ڈول کا پہلا آئنا سامنا یاد آیا تھا..... وہ تب بھی اسی طرح ملی تھی اس سے..... ڈرتی، جھجکتی، چھپتی.....

شہر بانو نے عکس مراد علی کے ہاتھ کی نرمی اور حدت کو بیک وقت محسوس کیا۔ دونوں کی نظریں ملیں، عکس کو اس سے نظریں ملانے میں کوئی عار نہیں ہوئی۔ چار سال کی وہ بچی اسے کبھی نہیں پہچان سکتی تھی۔ ”آپ کیسی ہیں؟“ شہر بانو نے اسے کہتے سنا۔ اس کی آواز کی ملائمت نے شہر بانو کے وجود کی سرد مہری کو عجیب انداز میں پگھلایا۔

”I 'm fine, how are you“ اس نے جواباً اپنی مسکراہٹ کو کچھ گرم جوش کرنے کی کوشش کی۔

”I 'm good too“ عکس نے جواباً ایک دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ دونوں کا ذہن بیک وقت blank ہوا تھا۔ اگلا جملہ دونوں کے پاس نہیں تھا۔ شیردل اب کشنر کے ساتھ اندر جا رہا تھا۔ شہر بانو کو جیسے ایک عجیب اطمینان ہوا تھا اس فوٹو فریم کے ایک حصے کو وہاں سے ہٹے دیکھ کر۔

”شیردل سے بہت سنا ہے میں نے آپ کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔“ عکس اس کی بات پر مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی شہر بانو نے اسے کچھ جتانے کی کوشش نہیں کی تھی اور وہ جانتی تھی شہر بانو بھوٹ بھی نہیں بول رہی تھی۔ شیردل اس کا ذکر شہر بانو سے کبھی نہیں کر سکتا تھا کسی بھی حوالے سے نہیں کر سکتا تھا..... کرتا تو عکس مراد علی کو شاک لگتا..... وہ اس کی گرل فرینڈ نہیں تھی، وہ اس کا افیئر بھی نہیں تھی، وہ اس کی محبوبہ بھی نہیں تھی، وہ اس کی دوست بھی نہیں تھی..... اس کے باوجود وہ شیردل کا سب کچھ تھی..... اس کا وہ راز جو ایک شیردل ہمیشہ چھپاتا رہا تھا ہمیشہ چھپا سکتا تھا۔ ایک نو سالہ بچے کے طور پر بھی وہ چڑیا کو guard کر سکتا تھا۔ ایک adult



دیتا ہے..... جب تم کالج گئی تھیں تو تم اس گاؤں سے کالج جانے والی پہلی لڑکی تھیں پھر اس گاؤں سے امتحانات میں ٹاپ کرنے والی واحد لڑکی..... ڈاکٹر بننے والی پہلی لڑکی..... اسٹنٹ کمشنر بننے والی پہلی لڑکی..... سی ایس ایس کے امتحان میں ٹاپ کرنے والی پہلی لڑکی..... یہ سارے کوئی چھوٹے اعزاز تھوڑی ہیں۔ پاکستان میں کتنی لڑکیاں ہیں جن کے پاس اتنی قابلیت ہوگی اور اس قابلیت کا صلہ بھی۔“ خیر دین بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے اس کے اعزاز گنوار ہاتھ تھا۔ ہاتھیں وہ دن میں کتنی بار چڑیا کی ان کامیابیوں کو گن گن کر چلتا تھا۔ ”ایک دن تم اس گاؤں سے ڈپٹی کمشنر بننے والی بھی پہلی لڑکی ہوگی اور کمشنر بننے والی بھی۔“ عکس خیر دین کی اس جذباتی پیش گوئی پر ہنس دی تھی۔

”نانا پاکستان میں عورتیں ڈپٹی کمشنر اور کمشنر نہیں بنتیں۔ ہمیں ڈویژن چلانے کے لیے نہیں دیا جاتا۔“ اس نے جیسے خیر دین کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ”سندھ میں شاید ایک آدھ خاتون آفسر کو کچھ عرصہ کے لیے ڈپٹی کمشنر کے طور پر تعینات کیا گیا تھا لیکن وہ بھی بہت کم عرصے کے لیے..... آپ اور خواب نہ دیکھیں میرے بارے میں۔“

”ایک دن آئے گا کہ یہ بھی ہوگا تم دیکھ لینا چڑیا، تم ڈپٹی کمشنر بھی بنوگی اور کمشنر بھی..... لیکن شاید تب تک میں نہ رہوں۔“ خیر دین کو بات کرتے کرتے ایک دم خیال آیا۔

”آپ اس بات کو چھوڑیں یہ بتائیں دروازے پر لگی اس تختی پر کیا لکھا تھا؟“ عکس نے بڑی مہارت کے ساتھ خیر دین کو جیسے اداس ہونے سے روکا۔ وہ اب اکثر اپنی موت کا ذکر کرنے لگا تھا۔

”اس تختی پر لکھا تھا ڈاکٹر عکس مرا علی، نو اسی خیر دین۔ اسٹنٹ کمشنر اسلام آباد۔“ خیر دین بچوں کی طرح بہلا اور اسے اس تختی پر لکھی تحریر فرسنے لگا۔ عکس نے کام کرتے کرتے اپنا ہاتھ روک دیا اور وہ خیر دین کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ جانتی تھی اس نے خیر دین کو زندگی میں فخر کے بے شمار لمحے دیے تھے۔ اس نے خیر دین کی جھولی کو بھر دیا تھا لیکن زندگی میں جو کچھ خیر دین نے اس کے لیے کیا تھا وہ اس سے بہت زیادہ تھا جو وہ اس کے لیے کر پاتی تھی۔ وہ جانتی تھی خیر دین کی زندگی کا اب آخری حصہ اس کے پاس تھا اور وہ اس آخری حصے کے گزر جانے سے پہلے خیر دین کے زندگی کے کھوئے ہوئے اثاثے بھی لوٹا دینا چاہتی تھی اسے..... کم از کم وہ چیزیں جو خیر دین نے اس کی وجہ سے کھوئی تھیں۔

اور کئی سال بعد یہ پہلا کام اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ ”گڑے مردے اکھاڑنے کا فائدہ۔“ اس رات جب اس نے بالآخر خیر دین کو یہ بتایا تھا کہ وہ زمین واپس لینے کی کوشش کرنا چاہتی ہے تو خیر دین نے اس سے کہا تھا۔

”وہ گڑا مردہ نہیں ہے..... ہمارا حق ہے..... اور اپنے حق کے لیے آواز اٹھانی چاہیے..... جدوجہد کرنی چاہیے..... ہمیشہ آپ ہی سکھاتے رہے مجھے یہ بات.....“ عکس نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔ وہ عکس کی بات پر کچھ دیر بول نہیں پایا۔

”تمہیں بیٹھے بٹھائے زمین کا خیال کیسے آگیا؟“ خیر دین نے جواباً اس سے پوچھا۔

”اب خیال نہیں آیا..... ہمیشہ سے خیال رہا ہے مجھے اس کا۔ آپ کو یاد ہے میں نے آپ سے کہا تھا میں جاب ملنے کے بعد دو کام کروں گی۔“ عکس نے مسکراتے ہوئے اسے کئی سال پہلے کی کہی ہوئی اپنی بات یاد

مجھ اکٹھا کر کے مذمتی تقریریں کر کے نعرے لگوائیں یہ وہ بیماری ہے جس کا کوئی حل نہیں..... جسم کی بیماریاں ہوں تو کوئی علاج کوئی حل نکلتا جو جس کو لگ جائے وہ کیسے ختم ہو.....

وقت خیر دین کو دنیا سے جانے سے پہلے سارے تماشے دکھا دینا چاہتا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا۔ بعض تختیاں انسان کا دل بوجھل کرتی ہیں۔ عکس مراد علی کے نام کی تختی نے بھی خیر دین کا دل اسی طرح بوجھل کر دیا تھا۔ ہر بار گاؤں جانے پر ایک بار پھر اس کے پاس سفارشی رقعے اور درخواستیں لے کر آنے والے لوگوں کا جھگھکا لگنا شروع ہو گیا تھا۔ خیر دین چپ چاپ ماضی کو یاد کرتے ہوئے ان رقعوں اور درخواستوں کو اکٹھا کرتا جاتا اور پھر واپس آ کر عکس کے سامنے رکھ دیتا۔ جو اگلے کئی دن ان درخواستوں کی منظوری اور ان پر عمل درآمد کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف رہتی۔ اس نے کبھی نانا کو یہ یاد دلانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ جن لوگوں کی مدد کے لیے اس سے کہہ رہا ہے وہ بہت بے رحم اور بے حس لوگوں کا ایک جھوم ہے۔ جنہوں نے ان لوگوں کی زندگی کے مشکل ترین دنوں میں ان کی رسوائی اور بربادی کا تماشا بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا اور کسی نے آگے بڑھ کر ان کے حق کے لیے ان کی مدد کے لیے آواز نہیں اٹھائی تھی اور وہ آج بھی صرف ان کے اچھے دنوں کی چھاؤں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ان کے پاس آتے تھے..... نہ وہ بدلے تھے نہ ان کا ضمیر نہ ان کا ضمیر..... مگر خیر دین کو یہ سب یاد دلانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا..... اور عکس کو اپنا وقت ضائع کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔

”تم بڑے نصیب والی ہو چڑیا.....“ خیر دین نے ایک بار گاؤں سے آنے کے بعد عکس کے پاس بیٹھے ہوئے اس کا چہرہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ان دنوں اسٹنٹ کمشنر کے طور پر اسلام آباد میں پوسٹڈ تھی اور خیر دین گاؤں سے سیدھا اسی کے پاس آ گیا تھا۔ وہ شام کے وقت اپنا کچھ کام نمٹاتے ہوئے ساتھ خیر دین سے گاؤں کے قصبے سن رہی تھی جب اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے خیر دین نے ایک دم اس سے کہا۔ اس نے کام کرتے کرتے مسکرا کر ایک نظر خیر دین کو دیکھا اور پھر اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ بیٹھے بٹھائے آپ کو میرے خوش قسمت ہونے کا خیال کیسے آگیا؟“

”اللہ تعالیٰ نے تمہیں کتنی عزت دی ہے..... اس قابل بنایا ہے کہ تم لوگوں کے لیے کچھ کر سکو، گاؤں والے گھر میں درجنوں بچے، بچیاں ہیں لیکن اس گھر کے دروازے پر کسی مرد کا نام نہیں ہے..... بلکہ تمہارا نام ہے۔ اس پورے گاؤں میں کسی گھر کے دروازے پر کسی عورت کا نام نہیں لکھا ہوا سوائے تمہارے نام کے..... اور ہر کوئی پہلی بار جب بھی اس دروازے کے سامنے سے گزرتا ہے تو رک کر اس تختی کو ضرور پڑھتا ہے۔ میں تو ہر بار ہی رک کر اس تختی کو پڑھتا ہوں۔“ خیر دین بات کرتے کرتے آخری جملے پر ہنس کر شرمایا تھا۔ عکس کو اپنے نانا پر عجیب سا پیار آیا۔ وہ اس سے جیسے کوئی گہرا راز شیئر کر رہا تھا۔

”نانا وہ میرا نام نہیں ہے..... میرا عہدہ ہے جس کی وجہ سے اس گھر کے ماتھے پر میرا نام لکھا گیا ہے.....“ عکس نے اپنے کام میں مصروف مسکراتے ہوئے کسی تاثر کے بغیر اس کو جیسے یاد دلایا۔

”یہ عہدہ بھی تمہاری ہی قابلیت ہے..... گاؤں میں ہے کسی کے پاس یہ عہدہ.....؟ کسی عورت کے پاس تو کیا کسی مرد کے پاس بھی نہیں ہے۔“ خیر دین اس کی بات کے جواب میں عجیب انداز میں جذباتی ہو گیا تھا۔ عکس مسکراتے ہوئے کام کرتے ہوئے خیر دین کی بات سنتی رہی۔

”گاؤں میں کیا پورے ضلع میں کسی اور عورت کے پاس یہ عہدہ نہیں ہے۔ اللہ ہر ایک کو عہدے کہاں

ساتنے اب نہیں بٹھہر سکتے لیکن میں انہیں بھوکا نہ لگانا چاہتا۔“ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔  
 ”نہیں کیوں؟“ عکس نے بھی سنجیدگی سے پوچھا۔ ”آپ اپنی زمین جانتے بوجھتے انہیں دے دینا چاہتے ہیں؟“

”مجھے یقین نہیں ہے کہ مجھے میری زمین مل سکتی ہے۔“  
 ”میں نے آپ سے کہا ہے آپ اس بات کی فکر مت کریں۔ آپ کو آپ کی زمین مل جائے گی اور کسی طویل قانونی لڑائی کے بغیر ملے گی۔“ عکس نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”زمین مل بھی گئی تو بھی اب اس عمر میں، میں نے اس زمین کا کیا کرنا ہے..... نہ میں ہل چلا سکتا ہوں، نہ وہاں گھر بنا سکتا ہوں۔“ خیر دین اس سے آنکھیں ملائے بغیر کہہ رہا تھا۔ ”اور چڑیا اب میرے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ دکان ہے جس کی قیمت اب ایک کروڑ سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ اپنا ذاتی ڈبل اسٹوری گھر ہے۔ گاڑی ہے، دکان سے ہر ماہ اتنی آمدنی ہوتی ہے کہ ایک مہینے کی آمدنی سے بھی میرا پورا سال گزر سکتا ہے۔ تمہارے پاس اتنی اچھی نوکری ہے، تم بھی اپنا کمائی اپنا کھاتی ہو..... تو ہمیں اس چیز کو کسی دوسرے سے چھیننے کی کیا ضرورت ہے جس سے کسی کے گھر کا چولہا جلتا ہو۔“ خیر دین کچھ رنج کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ ”اس زمین کے ٹکڑے سے حاصل ہونے والی آمدنی میں کبھی اتنی برکت نہیں ہوگی کہ وہ میرے بھائیوں، ان کی اولادوں اور ان کی اولادوں کی اولادوں کو پیٹ بھر کر کھلا سکے۔ وہ آج تک اسی پرانے خستہ حال گھر میں رہ رہے ہیں..... زمین کا وہ ٹکڑا ان کے پاس رہنے سے بھی ان کے پاس وہ برکت نہیں آسکتی جو اللہ نے ہمارے رزق میں دی ہے۔“ خیر دین بڑی سنجیدگی اور دلسوزی سے کہہ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا عکس اسے ٹوکے گی۔ عکس نے اسے نہیں ٹوکا تھا وہ بے حد خاموش اور تحمل سے خیر دین کی بات سنتی رہی تھی۔ جب خیر دین خاموش ہوا تو اس نے اس سے کہا۔

”آپ بات ختم کر لیں پھر میں بات کروں گی۔“  
 ”زندگی بہت قیمتی شے ہے چڑیا..... زندگی کا مقصد انتقام اور بدلہ بنانا اسے کوڑیوں کے بھاؤ بیچنا ہے۔“ عکس بے اختیار خیر دین کی بات پر مسکرا دی..... خیر دین نے چاندی کے ورق میں لپیٹ کر اسے جو بات کہی تھی وہ اس کا مطلب اور اشارہ بخوبی جانتی تھی۔

اپنی کرسی پر آگے ہو کر اس نے خیر دین کے ہاتھ کو بڑی نرمی سے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔  
 ”کیا آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ میں آپ کی تربیت کے بعد اپنی زندگی کو سازشوں اور انتقام لینے میں ضائع کر سکتی ہوں؟ کیا آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ میں اپنے دن رات ان چیزوں اور ماضی کے اس baggage کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارتی ہوں؟“ خیر دین نے کچھ اچھنبے سے اس کا چہرہ دیکھا پھر کہا۔

”نہیں میں کبھی ڈاکٹر عکس مراد علی سے یہ توقع نہیں کر سکتا۔“ وہ ہنس دی تھی۔ خیر دین اس کا اس طرح نام شاذ و نادر ہی لیتا تھا۔

”نانا انتقام لینے میں اور احسن طریقے سے اہتاج لینے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ کو آپ کا وہ حق مل جائے جو بددیانتی اور بدنیتی سے چھینا گیا اور میں جانتی ہوں میں آپ کو آپ کا حق دلوا سکتی ہوں۔“

”یہ پہلا کام تھا تمہارا جو تم کرنا چاہتی تھیں؟“ خیر دین ہنس دیا تھا۔  
 ”ہاں پہلی پہلا کام تھا۔“ وہ بھی مسکرائی۔

”اور دوسرا کام؟“ خیر دین نے اس سے پوچھا۔

”ابھی ہم پہلے کام کے بارے میں بات کر رہے ہیں نانا۔“ عکس نے خیر دین کو بات گھمانے نہیں دی۔  
 ”دیکھو چڑیا میں اس عمر میں کورٹ پکھری کے دھکے نہیں کھانا چاہتا۔“ عکس نے خیر دین کی بات کاٹ دی۔  
 ”آپ سے کس نے کہا آپ کو کورٹ پکھری کے دھکے کھانا پڑیں گے؟“

”ہمارے پاس اس زمین کا کوئی کاغذ تک نہیں ہے..... کوئی ثبوت کوئی گواہ نہیں ہم کیسے یہ ثابت کریں گے کہ وہ ہماری زمین ہے ہم سے چھینتی گئی ہے۔“ خیر دین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کا خیال تھا چڑیا جذبات میں آکر کچھ حقائق نظر انداز کر رہی تھی۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ چڑیا کبھی بھی جذباتی نہیں رہی تھی۔ اس پہلے کام کو کرنے سے پہلے وہ بہت سا ہوم ورک کر چکی تھی بہت سی سرنگیں لگا چکی تھی۔ اسے اس معاملے کے پیچیدہ پہلوؤں کا خیر دین سے زیادہ ادراک نہ ہوتا تو وہ جاب پر پوسٹ ہوتے ہی زمین کے اس ٹکڑے کی ملکیت کے لیے تگ و دو شروع کر دیتی لیکن اس نے یہ نہیں کیا تھا اس نے مناسب وقت کا بڑے تحمل کے ساتھ انتظار کیا تھا۔ اپنی پروموشن کا..... اپنے جونیئر سے سینئر آفیسر ہونے کا..... اپنے طاقتور ہونے کا..... اور وہ بالکل صحیح وقت پر صحیح جگہ سے وہ محاذ کھول رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے اندھا دھند اس جنگ میں نہیں کود رہی تھی۔

”نانا آپ اس کی پروا مت کریں، ان چیزوں کو آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔“ عکس نے خیر دین کو بڑے اطمینان کے ساتھ تسلی دی تھی۔

”تم اپنا وقت بے مقصد کاموں میں ضائع مت کرو۔“ خیر دین نے اسے دانا تھا۔ وہ خیر دین کی ڈانٹ پر ہنس دی تھی۔

”نانا یہ بے مقصد کام کیسے ہے؟“ اس نے جواباً خیر دین سے پوچھا۔

”جس کام کا کوئی نتیجہ نکلنے کا امکان نہ ہو اس پر وقت ضائع کرنا بے مقصد ہی ہے چڑیا۔“ خیر دین بہت سنجیدہ ہو گیا..... ”تم اس طرح کا کوئی کام شروع کرو گی تو پورا خاندان ایک بار پھر سے ہمارا دشمن ہو جائے گا۔ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیا تو.....“ عکس نے خیر دین کی بات بڑے تحمل سے کاٹ دی۔

”نانا وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ وہ گیدڑ ہیں شیر نہیں۔ صرف اندھیرے میں نکل کر نقصان پہنچا سکتے ہیں اور ہمارا اندھیرا ختم ہو چکا ہے۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے خیر دین سے کہہ رہی تھی۔ ”اور آپ کو اگر یہ لگتا ہے کہ زمین بے لینے کے بعد وہ ہم سے میل جول ختم کر دیں گے تو نانا میں آپ کو یقین دلاتی ہوں وہ یہ بھی نہیں کریں گے۔ وہ آپ سے پہلے ہی کی طرح ملتے رہیں گے، آپ کو اگر زمین کی وجہ سے اپنوں کے ایک بار پھر سے چھوٹ جانے کا ڈر ہے تو مت ڈریں۔ وہ اب آپ کو چھوڑنا اور ڈر نہیں کر سکتے۔“ خیر دین ایک بار پھر گنگ رہ گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا وہ اس کے لاشعور کی تہوں تک پہنچی ہوئی تھی وہ کچھ بھی پڑھ رہی تھی جو وہ اپنے آپ سے بھی چھپا رہا تھا۔ ایک طویل خاموشی کے بعد اس نے عکس سے کہا۔

”میں اپنے خاندان والوں پر قانون کی آری نہیں چلاؤں گا۔ میں جانتا ہوں وہ کمزور ہیں۔ ہمارے

”یہ جلسا زی تو نہیں ہو رہی۔“ وہ بار بار عکس کے کانوں میں سرگوشی کرتا۔ ”اصلی کام ہے؟“

”جی نانا..... بالکل اصلی۔“ وہ ہر بار مسکرا کر اسے جواب دیتی۔

چند گھنٹوں بعد پٹواری اور تمام متعلقہ لوگوں کے جانے کے بعد بھی خیر دین عجیب اچھنبے کے عالم میں زمین کے وہ کاغذات دیکھتا رہا جو اسے خواب لگ رہے تھے۔ پتا نہیں اس نے ان کاغذات کو کتنی بار کھول کر پڑھا تھا۔ پھر اس نے عکس سے بڑی معصومیت سے کہا۔

”اب کل میں اس زمین پر جاؤں گا؟“

”نہیں نانا..... کل ہمیں کہیں اور جانا ہے۔“ عکس نے جوابا کہا۔

اور اگلی صبح وہ عکس کے ساتھ جہاں گیا تھا اس جگہ نے بھی اس کے بہت سارے زخم ہرے کر دیے تھے۔ وہ اپنی سرکاری گاڑی میں پولیس اسٹیشن کے ساتھ اسی پولیس اسٹیشن میں گئی تھی جہاں کئی سال پہلے خیر دین ایک صبح حوالات کے پیچھے اٹھوا کر پھنکوا یا گیا تھا۔ متعلقہ تھانے کے ایس ایچ او نے اپنے عملے کے ساتھ تھانے کے گیٹ پر ان کا استقبال کیا تھا۔ انہیں بڑی عزت و احترام سے لا کر ایس ایچ او کے آفس میں بٹھایا گیا تھا۔ ایس ایچ او مصر تھا کہ وہ اس کی کرسی پر تشریف رکھیں اور یہ پیش کش عکس نے شکریے کے ساتھ رد کر دی تھی۔ ایس ایچ او نے تھوڑی دیر بعد خیر دین کے تقریباً تمام بھائیوں اور بھتیجیوں کو تھکڑیوں کے ساتھ پولیس اسٹیشن میں پیش کیا تھا۔ وہ خیر دین کی زمین پر ناجائز قبضے کے الزام میں دھرے گئے تھے۔ عکس مراد علی کی ایک دن پہلے درج کرائی گئی ایف آئی آر کے تحت جس کے بارے میں خیر دین کو علم نہیں تھا اور نہ وہ کبھی عکس کو ان لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی نہ کرنے دیتا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ زمین کاغذات پر کسی کے نام ہو جانے سے اس کی ملکیت نہیں ہوتی۔ زمین اس کی ملکیت ہوتی ہے جس کے قبضے میں ہوتی ہے۔ عکس اس سسٹم کی موٹو گائیڈ کو اپنے بوڑھے نانا سے زیادہ بہتر طریقے سے جانتی تھی لیکن خیر دین اپنے رشتے داروں کو وہاں پولیس اسٹیشن میں دیکھ کر شاکہ کھاتا تھا۔ ایس ایچ او اب ان لوگوں سے اسی طرح مخاطب تھا جس طرح کئی سال پہلے اس تھانے میں وہ پرانے ایس ایچ او نے خیر دین اور عکس سے بات کی تھی۔ ایس ایچ او نے خیر دین کے دو بھائیوں اور دو بھتیجیوں کو یہ کہا تھا کہ وہ حوالات میں موجود اپنے تمام رشتے داروں سے مشورہ کرنے کے بعد یہ طے کر لیں کہ انہیں جلسا زی اور فراڈ کے مقدمات بھگٹانے ہیں یا عزت سے زمین سے دستبردار ہو کر صلح صفائی کرنی ہے۔ وہاں موجود پٹواری نے اپنے کھاتوں میں سے زمین کے اصلی کاغذات ان لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے ان کے پاس موجود رجسٹری کو جلسا زی کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ انہوں نے ایک بھاری رقم دے کر زمین خیر دین سے خرید لی تھی۔ ایس ایچ او نے ان کے کاغذات پر موجود خیر دین کے انگوٹھے کے نشانات کو جعلی قرار دیا تھا کیونکہ وہ جعلی ہی تھے۔

پٹواری کے پاس زمین کے اس انتقال کا جو ریکارڈ تھا وہ بھی جعلی تھا کیونکہ خیر دین کے بھائیوں میں سے ایک خیر دین بن کر پٹواری کے پاس پیش ہو کر رشوت کے کچھ پیسوں کے عوض اس کی زبان بندی اور کاغذات میں مطلوبہ تبدیلی کروا آیا تھا لیکن اس تمام چکر بازی میں اس قدر جھول تھے کہ عکس جانتی تھی وہ اگر مقدمہ لڑتی تو وہ بھی چند پیشیوں میں جیت جاتی لیکن وہ مقدمے بازی میں نہ اپنے آپ کو الجھانا چاہتی تھی نہ خیر دین کو۔ وہ

آپ گاؤں کے اتنے لوگوں کے سفارشی رفقے اور درخواستیں لے کر میرے پاس آتے ہیں اور مجھے ہر وقت یہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کا مجھ پر حق ہے اور میرا فرض ہے ان کی خدمت کرنا..... مجھ پر آپ کا بھی تو حق ہے۔“ خیر دین اس کی بات سنتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

”رحم کرنا بہت اچھی بات ہے..... نیکی کرنا، سخاوت کرنا، رشتے داروں کا خیال رکھنا سب اچھا ہے لیکن جس طریقے سے آپ یہ کام کرنا چاہتے ہیں وہ اچھا نہیں ہے۔“ وہ اب بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ ”آپ اس گاؤں میں ایک بہت غلط اور خطرناک مثال قائم کر کے چھوڑنا چاہتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ اس گاؤں میں خاندان والے جس کو کمزور اور نہتہ پائیں اس کا حصہ چھین کر کھا جائیں کیونکہ وہ غریب ہیں اور آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس نا انصافی کی کبھی سزائی نہ کی جائے..... آپ غریب کو برائی کا لائسنس دینا چاہتے ہیں سخاوت اور رحم کا نام دے کر..... اور آپ بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔“ وہ بے حد سنجیدگی سے کہتی جا رہی تھی خیر دین خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

”میں سمجھتی ہوں ہمیں وہ زمین ضرور واپس لینی چاہیے، اس گاؤں کے لوگوں کے لیے یہ بہت بڑا سبق ہوگا۔ آپ اپنے بہن بھائیوں اور ان کے بچوں کو بھوکا ہنگامہ نہیں دیکھ سکتے ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں ضرور کریں۔ زمین لینے کے بعد ان کی مالی مدد کریں کہ وہ کہیں اور زمین لے لیں یا ماہانہ کچھ رقم انہیں دے دیا کریں۔ ان کی مدد کریں لیکن ان کے ظلم اور زیادتی پر نیکی کی چادر نہ ڈالیں..... ہم خدا نہیں ہیں اور ہم انسانوں کے رازق بھی نہیں ہیں۔ ہم ان سے صرف وہ چیز لے رہے ہیں جو ہماری ہے..... انسانوں کو برائیاں کرتے ہوئے یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ اس کا بھی ایک اجر ہوتا ہے۔ اس کی بھی فصل کٹنی پڑتی ہے۔ میں نہیں سمجھتی اس زمین کو واپس نہ لینا ایک اچھا فیصلہ ہے..... لیکن وہ آپ کی زمین ہے اور آپ جو فیصلہ کریں گے بہتر ہوگا۔“ خیر دین کے پاس لمبی خاموشی کے سوا بہت دیر تک کچھ نہیں بچا تھا۔ عکس بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی لیکن ایک مشکل کام کرنے کو کہہ رہی تھی۔ وہ بہت دیر ایسے ہی چپ بیٹھا رہا تھا۔ پتا نہیں یہ بڑھا پا تھا جو اس کے حواس کو کمزور کر رہا تھا یا پھر عکس کی دلیل..... وہ خیر دین کو الجھانا جانتی تھی اور اس نے خیر دین کو الجھا دیا تھا۔ اس نے بالآخر ایک بار پھر عکس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ ایک وقت تھا جب وہ اس کی انگلی پکڑ کر چلتی تھی، خیر دین اسے رستہ دکھایا کرتا تھا اور اب خیر دین اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی رہنمائی میں چلنے لگا تھا۔

وہ دو دن کے بعد عکس کے ساتھ گاؤں گیا تھا اور وہاں جاتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں ساری تیاری پہلے ہی پوری تھی۔ عکس کا ایک بیج میٹ اس ضلع میں ڈپٹی کمشنر کے طور پر فائز تھا اور وہ بہت سے احکامات پہلے ہی دے چکا تھا۔ وہ دونوں اس بار وہاں کے ایک ریٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے۔

ان کے وہاں پہنچنے کے چند گھنٹوں میں ہی علاقے کا پٹواری اپنے بیج کھاتوں سمیت وہیں ریٹ ہاؤس میں آ گیا تھا۔ اس کے کھاتوں میں خیر دین کی زمین کا ریکارڈ بھی موجود تھا۔ عکس کے اسٹاف کا ایک شخص پہلے ہی اس شخص کو بھی وہاں لا چکا تھا جس سے خیر دین نے وہ زمین خریدی تھی اور وہ گواہ بھی وہیں موجود تھے جنہوں نے خیر دین کی ملکیتی زمین کے کاغذات پر دستخط کیے تھے۔

چند گھنٹوں کے اندر خیر دین کی زمین واپس اس کے نام منتقل ہو چکی تھی..... کوئی کاغذی ثبوت اپنے پاس نہ ہونے کے باوجود..... خیر دین ہکا بکا تھا۔ وہ ان کاغذات پر انگوٹھا لگاتے ہوئے بھی ایسے ہی بوکھلایا تھا۔

لیے لگائی ہے۔ میں ایک تختی کی خاطر کسی کو اپنا تختہ کرنے نہیں دوں گی اور آپ بھی اس خوش فہمی سے باہر آ جائیں کہ وہ ہماری بہت عزت کرنے لگے ہیں۔ وہ ہم سے مرعوب ہیں اور ہماری عزت کرنے پر مجبور ہیں ان کے پاس کوئی دوسرا آپشن ہے کیا؟“ عکس اب خیر دین کے ساتھ بہت صاف گوئی کا مظاہرہ کر رہی تھی اس صاف گوئی کا جو اس کے پرفیشنل کیریئر کا حصہ تھا۔

”ہمارے ساتھ ملنا اچھے تعلقات رکھنا ان کی ضرورت اور مجبوری ہے ہماری نہیں..... ہم نہ اب یہاں رہتے ہیں نہ کل رہیں گے..... نہ ہی ہمارا یہاں کوئی میل جول ہے..... نہ ہم ان پر کسی بھی اعتبار سے ڈیپنڈنٹ..... یہ سارے مسائل اور مجبوریاں ان کی ہیں تو پھر ہم ان کو اپنا استعمال کیوں کرنے دیں۔ وہ اگر دل سے ہماری عزت کرتے تو اس زمین کو خود ہی معذرت کر کے آپ کو واپس کر دیتے..... لیکن وہ معذرت نہیں کریں گے، شرمندہ نہیں ہوں گے، زمین واپس نہیں کریں گے لیکن بڑی ڈھٹائی اور دھڑلے سے میرا نام استعمال کرنے کے لیے اپنے گھر کے دروازے پر لگالیں گے اور آپ کے پاس شہر میں سیر و تفریح کرنے کے لیے آتے رہیں گے، آپ کو چھوٹے بڑے کاموں کے لیے سفارشی اور درخواستیں بھی دیتے رہیں گے... ماننا اچھا لگتی کرنی چاہیے لیکن دوسروں کے ہاتھوں exploit نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ بہت دو ٹوک انداز میں کہہ رہی تھی۔ خیر دین کے پاس اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں تھا..... وہ جواب دینا بھی چاہتا تو بھی نہیں دے سکتا تھا..... جواب ڈھونڈنا بھی چاہتا تو نہیں ڈھونڈ سکتا تھا..... چڑیا اسے جو دکھا رہی تھی وہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا..... خونی رشتوں کے لالچ، خود غرضی اور سفاکی سے وہ جان بوجھ کر آنکھیں موند لیتا چاہتا تھا لیکن یہ کام چڑیا نہیں کرنے دے رہی تھی۔ وہ تختی جس پر خیر دین ناراض تھا وہ چڑیا کے لیے کوئی معنی ہی نہیں رکھتی..... سوائے exploitation کے ایک حربے کے۔

خیر دین کو جرنیشن گیپ کے لفظ کا مطلب اب سمجھ میں آیا تھا۔ چڑیا بہت سی باتوں پر وہ نہیں سوچتی جو وہ سوچتا تھا یہ وہ ہمیشہ سے جانتا تھا لیکن چڑیا اس کے بہت سے فیصلوں کو غلط اور احمقانہ سمجھتی تھی یہ وہ پہلی بار جان رہا تھا..... تکلیف وہ تھا یہ احساس..... ساری عمر عقل کی گنی دینے والے کو اگر کوئی یہ کہہ دے کہ اس کے علم میں نقص ہے تو اس پر جو گزرے گی وہ خیر دین پر بھی گزر رہی تھی۔ چڑیا نا فرمانی نہیں کر رہی تھی نہ ہی کوئی زبردستی کرتے ہوئے اس پر اپنا فیصلہ مسلط کر رہی تھی لیکن وہ خیر دین کو خوش فہمیوں کے خوش نما بارغ میں بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ اسے بڑی تمیز اور تہذیب سے وہ حقائق بتا اور دکھا رہی تھی جو خیر دین نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

”میں اس عمر میں کوئی دشمنی نہیں چاہتا۔“ خیر دین نے بالآخر لمبی خاموشی کے بعد بے حد کمزور لہجے میں ایک بہت ہی بودی تادیل پیش کی۔

”نانا دوستوں کے بھیس میں دشمنوں کو پالتے سے کھلے دشمن بہتر ہوتے ہیں۔“ خیر دین اس کی بات پر ہنس دیا تھا۔ وہ بالکل اسی کی طرح نصیحتیں کرنے لگی تھی اسے..... اور اس کی نصیحتیں اس کے دل پر بھی لگتی تھیں۔

”مجھے اچھا نہیں لگا اپنے بھائیوں اور ان کے بیٹوں کو اس طرح ہتھکڑیوں میں حوالات میں دیکھ کر..... جو بھی ہے وہ اپنا خاندان ہے اپنے خاندان کو انسان ذلیل نہیں کر سکتا۔“ خیر دین نے بالآخر چڑیا کے سامنے اپنا dilemma رکھ دیا۔

وہی کام کرنا چاہتی تھی جس کا نشانہ وہ خیر دین کئی سال پہلے بنے تھے۔

خیر دین کے ان دو بھائیوں اور بھتیجیوں نے ایک ڈیڑھ گھنٹے کی بات چیت کے بعد بھی یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ مقدمہ لڑیں گے، اس طرح آسانی سے اس زمین کو اپنے ہاتھوں سے جانے نہیں دیں گے جس پر ان کی بقا کا دار و مدار تھا۔ عکس کو ان سے یہی توقع تھی۔ وہ گاؤں دیہات کے ان پڑھ لوگ تھے جن کے لیے عزت کا ہر سراز زمین سے شروع ہو کر زمین پر ہی ختم ہوتا ہے۔ مقدمے، جھگڑے، مار کٹائی ان کے لیے نئی بات نہیں تھی، نہ ہی تھا نہ کچھری کوئی نئی چیز..... عکس کے پاس پلان بی پہلے ہی تیار تھا۔ وہ اگر خیر دین کی زمین سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے اور بات کو وہ کورٹ کچھری تک لے کر جانا چاہتے تھے تو پھر کورٹ کچھری میں فیصلہ صرف اس زمین کا نہیں ہوگا جو خیر دین کی ملکیت تھی بلکہ خیر دین خاندانی گھر اور اپنے باپ کی ملکیت زمین میں سے بھی اپنے حصے کے لیے مطالبہ کرے گا۔ خیر دین کے بھائیوں کے لیے یہ ایک بڑی پریشانی کی خبر تھی کیونکہ خیر دین نے اس سے پہلے کبھی بھی اپنے خاندانی گھر یا خاندانی زمین میں سے اپنے حصے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ قانونی طور پر وہ ابھی بھی اس جائداد میں حصے دار تھا اور یہ صرف ہمیشہ سے اپنے بھائیوں کے لیے احساسِ رحم تھا جس نے خیر دین کو اپنے حصے پر دعویٰ سے روکے رکھا تھا۔ اس کے پاس اچھی سرکاری نوکری تھی اور وہ وہاں سے جو کھا کما رہا تھا وہ اس سے بہت زیادہ اور بہتر تھا جتنا اس کے بھائی گاؤں میں اپنی خاندانی زمین پر کاشت کاری کر کے کما رہے تھے۔ خاندانی گھر کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اس لیے چوڑے احاطے میں بے تربیتی سے بنائے گئے کچے کچے کمروں میں یہ مشکل اس کا خاندان سایا ہوا تھا۔ وہ ان سے حصے کا مطالبہ کرتا تو یہ جیسے کسی کے جسم پر موجود کپڑوں میں سے کوئی کپڑا مانگتا تھا۔ اور خیر دین اپنے خونی رشتوں کو نگاہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے اتنا کافی تھا کہ بھی کبھار گاؤں آنے پر اسے چند دن کے لیے اس گھر میں خوش دلی سے رکھ لیا جاتا تھا اور یہ خوش دلی اس لیے بھی زیادہ تھی کیونکہ اس زمانے میں خیر دین کئی بار اپنے بھائیوں کو زبانی طور پر یقین دہانی کروا چکا تھا کہ اسے اپنے باپ کی جائداد میں سے اپنا حصہ نہیں چاہیے وہ اس سے دستبردار ہو جائے گا لیکن اب اچانک عکس کے منہ سے اس زمین اور گھر کا سن کر ان لوگوں کو جیسے غش پڑ گیا تھا۔ نہ صرف ان لوگوں کو بلکہ خیر دین بھی بے حد بھونچکا ہو کر عکس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

وہ ان کے سامنے ایک اور چال بچھا کر خیر دین کو ساتھ لیے وہاں سے اٹھ کر واپس ریٹ ہاؤس آگئی تھی ریٹ ہاؤس پہنچتے ہی خیر دین نے عکس سے وہی کہا جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔

”کیا ضرورت تھی اس سب کی؟ میں نے منع بھی کیا تھا تمہیں۔“ خیر دین اب بہت خفا تھا۔ ”اتنا پڑھا لکھا کر اب میں تمہیں تمہانے کچھریوں کے دھکے کھلاؤں گا۔“

”نانا تمہانے کچھری میں آتی جاتی رہتی ہوں میری جاب کا حصہ ہے یہ بھی۔“ عکس نے اطمینان سے اسے کہا۔ وہ جانتی تھی خیر دین کو پریشان کرنے والی یہ بات نہیں تھی وہ اگر پریشان ہو رہا تھا تو اپنے بھائیوں اور بھتیجیوں کو حوالات میں اس حال میں دیکھ کر ہو رہا تھا۔

”اتنی عزت کرتے تھے گاؤں میں خاندان میں سب تمہاری اور تم نے بیٹھے بٹھائے سب کچھ ڈبو دیا۔“ وہ بے حد بے یقین تھا۔

”نانا مجھے اس تختی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے جو انہوں نے اپنے گھر کے دروازے پر گاؤں میں شو آف کے

اس واقعے کے حوالے سے لیکن خلاف توقع ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے تھے پھر انہوں نے اسے اپنی ایک پوتی کی شادی میں دعوت دی تھی اور جب خیر دین نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے یہ دعوت قبول کر لی تھی تو انہوں نے ساتھ ہی اس بچی کی شادی کی تیاریوں کے لیے کچھ رقم بھی مانگ لی۔ خیر دین کو اس پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا، اس نے بڑی خوشی خوشی اپنے بھائی سے اس کی پوتی کی شادی کے لیے رقم بھیجنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اپنے بھائی سے فون پر بات ختم کرتے ہی خیر دین نے بڑے جوش و خروش کے عالم میں عکس کو فون کیا تھا۔

”تم بالکل ٹھیک کہتی تھیں چڑیا، وہ واقعی اب ہمیں نہیں چھوڑ سکتے۔“ خیر دین نے ساری تفصیلات چڑیا کو بتانے کے بعد جیسے اس کے Judgement پر اسے داد دی لیکن تمام تفصیلات میں سے اس نے اپنے بھائی کو دیا جانے والا رقم کا وعدہ چھپا لیا تھا۔

”نانا انہوں نے آپ سے شادی کے لیے کتنی رقم کا مطالبہ کیا ہے اور آپ نے کتنی رقم دینے کا وعدہ کیا ہے؟“ عکس نے خیر دین کی داد پر فخر محسوس کرنے کے بجائے بڑے اطمینان کے عالم میں اپنی اسی ٹیٹی اور ملائم آواز میں اگلوں والے انداز میں خیر دین سے پوچھا۔ خیر دین جواب نہ سننے لگا۔

”چڑیا تم اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہو۔“ خیر دین کی بات پر وہ ہنس دی۔

”چڑیا کے نہیں نانا صرف کوؤں کے۔“ اس نے جواباً خیر دین کو کہا تھا لیکن خیر دین سے یہ جاننے پر اصرار نہیں کیا تھا کہ وہ اس شادی میں کیا Contribute کرنا چاہتا تھا۔ خیر دین کے خاندان سے زمین چھین لینے کے باوجود وہ اس خاندان کے مسائل سے واقف تھی۔ مالی طور پر وہ بہت کمزور سماجی حیثیت رکھتے تھے اور پہلے خیر دین اور اب عکس کا نام وہ واحد سہارا تھا جو ان کی عزت نفس اور ساکھ کو سنبھالے ہوئے تھا اور وہ گاؤں کے کسی کمین نہیں کہلاتے تھے۔ عکس کو اندازہ تھا کہ خیر دین کی مالی معاونت کے بغیر وہ عزت سے اپنی کسی بچی کو نہیں بیاہ سکتے تھے اور اسے اس مالی امداد پر اعتراض نہیں تھا۔

خیر دین گاؤں میں شادی میں شرکت کرنے کچھ جھجکتا ہوا پہنچا تھا لیکن اسے وہاں یہ دیکھ کر عجیب حیرت ہوئی تھی کہ گاؤں اور خاندان میں اس کا استقبال پہلے سے بھی زیادہ گرم جوشی اور مرموعیت سے کیا گیا تھا۔ اسے عکس کی بات یاد آئی، اس نے کہا تھا۔ ”نانا اپنا حق لینے کے قابل ہونے کے بعد گاؤں میں آپ کا زیادہ احترام

”میں جانتی ہوں نانا اور مجھے بھی یہ بات اچھی نہیں لگی لیکن اس کے سوا اور کوئی آپشن نہیں تھا۔ وہ سب حالات میں ضرور ہیں لیکن آپ اطمینان رکھیں ان پر کسی قسم کا کوئی تشدد نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ اس طرح کا ذہنی اور جسمانی تشدد جو انہوں نے آپ پر کروایا تھا اور نہ ہی ان کے خاندان کی کسی عورت کو کھانے۔۔۔ بلوایا گیا ہے جیسے مجھے بلوایا گیا تھا۔“ وہ تلخ ہونا نہیں چاہتی تھی کیونکہ نئی انسان کو جذباتی کر کے منتقم المزاج بناتی ہے، بہت سے غلط فیصلے کرواتے ہیں، بہت سی زیادتیاں بھی کروا دیتی ہے لیکن خیر دین کو قائل کرنے کے لیے دی جانے والی ہر مثال اس کے دل کو عجیب سے رنج سے بھر رہی تھی اور خیر دین چڑیا کی مثالوں میں چھپی ٹیٹی اور تکلیف سے واقف تھا۔

”میں صرف ایک چیز چاہتی ہوں نانا اور وہ یہ کہ کم از کم اس گاؤں میں دوبارہ کبھی کوئی کسی کو بے بس دیکھ کر اس کے ساتھ وہ نہ کرے جو ہمارے ساتھ کیا گیا اور میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔۔۔۔۔ اس زمین کو واپس لینے کے بعد آپ کا خاندان اور یہ گاؤں آپ کی زیادہ عزت کرے گا کیونکہ آپ نے اپنا حق قانونی طریقے سے لیا اسے بے بس اور مجبور ہو کر چھوڑ نہیں دیا۔“ خیر دین نے ایک بار پھر چڑیا کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ اس کی دلیلیں اب اسے تو اتر سے لاجواب کرنے لگی تھیں۔

رات تک ایس ایچ او دوسری پارٹی کی طرف سے راضی نامہ لے کر آ گیا تھا۔ اس کے خاندان پر مزید کیا دباؤ ڈالا گیا تھا خیر دین نہیں جانتا تھا نہ عکس نے اسے بتایا تھا لیکن اگلے دن اس زمین سے اس کے خاندان کا قبضہ ختم ہو گیا تھا۔ پولیس کی نگرانی میں اس زمین کی حد بندی کروا کر اسے اسی علاقے کے ایک دوسرے زمیندار کو ٹھیکے پر دے دیا گیا تھا۔ اور یہ سب پورے گاؤں والوں کی نظروں اور چیمگیوں کے درمیان دن دھاڑے کیا گیا تھا۔ خیر دین بڑے سالوں بعد اس زمین پر کھڑا ہوا اس کی حد بندی دیکھتا رہا تھا۔۔۔۔۔ اسے فخر ہونا چاہیے تھا لیکن نہیں ہوا تھا۔۔۔۔۔ اس کے دل پر ایک عجیب سا بوجھ پڑ گیا تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس زمین کے اس طرح اچانک ہاتھ سے نکل جانے پر اس کے خاندان کے کیا تاثرات اور احساسات ہوں گے۔۔۔۔۔ کبھی وہ ایسی ہی کیفیات سے گزرا تھا۔۔۔۔۔ اس کی اذیت ان سے اس لیے زیادہ تھی کیونکہ وہ اپنی چیز سے ناحق بے دخل کیا گیا تھا۔۔۔۔۔ لیکن تکلیف اس کے بھائیوں کو بھی بہت زیادہ ہوئی تھی یوں جیسے میلا دیکھنے بھری جیب کے ساتھ کوئی جائے اور میلا دیکھنے سے پہلے ہی جیب کٹ جائے۔

راضی نامہ ایس ایچ او کے پولیس اسٹیشن پر اس کی نگرانی کے بجائے متعلقہ ڈی بی او آفس میں ڈی پی او کی نگرانی میں سائن ہوا تھا اور اس کے بعد خیر دین کے خاندان والوں کو بالآخر رہائی مل گئی تھی۔ عکس بھی خیر دین کو لیے اسی دن وہاں سے واپس لوٹ آئی تھی۔

اگلے کئی دن خیر دین اس زمین کا دوبارہ مالک بن جانے کے باوجود بھی ایک عجیب سے ملال میں رہا۔ گاؤں سے واپس آ جانے کے بعد کئی ہفتے اس کے خاندان میں سے کسی نے اس کے ساتھ پہلے کی طرح گپ شپ لگانے کے لیے فون پر رابطہ نہیں کیا تھا، نہ ہی کسی نے شہر آ کر اس سے ملنے کی کوشش کی تھی۔ خیر دین عکس سے بار بار اس بات کی شکایت کرتا رہا اور وہ بڑے اطمینان سے ہر شکایت پر اس سے کہتی رہی۔ ”نانا وہ آئیں گے۔۔۔۔۔ آپ دیکھ لیجیے گا۔“ اور اس کی یہ بات بالکل ٹھیک ثابت ہوئی تھی۔ اس واقعے کے پورے ایک مہینے کے بعد گاؤں سے اس کے بھائی نے اسے پہلی کال کی تھی۔ خیر دین کا خیال تھا کہ وہ اس سے لمبے گلے شکوے کریں

ہوگا۔“ اس نے شادی میں شرکت کرنے کے بعد واپس شہر جا کر عکس کو یہ بات بتائی تھی۔

”تم ٹھیک کہتی تھیں چڑیا.....“ خیر دین نے اس جملے سے اپنی بات کا آغاز کیا اور تب اچانک اسے احساس ہوا کہ اب وہ اکثر عکس سے اپنی بات چیت کا آغاز اسی اعتراضی جملے سے کرنے لگا تھا..... وہ بے اختیار مسکرا دیا تھا۔

”نانا آپ کچھ کہہ رہے تھے؟“ عکس نے اسے بات شروع کر کے پھر خاموش ہوتے دیکھ کر پوچھا۔ خیر دین نے بے پناہ شفقت سے خود پر جی ان گہری چمکتی آنکھوں کو دیکھا..... اپنی چڑیا کی آنکھوں کو..... پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم ٹھیک کہتی تھیں چڑیا اپنا حق لینے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے اور اپنا حق لینا کوئی جرم نہیں ہے۔“ عکس نے یہ نہیں کہتی تھی نانا..... یہ ساری عمر آپ کہتے رہے۔“ اس نے جیسے خیر دین کو یاد دلایا۔ وہ ہولے سے ہنسا تھا۔ عکس نے خیر دین کا ہاتھ بڑی نرمی سے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ”نانا میں اپنی authority کا استعمال بے مقصد انتقام لینے کے لیے بھی نہیں کروں گی لیکن میں جس چیز کو اپنا حق سمجھتی ہوں اسے حاصل کرنے کے لیے میں سب کچھ کروں گی۔“

خیر دین کو اندازہ نہیں ہوا وہ اسے اپنے اگلے کام کے لیے انفارم کر رہی تھی۔ اس نے سر جھکا کر عکس کے اس ہاتھ کو دیکھا جس میں اس نے خیر دین کے ہاتھ کو لیا ہوا تھا۔ مخروطی انگلیوں والا بہت نرم ہاتھ جو بھی بہت چھوٹا سا تھا اور خیر دین نے اسے قلم سمجھا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے لکھنا سکھایا تھا..... ٹیڑھی میٹھی لکیریں..... آڑے ترچھے حرف..... ٹوٹے پھوٹے لفظ..... اور پھر اپنا نام..... عکس مراد علی..... اور اب جب وہ ہاتھ کاغذ پر اپنا نام لکھا کرتا تھا تو وہ حکومتی فرمان ہوتا تھا..... اس ہاتھ میں بہت طاقت تھی اور اس قلم میں اس سے زیادہ..... جس سے وہ اپنے علم سے دنیا کو متعارف اور متاثر کیا کرتی تھی..... وہ اس منہی سی بچی کے ہاتھ میں قلم کے بجائے جھاڑو پکڑانے پر اصرار کرتا تو وہ بھی وہی ہوتی اور وہی بنتی جو اس کے گاؤں اور خاندان کی ساری لڑکیاں بنتی تھیں..... بے شناخت وجود..... جن کے پاس انگوٹھا ہوتا تھا دستخط نہیں.....

بے شک تعلیم نصیب بدل دیتی ہے اور راستہ بھی..... زندگی کا بدل جانا تو پھر مقدر ہو جاتا ہے۔ خیر دین نے نم آنکھوں کے ساتھ اس ہاتھ کو چوما جسے ایک ننھی بچہ ہوتی مٹھی سے آسمان تک پھیلے ہوئے پنجے تک اس نے اپنے خون سے سینچا تھا۔

☆☆☆

ایک شیردل کے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں اس کا ہاتھ برف کا ہو گیا ہوگا..... چند لمحوں کے لیے اسے ایسا ہی لگا تھا..... اگر وہ ہاتھ برف کا نہیں ہوا تھا تو پھر وہ خود ضرور کچھ دیر کے لیے فریز ہوئی تھی..... وہ اس کا سانس..... اس کے دل کی دھڑکن..... کائنات کی گردش اور اس پاس کا شور..... آوازیں..... سب کچھ سب ہی کچھ..... چند سیکنڈز..... چند منٹ..... وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے پھر وہ پکھلی..... پہلی آواز شاید دل کی تھی..... دوسری سانس کی..... پھر سب کچھ ایک جھٹکے سے چلنے لگا تھا..... بالکل پہلے کی طرح..... جاتی ہوئی سانس اور اوسان ایک ہی وقت میں لوٹے تھے.....

عکس نے اسی ترمی اور سہولت سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نکال لیا تھا جس طرح اس نے اس کا ہاتھ

عکس

پکڑا تھا پھر اس نے نظریں چرائی تھیں۔ اس نے اور ایک شیردل نے ایک ساتھ..... پھر وہ دونوں سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے اب وہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہے تھے ایک دوسرے کے بالمقابل نہیں تھے صرف ساتھ بیٹھے ہوئے تھے..... قریب، برابر لیکن اجنبی.....

”تو چڑیا اسے یاد ہے۔“ عکس نے سوچا تھا اور رد کی عجیب سی لہر اٹھی تھی۔ یہ خالی نام تھوڑی تھا جو اس کی... یادداشت میں ابھرا ہوگا۔ وہ اس سے آگے کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی، کچھ بھی نہیں۔ اسے اندازہ نہیں تھا نوٹس اتنی جلدی شیردل کی فیملی تک پہنچ گیا ہوگا اس کا خیال تھا ابھی ایک دو دن اور لگیں گے تب تک شیردل سنگا پور پہنچ چکا ہوگا جو کچھ ہوگا اس کے بعد ہوگا، اندازے کی ایک معمولی سی غلطی ہو گئی تھی۔

اس کے برابر یوں بیٹھے ہوئے اس نے سوچا آخری بار وہ کب اس طرح مجرمانہ سی حالت میں یوں برابر خاموش بیٹھے رہے تھے..... اسے یاد آ گیا۔ جب ایک اپنی می کے کہنے پر اس کے ساتھ کھیلنا چھوڑنے پر نام ہو کر اس کے پاس واپس آیا تھا اور وہ اس کے اصرار پر اس کے پاس آ گئی تھی۔ اس دن بھی وہ برآمدے کی سیڑھیوں میں یونہی چپ چاپ بیٹھے رہے تھے..... ایک ریکٹ کی string کو نام انداز میں ٹھیک کرتا رہا تھا اور اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اس سے کیا کہے لیکن اس کے باوجود وہ دونوں ایک دوسرے کے پاس بیٹھے رہے تھے۔ خاموشی اور تحمل سے..... کسی بات کے آغاز کا انتظار کرتے کرتے.....

”تم نے بھی چیری کھائی ہے؟“ تب بہت دیر بعد ایک نے گفتگو کا آغاز اسی طرح کیا تھا۔

”ہاں۔“ چڑیا نے تحمل سے جواب دیا تھا۔ ایک بچے کے طور پر بھی اسے احساس تھا وہ بے ٹکا سوال تھا اور اس کا آم کے میزین میں کرنے کا کوئی مقصد نہیں تھا جب ایک ہر روز آم کھانے بیٹھا ہوتا تھا۔

”بھی اسٹرابیری کھائی ہے؟“ اگلا سوال بھی ویسا ہی بے ٹکا تھا۔

”ہاں۔“ چڑیا نے ایک بار پھر وہی تحمل دکھایا تھا۔

”بلیویری کھائی ہے؟“ ایک اور سوال۔

”نہیں، اس بار چڑیا نے کہا تھا۔

”وہ بہت مزے کی ہوتی ہے۔“ اس بار جواب آیا تھا۔ چڑیا اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی۔ ایک کو اس کی نظروں سے جیسے مزید شرمندگی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ٹینس ریکٹ کی string ٹھیک کرنی شروع کر دی



تھی۔ آج بھی ویسی ہی مشکل آتی پڑی تھی اس خاموشی کو توڑنے میں۔

فلائٹ اٹاؤنس ہونے لگی تھی۔ ان دونوں نے بیک وقت اپنے باقی ساتھیوں کو دیکھا۔۔۔ ان میں سے کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ان کے درمیان چند منٹ پہلے کیا ہوا تھا شاید کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ کوئی دیکھ بھی لیتا تو شیردل کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ سب اپنے اپنے بیگز اٹھاتے ہوئے بورڈنگ پاس ہاتھ میں لیے جہاز میں سوار ہونے کے لیے اٹھ رہے تھے۔۔۔ وہ اور شیردل بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر۔ جہاز میں ان کی سیٹس ساتھ نہیں تھیں اور یہ عجیب طمانیت بخش شے تھی جیسے ان دونوں کے لیے۔۔۔ وہ ساتھ بیٹھ کر اتنا لمبا سفر خاموشی سے ایک دوسرے کے سامنے ٹوٹ جاتے کے بغیر کیسے طے کرتے۔ وہ دونوں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔

کراچی انٹرپورٹ پر ایک بار پھر وہ جیسے میکا نیکی انداز میں ایک دوسرے کے پاس آکر بیٹھے تھے اور پھر سنگاپور کی فلائٹ پکڑنے تک اسی طرح بیٹھے رہے تھے۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کے کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے۔۔۔ ان میں سے کسی کے پاس آجانے پر اس کے ساتھ گپ شپ لگاتے ہوئے۔۔۔ لیکن آپس میں بالکل خاموش۔۔۔ سنگاپور کے لی کوان یونیٹیٹیوٹ آف پبلک پالیسی میں پہلے دو دن بھی انہوں نے اسی خاموشی میں گزارے تھے۔ تیسری شام کو شیردل اور وہ بالآخر شام کو اس عمارت کے لان میں جا کر بیٹھ گئے تھے جہاں وہ رہائش پذیر تھے۔ ”تم ہمیشہ سے جانتی تھیں میں کون تھا؟“ شیردل نے کسی سیاق و سباق کے بغیر اسی طرح ایک بے تکی سوال سے گفتگو کا آغاز کیا تھا جس طرح تب چیری والا سوال کیا تھا۔

”ہاں۔“ عکس نے آج بھی اسی شکل کے ساتھ وہی ایک لفظی جواب دیا تھا۔ اس کے برابر میں بیٹھ کر بیٹھے شیردل نے اسے دیکھنے کی کوشش کیے بغیر اس فوارے کے گرتے ہوئے پانی پر نظریں جمائے رکھتے ہوئے سر ہلایا جس سے کچھ فاصلے پر وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ یوں جیسے اپنے اندازے کے ٹھیک ہونے کا یقین تھا اسے۔ ”میرے نام سے پہچانا تم نے۔۔۔ یا میرے چہرے سے؟“ اب اسٹرابری والا سوال آیا تھا۔

”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“ اس بار بالآخر بلیو پیری والا سوال آ گیا تھا۔

”کیا بتاتی تھیں۔۔۔ کہ میں کون ہوں۔“ اس بار عکس نے اس سے کہا تھا۔ ایک بار پھر ایک عجیب سی خاموشی ان کے درمیان آ گئی۔

شیردل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا کہے۔۔۔ تمہید باندھے تو تمہید کے بعد کیا کہے۔۔۔ بعض دفعہ انسان گونگا نہیں ہوتا لفظ گوگلے ہو جاتے ہیں اس کے ساتھ بھی۔ یہی ہو رہا تھا۔۔۔ معذرت کرتا تو کیسے اور کس بات کی۔ نہ کرتا تو۔۔۔ وہ اپنی مٹی سے ملنے کے بعد سے جیسے اپنی راتوں کی نیند کھو بیٹھا تھا۔۔۔ شاک 26 سال پہلے بھی لگا تھا اس رات اسے لیکن عکس کے تعارف نے جو شاک اب دیا تھا اس کی شدت بھی ویسی ہی تھی۔۔۔ اس رات کے واقعات کئی بار اس کی آنکھوں کے سامنے گزرے تھے اس کے ذہن کی اسکرین پر چلتے رہے تھے وہ یعنی شاید تھا اس واقعے کا لیکن اب عکس کے سامنے بیٹھے ہوئے اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ یعنی شاہد بن کر بات کرے یا پھر ہر چیز سے لاعلمی اور بے خبری کا ڈھونگ کرے۔۔۔ دوسرا آپشن زیادہ مناسب تھا۔ زیادہ suit کرتا تھا اسے اور وہ دوسرے آپشن ہی کا انتخاب کرتا اگر وہ عکس مراد علی نہ ہوتی اور اسے یہ یقین نہ ہوتا کہ اسے ریلنگ کے پاس کھڑا



ہوا چیخا ہوا ایک بھولا نہیں ہوتا۔

”جو کچھ ہوا نہیں ہونا چاہیے تھا.....“ بہت دیر کے بعد شیردل نے بالآخر بات شروع کرنے کے لیے کچھ لوے لنگڑے لفظ ڈھونڈ لیے تھے۔ عکس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے لفظ مبہم تھے۔

”جو کچھ میں نے کیا وہ؟“ اس نے شیردل کی بات کاٹ کر اس سے پوچھا۔ اس بار شیردل نے اسے دیکھا۔

”نہیں..... جو کچھ اس رات ہوا.....“ وہ بات مکمل کرتے کرتے بھی مکمل نہیں کر سکا۔

عکس نے کچھ نہیں کہا۔ وہ سننا چاہتی تھی وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا اس میں شیردل کا قصور نہیں تھا وہ اسے کسی لحاظ سے جواب دہ نہیں سمجھتی تھی لیکن پھر بھی سننا چاہتی تھی وہ کیا کہنا چاہتا تھا اس فیملی کے فرد ہونے کے حوالے سے۔

”اور تم یہ بھی جانتی تھیں کہ شہر بانو انکل شہباز ہی کی بیٹی ہے؟“ شیردل نے وہ بات ادھوری چھوڑ کر اس سے اگلا سوال کیا تھا۔ اس بار وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

”ہاں۔“ عکس نے بھی اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ شیردل کے چہرے پر بے حد عجیب سا تاثر آیا تھا۔ عکس کو اس تاثر کی توقع تھی اس نے شیردل کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور سیدھا دیکھنے لگی۔ شیردل نے اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹائی تھی۔ وہ اس عورت کو کبھی سمجھ نہیں پایا تھا تب جب وہ اس سے نو سالہ ایک بچے کے طور پر پہلی بار ملا تھا اتنے سالوں میں جب وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے تھے اور نہ آج۔ وہ نہ چڑیا کو سمجھ پایا تھا نہ عکس مراد علی کو..... اس نے ایک بار پھر اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔

”تم کچھ کہہ رہے تھے؟“ عکس نے یک دم اسے یاد دلایا۔ شیردل جان گیا تھا وہ کیا سننا چاہتی تھی اور وہی موضوع سب سے مشکل تھا۔ وہ دونوں ایک closure چاہتے تھے اور closure نہیں ہو پا رہا تھا۔

”تم یہ سب مت کرو۔“ وہ جو اس سے سننے کی توقع رکھتی تھی اس نے وہ نہیں کہا۔ اور جو کہا تھا عکس کو اس سے عجیب مایوسی ہوئی تھی۔

”شیردل تم اس معاملے میں مت آؤ..... یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔“ عکس نے جواباً بڑے مستحکم لہجے میں اس سے کہا۔

”عکس یہ میری فیملی کا معاملہ ہے، میں اس سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ تم جس آدمی کو بناری ہو وہ میرا انکل ہے میری بیوی کا باپ ہے اور تم کہہ رہی ہو کہ میں اس معاملے میں نہ آؤں کیونکہ اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے..... تم واقعی سمجھتی ہو کہ میں اس معاملے سے خود کو الگ تھلگ رکھ سکتا ہوں؟“ شیردل نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کرتی رہی پھر اس نے کہا۔

”تم چاہو تو اپنے آپ کو الگ رکھ سکتے ہو.....“

”نہیں رکھ سکتا..... میرے خاندان کی عزت کی بات ہے یہ۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ عکس بے اختیار ہنس دی۔ شیردل الجھا۔

”میں یہی سننا چاہتی تھی تمہاری زبان سے..... یہ تمہارے خاندان کی عزت کا سوال ہے اسی لیے تم غلطی پر ہوتے ہوئے بھی آخری حد تک جاؤ گے مجھے اس کیس سے روکنے کے لیے۔ تم سمجھتے ہو عزت صرف تمہارے

خاندان کی ہوتی ہے اور اس کی حفاظت کرنا صرف تمہارا حق ہے؟“ وہ بڑی سرد مہری سے کہہ رہی تھی۔ شیردل نے کچھ الجھ کر اس کی بات کاٹی۔

”میں نے ایسا نہیں کہا عکس۔۔۔۔۔“

”تمہاری بات کا یہی مطلب نکلتا ہے۔“

”غلط مطلب نکال رہی ہوں۔“

”پھر تو سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ میں بھی جو کچھ کر رہی ہوں اپنے نانا کی عزت کے لیے کر رہی ہوں۔ مجھے بھی ان کی عزت اتنی ہی پیاری ہے جتنی تمہیں اپنے انکل کی۔“ شیردل چند لمحوں کے لیے اس کی بات پر کچھ بول نہیں پایا پھر اس نے جیسے کچھ خفا ہو کر کہا۔

”تم غلط comparison کر رہی ہو عکس۔“

”انکل شہباز مرچکے ہیں۔۔۔۔۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے انہوں نے کتنا suffer کیا ہے۔۔۔۔۔ تم انہیں معاف کیوں نہیں کر رہیں۔“ وہ عجیب اکھڑے انداز میں بولا تھا۔ وہ انکل شہباز کی وکالت نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اسے احساس ہوا وہ وکالت ہی کرتا لگا تھا۔ عکس کو بھی ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔

”شیردل میں نے تم سے شادی کیوں نہیں کی تم جانتے ہو؟“ اس نے عجیب رنجیدگی سے اس سے کہا۔ وہ یہ نہ بھی کہتی تو بھی شیردل کو اس سوال کا جواب اسی دن مل گیا تھا جس دن خیر دین کی برطرفی کے خلاف اور اس کی پنشن اور دوسرے واجبات کے لیے فائل کیے گئے کیس میں اس نے عکس مراد علی کا نام دیکھا تھا۔

”ہاں جانتا ہوں۔“ شیردل نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

”شہباز حسین وجہ نہیں ہے اس کی۔“ عکس جیسے اس کا ذہن پڑھ رہی تھی۔ ”یہ کلاس ڈفرنس وجہ ہے اس کی جو بار بار تمہاری باتوں میں جھلکتا رہا ہے۔“ شیردل نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”تمہارے لیے تمہاری تکلیف بڑی ہے دوسروں کی چھوٹی۔“ شیردل نے اسے بات کرتے کرتے ٹوک دیا۔

”میں نے کبھی ایسا نہیں کہا۔“

”ہاں تم نے کبھی نہیں کہا لیکن تم نے ہمیشہ جتایا۔۔۔۔۔ کبھی شعوری طور پر کبھی لاشعوری طور پر۔۔۔۔۔ جیسے ابھی تم سمجھتے ہو تمہارے انکل نے بہت suffer کیا ہے۔۔۔۔۔ خیر دین نے نہیں جس کو صفائی کا موقع دیے بغیر چوری کے الزام میں ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ پنشن اور ہر طرح کے واجبات سے محروم کر دیا گیا۔۔۔۔۔ اس نے کوئی تکلیف نہیں کاٹی ہوگی۔“ وہ بے حد خفگی سے بول رہی تھی۔

”تم نے۔۔۔۔۔“ شیردل نے کچھ کہنا چاہا۔ عکس نے اس کی بات کاٹ دی۔

”نہیں شیردل، تم پہلے میری بات سنو، تم مجھ پر یہ جتنا چاہتے ہو کہ خیر دین کی تکلیف شہباز حسین کی تکلیف سے اس لیے کم ہے کیونکہ شہباز حسین کا گھر ٹوٹ گیا۔ بیوی بچی چھوڑ کر چلی گئیں اور وہ مر گیا تو اس لیے اس نے خیر دین سے زیادہ suffer کیا۔“

”نہیں، میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انکل شہباز نے جو غلط کام کیا انہیں اس کی سزا مل گئی اور اس سے بہت زیادہ ملی جتنی کورٹ انہیں دے سکتی تھی۔ انہوں نے اپنے ہر اس رشتے کو کھودیا جس سے وہ پیار کرتے تھے۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انکل شہباز نے جو غلط کام کیا انہیں اس کی سزا مل گئی اور اس سے بہت زیادہ ملی جتنی کورٹ انہیں دے سکتی تھی۔ انہوں نے اپنے ہر اس رشتے کو کھودیا جس سے وہ پیار کرتے تھے۔“

”نہیں، میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انکل شہباز نے جو غلط کام کیا انہیں اس کی سزا مل گئی اور اس سے بہت زیادہ ملی جتنی کورٹ انہیں دے سکتی تھی۔ انہوں نے اپنے ہر اس رشتے کو کھودیا جس سے وہ پیار کرتے تھے۔“

عکس

”تھے۔۔۔۔۔ آئی شرمین، شہر بانو۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ ممی۔۔۔۔۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے انہوں نے اپنی زندگی کے آخری سال کس طرح گزارے تھے۔۔۔۔۔ اور تم جانتی ہو انہوں نے خودکشی کی تھی۔“ وہ بول رہا تھا وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

”مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا۔“ شیردل کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزرا۔

”میں تمہاری فیملی سمجھ سکتا ہوں اس لیے مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی تمہاری اس بات سے۔“ شیردل نے مدہم آواز میں کہا۔

”شیردل تم کبھی میری فیملی نہیں سمجھ سکتے۔۔۔۔۔ اگر سمجھ سکتے تو شہباز حسین کے دفاع میں اتنا لبا۔۔۔۔۔ argument نہ کرتے۔“ عکس نے خفگی سے اس کی بات کاٹ کر کہا تھا۔ ”لیکن میں تمہیں blame نہیں کروں گی۔۔۔۔۔ وہ تمہارے انکل ہیں، تم انہی کی سائڈ لو گے۔۔۔۔۔ اور ٹھیک بھی ہے۔ تمہیں ان کو defend کرنا بھی چاہیے۔“ عکس کا لہجہ مدہم ہو گیا تھا۔

”تم سمجھتی ہو میں اگر تمہارے ساتھ نہیں ہوں تو تمہارے خلاف ہوں۔“ شیردل نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”میں تمہیں بھی نقصان سے بچانا چاہتا ہوں۔“

”کیسا نقصان؟“ عکس نے بے حد سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

”تم سمجھتی ہو میری فیملی اتنی آسانی سے تمہیں یہ کیس جیتنے دے گی اور تمہیں واقعی لگتا ہے کہ تم یہ کیس جیت جاؤ گی۔“ وہ اب بے حد سنجیدگی سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

”تمہیں لگتا ہے شیردل میں نے سوچے سمجھے بغیر اس کنویں میں چھلانگ لگا دی ہے۔۔۔۔۔ میں نے کوئی calculations نہیں کی؟“ عکس نے جواباً اس سے پوچھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

”نہیں، میں کم از کم یہ تو نہیں سمجھتا کہ تم نے کوئی calculations نہیں کی ہوں گی۔ تم جیسے پلیئر ہو ہر چال بہت سوچ کر چلتی ہو۔“ اس کا لہجہ بات کرتے کرتے عجیب ہو گیا تھا۔ عکس نے اس سے نظر نہیں ملائی۔

”جیسے کھیلنا چھوڑ چکی ہوں میں۔۔۔۔۔ زندگی جیسے سے بڑھ کر ملی ہے۔“ اس نے دور فوارے کو ایک بار پھر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے شیردل سے یہ نہیں پوچھا تھا اسے یہ کیسے یاد تھا کہ وہ جیسے کھیلتی تھی۔۔۔۔۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا صرف وہ نہیں تھی جسے چیزیں یاد رکھنی آتی تھیں۔۔۔۔۔ کبھی کبھار کوئی ایسا ہی نہ بھولنے والا مل جاتا ہے۔

”وہ تمہارا ٹرانسفر کر دیں گے اس کے بعد تم کیا کرو گی؟“ فوارے کے پانی کو روشنیوں میں اچھلتے دیکھتے ہوئے اسے شیردل کی آواز آئی۔ اس نے گردن موڑ کر شیردل کو دیکھا۔

”وہ۔۔۔۔۔؟ یعنی تمہاری فیملی؟“ عکس نے بڑی سنجیدگی سے شیردل سے پوچھا۔ وہ اس کی فیملی کے اثر و رسوخ سے واقف تھی۔

”پھر کیا کرو گی تم؟“ شیردل نے ہنس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اگلا سوال کیا۔ ”تم نے ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن کو ذمے دار ٹھہرایا ہے یہ سوچ کر کہ تم وہاں بیٹھی ہو اور تم اس کیس میں شہباز حسین کے الزامات کو غلط ثابت کر کے خیر دین کو بے تصور قرار دو گی اور اس کے حق میں ثبوت اکٹھے کر کے پیش کر دو گی، تمہیں

یہ اس لیے آسان لگتا ہے کیونکہ ابھی تم پوسٹڈ ہو۔ اتنے پرانے کیس کا کوئی عینی شاہد نہیں ملے گا۔ وہ لوگ جنہوں نے انگل شہباز کے ماتحت عملے کے طور پر تمہارے نانا کے خلاف بیانات ریکارڈ کروائے تھے اب اتنے سالوں بعد انہیں بڑی آسانی سے غلط ثابت کر دو گی۔ یہ سب اتنا سیدھا اور آسان نہیں ہے۔ تم ٹرانسفر کے بعد وہاں اپنا اثر و رسوخ استعمال نہیں کر سکتیں۔ تمہیں قرض کروا دلیس ڈی بنا دیتے ہیں تو کیا کرو گی تم پھر.....؟“ شیردل اسے بڑی سنجیدگی سے مضمرات سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں اگر یہاں پوسٹڈ نہ بھی ہوتی تو بھی میں کم از کم زندگی میں ایک بار اپنے نانا کو چوری کے اس کیس سے باعزت بری کروا کر ملازمت سے یکطرفہ اور ناجائز برطرفی کا فیصلہ غلط قرار دلوانے کی کوشش ضرور کرتی۔ ان کی پٹن اور واجبات بحال کروانے کی کوشش بھی ضرور کرتی۔“ اس نے جواباً بے حد مستحکم آواز میں شیردل سے کہا تھا۔

”میں نے زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں وہاں پوسٹ ہوں گی لیکن میں نے ہمیشہ یہ سوچا تھا کہ میں اپنے نانا کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی کا ازالہ ضرور کروں گی۔ وہ سرکاری ملازمت میرے نانا کے لیے بہت معنی رکھتی تھی۔ انہوں نے بڑی جدوجہد کر کے حاصل کی تھی۔ ان کے سر کا تاج تھا وہ زندگی بھر کا اثاثہ۔ اور وہ یہ deserve نہیں کرتے تھے کہ ایک رات.....“ وہ بات کرتے کرتے رک گئی تھی۔ شیردل کو لگا وہ اپنی بھرائی ہوئی آواز پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شیردل کے دل پر ایک عجیب سا بوجھ آ کے گرا تھا۔

”میرے نانا بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور ان کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے اور میں چاہتی ہوں کہ میں ان کے ماتھے پر لگی ہوئی یہ واحد تہمت ہٹا دوں۔ جس کا باعث میں تھی۔ میرے لیے یہ اہم نہیں ہے کہ میں یہ کیس جیتی ہوں یا نہیں۔ اس کا کوئی فائدہ ہوتا ہے یا نہیں۔ میرے لیے اہم بات صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ میں نے اس کام کے لیے کوشش تو کی۔ میں کم از کم یہ کچھ بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں نے کوشش بھی نہیں کی اپنے نانا کے لیے کچھ کرنے کی۔ میں تمہیں بالکل نہیں روکتی تم اپنے انگل کو defend کرو۔ اپنے خاندان کی سپورٹ کرو۔ تمہیں بالکل ایسا ہی کرنا چاہیے۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھے بھی ایسا ہی کرنے دو۔ تم میرے دوست ہو۔ اس مسئلے کی وجہ سے دوست نہیں رہنا چاہتے تو بھی ٹھیک ہے۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ شیردل وہیں بیٹھا شام کے اندھیرے میں اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔ اس کے پاس عکس مراد علی سے کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے پھر بھی کوشش کی تھی۔ ایک واحد اور آخری کوشش۔ وہ بیٹھ کر بیٹھا تب تک عکس کو دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آتی رہی۔

”تم جانتے ہو شیردل میں نے تم سے شادی کیوں نہیں کی.....؟ شہباز حسین وجہ نہیں ہے اس کی۔ وہ کلاس ڈفرنس وجہ سے جو بار بار تمہاری باتوں میں جھلکتا ہے۔ تمہارے لیے تمہاری تکلیف بڑی ہے دوسروں کی چھوٹی۔ ہاں تم نے کبھی زبان سے نہیں کہا لیکن ہمیشہ بتایا۔ کبھی شعوری طور پر..... کبھی لاشعوری طور پر۔“ وہ باتیں نہیں کر کے گئی تھی اس کی انا کے غبارے میں کیل گاڑ کر گئی تھی۔ ایک شیردل کو کبھی اندازہ نہیں ہوا۔ پیاز کی وہ برتن جو وہ اپنے وجود کے گرد چڑھائے ہوئے تھا اسے اتار کر رکھ گئی تھی۔ طبقاتی فرق اس کے انداز اور لب و لہجے میں اتنا نمایاں تھا کہ دوسروں کو چھتا تھا یا کم از کم اس عورت کو ضرور چھتا تھا جس سے اس نے واقعی محبت کی تھی۔ اور پتا نہیں وہاں بیٹھے بیٹھے اسے پہلی بار کیوں یہ یقین ہوا تھا کہ وہ بھی بالکل اسی کی طرح اس کی محبت میں پاگل تھی۔ اس پر مرنی تھی اس کے لیے جان دے سکتی تھی۔ وہ جس چیز کو صرف اپنا پاگل پن سمجھتا رہا

عکس

تھا وہ ایک طرف نہیں تھی۔ لیکن عکس مراد علی اس کی طرح عقل سے پیدل نہیں ہوئی تھی۔ وہ بہت کچھ چھپا سکتی تھی ایسی صفائی اور مہارت کے ساتھ کہ کوئی دوسرا کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔

”وہاں بیٹھے اسے یاد آیا تھا جب چڑیا فریڈی کی ڈسک شدید تکلیف کے باوجود بار بار پکڑنے کی کوشش کرتی رہی تھی اور اس نے اپنے ہاتھ نیچے کر لیے تھے۔ ایک اس پر شدید خفا ہوا تھا وہ اسے اس نو سالہ بچی کی بے وقوفی سمجھ رہا تھا۔ وہ قوت برداشت تھی۔ وہی قوت برداشت جو اس نے گھوڑے سے گرنے کے بعد چند منٹوں میں دوبارہ اسی گھوڑے پر بیٹھ کر دکھائی تھی۔ وہ درد تھا اور درد سہہ جاتا ہے انسان۔ لیکن محبت پر بند کیسے ہاندھے تھے اس نے۔ یہ ایک شیردل کو اس سے سیکھنا تھا۔

☆☆☆

”سر ہم بھی یہاں سیکھنے کے لیے آئے ہیں کھیاں مارنے تو نہیں آئے یا پھر آپ ہمیں اجازت دیں ہم باہر گلی ڈنڈا کھیل لیتے ہیں آپ تب تک میڈم کو پٹل شوٹنگ کی پریکٹس کراتے رہیں ہو سکتا ہے آپ کی یہ محنت رنگ لائے اور میڈم اگلے اوپیکس میں پٹل شوٹنگ میں گولڈ میڈل لے کر آپ کا اور پاکستان کا نام روشن کر کے آئیں۔“ عکس کو ہنسی آئی تھی شیردل کی جھلاہٹ پر لیکن اس نے سر جھکا کر ہاتھ میں پکڑے پٹل کا بلٹ جیمبر کھولتے ہوئے اپنی ہنسی چھپائی۔ اسے بہت دیر سے وقتاً فوقتاً شیردل کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہو رہا تھا کہ شیردل اب کسی بھی وقت پھٹنے والا تھا۔ وہ اس کی شکل اور تاثرات دیکھ کر بھی اس کی جھلاہٹ اور بے زاری کو پہچان سکتی تھی۔

وہ لوگ ایلٹ فورس کے ٹریننگ اسکول میں نشاۃ بازی کی تربیت کے لیے آئے تھے۔ وہ پہلا ڈی ایم جی گروپ تھا جن کی تربیت کا ایک حصہ نشاۃ بازی میں مہارت بھی تھا۔ تین روزہ اس تربیت کے پہلے ہی دن شیر دل کا موڈ اس وقت بری طرح آف ہوا تھا جب اس نے اپنے گروپ کے انسٹرکٹر کو مکمل طور پر عکس کی طرف متوجہ بلکہ فریفتہ پایا تھا۔ وہ لوگ چار چار کے گروپس میں تھے اور عکس اسی کے گروپ میں تھی۔ انہیں پاکستانی پولیس کے زیر استعمال اسلحے سے متعارف کرواتے ہوئے انسٹرکٹر نے پورا لیکچر عکس کو دیکھتے ہوئے دیا تھا بلکہ اس کا شاید بس چلتا تو وہ اس ٹریننگ سیشن کو صرف ون ٹو ون کر دیتا۔ ایلٹ فورس کا وہ اہلکار پہلی بار ڈی ایم جی کی کسی خاتون آفیسر کے متھے لگا تھا جو اسے سر کہہ رہی تھی اور خاتون آفیسر بھی وہ جن کے لیے اکیڈمی میں موجود بہت سارے حضرات گدھے بننے کے لیے تیار تھے اور وہ المکار خوش قسمت تھا کہ 18 کے اس گروپ کی ”ہیرڈن“ اس کی فلم میں تھی اور اسے اپنی اس خوش قسمتی اور باقی انسٹرکٹر کی بد بختی کا احساس بھی تھا۔

گروپ میں شیردل کے علاوہ دوسرے دونوں مرد آفیسر نے اس التفات پر صرف معنی خیز مسکراہٹوں کا تبادلہ کر کے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ صرف شیردل تھا جو نظر انداز نہیں کر سکا تھا۔ پتا نہیں اسے انسٹرکٹر کے ساتھ عکس کی یہ قربت اچھی لگی یا اس انسٹرکٹر کا ایک شیردل کو ایک لڑکی وجہ سے اس بری طرح نظر انداز کرنا۔

اکیڈمی میں سب ایک شیردل کے خاندان سے واقف تھے۔ ایڈیشنل سیکریٹری کے بیٹے کو بہت واضح انداز میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی حد تک پروٹوکول دیا جاتا تھا۔ ایک شیردل اس پروٹوکول کا عادی تھا۔ وہ بہت دیر تک یہی سب دیکھتا رہا۔ پریکٹس سیشن کے دوران بھی انسٹرکٹر باقی تینوں ممبرز کو ہلکی پھلکی ہدایات دینے کے بعد بار بار عکس کے پاس پہنچ جاتا تھا اور شیردل کی توجہ شوٹنگ رینج اور پریکٹس سے زیادہ اسی چیز پر تھی۔ نہ پٹل اس کے لیے نئی چیز تھی نہ وہ پہلی بار شوٹنگ پریکٹس کر رہا تھا اس کے باوجود اس نے جان بوجھ کر انسٹرکٹر کو اپنی طرف بلانا

نہیں ہے۔“ شیردل جانتا تھا وہ اسی کے استعمال کیے ہوئے لفظ کو لے کر اس پر چوٹ کر رہی تھی۔  
”دیکھیں گے۔“ شیردل کرسی جھلاتے ہوئے مسکرایا تھا۔  
”ضرور.....“ عکس نے مسکرا کے کہا۔

”تم چیلنج کر رہی ہو کہ تم مجھے یہ ٹرافی نہیں لینے دو گی؟“ شیردل نے اس کے جواب پر کہا۔ عکس جواب دینے کے بجائے اسے دیکھ کر مسکرا دی..... ایک بے حد گہری..... بے حد معنی خیز..... لیکن چیلنج کرنی ہوئی مسکراہٹ۔  
تقریباً آٹھ ماہ کے بعد GTP کی ٹریننگ کے اختتام پر اس بار کوئی کانٹے دار مقابلہ نہیں ہوا تھا۔ اسپورٹس کا ایونٹ شیردل کا نام رہا تھا۔ لیکن کورس کے تمام پیئرز میں وہ کسی ایک میں بھی ٹاپ نہیں کر سکا تھا۔ صرف وہی نہیں گروپ کے دوسرے آفیسرز میں سے کوئی بھی اکیڈمکس میں کسی ایک پیئر میں بھی عکس مراد علی کو beat نہیں کر سکا تھا۔ اکیڈمکس میں اتنی واضح اور یکطرفہ پرفارمنس کے بعد بیسٹ پروڈیوسر کی ٹرافی جیتنے کے لیے عکس کی باقی چیزوں میں بہت معمولی ایوریج پرفارمنس بھی بہت کافی تھی۔ اس نے شیردل کو کڑا جواب دیا تھا۔  
پاسنگ آؤٹ ceremony اٹینڈ کرتے ہوئے شیردل نے پہلی بار عکس مراد کے لیے کھلے دل سے تالیاں بجاتی تھیں۔ وہ ڈی ایم جی کی بیسٹ پروڈیوسر کی ٹرافی حاصل کرنے والی پاکستان کی پہلی خاتون آفیسر تھی اور اس کے ایوارڈ سے پہلے اس کا یہ اعزاز بھی دہرایا گیا تھا۔

دو سال کی ٹریننگ کے دوران شیردل ایک حریف کے طور پر اسے جتنا سخت مقابلہ دے سکتا تھا اس نے دیا تھا۔ اس نے کبھی عکس مراد علی کی سبقت اور قابلیت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ یہی کچھ اس گروپ کے باقی 16 آفیسرز نے کیا تھا۔ عکس مراد علی مرد بھی ہوتی تب بھی وہ اس کے ساتھ ایسا ہی کڑا مقابلہ کرتے لیکن اس کا عورت ہونا ان 17 مرد آفیسرز کے لیے جیسے ایک اور چیلنج تھا۔ ان میں سے ہر ایک وہاں اپنی ذاتی prestige کے لیے توڑ پھڑ رہا تھا لیکن وہ 17 لوگ اپنی صنف کی prestige کے لیے بھی لڑے تھے۔ جتنا اور جیسا لڑ سکتے تھے اور اب اس لڑائی کے اختتام پر وہ 17 لوگ بالآخر ڈاکٹر عکس مراد علی کو تعظیم دے رہے تھے..... کھلے دل سے..... اعلیٰ ظرف حریفوں کی طرح شیردل نے بھی بالآخر عکس مراد علی کی جیت کو خوش دلی سے تسلیم کر لیا تھا..... اس عورت کے لیے تحسین اور تعظیم کے جذبات کے ساتھ..... اس کے باوجود کہ وہ اپنے چیلنج میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

ہال میں بیسٹ پروڈیوسر کے لیے نخر یہ انداز میں تالیاں بجاتے ہوئے خیر دین کو اس شام مسز بختیار شیردل نے کئی سال بعد پہلی بار دیکھا تھا..... پہلی خاتون بیسٹ پروڈیوسر کے نام کے اعلان پر ہال اسٹینڈنگ اوویشن دینے کے لیے کھڑا ہوا تھا اور وہ پہلا لمحہ تھا جب پاکستان کے بااثر اور بارسوخ لوگوں کی اس gathering میں مسز بختیار شیردل نے فرسٹ رو میں اپنے اور اپنے شوہر سے کچھ فاصلے پر بے حد جوش و خروش سے تالیاں بجاتے ہوئے خیر دین کو دیکھا تھا۔ کئی سال گزرنے اور چہرے پر داڑھی ہونے کے باوجود مسز بختیار شیردل نے اس cook کو پہچاننے میں چند سیکنڈز لگائے تھے جو ان کے خاندان میں ہونے والی سب سے بڑی ٹریجڈی کا ذمہ دار تھا۔ ان کا دھیان عکس مراد علی سے ہٹ گیا تھا..... کچھ دیر کے لیے وہ اس صدمے کو بھی بھول گئی تھیں جو ایک بار پھر اس ٹرافی کے شیردل کو نہ ملنے پر انہیں ہوا تھا..... کچھ دیر کے لیے ان کا ذہن جیسے بالکل blank ہو گیا تھا۔ مسئلہ صرف خیر دین کو دیکھنے کا نہیں تھا مسئلہ خیر دین کو ایک غلط gathering میں دیکھنے کا تھا۔ وہ کس پروڈیوسر کی وجہ سے وہاں موجود تھا۔ یہ بھی بہت دیر تک ان سے چھپا نہیں رہا تھا۔ انہوں نے شاک کے عالم میں

شروع کر دیا تھا اور پھر جب ایک بار انسٹرکٹرز اس کے بلانے پر آنے کے بجائے اسے عکس کی وجہ سے انتظار کروانا رہا تو ایک نے کانوں پر چڑھائے ہوئے ear pluge اتار کر بڑی خفگی سے انسٹرکٹر سے کہہ ہی دیا تھا۔  
چند لمحوں کے لیے انسٹرکٹر کو اس کی بات کی سمجھ ہی نہیں آئی۔ بات مزاحیہ لگی تو اسے لیکن یقیناً ہنسانے کے لیے نہیں کی گئی تھی۔

”سر آپ پہلے ان کی بات سن لیں۔“ عکس نے انسٹرکٹر سے کہا۔ وہ انسٹرکٹر کی اس قدر توجہ کو خود بھی ہضم نہیں کر پا رہی تھی۔ انسٹرکٹر بادل ناخواستہ شیردل کی طرف چلا گیا۔

بریک میں شیردل اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ یہ اب روشنی میں ہونے لگا تھا وہ بے مقصد اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتا اور پھر بات چیت شروع کر دیتا آج بھی اس نے یہی کیا تھا۔

”اس طرح کے دو چار الو تمہیں پھر مل گئے تو بیسٹ پروڈیوسر کی ٹرافی ایک بار پھر تم لے جاؤ گی۔“ بڑے سرسری انداز میں کہی ہوئی اس بات میں بڑی تضحیک تھی جو عکس نے محسوس کی تھی۔

”ایکسکیوز می..... میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھتی۔“ اس نے بڑی شائستگی سے شیردل کو ٹوکا۔ پتا نہیں شیردل کس موڈ میں تھا لیکن اس نے بڑے اطمینان سے اس کی GTP کی بیسٹ پروڈیوسر کی ٹرافی کا کریڈٹ ان دو مردوں کو دیا تھا جن میں سے ایک کا نام لینا وہ سؤر کا نام لینے کے مترادف سمجھتا تھا اور دوسرے کو وہ گدھا نہیں خچر سمجھتا تھا۔ بڑے استہزاء نے انداز میں اس نے عکس کو جتایا تھا کہ وہ اسپورٹس کے ان دو ایونٹس میں مردوں کی پائرٹرشپ کی وجہ سے جیت سکتی تھی اور صرف ان فتوحات کی وجہ سے شیردل اور اس کے پوائنٹس میں فرق آ گیا تھا ورنہ وہ بھی بیسٹ پروڈیوسر ٹرافی اپنے بل بوتے پر نہیں جیت سکتی تھی۔ پانی کی بوتل سے پانی پیتے ہوئے عکس نے شیردل کی یہ بکواس بے حد اطمینان سے سنی تھی۔

”تمہارا خیال ہے وہ اسپورٹس پوائنٹس مجھے نہ ملنے تو یہ ٹرافی اب بھی تمہارے خاندان کے پاس جاتی؟“ اس کی بات سننے کے بعد اس نے بے حد شائستگی کے ساتھ شیردل سے پوچھا تھا یوں جیسے وہ کسی بہت اہم مسئلے پر اس کی رائے لے رہی ہو۔

”fact ہے یہ۔“ شیردل نے کندھے اچکا کر کہا تھا۔

”شیردل اس بار تو کوئی مکسڈ گیسز نہیں ہیں نا..... تم اس بار بیسٹ پروڈیوسر کی ٹرافی لے لو۔“ شیردل چند لمحے اس سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ وہ سنجیدہ تھی لیکن بلا کے اطمینان کے ساتھ اسے بیسٹ پروڈیوسر کی ٹرافی جیتنے کا چیلنج یوں دے رہی تھی جیسے کسی بیکری سے کپ کیک لانے کا کہہ رہی ہو۔

”تمہیں لگتا ہے میں نہیں جیت سکتا؟“ ایک ابرو بے حد تیکھے انداز میں اچکاتے ہوئے شیردل نے اس سے پوچھا۔

”کیوں نہیں جیت سکتے..... تم ہمارے کامن کے بیسٹ رائٹر ہو، بیسٹ سوئر ہو، بیسٹ ٹینس پلیئر ہو، مجھے یقین ہے بیسٹ شوٹر بھی تم ہی ہو گے..... کیوں نہیں جیت سکتے تم۔“ اس نے اس طرح اطمینان سے کہا تھا جیسے ایک فارم پنچر اپنے اسٹوڈنٹ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اسے اس کی قابلیت کا یقین دلاتے ہوئے کسی بڑے مقابلے میں بھیجنے کے لیے تیار کر رہی ہو۔

”لیکن بات یہ ہے ایک شیردل کہ یہ اوپیکس ہوتے تو تنہی جیتنے ہر کھیل میں لیکن خوش قسمتی سے یہ اوپیکس

ہے؟“ انہوں نے خوش دلی سے بات کرتے ہوئے اپنی بیوی کے تبصرے کو lightly لیا۔ ان کی بیوی کبھی بھی اس طرح کی باتیں اور تبصرے کرنے کی عادی نہیں تھیں جیسا تبصرہ انہوں نے اس وقت ان سے سنا تھا۔  
 ”generally“ بات کر رہی ہوں کسی خاص شخص کی طرف اشارہ نہیں ہے میرا۔“ انہوں نے شوہر کی بات پر..... ایک دم کچھ سنبھل کر کہا تھا۔

”ویسے آپ عکس مراد علی کی تعریف کس حوالے سے کر رہے تھے؟“ انہوں نے بات کرتے کرتے ایک دم موضوع بدلا۔

”بہت قابل آفیسر ہے اور بہت گروڈ..... اچھا لگا مجھے اس سے مل کر۔“ بختیار نے کہا۔  
 ”فیملی بیک گراؤنڈ کوئی اتنا اچھا نہیں ہے اس کا۔“ شیردل کی مٹی نے بے ساختہ ان سے کہا۔ ”ماں نے دوسری شادی کی ہوئی ہے نڈل ایسٹ میں کہیں ہے وہ سوتیلے باپ اور فیملی کے ساتھ..... اور نانا دال کی کوئی دکان چلاتا ہے۔ خیر دین کی دال کا سنا ہوگا آپ نے۔“ بختیار کو بیوی کا انداز آج حیران کر رہا تھا۔ ان کے لہجے میں پہلی بار وہ اس طرح کی تفحیک محسوس کر رہے تھے اور انہیں وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ کیا صرف وہ جیسی جو ایک ماں اس لیے محسوس کرتی ہے کیونکہ اس کے بیٹے کا حق سمجھی جانے والی چیز کسی اور نے چھین لی تھی..... چاہے قابلیت کے بل پر درست طریقے سے ہی سہی لیکن تھوڑی بہت خفگی اور جیسی بہت نیچرل بات تھی اس صورت حال میں۔

”ہاں میں نے سنا ہے خیر دین کی دال کے بارے میں۔ پہلے بھی میں نے سنا تھا اس حوالے سے کسی سینئر آفیسر سے..... لیکن مجھے اس آدمی سے ملے ہوئے بہت اچھا لگا۔ وہ بات چیت سے رکھ رکھاؤ سے بالکل مزدور نہیں لگ رہا تھا بلکہ مجھے کافی پڑھا لکھا لگا..... تمہیں بھی ملنا چاہیے تھا اس سے جب شیردل کہہ رہا تھا۔“ بختیار نے بات کو تھوڑا سا بدل دیا تھا۔

”مجھے دلچسپی نہیں تھی۔“ انہوں نے کہہ کر بات کا موضوع ایک بار پھر بدل دیا۔ لیکن اب ایک عجیب سی بے چینی انہیں ہو رہی تھی۔ شیردل نے ان سے ذکر نہیں کیا تھا لیکن کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ خیر دین کو اس پوسٹنگ کے حوالے سے اور عکس کو چڑیا کے حوالے سے جانتا تھا اور وہ ان سے چھپا رہا تھا۔ انہیں یاد تھا وہ ماں کی چڑیا کے لیے ناپسندیدگی جاننے کے بعد ماں سے چڑیا کے بارے میں بہت کچھ چھپانے لگا تھا۔ مسٹر بختیار شیردل کو ایک عجیب سا اضطراب ہوا تھا۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا یہ ناممکن تو نہیں تھا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس کی عکس مراد علی سے اتنی دوستی ہو اور عکس مراد علی اور خیر دین اس کا نام اور خاندان کے بارے میں جاننے کے بعد یہ نہ جان پائیں کہ وہ کون تھا..... اور اگر انہوں نے بالفرض شیردل کو نہیں پہچانا تھا تو شیردل تو ان دونوں کو پہچان سکتا تھا..... یا پہچانتا تھا اور ان سے چھپا رہا تھا اور چھپا رہا تھا تو یہ بہت خوفناک بات تھی۔ اس رات وہ اپنے بستر پر کروٹیں لیتی رہیں انہیں نیند نہیں آئی۔ وجوہات بہت ساری تھیں انہیں شہباز حسین یاد آیا تھا..... ان کا جان سے پیارا اکلوتا چھوٹا بھائی..... جس کی موت کے ساتھ ہی اس کا خاندان ختم ہو گیا تھا۔ منزہ کی زندگی کا سب سے بڑا tarumal یہی تھا۔ وہ شرمین کو شہباز کی خودکشی کا ذمہ دار سمجھتی تھیں اور آج خیر دین اور عکس کو دیکھنے پر یک دم انہیں یوں لگا تھا جیسے شہباز کی موت کی وجہ وہ دونوں تھے..... وہ ایک پھانس تھی جو ان کے دل سے نکلتی ہی نہیں تھی۔ انہوں نے اگلے ہی دن شیردل سے عکس مراد علی کے بارے میں بات چیت کی تھی۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خود اسے خیر دین کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتا کر بات شروع کریں لیکن وہ یہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ شیردل ان کے بارے میں کیا جانتا تھا اور کیا نہیں۔

عکس مراد علی کو دیکھا تھا۔ یوں جیسے انہوں نے کسی بھوت کو دیکھ لیا تھا..... اور یہ غلط بھی نہیں تھا وہ اپنے خاندان کے ماضی کا ایک بھوت ہی دیکھ رہی تھیں اس لڑکی کی شکل میں..... انہیں وہ نو سالہ بچی یاد آئی تھی جس کی باتیں ان کا پٹا quotations کی طرح دہرایا کرتا تھا ان کے سامنے اور جس کی باتیں انہیں شدید خفا کرتی تھیں کیونکہ انہیں لگتا تھا ان میں بناوٹ کی بو تھی..... عمر سے زیادہ کی maturity تھی..... اور چلیج تھا..... وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس بچی کو ناپسند کرنے لگی تھیں جس کے ساتھ کھیلنے کے لیے ایک شیردل ان سے سو جھوٹ بولنے پر تیار رہتا تھا..... وہ بھی چڑیا کی باتوں کو ایک بچے کی ذہانت سمجھ کر اسے داؤ نہیں دے سکتی تھیں اور اب اسی چڑیا کے لیے وہ اسی ہال میں کھڑے تالیاں بجانے پر مجبور تھیں اس کے باوجود کہ اس نے وہ ٹرائی ان کے خاندان سے چھینی تھی جیسے شیر کے منہ سے نوالہ چھین لیا ہو اور اس کے باوجود کہ وہ اس لڑکی کی وجہ سے اپنے عزیز ترین اٹائے اپنے بھائی سے محروم ہوئی تھیں۔

اسی خالی ذہن اور بے تاثر چہرے کے ساتھ انہوں نے تقریب کے بعد ہونے والے ڈنر کو اینڈ کیا تھا۔ شیردل نے ماں کے اکھڑے ہوئے موڈ کو محسوس کر لیا تھا اور اس کا خیال تھا یہ اس کے ٹرائی نہ جیتنے کی وجہ سے تھا۔ ڈنر کے دوران تمام کامنرز کے والدین ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ شیردل نے بھی بختیار اور ماں کو عکس اور اس کے نانا سے ملوانے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا..... بے حد کورا انکار۔ شیردل نے ان کے لہجے کی اس رکھائی اور انکار کو بھی عکس مراد علی کو ملنے والی ٹرائی کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ ماں زندگی میں پہلی بار کسی سوشل گید رنگ میں اس طرح ری ایکٹ کر رہی تھیں کہ شیردل کو انہیں سمجھنا مشکل ہو رہا تھا۔ بختیار شیردل اپنی بیوی کے انکار کے باوجود شیردل کے ساتھ بڑی خوش دلی سے عکس اور اس کے نانا سے ملے تھے۔ خیر دین اور ان کا بھی پہلے آنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے چند منٹ خیر دین کو عکس مراد علی کی کامیابی کی مبارک باد دی، عکس کے ساتھ گپ شپ کی اور پھر شیردل کے ساتھ ہی واپس آ گئے۔

”اچھی لڑکی ہے۔“ شیردل کی مٹی نے بختیار شیردل کو عکس سے مل کر واپس آنے پر اس کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے سنا تھا۔ انہوں نے شوہر کے اس تبصرے کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ شیردل سے عکس مراد علی کے بارے میں بہت کچھ سنتی رہتی تھیں۔ انہیں اندازہ تھا CTP میں ایک شیردل کی عکس کے علاوہ کسی اور سے دوستی نہیں تھی۔ بعض دفعہ انہیں شیردل عکس سے ضرورت سے زیادہ متاثر محسوس ہوتا لیکن انہوں نے کبھی اس چیز پر زیادہ غور خواص نہیں کیا تھا کیونکہ عکس مراد علی ایک شیردل کی پہلی دوست نہیں تھی۔

وہ اس رات تقریب سے واپس چلے آئے پر گھر میں بھی بہت آپ سیٹ رہی تھیں اور بختیار نے ان کی اس پریشانی کے بارے میں سب سے پہلے تبصرہ کیا تھا۔

”آپ اب اس ٹرائی کو ذہن سے نکال دیں it went to the better officer نے انہیں بڑی صاف گوئی سے کہا تھا۔ وہ بھی اپنی بیوی کی اس خاموشی کو اس ٹرائی کے کھودینے کا رد عمل سمجھتے تھے لیکن انہیں حیرت تھی کہ ان کی بیوی اس ایک ٹرائی کو اتنا سیریسلی کیوں لے رہی تھیں۔

”سول سروس میں بھی اب پتا نہیں کیسے کیسے لوگ آنے لگے ہیں۔“ بختیار نے ڈرینگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنی بیوی کو عجیب سا تبصرہ کرتے سنا۔ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے کچھ حیرانی سے انہیں دیکھا تھا۔

”سول سروس میں ہمیشہ سے ہی پتا نہیں کیسے کیسے لوگ آتے رہتے ہیں۔ ویسے تمہارا اشارہ کس طرف

کبھی بھول کر نارمل نہیں ہوسکا تھا۔ ان دونوں کی کم عمری میں شادی ہوئی تھی۔ شہباز ان دنوں امریکا میں اپنی ڈگری کر رہا تھا جب وہاں کسی فیملی فرینڈز کے ہاں اس کی شرمین سے پہلی ملاقات ہوئی اور تیسری ملاقات میں اس نے شرمین کو پروپوز کر دیا تھا۔ وہ اس وقت 17 سال کی تھی شہباز 22 سال کا تھا۔ دونوں بہت اچھی فیملیز سے تعلق رکھتے تھے اور شکل و صورت میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔

”ان کی شادی پرفیکٹ میچ تھا۔ آپڈیل کپل..... love birds شہباز temperamental تھا لیکن شرمین کے لیے یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتا تھا کہ کبھی غصہ کر بھی لیتا تو بھی اسے خود ہی منایا کرتا تھا۔ وہ کبھی کبھار ڈرنک کرتا تھا لیکن شرمین اس کی اس عادت سے شادی سے پہلے ہی واقف تھی۔ اس کا اپنا فیملی سیٹ اپ بھی اتنا لبرل تھا کہ کبھی کبھار کی شراب نوشی اس میں معیوب بات نہیں تھی۔ شہباز حسین میں اور کوئی خامی نہیں تھی کم از کم تب تک شرمین ایسا کچھ اس میں دیکھ نہیں پائی تھی جس پر اسے کبھی پریشانی یا تشویش ہوتی۔ شادی کے بعد وہ سول سروس میں آیا تھا اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں کی طرح اور شرمین پاکستان شفٹ نہ ہونے کی خواہش رکھنے کے باوجود اس کی محبت میں اس کے ساتھ پاکستان چلی آئی تھی۔ اسے وہاں آکر ایڈجسٹ ہونے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی تھی۔ شہباز کی صرف ایک بہن تھی اور وہ بھی میر ڈتھی لیکن اس کی extended family کافی زیادہ تھی۔ شرمین کو اس کی فیملی میں بڑی گرم جوشی سے لیا گیا تھا۔

شادی کے دس سال بہت آرام سے گزرے تھے۔ شادی کے شروع کے چند سالوں میں اوپر نیچے کے تین چار miscarriages کے بعد شہباز شرمین کے بارے میں ضرورت سے زیادہ پروٹیکو ہو گیا تھا۔ شہر ہانوں کی پیدائش کے بعد اس نے شرمین سے کہہ دیا تھا کہ اسے مزید بچوں کی ضرورت اور خواہش نہیں تھی۔ شرمین خود بھی زیادہ اولاد میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ ان کی زندگی میں آنے والا واحد طوفان خیر دین اور چڑیا کی وجہ سے آیا تھا اور وہ پہلا طوفان ہی ان کے رشتے کی جڑیں اکھاڑ گیا تھا۔

سسٹرائیکنس سے شرمین کی کئی سالوں کے بعد لاہور کا نوٹ میں ملاقات ہوئی تھی۔ شہباز کی اگلی پوسٹنگ بہت عرصے کے بعد واپس لاہور میں ہوئی تھی۔ شہر بانو تب آٹھ سال کی تھی۔ سسٹرائیکنس لاہور کا نوٹ میں تھیں لیکن اس بار وہ وہاں پرنسپل کے طور پر نہیں تھیں۔ شرمین سے ان کی ملاقات اتفاقی ہوئی تھی۔ شرمین خود بھی لاہور کا نوٹ میں بہت بچپن میں چند سال زیر تعلیم رہی تھی۔ سسٹرائیکنس کے ساتھ کچھ سال پہلے ہونے والے تلخ تجربے کے باوجود شرمین ان سے بہت گرم جوشی سے ملی تھی لیکن سسٹرائیکنس اس سے تب بھی کچھ پیچھے ہی رہی تھیں۔ ان کے رویے نے شرمین کو ایک بار پھر چند سال پہلے ہونے والے اس واقعے کے حوالے سے بحسب کا شکار کر دیا تھا۔ اس نے اس بار شہباز حسین کو سسٹرائیکنس کے بارے میں بتانے کی حماقت نہیں کی تھی۔ وہ ایک بار پھر شہر بانو کی اسکولنگ کے حوالے سے شہباز حسین کے رویے میں کوئی افراتفری دیکھنا نہیں چاہتی تھی لیکن اس بار اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سسٹرائیکنس سے ان کے اور شہباز حسین کے درمیان ہونے والے تنازعے کی اصل وجہ جاننے کے لیے ضرور کوشش کرے گی اور اگر ممکن ہو تو وہ اس تنازعے کو حل بھی کرادے گی۔

وہ سسٹرائیکنس سے اس تنازعے کی وجہ جاننے پر اتنا اصرار نہ کرتیں تو سسٹرائیکنس چڑیا اور خیر دین کے ساتھ ہونے والے واقعات کبھی شرمین کے ساتھ شیر نہ کرتیں۔ سسٹرائیکنس سے سب کچھ سننے کے بعد شرمین اگلے کئی

”جتنی میری کبھی اس معاملے پر اس سے تفصیلی بات نہیں ہوئی۔ اس کے نانا کی تودال کی ایک بڑی مشہور دکان ہے میں نے آپ کو بتایا تھا۔“ شیردل نے کہنا شروع کیا۔

”اور جو اس کے سوتیلے والد ہیں وہ.....“ منزہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اس کے نانا دال کی دکان کھولنے سے پہلے کیا کرتے تھے؟“ شیردل ماں کی بات پر ہنس دیا۔

”مئی ان کا بزنس ہے یہ اور بہت established ہے یہ..... یہی کرتے ہوں گے وہ ہمیشہ سے.....“ اس نے بے پروائی سے کہا تھا۔ منزہ اس کا چہرہ بڑے غور سے دیکھتی رہیں یوں جیسے یہ جاننے کی کوشش کر رہی ہوں کہ وہ ان سے کچھ چھپانے کی کوشش تو نہیں کر رہا تھا لیکن شیردل کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا جس سے انہیں یہ وہم ہوتا کہ وہ ایسا کچھ کر رہا تھا۔

”زیادہ اچھا فیملی بیک گراؤنڈ نہیں ہے اس کا۔“ منزہ نے بالآخر کہنا شروع کیا۔ ”ویسے تم تو اس کے نانا سے اکثر ملتے رہتے ہو گے؟“ منزہ نے بات شروع کر کے یک دم کہا۔

”نہیں اکثر تو نہیں لیکن ہاں ان سے مل چکا ہوں چند بار پہلے بھی..... کبھی کبھار دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ کے دوران آؤٹ آف سٹی جاتے ہوئے دال کھانے لے جاتے تھے میرے دوست وہاں..... یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ عکس کے نانا ہیں وہ..... اچھے آدمی ہیں ویسے.....“ شیردل نے بے پروائی سے تبصرہ کیا تھا۔

”خاندان بڑا matter کرتا ہے۔“ منزہ نے یہ بات اس ساری گفتگو کے جواب میں کیوں کہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ نہ اس کی سمجھ میں آیا..... نہ شیردل کی سمجھ میں..... لیکن وہ خیر دین اور عکس کے بیک گراؤنڈ کے حوالے سے منزہ کی باتیں سنتا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے وہ منزہ کی بہت سی باتوں سے متفق تھا۔

ایکڈی سے پاس آؤٹ ہونے کے ایک سال بعد منزہ کے سامنے شادی کے تذکرے پر سرسری انداز میں عکس کا نام لینے پر اس نے ماں سے دوبارہ وہی لیکچر سنا تھا اور اس وقت اسے احساس ہوا اس کی ماں بہت پہلے اس خطرے کو بھانپ چکی تھی، نہ بھانپ چکی ہوتی تو اسے ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنے خاندانی ہونے اور خاندانی رہنے کی اہمیت کو جتنا نہ چکی ہوتی۔ وہ ماں سے زیادہ بحث نہیں کر سکتا تھا۔ کہیں نہ کہیں لاشعوری طور پر وہ بھی طبقاتی فرق اور اچھے بیک گراؤنڈ کی اہمیت پر یقین رکھتا تھا اور کہیں نہ کہیں وہ بھی عکس مراد علی سے شادی کرنے کی شدید خواہش کے باوجود اس ایک معاملے کی وجہ سے ہچکچاتا تھا۔ وہ ہلکا پھلکا پروپوزل جو اس نے بظاہر غیر سنجیدگی سے عکس کو دیا تھا اس نے تھینک پویری میچ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا..... اسے عکس کی طرف سے کسی دلچسپی کا اظہار ملا ہوتا تو وہ ماں کی ان باتوں پر کسی نہ کسی حد تک عکس کا دفاع کرتا..... بالکل اسی طرح جس طرح اس نے عکس کو دوسری بار پروپوزل کرنے کے وقت منزہ سے اس معاملے پر شدید بحث کی تھی..... وہ کم سے کم دوسری بار عکس سے شادی کرنے میں اس کے خاندانی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے متامل نہیں تھا، نہ ہی وہ ماں کو اس بات کے لیے blame کرتا تھا کہ عکس سے اس کی شادی نہ ہونے کی وجہ وہ بنی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ اگر عکس راضی ہو جائے تو وہ ماں کو منالیتا..... شیردل کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ وہ بختیار شیردل کو مناسکتا تھا۔ وہ منزہ بختیار کو کبھی راضی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں مسئلہ خاندانی بیک گراؤنڈ نہیں تھا، یہاں مسئلہ شہباز حسین تھا۔

☆☆☆

شرمین شہباز حسین کو کبھی نہیں بھول سکی تھی بالکل اسی طرح جیسے شہباز حسین اس کی زندگی سے نکل جانے کو



اپنی زندگی کے سب سے بڑے کرائس کا سامنا کرنا پڑا تھا۔  
اس دن شرمین نے گھر جا کر شہباز سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس نے طے کیا تھا کہ وہ اس بار خیر دین اور  
چڑیا سے ملے گی۔ کسی بھی طرح کچھ بھی کر کے۔۔۔۔۔ اور وہ خیر دین سے ملنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔  
زندگی میں بہت دفعہ شرمین کو اس ایک ملاقات کا رنج رہا۔ وہ خیر دین سے نہ ملتی تو اس کا گھر بچا رہ سکتا  
تھا۔۔۔۔۔ شہباز حسین زندہ رہ سکتا تھا۔ اسے پاکستان چھوڑ کر نہ آنا پڑتا۔

☆☆☆

”تم واپس کب آرہی ہو؟“ شہر بانو نے مسکراتے ہوئے منزہ کا سوال سنا اور پھر ہنس دی۔  
”ممی لگتا ہے آپ اس بار مجھے شیر دل سے بھی زیادہ مس کر رہی ہیں۔“ منزہ جواب میں مسکرائیں سکی تھیں۔  
”شیر دل تو جب سے سنگاپور کورس کے لیے گیا ہے اسے سب بھول گیا ہے ممی۔“ شہر بانو نے منزہ کے موڈ  
کا اندازہ لگائے بغیر مسکراتے ہوئے اس سے شیر دل کی شکایت کی۔

”شہر بانو مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ منزہ نے یک دم اسے ٹوک دیا۔ اس وقت پہلی بار شہر بانو نے  
اپنی ساس کے لہجے کا اضطراب نوٹس کیا۔

”کیا ہوا ممی؟ خیریت تو ہے؟“ وہ بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”خیریت نہیں ہے۔“ منزہ نے بے ساختہ کہا۔

”آپ مجھے پریشان کر رہی ہیں ممی۔“ شہر بانو الجھ گئی تھی۔

”دیکھو بیٹا میں تم سے جو بھی ڈسکس کر دوں اس کا ذکر تم شرمین سے مت کرنا۔“ منزہ نے بات شروع کرنے  
سے پہلے اسے ہدایت دی۔

”ایسی کیا بات ہے ممی۔“ وہ کچھ اور الجھی۔

”شرمین کبھی اس مسئلے کی سنجیدگی کو نہیں سمجھے گی۔ وہ ایک سمجھدار عورت نہیں ہے۔ بے وقوف ہے، جذباتی  
ہے۔ اس نے خود ہمیشہ غلط فیصلے کیے ہیں اور میں جانتی ہوں وہ تمہیں کبھی صحیح طریقے سے گائیڈ نہیں کر سکتی۔ وہ  
تمہیں بھی ہمیشہ غلط فیصلہ کرنے ہی کا مشورہ دے گی۔“ منزہ کی یہ ساری تنقید شہر بانو کے لیے نئی چیز نہیں تھی۔ وہ  
جانتی تھی منزہ اور شرمین ایک دوسرے کو شدید نا پسند کرتی تھیں اور یہ نا پسندیدگی منزہ کی طرف سے زیادہ تھی۔ وہ  
اپنے بھائی کی موت کا ذمے دار کھلے لفظوں میں شرمین کو کہتی تھی لیکن بہر حال وہ یہ بات شہر بانو کے سامنے نہیں کہتی  
تھی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہ بات شہر بانو کے سامنے کہہ بھی دے تو بھی شہر بانو کو برا نہیں لگے گا کیونکہ ایک  
بہت طویل عرصہ وہ بھی منزہ ہی کی طرح شرمین کو اپنے باپ کی موت کا ذمے دار سمجھتی رہی تھی اور شاید یہی وجہ تھی  
کہ منزہ کی شرمین پر کی جانے والی تنقید کا اس نے کبھی برا نہیں منایا تھا۔ منزہ خود اسے بے حد عزیز رکھتی تھی۔ وہ  
بچپن میں بھی اپنے بھائی کی اکلوتی اولاد سے بہت پیار کرتی تھی اور شرمین کے پاکستان سے چلے جانے کے بعد  
بھی اس نے شرمین سے بہت دفعہ رابطہ کر کے شہر بانو سے ملنے کی کوشش کی تھی۔ شرمین نے ہمیشہ ان کی ان  
کوششوں کا بہت حوصلہ شکن جواب دیا تھا۔ آہستہ آہستہ منزہ نے بھی یہ کوشش ختم کر دی تھی۔

”ممی آپ بتائیں کیا بات ہے؟“ شہر بانو نے فی الحال شرمین پر ہونے والی تنقید میں دلچسپی لینے کے  
بجائے پوچھا تھا۔

منٹ بے یقینی کے عالم میں سسٹر ایکٹس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اسے لگ سسٹر ایکٹس کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔  
”یہ شہباز نے کیا؟“ اس نے شک میں پوچھا تھا۔ سسٹر ایکٹس تائید میں سر ہلاتے ہوئے اسے کچھ اور  
تفصیلات بتانے لگی تھیں۔

شرمین سرد ہاتھ پیروں کے ساتھ پلکیں جھپکائے بغیر سسٹر ایکٹس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس کا دماغ گھومنے  
لگا تھا۔ وہ شہباز حسین پر کیسا گھناؤنا الزام لگا رہی تھیں۔ شہباز ایسا کس طرح ہو سکتا تھا۔ اس نے اتنے سالوں میں  
اپنے شوہر میں معمولی سی بھی اخلاقی بے راہ روی نہیں دیکھی تھی اور سسٹر ایکٹس کہہ رہی تھیں وہ۔۔۔۔۔ شرمین آگے  
کچھ سوچ نہیں پا رہی تھی۔ اس کا دل کسی بات پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا دماغ اس واقعے کے بعد شہباز  
کی طرف سے بولے جانے والے تمام جھوٹوں کو جیسے کسی flashback کی طرح ایک کے بعد ایک اس کے  
دماغ کی اسکرین پر لانا جا رہا تھا۔ عجیب جنگ تھی جو اس کے دل و دماغ میں ہو رہی تھی۔ وہ سسٹر ایکٹس کے پاس  
سے ایک لفظ بھی کہے بغیر اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔ باہر آ کر گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اسے یاد آیا اسے شہر بانو کو اسکول  
سے لینا تھا۔ عجیب خالی الذہنی کے عالم میں اس نے شہر بانو کو اسکول سے نکلتے ہوئے بچوں میں ڈھونڈنا شروع کیا  
تھا اور جو ڈھونڈتی ہی چلی گئی تھی لیکن شہر بانو تو ملنے پر نہیں آرہی تھی اور تب اس پر یہ خوفناک انکشاف ہوا تھا کہ وہ تو  
شہر بانو کی شکل ہی بھول گئی تھی۔ ذہن پر بہت زور ڈالنے کے باوجود اسے اپنی اکلوتی بیٹی کی شکل یاد نہیں آرہی تھی۔  
اس نے عجیب خوف کے عالم میں اپنے پرس میں پڑے والٹ میں سے شہر بانو کی تصویر نکال کر جیسے خود کو اپنی بیٹی کا  
چہرہ یاد دلانے کی کوشش کی تھی اور پھر دوبارہ سراٹھا کر بچوں کے اس ہجوم میں شہر بانو کا چہرہ تلاش کیا تھا۔ ایک بار  
پھر شہر بانو کا چہرہ اس کے ذہن کی اسکرین سے صاف ہو گیا تھا۔ وہاں ایک اور چہرہ ابھر آیا تھا۔۔۔۔۔ اس نو سالہ چڑیا  
کا چہرہ۔۔۔۔۔ وہاں ہر بچے کا چہرہ ایک دم چڑیا کا چہرہ بن گیا تھا۔ اس کے سامنے درجنوں چڑیاں اُدھر سے اُدھر  
جا رہی تھیں۔ وہ کسی بت کی طرح بے حد خوف کے عالم میں پرس ہاتھ میں پکڑے ان بچوں کے ہجوم میں کھڑی  
تھی۔ ایک لمحے کو لگا تھا اس کا ذہنی توازن خراب ہو گیا تھا ورنہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی ہی اولاد کو نہ پہچان  
سکے۔۔۔۔۔ ماں ہو کے وہ اپنی اولاد کو نہ پہچان سکے۔۔۔۔۔ اور بھی کوئی یک دم اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا۔ شرمین  
نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ممی۔۔۔۔۔“ اسے شہر بانو کی کھلکھلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ اپنی پشت پر بیگ لٹکائے ماں کے پاس آچکی تھی۔  
بتا نہیں شرمین کو کیا ہوا تھا وہ بے اختیار وہیں کھڑے کھڑے بچوں کے بل بیٹھ گئی تھی۔ شہر بانو کو ساتھ  
لیٹاتے ہوئے وہ اسکول گیٹ کے پاس بچوں اور ان کے پیرنٹس کے ہجوم میں دھاڑیں مار مار کر روئی تھی اس بات کی  
پروا کیے بغیر کہ وہاں سے گزرنے والے بہت سے بچوں کے پیرنٹس اسے شہباز حسین کی بیوی کے طور پر جانتے  
تھے۔۔۔۔۔ اور وہ اپنی بیٹی کو emmbarras کر رہی تھی۔ شہر بانو عجیب دہشت زدہ ہو کر ماں کو اس طرح روتا  
دیکھتی رہی تھی۔ اس کا ذہن کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

شرمین اس دن اسکول سے گھر تک اسی طرح روتے ہوئے آئی تھی۔ وہ جکسا پزل جو وہ کئی سال پہلے صرف  
ایک بیس نہ ملنے کی وجہ سے حل نہیں ہوا تھا۔ وہ آج حل ہو گیا تھا۔ وہ گمشدہ بیس مل گیا تھا۔۔۔۔۔ لیکن اسے حل نہیں  
ہونا چاہیے تھا وہ بہت غلط وقت پر حل ہوا تھا۔ وہ کئی سالوں بعد ایک دوسرے بچے کے لیے کوشش کر رہے تھے اور  
شرمین کو چند دن پہلے اپنی پریگنٹسی کا پتا چلا تھا۔ وہ اور شہباز بہت خوش تھے اور اس ساری خوشی کے درمیان اسے



”شہباز پر اس کے ایک پرانے کک نے کچھ الزامات لگا کر کئی سال پہلے اس کی سرکاری نوکری سے برطرفی کے فیصلے کو کورٹ کے ذریعے چیلنج کیا ہے۔“ منزہ نے بالآخر اسے مختصر لفظوں میں بتایا۔

”میری سمجھ میں نہیں آیا..... پاپا پر اب کوئی کیس کیسے کر سکتا ہے؟“ منزہ کی بات شہربانو کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی۔

”تم عکس مراد علی کو جانتی ہو؟“ منزہ کے اگلے سوال نے شہربانو کو کچھ اور بھی حیران کیا۔

”جی وہ شیردل کی دوست اور کولیگ ہے۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”وہ اس کک کی نواسی ہے۔“ شہربانو کو ایک لمحے کے لیے کچھ سمجھ نہیں آیا۔

”مئی مجھے یہ equation سمجھ میں نہیں آئی۔ کون کک، کیسے الزامات؟ اور اس میں پاپا یا عکس کا کیا کنکشن ہے؟“ اس نے کچھ الجھ کر منزہ سے کہا۔

”اس فیملی نے کبھی اس گھر میں شہباز اور تمہاری مئی کو serve کیا تھا۔ پھر خیر دین نے گھر میں چوریاں کرنی شروع کر دیں اور شہباز نے اسے گھر سے نکال دیا۔ تمہاری مئی اس پر بہت خفا ہو گئیں کیونکہ خیر دین اس کا بڑا فیورٹ نوکر تھا اور خیر دین نے بھی شرمین کو الٹی سیدھی پٹیاں پڑھائیں..... شہباز پر بہت برے برے الزامات لگائے۔ اسی کے الزامات کی وجہ سے شرمین نے شہباز سے علیحدگی اختیار کی تھی اور اب اتنے سالوں کے بعد وہ پھر معصوم بن کر واپس آ گیا ہے اپنی اس نواسی کو لے کر جو پہلے شیردل سے شادی کے لیے اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور جب وہ نہیں ہوا تو اب یہ نیا پینڈو رہا کس لے کر آگئے ہیں وہ دونوں۔ میں چاہتی ہوں تم شیردل سے بات کرو۔ اسے سمجھاؤ کہ وہ اس لڑکی کو اور اس کے نانا کو منع کرے اس کیس سے..... وہ اس کی دوست ہے اس کے لیے مشکل نہیں ہے اسے یہ بات سمجھانا..... میں نے ابھی بھی اس سے بات کی ہے سنگاپور..... لیکن وہ کہہ رہا ہے وہ عکس کو منع نہیں کرے گا۔ اسے اپنے ماموں، اپنے خاندان تمہارے پاپ کی پروا نہیں ہے۔ اس لڑکی کی پروا ہے..... شہربانو تم اس سے بات کرو گی تبھی کچھ ہوگا۔“ منزہ اس سے کہتی جا رہی تھی یہ اندازہ لگائے بغیر کہ انہوں نے شہربانو کے کانوں میں سیسہ انڈیلا تھا تھوڑی دیر پہلے..... وہ گنگ فون کارڈیسورکان سے لگائے بیٹھی رہی تھی۔

شہباز حسین..... شرمین..... الزامات..... علیحدگی..... عکس مراد علی..... شیردل..... پتا نہیں ان میں سے کون سی بات نے اسے زیادہ کاٹا تھا..... کون سی بات آری تھی اور کون سی چھری..... لیکن شہربانو کا گھر گرداب میں پھنس گیا تھا اور اس کا دماغ چکرار ہا تھا۔

☆☆☆

اس نے چکراتے ہوئے سر کے ساتھ رات کے دو بجے شیردل کے بیڈروم کے دروازے کو بجانا شروع کیا تھا اور پھر وہ بے اختیار پالگوں کی طرح بجاتی ہی چلی گئی تھی۔ اس نے اندر سے شیردل کی خفگی میں کچھ کہنے کو بھی نہیں سنا تھا۔ شیردل نے ٹائٹ سوٹ میں بہت بڑبڑاتے ہوئے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تھا اور وہ عکس مراد علی کو دروازے پر دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ شیردل نے بے اختیار اس کا بازو پکڑا۔ وہ بچوں کی طرح اس سے لپٹ گئی تھی۔

”نانا..... نانا.....“ شیردل نے ہچکیوں اور سسکیوں میں اس کی آواز سنی۔

(باقی آئندہ)

## عکس

اس آئینے میں شہر بانو نے عکس اور طغزل کی پشت دیکھی تھی..... پھر اپنا چہرہ..... گاڑی کے کھلے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے اس گھر میں یہ تیسری چیز تھی جس نے شہر بانو کے دل پر ضرب لگائی تھی۔ اس آئینے میں اس نے پہلی بار اپنا جو عکس دیکھا تھا وہ جیسے تھوڑی طرح لوٹ کر اس کے پاس آیا تھا..... وہ پہلا عکس جس میں وہ تھی، مثال تھی اور شیردل تھا..... ایک خاندان تھا۔ خوشی تھی، مستقبل تھا اور اب جو عکس ابھرا تھا اس میں صرف شکست خوردگی تھی اور ماضی ہی ماضی تھا..... مثال اب بھی ساتھ تھی۔ شیردل ساتھ نہیں تھا۔

”زندگی ہمارے ساتھ یہ سب کیوں کرتی ہے؟“ اس نے عجیب سی تھکن کے ساتھ سوچا تھا۔ گاڑی پورچ میں رکھتے ہی اس کے دروازہ کھولنے سے بھی پہلے اس نے عکس اور طغزل کو براؤنڈ سے نکل کر پورچ میں اپنے استقبال کے لیے بڑھتے دیکھا۔ دروازہ ڈرائیور نے کھولا تھا۔ گاڑی سے نکل کر اس نے پہلی نظر اس عورت پر ڈالی جس عورت سے زیادہ اس نے زندگی میں کسی عورت سے نفرت نہیں کی تھی۔ وہ ان دونوں مردوں کو اس کی زندگی سے نکال دینے کا باعث بنی تھی جن کے گرد شہر بانو کی زندگی گھومتی تھی..... اس کی واحد حریف، واحد رقیب..... ایک عجیب سی بھگ اور خاموشی نے چند لمحوں کے لیے ان دونوں کو اپنی گرفت میں لیا تھا..... لیکن صرف چند لمحوں کے لیے پھر عکس آگے بڑھا آئی تھی۔

شہر بانو نے اس کی طرف مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ہمیشہ کی طرح محتاط انداز میں۔ عکس نے اس کا ہاتھ نہیں تھاما تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر گرم جوشی سے اس کو گلے لگایا تھا..... کیا ہزیمت تھی جو شہر بانو نے محسوس کی تھی اور کیا ذلت تھی جو اسے اپنے اس حریف کے پاس لے آئی تھی جس کی وہ شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

”سفر ٹھیک سے گزرا؟“ اس ملائم آواز نے اس سے پوچھا تھا۔ کانٹوں پر کیا جانے والا سفر ٹھیک سے کیسے گزر سکتا تھا؟ شہر بانو جواباً اس سے پوچھنا چاہتی تھی۔

”ہاں۔“ اس نے اپنے جواب کو وہیں چھوڑتے ہوئے نظریں ملائے اور عکس کے چہرے کو دیکھے بغیر کہا۔ وہ اس سے الگ ہو گئی تھی۔ شہر بانو نے جیسے عجیب سا سکون محسوس کیا۔ عکس مراد علی اب مثال کی طرف بڑھی تھی۔ شہر بانو نے اس کے چہرے پر بھی وہی اضطراب اور الجھن دیکھی جو اس نے چند لمحے پہلے خود محسوس کی تھی۔ اس نے بے اختیار اس سے نظریں ہٹالیں۔ کیا عجیب حسد تھا جو اس نے اس عورت کو اپنی اولاد کی طرف بڑھتے دیکھ کر محسوس کیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے جیسے وہ چلا کر اسے روک دینا چاہتی تھی کہ وہ اس کو مت چھوئے..... جو شیردل کے بعد اس کی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ تھا۔

”السلام علیکم۔“ طغزل کی آواز نے اس کے خیالات کے تسلسل کو توڑا تھا، وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ شکست خوردگی اور حسد نے شہر بانو کو چند لمحوں کے لیے کچھ عجیب سے انداز میں دیمک زدہ کیا تھا..... حسد، رنج، تکلیف، شکست..... بس اگر کچھ نہیں تھا جو شہر بانو نے محسوس نہیں کیا تھا تو وہ پچھتاوا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر اس کی بیٹی کو مشفقانہ انداز میں لپٹائے چومتی ہوئی اس عورت نے شہر بانو سے اس آئینے میں پہلی بار شہر بانو کو دکھائی دینے والے خوش و خرم خاندان کے عکس کو اس سے چھین کر اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا تھا..... اور وہ آج اس گھر میں ”اپنے خاندان“ کے ساتھ کھڑی تھی جہاں شہر بانو اپنی زندگی کے پینٹھڑے اور دھجیاں سینے ”پناہ“ کے لیے آئی تھی..... بدترین دشمن کی چھت کے نیچے پناہ..... زندگی ہمارے ساتھ کیا کرتی ہے!

☆☆☆

زندگی میں پہلی بار شیردل اسے روتے دیکھ رہا تھا..... بچوں کی طرح روتے ہوئے..... جو اس باختہ، خوف زدہ، کسی انہونی سے دہشت زدہ، آنے والے کسی برے لمحے سے آسیب زدہ..... پتھر سے بھر بھری مٹی بنتے ہوئے..... اور اتنے سیالوں میں یہ پہلی بار ہوا تھا۔ وہ اس عکس مراد علی سے پہلی بار متعارف ہوا تھا اور اسے خوشی نہیں ہوئی تھی عجیب تکلیف پہنچی تھی۔

خیر دین دل کے دورے کے بعد تشویشناک حالت میں ICU میں تھا۔ رات کے پچھلے پہر جگا کر دی جانے والی یہ

شیردل اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ اپنے نانا کے بہت قریب تھی اس کا اندازہ اسے اتنے سالوں میں اس کے چڑیا ہونے کی اصلیت نہ پتا ہونے کے باوجود تھا لیکن یہ اندازہ اسے بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے ارد گرد خونی رشتوں کے قحط کا بھی شکار تھی اور شاید نانا سے اس کی اتنی closeness کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

”کسی نہ کسی کو تو ہاسپٹل ہونا چاہیے تمہاری ٹیلی میں سے..... تمہارے پاکستان پہنچتے ہوئے بھی ایک دن گزر جائے گا..... تمہاری امی سے بات نہیں ہوئی ابھی..... ہو سکتا ہے وہ جلدی ٹکٹ کا انتظام کر کے واپس آسکیں لیکن بہت جلدی بھی ہو تو بھی دس بارہ گھنٹے سے پہلے نہیں ہو سکتا یہ۔“ شیردل جیسے اس سے بات کرتے ہوئے اپنے ذہن میں ان تمام ممکنہ طریقوں کو بھی consider رہا تھا جن کے ذریعے وہ اس مسئلے کا حل نکال سکتا تھا اور اس کا ذہن جس حل پر آ کے رکھا تھا وہ اسے ذہن سے جھٹک دینا چاہتا تھا لیکن چاہتے ہوئے بھی جھٹک نہیں سکا۔

”جواد کو انفارم کرو۔۔۔۔۔۔ وہ وہاں آ جائے تو بہتر ہے۔“ شیردل نے اپنے فون پر عکس کی والدہ کا نمبر ملاتے ہوئے کہا اور وہ پہلا موقع تھا جب عکس کو جواد یاد آیا۔ وہ کئی دنوں سے رابطے میں نہیں تھے۔ اس واقعے کے بعد ایک عجیب سی خلیج آگئی تھی ان کے رشتے میں۔

”زندگی میں کبھی بھی جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔“ خیردین نے جواد کے خلاف بننے والے پولیس کیس کے بارے میں جاننے پر اس سے کہا تھا جب وہ شدید غصے اور رنجیدگی میں اس رشتے کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔

”اس معاملے کو ختم ہونے دو..... جواد کی بات سنو کہ وہ اس معاملے کے بارے میں کیا کہتا ہے اور پھر کوئی فیصلہ کرو۔“ خیردین نے اپنی مایوسی اور پریشانی کو چھپاتے ہوئے اس کی رنجیدگی اور اضطراب کو کم کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس کی تکلیف اور مایوسی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ شادی سے چند ہفتے پہلے ہونے والے اس واقعے نے اسے شدید ذہنی اذیت تو پہنچائی ہی تھی لیکن جواد پر اس کے اعتماد کو بری طرح ٹھیس بھی پہنچائی تھی۔

”وہ کیا کہے گا نانا.....؟ سچ تو کبھی نہیں بولے گا..... کوئی نہ کوئی بہانہ کوئی نہ کوئی جھوٹ ہی بولے گا اس ساری پچویشن کی وضاحت کے لیے۔“

”پھر بھی موقع دوا سے وضاحت دینے کے لیے۔ جھوٹ بولے تو بھی سنو۔“ وہ عجیب سی تکلیف میں ہنس پڑی تھی۔

”جھوٹ بولے تو بھی سنو..... عجیب logic ہے نانا۔“ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ خیردین کو عجیب تکلیف ہوئی تھی اس کی بات پر..... وہ ڈھائی سال سے جواد سے مل رہی تھی..... اس کے لیے پسندیدگی رکھتی تھی۔ جواد نے جب اسے پروپوز کیا تھا تو عکس نے امریکا سے فون کر کے اسے بڑی خوشی کے عالم میں بتایا تھا۔ وہ جواد کو اس کے دوست کی حیثیت سے جانتا تھا۔ امریکا جانے کے بعد سے مسلسل اس سے اس کا ذکر سنتا آ رہا تھا لیکن اس نئی حیثیت سے وہ اس سے پہلی بار متعارف ہوا تھا۔ جواد کی ٹیلی اس کی عدم موجودگی میں ہی خیردین اور حلیمہ سے اس کے رشتے کے حوالے سے ملنے آئی تھی۔ ان کی سماجی حیثیت خیردین کے خاندان سے کہیں بہتر تھی اور خیردین کو خوشی ہوئی تھی کہ وہ ایک اچھے خاندان کا حصہ بنے گی لیکن اس نے عکس کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ان کی گفتگو میں ان کے اپنے خاندان کے لیے بہت تکبر تھا..... وہ تکبر خیردین کو ہر بار دکھاتا اور چھٹاتا تھا۔ وہ عکس کے ریفرنس سے نہ آئے ہوتے تو خیردین پہلی ملاقات کے بعد ہی ان سے معذرت کر لیتا لیکن وہ عکس کے حوالے سے آئے تھے جس کی جواد کے بارے میں رائے بہت اچھی تھی۔

”اباب وہ اتنے بڑے خاندان سے ہیں تو تھوڑا بہت تو غرور ہوتا ہی ہے انسان کو اپنے خاندان پر۔ اب اگر ہم ہر رشتے کو اتنی باریک بینی سے دیکھ دیکھ کر چھان بچھان کرنے لگے تو پھر تو کہاں کوئی ڈھنگ کا رشتہ ملے گا..... ویسے بھی شادی کی عمر لگی جا رہی ہے اس کی..... آپ کو تو فکر ہی نہیں ہے۔“ حلیمہ نے خیردین کے اعتراضات پر اس سے کہا تھا۔

”اگر ایسی بری فطرت کے لوگ ہوتے تو اپنے بیٹے کے کہنے پر بھی ہمارے جیسے خاندان میں رشتے کی بات کرنے نہ آتے۔“ حلیمہ بالکل مطمئن تھی بلکہ بے حد خوش تھی عکس کے لیے ایسے خاندان سے رشتہ آنے پر۔ اس سے پہلے اس کے لیے جتنے بھی رشتے آتے رہے تھے ان میں سے کوئی بھی اتنے بڑے خاندان سے نہیں تھا۔ حلیمہ ایک عام ماں بھی جس کے لیے یہ فخر کی بات تھی کہ اس کی بیٹی اتنی لائق بھی لیکن اب اس کے لیے زیادہ مسرت کی بات یہ تھی کہ ایک اتنا بڑا خاندان اس

خبر عکس کو چڑیا بنا گئی تھی..... خیردین اس کی زندگی کا محور تھا اور عکس کے لیے فوری طور پر یہ تصور کرنا بھی مشکل تھا کہ اس کی زندگی کا وہ محور ختم ہو سکتا تھا۔ ختم ہو جاتا تو وہ کیا کرتی۔ اس کی زندگی میں خیردین کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ شیردل سے محبت تھی رشتہ نہیں تھا۔ جواد سے رشتہ تھا محبت نہیں تھی..... صرف خیردین سے رشتہ اور محبت دونوں تھے۔ صرف وہ تھا جس نے اپنے وجود کو ہمیشہ اس کے لیے چھتری بنائے رکھا تھا اور اس چھتری کے بغیر کھڑے ہونے کا تصور بھی عکس کے لیے سوہان روح تھا۔

”انکل ICU میں ہیں لیکن ٹھیک ہیں۔“ شیردل نے بہت گول مول انداز میں اسے تسلی دی تھی۔ اس نے ابھی کچھ دیر پہلے پاکستان میں اپنے پی اے کے ذریعے ہاسپٹل کی management سے رابطہ کر کے بات کی تھی۔ خیردین کی حالت نازک تھی۔ لیکن وہ زندہ تھا اور جب تک وہ زندہ تھا وہ عکس کو دلا سادے سکتا تھا۔ وہ اس کے بیداروں میں پڑی کرسی پر بیٹھی اس کی فون کالز کے دوران بھی اسی طرح ہچکچو اور سسکیوں سے روٹی رہی تھی۔ پتا نہیں اسے یہ خوف کیوں تھا کہ اس سے جھوٹ بولا جا رہا تھا۔ وہ پاکستان جائے گی تو خیردین اسے زندہ نہیں ملے گا۔ شیردل کی فون کالز اور ہاسپٹل انتظامیہ کے ساتھ ہونے والی اس کی بات چیت کے باوجود۔

”سیٹ کروادوں تمہاری؟“ شیردل نے اسے خیردین کی حالت کے بارے میں بتانے کے بعد اس سے بڑی نرم آواز میں پوچھا۔ اس نے کچھ بھی کہنے کے بجائے اسی طرح سر جھکائے ٹشو سے اپنی سرخ ناک رگڑتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ اس کا مافوق ذہن اب آہستہ آہستہ اس شاک سے باہر آ رہا تھا جو آدھی رات کو وہ فون کال سن کر اسے لگا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں موجود انٹرکام فون کی بیل پر ہی جاگئی تھی اور چند لمحوں کے لیے اسے لگا جیسے وہ wake up call کے لیے کیا جانے والا فون تھا جو ہر روز صبح پانچ بجے اسے دی جاتی تھی لیکن پھر کال ریسیو کرتے ہی اس ریڈیٹس کی reception پر ناٹ ڈیوٹی کرنے والے نے اس کو اس کال کے بارے میں انفارم کرتے ہوئے اس کے پی اے سے اس کا رابطہ کروایا تھا جس نے بے حد گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں کسی تمہید کے بغیر اسے خیردین کے بارے میں اطلاع دی تھی اور وہ چکر لگتی تھی۔ اسے ٹھیک سے یاد بھی نہیں تھا اس نے پی اے سے کیا پوچھا اور کیا کہا تھا۔ وہ بس شاک کے عالم میں اپنے کمرے سے نکل کر شیردل کے پاس آگئی تھی جس کا کمر اس کے کمرے سے تین کمروں کے فاصلے پر تھا۔ اس تکلیف اور سراسیمگی میں بھی اسے شیردل ہی کا خیال کیوں آیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی اور وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کے لیے کیا کرے گا؟ کیا کر سکتا تھا؟

ہم زندگی میں ہمیشہ بہادر رہ سکتے ہیں دکھ نہیں سکتے..... آزمائشیں ہمیں توڑتی ہیں..... بار بار..... حوصلہ ہمیں جوڑتا ہے..... بار بار..... لیکن شکست و ریخت کا یہ عمل چھپائے رکھنے کی لاکھ کوشش کے باوجود بھی کسی ”اپنے“ کے سامنے ہمیں موم کا کر دیتا ہے۔ عکس مراد علی کی زندگی میں وہ ”اپنا“ بس ایک ہی شخص تھا..... ایک شیردل..... اعتراف، اظہار اور اعلان کے بغیر بھی۔

دس گھنٹوں کے بعد ایک غیر ملکی ایئر لائن کی Indirect flight میں اس کو سیٹ مل گئی تھی۔ اس سیٹ کے لیے شیردل نے کیا پا پڑیلے تھے اسے اندازہ تھا۔ یہ کام اس کے ہاتھ میں ہوتا تو بھی نہیں ہو سکتا تھا مگر شیردل کے لیے یہ مشکل تھا ناممکن نہیں۔

”پاکستان میں تمہارے اور کون سے relatives ہیں جن کو انفارم کرنا ضروری ہے تاکہ وہ تمہارے پہنچنے سے پہلے تمہارے نانا کے پاس ہوں۔“ شیردل نے اس کی امی کو کال کر کے اطلاع دینے سے پہلے اس سے پوچھا تھا۔

”کوئی بھی نہیں ہے۔“ اس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ حیران ہوا۔

”کوئی بھی نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے تمہارے ماموں چچا وغیرہ۔“ اسے شاید یقین نہیں آیا تھا کہ ”کسی“ کا ”کوئی“ بھی نہیں ہو سکتا۔

”میری امی اکلوتی اولاد ہیں میرے نانا کی۔ کوئی بہن بھائی نہیں ہے۔ نانا کے کچھ رشتے دار گاؤں میں ہیں لیکن میں انہیں انفارم کرنا نہیں چاہتی فی الحال..... بس کافی ہے کہ امی کویت سے آجائیں۔“ وہ ٹھکی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

کے بارے میں اسے عملی معلومات دینے کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔۔۔۔۔ اور ہمیشہ کی طرح اس بات سے لاعلم تھا کہ وہ اسے اس بار کس طرح serve کر رہا تھا۔  
 ”تو؟“ عکس نے اندازہ لگایا کہ وہ اب رات نو بج کر چالیس منٹ کے قریب لاہور کی بیرونی حدود کے قریب ہوں گے۔۔۔۔۔ اگر اس سے پہلے کوئی اور turn نہ لے لیا گیا۔

”تو؟“ شیردل کو جیسے جھٹکا لگا تھا۔  
 ”ہاں تو؟“  
 ”تمہیں اپنے دوست کے کرتوتوں کے بارے میں جان کر کوئی فرق نہیں پڑتا؟“ شیردل نے جیسے بے یقینی سے کہا۔

”نہیں۔“ عکس نے بے حد اطمینان سے کہا۔ ”وہ میری بہت عزت کرتا ہے اور میرے لیے یہ کافی ہے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں کیا کرتا ہے وہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔“

”وہ ابھی تمہیں trap کرنے کے لیے جال بچھا رہا ہے۔“ شیردل نے استہزائیہ انداز میں ہنس کر کہا۔  
 ”جال میں جانور اور مچھلیاں آتے ہیں انسان ہوں۔“ عکس نے اتنے ہی اطمینان سے جواب دیا۔ وہ شیردل کی جھلاہٹ سے عمل طور پر محظوظ ہو رہی تھی۔

”وہ کسی عورت کی عزت کرنے والا مرد نہیں ہے۔“ شیردل نے دو ٹوک انداز میں کہا۔  
 ”پھر مجھے اور بھی خوش ہونا چاہیے کیونکہ شاید وہ مجھے ”مرد“ سمجھ کر عزت اور پروٹوکول دیتا ہے۔۔۔۔۔ برابر کا درجہ۔۔۔۔۔ Good۔“ شیردل اس کی حس مزاح سے محظوظ نہیں ہوا تھا۔ اس کو چند منٹ چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے کہا۔

”تمہیں وہ کیوں پسند ہے؟“  
 ”بہت ساری وجوہات ہیں تم کتنی سننا چاہتے ہو؟“ عکس نے اس بار بھی اسی انداز میں کہا۔ شیردل تپا تھا۔  
 ”تم ریسرچ کرنا اس پر۔۔۔۔۔ مجھے دوپٹی نہیں ہے کچھ بھی سننے میں۔“

”ٹھیک ہے جیسا تم چاہو۔“ عکس نے بے حد پرسکون انداز میں اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ شیردل کچھ دیر خفگی کے عالم میں خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا پھر کچھ دیر بعد اس نے ایک بار پھر بات کا آغاز کیا۔  
 ”وہ میرے بارے میں بہت کچھ کہتا ہوگا تم سے؟“

”نہیں۔“  
 ”I don't believe it“

”یقین نہ کرنا یا کرنا تمہاری مرضی ہے لیکن وہ واقعی تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔“ عکس اب سنجیدہ ہوئی تھی۔ وہ غنی حمید کے لیے شیردل کی ناپسندیدگی کا بیک گراؤنڈ کسی نہ کسی حد تک جانتی تھی اور وہ غنی حمید کے بارے میں بات نہ کرنے کے باوجود یہ بھی جانتی تھی کہ وہ بھی شیردل کے بارے میں کم و بیش شیردل والے ہی جذبات رکھتا تھا۔

”اس نے تمہیں منع نہیں کیا کہ تم مجھ سے دوستی نہ کرو۔“  
 ”نہیں۔“

”میں یقین نہیں کر سکتا کہ اس کو کوئی اعتراض نہ ہوا ہو۔“ شیردل نے سر جھٹکا۔  
 ”اس کو اگر کوئی اعتراض ہوتا بھی تو مجھے اس کی پروا نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ میں اس سے بھی یہی سب کچھ کہہ رہی ہوتی جو تم سے کہہ رہی ہوں۔ لیکن خوش قسمتی سے غنی نے بھی تمہارے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔۔۔۔۔ اچھی یا بری کوئی بات بھی۔“

عکس نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔  
 ”اس کے باوجود میں اس کے بارے میں سب کچھ کہتا رہا ہوں گا۔“ شیردل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔  
 ”ضرور۔“ عکس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”اگر تمہارے پاس نان ایشوز پر بات کرنے کے لیے وقت ہے تو

کی بیٹی کو اپنا حصہ بنانا چاہتا تھا۔  
 خیر دین نے حلیمہ سے بحث یا سوال جواب نہیں کیے تھے۔ حلیمہ سے اس مسئلے پر بات چیت کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اس مسئلے کو بھی عکس سے ہی ڈسکس کرنا چاہتا تھا اور اس نے یہی کیا تھا۔ کوئی حتمی فیصلہ اس نے جواد سے ملاقات ہونے تک کے لیے ملتوی کر دیا تھا۔

جواد سے پہلی ملاقات میں وہ خیر دین کو اچھا لگا تھا۔ عکس اس کی جس شائستگی اور تہذیب کی بات کرتی تھی وہ خیر دین کو بھی دکھی تھی۔ وہ کچھ مطمئن ہو گیا تھا۔ یہ کافی تھا کہ عکس کی جواد کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ باقی چیزیں اس کے لیے ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھیں۔

”شیردل کیا کہتا ہے جواد کے بارے میں؟“ خیر دین نے جواد سے ہونے والی پہلی ملاقات کے بعد عکس سے پوچھا تھا۔ وہ اس سوال پر حیران نہیں ہوئی تھی۔ خیر دین کو شیردل کی رائے پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا اور اس اعتماد کی وجہ پچھلے سالوں میں ان تمام مردوں کے حوالے سے دیا جانے والا اس کا بے حد درست اور اتنا ہی خطرناک بیک گراؤنڈ چیک تھا جس نے ہر بار عکس اور خیر دین کو کسی شرمندگی سے دوچار ہونے والی صورت حال سے بچایا تھا۔

”شیردل ابھی نہیں ملا اس سے؟“ خیر دین نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔  
 ”نہیں۔“ وہ خیر دین سے یہ نہیں کہہ سکی کہ وہ دونوں پچھلے کچھ عرصے سے رابطے میں نہیں تھے اور اس کی وجہ شیردل کا غنی حمید کے حوالے سے کیا جانے والا وہ سوشل ورک تھا جس کی وجہ سے وہ غنی حمید کے اپنے آپ میں بے حد انٹرسٹڈ ہونے کے باوجود اس کے ساتھ چاہتے ہوئے بھی دوستی کے علاوہ کوئی اور رشتہ نہیں بنا سکی تھی اور خیر دین ایک بار پھر شیردل سے اسی سوشل ورک کا خواہش مند تھا۔

”تم غنی حمید کو چھوڑ نہیں سکتیں؟“ اکیڈمی میں STP کی ٹریننگ کے دوران دوستی ہو جانے کے بعد یہ شیردل کی طرف سے آنے والا پہلا مطالبہ تھا۔

”نہیں۔“ عکس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ جس رفتار سے گیند serve کر کے اس کے کورٹ میں پھینکی گئی تھی۔ اسی رفتار سے اسے return کر کے واپس شیردل کے کورٹ میں پھینک دی گئی تھی۔

”کیوں؟“ شیردل نے تڑاک سے پوچھا۔  
 ”کیوں چھوڑوں؟“ کھٹاک سے جواب آیا۔

وہ اس وقت ٹریننگ کے دوران ہونے والی ملٹری attachment کے دوران ویک اینڈ پر اس سے ملنے آیا ہوا تھا۔ وہ دونوں دو قریبی کنٹونمنٹس میں ہی attached تھے اور شیردل اس ویک اینڈ پر اسے وہاں سے لاہور لے جانے کے لیے اپنی دونوں پہلے ملنے والی نئی ہوٹل اکارڈ پر پک کرنے آیا تھا اور لاہور جاتے ہوئے شام کے وقت ان کے درمیان غنی حمید کے حوالے سے بحث چھڑ گئی تھی۔

”وہ پاک womanizer ہے۔“ شیردل نے اس سے کہا۔ GT road پر سیدھا جانے کے بجائے اس نے ہمیشہ کی طرح ایک نئی بائی روڈ پر ٹرن لے لیا۔ عکس نے اس کی بات سننے ہوئے غیر محسوس انداز میں اپنی باتیں کلائی میں پہنی ہوئی اسپورٹس واچ میں سمت چیک کی۔ وہ جہاں سے چلے تھے وہ شمال تھا اور انہیں جہاں جانا تھا وہ مغرب تھا اور ایک شیردل نے جو حالیہ موڑ مڑا تھا وہ مشرق کی سمت میں تھا تو لاہور جاتے ہوئے وہ سیدھا شمال سے مغرب کی طرف

جانے کے بجائے شمال سے مشرق، مشرق سے جنوب اور جنوب سے پھر مغرب تک پہنچتے۔۔۔۔۔ سورج ان سے پہلے مغرب میں پہنچ جایا کرتا تھا کیونکہ وہ عکس مراد علی کو کسی گاڑی میں بٹھا کر اس کی منزل پر پہنچانے کی کوشش نہیں کر رہا ہوتا تھا۔ وہ اب اس سفر میں ہونے والے ممکنہ اضافی کلومیٹرز کو منٹوں میں calculate کر کے ممکنہ وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش میں مصروف تھی جو انہیں لاہور پہنچنے میں لگنا تھا۔ اس نے شیردل کے ساتھ ویک اینڈ پر لاہور تک ملنے والی ”لفٹ“ کے دوران

directions، routes، roads دن کنٹونمنٹ میں ملٹری maps پڑھ پڑھ کر نہیں سیکھا تھا۔ شیردل جیسے اس علاقے کے تمام roads اور routes

اور خیر دین سے یہ معاملہ ڈسکس کرنے میں وہ متامل تھی۔ اس نے صبح خیر دین کی پریشانی رات والے اسکینڈل کی وجہ سے دیکھی تھی اور اب شام کو وہ اس کے سامنے جواد کے خلاف ایک نیا کیس رکھ دیتی۔ جواد کی شخصیت کی یہ جہیں کھلنے پر وہ جہاں رنجیدہ تھی وہاں اسے بے حد ندامت بھی تھی۔ جواد اس کا انتخاب تھا اور اس کا انتخاب انتہائی ناقص نکل رہا تھا۔ خیر دین سے بہت دیر پہلے بات چچی نہیں رہ سکی تھی۔ کیونکہ عکس کے لیے ہی یہ بہت مشکل ہو گیا تھا کہ وہ اس mess میں ہوتے ہوئے خیر دین سے اس کا ذکر نہ کرے۔

”میں نے ہمیں بڑی محنت سے پالا ہے چڑیا اور میں نے یہ محنت اس لیے نہیں کی کہ کوئی دوسرا آکے اسے ضائع کرے۔ میں چاہتا ہوں تمہیں ساتھ دینے والا عزت دینے والا جیون سا بھی ملے صرف شوہر نہیں۔“ خیر دین نے ایک بار پھر جیسے اس کے کندھوں سے بوجھ ہٹا لیا تھا۔ اس رشتے سے نکل جانے کا آپشن اس کے سامنے رکھ دیا تھا جس سے نکلنا اسے بہت اعتبار سے مشکل لگ رہا تھا۔

”اللہ پر توکل بڑی شے ہے اور اللہ کے پاس خوب سے خوب تر ہوتا ہے۔ جو ہمیں کامل لگتا ہے اللہ کے پاس اس سے بھی اچھی اور عمدہ شے ہوتی ہے۔“ عکس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے وہ جانتی تھی اس کا نانا اس کے درد اور مشکل سے واقف تھا۔۔۔۔۔۔ یہ پہلی بار نہیں ہو رہا تھا اس کے ساتھ کہ دل پسند شے چھوڑنی پڑ رہی تھی۔ پہلے ایک سلطان پھر عکس جیو اور اب جواد ملتی۔۔۔۔۔۔ عکس جانتی تھی خیر دین کی لفتی میں ایک شیردل نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ اس کی لفتی میں وہ سب سے پہلے نمبر پر تھا۔

”مجھے لگتا ہے نانا میرے ہاتھ میں شادی کی لائن نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ نہ شادی کی نہ اچھے سا بھی کی۔۔۔۔۔۔ میرے نصیب کا یہ ایک خانہ خالی ہے۔۔۔۔۔۔ میں خواہ مخواہ وقت ضائع کرتی ہوں relationships بناتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں ایسی ناپوسی خیر دین نے سالوں بعد دیکھی تھی اور وہ کٹ گیا تھا۔

”نانا میدی کی بات نہیں ہے نانا۔۔۔۔۔۔ بعض چیزیں حقائق ہوتی ہیں۔ ان سے نظریں چرانا بے وقوفی ہوتی ہے۔“ اس نے بدھم آواز میں کہا تھا۔

”انسان کو اپنی تقدیر کے بارے میں اندازے نہیں لگانے چاہئیں۔ یہ حساب کا سوال نہیں ہے چڑیا۔۔۔۔۔۔ ایمان کا حصہ ہے، رب پر ہی چھوڑ دینا چاہیے اسے۔“ خیر دین نے اسے سمجھایا تھا۔ ”تم بہت اچھی لڑکی ہو۔۔۔۔۔۔ اللہ نے کتنی نعمتوں سے دامن بھرا ہے تمہارا۔۔۔۔۔۔ اور اللہ کے پاس کوئی کمی نہیں ہوگئی نعمتوں کی۔“ عکس قائل ہوئی یا نہیں اس نے بحث نہیں کی تھی۔ خیر دین کو اپنے دکتے ہوئے وجود کو سہلانے اور ان پر چھائے رکھنے دیا تھا۔

”میں چاہتا ہوں باقی کی زندگی میں تمہیں وہ سا بھی ملے جو تمہاری عزت کو اپنی عزت سمجھے۔۔۔۔۔۔ تم کو قیمتی اثاثہ سمجھ کر سمجھانا پھرے۔۔۔۔۔۔ میں اپنی چڑیا کو کسی کے سر کا تاج دیکھنا چاہتا ہوں پاؤں کی جوتی نہیں۔“ وہ نم آنکھوں کے ساتھ ہنس دی۔ خیر دین اسے دن میں خواب دکھا رہا تھا۔ ہمیشہ ہی دکھاتا آیا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ انہیں خیالی پلاؤ سمجھ سکتی تھی زبان سے کہہ نہیں سکتی تھی۔

جواد ملتی سے رشتہ رکھنے نہ رکھنے کا فیصلہ وہ سنگاپور سے واپسی پر کرنا چاہتی تھی۔ وہ جواد اور اپنے آپ دونوں کو وقت دے رہی تھی۔ ایک بڑا فیصلہ کرنے یا نہ کرنے کے لیے۔۔۔۔۔۔ جواد کا رویہ ویسے بھی اس واقعے کے بعد ضرورت سے کچھ زیادہ اچھا اور محتاط ہو گیا تھا۔

”تم جواد کو فون کرلو۔“ شیردل نے عکس کی حلیمہ سے بات کروانے کے بعد اسے مشورہ دیا تھا۔

”امی کہہ رہی ہیں وہ انکل کی فیملی میں سے کسی کو نانا کے پاس بھجوا دیں گی جب تک ان کی فکٹس کا نہیں ہو جاتا۔“ عکس نے فون اسے واپس دیتے ہوئے اپنے سوتیلے والد کے حوالے سے کہا۔

”تم پھر بھی جواد کو انفارم کرو۔“ شیردل نے فون واپس لیے بغیر اصرار کیا۔ وہ کچھ دیر متامل رہی پھر اس نے کال ملائی شروع کر دی۔ شیردل کال ملتے ہی اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ عکس نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے بھی اندازہ نہیں تھا جواد سے اس کی فکٹنگ نوعیت کی ہو سکتی تھی۔

ضرور کیا کرو اس کے بارے میں بات۔“ شیردل بے اختیار مسکرایا۔

”تو غنی ایک نان الیٹو ہے؟“ اسے ایک عجیب سی ٹھنک محسوس ہوئی تھی جس کو ختم کرنے میں عکس نے دیر نہیں لگائی تھی۔

”میرے اور تمہارے درمیان غنی ایک نان الیٹو ہے۔ وہ میرا دوست ہے ہمیشہ دوست ہی رہے گا۔۔۔۔۔۔ تم اسے دشمن سمجھتے ہو۔“ That's ok with me۔۔۔۔۔۔ شیردل نے کچھ خفا سے انداز میں اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”وہ تمہیں بھی اسکینڈل لائز کرے گا تم یاد رکھنا۔“

”شیردل میں اسے ڈیڑھ سال سے جانتی ہوں، مجھے اس سے کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا کیونکہ ہم عورت اور مرد بن کے نہیں ملتے، تم پریشان مت ہو میرے بارے میں۔“ اس نے شیردل کو عجیب سلی دینے والے انداز میں کہا۔ اس کا خیال تھا شیردل دوبارہ غنی حمید کے حوالے سے اس سے بات نہیں کرے گا لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ شیردل نے غنی حمید کے حوالے سے اس سے بحث کرنا نہیں چھوڑی تھی اور عکس نے اس کے ساتھ اپنی بڑھتی ہوئی دوستی اور قربت کے باوجود غنی حمید کو نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا خیال تھا شیردل، غنی کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ وہی کر سکتا تھا جو وہ ہمیشہ کرتا رہا تھا۔۔۔۔۔۔ اس کی برین واشنگ کی کوشش۔۔۔۔۔۔ یہ اس کے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ غنی اور اس کی دوستی کو کسی رشتے میں بدلنے سے روکنے کے لیے اس سے رابطہ بھی کر سکتا تھا۔۔۔۔۔۔ شیردل کے ساتھ وہ اس کا پہلا بڑا جھگڑا تھا جو شیردل کی غنی کو کی جانے والی اس کال کے بعد ہوا تھا جو اس نے عکس کے یہ بات شیر کرنے کے بعد کی تھی کہ غنی اس میں انٹرمیڈیٹ تھا اور اس نے عکس کو پروپوز کیا تھا۔

”شیردل اس سے مل لیتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔“ خیر دین نے اس کی طرف سے کوئی رسالہ نہ ملنے پر ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔ عکس نے ایک گہری سانس لے کر خیر دین کو دیکھا۔ وہ شیردل کے لیے خیر دین کی شدید پسندیدگی سے واقف تھی لیکن وہ اس بات سے بھی واقف نہیں تھی کہ خیر دین بھی شیردل کے لیے اس کے دلی جذبات سے واقف تھا۔

”نانا اگر شیردل سے مشورہ ہوتا تو میری شادی بھی نہیں ہوگی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے خیر دین سے کہا۔

”اس نے ہمیشہ صحیح مشورہ دیا ہے تمہیں۔۔۔۔۔۔ ہمیشہ نقصان سے بچاتا رہا ہے وہ تمہیں۔۔۔۔۔۔ پھر تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟“ خیر دین اس کی بات پر حیران ہوا تھا۔ وہ جواباً خاموش ہو گئی۔ اس نے سر جھکا لیا تھا۔ وہ خیر دین سے وجوہات کو کیا ڈسکس کرتی۔

خیر دین نے اس سے اصرار نہیں کیا تھا۔ جواد کے ساتھ اس کا رشتہ شیردل کے ”مشورے“ سے بچ گیا تھا لیکن شراب والے واقعے میں پکڑے جانے کے بعد عکس اور خیر دین کے لیے اگلا دن بڑا تکلیف دہ تھا۔ دونوں اپنے تمام خدشات آنکھیں چراتے ہوئے جواد کا دفاع کرنے کی کوشش کر رہے تھے اس کی بات کو سچ نظر آتے ہوئے بھی نہ ماننے کی کوشش کر رہے تھے۔

عکس کے لیے اگر کچھ مکمل طور پر ناقابل قبول تھا تو وہ شراب نوشی تھی۔ امریکا میں دو سال جواد کے ساتھ رہتے ہوئے اسے بھی اندازہ نہیں ہوا کہ وہ شراب پیتا ہے۔۔۔۔۔۔ یا بلی سکتا ہے۔ اس نے چند بار اس سے اس حوالے سے بات بھی کی تھی اور ہر بار جواد اتنے صاف لفظوں میں شراب کے لیے اپنی ناپسندیدگی جتاتا رہا کہ عکس کے لیے اب یہ ماننا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ اس بارے میں اس سے جھوٹ بولتا رہا اور وہ ہمیشہ سے شراب پیتا رہا تھا۔۔۔۔۔۔ یا پھر وہ جواد کو یہ مار جن دیتی کہ وہ عادی شراب نوش نہیں تھا پہلی بار ہی شراب پیتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔

جواد نے عکس کی نظروں میں اپنے آپ کو مزید اس وقت گرالیا تھا جب اس نے اس کے آفس میں آکر اس سے تلخ کلامی کی تھی۔ عکس کے لیے اس کی شراب نوشی جتنی ناقابل یقین تھی اس کا یہ رویہ اس سے زیادہ ناقابل یقین تھا۔ اس نے جواد کو بھی ایک جاہل مرد نہیں سمجھا تھا۔ اس کے لیے یہ ماننا مشکل تھا کہ کوئی ہاورڈ سے پڑھنے والا کسی ذاتی نوعیت کے جھگڑے کو آفس تک لے جا کر وہاں شور مچانے کی کوشش کرے گا۔ جواد کے بارے میں یہ دوسرا خطرے کا الارم تھا جو اس کے لیے بجا تھا۔

"Don't worry" شیردل نے اسے تسلی دی۔ وہ اب اس کا پہرا دینے لگا تھا۔ وہ اس کے بے حد قریب تھی۔ زندگی میں اگر وہ کبھی کسی رشتے کو صرف محبت کی کیفیت میں بھی نہیں رکھ پایا تھا تو وہ اس عورت کے ساتھ رشتہ تھا۔ اس کا دل اس کے وجود کے ساتھ تعلق کے کن کن دھاگوں سے بندھا ہوا تھا وہ بھی بیٹھ کر گن نہیں پایا۔ گنتا تو دھاگے الجھ جاتے اور شکل اسی کو ہوتی۔

نیند کے جھونکے میں وہ اس کی طرف جھکی۔ شیردل اس کے قریب ہو گیا اس نے جیسے اس کے سر کو ٹکانے کے لیے سہارا دیا تھا۔ وہ نیند میں ہی کچھ اور اس کی طرف جھک آئی۔ شیردل کو شہر بانو یاد آئی تھی۔ وہ بھی اسی طرح سفر کرتے ہوئے اکثر سوچا کرتی تھی۔ اس کے کندھے پر سر ٹکائے اس کے پیٹ کے گرد بازو حائل کیے وہ کسی بچے کی طرح اس سے لپٹ کر سوئی تھی۔ ملکیت کے احساس کے ساتھ تحفظ کے اعتماد کے ساتھ۔ وہ سارا راستہ اپنے laptop پر کام کرتا رہتا یا کوئی کتاب پڑھتا رہتا لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اس کے جسم کی کسی حرکت سے شہر بانو کی نیند خراب نہ ہو۔ بعض دفعہ ایک ہی حالت میں کئی گھنٹے بیٹھے ہوئے اس کے جسم کا وہ حصہ بھی بن ہو جاتا تھا اور تب وہ بڑی احتیاط کے ساتھ شہر بانو کو خود سے الگ کرتے ہوئے جیسے کچھ دیر کے لیے خود کو آرام دینے کی کوشش کرتا اور شہر بانو تب بھی سوئی رہتی۔ وہ چند منٹ آرام کرنے کے بعد اسے پھر اپنے ساتھ لگایا تھا اور وہ پھر اسی طرح نیند میں اس سے لپٹ کر سو جاتی۔ شیردل، شہر بانو کے ساتھ سفر کے دوران آج تک کبھی نہیں سو سکا تھا وہ سوئی جاتی کیفیت میں رہتا لیکن کبھی آنکھیں بند نہیں کر پاتا تھا۔ عجیب لاشعوری انداز میں وہ جیسے شہر بانو کی حفاظت کر رہا ہوتا تھا۔ وہ نیند میں بھی بعض دفعہ اپنا سر اور ہاتھ پاؤں نہیں نہ کہیں مار لیتی تھی۔

عجیب بات تھی وہ شہر بانو کو دیکھتا تو اسے عکس یاد آتی اور اب عکس کو دیکھ رہا تھا تو شہر بانو یاد آنے لگی تھی۔ اس کا دل دو عورتوں سے عجیب انداز میں بندھا ہوا تھا۔ عکس نے نیند میں اپنے جسم کو ذرا سا ٹیڑھا کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھ دیا۔ شیردل کچھ دیر کے لیے حرکت کرنا بھول گیا تھا۔ اس کا ہاتھ اس کے بازو سے سرکتے سرکتے اس کے ہاتھ پر آ کر ٹک گیا تھا اور اس کے ہاتھ کی ایک انگلی میں شیردل نے وہ انگلی دیکھی جو اسے ایک جھٹکے سے جیسے اس خیالی دنیا سے باہر لے آتی تھی۔

"یارو دیکھو تمہاری اور میری شادی صرف ایک سال چلتی ہے۔۔۔۔۔ زیادہ سے زیادہ۔۔۔۔۔ تو تم ایک سال کے لیے مجھ سے شادی کر لو اس کے بعد تم وہاں شادی کر لینا جہاں تمہارے نانا کہیں اور میں اپنی نیکی میں کہیں شادی کر لوں گا۔" اس نے اپنا پرد پوزل چوٹی بارر جیکٹ کرنے پر جھلا کر عکس سے کہا تھا۔

"یہ funny بات نہیں ہے cheap بات ہے۔" عکس نے بڑے اطمینان سے اس سے کہا تھا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں یہ یقین کیوں نہیں آ رہا کہ مجھے واقعی تم سے محبت ہے اور میں تمہارے بارے میں غور نہیں ہوں۔" شیردل نے اس کی لعنت و ملامت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اصل میں کسی اور سے محبت ہے اس لیے۔" اس نے شیردل کے سر پر جیسے بم پھوڑا تھا۔ نیند میں عکس نے پبلک اناؤنسمنٹ سسٹم پر کوئی آواز گونجتی سنی اس نے یک دم ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی فلائٹ کا اعلان ہو رہا تھا۔ چیک ان اشارت ہو چکا تھا اور اس کے برابر بیٹھا شیردل گہری نیند میں تھا۔ اس نے اپنا ٹکٹ نکال کر ایک بار پھر چیک کیا۔ وہ اسی کی فلائٹ تھی جو دو گھنٹے کے بعد اب روانگی کے لیے تیار تھی۔ اس کی آنکھ اگر خود نہ کھل جاتی تو وہ اور شیردل یقیناً وہیں سوئے پڑے رہتے۔

"شیردل، شیردل۔۔۔۔۔ اٹھ جاؤ۔" اس نے شیردل کا بازو تھپتھپایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ "oh my god۔۔۔۔۔ میں کیا سو گیا تھا؟"

"تم اب جاؤ۔۔۔۔۔ تھکے ہوئے ہو۔" عکس کو اسے سوتے دیکھ کر اندازہ ہوا تھا کہ وہ بھی اس کے جانے کے بعد سو نہیں سکا تھا اور صبح کلاسز ہونے کی وجہ سے دن میں سونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ "تمہارا فون؟" وہ اب بگ سے اس کا فون نکال کر اسے دے رہی تھی۔

جواد کے لیے عکس کی کال غیر متوقع تھی۔ اگرچہ سنا پورا جانے سے پہلے دونوں کی آپس میں بات ہوئی تھی اور وہ ایسے ہی آف کرنے کے لیے بھی آنا چاہتا تھا لیکن عکس نے کوئی بیانا نہ بنا دیا تھا۔ وہ جواد کے حوالے سے جو فیصلہ کرنا چاہتی تھی اس کے بعد وہ جواد کے ساتھ کوئی ایسا وقت نہیں گزارنا چاہتی تھی جو اسے کمزور کر دیتا لیکن خیر دین کی اچانک آنے والی بیماری نے وقتی طور پر اسے عجیب طرح سے کمزور کیا تھا۔ جواد سے بات کرتے ہوئے اسے اندازہ ہوا خیر دین کے بعد جواد کے بھی نہ ہونے سے وہ بالکل تنہا ہو جانے والی تھی اور کچھ دیر کے لیے اس سوچ نے بھی اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ جواد اسے تسلیاں دیتا رہا اور وہ رونی رہی۔ وہ شیردل نہیں تھا جس کے لفظوں اور آواز میں اس کے لیے جادو بولی جیسی تاثیر اور مسجائی ہوتی لیکن پھر بھی دوسرا ہٹ کا ایک عجیب احساس ہو رہا تھا اسے جو اس کی ہمت بندھا رہا تھا۔

شیردل جب کمرے میں واپس آیا تو وہ فون بند کر چکی تھی اور اب اپنے دوبارہ آنسوؤں سے بھیگ جانے والے چہرے کو خشک کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"بات ہو گئی؟" وہ اس سے بہت فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ وہ نانا کے پاس جا رہا ہے۔" عکس نے فون ساؤنڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں نے تمہیں کافی پریشان کیا۔" اس کو اب پہلی بار رات کے وقت کا اور شیردل کی خواری کا احساس ہوا۔ صبح

اب قریب تھی اور وہ اتنے گھنٹوں سے ایک کے بعد ایک فون کرتا اور منتظر رہتا تھا۔

شیردل بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "وہ تو تم کئی سالوں سے کر رہی ہو۔" اس نے جواباً دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے

کہا۔ ساؤنڈ ٹیبل پر پڑا فون اٹھا کر اس نے عکس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ اپنے پاس رکھو۔ تمہیں ضرورت پڑے گی اس کی پاکستان رابطہ کرنے کے لیے۔"

وہ جھجکی۔ "تم کیا کرو گے فون کے بغیر؟"

"اتنا لمبا کورس نہیں ہے میرا گزارہ ہو سکتا ہے۔ ضروری ہوا تو لے لوں گا یہاں سے کوئی فون۔" اس نے عکس سے

کہا۔

سہ پہر کو وہ ابھی اپنا سامان سمیٹ کر فارغ ہوئی تھی جب شیردل آ گیا تھا۔ "تم کیوں آئے ہو۔۔۔۔۔ ابھی تو کلاس چل

رہی ہوگی۔" عکس نے اس سے کہا۔

"تمہیں ہی آف کرنا تھا میں نے۔"

"میں چلی جاتی نیکی لے کر۔"

"تم سوئی نہیں؟" شیردل نے بات بدلتے ہوئے اس کی سرخ اور متورم آنکھیں دیکھ کر کہا۔

"نیند نہیں آئی۔" اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

"کچھ کھایا ہے؟"

"شیردل تم واپس جاؤ۔۔۔۔۔ اپنا کورس خراب مت کرو میرے لیے۔۔۔۔۔ کوئی نیکی ریما کر کس چلے گئے تمہاری رپورٹ

میں تو تمہارے لیے مسئلہ ہو جائے گا۔" عکس کو اس حالت میں بھی تشویش ہوئی تھی۔

"کچھ نہیں ہوتا۔" اس کے بیگز اٹھاتے ہوئے اس نے بے پروائی سے کہا تھا۔

فلائٹ دو گھنٹے لیٹ تھی اور عکس کی فرسٹریشن میں اضافہ ہو گیا تھا۔ شیردل نے اسے زبردستی کھانا کھلایا تھا۔ وہ اندر

جانے کے بجائے باہر وقت گزارنے کے لیے بیٹھ گئے تھے۔ اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے عکس کو نیند آنے لگی تھی۔ وہ

اس کا ذہن بنانے کے لیے اسے دن میں انینڈ کی ہوئی کلاسز میں پچھڑکی تفصیلات بتا رہا تھا۔

"تمہیں نیند آرہی ہے تو تم سو جاؤ۔" شیردل نے اس کی بند ہوئی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ عکس نے بیچ کی پشت

سے سر ٹکا کر نیم دراز ہوتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"تم نا تم کا خیال رکھنا اور گھڑی دیکھتے رہنا۔" آنکھیں بند کرنے سے پہلے وہ اسے ہدایت دینا نہیں بھولی تھی۔ وہ

فلائٹ مس کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔



چڑیا کا نام اس کے حافظے کا حصہ بن گیا تھا کیونکہ اس نے اپنے ماں باپ کے جھگڑوں میں اس نام کو بار بار سنا تھا۔ اس وقت اسے چڑیا یاد تھی وہ اس کی محبت میں گرفتار تھی اور وہ حیران تھی کہ اس کے ماں باپ چڑیا کی وجہ سے کیوں جھگڑتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ چڑیا اور اس کا نام اس کے حافظے سے غائب ہوتا گیا۔ اسے یہ بھی بھولنا گیا کہ آٹھ نو سال کی عمر میں اس کے ماں باپ کے درمیان ہونے والے جھگڑوں کی نوعیت اور وجہ کیا تھی اور اب آج جیسے منزہ کے عکس کو اس کے ماں باپ کی علیحدگی کی وجہ قرار دینے پر اسے یاد آ گیا تھا۔ کہ اس کے ماں باپ کے درمیان کسی ملازم اور اس کی بچی پر جھگڑا ہوتا تھا لیکن شہر بانو کو اس سے زیادہ کچھ یاد نہیں تھا۔

ساڑھے تین سے ساڑھے چار سال وہ راک اسٹار کے اسٹارڈم والی جس چڑیا کے عشق میں گرفتار رہی تھی اسے اس وقت کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ نہ چڑیا نہ وہ وقت نہ وہ گھر۔ صرف اسکول تھا جس کے بارے میں اسے شرمین کے بتانے کی وجہ سے یاد تھا کہ اس نے اپنی اسکولنگ کا آغاز وہاں سے کیا تھا اور یہ بات شیردل بھی اس کے بتائے بغیر جانتا تھا۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ وہ بھی بچپن میں وہاں رہ چکی تھی۔ تب وہ بہت چھوٹی تھی اور تب وہ بھی وہاں چھٹیاں گزارنے آیا تھا۔ شہر بانو نے بڑی دلچسپی سے شیردل کی گفتگو سنی تھی۔ شیردل پاکستان میں گزارے جانے والے سالوں میں جھانکنے والی اس کی واحد کھڑکی تھی۔ شرمین اس کی اور اپنی زندگی کے اس حصے کے بارے میں بات ہی نہیں کرتی تھی۔ شیردل کرتا تھا۔ اسے جو کچھ شہر بانو کے بارے میں، اس کے بچپن کے حوالے سے علم تھا اس نے شہر بانو کو وہ بتا دیا تھا۔ جب بھی جو بھی یاد آ جاتا تھا وہ بتا دیا کرتا تھا۔ اسی نے اسے اس گھر کے بارے میں بھی بتایا تھا جب وہ وہاں رہنے کے حوالے سے خائف تھی۔ اور شہر بانو کو یہ جان کر ایک عجیب سی طمانیت ہوئی تھی کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ اس سے پہلے اس گھر میں رہ چکی تھی۔ اور اگر وہ گھر اتنا خوفناک ہوتا تو اس کے باپ اسے کیسے وہاں رہنے دیتے۔ وہ گھریک دم اس کے لیے آسیب زدہ نہیں رہا تھا۔ وہ اس گھر میں پھرتے ہوئے ہر جگہ پر شہباز حسین کی موجودگی کے احساس سے دوچار رہتی تھی اور اسے جیسے یقین ہو گیا تھا کہ وہاں اسے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

گھر میں ہونے والے عجیب و غریب واقعات کے باوجود شہر بانو کا ابتدائی خوف اور بدحواسی ختم ہو گئی تھی اور اب وہ گھر اس کی زندگی کو دوسری بار تباہ کر رہا تھا۔ مثال دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی۔

”مئی پارک جانا ہے۔“ مثال نے اس کے قریب آ کر اس کا ہاتھ کھینچا۔ وہ ماں کا چہرہ پڑھ سکتی تو کبھی اس وقت اسے کہیں جانے کے لیے نہ کہتی۔ شہر بانو لٹھے کی طرح سفید چہرے کے ساتھ ایک مئی کی طرح وہاں بیٹھی تھی یوں جیسے اس کا سارا خون کسی نے نکال لیا تھا۔ منزہ کی کال ایک ڈریکولا کی طرح لگی تھی اسے۔

”مئی۔“ مثال نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ کھینچا۔ شہر بانو نے مثال کا چہرہ دیکھا اور اس کا دل بھر آیا۔ وہ ایک بت سے گوشت پوست کے انسان میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنا سارا بچپن ماں باپ کے درمیان ہونے والے جھگڑوں، گھرنوٹے کے خوف اور گھر اور باپ کے ختم ہو جانے کے trauma میں گزاری تھی۔ لیکن اس کے پاس بچپن کے پھر بھی کچھ اچھے اور یادگار سال تھے۔ وہ چند سال جب وہ لاہور میں تھے جب شرمین اور شہباز کے درمیان جھگڑے ہونا شروع نہیں ہوئے تھے۔ جب اس کے ماں باپ نے اسے کسی آنے والے بہن یا بھائی کی نوید سنائی تھی اور وہ اس کے بارے میں اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ ایکساٹڈ تھی جب زندگی مزہ تھی۔ سکون۔ تحفظ۔ انجوائے منٹ سے بھر پور۔ جب وہ اٹلیس گئی لیکن اپنے ماں باپ کے ساتھ تھی ونڈر لینڈ میں نہیں۔

اس نے بھی یہ نہیں سوچا تھا زندگی اسے اور اس کی اولاد کو بھی اسی راؤنڈ ہاؤس پر لے آئے گی جہاں سے وہ اپنے بچے اور وجود کو بھی کر کے گزر چکی تھی۔ وہ مثال اور شیردل کو ساتھ دیکھ کر اپنی ہی غیبی بر رٹک کیا کرتی تھی۔ وہ اس سے بہتر بچپن اور بہتر زندگی گزار رہی تھی اور اسے یقین تھا اس کا سارا بچپن ایسے ہی ہنستے مسکراتے اپنے ماں باپ کی مضبوط پناہ میں گزر جائے گا۔ اور اب۔۔۔۔۔

شہر بانو نے مثال کو اپنے ساتھ لیٹا لیا اور رونے لگی۔ بتائیں بڑے بچوں کے سامنے روتے ہوئے یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں سمجھیں گے کچھ نہیں کھوجیں گے کوئی سوال نہیں کریں گے۔ اور انہیں ان آنسوؤں سے تکلیف بھی نہیں ہو

”اسے پاس رکھو۔ connecting flight ہے۔۔۔۔۔ پتا نہیں آگے کب کبس مزید delay نہ ہو جائے۔ میں کم از کم تم سے رابطے میں تو رہوں گا۔“ وہ اس کا سامان اٹھا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

انٹرنیشنل ڈیپارچر کے سامنے کھڑے اسے رخصت کرتے ہوئے شیردل نے اس سے کہا۔ ”مجھے شاید تمہارے ساتھ جانا چاہیے تھا۔“ عکس کا دل بھرا آیا تھا۔ وہ فکر مندی بناؤنی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی وہ اس کے حوالے سے تشویش میں مبتلا تھا۔

”نہیں میں ٹھیک ہوں، تمہیں کورس مس نہیں کرنا چاہیے۔ تمہارے لیے ضروری ہے یہ کورس۔ ورنہ تو میں شاید چاہتی کہ تم بھی ساتھ آتے تاکہ تم سے مل لیتے۔۔۔۔۔ تمہیں بہت پسند کرتے ہیں وہ۔“ بات کرتے ہوئے اس کی آواز پھر بھرائی تھی۔

”میں سبکا پورا آتے ہوئے ان سے مل کر آیا تھا۔“ وہ فریز ہو گئی۔ ایک لمحے میں اس نے خیر دین کی اس اچانک بیماری کی وجہ کو جان لیا تھا۔

☆☆☆

شہر بانو نے آج جانا تھا کہ لایعلی کو نصرت کیوں کہا جاتا تھا۔۔۔۔۔ منزہ کی فون کال بند ہونے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک بت بنی فون گود میں رکھے بیٹھی رہی تھی۔ پتا نہیں زندگی میں ناممکنات کہاں پائے جاتے ہیں اور کس کے لیے ہوتے ہیں۔ اس کے لیے تو وہ بیک دم اپنا وجود اور مفہوم ہی کھو بیٹھی تھی۔ شیردل اور عکس۔۔۔۔۔ شیردل، عکس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ اور وہ شہر بانو اس کی زندگی میں متبادل کے طور پر آئی تھی۔۔۔۔۔ اتنے سالوں میں متبادل ہی رہی تھی شاید۔۔۔۔۔ اور عکس اور اس کے نانا کی وجہ سے اس کی مئی اور پاپا میں علیحدگی ہوئی تھی۔ ان کا گھر ٹوٹا تھا۔ پتا نہیں کس بات کا رنج اور غصہ زیادہ تھا اس کو۔۔۔۔۔ رنج اور غصے کے علاوہ ایک تیسرا احساس دھوکے اور تذلیل کا تھا۔ شیردل اس کی آنکھوں کے سامنے عکس سے انہیں چلا رہا تھا اور اسے شاید تک نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے شوہر پر، اس کی محبت پر اس کی وفاداری پر فخر کرتی رہی، قصیدے پڑھتی رہی۔ وہ اس کی آنکھوں میں اس طرح دھول کیسے جھونک سکتا تھا۔۔۔۔۔ کس طرح سے زیادہ بڑا سوال تھا کہ کیوں جھونک رہا تھا۔

زندگی میں جن چند چیزوں کو ایک عورت کبھی سمجھ نہیں پاتی اس میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مرد جو آپ کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہو، آپ سے چاند ستارے توڑ لانے کے وعدے کرتا ہو، وہ اچانک کسی اور کی محبت میں گرفتار کیسے ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ کیسے ہو سکتا ہے؟ اخلاقیات نام کے ڈھیر میں سے کوئی ایک بھی اس کے لیے رکاوٹ کیوں نہیں بنتی اور یہاں پر معاملہ اس سے بھی زیادہ خراب تھا۔ وہ اسے زندگی میں اس لیے لے کر آیا تھا کیونکہ وہ اس عورت سے شادی نہیں کر سکا تھا جس سے وہ کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ منزہ نے اس سے کہا تھا کہ عکس اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ شہر بانو کم از کم اب اس معاملے کوون سائیڈ ڈیجھنے پر تیار نہیں تھی۔ شیردل کی زندگی میں عکس نام کا ڈارک ہول اب کم از کم شہر بانو کے لیے ڈارک نہیں رہا تھا۔ وہ اس کے اندر جھانک کر دیکھ سکتی تھی لیکن یہ مسٹری اس کی زندگی میں بہت غلط وقت پر حل ہوئی تھی، وہ عکس مراد علی کے ساتھ سبکا پور میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ اس کے کہنے پر بے وقوفوں کی طرح آ کر امریکا بیٹھ گئی تھی۔ اسے امریکا کا ٹرپ لبا کرنے کا مشورہ اسی کا تھا اور وہ اس کی عدم موجودگی میں عکس مراد علی کی جنگ لڑنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ کس کے خلاف؟ اس کے پاپا کے خلاف۔۔۔۔۔ جن کا وہ کبھی فیورٹ ہوا کرتا تھا۔ اس نے اتنے سالوں میں کبھی ایک بار اسے تکلیف نہیں پہنچائی تھی اور اب تکلیف پہنچانے پر آیا تھا تو بیک وقت کہاں کہاں سے ہرٹ کر رہا تھا۔

خیر دین اور اس کی نواسی۔۔۔۔۔ عکس مراد علی۔۔۔۔۔ اس کے ماں باپ کے جھگڑے۔۔۔۔۔ اور دوناموں کی بازگشت۔۔۔۔۔ خیر دین اور چڑیا۔۔۔۔۔ وہ ان ناموں کو بھول چکی تھی۔۔۔۔۔ زندگی اسے بہت آگے لے آئی تھی لیکن آج منزہ کی ایک کال نے اسے علیحدگی سے پہلے شرمین اور شہباز کے درمیان ہونے والے شدید جھگڑوں کی یاد دلانی تھی جس میں شرمین، شہباز کو برا بھلا کہتی تھی ”کسی چیز“ کے حوالے سے۔۔۔۔۔ وہ کیا چیز تھی شہر بانو کو نہ اس وقت سمجھ آیا تھا نہ اب یاد آ رہا تھا۔۔۔۔۔ چڑیا کے حوالے سے بہت ساری باتیں۔۔۔۔۔ بہت سارے الزامات لگتے دیکھتی۔۔۔۔۔ الزامات۔۔۔۔۔ جنہیں وہ سمجھ نہیں پاتی تھی لیکن



وہ اس منظر کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا جس نے اس کی زندگی میں سے اس کا آئیڈیل نکال دیا ہے..... کچھ بھی نہ سمجھ پانے کے باوجود اس نے شہباز حسین کا وہ بت ضرور توڑ دیا تھا جس کی وہ پرستش کرتا تھا..... وہ ہمیشہ انکل شہباز کی طرح ہونا چاہتا تھا لیکن وہ اب کبھی انکل شہباز کی طرح نہیں بننا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر عکس مراد علی..... اور..... چڑیا..... اور خیر دین..... ایک گہری سانس لے کر اس نے ان تمام کاغذات کو واپس ٹیبل پر رکھ دیا اور ٹیبل پر رکھے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر پانی پیا..... ماؤف اعصاب اور حواس کو بحال کرنے کے لیے وہ اس وقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جو کچھ اس نے چند لمحوں پہلے دیکھا اور پڑھا تھا وہ اس کا بدترین خواب تھا۔

”میں نے تمہارے پاپا کو ابھی کچھ نہیں بتایا انہیں بتا چلے گا تو وہ تو حشر کر دیں گے اس عورت کا..... اور ساتھ تمہارا بھی..... کیونکہ تمہاری دوستی نے ہی اس عورت کو اتنی جرأت دی ہے..... اب جا کر ملو اس سے..... اور شٹ اپ کال دو اسے..... یا پھر تم کو پہلے سے پتا تھا کہ وہ کون بھی اور کیا کرنے والی تھی۔“ منزہ نے تھکسا نہ انداز میں اس سے بات کرتے کرتے اچانک کسی دہم میں اس سے پوچھا۔

شیردل نے گلاس واپس ٹیبل پر رکھ دیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”نہیں“ میں نہیں جانتا تھا۔“ اس نے مختصر اماں سے کہا اور منزہ کو اس کے لہجے اور چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔

وہ وہاں تین گھنٹے بیٹھا منزہ کی باتیں سنتا رہا، وہ غصے میں تھی اور بہت زیادہ ہرٹ بھی..... شہباز اس کا اکلوتا بھائی تھا۔ اسے حد سے زیادہ عزیز تھا۔ اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی وہ اس کی ناگہانی موت کا صدمہ بھول نہیں سکی تھی اور اب اس کے اسی عزیز ترین اکلوتے بھائی کو اس کی موت کے بعد کوئی ایک ”برا“ ثابت کرنے پر تل گیا تھا۔ وہ تڑپ نہ جاتی تو کیسے نہ تڑپ جاتی۔ شیردل کو اپنی ماں کی تکلیف کا اندازہ تھا..... اس کو اس شاک اور تکلیف کا بھی اندازہ تھا جو شہباز کو اس کیس کے بارے میں جاننے سے ہو سکتی تھی۔

”آپ شہباز کو سے کچھ مت کہیے گا۔“ شیردل نے منزہ کی گفتگو کے اختتام پر اٹھتے ہوئے کہا۔ وہاں سے واپسی کا سارا سفر بھی اس نے اسی کم صم کیفیت میں کیا تھا۔ وہ عکس کے بارے میں سوچتا رہا اور وہ چڑیا کے بارے میں سوچتا رہا..... ڈاکٹر عکس مراد علی پہلے دن سے اس سے واقف تھی۔ کم از کم وہ اب یہ خوش فہمی نہیں پال سکتا تھا کہ وہ اکیڈمی میں آنے کے بعد اس سے متعارف ہوئی تھی..... اتفاقاً..... وہاں یقیناً بہت کچھ اتفاق نہیں تھا..... وہ اسے کیوں اس بری طرح سے avoid کرتی تھی۔ اس کی وجہ وہ اب سمجھ رہا تھا، وہ اس کی arrogance نہیں تھی اس کا ایک شیردل ہونا تھا جو اس کے لیے مسئلہ تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی تھی پہلی بار ان کے درمیان برف کیسے بچھلی تھی۔ رقابت اور ان کی برف..... اسے یاد آیا تھا وہ STP کی ٹریننگ کے دوران کنٹری ٹور پر ایبٹ آباد گئے ہوئے تھے اور وہاں ریٹ ہاؤس میں سچ کے دوران اس کے حلق میں پھٹکی کھاتے ہوئے کاٹا پھنس گیا تھا۔ اس نے کھانا شروع کیا، چند لمحوں کے لیے اسے سانس لینے میں دقت ہوئی۔ پورا گروپ فوری طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا اور عکس اٹھ کر اس کے برابر والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اس گروپ میں موجود واحد ڈاکٹر تھی اور شیردل کو فرسٹ ایڈ دینا کہے بغیر بھی اسی کی ذمہ داری تھی۔ بالکل ایک برڈیشنل ڈاکٹر کی طرح شیردل کو دلاسا دیتے ہوئے اس نے اس کی پشت کو تھپکا۔ پھر سامنے بڑی چپائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر شیردل کو نگننے کے لیے دیا۔ ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا القمہ نگننے پر بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ البتہ شیردل کو اب سانس لینے میں پہلے جیسی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ عکس نے رونی کے ٹکڑوں کے کام نہ کرنے پر ایک گلاس میں لیموں کا رس نکلا کر پلا دیا تھا۔ اس سے شیردل کا کاٹنا نکل گیا تھا لیکن گلا بیٹھ گیا تھا۔

رات کے وقت وہ ریٹ ہاؤس کے لان میں سگریٹ پینے کے لیے آ کر بیٹھا تھا۔ ان دنوں اس نے نئی نئی اسموکنگ شروع کی تھی جب اس نے عکس کو بھی لان میں داک کر کے دیکھا۔ وہ سگریٹ سلگاتے سلگاتے رک گیا اور اس کی طرف چلا آیا۔ وہ بھی اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر رک گئی تھی۔

”گلا کیسا ہے اب تمہارا؟“ اس نے شیردل سے پوچھا۔

گی..... کیونکہ وہ بچے ہوتے ہیں..... آنسو ہر ایک پر ایک جیسا اثر کرتے ہیں..... درد ہر ایک کو محسوس ہوتا ہے..... غم کو ہر کوئی سمجھ لیتا ہے..... بڑوں اور بچوں کے درمیان فرق صرف لفظوں کی کمی کا ہوتا ہے عمر کے سالوں کا نہیں۔

مثال بھی اپنے وجود سے لپٹی ماں کے بہتے آنسوؤں اور سسکیوں سے شاکڈ اور حواس باختہ تھی۔ یہ اس کی زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا کہ اس کی ماں کو اپنے آنسوؤں اور تکلیف شیعہ کرنے کے لیے اس سے لپٹنا پڑا ہو ورنہ یہ کام وہ کیا کرتی تھی۔

”پاپا کو بتاؤں گی بھی (دور ہی ہے)۔“ پہلا خیال اسے وہی آیا تھا جو اسے آنا چاہیے تھا۔ اس کی ہر بات پاپا کو بتا کر شروع ہوتی تھی یا اس پر ختم ہوتی تھی۔ شیردل، شہباز کی طرح اس کی بھی زندگی کا محور تھا۔ وہ پارک بھول گئی تھی۔ کینڈیز بھی بھول گئی تھی، جھوٹے بھی بھول گئی تھی اور باتیں بھی بھول گئی تھی..... وہ بس کھڑی رہی..... کم صم..... پریشان..... ابھی ہوئی..... وہ شہباز کو تسلی دینا چاہتی تھی نہیں دے سکی..... اس کے آنسو پونچھنا چاہتی تھی وہ بھی نہیں کر سکی..... وہ دونوں بڑوں کے کام تھے وہ کرنا نہیں جانتی تھی لیکن اس نے وہی کیا جو وہ اپنی باری ڈول کو سلائے کے لیے کرتی تھی..... نیند میں آنسو رک جاتے ہیں وہ کم از کم یہ تو جانتی ہی تھی۔ اس نے شہباز کو سر ہٹا کر شروع کر دیا..... اس کی پچھلیوں نے شہباز کی سسکیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔

”Do you want to talk to papa?“ مثال نے بالآخر اس کی سسکیوں سے پریشان ہو کر کہا۔

”Are you missing papa...?“ اس نے اوپر نیچے شہباز کو سے سوال کیے۔ یوں جیسے اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی جو اس کی ماں کو پریشان کر کے رلاتی۔

”I would never speak to your papa again“ اس کے جواب نے مثال کو شاکڈ کر دیا تھا۔

☆☆☆

وہ صدمے کی حالت میں باری باری ان تمام کاغذات کو دیکھتا گیا تھا جو اس کی ماں نے کچھ دیر پہلے اس کے سامنے رکھتے ہوئے اسے ان کاغذات میں موجود کیس کی نوعیت بتاتے ہوئے آگ بگولہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔

”تم اس عورت کی جرأت دیکھو کہ کس دھڑلے سے تمہیں فریق بنا رہی ہے وہ..... انکو رکھنے ہیں والی صورت حال ہو گئی ہے یہ تو..... تم نے شادی نہیں کی اس کے ساتھ..... وہ کر لیتے تو سارا مسئلہ حل ہو جاتا اور اب وہ گڑے مردے اکھاڑنے پر تلی ہوئی ہے..... نانا کے ساتھ نا انصافی ہوئی..... یہ تو شہباز کا بڑا پین تھا کہ اس نے اس بڑے کوسز میں جیل نہیں کروائی ورنہ جتنا مالی نقصان وہ پہنچاتا رہا تھا اسے اصولی طور پر جیل کروا دینی چاہیے تھی اسے..... ایسے لوگوں پر ترس کھانے اور چھوٹ دینے کا مطلب اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا ہوتا ہے..... آئین کے سامنے کود دھ پلانے والی بات ہے یہ تو..... اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا میں کیوں تمہاری اس کے ساتھ شادی کرنے پر تیار نہیں تھی۔ میں پہلے دن سے اس کی اصلیت جانتی تھی۔ اس لیے بار بار تمہیں منع کرتی تھی کہ اس سے دور رہو لیکن تم پر بھی میری کسی بات کا اثر نہیں ہوا..... اب دیکھ لیا تا کہ خاندان اور خاندانی پن کی کیا اہمیت ہوتی ہے..... خاندان اپنا آپ دکھاتا ہے شیردل جیسے اس عورت کا دکھا رہا ہے۔“ وہ سر جھکائے ان کاغذات کو ہاتھ میں لیے بت کی طرح اس میں ایک ہی پیام کو بار بار مختلف صفحات پر دیکھ رہا تھا..... وہ شہباز حسین کے داماد اور بھائے کے طور پر فریق بنایا گیا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس نے شہباز کو اور منزہ کو فریق نہیں بنا ڈالا تھا۔ منزہ کا کوئی ایک جملہ کوئی ایک لفظ شیردل کی سمجھ میں نہیں آیا تھا..... اس کا ذہن اس وقت کچھ ایسا ہی مفلوج ہوا تھا۔

”No way“ عکس نے بے ساختہ کہا۔

”اچھا؟ مجھے ہمیشہ لگا۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ تم غنی حمید کے ساتھ ہوتی ہو زیادہ تر..... میں نے سوچا شاید اس نے میرے بارے میں ایسا کچھ کہا ہے کہ تم مجھے ناپسند کرنے لگی ہو۔“ شیردل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

”غنی حمید نے مجھے تمہارے بارے میں کیا کہنا تھا؟“ عکس نے جواباً بڑی سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

”کوئی جھوٹ۔“

”میں جھوٹ پر کھ سکتی ہوں۔“

”بعض لوگ بہت اچھا جھوٹ بولتے ہیں، ان کے جھوٹ کو پکڑنا آسان نہیں ہوتا۔“ شیردل نے سنجیدگی سے کہا۔

”ٹھیک کہتے ہو تم لیکن غنی بہت اچھا انسان اور دوست ہے۔“ بڑے سادہ سے انداز میں بنا سوچے سمجھے کہے گئے اس جملے نے شیردل کو جلا کر کونکہ کر دیا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا زندگی میں وہ کسی عورت کو اتنی attention دیتا پھر رہا ہو اور وہ پھر بھی اس کے سامنے کسی دوسرے مرد کے گن گائے اور وہ بھی غنی حمید کے جس کی وہ شکل بھی دیکھنا پسند نہ کرتا ہو۔

”اچھے انسان کا تو مجھے یقین نہیں لیکن تمہارا دوست ضرور ہے وہ۔“ شیردل کے لہجے کی گرم جوشی ایک دم غائب ہو گئی تھی۔ ”اوکے..... میں چلتا ہوں۔“

”Good night“ عکس نے جواباً اس سے کہا۔ وہ شدید نفخا ہوا اور اسے جواباً گڈ نائٹ کہے بغیر وہاں سے

آگیا۔ اس کا خیال تھا وہ جانے کا ارادہ ظاہر کرے گا اور وہ اسے روکنے کی کوشش کرے گی۔ دل سے نہ سبھی رسا ہی اسے رکنے کا کہہ دے گی..... عکس مراد علی نے ایسی کوئی رسم نہیں سمجھائی تھی۔ یہ بالکل ایسا تھا۔ ”میں جاتا ہوں۔“ ”سوہم اللہ۔“

شیردل اس رات کمرے میں آکر بھی تیار رہا۔ اس لڑکی کی طرف سے اسے کوئی لفٹ نہیں مل رہی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ جس شخص کو اس پر ترجیح دے رہی تھی بدستوری سے وہ غنی حمید تھا۔

اگلی صبح ڈاننگ روم میں ناشتے کے دوران اس کی عکس سے دوبارہ ملاقات ہوئی تھی اور اس نے خوش دلی سے اس سے اس کے گلے کے بارے میں پوچھا تھا۔ شیردل چاہتے ہوئے بھی اس سے حلقی برقرار نہیں رکھ سکا۔ عکس مراد علی بھی کچھ عجیب طرح سے اثر انداز ہوتی تھی اس کے اعصاب اور حواس پر اور وہ جس طرح سے اسے اور اپنے batch mates کو ہینڈل کیا کرتی تھی شیردل نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ستائش کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ وہ ہر ایک سے خوش دلی سے بات

کرنے کے باوجود ہر ایک کو ایک فاصلے پر رکھے ہوئے تھی..... غنی حمید کے ساتھ اگرچہ اس کی دوستی ان سب ہی کی نظروں میں تھی لیکن غنی حمید کے ساتھ دوستی کے باوجود ان سب کو وہ دونوں ہر وقت اکٹھے نظر نہیں آتے تھے۔ نہ ہی کونوں کھدروں میں بیٹھ کر باتیں کرتے پائے جاتے تھے اور نہ ہی عکس مراد علی اپنے ہر کام کے لیے غنی حمید کی خدمات کی منتظر یا طلب گار

رہتی تھی..... شیردل اپنے تمام اختلافات اور رقابت کے باوجود ان دونوں کے تعلق میں کوئی ایسی چیز نہیں ڈھونڈ پایا تھا جو ہر گز شیوں کو جنم دیتی یا جو ان پر انگلیاں اٹھانے کا باعث بنتی..... وہ دونوں اکثر جہاں بات چیت کرتے پائے جاتے وہاں گروپ کے بانی لوگوں میں سے بھی کوئی نہ کوئی ہوتا اور ان کے درمیان جو بھی بات چیت ہوتی تھی وہ سب کے سامنے

تھی۔ شیردل شاید اس گروپ کا واحد شخص تھا جسے ان کی دوستی پر اعتراض تھا۔

وہ اب عکس کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی یہ ماننے پر تیار نہیں تھا کہ وہ دانستہ طور پر اسے tease کرنے کے لیے یہ سب کر رہی تھی۔ گاڑی اس کے کمرے کے پورچ میں رکھی تھی جب اس نے فون پر عکس کی کال آتے دیکھی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر وہ کچھ دیر اس کے نام کو دیکھتا رہا۔ چند گھنٹوں نے کیا کچھ بدل دیا تھا ان دونوں کے بیچ میں۔

”ہیلو۔“ فون اٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔ ”ہیلو۔“ دوسری طرف سے آنے والی آواز میں اس نے پہلی بار چٹیا کو شناخت کرنے کی کوشش کی اور چٹیا مل گئی تھی۔ اس نرم آواز میں آج بھی چٹیا کی ریشمی آواز کی ملائمت جھلکتی تھی۔

دونوں کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کے دوران وہ بہت کم بولا تھا۔ وہ ایک رات پہلے اس کی کہی جانے والی باتوں کو

”بہتر ہے۔“ شیردل نے اپنی لڑکھائی آواز میں کہا۔ وہ ہمدردانہ انداز میں مسکرائی۔

”گرم پانی سے غرارے کرنے چاہئیں اب تمہیں نمک ڈال کر..... میرا خیال ہے صبح تک بہتر ہو جائے گا۔“ اس نے پھر کسی فزیشن کی طرح اس سے کہا تھا۔ شیردل نے بات کرتے کرتے اس کی نظروں کو اس کے ہاتھ میں پکڑے

سگریٹ اور لائٹر پر مرکوز دیکھا تھا پھر وہ دوبارہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

”ویسے ایک لحاظ سے تو اچھا ہے۔ اب کچھ وقت تو تم چپ رہو گے۔“ شیردل نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سنجیدہ نظر آرہی تھی لیکن جملہ سنجیدہ نہیں تھا۔

”مطلب؟“ وہ اس کا مطلب سمجھ گیا تھا لیکن پھر بھی پوچھنے سے نہیں چوکا تھا۔

”کوئی خاص مطلب نہیں۔“ عکس نے اطمینان سے کہا۔

”تم اگر ڈاکٹر ہوتیں تو اچھی ڈاکٹر ہوتیں۔“ اس نے دقت کے ساتھ بھی بولنے سے گریز نہیں کیا۔

”میں جانتی ہوں۔“ جواب کمال اطمینان سے آیا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

”میں بھی واک کرنے آیا تھا۔“ شیردل نے کہا۔

”ضرور کریں۔“ عکس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے لان کی طرف اشارہ کیا اور خود دوسری طرف چل دی۔ شیردل کچھ لمحوں کے لیے بالکل سٹپٹا کر رہ گیا تھا۔ پھر وہ بے اختیار اس کے عقب میں آیا۔ عکس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ شیردل ڈھٹائی سے مسکرایا تھا۔

”ہم ساتھ بھی کر سکتے ہیں واک۔“

”ساتھ صرف باتیں ہو سکتی ہیں واک نہیں۔“

”میرا لگا خراب ہے اس لیے آج میں صرف تمہیں سنوں گا۔“ شیردل نے بڑی فیاضانہ آفر کی۔

”اور میرے پاس سنانے کے لیے کچھ ہے نہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”ہو سکتا ہے کچھ یاد آ جائے۔“ شیردل نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے عکس کو ایک گہری سانس لے کر کہتے ہوئے سنا۔

”ہاں یاد تو بہت کچھ آ سکتا ہے لیکن میں کچھ یاد نہیں کرنا چاہتی۔“

”ویسے یہ حیرانی کی بات ہے کہ ہم میں بات چیت کا سلسلہ اتنا محدود ہے۔“ شیردل نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ عکس نے جواباً کچھ نہیں کہا تھا۔

”تمہاری کوئی رائے نہیں ہے؟“

”اگر تم اس طرح بولتے رہے تو اگلے دو دن بھی تمہارا لگا اسی طرح رہے گا۔“ عکس نے یک دم اسے ٹوک کر وارن کیا۔

”مجھے اگر یہ غلط بھی لگے گی کہ تم اپنے گلے کی اس حالت کے ساتھ بول نہیں سکتے تو وہ دور ہوگئی۔“ شیردل بے اختیار ہنسا۔

”اگر تم بات نہیں کرو گی تو ظاہر ہے مجھے ہی بات کرنی پڑے گی۔“ اس نے جیسے ملے عکس کے سر پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”تم مجھے سوچنے کا موقع دو گے تو میں بات کروں گی نا۔“ اس نے ساتھ چلتے ہوئے جواباً کہا۔

”اچھا سوچو۔“ شیردل نے فوراً پسپائی اختیار کی اور خاموش ہو گیا۔ عکس اس کے ساتھ چلتے ہوئے کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے ایک بہت عجیب سوال کیا تھا۔

”تم مجھے ناپسند کرتے ہو؟“ شیردل کچھ دیر کے لیے بول نہیں سکا..... سوال اتنا ہی غیر متوقع تھا پھر چند لمحے خاموش رہ کر اس نے کہا۔

”ناپسند..... تو نہیں..... لیکن ہاں تم مجھے کچھ عجیب لگتی تھیں۔“

”لگتی تھی؟“ عکس نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں پہلے زیادہ لگتی تھیں۔ اب تھوڑا کم لگتی ہو اور آج تھوڑا اس سے بھی کم۔“ وہ مسکرا دی۔ ”تم بھی تو مجھے ناپسند کرتی ہو؟“

سائے رو پڑتی۔ وہ ان آنسوؤں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ اس کا اپنا خاندان تھا۔ وہ سنگاپور انٹرنیٹ پر روتی ہوئی چڑیا کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اس لیے اس نے ڈاکٹر عکس مراد علی کو جانے دیا لیکن وہ جب تک وہاں کھڑا رہا جب تک عکس اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

عکس نے ایک بار بھی اندر جانے کے بعد اسے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ وہاں کھڑا تھا اور جب تک وہ نظر آ رہی تھی وہ وہاں سے ہٹ نہیں سکے گا۔ وہ اس سے ایکسکیز کر رہا تھا اور کہاں کھڑا ہو کر رہا تھا۔ وہ جانے کے باوجود اپنے چہرے کو بار بار بھینکنے سے نہیں روک پارہی تھی۔ شیردل نے کہا تھا کہ اس نے خیر دین سے کچھ نہیں کہا تھا اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ اس نے خیر دین سے کچھ کہا ہوگا۔ وہ دونوں اس حد تک ایک دوسرے کی بات پر یقین رکھتے اور کرتے تھے۔

ایکسکیز کروانے کے بعد لاہور سے گزرتے ہوئے اس نے شیردل کے فون سے باری باری کچھ کالز کی تھیں۔ پہلی کال اس نے جواد کی تھی اس نے کال انینڈ نہیں کی تھی۔ اس نے چند بار اور کوشش کی لیکن نتیجہ وہی رہا۔ پھر اس نے پاکستان میں اپنے عملے کے اس شخص سے رابطہ کیا تھا جو ہسپتال میں خیر دین کی دیکھ بھال کر رہا تھا پھر اس کو شیردل کے گروائے ہوئے کچھ انتظامات کے ذریعے لاہور منتقل کر دیا گیا تھا۔ جواد ایک بار اس کی خیریت دریافت کرنے آیا تھا لیکن اس کے بعد عملے کے اس فرد کے ساتھ اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ عکس کو اس وقت جواد کا غائب ہو جانا کچھ چھٹا تھا لیکن اس وقت اپنی پریشانی میں اس نے اس کی وجوہات پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جواد سے ہونے والی بات چیت میں اس نے اسے اپنے فلائٹ شیڈول کے بارے میں بتایا تھا اور اس نے اسے کہا تھا کہ وہ انٹرنیٹ پر اسے پک کر لے گا لیکن اب رابطہ نہ ہونے پر عکس نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے عملے کو انٹرنیٹ پر بلوایا تھا۔ پاکستان کالز کرنے کے بعد اس نے کویت حلیہ کو کال کر کے اس سے پاکستان آمد کا شیڈول پوچھا تھا۔ وہ اگلی شام کی فلائٹ سے پاکستان پہنچ رہی تھی۔ ان تمام کالز سے فارغ ہونے کے بعد وہ چند میسجز کر رہی تھی جب اس نے فون پر شہر بانو کا نام دیکھا۔ اس نے text کیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے عکس کو سمجھ نہیں آئی۔ وہ اس text کا جواب دے یا نہ دے۔ text نہ کھولنے کے باوجود اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اس سے فوری طور پر بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ عجیب کشش میں بیٹھی رہی۔ پھر اس نے text کا جواب نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ اسے یقین تھا ہاشل واپس پہنچ کر شیردل، شہر بانو کو خود ہی کال کر لیتا اور اسے فون کے عکس کے پاس ہونے کے بارے میں بتا دیتا۔ اس سے پہلے کہ وہ فون رکھ دیتی سیل فون پر ایک لوکل نمبر سے کال آنے لگی تھی۔ وہ شیردل تھا جو اس سے اس کی فلائٹ کی روانگی چیک کرنا چاہتا تھا۔

”شہر بانو کو فون کرلو۔۔۔۔۔ اس کا message آیا تھا وہ تم سے ایمر جنسی میں بات کرنا چاہتی ہے۔“  
 ”اوکے میں اسے کال کر لیتا ہوں۔ تم نے اسے بتایا ہے کہ فون تمہارے پاس ہے؟“ شیردل نے جواباً پوچھا تھا۔  
 ”نہیں، میں نے نہیں بتایا۔ مجھے عجیب لگا تھا کہ۔۔۔۔۔“ شیردل نے اس کی بات کاٹ دی۔  
 ”ٹھیک کیا۔ میں خود اس سے بات کر لوں گا۔“ چند منٹ دونوں بات کرتے رہے۔ گفتگو کے اختتام پر عکس نے ایک بار پھر شیردل سے کہا۔  
 ”شہر بانو کو فون کر لینا وہ ایمر جنسی میں تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔“ اسے شیردل کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ بہت تھکا ہوا تھا اور سونے کے موڈ میں تھا۔  
 ”ہاں میں کر لوں گا۔“ شیردل نے جہاں ہی لیتے ہوئے کہا۔

چار گھنٹے کے بعد ملائیشیا میں اپنی connecting فلائٹ کے لیے ملائیشیا انٹرنیٹ پر قدم رکھتے ہوئے عکس کا فون بہت سارے فیکسٹ میسجز سے بجنے لگا۔ اس نے ان تمام میسجز کو چیک کیا ان میں شہر بانو کا کوئی بھی میسج نہیں تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ یقیناً شیردل اور شہر بانو کی آپس میں بات ہوئی تھی۔ مین گھنٹے کے اسٹاپ اور میں ملائیشیا انٹرنیٹ پر بیٹھے اس نے ایک بار پھر خیر دین کی خیریت دریافت کی تھی اور ایک بار پھر جواد سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ خیر دین کی حالت دیکھی ہی تھی اور جواد بھی اسی طرح غائب تھا اور جب بالآخر ان کالز سے فارغ ہونے کے بعد اس نے

اب سمجھ رہا تھا۔ معنی پہنانے کے قابل ہو گیا تھا۔  
 ”تم ٹھیک ہو؟“ اس سے چند منٹ بات کرنے میں بھی عکس نے اس کے غیر معمولی رویے کو نوٹس کیا تھا۔  
 ”ہاں، کیوں؟“ شیردل نے حیران ہوئے بغیر کہا۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ بھی چھپا نہیں سکتے تھے اس لیے چھپانے کی کوشش میں وہ وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے سب کو جتنا بھی نارمل رکھتا وہ پھر بھی اس کی ذہنی کیفیت کو بھانپ جاتی۔  
 ”خاموش ہو۔“

”طبیعت ٹھیک نہیں کچھ۔“ یہ واحد بہانہ تھا جو سب کچھ چھپا لیتا۔ وہ اسے اپنا خیال رکھنے اور آرام کرنے کا کہتی رہی پھر اس نے فون بند کر دیا تھا۔

وہ اس رات تقریباً ساری رات اس سوئنگ کرتا رہا۔ وہ سو نہیں سکا تھا۔ بعض جنگلیں ضمیر اور بے ضمیری کے درمیان ہوتی ہیں۔ وہ بھی اس رات وہی جنگ لڑ رہا تھا۔ عکس مراد علی کے اس نئے تعارف نے اسے بہت پیچھے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ایک شدید احساس جرم میں مبتلا کر دیا تھا۔ چڑیا کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کا یقینی شاہد تھا اور یہ شہادت اس کے دل پر ایک بوجھ کی طرح تھی۔ اس دائرے کے جانے والے کیس میں اس الزام کے حوالے سے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ شہباز حسین کے خلاف ایک سادہ misconduct اختیارات کے غلط استعمال اور خیر دین پر لگائے گئے جھوٹے الزامات کا کیس تھا اس کے باوجود شیردل صرف اس ایک رات کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ بہت کچھ اب اس کی یادداشت میں اس طرح محفوظ نہیں رہا تھا جیسے پہلے تھا لیکن اس کے باوجود جو کچھ اسے یاد تھا اس کے بعد عکس مراد علی سے نظر ملانا اس کے لیے بہت مشکل ہو گیا تھا۔

عکس اس وقت لاہور میں تھی اور اسے اس رات لاہور ہی میں رہ کر اگلے دن وہاں سے سنگاپور کی فلائٹ لینی تھی۔ وہ نہیں جانتا اسے کیا خیال آیا تھا لیکن اگلے دن لاہور جانے سے پہلے وہ صبح سویرے خیر دین سے ملنے چلا آیا تھا۔

☆☆☆

”تم نے ان سے کیا کہا؟“ چیک ان اشارٹ ہونے کے اعلانات کے باوجود اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے اس نے شیردل سے پوچھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار شیردل پر بے تحاشا غصہ آیا تھا اتنا غصہ کہ۔۔۔۔۔ وہ اس کے ساتھ دھوکا کر رہا تھا، اس سے پوچھتے بغیر اسے بتائے بغیر اس کی عدم موجودگی میں وہ اس کے گھر خیر دین سے ملنے پہنچ گیا تھا۔  
 ”میں ان سے ایکسکیز کرنے گیا تھا اور میں ان سے کچھ نہیں کہہ سکا۔۔۔۔۔ کیونکہ تم نے انہیں ہر بات سے بے خبر رکھا ہے۔“ شیردل اس کے چہرے سے جیسے اس کے دل تک پہنچ رہا تھا۔ وہ محو میں آگ سے موم ہوئی تھی۔  
 ”کس چیز کے لیے ایکسکیز؟“

”ہر چیز کے لیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے وہ بالقابل کھڑے رہے۔۔۔۔۔ سادہ۔۔۔۔۔ سانس روکے۔۔۔۔۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں اس چیز کو پہچاننے اور پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے جو نظر آ رہی تھی۔۔۔۔۔ اس چیز کو کھوجنے کی کوشش کر رہے تھے جو چھپی ہوئی تھی۔ شیردل کی آنکھوں میں عکس نے ٹھکن کو دیکھا اور اس کے پیچھے ندامت کو۔۔۔۔۔ شیردل نے اس کی آنکھوں میں نی کی چمک دیکھی اور اس کے پیچھے جھلکتی افسردگی کو۔۔۔۔۔ انہوں نے بیک وقت سانس لی تھی، بیک وقت نظریں چرائی تھیں، بیک وقت سر جھکا کر دوبارہ سراٹھایا۔ پھر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا پھر نظریں چرائیں۔۔۔۔۔ یوں جیسے دونوں مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کو ایک دوسرے کی کشش کے اثر کے حصار سے نکالنے، توڑنے، چھڑانے، چرانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

ہر چیز میں کیا کیا تھا؟ عکس نے ایک لمحے سے بھی کم میں سمجھ لیا تھا لیکن یہ ایکسکیز وہ لینے پر تیار نہیں تھی۔ کم از کم زندگی کے اس لمحے میں نہیں۔

”دیر ہو رہی ہے میں چلتی ہوں۔“ وہ اس سے کہتے ہوئے یک دم پلٹ گئی تھی۔ شیردل وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے بھی اس کو اندازہ تھا کہ وہ رو رہی تھی۔ وہ اسے وہاں بات کرتے ہوئے روکتا تو وہ اس کے

شام کو حلیہ بھی پاکستان پہنچ گئی تھی۔ وہ اکیلے ہی آئی تھی۔ اس کے شوہر یا بچوں میں سے کوئی ساتھ نہیں آ سکا تھا۔ شام کو وہ کچھ دیر آرام کرنے کے لیے ابھی اس کلب میں پہنچی ہی تھی جہاں شیردل نے اس کی عارضی رہائش کا انتظام کروایا تھا۔ شیردل کی کال آگئی تھی۔ خیر دین اور اس کی خیریت کے بارے میں بات کرنے کے بعد عکس کو مسز فاروق یاد آگئی تھیں۔

”شیردل..... مسز فاروق کون ہیں؟“ اس نے اچانک شیردل سے پوچھا تھا۔ وہ چونکا۔

”کون مسز فاروق؟“

”تمہارے سیل فون میں ایک نمبر saved ہے۔“

”اوہ وہ..... شہر بانو کی می ہیں۔“ شیردل نے دانستہ شہباز حسین کی سابقہ بیوی کے حوالے سے شرمین کا تعارف نہیں کروایا تھا۔ عکس کچھ دیر کے لیے بول نہیں سکی تھی۔

”کیوں؟ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”ملائیشیا میں اسٹاپ اور کے دوران ان کی کال آئی تھی تمہارے فون پر.....“

”میرے فون پر.....؟“ شیردل بے اختیار حیران ہوا۔

”ہاں انہوں نے تمہارا پوچھا پھر میرے بارے میں پوچھا، میں نے جب نام نہیں بتایا تو انہوں نے کہا کیا تم عکس مراد علی ہو؟“

”یہ تم سے شرمین آنٹی نے کہا؟“ شیردل ابل گیا تھا۔

”ہاں..... وہ میرے بارے میں کیسے جانتی ہیں؟“ شیردل فی الحال جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا شرمین عکس مراد علی کے بارے میں کیسے جان پائی ہوں گی۔

☆☆☆

شرمین، مثال کی بات پر ابل کر رہ گئی تھیں۔

”شہر بانو رو رہی ہے.....؟ کس لیے؟“ ایک چار سالہ بچی سے کیا جانے والا یہ سوال احمقانہ تھا لیکن وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔ وہ اپنے بیڈروم میں اپنی وارڈروپ سے کچھ کپڑے نکال رہی تھیں جب مثال دروازہ کھول کر بہت اداس سی ان کے پاس آئی تھی۔

”آؤ بیٹا.....“ شرمین نے اپنے کام میں مصروف اسے پکارتے ہوئے کہا۔

”نانو! تمی رو رہی ہیں۔“ مثال نے اندر آ کر کوئی تمہید باندھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ کام کرتے کرتے رک گئیں۔

فون رکھنا چاہتا تو اس کے فون پر کسی مسز فاروق کی کال آنے لگی تھی۔ وہ چند لمحے اس کال کو دیکھتی رہی اور یہ طے کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ اسے کال مینی چاہیے یا نہیں۔ اس نے بالآخر کال لینے کا فیصلہ کیا۔ ہیلو کہنے پر دوسری طرف کچھ دیر کے لیے آواز ہی نہیں آئی تھی۔ عکس کو دو مین بار ہیلو..... ہیلو کہنا پڑا اور بالآخر اس نے شرمین کی آواز سنی۔

”میں ایک شیردل سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“ عکس کو اس آواز میں ایک عجیب سی حیرانی اور بے یقینی کی کیفیت محسوس ہوئی جسے وہ سمجھ نہیں سکی۔

”وہ اس وقت available نہیں ہیں۔ آپ مجھے میج دے دیں میں ان کو فارورڈ کر دوں گی، وہ آپ کو خود کال کر لیں گے۔“ عکس نے بے حد شائستگی سے کہا۔

”آپ کون ہیں؟“ مسز فاروق نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس سے کہا۔ عکس کو اپنا تعارف کروانے میں تامل ہوا۔

”آپ اپنا میج دے دیں میں انہیں فارورڈ کر دوں گی۔“ اس نے جواب دینے کے بجائے اپنی بات دہرائی۔

”آپ عکس مراد علی ہیں؟“ عکس دوسری طرف سے اپنا نام لیے جانے پر یک دم حیران رہ گئی تھی۔ وہ کون تھیں جو اس کے نام سے واقف تھیں اور یہ بھی جانتی تھیں کہ اگر اس وقت وہ بمبر اس کے پاس تھا تو پھر وہ عکس مراد علی تھی۔

”جی۔“ وہ اس بار اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکی۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی اور پھر یک دم فون بند ہو گیا۔ عکس کو لگا شاید کال اتفاقاً ڈس کنیکٹ ہوئی تھی اور مسز فاروق کچھ دیر میں اسے دوبارہ کال کریں گی لیکن دوبارہ کوئی کال نہیں آئی تھی۔ عکس نے ایک بار مسز فاروق کا نمبر چیک کیا تھا۔ وہ امریکا کا نمبر تھا اور امریکا میں شیردل کی آدمی سے زیادہ فیملی تھی یہ عکس جانتی تھی لیکن وہ کون تھی شہر بانو کے علاوہ جو اسے اس طرح پہچان جاتی؟ جو اس کے نام سے اس طرح واقف ہوئی

کہ شیردل کے فون پر اس کی آواز سنی تو اسے اس کے نام سے پہچان لیتی۔ یہ انتہائی تشویشناک بات تھی اس کے لیے اور انتہائی الجھا دینے والی بھی۔ اس کا ذہن ایک لمحے کے لیے شہر بانو اور اس کی ماں کی طرف گیا تھا لیکن وہ یہ یقین نہیں کر سکتی تھی کہ شرمین اسے فون کرنے پر اسے اس کے نام سے پہچانے گی۔ شہر بانو اور اس کے درمیان ایک رسمی علیک سلیک کے علاوہ کچھ نہیں ہوا تھا اور وہ یہ نہیں سوچ سکتی تھی کہ شیردل اپنی ساس کے سامنے اس کا ذکر کرتا رہا ہوگا اگر کرتا بھی رہتا

تب بھی ان کا اس طرح اس کی آواز پر پہلا اندازہ اس کے بارے میں لگانا..... وہ بری بری طرح الجھی تھی۔ اسے شیردل سے یہ معاملہ ڈسلس کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس نے اسے کال نہیں کی تھی اور وہ کوشش کرتی تو سیل فون میں اس کے کمرے کا نمبر ڈھونڈ کر آپریٹر کے ذریعے اس سے رابطہ کر لیتی لیکن وہ رات کا آخری پہر تھا اور وہ چاہتی تھی کہ شیردل سوتا

رہے۔ وہ اسے ایک معمولی سی بات کے لیے نیند سے جگانا نہیں چاہتی تھی۔

وہ اگلی صبح گیارہ بجے خیر دین کے پاس پہنچی تھی اور آئی سی یو کے ششے سے اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی وہ چند لمحوں کے لیے یہ بھول گئی تھی کہ وہاں اس کا عملہ تھا اور ڈاکٹر تھا۔ اس نے بچپن سے آج تک خیر دین کو ہسپتال کے بستر پر بیمار نہیں دیکھا تھا، اس طرح پڑے نہیں دیکھا تھا اور اب وہ دیکھ رہی تھی تو اسے یہ سمجھنا مشکل ہو رہا تھا کہ خیر دین کو کچھ ہوسکتا تھا.....

پہاڑ ٹوٹے ہیں لیکن جب تک ہم انہیں اپنے سامنے ٹوٹا ہوا نہ دیکھ لیں ان کا قابل شکست ہونا ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہوتا۔ خیر دین بھی اس کے لیے پہاڑ تھا اور پہاڑ کو ریت بنتے دیکھنا..... وہ بہت دیر بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہیں آئی سی یو کے ششے سے خیر دین کو دیکھتی رہی..... اندر جانے کی ہمت نہیں کر سکی پھر وہ ڈاکٹر کے ساتھ اندر چلی گئی تھی۔

اس نرم جھریوں بھرے کمزور سویوں لگے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ ایک بار پھر سسکیوں سے رونے لگی تھی۔ حلیہ کی شادی ہو جانے اور اپنا خاندان شروع کر لینے کے بعد خیر دین کے علاوہ اس کا دنیا میں واقعی کوئی نہیں رہا تھا۔

اس بستر پر خیر دین نہیں تھا اس کا سارا خاندان تھا۔ ماں..... باپ..... بہن..... بھائی..... دوست..... سب کچھ وہی ایک شخص تھا اس کے لیے..... وہ کئی گھنٹے خیر دین کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے یک تک اسے دیکھتے ہوئے اس کے پاس بیٹھی

رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے پوری کائنات تھے اور خیر دین کے بے ہوش ہوتے ہوئے بھی عکس کو یقین تھا وہ اس کے ہاتھ کا لمس پہچانتا تھا۔

اضطراب کے عالم میں کہا۔ ”ممی میں اب اس سے کبھی بات نہیں کروں گی۔“

”شہر بانو یہ ٹھیک نہیں ہے۔۔۔۔۔ بات تو کرنی چاہیے اور تم نہیں تو میں بات کرتی ہوں اس سے۔“ شرمین نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”ممی آپ اس سے بالکل بات نہیں کریں گی۔۔۔۔۔ اس نے مجھے ہرٹ کیا ہے۔“

”میں جانتی ہوں بیٹا! لیکن پھر بھی بات تو کرنی چاہیے۔ پوچھنا تو چاہیے کہ کیا ہوا اور کیوں ہوا؟“ شرمین اسے سمجھا رہی تھی۔

”میں اس سے جو کچھ بھی پوچھوں گی اب سامنے پوچھوں گی۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”وہ اب یہاں آئے گا تو بات ہوگی۔۔۔۔۔ میں جب تک یہاں ہوں میں اس سے کوئی بات نہیں کروں گی۔“

شرمین عجیب خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی اس کی بات سنی رہی تھی۔ عکس مراد علی کے نام نے اس کے ذہن میں بہت سی گھنٹیاں بجائی تھیں۔ اسے خیر دین اور اس کی نواسی کا نام یاد آیا تھا لیکن اسے یہ یقین نہیں تھا کہ خیر دین کی نواسی کا نام عکس مراد علی ہی تھا۔ وہ مراد علی کا نام یاد کرتے ہوئے ابھی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ بچی ایک شیردل کی کولیگ ہو سکتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ افیئر چلا سکتی تھی۔ یہ یقیناً کوئی اور عکس تھی جسے وہ خیر دین کی نواسی کے نام کی وجہ سے کنفیوز کر رہی تھی۔

”تم جانتی ہو شیردل کی اس کولیگ عکس مراد علی کو۔۔۔۔۔؟“ شرمین نے جیسے پھر بھی اپنے کسی واسے کی تصدیق کی تھی۔ اس نے اور اس کے سوال نے شہر بانو کو یک دم جیسے ہوش میں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”ہاں میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔ دو چار بار ملی ہوں۔۔۔۔۔ ڈاکٹر ہے وہ۔۔۔۔۔“ اس نے کچھ لپیٹ کر بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

”فیملی بیک گراؤنڈ کیسا ہے؟“ شرمین کے سوال نے شہر بانو کو اپنی گئی وارننگ یاد دلائی۔

”اس کی ممی کویت میں ہوتی ہیں۔ ماں باپ، بہن بھائی اور خود وہ لاہور میں based ہے۔“ آخری جملہ اس کا اندازہ تھا کہ وہ لاہور سے ہی تعلق رکھتی ہوگی۔ شرمین کو اطمینان ہوا پھر یہ وہ والی عکس نہیں ہو سکتی وہ تو کسی دیہاتی علاقے سے تعلق رکھتی تھی اور وہ اپنے نانا کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی ماں کی شادی ہو چکی تھی۔

”میں منزہ سے بات کرتی ہوں اگر شیردل سے بات نہیں کرنی تو۔“ شرمین نے اسی مضطرب انداز میں کہا۔

”نہیں ممی آپ شیردل کی ممی سے بات نہیں کریں گی۔“ شہر بانو نے فوراً سے پیشتر کہا۔

”تو پھر معاملہ کسے حل ہوگا؟“ شرمین نے کچھ حیرانی سے ہچکیاں لیتی ہوئی بچی کو دیکھ کر کہا۔

”شہر بانو رو رہی ہے؟“

”Yes“

”کیوں؟ کیا ہوا؟“

”ممی نے کہا میں آپ کو نہ بتاؤں کہ وہ رو رہی ہیں۔“ شرمین کو مثال کی اگلی بات پر جیسے ایک اور دھچکا لگا تھا۔ وہ دارڈ روہ بند کرنا بھی بھول گئی تھی اور وہاں سے سیدھا شہر بانو کے کمرے میں آگئی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ دروازہ بجا کر اندر آتیں لیکن اس بار انہوں نے دروازہ تک نہیں بجایا تھا۔ شہر بانو واقعی اندر بیٹھی رو رہی تھی۔ شرمین کے یک دم اندر آنے پر اسے اتنا موقع نہیں ملا تھا کہ وہ کوئی احتیاطی تدابیر کر سکتی۔

”کیا ہوا جان؟“ شرمین کے ہاتھ پاؤں اسے اس بری طرح سے روتے دیکھ کر کچھ مزید پھول گئے تھے۔ شہر بانو جھوٹ بولنا چاہتی تھی۔ کوئی بہانہ بنانا چاہتی تھی۔ ہنس کر بات ٹال دینا چاہتی تھی لیکن وہ کچھ نہیں کر سکی۔ شرمین کے پاس آ کر بیٹھنے پر وہ ہلکتے ہوئے ان کی گود میں منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔ شکست خوردگی کا کیا بلا کا احساس تھا جس نے اسے اس وقت اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

”کیا ہوا بیٹا کیوں رو رہی ہو؟ کچھ تو بتاؤ؟“ شرمین گھبرائی ہوئی اس سے سوال پر سوال کر رہی تھی۔ اور اس کے پاس کہنے کے لیے جیسے ایک لفظ نہیں تھا۔ وہ شرمین اسے یہ کیسے کہہ دیتی کہ اس کی ساری پیش گوئیاں اور وارننگز ٹھیک ثابت ہوئی تھیں۔ شیردل ویسا ہی مرد ثابت ہوا تھا جیسا وہ اسے سمجھتی تھیں۔ وہ شوہر کی محبت اور وفاداری کا جو تاج سجائے پھرتی تھی وہ آج جیسے بیچ بازار سے گرا تھا۔ کیا وہ اس شرمینا کی ذلت کے احساس کو صرف خود تک رکھنا چاہتی تھی لیکن یہ بھی مشکل تھا یہ نہیں ناممکن تھا۔

ماں کی گود میں منہ چھپائے رکھتے ہوئے اس نے شرمین سے کہا۔ ”ممی! شیردل اپنی کسی کولیگ کے ساتھ افیئر چلا رہا ہے۔“ شرمین کپکپانے لگی تھی۔

”کون کولیگ؟“

”عکس مراد علی۔“ شہر بانو نے روتے ہوئے کہا۔ جو بات تھی وہ بتا نہیں سکتی تھی۔۔۔۔۔ بتا دیتی تو اس کی ماں کے اپنے زخموں کے کھرند اترنے لگتے۔۔۔۔۔ اس کے باپ کے حوالے سے پھر سوالیہ نشان اٹھتے۔۔۔۔۔ وہ شرمین کو ایسا کوئی حوالہ دینا نہیں چاہتی تھی جو عکس مراد علی کو ”ظالم“ نظر نہ آنے دیتا۔

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم سے کس نے کہا؟ شیردل ایسا نہیں کر سکتا۔“ شرمین نے عجیب بے یقینی اور دل گرفتگی سے یکے بعد دیگرے کئی سوال کر ڈالے۔ ابھی کچھ گھنٹوں پہلے تک تو وہ خوش باش تھی۔۔۔۔۔ ہر روز تو وہ شیردل کی تعریفیں کرتی تھی۔۔۔۔۔ اس کی کوئی بات شیردل کے حوالے کے بغیر پوری نہیں ہوتی تھی اور اب بیک دم وہ کہہ رہی تھی کہ۔۔۔۔۔ شرمین کو یقین نہیں آیا۔ اس خاندان کے حوالے سے خدشات رکھنے کے باوجود اسے یقین نہیں آیا کہ اس کی بیٹی کے ساتھ وہ سب کچھ ہو سکتا تھا۔

”ممی نے بتایا ہے مجھے کچھ دیر پہلے فون پر کہ۔۔۔۔۔“ شہر بانو نے روتے ہوئے کہا۔

”کیا بتایا ہے؟“ شرمین نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ بس یہی بتایا ہے کہ سنگا پور میں بھی اکٹھے ہیں دونوں۔“

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بیٹھے بیٹھے شیردل کیوں ایسا کچھ کرنے لگا۔۔۔۔۔ تم نے پہلے کبھی۔۔۔۔۔“

”ممی میں کچھ نہیں جانتی تھی۔۔۔۔۔ میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔“ وہ شرمین کی بات کاٹتے ہوئے ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس ساری گفتگو میں یہ پہلا سچ تھا جو وہ بول رہی تھی۔ وہ واقعی عکس اور شیردل کے ماضی کے اس تعلق کے حوالے سے کچھ نہیں جانتی تھی۔

شرمین کچھ دیر کے لیے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔ ”اس سے بات کرو تم۔۔۔۔۔ پوچھو“ شرمین نے بالآخر جیسے عجب

”ہو جائے گا حل..... اگر حل ہونا ہوا تو۔“

”ہو سکتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہو رہی ہو۔“ شرمین نے جو جملہ کہا تھا وہ یہ جملہ نہیں کہنا چاہتی تھی۔  
”کیسی غلط فہمی؟“ شہر بانو نے بھیکے ہوئے چہرے کے ساتھ ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”شرمین کے حوالے سے۔“ شرمین نے جیسے عجیب آس کے ساتھ کہا۔ شہر بانو کا دل کٹا تھا۔ اس کی ماں زندگی میں پہلی بار شہر بانو کو defend کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور کہاں کر رہی تھی۔

”کاش غلط فہمی ہی ہوتی مہی۔“ وہ کہتے ہوئے ایک بار پھر سسک پڑی۔ شرمین بہت دیر اس کے پاس بیٹھی اسے تسلی دیتی رہی تھی لیکن وہ بے حد پریشان تھی اور اسی پریشانی میں اس نے شیر دل سے اس سارے معاملے کے بارے میں خود بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ شہر بانو کے پاس سے اٹھ کر اپنے بیڈروم میں آگئی تھی اور اس نے وہاں سے شیر دل کے نمبر پر کال کی تھی اس بات کی پروا کیے بغیر کہ اس وقت وہ سو رہا ہوگا اسے اس وقت شک لگا تھا جب اس کی کال کسی لڑکی نے receive کی تھی۔ چند لمحوں کے لیے شرمین کو لگا آسمان اس کے سر پر آگرا تھا۔ رات کے اس پہر۔۔۔ شیر دل کے فون پر آنے والی کالز ریسیو کرنے والی کون ہو سکتی تھی اور اس سے بھی بڑا سوال یہ تھا کہ وہ دونوں اس وقت اکٹھے کیا کر رہے تھے۔ اس نے شیر دل سے کیا بات کرنی تھی اور کیا نہیں وہ سب بھول گئی تھی اور اس نے اس لڑکی سے وہ پوچھا تھا جو وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔ ملنے والے جواب نے اس کی رہی سہی ہمت بھی توڑ دی تھی۔ اس نے مزید کچھ بھی پوچھنے کچھ بھی کہنے بغیر فون بند کر دیا تھا۔ آج اس کی زندگی کا ایک اور سیاہ دن تھا۔ تاریخ اسے آپ کو بہت غلط وقت پر بہت غلط طریقے سے ڈرہا رہی تھی۔ فون ہاتھ میں لیے وہ بیٹھی رہی۔۔۔ بے حس و حرکت۔۔۔ ابھی ابھی اسے جو پتا چلا تھا وہ شہر بانو کے ساتھ اسے شیر کرنا چاہیے تھا یا نہیں۔۔۔؟ یہ سوال ایک دم کسی جھٹکڑی طرح اس کے ذہن میں گونجنے لگا تھا۔ اسے شہباز حسین یاد آیا تھا۔۔۔ اس کے ساتھ گزاری ہوئی اچھی زندگی اور اس کے بعد آنے والی تباہی۔۔۔ وہاں بیٹھے بیٹھے نہ چاہتے ہوئے بھی اس درو سے دوبارہ گزری تھی جو کبھی مندل ہوا ہی نہیں تھا۔۔۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔۔۔ بعض کانٹے آپ کو ساری عمر جیتے رہتے ہیں آپ لاکھ جتن کر کے بھی ان کو نکال نہیں پاتے۔۔۔ کیونکہ وہ نظر نہیں آتے۔ بس ان سے اٹھنے والی ٹیس میں آپ کو یاد دلائی رہتی ہیں کہ وہ ”ہیں“ اور آپ کے وجود کے اندر سے آپ کو بے حال کیسے ہوئے ہیں۔

”شہر بانو بتا رہی تھی کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تم بہت پروری تھیں۔“ شہباز اس دن آفس سے گھر آتے ہی اس کے پاس آیا تھا۔ وہ اس وقت وارڈ روم سے کپڑے نکال رہی تھی۔ ہر روز کی طرح اس نے شہباز کا استقبال گھر کے دروازے پر نہیں کیا تھا۔ اس نے پلٹ کر شہباز کو دیکھا تھا۔ وہ مرد جس کی وجاہت پر وہ کبھی مرئی تھی اس وقت اسے ایک بھوت کی شکل میں نظر آ رہا تھا۔ مکروہ آنکھوں، سیاہ داغدار شکل، طوطے جیسی مڑی ہوئی ناک اور لمبے نوکدار زرد ٹیڑھے میڑھے داغوں والا ایک چہرہ۔۔۔ جس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس سے خوف زیادہ آتا ہوگا یا نہیں۔۔۔ اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی شہباز کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں تھی۔ سرخ سوچی ہوئی آنکھیں، ستا ہوا چہرہ اور رگڑ رگڑ کر سرخ ہو جانے والی ناک۔

”کیا ہوا ڈارلنگ؟“ وہ جیسے کچھ بے چین انداز میں اس کو console کرنے کے لیے آگے بڑھا تھا۔  
”آج میں سسٹر ایلیفنس سے ملی۔“ اس کے ٹھنڈے لفظوں نے شہباز کے قدموں میں جیسے زنجیر ڈالی تھی۔ وہ فریز ہو گیا تھا۔ اتنے سالوں بعد اس نام کی بازگشت اسے آسب کی آواز جیسی لگی تھی۔  
”تم نے چڑیا کے ساتھ کیا کیا تھا؟“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہنا شرمین کے اگلے سوال نے ایک پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا تھا۔

”کون چڑیا؟“ وہ یہ سوال کرتے ہوئے بھی شرمین کا چہرہ دیکھتے ہوئے جانتا تھا وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی تھی۔

”تم چڑیا کو نہیں جانتے؟“ شرمین نے ایک قدم آگے بڑھا کر اس سے پوچھا۔

”نہیں؟“ شہباز کے پاس انکار کے علاوہ کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک زوردار تھپڑ نے شہباز کو کسی مزید جھوٹ کے حامل نہیں چھوڑا تھا۔

”چڑیا تمہاری بیٹی تھی..... جیسے شہر بانو..... جسے ساری دنیا کے مردوں سے چھپائے پھرتے ہو تم..... اس لیے چھپائے پھرتے ہو؟“ وہ چلائی تھی۔

”ویکھو تم کچھ غلط سمجھ رہی.....“ شہباز جانتا تھا سب کچھ ڈوب چکا تھا۔ اس نے پھر بھی جیسے اپنا گھر بچانے کی آخری کوشش کی۔

”ایک لفظ بھی مت کہنا تم شہباز حسین..... میں تمہارے منہ سے ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی۔“ وہ وارڈ روب سے دوبارہ اپنے کپڑے نکالنے لگی تھی۔

”شرمین میری بات سنو۔“ وہ لپکتا ہوا اس کی طرف آیا تھا۔

”تم مجھے ہاتھ بھی مت لگانا۔“ اس نے اسے قریب نہیں آنے دیا تھا۔

”وہ سب سازش کر رہے ہیں میرے خلاف..... تم کو اندازہ نہیں ہے کہ سسٹریٹکس مجھے تباہ کرنا چاہتی ہے..... کوئی بات ہوتی تو خیر دین میرے خلاف کیس کرتا..... تمہارے پاس آتا..... پریس میں جاتا..... سسٹریٹکس بکواس کرتی ہے۔“ شہباز کو اندازہ نہیں تھا وہ اس وقت اعتراف جرم کرنے کے بجائے جھوٹ بولنے پر ڈٹے رہنے کا فیصلہ کر کے اپنے پیروں پر کھڑی مار رہا تھا۔

”میں خیر دین سے مل کر آئی ہوں..... تم نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا وہ سن کر آئی ہوں..... جھوٹ بولنا چھوڑ دو شہباز کلم از کم..... اب چھوڑ دو۔“ وہ غرائی تھی۔ شہباز حسین کو جیسے قسمت نے ایک پتھرے میں ڈال دیا تھا۔

”وہ بھی بکواس کرتا ہے..... یہ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں..... مجھے اور میری فیملی کو بلیک میل کرنا چاہتے ہیں، تم ان لوگوں کی ذہنیت سے واقف نہیں ہو..... میں جانتا ہوں۔“ شہباز عجیب بے بسی اور خوف سے چلا یا تھا۔ اسے اپنا گھر ٹوٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”اور تم..... تمہاری ذہنیت کیا ہے؟ تمہیں تو جیل میں ہونا چاہیے شہباز..... اور آج نہیں تو کل تم جیل میں ہی ہو گے۔“ وہ اس پر چلاتے چلاتے رو پڑی تھی۔ ”تمہیں شہر بانو کا سوچنا چاہیے تھا۔ میرا سوچنا چاہیے تھا..... یہ سب کرتے ہوئے..... اتنا کرتے ہوئے..... اس طرح جانور بننے ہوئے۔“ وہ روتے ہوئے اس سے ہتی گئی تھی۔ شہباز اسے وضاحتیں دینے کے لیے ایڑیاں رگڑتا رہا تھا اور اس کی ہر وضاحت اسے شرمین کی نظروں میں کچھ اور گرانی گئی تھی۔ شہباز کی سر توڑ کوشش کے باوجود وہ اس کا گھر چھوڑ کر شہر بانو کو لیے وہاں سے ایک ہوٹل میں چلی آئی تھی۔ شہباز حسین کے گھر میں وہ اس کا آخری دن تھا۔

”مجھ سے یہ مت پوچھیں کہ میں شہباز کے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتی لیکن مجھے اس سے الگ ہونے دیں۔“ امریکا واپس آ کر پاکستان خلع کے لیے کیس فائل کرنے سے پہلے اس نے اپنے ماں باپ سے کہا تھا۔ اس کے لیے وہ وجہ اپنے ماں باپ کو بھی بتانی شرمناک محسوس ہو رہی تھی جو اس کے اور شہباز کے درمیان علیحدگی کا باعث بن رہی تھی۔ وہ ایک راز تھا جو اس نے بھی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کیا تھا صرف اس لیے کہ شہر بانو کی زندگی پر اس انکشاف کے بہت سے منفی اثرات ہو سکتے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے اس فیصلے نے شہر بانو کی نظروں میں اسے ایک ولن بنا دیا تھا لیکن وہ یہ قیمت ادا کرنے پر تیار تھی۔

اور اب اتنے سالوں بعد وہ شہر بانو کو اسی دورا ہے پر دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

آپ نے شہر بانو سے کوئی بات کی ہے؟“ شیردل نے رکی علیک سلیک کے بعد کسی تمہید کے بغیر منظرہ سے فون پر پوچھا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس غیر متوقع سوال کا جواب منظرہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔



میں اور آپ اس کا گلا نہیں دبا سکتے۔“ شیردل نے انتہائی خشکی سے آخری جملہ کہا تھا اور پھر مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پتا نہیں کیا یا دیا گیا تھا۔ انسان کا لاشعور بعض دفعہ اپنے اندر چھپے راز بچ بازار تھوک دیتا ہے۔

”تم اپنے انکل کو جانتے ہو پھر بھی یہ باتیں کر رہے ہو..... شہباز کسی کے ساتھ نا انصافی، زیادتی کر سکتا ہے؟“ منزہ نے بھی اس بار چلا کر کہا۔ ”کوئی لاکھ بار بھی آکر کہے تو بھی میں نہیں مانوں گی..... مان ہی نہیں سکتی..... وہ میرا بھائی اس کی ساری عمر میرے سامنے گزری ہے..... اور.....“ شیردل نے ماں کی بات کاٹ دی۔

”آپ انکل شہباز کی خاطر اب میرا گھر تروادیں گی۔“ شرمین آنٹی نے فون کیا تھا مجھے..... شہباز نے یقیناً سب کچھ نہیں بتا دیا ہے میں جس mess کو سینٹا جاتا تھا آپ نے اسے بہت بڑھا دیا ہے میرے لیے۔“ شیردل نے بے چارگی سے ماں سے کہا۔ منزہ کچھ دیر بول ہی نہیں سکی۔ وہ شہباز کو اس کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

”شرمین نے تمہیں فون کیا تھا؟ میں نے شہباز کو منع کیا تھا اس سے بات کرنے سے۔“ منزہ کو پہلی بار کچھ regret۔

”میں نے بھی آپ کو منع کیا تھا شہباز کو سے کچھ بھی کہنے سے..... اگر آپ میری بات اگور کر سکتی ہیں تو شہباز کو آپ کی بات کیوں مانے گی؟“ شیردل نے خبی سے ماں سے کہا۔

”کیا کہا شرمین نے تم سے؟“ منزہ اب شدید اضطراب میں تھی۔

”میری ان سے بات نہیں ہو سکی..... اب کرنا چاہتا ہوں۔“ شیردل انہیں یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ شرمین کی کال عکس نے ریسیو کی تھی اور اس کا فون عکس کے پاس تھا۔ یہ منزہ کے غصے کو نئے سرے سے جگانے کا باعث بنتا۔

”مجھے لگتا ہے مجھے اب تمہارے باپ سے بات کرنی چاہیے..... عکس کے خلاف کوئی ٹھکانہ کارروائی ہوگی تبھی اس مسئلے کا کوئی حل نکلے گا۔“ منزہ نے یک دم جیسے کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

”میں آپ ایک mess کھڑا کر چکی ہیں ایک اور مت کریں..... آپ پاپا سے اس طرح کی کوئی چیز نہیں کروائیں گی۔ جس سے اس کے کیریئر کو کوئی نقصان پہنچے۔“ شیردل نے دو ٹوک انداز میں ماں کو خبردار کیا۔

”تم اس کو اس کیس کو واپس لینے پر رضامند نہیں کرو گے اور تم اس کے خلاف کچھ کرنے نہیں دو گے..... شیردل تم اس کے لیے اپنے خاندان کو متاثر نہ کرو گے..... اور وہ میں نہیں ہونے دوں گی۔“ منزہ نے بڑی خبی کے ساتھ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ شیردل فون ہاتھ میں لیے بیٹھا رہ گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے پہلے ازدواجی کراسس میں پھنسا تھا اور فی الحال اسے اس سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی کیونکہ وہ شہباز کو سے ہزاروں میل دور بیٹھا ہوا تھا..... سنگاپور میں بیٹھے

گاہنے والے دنوں کا تصور اسے ہول رہا تھا۔ ایک دن پہلے تک۔ صرف عکس کی پریشانی تھی جو اس کی ایزھی کا کابجانی ہوئی تھی اور اب یک دم شہباز کو کی خشکی..... وہ زندگی میں پہلی بار اس سے خفا ہوئی تھی شیردل کو کچھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی

خشکی کو کس طرح دور کرے اس سے پہلے چھوٹے موٹے معمولی جھگڑے ہوتے تھے ان دونوں کے درمیان جن کا دورانیہ چند گھنٹوں سے زیادہ بھی نہیں بڑھ پایا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے

تھے اور شیردل اسے خفا نہیں رہنے دیا کرتا تھا۔ شہباز کو بچے کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہل جاتا کرتی تھی اور شیردل اپنے اس کی خشکی کو کبھی سنجیدگی سے لیا ہی نہیں تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ خفا تھی اور دوری اور اسے بات یا وضاحت کرنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا منزہ نے شہباز کو سے کس طرح بات کی تھی خاص طور پر عکس کے حوالے

کے..... لیکن شہباز کو کے اس طرح سے غائب ہو جانے سے اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ جو کچھ بھی کہا گیا تھا وہ شہباز کو کے لیے بہت زیادہ پریشان کن تھا۔

سنگاپور میں قیام کے باقی دنوں میں سر توڑ کوشش کے باوجود وہ شہباز کو سے بات نہیں کر سکا تھا۔ فون اٹھایا جاتا اور اس کی آواز سنتے ہی کچھ کہے بغیر رکھ دیا جاتا اور یہ شرمین اور شہباز کو دونوں کی طرف سے ہوتا تھا۔ اس نے بہت اب سیٹ ہو کر بالآخر ایک دن فاروق کو کال کی تھی۔ فاروق کا رویہ بھی بے حد سرد مہری لیے ہوئے تھا اور اس نے بہت صاف لفظوں

میں اور آپ اس کا گلا نہیں دبا سکتے۔“ شیردل نے انتہائی خشکی سے آخری جملہ کہا تھا اور پھر مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پتا نہیں کیا یا دیا گیا تھا۔ انسان کا لاشعور بعض دفعہ اپنے اندر چھپے راز بچ بازار تھوک دیتا ہے۔

”کیا بات؟“ منزہ کو کوئی اور جواب نہیں سوجھا تھا۔

”میں وہ میری کال نہیں لے رہی۔ آپ نے کیا کہا ہے اس سے؟“ شیردل نے خشکی آمیز انداز میں کہا۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے وقفے وقفے سے شہباز کو کال کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ فون نہیں اٹھا رہی تھی اور وہ اب بے حد اب

سیٹ ہو رہا تھا۔

”تم نے عکس کو سمجھانے سے انکار کیا تھا تو پھر مجھے شہباز کو سے بات کرنی ہی تھی، میں نے اس سے صرف یہ کہا تھا کہ وہ تمہیں سمجھائے۔“ منزہ نے بے حد آرام سے کہا۔ شیردل ان کے انداز پر حیران رہ گیا تھا۔

”میں نے آپ کو منع کیا تھا۔“

”اور میں نے بھی تم سے کہا تھا تم عکس کو یہ کیس واپس لینے پر مجبور کرو۔“

”عکس اپنی زندگی کے فیصلے مجھ سے پوچھ کر نہیں کر سکتی اور نہ ہی میں اسے کسی چیز کے لیے مجبور کر سکتا ہوں..... وہ اپنے ہر فیصلے میں آزاد ہے۔“ شیردل نے دو ٹوک انداز میں ایک بار پھر ماں کے سامنے وہی بات دہرائی تھی جو وہ پہلے بھی

کہہ چکا تھا۔

”تمہیں اپنی فیملی کی پروا نہیں ہے تمہیں انکل شہباز کی پروا نہیں ہے، تمہیں اپنی بیوی کے مرے ہوئے باپ کی عزت کا خیال نہیں ہے تمہیں پروا ہے تو اس دو ٹوکے کی لڑکی کی۔“ منزہ کو اس کی بات پر یک دم غصہ آ گیا تھا۔

”میں فرض کریں وہ میری دوست نہ ہوتی میں اس کو جانتا بھی نہ ہوتا اور یہ کیس فائل ہو جاتا انکل شہباز کے خلاف تب کیا ہوتا؟“

”تم میرے ساتھ امکانات کی بات نہ کرو حقائق کی بات کرو۔“ وہ اس کی بات پر مزید خفا ہوئی تھیں۔

”حقائق بڑے سخت ہوتے ہیں مگر..... ان کا سامنا کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔“

”تم میرے سامنے فلسفہ بولنے کی کوشش مت کرو۔“

”آپ کو اندازہ ہے کہ آپ نے شہباز کو کو اس کیس کے بارے میں بتا کر کتنا ہرٹ کیا ہوگا..... آپ انکل شہباز کے حوالے سے اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیت سے اچھی طرح واقف ہیں پھر بھی آپ نے لحاظ نہیں کیا۔“ شیردل نے بات کا موضوع بدل دیا تھا۔

”شیردل تمہیں شہباز کو کی ذہنی اور جذباتی حالت کی پروا نہیں ہے، تمہیں ٹینشن صرف اس بات کی ہے کہ شہباز کو عکس کے حوالے سے تمہارے تعلق اور رشتے کی نوعیت کا پتا چل گیا ہے۔“ شیردل چند لمحے جیسے صدمے سے بول نہیں سکا

تھا۔

”آپ نے شہباز کو کو کیا بتایا ہے میرے اور عکس کے بارے میں؟“

”جو کچھ تھا اور جو کچھ ہے..... سب کچھ.....“ منزہ نے انتہائی سنگ دلی سے کہا۔ ”اور میں کیوں نہ بتاتی..... میں تم سے ڈرتی تو نہیں ہوں۔“

”تمہیں بتایا تھا میں نے..... ہم دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ نہیں تھی۔“ شرمین نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے پتا نہیں کون کون سا زخم ہرا ہو گیا تھا اس کا۔

”انڈر اسٹینڈنگ نہ ہو تو انسان اتنے سال تو اکٹھے نہیں رہتا..... بس دو چار سال میں سب کچھ پتا چل جاتا ہے۔“ شہربانو نے ماں کی بات کو پہلی بار کھلے لفظوں میں رد کرتے ہوئے کہا۔

”بعض شادیاں سالوں چلنے کے بعد بھی ٹوٹ جاتی ہیں۔“ شرمین نے عجیب دل گرفتگی کے عالم میں کہا تھا۔ وہ پہلا موقع تھا جب شہباز سے اپنی شادی کے بارے میں بات کرتے ہوئے شہربانو نے شرمین کو رنجیدہ دیکھا تھا اور نہ وہ ہمیشہ ایک بے تاثر چہرے اور سرد مہر لہجے میں اس ایشو پر بات کرتی تھیں یوں جیسے وہ کسی اور کی زندگی کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔

”ایسا کیا ہوا تھا آپ میں اور ان کے درمیان کہ آپ نے divorce جیسا بڑا فیصلہ کر لیا۔“ شہربانو نے اپنے سوال پر اصرار کیا۔

”تمہیں آج بیٹھے بٹھائے مجھ سے یہ پوچھنے کا خیال کیسے آ گیا؟“

”ہمیشہ ہی پوچھنا چاہتی تھی آپ نے بھی موقع ہی نہیں دیا۔“ شہربانو نے ماں کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”بہت وقت گزر گیا بہت پرانی بات ہو گئی اب اس کے بارے میں بات کرنے کا کیا فائدہ..... زندگی بہت آگے آگئی ہے۔“ شرمین نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”میرے لیے نہیں آئی..... میری زندگی کا ایک حصہ، پاپا کے ساتھ بندھا ہوا تھا وہ آج بھی وہیں ہے۔“ بہت تکلیف دہ اعتراف تھا یہ شہربانو کا اور اتنا ہی تکلیف دہ یہ شرمین کے لیے تھا۔ شہربانو، شہباز سے کس طرح انچیز تھی شرمین کو اس کا اندازہ اور احساس تھا اور شادی کے اس رشتے کو توڑتے ہوئے اگر اسے کسی چیز کی سب سے زیادہ تکلیف تھی تو وہ یہی تھی۔ جھگڑے کی وجہ وہ نہ ہوتی جو بھی تو وہ شہربانو کو شہباز سے اس طرح دور نہ کرنی لیکن پتا نہیں اسے شہباز اور شہربانو کے حوالے سے عجیب سے وہم ہوتے تھے۔ نفسیاتی طور پر وہ شہربانو کو شہباز کے پاس اکیلا چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور یہ ایک ایسا خوف اور وہم تھا جسے وہ کسی کے ساتھ شیئر کر کے اس سے نجات حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ شہباز، شہربانو کا باپ تھا اور یہ سوچنا بھی شرمین کا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ کوئی غلط حرکت کر سکتا تھا لیکن شرمین اس ایک انکشاف کے بعد ہر طرح کے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو گئی۔ اس کا گھر زمین بوس نہیں ہوا تھا، اس کی پوری شخصیت زمین پر آگری تھی۔ شہباز اپنے جرم کا اعتراف کرنے پر تیار نہیں تھا اور اس کی اس ڈھٹائی نے شرمین کے خوف اور عدم تحفظ کو بڑھا دیا تھا۔ وہ شہباز سے اعتراف جرم کا مطالبہ کر رہی تھی اور وہ اس سے انکار ہی تھا۔

”تم خود سوچو میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں۔ میں ڈننی طور پر بیمار ہوں کیا؟“ اسے منانے کی کوششوں کے دوران وہ بار بار ایک ہی جملہ بولتا رہتا تھا اور ایک پوائنٹ پر آ کر شرمین چلا آتی تھی۔

”تم ڈننی طور پر بیمار ہو۔ تمہیں علاج کی ضرورت ہے۔ اس inode of denial سے باہر نکل آؤ شہباز..... کم از کم اب جب تم یہ بھی جانتے ہو کہ سب کچھ پتا چل گیا ہے مجھے۔“ شہباز پر اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ سب ٹھیک ہو جاتا اگر اسے منزہ کی اتنی بھرپور اور کھلی حمایت نہ ملتی۔ اسے اپنی زندگی میں بھی اپنے اس فیصلے پر بچھتا ورنہ ہوتا اگر طبع ہو جانے کے کچھ عرصے کے بعد شہباز نے خود کشی نہ کر لی ہوتی۔

اس کی موت نے شرمین کو اس سے رشتہ ختم ہو جانے کے باوجود بری طرح توڑ دیا تھا..... وہ پہلا موقع تھا جب اس نے اپنے فیصلے کے نتائج کے بارے میں دوبارہ سوچنے کی کوشش کی تھی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ شہباز حسین کے ساتھ گزار دی ہوئی زندگی اس کی زندگی کا بہترین حصہ تھا جب تک اسے چڑیا کے بارے میں پتا نہیں چلا تھا اور زندگی کے بہترین حصے کو اپنی یادوں سے محل طور پر کاٹ دینا آسان نہیں تھا..... فاروق کی زندگی

میں اس سے کہا تھا کہ یہ اس کا اور شہربانو کا مسئلہ ہے وہ اسی کے ساتھ حل کرے وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نے شہربانو سے بات کرانے کے سلسلے میں کبھی صاف انکار کر دیا تھا۔

شیردل نے شدید خشکی اور ڈپریشن میں دوبارہ منزہ کو فون کیا تھا۔ ”آپ اب خود دوبارہ شہربانو سے بات کریں..... یہ مصیبت میرے لیے آپ نے پیدا کی ہے آپ کی فتنہ داری بنتی ہے کہ آپ اب اسے ختم بھی کریں۔“ شیردل کو ماں سے شدید شکایت تھی۔ منزہ نے واقعی بیٹھے بٹھائے باہر جانی پریشانی کو اس کے گھر لا بٹھایا تھا اور منزہ کو اب اس کا احساس ہونے لگا تھا۔

”بیٹا میں نے تم کو شیردل کو سمجھانے کے لیے کہا تھا یہ نہیں کہا تھا کہ تم اس سے بات چیت ہی ختم کر دو۔“ منزہ نے شیردل سے بات کرنے کے بعد اس دن شہربانو کو فون کیا تھا۔ شیردل کے فون کے برعکس شہربانو نے منزہ کی کال ریسیو کر لی تھی۔

”ممی میں ایک ایسے شخص کے ساتھ نہیں رہوں گی جو مجھ سے sincere نہیں ہے۔ اگر اس کے لیے کوئی دوسری عورت اہم ہے تو اسے اس دوسری عورت کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔“ شہربانو نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”تم کیا حماقت کرنا چاہ رہی ہو؟“ منزہ نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”تم یہ چاہتی ہو کہ وہ اس عورت کے ساتھ مل کر شہباز کی عزت اور نام خراب کرے؟ اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے پاپا کا ہی خیال کرو تم۔“ منزہ نے اسے سمجھانے کی کوششوں کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”اور میں نے تم سے کہا تھا اپنی ممی سے ذکر مت کرنا تم نے ان سے بات کیوں کی اس معاملے پر..... تم ہماری فیملی کا حصہ ہو شرمین کی فیملی کا نہیں..... شرمین نہ اس مسئلے کو سمجھ سکتی ہے نہ ہی وہ اس کا حل نکال سکتی ہے۔ وہ صرف تمہیں غلط مشورے دے سکتی ہے۔“ منزہ نے بے حد نفرت سے کہا تھا۔

”ممی انہوں نے مجھے کوئی مشورہ نہیں دیا اور میں نے ان سے پوری بات ڈسکس نہیں کی صرف شیردل اور عکس کے افیئر کے حوالے سے بتایا ہے۔“

”بس تو پھر کافی ہے اتنا ہی..... تمہیں اس سے زیادہ شرمین کو بتانا بھی نہیں چاہیے۔ تم پاکستان آ جاؤ اور یہاں آ کر شیردل سے بات کرو۔“ منزہ نے جیسے سکون کی سانس لی تھی کہ شہربانو نے شرمین سے بہت کچھ چھپا لیا تھا۔ شہربانو انکار کرنا چاہتی تھی لیکن وہ منزہ کو انکار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ شیردل کا فون نہیں لے رہی تھی اور وہ اسے اور شرمین کو کالز پر کالز کر رہا تھا لیکن اب اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بات نہ کرنے سے اور امریکا میں بیٹھے رہنے سے بھی کیا ہوگا۔ اس مسئلے کا حل بات چیت سے ہی نکلتا تھا آخر میں..... اسے شیردل کی بات سنی ہی تھی..... لیکن وہ شیردل کے منہ سے اب عکس کا نام نہیں سننا چاہتی تھی۔ وہ اتنے سالوں بعد بڑی خوشی سے امریکا چھٹیاں گزارنے آئی تھی لیکن اب اس کی واپسی عجیب احساسات کے ساتھ ہونے والی تھی۔

”ممی آپ نے پاپا سے divorce کیوں لی تھی؟“ شہربانو نے شرمین کو اپنے اور منزہ کے درمیان ہونے والی بات چیت کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن اس نے شرمین کو یہ ضرور بتا دیا تھا کہ وہ واپس جانے کا سوچ رہی تھی کیونکہ وہ شیردل سے اس سلسلے میں آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرنا چاہتی تھی۔ شرمین نے اسے روکنے یا منع کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن وہ خود اندر سے بہت سے خدشات کا شکار تھی، اس نے شہربانو کو اس رات شیردل کا فون ملانے پر عکس کے فون اٹھانے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ وہ شہربانو کو یہ بات بتا سکتی۔ شہربانو نے اس سے کہا تھا کہ عکس کی کچھ عرصے تک شادی ہونے والی تھی اور لا شعوری طور پر شرمین کو یہ آس بندھ گئی تھی کہ اس کی شادی کے ساتھ ہی یہ مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ یہ کراسس اس کی بیٹی کی زندگی سے ختم ہو جائے گا۔ شیردل اس کی نظروں سے پری طرح گر گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ جیسے اپنی بیٹی کی خوشیاں اور گھر بچانے کے لیے اسے ایک آخری موقع دے رہی تھی۔ اس ساری گفتگو کے دوران شہربانو نے وہ سوال کیا تھا۔ شرمین کچھ دیر کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ اس نے کئی سالوں بعد اس سے دوبارہ یہ سوال پوچھا تھا اس کے باوجود کہ وہ اس کو جواب دے چکی تھی۔

”مصرفیت کسی کو ایک کال کرنے سے تو منع نہیں کرتی۔“

”گلے شکوے تو ہوتے رہتے ہیں بیٹا..... سسرال والے بھی سب کرتے ہیں..... اتنا بڑا اور اونچا خاندان ہے ان کا..... ہم تو ان سے شکایت بھی نہیں کر سکتے۔“ حلیمہ نے بالآخر اپنے احساس کمتری کا اظہار کیا تھا۔ عکس کو ماں کی اس بات پر شدید تشویش ہوئی تھی۔ اس کے لیے جواد ”خاندان“ نہیں تھا اس کے لیے جواد ”جواد“ تھا۔ زندگی میں اگر ایک چیز اس کے اندر خیر دین نے بھی نہیں آنے دی تھی تو وہ احساس کمتری تھا۔ اس نے زندگی میں بھی اپنے ”سہاقتوں“ اور ”لاحقوں“ کو نہیں چھپایا تھا۔ اپنے ”حوالوں“ پر شرم محسوس نہیں کی تھی۔ وہ ”اچھے“ خاندان کو پہچان سکتی تھی۔ ”اونچے“ خاندان کی تعریف اور شناخت سے لاعلم تھی۔ اور اب حلیمہ اس کے سامنے ایک عجیب سوال لے آئی تھی۔ اس نے حلیمہ سے بحث نہیں کی تھی اس کے اصرار پر اس بار اپنے بجائے اپنے اسٹاف سے فون لے کر جواد کو کال ملائی تھی۔ کال unknown نمبر کی وجہ سے ریسیو کر لی گئی تھی۔ وہ بے عزتی محسوس کرنا چاہتی تو یہ بھی کافی تھی۔ غیر متوقع طور پر اس کی آواز سننے پر جواد کچھ دیر کے لیے گڑبڑا گیا تھا۔ پھر اس نے نارمل ہوتے ہوئے اس سے حال چال پوچھا، مانا کے بارے میں دریافت کیا۔

”امی تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔“ عکس نے اس سے کہا اور اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس سے کہا۔ ”میری امی بھی تمہاری امی سے بات کرنا چاہتی ہیں۔“ اس کا لہجہ اتنا عجیب تھا کہ عکس پوچھے بغیر نہیں رہ سکیں۔ ”کس لیے؟“

”میرے پیرئٹس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ فوری طور پر کچھ بول نہیں سکی۔ چند ہفتوں پہلے تک وہ خود اس رشتے کو ختم کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی لیکن اس کے باوجود چند لمحوں کے لیے اسے عجیب ٹھیس سی لگی تھی جواد کے جواب سے یہ بات سن کر۔

”میں وجہ جان سکتی ہوں؟“ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی جواد سے پوچھا۔

”وجہ تم اچھی طرح جانتی ہو عکس۔“

”اگر میں جانتی ہوں تو تم سے بھی نہ پوچھتی۔“

”جہیں شیردل اور اپنے بارے میں مجھے بتانا چاہیے تھا..... لیکن تم.....“ وہ رشتہ ختم کرنے کے بارے میں سن کر اتنا شاکہ نہیں ہوئی تھی جتنا جواد کے منہ سے شیردل کا نام سن کر۔

”تم اگر شیردل کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھیں تو.....“ جواد کے لہجے میں عجیب سی خفگی تھی۔ عکس نے بے حد الجھ کر اس کی بات کاٹی۔

”تم سے کس نے کہا کہ میں شیردل سے شادی کرنا چاہتی تھی؟“

”اس کی امی نے میری امی کو فون کیا تھا۔“ عکس کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔ آخری چیز جس کی توقع وہ منہ پر جھٹکا شیردل سے کر سکتی تھی وہ یہ بھی جو وہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

”آپ اسے suspend کروائیں..... اس کے خلاف کوئی انکوائری کروائیں لیکن اس کو سبق سکھادیں، اسے جہاں چائے کہ اس طرح کی حرکت کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔ آپ ذرا سوچیں ہماری فیملی کی عزت خراب کرنے پر تلی ہوئی ہے..... پتا نہیں کہاں سے یہ کی مینوں کے بچے آرہے ہیں سول سروس میں اور پھر آکر خاندانی لوگوں کو خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں.....“ منہ پچھلے پندرہ منٹ سے بختیار شیردل کے سامنے عکس کے خلاف ذہرا گفٹے میں مصروف تھی۔

بختیار کو اس کورٹ نوٹس کا علم ہو گیا تھا کیونکہ کورٹ کی طرف سے ویسا ایک نوٹس ایس اینڈ جی اے کو بھی موصول ہو گیا تھا اور اس کے بعد یہ خبر بختیار تک پہنچی مشکل نہیں تھی۔ وہ جیسے کیس کی نوعیت سے زیادہ کیس کرنے والے کے بارے میں سن کر ہکا بکا ہوئے تھے۔ عکس کی شیردل کے ساتھ دوستی سے وہ واقف تھے اور کسی کو بھی شاک

میں آجانے کے بعد بھی..... وہ شہباز کے لیے کبھی کسی کے سامنے نہیں رو سکی تھی..... یہ کام اس نے ہمیشہ اکیلے میں کیا تھا۔ کسی چیز پر جج بن کر فیصلہ کروینا ایک بات ہوتی ہے لیکن اس فیصلے کے ہاتھوں ساری زندگی suffer کرنا ایک دوسری بات..... ضمیر کی آواز پر اس نے فیصلے تو کیے تھے لیکن زندگی ان فیصلوں کے بعد بھی کبھی آسان نہیں لگی تھی شرمین کو۔

”تم نے کیا فیصلہ کیا ہے پھر؟“ شرمین نے بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔

”پاکستان جاری ہوں میں..... شیردل سے بات کروں گی اور اگر کوئی حل نہ نکلا تو.....“ شہربانو بات مکمل نہیں کر سکی تھی۔ شرمین نے اس تو کے بعد اگلے جملے کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔

”جو بھی تم بہتر سمجھتی ہو کرو لیکن بس ہمیشہ یہ یقین رکھنا کہ تم اپنے ہر فیصلے میں مجھے ساتھ پاؤ گی۔“ شرمین نے اسے تسلی دی تھی۔ شہربانو نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا کہ کہنے کے لیے اب اس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ غرور اور فخر جو وہ شیردل کی ذات کی وجہ سے لیے پھرتی تھی وہ ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

خیر دین کی حالت آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی تھی اور اس کی حالت کے سنبھلنے کے ساتھ ساتھ جیسے عکس کی جان میں جان آنا شروع ہو گئی تھی۔ حلیمہ بھی پاکستان واپس آ چکی تھی اور ہاسپٹل میں ہی اس نے جواد یا اس کی فیملی کی طرف سے کسی قسم کا رابطہ نہ ہونے پر عکس سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔

”میں نے جواد کو سٹنگ پور سے ہی مانا کے بارے میں انکار کیا تھا اور اس نے مانا کے پاس آنے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن پتا نہیں اس کے بعد کیا ہوا..... میرے اسٹاف نے کہا کہ وہ ایک بار آیا تھا میرے پاکستان پہنچنے سے پہلے کی بات ہے..... لیکن بس اس کے بعد اس کے ساتھ میرا کوئی رابطہ نہیں۔ میں نے چند ایک بار فون کیا تھا اسے لیکن اس نے کال ریسیو نہیں کی پھر میں نے بھی دوبارہ کال نہیں کی..... یہاں مانا کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑ رہی ہے۔ اس سے چھٹی پر ہوں لیکن وہاں سے بھی کالز پر کالز اینڈ کرنی رہی ہوں سارا دن۔“ وہ حلیمہ کو تفصیل سے جواد سے رابطے کے حوالے سے بتا رہی تھی جو بات وہ ماں کو نہیں کہہ پارہی تھی وہ یہ بھی کہ وہ جواد کے اس رویے اور بے اعتنائی سے بری طرح ہرٹ ہوئی تھی۔ وہ مستقبل میں اس کا لائف پارٹنر بننے والا تھا اور اس کی زندگی کے اس مشکل وقت میں اس نے اس سے مکمل طور پر رابطہ ختم کر دیا تھا۔ وہ سپورٹ جو وہ اس سے چاہتی تھی وہ اسے شیردل سے مل رہی تھی۔ وہ پاکستان میں نہ ہوتے ہوئے بھی اس سے رابطے میں تھا۔ ہاسپٹل انتظامیہ سے رابطے میں تھا۔ اس کی رہائش کے انتظامات فوری طور پر اس کی وجہ سے ہوئے تھے۔ اس کا اسٹاف تقریباً ہر روز اس سے رابطہ کر کے کسی بھی کام کے حوالے سے اپنی خدمات پیش کر رہے تھے۔ شیردل کا اثر و رسوخ اس کے اثر و رسوخ سے کہیں زیادہ تھا اور اس کی وجہ سے خیر دین کو ہاسپٹل میں وی آئی بی ٹریٹمنٹ دیا جا رہا تھا..... اور وہ اگر نہ ہوتا تو عکس کو بہت سارے کاموں کے لیے بہت سارے لوگوں کو کہنا پڑتا..... اثر و رسوخ جواد اور اس کی فیملی کا بھی کم نہیں تھا لیکن ان کی طرف سے اس کے لیے کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ باقی سب کچھ وہ اگر نظر انداز کر بھی دیتی تو اس کے لیے یہ نظر انداز کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے کسی نے عیادت کے لیے بھی اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

”میں سوچ رہی ہوں میں فون کرتی ہوں جواد کو۔“ حلیمہ نے اس سے کہا تھا۔

”امی آپ کو نہیں لگتا کہ یہ اس کی ذمہ داری ہے۔“ عکس نے..... بے حد سنجیدگی سے ذکر نہ کرتے ہوئے بھی جواد کی بے اعتنائی جتائی تھی۔

”ہاں فرض تو بنتا تھا ان کا..... اور یہ اچھا نہیں کیا اس نے لیکن پھر بھی وہ..... چلو ایک بار ابابا کو دیکھنے تو آیا تھا..... میں سوچ رہی تھی ہو سکتا ہے کوئی مصروفیت ہو۔“ عکس نے ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

لگتا اگر انہیں ان دونوں کے تعلقات کی نوعیت کا اندازہ نہ ہوتا۔ کیس کی details شک کی شدت بڑھانے کے لیے کافی تھیں۔

انہوں نے گھر آ کر منظرہ سے اس بارے میں بات کی تھی اور منظرہ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ عکس کے خلاف جتنا زہرا گل سکتی تھی اگلی۔

”شہباز کی reputation ایک ایماندار اور قابل آفیسر کے طور پر تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ملازم کے ساتھ بغیر کسی وجہ کے اتنی بڑی زیادتی کرے اور وہ ملازم اتنے سال چپ رہنے کے بعد اب اس کے لیے کیس کر رہا ہے۔“ بختیار کے لیے بھی کیس کی مندرجات سے متفق ہونا مشکل تھا۔

”یہ آدمی چور تھا..... چوریاں کرتا رہا شہباز کے گھر میں..... اور وہ اس پر اتنا ٹرسٹ کرتا تھا۔ جب پکڑا گیا تو شہباز نے اسے نکال دیا اور اس پر ترس کھاتے ہوئے اس کے خلاف کیس نہیں کیا لیکن اس نے شرمین سے مل کر اسے شہباز کے خلاف بھڑکایا۔ شہباز پر بہت گناہ و نا اہرام لگایا..... شرمین نے اسی آدمی کی باتوں میں آ کر شہباز کو چھوڑا تھا..... میرے تو یہ سامنے آ جائے تو میں اسے شوٹ کروں.....“ منظرہ بالکل آگ بگولا تھی۔ معاملے کو وہ جتنا لپیٹنے اور hushed up رکھنے کی کوشش کر رہی تھی وہ اتنا ہی پھیلتا جا رہا تھا۔

”کیا اہرام لگایا تھا اس نے شہباز پر؟“ بختیار نے یک دم اس سے پوچھا۔ منظرہ چند لمحوں کے لیے کچھ بھی بول نہیں سکی تھیں۔ انہیں اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا انہیں بختیار کے سامنے الزامات کی بات شاید کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ یہ نہیں تھا کہ انہیں یہ خدشہ تھا کہ خیر دین کے لگائے ہوئے الزام کی نوعیت جان کر بختیار کو شہباز پر کوئی شبہ ہونے لگتا لیکن اس کے باوجود وہ بختیار کے سامنے وہ الزام دہرانا نہیں چاہتی تھیں۔ شرمین اور شہباز کے درمیان طلاق والے معاملے کو بھی انہوں نے جس حد تک ممکن تھا بختیار سے چھپائے رکھنے کی کوشش کی تھی۔ بختیار نے معاملہ بہت بار بڑھنے پر چند ایک بار اس معاملے کو حل کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن منظرہ نے انہیں اس معاملے کے درمیان آنے نہیں دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں شرمین کے الزامات کی بازگشت بختیار تک پہنچے۔ اپنے اکلوتے بھائی کے نام اور عزت کو ہر طرح سے محفوظ رکھنے کے لیے منظرہ کسی بھی حد تک جانے پر تیار نہیں۔

”تم نے بتایا نہیں کہ شہباز پر کیا الزام لگایا تھا اس نے؟“ بختیار نے انہیں یوں گم صم دیکھ کر جیسے ایک بار پھر اپنے سوال کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ منظرہ بے حد کنفیوزڈ تھیں۔

☆☆☆

عکس مراد علی کے suspend (معطل) ہونے کی خبر شیردل کو لاہور انٹرپورٹ پر پہنچتے ہی مل گئی تھی۔ اس کا اسٹاف وہاں اسے ریسیو کرنے کے لیے موجود تھا اور گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کے پی اے نے اسے مختلف معاملات پر update کرتے ہوئے عکس کی معطلی کی بھی اطلاع دی تھی شیردل کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

”suspend ہو گئیں؟ کس لیے.....؟ کب؟“ شیردل نے بے حد اضطراب کے عالم میں پی اے سے پوچھا۔ ابھی پچھلی رات اس کی عکس سے بات ہوئی تھی اور اس سے بات چیت کے دوران اسے اس کے لہجے تک سے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی کراسس میں تھی۔

”کل آرڈرز نکلے ہیں اور وجہ کا نہیں پتا۔“ اس کے پی اے نے اسے جواب دیا تھا۔ شیردل بہت اپ سیٹ ہو گیا تھا اس کی چھٹی جس نے اسے جیسے خبردار کیا تھا اور اگر یہ اس کی فیملی کی وجہ سے ہوئی تھی تو اس کا مطلب تھا یہ سارا معاملہ اس کے باپ تک پہنچ چکا تھا جس بورڈ پر تمام چھوٹے پیادے پٹ چکے تھے۔ اب صرف بڑے مہرے رہ گئے تھے اور بڑے مہرے صرف سیدھی نہیں ٹیڑھی چالیں بھی چل سکتے تھے۔

(باقی آئندہ)

چند لمحے پہلے آئینے میں نظر آنے والے اپنے عکس کو اس بار اس نے خیر دین کی آنکھوں میں منعکس ہوتے دیکھا تھا۔

ایک سرخ اور سنہرے کا مدار دوپٹے کے ہالے میں دلہن کا روپ لیے چمکتا ہوا اس کا چہرہ..... ماتھے کے بیچ تاج کی طرح نکا اس کے لباس کے ہم رنگ سرخ پتھروں سے مرصع بیضوی شکل کا ایک ٹیکا..... اس کے کانوں میں ہلکورے لیتے لمبے لمبے جھمکے جن کے نچلے حصے پر لٹکتے سرخ باریک موتی اس کی قمیص کے گہرے گول گلے سے ہمیشہ کی طرح نمایاں کالر بون کو گردن کے ذرا سے خم پر چومنے لگتے تھے اور اس کی باریک صراحی وار گردن کے گرد موجود سرخ پتھروں کا وہ نیگلکس جس کا نیچے کو نکلا ہوا سنہری بیضوی حصہ اس کی سرخ قمیص کے سرے کو چھو رہا تھا۔ وہ آئینے میں اپنے شفاف اور واضح اس عکس کو دیکھ کر مبہوت نہیں ہوئی تھی۔ خیر دین کی آنکھوں میں اپنے دھندلائے ہوئے عکس کو دیکھ کر ہو گئی تھی۔ وہ اپنے نانا کی آنکھوں کی کمی میں ہلکورے لے رہی تھی یا شاید وہ اس کی اپنی آنکھوں کی کمی تھی جس نے خیر دین کی آنکھوں کی کمی میں..... دھندلائے اس کے عکس کو کچھ اور دھندلا کر دیا تھا۔

لیکن خیر دین اور وہ پھر بھی ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ آنکھوں میں کمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کے ساتھ..... بے یقینی کے ایک عجیب سے جہاں میں پہنچے ہوئے۔

اس کے چہرے سے بالآخر نظریں پہلے خیر دین نے ہی ہٹائی تھیں۔ وہ اپنی چڑیا کو اپنی نظر لگنے سے بھی بچانا چاہتا تھا۔ یہ اس کا وہ روپ تھا جس کو دیکھنے کے لیے وہ کئی سالوں سے متنی تھا اور آج اس روپ میں چڑیا کو دیکھتے ہوئے اس کا دل عجیب سی خوشی اور طمانیت کے ساتھ ساتھ بڑی عجیب سی کسک محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی چڑیا کو اپنا جیون سا بھی مل گیا تھا وہ اس کے ساتھ اب ایک نئے سفر پر اڑ جانے والی تھی۔

عکس نے خیر دین کو خود سے نظریں چراتے ہوئے آگے بڑھتے اور اسے اپنے ساتھ لپٹاتے دیکھا۔ وہ جذباتی نہیں تھی لیکن وہ اس لمحے رو دی تھی۔

وہ چند منٹ پہلے بیوٹی پارلر سے نکاح کی اس سادہ تقریب میں شرکت کے لیے پہنچی تھی جو اسی گھر کے لان میں منعقد کی گئی تھی اور دروازے پر اس کا استقبال خیر دین نے ہی کیا تھا۔ وہ چڑیا کے چند گھنٹے پہلے پارلر جانے کے بعد سے وہاں مہمانوں کا استقبال کرتا وہاں سے ہلا نہیں تھا۔ اسے اپنی چڑیا کی واپسی کا انتظار تھا۔ دلہن کے روپ میں اس پر پہلی نظر ڈالنے کی بے قراری..... خیر دین کی نظریں مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اور انہیں پائیں باغ کی طرف بھیجتے ہوئے بھی گیٹ پر جمی رہی تھیں۔

اور اب جب وہ گھر کے اندرونی دروازے کے سامنے گھر کے اندر جانے کے لیے اپنی چند دوستوں کے ساتھ کھڑی تھی تو خیر دین کا دل عجیب طرح سے بوجھل تھا۔ وہ عام لڑکی نہیں تھی نہ خیر دین نے اسے عام طرح سے پالا تھا پھر بھی وہ ایک لڑکی تھی اور خیر دین کا دل ویسے ہی اندیشوں اور خدشات سے دوچار تھا جیسے اندیشے کوئی بھی باپ اپنی بیٹی کو ایک انجان آدمی کے ساتھ ایک انجان سفر پر رخصت کرتے ہوئے رکھتا..... چاہے وہ انجان آدمی جیون سا بھی ہی کیوں نہ ہوتا۔ چاہے وہ انجان سفر زندگی کا سفر ہی کیوں نہ ہوتا۔

خیر دین نے اسے کندھوں سے تھامے ہوئے اس کے جھکے ہوئے سر کو پھر ماتھے کو چوما، عکس نے ایک بار پھر سر اٹھا کر اپنے نانا کو دیکھا وہ کتنی خوب صورت لگ رہی تھی اس نے خیر دین کی آنکھوں میں دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کے لیے کیا دعا مانگ رہی تھی کہ اس کے ساکت ہونٹ سے بھی سن سکتی تھی۔ عکس مراد علی نے اپنی ساری زندگی میں ایسا مرد بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ شفیق تھا، رہبر تھا، دوست تھا، عم خوار تھا، اس پر جان چھڑکنے والا تھا



طرح ناکام رہا تھا۔ وہاں ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے علاوہ اسے کچھ نہیں ملا تھا۔ ایک انتہائی اطمینان بھری مسکراہٹ جس میں کسی قسم کا کوئی اضطراب نہیں تھا۔  
”کیا ضرورت تھی اتنی جلدی یہاں آنے کی؟ ریٹ کرتے..... کل پرسوں آجاتے یا فون پر حال پوچھ لیتے۔“ عکس نے اسے کہا۔

”انکل کیسے ہیں؟“ شیردل نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا۔  
”اللہ کا شکر ہے پہلے سے بہتر ہیں۔“ عکس نے جواباً کہا۔ ”تمہاری فلائٹ کیسی رہی؟“  
”ٹھیک تھی، تم نے مجھے اپنی suspension کے بارے میں نہیں بتایا۔“ شیردل نے چھوٹے ہی وہ سوال کیا جو ہسپتال تک آنے کے پورے راستے میں اسے پریشان کرتا رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھکی پھر اس نے اسی اطمینان سے کہا۔

”کیا بتائی؟“ ایک لمحے کے لیے اس کے سوال نے شیردل کو لا جواب کیا۔  
”انفارم کرتیں مجھے، کل میری اور تمہاری بات ہوئی ہے تم نے ذکر تک نہیں کیا۔“ وہ بات کرتے کرتے شکایت کر گیا۔

”فائدہ کیا ہوتا؟“ اس کا اطمینان برقرار تھا۔  
”نقصان بھی کوئی نہیں تھا۔“ شیردل نے جتایا۔  
”میں نے نہیں بتایا تو بھی پتا تو چل ہی گیا نا تمہیں..... ایسا کوئی راز تو نہیں تھا کہ پتا نہ چلتا۔ نانا سے ملو گے؟“ اس نے اس کی شکایت کو بے پروائی سے نظر انداز کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔  
”ہاں۔“ شیردل نے مختصراً کہا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ عکس بھی اس کے ساتھ واپس پلٹ گئی تھی۔  
”suspension کیوں ہوئی؟“ شیردل نے ساتھ چلتے ہوئے اس سے پوچھا، وہ گردن موڑ کر اس کو دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

”پوری چارج شیٹ سناؤں یا صرف بنیادی وجہ بتاؤں؟“ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا جس سے شیردل پر گھڑوں پانی پڑا تھا۔  
”میں نے تمہیں منع کیا تھا۔“ شیردل نے اس سے نظریں چراتے ہوئے خفگی سے کہا۔ ”اسی سب سے بچانا چاہتا تھا تمہیں، اسی سب سے بچانے کے لیے وارن کر رہا تھا تمہیں۔“  
”میں نے تم سے کوئی شکایت کی ہے؟“ اس نے شیردل کی بات بڑے تحمل سے کاٹ دی تھی۔ ”اب تمہیں پتا چلا میں نے تمہیں کیوں نہیں بتایا تھا اپنی سسپینشن کے بارے میں۔“  
”تم اپنا سروس ریکارڈ خراب کر رہی ہو عکس۔“ شیردل چلتے چلتے رک گیا۔

”شیردل وہ میرا مسئلہ ہے تم اس کے بارے میں پریشان نہ ہو۔ مجھے چارج کیا گیا ہے میں انہیں explanation دے لوں گی۔ اور میرے لیے یہ سب غیر متوقع نہیں ہے۔ جس دن میں نے کیس فائل کیا تھا مجھے اندازہ تھا کہ میں کون سا پینڈورہ باکس کھولنے جا رہی ہوں۔ اس لیے تم پریشان مت ہو۔ تم اپنی فیملی اور اپنے انکل کو defend کرو..... مجھے کیس لڑنے کے لیے جو کرنا پڑا میں وہ کروں گی لیکن ہم پھر بھی دوست رہیں گے۔“ وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ زندگی میں پہلی بار اسے عکس مراد علی بے وقوف لگی تھی۔

”تم عقل سے بیدل ہو۔“ وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔  
”اچھا؟“ وہ بے اختیار ہنس دی تھی۔

اور وہ اس کے لیے اپنی انا اور عزت کو ہر بار کی طرح اس بار بھی کہیں بہت پیچھے رکھ آیا تھا۔ ایسا کون ملے گا اسے جو اسے خیر دین کی طرح چاہے گا..... کبھی کوئی نہیں مل سکتا، کوئی اس جیسا ہو ہی نہیں سکتا، کوئی اس کے لیے اپنے دل میں ویسی غیر مشروط محبت رکھ ہی نہیں سکتا۔ چڑیا نے اپنے نانا کی آنکھوں میں یہ سب پڑھا تھا۔ کھلی کتاب کی طرح جس کا ایک ایک لفظ خود بول رہا تھا۔

بنا کچھ کہے اس نے خیر دین کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس ہاتھ کے لمس میں وہ تشکر جھلک رہا تھا جو عکس کے دل میں تھا اور جو اس کے نرم ہاتھ کی سخت گرفت میں تھا۔  
”میں تمہارے بغیر بہت اداں ہو جاؤں گا چڑیا۔“ خیر دین نے اپنی نم آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس سے کہا۔

”نانا میں آپ کی زندگی سے کہیں جاؤں گی تو اداں ہوں گے نا آپ۔ میں کہیں نہیں جا رہی، میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی رہوں گی۔“ خیر دین رنجیدگی سے اس کی تسلی سنتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔ وہ اسے بچوں کی طرح بہلا رہی تھی۔

”رک کیوں گئیں؟“ خیر دین نے اسے گھر کے اندرونی دروازے میں رکتے دیکھ کر کہا۔  
”نہیں..... ایسے ہی۔“ وہ چونکی تھی اور اس نے اپنے ان سات ساتھیوں سے نظریں ہٹالی تھیں جو ایک بار پھر اس کا استقبال کرنے کے لیے وہاں موجود تھے اور جنہیں وہ ہمیشہ اس گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہیں نہ کہیں دیکھتی رہی تھی۔ وہ سات اس کی زندگی کے اس نئے سفر پر اسے رخصت کرنے کے لیے ایک بار پھر وہاں موجود تھے۔

ٹوفاس کے روپہلی چوڑی دار پا جامے کی چوڑیوں کے ساتھ لٹکا اپنا توازن برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ کنفا اس کی پینسل ہیل والے جوتے کے اسٹریپ سے چپکا اس کے پیروں پر بنے مہندی کے نقش و نگار پر غور فرمانے میں مصروف تھا۔ منفا ایک باجا پکڑے گھر کی دہلیز پر ادھر سے ادھر جاتے ہوئے اسے بجانے میں لگا تھا۔ ڈیڈ واچھل اچھل کر اس کے ٹخنوں تک پہنچتی سرخ قمیص کے سنہری کامدار دامن کو پکڑنے کی کوشش میں لگا تھا۔ ٹوکو اس کے زمین تک لٹکنے والے دوٹے کے پلو سے لٹکا ہوا تھا اور کٹو اور ٹٹو خوشی سے بے قابو سر پر ساگرہ والی نوکدار لمبی ٹوپیاں پہنے پھر کی طرح گول گول گھومتے چکراتے پھر رہے تھے۔ وہ سب اس کی خوشیوں کو سیلیبریت کر رہے تھے۔ چڑیا نے اس غیر مرمی دنیا کو مسکراتے ہوئے دیکھا جو صرف اسے نظر آتی تھی اور جہاں کی ملکہ وہ تھی۔

ایس آج اپنے اس ونڈر لینڈ کو چھوڑ کر اپنے جیون ساتھی کے ساتھ ایک نئے ونڈر لینڈ کو آباد کرنے جا رہی تھی۔

☆☆☆

ان دونوں نے بہت دور سے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا۔ شیردل چند لمحے پہلے ہی ہسپتال کے اس کوریڈور میں داخل ہوا تھا جہاں خیر دین کا کمرہ تھا اور عکس ابھی ابھی ہسپتال سے کسی کام کے لیے باہر نکل رہی تھی۔ شیردل کو آتے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی تھی۔ بہت دور سے بھی دونوں نے ایک دوسرے کو ایک خیر مقدمی مسکراہٹ دی تھی۔

”کب آئے؟“ عکس نے اس کے قریب آنے پر علیک سلیک کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔  
”ابھی، ابھی۔“ شیردل نے جواب دیتے ہوئے اس کے چہرے کو جیسے کھوجنے کی کوشش کی، وہ ہمیشہ کی

وہ لاہور اور اس کے آس پاس کے شہروں میں بھی گھوم پھر رہا تھا جہاں جہاں اس کے دوستوں کے والدین یا خود اس کے قریبی رشتے دار پوسٹڈ تھے اور اسی سیر و تفریح میں اسے ایک دوست کے ہاں قیام کے دوران خیر دین کی وال جواس شہر کا تعارف بن چکی تھی شیردل نے دریافت کی تھی۔ وہ پاکستانی روایتی کھانوں کا کوئی زیادہ شوقین نہیں تھا مگر چند ایک چیزیں جن کے ذائقے کو وہ پاکستان میں اس قیام کے دوران بھول نہیں سکا تھا ان میں سے ایک وہ دال بھی تھی۔ وہ اس کے بعد کئی بار خاص طور پر اس دکان کی وال کھانے کے لیے لاہور سے سفر کر کے آیا تھا اور ہر بار وہ اس دکان کے مالک اس بوڑھے بے حد سلجھے ہوئے آدمی سے گپ شپ لگا کر بے حد محظوظ ہوتا جو اپنے حلیے یا کسی بھی طرح سے ایک عام دکاندار نہیں لگتا تھا۔ ایک بے حد، شفیق مہربان، نرم خور اور اپنی گفتگو سے بڑا پڑھا لکھا نظر آنے والا وہ بوڑھا جو ہر بار اس کے وہاں جانے پر اپنے ہاں کام کرنے والے ویٹرز کو ذاتی طور پر شیردل کو سرو کرنے کے لیے کہتا تھا۔ شیردل کو اس کا داڑھی والا چہرہ کئی بار بے حد شناسا لگا تھا۔ اس کا چہرہ اس کی آواز..... دونوں چیزیں مگر وہ اسے اپنا وہم سمجھتا تھا۔ آخر لاہور سے سکیڑوں میل دور ایک شہر کی ایک چھوٹی سی ریسٹورنٹ نما دکان کے بوڑھے مالک کو وہ پہلے کیسے جان سکتا تھا جبکہ اس نے زندگی میں پہلی بار اس دکان پر کھانے پینے کے لیے آنا جانا شروع کیا تھا۔ ایک شیردل نے اپنے ہر خیال کو وہم سمجھ کر جھٹک دیا تھا۔

جو بات ایک شیردل کو البتہ سمجھ میں نہیں آتی تھی وہ اسے خاص طور پر وہاں دیا جانے والا پروٹوکول تھا۔ خیر دین اسے اتنی اپیل توجہ کیوں دیتا تھا ایک شیردل نے اس کی وجہ ڈھونڈنے پر بھی بڑا غور کیا تھا لیکن وہ ناکام رہا تھا۔ وہ اگر پہلے ہی اپنے دوستوں سے یہ نہ سن چکا ہوتا کہ اس دکان پر بڑی دور دور سے بہت امیر اور اثر و رسوخ والے لوگ بھی آیا کرتے تھے اور پھر خود وہ اپنی آنکھوں سے وہاں دکان کے باہر کھڑی بہت ساری سبز پلیٹوں والی سرکاری گاڑیاں نہ دیکھتا رہتا تو ایک شیردل اس توجہ کو اس سرکاری گاڑی کی سبز نمبر پلیٹ کی مرہون منت سمجھتا جس میں وہ آیا کرتا تھا۔ وہ اس خوش فہمی یا غلط فہمی کا شکار بھی نہیں ہو سکا تھا کہ اس ڈبل اسٹوری ریسٹورنٹ نما دکان کا مالک بڑی بڑی گاڑیوں میں آنے والے پرانے گاؤں کو چھوڑ کر اس کی طرف کسی خاص لالچ میں متوجہ ہوتا تھا۔ خیر دین اور اپنی ہونے والی گپ شپ میں اس نے بھی اپنے باپ کے عہدے کے بارے میں نہیں بتایا تھا اور نہ ہی خیر دین نے اس سے اس کے باپ کے بارے میں کبھی پوچھا تھا تو پھر وہ کیا وجہ تھی جو ان دونوں کے درمیان اس قسم کی شناسائی اور پسندیدگی کو وجود میں لے آئی تھی۔ شروع میں چند بار اچھے اور سر کھانے کے بعد شیردل نے اس سوال کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا اس کے لیے بس یہ کافی تھا کہ وہ وہاں جاتا تھا تو اسے خاص پروٹوکول دیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ جانے والے اس کے دوست اس چیز کو نوٹس کرتے تھے۔

ان چھٹیوں کے بعد بھی شیردل پاکستان میں اپنے ہر قیام کے دوران وہاں باقاعدگی سے آنے لگا تھا۔ وہ اب یہ بھی جانتا تھا کہ خیر دین کی ایک ہی نوا سی ہے جو ایک میڈیکل کالج میں پڑھتی تھی اور اس دکان میں آنے والے پرانے گاؤں میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جو خیر دین کی اس لائق نوا سی سے واقف نہ ہوتا جو خیر دین کے دل کی دھڑکن تھی اور جس کے ذکر کے بغیر خیر دین کا دن نہیں گزرتا تھا۔

شیردل نے خیر دین کی نوا سی کا پہلی بار خیر دین سے تعارف ستاشی مسکراہٹ کے ساتھ زیادہ دلچسپی کے بغیر سنا تھا۔ خیر دین اپنی نوا سی کو میڈیکل کروا رہا تھا۔ اچھی بات تھی۔ وہ نوا سی لائق تھی یہ اور بھی اچھی بات تھی۔ وہ خیر دین کا جوش اور فخر سمجھ سکتا تھا اس کے بیک گراؤنڈ کے کسی آدمی کا اپنی اگلی نسل کی کسی لڑکی کو اعلیٰ تعلیم دلوانا

”تم اتنا آسان سمجھ رہی ہو یہ سب کچھ..... تمہارا خیال ہے کہ تمہیں اگر suspend کیا گیا ہے تو پھر تمہاری explanation لے کر تم سے معذرت کرتے ہوئے تمہیں بحال کر دیا جائے گا۔“ وہ طنزیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”شیردل میں کیس واپس نہیں لوں گی اور اب تو بالکل بھی نہیں۔ تم نانا کی عیادت کرنا چاہتے ہو یا ویسے ہی واپس جانا چاہتے ہو؟“ اس نے شیردل کی بات کاٹ کر اسے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”جہنم میں جاؤ تم۔“ شیردل اس کے جیلے پر بری طرح جھنجھلایا..... وہ دوبارہ قدم اٹھاتے ہوئے مسکرائی۔

”میں وہاں سے گزر کر آئی ہوں۔ دوبارہ بھی جانا پڑا تو باہر نکلنے کا راستہ جانتی ہوں۔“ اس کا اطمینان... قابلِ داد تھا اور وہ داد دیتا اگر کیس اس کے اپنے خلاف نہ ہوا ہوتا۔

”اور اب نانا سے میری suspension کا قصہ لے کر مت بیٹھ جانا۔“ اس نے ساتھ چلتے ہوئے اسے ہدایت کی۔

”انہیں کچھ بتانا ہوتا تو سب سے پہلے اس کیس کے بارے میں بتاتا۔“ وہ ساتھ چلتے ہوئے خفگی سے بولا۔

”عقل مند ہو گئے ہو۔“ وہ داد نہیں تھی راز کو راز..... رکھنے کی ترغیب تھی اور شیردل یہ بات جانتا تھا۔ خیر دین بستر پہ لیٹے ہوئے دروازے میں داخل ہوتے شیردل کو دیکھ کر مدہم انداز میں ہلکا سا مسکرایا تھا۔ شیردل بھی جواباً مسکرایا۔ وہ عکس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا تھا اور اس سے کچھ بات کرتے کرتے وہ خیر دین کے بستر کے قریب آ گیا۔ خیر دین پر ذرا سا جھکتے ہوئے اس نے خیر دین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑی نرم آواز میں اس سے پوچھا۔

”آپ کی طبیعت اب کیسی ہے انکل؟“ خیر دین مسکرایا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے۔“ شیردل مسکراتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔ عکس اسے خیر دین کے بارے میں ڈاکٹر کی رائے بتا رہی تھی۔ خیر دین ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے بات کر رہے تھے۔ دراز قد..... اسماٹ..... خیر دین نے عجیب حسرت سے ان دونوں کو اکٹھے کھڑے دیکھا تھا۔ شیردل وہ پہلا مرد تھا جس کو دیکھ کر خیر دین کو اسے چڑا کا نصیب دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ وہ اسے کچھ ایسا ہی اچھا لگا تھا۔ وہ پہلی نظر کی پسندیدگی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ شیردل کے شادی شدہ ہو جانے کے باوجود خیر دین کے دل سے وہ پسندیدگی ختم نہیں ہوئی تھی اور عکس خیر دین کی اس پسندیدگی اور خواہش دونوں سے واقف تھی تب سے جب وہ شیردل سے ملی بھی نہیں تھی جب شیردل اس کے لیے صرف ایک غائبانہ وجود تھا جس کا ذکر وہ خیر دین سے سنا کرتی تھی اور اسے حیرت ہوتی تھی اس کا نانا کسی سے بھی اس طرح اتنی جلدی متاثر نہیں ہوتا تھا جس طرح وہ شیردل سے ہو گیا تھا۔

خیر دین نے شیردل کو پہلی بار اپنی دکان پر اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ شکل صورت میں تو اچھا تھا ہی لیکن خیر دین کو وہ خوش شکل اور خوش لباس لڑکا اپنی تہذیب اور شائستگی کی وجہ سے اچھا لگا تھا۔ خیر دین نے پہلی بار اسے اپنی دکان پر آتے ہوئے صرف کھانا کھا کر جاتے دیکھا تھا وہ اس سے ذاتی طور پر نہیں ملا تھا یہ چند دنوں کے بعد خیر دین کی دکان پر شیردل کا دوسرا چکر تھا جس میں خیر دین اس سے متعارف ہوا تھا۔ وہ ان دنوں امریکا میں پڑھ رہا تھا اور چھٹیوں میں پاکستان آیا تھا۔ اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ میل ملاقاتوں میں



”سارے ایگزامز میں۔“ عکس نے بہت مدھم آواز میں تصحیح کی تھی، شیردل نے روانی میں غور نہیں کیا۔  
 ”لاہور کے کسی میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے۔“

”پڑھ لیا۔“ تصحیح ایک بار پھر ہوئی۔

”شاید علامہ اقبال میڈیکل کالج میں۔“

”سنگ ایڈورڈ میں۔“ وہ تیسری تصحیح تھی جس پر بالآخر شیردل نے گلاس کے کناروں پر انگلیاں پھیرتی

عکس سے پوچھا۔

”اوہ تم بھی تو KE سے ہی پڑھی ہو۔“ تم یقیناً جانتی ہوگی اسے۔“ شیردل نے ہمیشہ کی طرح سوال کا

جواب آنے سے پہلے ہی اپنا اندازہ لگایا تھا۔

”بہت اچھی طرح۔“ عکس مسکراتی تھی۔ شیردل نے اس کی مسکراہٹ پر غور نہیں کیا۔ اس نے ان تین

ویٹرز پر بھی غور نہیں کیا جن میں سے دو عکس کے بالکل قریب ٹیبل کے دائیں جانب تھے اور تیسرا عکس کے بائیں

جانب..... شیردل خود عکس کی دائیں جانب تیسری کرسی پر تھا اور وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ ویٹرز شیردل کے ان

لوگوں کے ساتھ ہونے کی وجہ سے شیردل کے قریب تھے۔ وہ انگلش میں بات کر رہا تھا۔ اردو میں کرتا تو اس کی

گفتگو کا موضوع ان ویٹرز کو بھی بھونچکا کر دیتا۔ ”عکس باجی“ کے ساتھ آئے ہوئے مہمان عکس باجی کو نہیں

جانتے تھے یہ بات وہاں کام کرنے والے کسی بھی شخص کو ایسے ہی حیران کر دیتی۔

”Now this is amazing“ شیردل کہہ رہا تھا۔ ”کوئی ملک ترقی کر سکتا ہے تو اس اسپرٹ

کے ساتھ کر سکتا ہے اور مجھے حیرانی ہوئی ہے کہ ہمارے ملک میں بھی ایسی success stories ممکن ہیں۔

ہمارے معاشرے میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں۔“ شیردل اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے پیپی پیتا

ہوا بڑے اطمینان سے کہتا جا رہا تھا۔ کھانا سرو ہونے لگا تھا۔ وہ لوگ کھانا کھانے لگے، گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

خیر دین بالکل اس لمحے بیٹھیاں چڑھ کر اس چھوٹے سے ہال نما کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جھجک گیا۔

اسے نیچے پتا چل گیا تھا کہ عکس کچھ لوگوں کے ساتھ وہاں آئی تھی لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا وہ سارے اس کے بیچ

میٹس تھے۔ وہ افسروں کے ساتھ بھی اس وقت اور زندگی میں پہلی بار خیر دین اپنی چڑیا سے جھجکا تھا۔ جو بھی تھا

وہ ایک معمولی دکان دار تھا معاشرے کے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک معمولی شخص..... اس نے اپنی چڑیا

کو اپنا خون پسینہ دے کر کامیابی کی سیڑھیوں پر چڑھایا تھا اور اب جب وہ وہاں چڑھ گئی تھی تو زندگی میں پہلی بار

خیر دین کو اس کے سامنے احساس کمتری ہوا تھا۔ وہ اسے ان لوگوں کے درمیان اپنا حوالہ دینے سے جھجکا تھا۔

شاید یہ مناسب نہیں ہو، شاید چڑیا نے ان لوگوں کو اس کے بارے میں نہ بتایا ہو، پتا نہیں وہ چڑیا کے لیے وہاں

ندامت اور خفت کا باعث نہ بن جائے۔ اس نے ہال میں جتنے جوش و خروش میں قدم رکھا تھا اسی تیزی سے وہ

پیچھے ہٹنے لگا تھا۔ عکس تب تک اسے دیکھ چکی تھی۔ سیڑھیوں سے اوپر آنے والا وہ راستہ اس کے سامنے تھا۔ ایک

لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے وہ حیران ہوئی تھی خیر دین پیچھے کیوں ہٹا تھا اور پھر جیسے ایک جھماکے کے ساتھ اسے

وجہ سمجھ آئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا دوسرا لقمہ اپنی پلیٹ میں واپس رکھتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

”نانا۔“ سیڑھی پر واپس بیٹھتے خیر دین کے پیروں میں ایک بیڑی پڑی۔ ٹیبل کے گرد بیٹھے وہ سارے مرد

یک دم چونکے تھے پھر انہوں نے عکس کی نظروں کے تعاقب میں اس بوڑھے بارش آدمی کو دیکھا جواب آگے

بڑھ رہا تھا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب ایک شیردل کو بھی کرنٹ لگا تھا۔

”نانا!“ وہ زپر لب بے یقینی سے بڑبڑایا۔ ایک نظر اس نے عکس کو دیکھا پھر ٹیبل کے پار خیر دین کو۔

کسی معرکے سے کم نہیں تھا اور شیردل کے خاندان میں کسی لڑکی کا کوئی پروفیشنل ڈگری لینا ایک معمول کی بات  
 ..... شیردل کے لیے خیر دین کی نواسی کی قابلیت قابل غور چیز تھی ہی نہیں لیکن وہ اسے خیر دین کی دلچسپی کا  
 موضوع سمجھ کر سنتا رہا تھا۔ خیر دین کی وہ نواسی اس سے عنقریب کہاں ٹکرانے والی تھی شیردل کو اس کا اندازہ نہیں  
 تھا۔

وہ STP کے دوران ایک فیلڈ ٹرپ کرتے ہوئے اپنے پورے گروپ کو وہاں لایا تھا۔ عکس بھی ان 25

لوگوں میں تھی جو اس گروپ میں شامل تھے۔ شیردل کو وہاں ویسا ہی پروٹوکول ملا تھا جو اس کے لیے متوقع تھا۔

اس چھوٹے سے ریسٹورنٹ کی پہلی منزل پر موجود فیمیلی ایریا فوری طور پر ان لوگوں کے لیے خالی کر دیا گیا تھا۔

شیردل کو وہاں داخل ہوتے ہوئے خیر دین نظر نہیں آیا تھا اور وہ پہلا موقع تھا جب اس کی وہاں آمد کے موقع پر

اس کا اور خیر دین کا آنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس نے ایک ویٹر سے خیر دین کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ وہ

نماز پڑھنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ فیمیلی ہال کی چند ٹیبلز کو چھوڑ کر ان لوگوں کے لیے ایک ہی لمبی ٹیبل تیار کر دی گئی

تھی۔ شیردل نے ان ٹیبلز پر ایک دم نئے ٹیبل کور، بہت اچھی کراکری اور شیشے کے چمکتے ہوئے نئے گلاسز اور نئی

کٹلری کو نوٹس کیا تھا۔ اس نے ان تین مستعد اور مودب ویٹرز کو بھی نوٹس کیا تھا جو صرف ان کے احکامات لینے

کے لیے وہاں موجود تھے اور اس نے یہ بھی نوٹس کیا تھا کہ وہاں موجود تقریباً تمام عملے نے داخل ہوتے وقت

شیردل سے تو ہمیشہ کی طرح علیک سلیک کی تھی لیکن عکس سے بھی وہ بہت مودبانہ انداز میں مخاطب ہوتے رہے

تھے۔

”لگتا ہے تمہیں بھی پہچانتے ہیں یہ لوگ۔ تمہارا تو شہر ہے، تم تو بہت بار آچکی ہوگی یہاں۔“ شیردل کو اس

کے علاوہ اس عجیب ”شنا سانی“ کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی جو عکس کے لیے وہاں کے عملے کے رویے میں تھی۔

”بہت بار۔“ عکس نے جواباً ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ شیردل بھی مطمئن انداز میں مسکرا دیا۔

کھانے کی ٹیبل کے گرد کھانے کا انتظار کرتے ہوئے شیردل ان تمام لوگوں کو اس دکان کے مالک

بوڑھے خیر دین کے بارے میں بتاتا رہا جو اس کے نزدیک ایک انتہائی دلچسپ بوڑھا تھا۔ ایک حیران کن قسم کا

دکان دار..... وہ خیر دین کے ساتھ ہونے والی اپنی گپ شپ ان کے سامنے ڈھرتا رہا۔ گروپ کے کچھ اور

لوگ بھی خیر دین کی اس مشہور زمانہ دال اور اس جگہ سے واقف تھے اور وہاں آچکے تھے لیکن باقی لوگوں کے

لیے وہ جگہ نئی تھی لیکن وہ تمام لوگ جو پہلے وہاں آچکے تھے ان میں سے کوئی بھی خیر دین کو ان حوالوں سے نہیں

جانتا تھا جن حوالوں سے ایک شیردل جانتا تھا۔

عکس مراد علی ایک شیردل کی اس ساری ”دلچسپ“ گفتگو کے دوران پانی کا ایک گلاس پکڑے اس لمبی

میز کے ہیڈ پر بیٹھی تھی اور وقفے وقفے سے پانی پیتے ہوئے ایک مدھم مسکراہٹ کے ساتھ شیردل کی خیر دین کے

حوالے سے وہ بے تکلفانہ گفتگو سنتی رہی جو وہ ایک ڈائنٹ پیسی کے کین کو پیتے ہوئے کرتا رہا تھا۔

”اور ہاں خیر دین کی ایک نواسی بھی ہے۔“ گیدڑ کی جیب شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے کے

مصدق ایک شیردل کو بے حد غلط وقت پر وہ ”نواسی“ یاد آتی تھی جو اس وقت اس سے تین کرسیوں کے فاصلے

پر ٹیبل کے ہیڈ پر پڑی کرسی پر بیٹھی گلاس کو اس کی جگہ پر دائرے کی شکل میں ہلکی گردش دیتے ہوئے ایک

شیردل سے ”اپنا تعارف“ سن رہی تھی۔

”بتا رہا تھا مجھے کہ اس کی نواسی گولڈ میڈلسٹ رہی ہے کس میں...“ شیردل نے بات کرتے کرتے ایک

لمحے کے لیے رک کر کچھ یاد کیا۔ ”ہاں بورڈ کے کسی ایگزام میں۔“

”میرے نانا اور دکان کے مالک۔“ عکس مراد علی نے بے حد روانی اور اعتماد کے ساتھ اپنی کرسی چھوڑتے ہوئے خیر دین کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ٹیبل کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو چند لمحوں کے لیے سکتہ ہوا تھا پھر وہ بیک وقت اپنی اپنی کرسیوں سے احتراماً کھڑے ہوئے تھے۔ وہ تب تک خیر دین کے پاس پہنچ چکی تھی اور اس نے جا کر ہمیشہ کی طرح خیر دین کا ہاتھ چوم لیا تھا۔ فخر کے بہت سے لمحے آئے تھے اس شہمی لڑکی کی وجہ سے اس کی زندگی میں..... اور ایسا ہی فخر کا ایک لمحہ وہ بھی تھا خیر دین کے لیے۔ وہ اسے اس جگہ پر own کر رہی تھی جہاں کا رزق اسے کھلا کھلا کر خیر دین نے پالا تھا۔ ان 24 لوگوں کے سامنے جن کے خاندانوں کی سات پشتوں میں کوئی مزدور نہیں رہا تھا اور اگر بھی رہا تھا تو وہ عکس مراد علی جیسا دل گردہ نہیں رکھتے تھے کہ اس کا اعتراف سب کے سامنے کر پاتے۔

شیر دل ایک عجیب سی بے یقینی کی کیفیت میں خیر دین کو اپنے بیچ میٹس کے ساتھ متعارف ہوتے دیکھتا رہا پھر بالآخر عکس اور خیر دین اس کے سامنے آ گئے تھے۔ خیر دین کی آنکھوں میں وہی شناسائی جھلکی تھی۔ ایک عجیب سی ٹیس عکس کے دل میں اٹھی تھی وہ اب جانتی تھی خیر دین اتنے سالوں سے کس نامعلوم لڑکے گن گاتا تھا۔ وہ شیر دل کی زبان سے خیر دین کی طرف سے کیے جانے والے خاص برتاؤ کے ذکر پر ہی چونک گئی تھی۔ اسے ایک عجیب انداز میں یقین ہوا تھا کہ خیر دین جس لڑکے جیسے مرد کو اس کا چہرہ دیکھنے کا خواہش مند تھا وہ ایک شیر دل ہی تھا۔ کیا عجیب دل تھا ان دونوں نانا نواسی کا۔ ایک ہی شخص پر آیا تھا اور وہ بھی اس پر جس کا ساتھ ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ خیر دین نہیں جانتا تھا وہ خوش گمان تھا، اُردو امید تھا۔ عکس جانتی تھی وہ خوش گمانیوں کو فریب سمجھتی تھی۔ امید اس جس چیز کی رکھتی تھی جو مجزے سے نہیں کوشش سے ملتی۔ اور وہی وہ ایک لمحہ تھا جب ایک شیر دل یہ جان گیا تھا کہ عکس مراد علی کو زندگی کا ساتھی بنانے کی خواہش اسے چھوڑنی پڑے گی۔ پہلے یہ کام مشکل تھا اب ناممکن تھا۔ اس کا خاندان جس حسب و نسب کا قائل تھا عکس مراد علی اب اس اسکیل پر چند درجے اور نیچے چلی گئی تھی۔

پنجاب کے ایک نامور جاگیردار خاندان کے سپوت اور انڈین سول سروس کے ممتاز ترین آفیسرز میں سے ایک شیر دل علی قلی کے پوتے کی شادی ایک لوہار خاندان سے تعلق رکھنے والے خیر دین دال والے کی نواسی سے تو نہیں ہو سکتی تھی۔ شیر دل ساری عمر ایچی سن اور پھر ہارورڈ میں پڑھا تھا۔ بنیادی انسانی حقوق میں مساوات کا قائل تھا تب تک جب یہ روشن خیالی اور انسانیت پسندی پاکستان سے باہر دکھانا مقصود ہوتا۔ اپنے ملک اور معاشرے میں آتے ہی وہ تمام خول اور ماسک جڑھانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ جس کے بغیر اس ملک میں تفریق رکھنا اور شناخت کروانا مشکل ہوتا تھا محبت ایک عظیم اور لافانی جذبہ تھا وہ جذبات میں آ کر جان دے سکتا تھا لیکن اپنے خاندان کی اگلی نسل کو اپنے خاندان سے کمتر خاندان کی ماں اور خون دینا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

اس دن عکس کو اندازہ نہیں ہوا خیر دین کے اس تعارف نے ایک شیر دل پر کیا قیامت ڈھائی تھی بالکل ویسے ہی جیسے خیر دین کو یہ پتا نہیں تھا کہ وہ جس ایک شیر دل پر جان و دل سے فدا تھا اس کا خاندان اس پر کیا قیامت ڈھا چکا تھا۔

شیر دل ایک کرسی کھینچ کر خیر دین کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ وہ اس سے ادھر ادھر کی گفتگو کرتا رہا تھا اور اس ساری گفتگو کے دوران وہ خیر دین سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ وہ اور اس کا خاندان اس بوڑھے کے خاندان کا بہت حوالوں سے مجرم تھا اور شیر دل ضمیر کو مسلسل سلانے کی کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد اس

بوجھ کو بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ خیر دین سے اس دن بھی نظر نہیں ملا سکا تھا جس دن وہ کسی حوالے سے عدالتی نوٹس ملنے کے بعد اس کے پاس گیا تھا۔ خیر دین اس کی شناخت سے بے خبر تھا اگر نہ ہوتا تو کم از کم اس دن وہ ہمیشہ کی طرح اس سے معمول کی گفتگو میں مصروف نہیں رہتا۔ اس کا تعارف اگر صرف عکس مراد علی تک محدود تھا تو پھر اس کا یہ مطلب تھا کہ خیر دین کو اس یقین کے حوالے سے بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ اس سے معذرت کرنا چاہتا تھا اور وہ چاہنے کے باوجود یہ نہیں کر سکا۔

پھر خیر دین کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ عکس کے ساتھ دوبارہ کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ ”تمہارا فون ہے میرے پاس۔“ عکس نے اپنے شو لڈر بیگ کی ایک اندرونی جیب سے اس کا فون نکال کر اس کو واپس دیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اسے آف ہی رکھا تھا۔“ انٹرنیشنل رومنگ کی سہولت ہونے کی وجہ سے شیر دل نے اسے اپنا فون استعمال کرنے کے لیے دیا تھا اور وہ سارے سفر کے دوران اسی فون کے ذریعے کویت اور پاکستان کے ساتھ ساتھ سنگا پور میں شیر دل سے بھی رابطے میں رہی تھی لیکن پاکستان آنے کے بعد اس نے اس فون کو بند کر دیا تھا۔ وہ مسز فاروق کی طرح کسی اور کی کال اٹھا کر شیر دل کے حوالے سے کسی سوال جواب کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”ایک بات بتاؤ شیر دل، شہر بانو کی می مجھے کیسے جانتی ہیں؟ وہ یہ کیسے جان گئی تھیں کہ سنگا پور میں تمہارے فون پر ان کی کال ریسیو کرنے والی میں ہی ہو سکتی ہوں۔“ شیر دل اس کے اس سوال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس نے پہلی بار سنگا پور سے اس کے اس سوال پر فون ڈس کنکٹ کر کے خود کو بچا لیا تھا لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا وہ اس کے بالمقابل کھڑی بے حد سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے پوچھ رہی تھی۔ شیر دل کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”مجھے نہیں پتا۔“ یہ جملہ بولتے ہوئے بھی اسے اندازہ تھا کہ وہ کتنا بوجھ دے رہا تھا۔ ”تمہارے اور شہر بانو کے درمیان میری وجہ سے کوئی ناراضی ہے؟“ اس بودے جواب کا نتیجہ ایک بے حد ڈائریکٹ اور بے لحاظ سوال میں آیا تھا۔

”تمہاری وجہ سے نہیں، اس کیس کی وجہ سے۔“ شیر دل نے اس بار جھوٹ بولنا ضروری سمجھا۔ اس بار وہ اس سے نظریں نہیں چرا سکتا تھا۔

”شہر بانو کو اس کیس کا کیسے پتا چل گیا؟ تم نے ذکر کیا؟“ اس بار عکس کی آواز مدہم ہو گئی تھی۔

”ہاں، می نے بتایا ہے اسے۔“ شیر دل نے کہا۔ عکس چند لمحے خاموش رہی۔

”اس کی می جانتی ہیں کہ میں کون ہوں؟“ اس نے مدہم آواز میں پوچھا۔

”میں یہ بھی نہیں جانتا، وہ مجھ سے بات نہیں کر رہی لیکن پاکستان واپس آ رہی ہے چند دنوں میں..... پتا چل جائے گا۔“ عکس کو اس بار پہلی بار احساس ہوا کہ وہ پریشان تھا، تھکا ہوا نہیں تھا وہ اس کے اترے ہوئے چہرے کو تھکن کا نتیجہ سمجھ رہی تھی۔ ایک لمبی بے مقصد خاموشی دونوں کے درمیان آئی پھر عکس نے کہا۔

”شیر دل ہم آج کے بعد دوبارہ کبھی نہیں ملیں گے نہ ہی فون پر رابطہ کریں گے۔“ وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔

”کیوں؟“

”میرے پاس اس کیوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔“ عکس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔



”چلو تم ایسا ہی سمجھ لو۔“ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھکی اور پھر اس نے اتنی ہی روانی سے کہا۔ شیردل اس بار بول نہیں سکا تھا۔ وہ دونوں عجیب خاموشی میں باہر پارکنگ میں اپنی اپنی گاڑیوں تک آئے تھے۔

☆☆☆

پاپا ہمیں مس کر رہے ہیں نا؟“ شہر بانو اپنا سامان پیک کر رہی تھی جب مثال نے بے حد ایکسٹینڈ انداز میں اپنا ایک کھلونا پکنگ کے لیے لا کر اس کے پاس رکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ پاکستان واپس جانے کا سن کر بے حد ایکسٹینڈ پھر رہی تھی اور اس کی ایکسٹینٹ شرمین اور شہر بانو دونوں کے لیے عجیب سے کرب کا باعث تھی۔

”پتا نہیں۔“ اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر پھر اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”میں جانتی ہوں وہ مجھے مس کر رہے ہیں۔“ مثال کے یقین میں کمی نہیں آئی تھی۔

”اچھا۔“ شہر بانو نے کسی دلچسپی کے بغیر اپنے کپڑے تہ کرتے ہوئے سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کو بھی مس کر رہے ہیں وہ۔“ مثال نے چند لمحوں کے بعد جیسے ماں کو عجیب سی تسلی دینے کی کوشش کی۔

وہ کپڑے تہ کرتے ہوئے ٹھک گئی۔ بچے بعض دفعہ ایک جملے سے جیسے بڑوں کو دریا میں ڈبو چھوڑتے ہیں۔ شہر بانو کو خود پر عجیب سا ترس آیا تھا۔ کیا وقت آنا تھا یہ بھی کہ اسے اپنی ہی کم سن چند سالہ بچی شیردل کے حوالے سے تسلی دیتی۔ یہ بتاتی کہ وہ اسے مس کر رہا تھا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ کپڑے تہ کرتے کرتے رک کر اس نے مثال کو دیکھا پھر اس سے کہا۔

”مثال ادھر آؤ۔“ مثال نے اپنے کھلونے اکٹھے کرتے کرتے چونک کر ماں کو دیکھا پھر وہ سب کچھ چھوڑ کر ماں کے پاس آ گئی۔ شہر بانو اسے لیے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ بہت دیر وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے مثال سے پوچھا۔

”اگر ہم کبھی ہمیشہ کے لیے امریکا آ گئے تو تمہیں اچھا لگے گا یہاں رہنا؟“ وہ اس سے کوئی اور سوال کرنا چاہتی تھی لیکن اسے ہمت نہیں ہوئی۔ اس کی زبان پر جملہ کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔

”یس۔۔۔۔۔“ مثال نے بغیر کسی تامل کے بے حد خوشی کے ساتھ اسے یقین دہانی کروائی۔

”ہمیشہ کے لیے؟“ شہر بانو اب اسے سوال کے مشکل حصے کی طرف آرہی تھی۔

”یس۔۔۔۔۔“ مثال نے اب بھی اسی گرم جوشی کے ساتھ کچھ بھی سمجھے بغیر سر ہلایا۔ شہر بانو کچھ دیر خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”اگر صرف میں اور تم آ جا سیں امریکا تو؟“ مثال نے اس بار پہلی بار ماں کا چہرہ غور سے دیکھا اور اس سوال کو سمجھنے کی کوشش کی جو اس سے کیا جا رہا تھا۔

”صرف میں اور آپ کیوں؟ پاپا کیوں نہیں؟“ شہر بانو کو اس سے اسی قسم کے سوال کی توقع تھی۔

”ہو سکتا ہے پاپا نہ آ سکیں اسی لیے پوچھ رہی ہوں، میں اور تم بہت خوش رہیں گے یہاں۔۔۔۔۔ تم نے دیکھا

ہم نے کتنی سیر کی۔۔۔۔۔ کتنا انجوائے کیا ہر جگہ۔۔۔۔۔ سب نے کتنا پیار کیا تمہیں، کتنی ڈھیر ساری چیزیں لے کر

دیں۔“ وہ اب اسے وہ سبز باغ دکھا رہی تھی جس میں کرب چھپا ہوا تھا لیکن یہ صرف وہ جانتی تھی۔

”لیکن پاپا ساتھ کیوں نہیں آئیں گے؟“ مثال نے اس کے سبز باغ کے اندر پنہاں پھندے کو دیکھ

لیا تھا۔

”پاپا پاکستان میں بہت بڑی ہوتے ہیں۔ ان کے لیے یہ آسان نہیں ہے کہ وہ ہمارے ساتھ یہاں

آ جائیں۔“ شہر بانو اسے divorce کا مطلب سمجھانے کی جرات نہیں رکھتی تھی نہ ہی ابھی اپنے ذہن میں

”تمہارے پاس ہر مسئلے کا ایک ہی حل کیوں ہوتا ہے؟ مجھ کو چھوڑ دینا۔“ وہ خفا ہوا تھا۔ ”اس سے آج تک کبھی کوئی مسئلہ حل ہوا؟“

”نہیں لیکن کوئی مسئلہ پیدا بھی نہیں ہوا۔“ اس نے جواباً کہا۔

”تمہارے لیے نہیں ہوا ہوگا میرے لیے ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔“ شیردل نے بے حد کھلے لفظوں میں کہا۔

”میں تمہارا گھر توڑنا نہیں چاہتی شیردل۔ میں وہ وجہ نہیں بننا چاہتی جو تمہارے اور شہر بانو کے درمیان علیحدگی کا باعث بنے۔“ اس نے شیردل کی بات پر تبصرہ کرنے کے بجائے کہا تھا۔

”پھر تم یہ کیس واپس لے لو۔“ وہ شیردل کے اس جملے پر بول نہیں سکی تھی۔

”میرے اور شہر بانو کے درمیان اگر کوئی مسئلہ ہوا تو تمہارے اس کیس کی وجہ سے ہوگا۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”کیوں۔۔۔۔۔ تم تو فریق ہو اس میں شہباز حسین کے وراثت کے طور پر۔۔۔۔۔ تم تو defend کرنے

والے ہو شہباز حسین کے actions کو۔۔۔۔۔ شہر بانو کو کیا مسئلہ ہوگا اس سے۔“ وہ واقعی الجھی تھی۔

”میری فیملی جانتی ہے تم میری دوست ہو۔“ شیردل نے مدہم آواز میں کہا۔ ”ان کے لیے یہ قابل قبول

اور ماننے والی بات نہیں ہے کہ تم میری دوست ہوتے ہوئے یہ کیس واپس نہیں لے سکتیں۔“ شیردل نے اسے

یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اپنی فیملی کے سامنے اسی ایک بات پر اڑا ہوا تھا کہ وہ اسے پریشاں نہیں کرے گا۔ عکس نے

بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔

”تو اس کا مطلب ہے اب تمہیں دشمن بنانا پڑے گا۔“

”بنا سکتی ہو؟“ سوال سیدھا سیدھا تھا اور شیردل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا لیکن صرف

وہ جانتی تھی کہ وہ سوال نہیں تھا چیخ تھا۔ وہ اس سے نظر چرا گئی۔ نظر ملانے رکھنا مشکل تھا۔

”جانتی ہوں میں۔“ عکس نے قدم بڑھا دیا۔

”تم نے جواب نہیں دیا۔“ وہ ساتھ بڑھا۔

”تم جانتے ہو؟“

”تم ڈھیٹ ہو؟“ شیردل نے بے ساختگی سے کہا۔

”الگش میں اسے steadfastness کہتے ہیں اور اکیڈمی میں یہ خصوصیت ہمارے اندر پیدا

کرنے پر خاص زور دیا جاتا تھا۔“ وہ تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی تھی۔ شیردل اس

کی بات سے محظوظ نہیں ہوا۔

وہ جس مصیبت میں پھنسا ہوا تھا اس میں وہ عکس مراد علی کی حس مزاح سے محظوظ نہیں ہو سکتا تھا۔

”انگل کو اس سارے معاملے کا پتا تک نہیں ہے اور تم کیس لڑ رہی ہو۔۔۔۔۔ تم آخر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟“

وہ کچھ جھنجھلایا ہوا اس کے پیچھے آیا تھا۔

”میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ ہم سب انسان ہیں اور ہم سب کی عزت برابر ہوتی ہے اور ہم

سب کو اپنے حق کے لیے لڑنے کا حق حاصل ہے اور میں اس پر مزید بحث نہیں کروں گی تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔ تم کو

میں نے بہت پہلے بتا دیا تھا کہ تم اپنی فیملی کو سپورٹ کرو۔۔۔۔۔ ان کی طرف سے لڑو۔۔۔۔۔ میں اور میرے نانا تمہاری

ذمے داری نہیں ہیں، مجھے تم سے اس معاملے میں کوئی توقعات نہیں ہیں اور نہ ہی کوئی شکایت ہوگی اور ایک

شیردل ہم آج کے بعد نہیں مل رہے۔“ وہ اس بار اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی تھی۔

”تمہیں جو ادب نے منع کیا ہے مجھ سے ملنے سے؟“ شیردل کو پتا نہیں کیا خیال آیا تھا۔

”آپ نے عکس کو suspend کروایا ہے؟“ آدھے گھنٹے کے بعد بختیار کے پاس بیڈروم میں آکر بیٹھتے ہی شیردل نے براہ راست اس سے پوچھ لیا تھا۔  
 ”ہاں۔“ جواب مختصر تھا مگر وہی تھا جس کی شیردل کو توقع تھی۔ ”اور کیوں کروایا ہے یہ سب بھی تم جانتے ہو گے۔ وہ غیر ذمے دار ہے اور اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر رہی ہے۔“ بختیار نے اسی سنجیدگی سے ایک ہی سانس میں کہا تھا۔  
 ”وہ ایسا کچھ نہیں کر رہی۔“ شیردل نے ان کو ٹوک دیا۔

”تم میرے سامنے اس کو سپورٹ کرنے کا سوچنا بھی مت..... وہ تمہاری دوست ہے اور اس کی جرات یہ ہے کہ وہ تمہاری ہی فیملی کو ٹارگٹ کر رہی ہے اور تم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہو۔“ بختیار خفگی سے کہہ رہے تھے۔  
 ”میں ہمیشہ اس کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتا رہا مجھے اگر یہ اندازہ ہوتا کہ وہ اس طرح کے بیک گراؤنڈ کے ساتھ اس طرح کے کریمنل ریکارڈ رکھنے والے ایک تھرڈ کلاس خاندان سے تعلق رکھتی ہے تو میں تو تمہیں کبھی اس سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا اور تم اس سے شادی کے لیے مرے جارہے تھے کسی زمانے میں.....“ بختیار کا غصہ بات کرتے کرتے اور بڑھ گیا تھا۔

”آپ سے کس نے کہا ہے کہ وہ کریمنل.....“ بختیار نے شیردل کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔  
 ”شہباز نے اس کے نانا کو جواب سے اسی لیے نکالا تھا کہ وہ چوریاں کرتا رہا اس کے گھر اور چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔“ اس سے پہلے کہ بختیار کچھ اور کہتا منظرہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی۔ وہ ابھی ابھی گھر پہنچی تھی اور اس کے وہم و گمان میں بھی وہ سین نہیں تھا کہ جو اس وقت اس کے بیڈروم میں ہو رہا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت سی ہو گئی تھی۔ بختیار کی بلند آواز اور شیردل کے چہرے کے تاثرات اسے سمجھانے کے لیے کافی تھے کہ اندر کیا ہو رہا تھا۔

”تم کب پہنچے ہو؟“ منظرہ نے جسے خود کو سنبھالتے ہوئے شیردل کے سلام کا جواب دیا۔  
 ”منظرہ تم کچھ دیر کے لیے باہر چلی جاؤ ہم ایک اہم مسئلے کو ڈسکس کر رہے ہیں۔“ علیک سلیک کے بعد بختیار نے اس سے کہا تھا۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ منظرہ کسی بھی طرح ان دونوں کے درمیان ہونے والی اس اہم ڈسکشن کو چھوڑ کر کہیں چلی جاتی۔  
 ”کیس کے بارے میں؟“ اس نے بختیار سے پوچھا اور شیردل کو دیکھا جو ماں سے نظریں چرا گیا تھا۔

”ہاں۔“ بختیار نے مختصر کہا۔  
 ”تو پھر میں کہیں نہیں جاؤں گی..... آخر اس کے بارے میں ایسا کیا ہے جو آپ دونوں میرے سامنے ڈسکس نہیں کر سکتے۔“ اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے حتمی انداز میں کہا۔ بختیار اور شیردل نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر بختیار نے کہا۔

”شیردل یہ مسئلہ تمہارے سامنے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا۔“  
 ”ہاں میں اچھی طرح جانتی ہوں وہ کیوں یہ مسئلہ میرے سامنے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا..... وہ عکس کو reinstate کروانا چاہتا ہوگا، یہ بات تو اس سے برداشت نہیں ہو رہی ہوگی کہ اس کی جیتی کو کچھ ہو۔“ منظرہ نے بے حدخی سے شیردل کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”ممی عکس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ کیس کورٹ میں لڑا جاتا ہے، اس طرح نہیں۔“ شیردل نے بے اختیار اس سے کہا۔

اس خوفناک چیز کے بارے میں غور کر رہی تھی۔

”we can wait“ جب پاپا کا کام ختم ہو جائے گا تو وہ بڑی نہیں ہوں گے تو پھر ہم آجائیں گے۔“ مثال نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔ اس نے اپنی طرف سے اس گمبھیر مسئلے کا ایک آسان حل نکالا تھا۔ وہ گمبھیر مسئلہ جو اس کی ماں سے حل نہیں ہو رہا تھا۔ شہربانو چند لمحوں کے لیے خاموش رہی پھر اس نے کہا۔  
 ”پاپا کا کام کبھی بھی ختم نہیں ہوگا اور وہ ہمیشہ بڑی رہیں گے۔“ مثال نے کچھ الجھ کر ماں کو دیکھا۔  
 ”he told you that“ اس نے جیسے بے یقینی سے ماں سے پوچھا۔

”yes he did“ اس نے آج تک کبھی مثال سے جھوٹ نہیں بولا تھا لیکن آج وہ اس کے ساتھ جھوٹ بول رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی اب اسے مثال کے سوالوں سے بچنے کے لیے جھوٹ گھڑنا اور جھوٹ بولنا سیکھنا تھا۔

”میں ان سے پوچھوں گی وہ ضرور ہمارے ساتھ امریکا آجائیں گے..... holi days میں۔“ مثال کا باپ پر یقین ابھی بھی متزلزل نہیں ہوا تھا۔

”ہم دونوں اگر اکیلے امریکا میں آگئے تو ہم بہت خوش رہیں گے۔ یہاں گھومنے پھرنے کے لیے بہت ساری جگہیں ہیں..... میں تمہیں ڈھیروں کھلونے دلاؤں گی ڈھیروں چاکلیٹس اور سوئیٹس دلاؤں گی ہم بہت مزہ کریں گے، تم پاپا کو بالکل مس نہیں کرو گی۔“

”نومی..... I will miss Papa“ مثال نے اس کی بات کاٹ کر جیسے اعلان کرنے والے انداز میں اس سے کہا تھا۔ وہ ہل نہیں سکی پھندے کوئی ایک دو نہیں تھے جو اس کے پاؤں میں تھے وہ ہر طرح سے جکڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

”مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے پاپا۔“ شیردل نے ہاسپٹل سے گھر پہنچتے ہی بختیار شیردل سے کہا تھا۔ وہ اس وقت آفس سے گھر آئے تھے اور شام کی فلائٹ سے اسلام آباد جا رہے تھے۔ شیردل اور ان کی ملاقات لاؤنج میں ہی ہوئی تھی۔ رسی علیک سلیک کے فوراً بعد شیردل نے انہیں کہا تھا۔  
 ”مجھے بھی تم سے کافی ضروری باتیں کرنی ہیں سات بجے کی فلائٹ ہے میری۔ تم آج یہیں ہو؟“ بختیار نے اس سے پوچھا تھا۔

”جی میں آج یہیں ہوں۔“ شیردل کو ان کے لب و لہجے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس سے کس موضوع پر بات کرنا چاہتے تھے۔ عکس کی معطلی ان کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی اور اس معطلی کے لیے انہیں رضامند کرنے کے لیے بہت کچھ ان کے علم میں لایا گیا ہوگا۔ یہ شیردل اندازہ کر سکتا تھا۔  
 ”چینج کر کے میرے بیڈروم میں ہی آ جاؤ، وہیں بات کر لیتے ہیں۔“ بختیار نے اس سے کہا تھا۔  
 ”تمہاری ممی بھی تب تک آجائیں گی۔“

”میں ممی کے سامنے آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا پاپا، میں اس مسئلے پر آپ سے الگ بات کرنا چاہتا ہوں۔“ شیردل نے بالآخر کسی تمہید کے بغیر موضوع پر آتے ہوئے کہا۔ بختیار نے ماتھے پر بل لیے اسے دیکھا وہ الجھ گیا تھا۔

”ٹھیک ہے ہم منظرہ کے سامنے بات نہیں کریں گے، تم بیڈروم میں آ جاؤ۔“ بختیار اس سے کہہ کر چلا گیا تھا۔

اور اس معاملے کو چھپانے کے لیے انکل شہباز نے عکس کے نانا پر چوری کا الزام لگا کر اسے گھر سے نکال دیا تھا۔“ بختیار اور منزہ پر چند لمحوں کے لیے عجیب سا سکتہ ہوا تھا۔ پھر یہ منزہ بھی جس نے اس خاموشی کو ہڈیانی انداز میں یہ کہتے ہوئے توڑا تھا۔

”Shame on you.....Shame on you Sherdil.....تم اپنے انکل پر اتنا گھناؤنا الزام لگا رہے ہو.....تم اس دعا باز کی باتوں پر یقین کر رہے ہو؟“

”Just stop lieing... stop lieing Mummy“ شیردل اپنی آواز اور لہجے پر قابو نہیں رکھ سکا۔ وہ فیصلہ جو ضمیر نہیں کروا پا رہا تھا، وہ گالی کے ایک چھوٹے سے لفظ کی گونج نے کروا دیا تھا۔ منزہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ ان کی اولاد تھی، وہ ان پر چلا رہا تھا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو تم؟“ بختیار بھی حواس باختہ ہو گئے۔

”ممی سے پوچھیں۔“

”شہباز یہ نہیں کر سکتا۔“ منزہ نے عجیب انداز میں کہا۔

”ممی سچ کہیں۔“ شیردل یک دم کرسی سے اٹھ کر منزہ کے پاس چلا گیا۔

”الزام ہے یہ۔“

”میں نے دیکھا تھا انکل شہباز کو اس رات یہ سب کرتے.....“

”وہ وہاں کیوں آئی تھی۔ آدھی رات کے وقت کیسے آئی وہ اس گھر میں..... اپنی مرضی سے آئی ہوگی.....“

یہ نوکروں کے بچے، بچے تو نہیں ہوتے یہ تو adult ہوتے ہیں۔ میچور ہوتے ہیں۔ یہ بچیاں جان بوجھ کر اپنے آپ کو پیش کرتی ہیں۔ tempt کرتی ہیں پیسوں کے لیے۔“ شیردل نے منزہ کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”مت کہیں ممی..... یہ سب مت کہیں۔ وہ باتیں مت کہیں کہ آپ میری نظروں سے گر جائیں۔ وہ نو

سال کی ایک بچی تھی۔ Just a child..... میں نے اسے اس رات بلوایا تھا..... چس کھیلنے کے لیے،

میں نے اس کے لیے دروازہ کھولا تھا۔“ وہ انکشاف پر انکشاف کر رہا تھا اور منزہ کی آنکھوں میں عجیب التجا تھی

یوں جیسے وہ چاہتی ہوں وہ وہ راز نہ اگلے جو کم از کم ان کے لیے راز نہیں تھا۔ بات کرتے ہوئے شیردل کی آواز

بھرا گئی۔ اس نے منزہ کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹالیا۔

”اس رات وہاں جو کچھ ہوا، اس کا ذمہ دار میں بھی تھا لیکن انکل شہباز..... وہ انسان نہیں تھے He

was an animal۔“ وہ ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس بت پر ضربیں لگا رہا تھا جو منزہ اپنے

بھائی کا لیے پھرتی تھیں۔ بختیار ساکت تھا اور منزہ گونگی ہو چکی تھیں۔

”انکل شہباز نے ایک خاندان تباہ کیا تھا اس رات..... صرف ایک نہیں..... میں باپ ہوں ایک چار

سال کی بچی کا۔ ممی میں سمجھ سکتا ہوں اس تکلیف اور بے عزتی کے احساس کو جو عکس کے نانا کو ہوئی ہوگی۔ میں ان

کی جگہ ہوتا تو اس شخص کو مار ڈالتا جو.....“ منزہ نے اس کی بات کاٹی۔

”تم نو سال کے بچے تھے تب خود شیردل..... تم کیسے سمجھ سکتے ہو یہ سب کچھ..... ہو سکتا ہے تم نے اس

رات کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو اور یہ سب کچھ تمہارے ذہن نے خود بنا لیا ہو۔ خیر دین اور شہباز کا جھگڑا

ہوتے اور ان کی باتیں سنتے ہوئے تم نے یہ سمجھ لیا ہو کہ واقعی ایسا کچھ ہوا تھا..... تم کتنی باتیں اور چیزیں

اپنے پاس سے گھڑ لیا کرتے تھے۔“ منزہ ایک عجیب اضطراب کے عالم میں ایک آخری کوشش کر رہی تھیں

شہباز کی عزت بچانے کی۔ ایک آخری کوشش..... اپنے مرے ہوئے اکلوتے بھائی کو اس کے گناہ پر کی

ماہنامہ پاکیزہ۔ اگست 2012ء 35

”اس کا قصور نہیں ہے..... وہ بچپن..... تیس سال بعد منہ اٹھا کر میری فیملی کو ذلیل کرنے آگئی ہے اور اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔“ وہ بہت غصے سے بول رہی تھیں۔

”وہ ذلیل کرنے نہیں آئی آپ کی یا ہماری فیملی کو، یہ کام شہباز انکل نے کیا تھا۔“ شیردل نے یک دم

ماں کو ٹوک دیا۔ منزہ کی رنگت چند لمحوں کے لیے لٹھے کی طرح سفید ہو گئی۔ وہ مر کے بھی شیردل کے منہ سے

شہباز کے لیے ایسا جملہ سننے کی توقع نہیں کر سکتی تھیں۔

”تم اس لڑکی کی زبان مت بولو اس گھر میں..... تم اس لڑکی کی باتوں میں آ کر اپنے خاندان پر خود کیچڑ

اچھا لو گے؟“ بختیار اس بات پر بری طرح برہم ہو گئے۔

”میں اس لڑکی کی زبان نہیں بول رہا ہوں پاپا۔“ شیردل نے باپ کی بات کاٹی۔

”تم کیا جانتے ہو اس آدمی اور اس کے خاندان کے بارے میں جس کے لیے وہ لڑ رہی ہے، بلیک میلنگ

کا طریقہ ہے۔“

منزہ کو یک دم جیسے ہوش آ گیا۔ اگر زندگی میں کبھی شہباز حسین کو ان کی ضرورت تھی تو وہ اس وقت تھی۔

”وہ کیوں ہماری فیملی کو بلیک میل کریں گے؟ پوری دنیا میں انہیں اس کام کے لیے ہمارا ہی خاندان

کیوں نظر آیا ہے؟“ شیردل نے بے حد عجیب انداز میں منزہ سے کہا۔ منزہ کو اس کا انداز دہلا رہا تھا۔ شیردل

زندگی میں پہلی بار شہباز کے حوالے سے ان سے اس طرح بات کر رہا تھا۔

”تم جانتے ہو اس لڑکی کے نانا نے شہباز پر کیا الزام لگایا تھا؟ بختیار نے جیسے خاندان کا وہ راز شیردل

سے شیر کرنے کا فیصلہ کیا جو ان کی بیوی نے چند دن پہلے ان سے شیر کیا تھا۔ شیردل چند منٹ سپاٹ نظروں

سے باپ کا چہرہ دیکھتا رہا۔ ایک جملے نے اسے ایک بار پھر اس رات کے جہنم میں پھینک دیا تھا۔

”جانتا ہوں.....“ اس نے مدھم آواز میں کہا۔ ”اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ الزام درست ہے۔“ بختیار کا

دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔

”تم اپنے خاندان کے مرد کو اتنا گھٹیا سمجھتے ہو کہ وہ ایک خانساں کی بیٹی کے ساتھ افیئر چلائے گا، اپنی

بیوی اور بیٹی کے ہوتے ہوئے؟“ بختیار نے بہت تیز اور جیتے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

”کون سا افیئر؟“ ان کی بات شیردل کے سر سے گزر گئی۔

”اس لڑکی کی ماں نے شہباز کے ساتھ تعلقات کا الزام لگایا تھا شرمین کے سامنے۔ اس لڑکی کے نانا نے

چوری کے الزام سے بچنے کے لیے اپنی بیٹی کو استعمال کیا۔ شہباز کا گھر تڑوا دیا اس نے۔“ بختیار کہہ رہا تھا اور

شیردل صرف اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”آپ سے ممی نے کہا یہ سب؟“ یہ راکٹ سائنس نہیں تھی کہ وہ سیکنڈز میں یہ نہ جان پاتا کہ بختیار کو یہ

سب باتیں بتانے والا کون ہو سکتا تھا۔

”یہ سب کچھ میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا صرف اس لیے کہ تمہاری اس لڑکی کے ساتھ دوستی ہے، تم اسے

پسند کرتے تھے۔ میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی حالانکہ میں اس لڑکی کے بارے میں یہ سب کچھ پہلے دن

سے جانتی تھی۔ اسی لیے منع کر رہی تھی کہ یہ بلیک میلرز کی فیملی ہے۔ تم ان کا حصہ نہ بنو ان کی باتوں میں نہ آؤ۔“

منزہ نے بات شروع کی تو پھر وہ بولتی ہی چلی گئیں انہوں نے شیردل کے تاثرات نوٹس کرنے کی کوشش نہیں کی یا

اگر کی بھی تھی تو انہیں نظر انداز کر دیا۔

”پاپا، شہباز انکل نے عکس کے ساتھ زیادتی کی تھی اور اسے قتل کرنے کی کوشش تھی جب وہ نو سال کی تھی

ماہنامہ پاکیزہ۔ اگست 2012ء 34



ہوں گی، گیارہ سالہ منرہ نے اسے ڈانٹتے ہوئے بیٹ مین کو آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔ ننھے شہباز پر ایک عجیب سا خوف لہرانے لگا۔ خوف، بے چارگی، بے بسی..... منرہ ہمیشہ الجھتی تھی جب شہباز بیٹ مین حفیظ گل کے ساتھ کہیں بھی جانے سے بری طرح بدکتا تھا۔ حالانکہ حفیظ گل ان کا بارہ سال پرانا بیٹ مین تھا۔ ان دونوں کی پیدائش سے بھی پہلے سے حسین کے پاس کام کر رہا تھا۔ اور بے حد وفادار اور قابل اعتبار تھا۔ وہ واحد ملازم تھا جس پر حسین اور اس کی بیوی اپنے بچوں کے حوالے سے اندھا اعتبار کرتے تھے۔ منرہ، حفیظ گل کے ساتھ بے حد اچھڑی اور حفیظ گل شہباز پر جان چھڑکتا تھا لیکن وہ شہباز پر جتنا نارہ تھا، شہباز اس سے اتنا ہی بھاگتا تھا۔ حفیظ گل کے ساتھ اکیلے کہیں جانے سے اس کی جان جاتی تھی لیکن جیسے ہی حفیظ گل سامنے آ جاتا تھا وہ بالکل گونگا ہو جاتا تھا پھر وہ میکینگی انداز میں اس کے ساتھ چل پڑتا تھا۔

چالیس سالہ حفیظ گل شادی شدہ اور چار بچوں کا باپ تھا۔ وہ ایک بے حد مستعد، خوش مزاج اور محنتی آدمی تھا۔ ایمانداری اس کی ایک اور خوبی تھی اور اس کی انہی تمام خوبیوں نے اسے حسین کے گھر کا ایک فرد بنا دیا تھا۔ وہ کھلے عام گھر میں کہیں بھی آ جاسکتا تھا۔ بچوں کے کمرے تک میں..... اور یہ آمدورفت صرف حسین اور اس کی بیوی کی موجودگی میں ہی نہیں رہتی تھی ان کی عدم موجودگی میں بھی حفیظ گل کو گھر کے ہر حصے تک آنے جانے میں اتنی ہی آزادی تھی۔

شہباز حسین کو بچپن سے حفیظ گل ہی نے کھلایا تھا۔ حسین آرمی میں تھا اور حفیظ گل ان کے ساتھ جاتا تھا۔ دونوں میاں بیوی بے حد سوشل تھے خاص طور پر حسین کی بیوی۔ منرہ کے حوالے سے وہ بچپن میں کچھ محتاط رہی تھی لیکن شہباز کو بچپن سے ہی اس نے زیادہ تر حفیظ گل کے سر پر ہی ڈالا ہوا تھا۔ وہ لیڈیز کلب کی ایک سرگرم عہدے دار تھی۔ دونوں میاں بیوی کا تعلق اپر کلاس سے تھا اور ان کے شوق اور سرگرمیاں بھی بے شمار تھیں۔ وہ دونوں خود بھی نوکروں والے گھروں میں نوکروں کے ہاتھوں ہی پلے بڑھے تھے ان کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔ ننھے شہباز کو حفیظ بہت بچپن میں ہی حسین یا اس کی بیوی کے کہنے پر پرانے میں ڈال کر باہر سڑک پر گھمانے لے جایا کرتا تھا یا اپنے کوارٹر میں لے جاتا۔ حسین یا اس کی بیوی کو بھی اندازہ نہیں ہوا وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بچے کے لیے ایک جہنم تیار کر رہے تھے نہ انہیں بھی حفیظ پر یہ شبہ ہوا کہ اس کے کردار میں کوئی خرابی ہو سکتی ہے..... نہ ہی شہباز کے آہستہ آہستہ حفیظ سے دور بھاگنے کی کوشش پر انہیں بھی یہ احساس ہوا کہ ان کا بچہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کے لیے ادھر ادھر ہاتھ مار رہا تھا۔

پہلی بار شہباز نے دس سال کی عمر میں بالآخر اپنی بہن کے ساتھ اپنی زندگی کا وہ جہنم دکھایا تھا جس میں وہ پچھلے کئی سالوں سے جکس رہا تھا۔ منرہ شاک میں آ گئی۔ چودہ سال کی اس بچی کو سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ماں باپ کو یہ سب بتادے جبکہ شہباز اس سے اصرار کر رہا تھا کہ وہ کسی کو کچھ نہ بتائے ورنہ حفیظ گل ان سب کو مار ڈالے گا۔ اس نے منرہ کو ان چاقوؤں کے بارے میں بتایا تھا جو حفیظ گل کے پاس تھے اور اس نے اسے بتایا تھا کہ وہ کس طرح ان چاقوؤں کے ساتھ اس کے ماں باپ کو ذبح کر دے گا اور پھر ان کے اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دے گا جس طرح وہ ہر بقر عید پر ان بکروں کے کرتا تھا جنہیں وہ قربانی کے لیے حسین کے گھر پر ذبح کرتا تھا۔

اس نے منرہ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کسی کو نہیں بتائے گی لیکن وہ اسے حفیظ گل سے بچالے گی۔ اور منرہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گی لیکن وہ اپنے آپ پر کنٹرول نہیں کر سکی تھی۔ شدید طیش کے عالم میں اس نے اپنا ٹینس ریکٹ نکالا تھا اور وہ بھاگتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئی..... حفیظ گل پورچ میں کھڑی گاڑی

جانے والی ملامت سے بچانے کی آخری کوشش۔ ”آپ کو تو یاد ہی ہوگا بختیار..... یہ کیسی کیسی باتیں سوچ لیا کرتا تھا بچپن میں..... جو ممکن ہی نہیں ہوتی تھیں اور ہم ہنستے تھے اس کی باتوں پر کہ کیا imagination ہے۔“ وہ بات کرتے کرتے چند لمحوں کے لیے رک گئیں۔ بختیار کی آنکھوں میں کچھ تھا جو انہوں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔

”انہی دنوں یہ بہت اب سیٹ تھا۔ اکثر راتوں کو ڈر جاتا تھا..... آپ کو تو یاد ہوگا آپ امریکا میں تھے اور جب واپس آئے تھے تو آپ بھی اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے..... ہو سکتا ہے اس نے خواب میں ایسا کچھ دیکھا ہو اور اس نے سچ سمجھ لیا ہو۔“ منرہ نے یک دم اپنی بات بدل دی تھی۔ انہیں اندازہ تھا کہ ان کی بات ناقابل قبول تھی وہاں بیٹھے ہوئے دونوں مردوں کے لیے۔

”مُمی! آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ آپ اچھی طرح جانتی تھیں انکل شہباز نے کیا کیا تھا۔“ شیردل نے بے حد سرد مہری کے ساتھ ماں کو ایک بار پھر ٹوک دیا۔ ”میں شاید تیرہ چودہ سال کا تھا جب شہباز انکل اور شرمین آنٹی کے درمیان divorce ہوئی کیونکہ شرمین آنٹی کو اس سارے جھگڑے کا پتا چل گیا تھا۔ آپ نے انکل شہباز کو گھر بلایا تھا۔ ان سے بات کی تھی۔ میں نے وہ باتیں سنی تھیں۔“ منرہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

”انہوں نے آپ سے کہا تھا وہ شراب پیے ہوئے تھے اس رات جب چڑیا ان کے اسٹڈی روم میں چس کھیل رہی تھی، وہ اتفاقاً وہاں چلے گئے تھے اور انہیں نہیں یاد انہوں نے کیا کیا..... شاید کچھ غلط ہوا ہو..... لیکن انہوں نے کچھ بھی جان بوجھ کر نہیں کیا تھا..... وہ آپ سے کہہ رہے تھے کہ آپ شرمین کو سمجھائیں اور آپ نے ان پر چلانے اور غصہ کرنے کے بعد ان سے کہا تھا کہ وہ جھوٹ بولتے رہیں۔ اس جرم کا بھی اعتراف نہ کریں۔ I had heard every single word of your conversation اور مجھے آپ دونوں کی ایک ایک بات آج بھی یاد ہے..... مجھے شرمین آنٹی کے ساتھ آپ کا آرگومنٹ بھی یاد ہے..... کیا آپ کو وہ بھی سناؤں؟“ منرہ کے کندھے پہلی بار جھکے۔ تنا ہوا جسم اور گردن یک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ کچھ رازوں کو کہیں بھی دباؤ، وہ کہیں نہ کہیں سے باہر نکل آتے ہیں..... کچھ آوازوں کو کتنا ہی دباؤ ان کی بازگشت کہیں نہ کہیں سے ضرور سنائی دیتی ہے۔ انہوں نے شکست خوردہ انداز میں شیردل کا چہرہ دیکھا پھر بختیار کا۔ وہ اپنے اکلوتے چھوٹے بھائی کو ان کی نظروں میں ولن بننے سے نہیں روک پائی تھیں۔

”Disgusting“ انہوں نے بختیار کی آواز سنی۔ وہ لفظ کوڑے کی طرح پڑا تھا ان پر۔ وہ جانتی تھیں وہ کس کے لیے کہا گیا تھا..... شہباز کے لیے..... ان کے جان سے عزیز چھوٹے بھائی کے لیے۔ وہ لوگ شہباز کی تکلیف کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ لوگ کبھی بھی اس کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ سر جھکا کر وہ ہچکیوں اور سسکیوں سے رونے لگیں۔ وہ شہباز حسین کو دوسری بار بھی نہیں بچا سکی تھیں۔

☆☆☆

”موننی میں چاچا کے ساتھ نہیں جانا چاہتا۔“ سات سالہ شہباز نے بے حد اضطراب کے عالم میں منرہ کا ہاتھ پکڑا تھا۔

”میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔“ وہ اصرار کر رہا تھا۔

”تم ہمیشہ مجھے اسی طرح تنگ کرتے رہتے ہو..... چاچا کے ساتھ اکیلے جانے میں تمہیں کیا مسئلہ ہے، جاؤ سوئمنگ کے لیے..... ورنہ مُمی آئیں گی اور ان کو پتا چلا کہ تم نے آج پھر سوئمنگ مَس کر دی ہے تو وہ ناراض



بھی کھل سکتا ہے اور کھل جاتا ہے۔ شہباز کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ شراب نوشی کی عادت اس نے امریکا میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں اپنائی تھی اور اس عادت کا تعلق اس ڈپریشن کو ختم کرنے کی کوششوں سے تھا جو کبھی کبھار اچانک بچپن کے اس حادثے کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے ہو جاتا تھا۔ اس کی زندگی میں صرف یہی ایک سیاہ داغ تھا جو اس نے شرمین کے ساتھ کورٹ شپ اور شادی کے بعد بھی اس سے شیر نہیں کیا تھا۔ نہ ہی بڑا ہو جانے کے بعد اس کے ماں باپ اور منزہ میں سے کسی نے اس سے دوبارہ کبھی ان تمام تکلیف دہ واقعات کے بارے میں بات کی تھی لیکن اس حادثے کے بعد منزہ شہباز کے ساتھ جیسے سائے کی طرح لگی رہی تھی۔ وہ اس کے علاوہ اب اور اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے ماں باپ کی طرح وہ بھی اس حادثے کے لیے خود کو بھی blame کرتی تھی۔ اگر وہ شہباز کے اصرار پر اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی اور زبردستی مجبور کر کے حفیظ گل کے ساتھ نہ بھیجتی تو شاید یہ کبھی نہ ہوتا۔ چودہ سال کی ایک بچی ہوتے ہوئے بھی وہ ایک بڑی بہن کے طور پر اپنی کوتاہیوں پر نادم تھی۔

اس حادثے کے بعد جو ایک تبدیلی حسین کے خاندن میں آئی تھی، وہ نوکروں کے لیے ان کا بدلا ہوا رویہ تھا۔ وہ نوکروں پر اب کسی بھی طرح سے اعتبار کرنے پر تیار نہیں تھے نہ اعتبار کرنے پر نہ ہی ان کے ساتھ بے تکلفی رکھنے پر۔ ایک واضح لکیر تھی جو اس خاندان نے مالک اور نوکر کے درمیان کھینچ دی تھی۔

اور زندگی میں اس trauma کے ساتھ پل کر بڑا ہونے والا شہباز حسین اس رات ہمیشہ کی طرح ڈپریشن کے ایک اور دورے میں تھا اور اس ڈپریشن پر قابو پانے کے لیے اس نے ہمیشہ کی طرح اس رات بھی شراب نوشی کی تھی اور شراب کے اس نشے میں اس نے اپنی اسٹڈی میں چڑیا کو دیکھا تھا۔ وہ اسٹڈی میں صوفے کے پاس پڑی ایک سینئر ٹیبل پر اس کی میکینیک چیس لیے گھٹنوں کے بل ٹیبل پر اپنی کہنیاں ٹکائے بڑے اشتیاق سے بیٹھی ہوئی تھی۔ دروازہ اس وقت کھلا تھا اس لیے اس نے شہباز حسین کے کمرے میں داخل ہونے کی آواز نہیں سنی تھی۔ وہ ٹیبل پر کہنیاں ٹکائے پورے

دھور ہا تھا۔ منزہ نے باہر نکلتے ہوئے بھاگتے ہوئے حفیظ گل کے سر پر عقب سے وہ ریکٹ مارا تھا۔ حفیظ گل خوش قسمت تھا کہ ریکٹ کی ضرب سے اس کو نقصان نہیں پہنچا لیکن وہ چلا کر بے اختیار اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ دس سالہ شہباز خوف کے عالم میں بھاگتا ہوا باہر آیا لیکن وہ بیرونی دروازے سے باہر نہیں نکل سکا۔ اس نے اپنی چودہ سالہ بہن کو اس ٹینس ریکٹ کو فرش پر گرے حفیظ گل پر برساتے دیکھا اور اس نے حفیظ کو کسی کچھوے کی طرح اپنے دفاع کی کوشش میں زمین پر لوٹتے پوٹتے اپنے سر اور چہرے کو بچانے کی کوشش کرتے دیکھا۔ جن کبھی بن گیا تھا۔ وہ جن جو ایک بچے کے پورے بچپن کو کھا گیا تھا، وہ کتنا کمزور اور ڈرپوک تھا، یہ اس بچے نے وہاں کھڑے کھڑے دیکھ لیا تھا۔ منزہ جو کچھ اس پر ریکٹ برساتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی، حفیظ گل کو وہ چند جملے ہی یہ سمجھانے کے لیے کافی تھے کہ اس کا بھیا نک راز افشا ہو چکا تھا۔ حسین اس وقت تک کرنل بن چکے تھے اور ایک کرنل ایک بیٹ مین کے ساتھ اس واقعے کے بعد کیا کر سکتا تھا۔ حفیظ گل کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ حسین اور اس کی بیوی دونوں اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ حفیظ کے پاس اپنی زندگی بچانے کا ایک موقع تھا۔ وہ ان دونوں بچوں کو جان سے مار دیتا اور گھر میں چوری کی واردات ہو جانے کا ڈراما کرتا تو وہ بچ سکتا تھا، یہ اس کا خیال تھا۔ مار کھاتے کھاتے اس نے منزہ اور اس کے ریکٹ کو پکڑ لیا تھا اور منزہ نے یک دم بلند آواز میں چلانا شروع کر دیا تھا۔

دروازے میں کھڑا شہباز، منزہ کو حفیظ کی گرفت میں اس طرح چلاتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ بھی دروازہ کھول کر بلند آواز میں روتے اور چلاتے ہوئے باہر آ گیا تھا۔ حفیظ گل بہ مشکل منزہ کا منہ دبا کر اس کی آواز بند کر پایا تھا مگر وہ ایک وقت میں دونوں بچوں کا شور ختم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھی وہاں پورچ میں دن کے وقت۔ صرف چند منٹ لگے تھے اور آرمی آفیسرز کی اس کالونی میں آس پاس کے گھروں سے بیٹ مین اور دوسرے لوگ نکل کر بھاگتے ہوئے وہاں آ گئے تھے۔ بند گیٹ کے پار پہلے شخص کو دیکھتے ہی حفیظ گل کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بیٹ مین گیٹ کے اوپر سے کود کر اندر آ گیا تھا اور تب حفیظ گل نے بے اختیار منزہ کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر بھاگتا ہوا گھر کے عقب میں اپنے کوارٹر میں چلا گیا تھا۔ وہاں اکٹھا ہونے والا مجمع جب تک اس کو وارٹر تک پہنچ کر دروازہ توڑ کر اسے اندر سے نکالتا وہ اپنے پاس موجود ایک ریوالور سے اپنے آپ کو شوٹ کر چکا تھا۔

حفیظ گل ختم ہو گیا تھا لیکن اگلے کئی سال تک حسین اس کی بیوی اور وہ دونوں بچے اس trauma سے باہر نہیں نکل پائے تھے۔ اور شہباز حسین ساری زندگی بچپن کے ان اذیت ناک سالوں کے سائے میں رہا تھا۔ حسین نے اپنے اکلوتے بیٹے کو بہترین سائیکا ٹرسٹ کے پاس زیر علاج رکھا تھا۔ وہ اس کے ذہن اور اس کی مسخ شدہ شخصیت کو ایک بار پھر سے سنوارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے تھے۔ شہباز آہستہ آہستہ نارمل ہوتا گیا تھا یا کم از کم اس کے والدین کو یہ لگا تھا کہ وہ نارمل ہو رہا ہے لیکن انسانی ذہن بچپن کے تکلیف دہ واقعات اور حادثات کو بڑے عجیب طریقوں سے رجسٹر کرتا ہے۔ زندگی میں ان یادوں کا کھاتہ کبھی

لیے یہ وجہ کافی تھی کہ وہ شراب پیتا تھا۔ صرف غنی حمید ہی نہیں، کسی بھی مرد کو رد کرنے کے لیے اس کے لیے یہی ایک وجہ کافی تھی۔ وہ زندگی میں بہت سی دوسری چیزوں کے ساتھ کمپروماز کر سکتی تھی لیکن شراب پینے والے مرد کے ساتھ نہیں۔ یہ ایک چیز تھی جسے وہ شعوری یا لاشعوری کسی بھی طرح سے نظر انداز نہیں کر پاتی تھی۔ شیردل نے غنی کی ان عادات کے بارے میں اسے بہت پہلے بتا دیا تھا اور شیردل کے سامنے یہ ظاہر کرنے کے باوجود کہ اسے اس بات کی پروا نہیں تھی، عکس، غنی کے حوالے سے ایک دم بہت محتاط ہو گئی تھی۔ غنی کے ساتھ کچھ اور وقت گزارنے کے بعد عکس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ شیردل نے اس کے حوالے سے جو بھی کہا تھا، وہ صرف جیسی نہیں تھی حقائق تھے۔ غنی نے عکس کے سامنے کسی گفتگو میں ایک بار شراب پینے کا اعتراف کیا تھا اور بہت فخریہ انداز میں کیا تھا۔ البتہ اس نے عکس کے سامنے کبھی لڑکیوں کے ساتھ اپنے افیئرز اور تعلقات کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر اس حوالے سے محتاط تھا۔ یہ وہ بات تھی جو کسی بھی عورت کے لیے قابل قبول نہ ہوتی اور اتنے کھلے اعترافات کے بعد کوئی بھی لڑکی ایسے کسی شخص کو لائف پارٹنر بنانے سے پہلے سو بار سوچتی لیکن غنی کو اندازہ نہیں تھا کہ عکس کے لیے اس کی شراب نوشی اس کے افیئرز سے زیادہ repulsive تھی۔ غنی حمید کو اس نے ان مردوں کی فہرست میں کبھی شامل ہی نہیں کیا تھا جنہیں وہ لائف پارٹنر کے طور پر چننے کے لیے غور کرتی۔ غنی نے جب پہلی بار اسے پروپوز کیا تھا تو عکس نے اسے بڑے واضح اور صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ وہ اسے بہت پسند کرتی تھی لیکن دوستی کے علاوہ اس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں چاہتی۔

غنی نے اس کے انکار کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ اپنی رائے بدل دے گی خاص طور پر اس لیے کیونکہ ان کے درمیان بہت اچھی دوستی اور انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ شیردل کے برعکس غنی حمید status conseious ہونے کے باوجود شادی کے معاملے میں اپنی پسند کو ایک حسب نسب کی شادی پر ترجیح دینے پر یقین رکھتا تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ اپنے خاندان کو عکس کے ساتھ اس کی شادی کرنے پر تیار کر لے گا اور اس کا اظہار اس نے

انہماک کے ساتھ چیس بورڈ کی طرف متوجہ تھی۔ شہباز حسین کی طرف اس کی پشت تھی۔ کمرے میں پہلا قدم رکھتے ہی شہباز نے اسے دیکھ لیا تھا۔ ایک عجیب سی خفگی اور غصے نے اسے اپنی گرفت میں لیا تھا۔ وہ بغیر اجازت رات کے اس پہران کی اسٹڈی میں کس طرح آگئی تھی اور کیوں آئی تھی۔ انہوں نے ایک قدم اور بڑھایا اور اس بار قدموں کی چاپ پر چڑیا کچھ ہڑبڑائی اور اس نے بیٹھے بیٹھے مڑ کر دروازے کو دیکھا۔ وہاں ایک بونا کھڑا تھا..... ایک بے حد بد صورت بونا۔

☆☆☆

عکس نے اپنی آنکھیں بند کر کے رگڑیں پھر غنی سے کہا۔

”تھینک یو۔“ اس نے چند لمحے پہلے میز پر وہ خط لفافے میں ڈال کر رکھا تھا جو اس کا پی اے اس کے آفس کی کچھ دوسری ڈاک کے ساتھ اس کے لیے لے کر آیا تھا۔ وہ اس کی معطلی کی منسوخی کے آرڈرز تھے۔ اسے فوری طور پر اسی جگہ اور اسی عہدے پر دوبارہ کام کرتے رہنے کا حکم دیا گیا تھا جہاں وہ کام کر رہی تھی۔ دو دن کی معطلی میں اس کے ماتحت عملے میں جیسے ایک ہلچل مچ گئی۔ اس نے چھٹی بڑھالی تھی اور وہ ابھی بھی لاہور میں خیر دین کے پاس ہی تھی۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے..... دو چار دنوں میں انکوائری بھی رک جائے گی..... شوکا ز نوٹس بھی کینسل ہو جائے گا۔“ غنی اسے بتا رہا تھا۔ ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا بختیار، شیردل کو کیا ایشو ہوا ہے تم سے.....؟ تمہارے اور شیردل کے درمیان اب دوستی نہیں ہے کیا؟.....“ غنی اپنی کافی میں چمچ ہلاتے ہوئے کچھ الجھے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔ عکس کے معطل ہونے کی خبر پر سب سے پہلے اسے فون کرنے والا وہی تھا۔ عکس نے اس کا اصل مسئلہ بتانے کے بجائے ٹال مٹول والے انداز میں اس سے بات کی تھی لیکن اسے اندازہ تھا کہ غنی جب اسے بحال کروانے کی کوشش کے لیے اپنا اور اپنی فیملی کا اثر و رسوخ استعمال کرے گا تو اسے یہ جاننے میں دقت نہیں ہوگی کہ اسے معطل کرنے اور انکوائری کے لیے پریشر کہاں سے آیا تھا اور وہ یقیناً اسی طرح ہکا بکا رہ جائے گا جس طرح وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ بختیار شیردل کی فیملی اگر establishment کا ایک ستون تھا تو غنی حمید کا خاندان دوسرا ستون تھا۔ عکس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس دوسری فیملی سے بھی کسی نہ کسی طرح وابستہ تھی..... غنی اور اس کی دوستی پسندیدگی اور غنی کی طرف سے شدید قسم کی پسندیدگی کے بہت سارے مراحل طے کرنے کے باوجود شادی جیسے رشتے میں تبدیل نہیں ہو سکی تھی..... غنی ڈرنک کرتا womanizer تھا اور جاب میں آنے کے بعد مالی بے ضابطگیوں میں بھی انوالو ہوتا رہا تھا۔ شیردل اور اس کے خاندان کے درمیان فرق صرف reputation کا تھا۔ شیردل کے خاندان کا دامن اس حوالے سے صاف تھا اور ان کی reputation اور کارکردگی غنی حمید کے خاندان سے بہت بہتر تھی جو سیاسی گھرانوں کے زیادہ قریب تھا اور ان پر نوازشات کرنے اور انہیں ان سے مراعات لینے کا ماہر تھا۔

غنی حمید کے خاندان کی ایسی ساکھ نہ بھی ہوتی تب بھی عکس کے لیے اس کو ریجیکٹ کرنے کے

عکس سے کئی بار کیا تھا۔

”شیردل نے تمہیں میرے حوالے سے برین واش کیا ہے؟“ غنی حمید نے کئی بار شادی کا پروپوزل رد ہونے کے بعد بالآخر عکس سے کہا تھا۔ وہ پہلا موقع تھا ان کی دوستی کے دوران میں کہ ان کے درمیان شیردل کے حوالے سے اس طرح کی گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ پہلا موقع تھا جب عکس کو احساس ہوا کہ غنی حمید، شیردل سے ہمیشہ بے نیازی اور لائقیت ظاہر کرنے کے باوجود بھی اس سے خائف تھا۔ وہ شیردل کے چارم سے خائف تھا..... عورتوں میں اس کی مقبولیت سے خائف تھا اور وہ کبھی بات نہ کرنے کے باوجود بھی شیردل اور عکس کی دوستی سے خائف تھا۔

”شیردل نے مجھے کبھی تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہا۔“ عکس نے زندگی میں پہلی بار شیردل کے حوالے سے غنی سے جھوٹ بولا۔ وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

”یہ سفید جھوٹ ہے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”شیردل اور کبھی تم سے میرے بارے میں کچھ نہ کہتا ہو، وہ میرا بچپن کا حریف ہے۔ میں اور وہ ایک دوسرے کی کمینگی کو تمہارے لاکھ جھوٹ کے ساتھ بھی پہچانتے ہیں۔“ اس نے عکس کا مذاق اڑایا۔

”میری زندگی کے کسی فیصلے پر شیردل کی کسی رائے کا اثر نہیں ہوتا۔“ عکس نے ایک اور جھوٹ بولا۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا تھا کم از کم اس نے اس بات پر اس کو ٹوک کر اس کی بات ماننے سے انکار نہیں کیا تھا عکس کے ساتھ اتنا عرصہ رہنے کے بعد اسے بھی یہ اندازہ تھا کہ وہ دوسروں کی باتوں اور رائے کے مطابق اپنے فیصلے نہیں کرتی..... لیکن اس مسئلے میں بات شیردل کی ہو رہی تھی اور وہ عکس اور شیردل کی close association سے واقف تھا..... ایک لمبی بحث تھی جو ان دونوں کے درمیان تب ہوئی تھی اور اس بحث کا نتیجہ وہی رہا تھا جو پہلے تھا۔ غنی حمید بہت مایوس ہوا تھا لیکن اس نے عکس کے انکار کو کسی ذاتی ہتک کے طور پر نہیں لیا تھا نہ ہی انا کا مسئلہ بنایا تھا۔ ان دونوں کے درمیان دوستی اسی طرح چلتی اور قائم رہی تھی جیسے پہلے تھی۔ عکس مراد علی، غنی حمید کے بیچ میٹ کی واحد لڑکی تھی جس کے ساتھ غنی حمید کی اس طرح کی دوستی تھی..... باقی لڑکیوں کے ساتھ غنی حمید کی چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی تھی اور اس حوالے سے بہت کم ہی کوئی لڑکی ایسی تھی جو غنی حمید کی دل سے عزت یا احترام کرتی ہو۔ شیردل اس کے برعکس ایک پرفیکٹ جنٹلمین تھا خواتین بیچ میٹس کے ساتھ وہ بھی بے تکلف تھا اور ان میں بہت پاپولر بھی لیکن اس کی بے تکلفی اور دوستیاں ایک حد تک رہتی تھیں۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ فضول چھیڑ چھاڑ کے حوالے سے بے حد محتاط تھا اور شیردل میں بے حد دلچسپی کے باوجود اس کے حوالے سے کسی لڑکی کو کوئی ناگوار تجربات نہیں ہوئے تھے۔ اس کی رپوٹیشن اس حوالے سے بہت اچھی تھی..... اور عکس مراد علی اپنے کامن کے ”ہیرو“ اور ”ولن“ دونوں کے ساتھ قریبی دوستی رکھتی تھی۔ ”ہیرو“ اور ”ولن“ اس کے لیے ایک جیسا احترام رکھتے تھے۔ یہ ایک عجیب و غریب تکنون تھی جو ان تینوں کے درمیان تھی۔ اس تکنون کو غیر متوازن ہونے سے بچانے کا سارا کریڈٹ عکس مراد علی کو جاتا تھا۔

”شیردل کے ساتھ میرا کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟“ وہ غنی حمید کے سوال پر مسکرا دی۔

”پھر بختیار شیردل نے کیوں.....؟“ عکس نے غنی کو ٹوک دیا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

”میرے نانا نے اپنے پروفیشنل کیریئر میں اپنے ساتھ ہونے والی ایک بے انصافی کے لیے کیس کیا ہے اور وہ شیردل کے ایک انکل کے خلاف ہے جو کبھی ان کے پاس رہے تھے۔“ اس نے بہت مختصر غنی سے کہا۔

”wow“ وہ بے اختیار کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ ”وہ یقیناً ایک کارنامہ تھا۔ اور تم نے انہیں کرنے دیا؟“ غنی کے لیے حیرت کا اصل باعث یہ بات تھی۔

”ہاں۔“ عکس یہ چھپا گئی کہ کیس اس کی طرف سے تھا اور شیردل بھی اس میں نامزد تھا ایک وارث کے طور پر۔

”Now I understand“ غنی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور شیردل کے ساتھ اب اس کیس کے بعد تو.....“ عکس نے اس کی بات کاٹ دی۔

”we are still friends“ اس نے کہا۔ وہ بے یقینی سے مسکرا دیا۔ ”یہ مشکل کام ہے۔ میں شیردل کی جگہ ہوتا تو کبھی ایسی دوستی نہیں رکھ سکتا تھا۔“ غنی نے بے ساختہ کہا۔ عکس مسکرا دی۔

”تم شیردل نہیں ہو غنی۔“ کیا تھا اس جملے میں کہ غنی ہل نہیں سکا تھا۔ اس نے اپنے اور شیردل کے تعلق کو اس سے پہلے ایسے واضح لفظوں میں نہیں بتایا تھا۔ غنی بہت دیر تک بول نہیں سکا۔

”تم سمجھتی ہو کہ شیردل اپنی فیملی کے بجائے تمہیں سپورٹ کرے گا..... کیونکہ تم اس کی دوست ہو؟“ ایک لمبی خاموشی کے بعد غنی نے عجیب مذاق اڑانے والے انداز میں اسے سلگایا۔

”سپورٹ کا میں نے نہیں کہا اور نہ ہی مجھے اس کی سپورٹ کی ضرورت ہے..... لیکن دوست ہم اس جھگڑے کے بعد بھی رہ سکتے ہیں۔“

”خوش فہمی ہے تمہاری۔“ غنی نے اسی انداز میں کہا۔ آج پہلی بار شیردل کے لیے عکس کی یہ جانبداری اسے زہر لگی تھی۔

”انسانوں کے حوالے سے میں خوش فہمیاں رکھنے کی قائل نہیں ہوں۔ یہ کام ساری زندگی نہیں کیا تو اب کیا کروں گی۔“ وہ اسی اطمینان سے بولی۔

”مجھ سے کیوں اس کیس کی بات نہیں کی تم نے؟ میں آخری حد تک جا کر تمہاری مدد کرتا۔“ غنی نے یک دم بات بدلتے ہوئے کہا۔

”اپنے مسئلے انسان کو خود نمٹانے کی کوشش کرنی چاہیے۔“ وہ مسکرا دی۔

”مجھے جانتا ہے یہ سب۔“ غنی نے کچھ دیر خاموش رہتے ہوئے اس سے کہا۔ اس پوری گفتگو کے دوران میں پہلی بار اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزرا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے کہا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے غنی کو یہ بتانا چاہیے تھا یا نہیں کہ اس کی اور



جواد کی مگنی ختم ہو چکی تھی۔

”شیردل سے کہو وہ اس ایشو پر تمہاری مدد کرے لیکن اپنی زندگی کی اس اسٹیج پر بختیار شیردل کے خاندان سے کسی قسم کا جھگڑا مول مت لو۔“ عکس کو یقین نہیں آیا یہ مشورہ اسے غنی حمید دے رہا تھا۔ شیردل اور اس کے خاندان کا ازلی حریف۔ ”تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ شیردل کا خاندان اس مسئلے پر تمہیں کس حد تک تنگ کر سکتا ہے اور جواد اور اس کی فیملی کبھی تمہیں سپورٹ نہیں کرے گی۔ وہ تمہارے نانا کے ایک پرانے مسئلے کے لیے شیردل خاندان کی دشمنی کبھی مول نہیں لیں گے نہ ہی تمہیں لینے دیں گے۔“ وہ اس وقت ایک مخلص دوست کی طرح اور صرف دوست ہی بن کر اسے مشورہ دے رہا تھا۔ جواد کے خاندان کو وہ بھی شیردل کی طرح اچھی طرح جانتا تھا۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں..... پوری کوشش کروں گا کہ کہیں بھی تمہارے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو کم از کم پروفیشنل لیکن عکس یہ پاکستان ہے..... یہاں ایک عورت کو دھمکانے اور تنگ کرنے کے لیے بہت سے طریقے اور حربے ہیں۔ ابھی انکوائری اور شوکا ز نوٹس اختیارات کے غلط استعمال کے حوالے سے ہے۔ کل کو تمہاری character assassination بھی کی جاسکتی ہے یا کروائی جاسکتی ہے۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہمارے جیسے ملک میں اس کا عورت ہونا ہے اور مرد کی سب سے بڑی طاقت اس کا مرد ہونا..... یہ پیدائشی تفریق اور امتیاز ہے جو یہ معاشرہ کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ یہ تعلیم، کیریئر اور باقی ساری چیزیں مل کر بھی اس بیلنس آف پاور (طاقت کے توازن) کو عورت کے حق میں تبدیل نہیں کروا سکتیں..... تو انکل خیر دین کو کوئی ایسا کام مت کرنے دو جس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے۔ وہ انکل خیر دین کو کچھ نہیں کہیں گے، وہ جو بھی کہیں گے تمہیں کہیں گے۔ تمہیں پہنچنے والا نقصان تمہارے نانا کے پیرا کھاڑنے اور انہیں پچھاڑنے کے لیے کافی ہوگا..... اور میں تمہیں نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتا۔“ وہ خاموش بیٹھی بڑی سنجیدگی اور غور سے غنی حمید کی ایک بات سنتی رہی اور اس نے اعتراف کیا کہ اس نے غنی کو underestimate کیا تھا۔ وہ شیردل سے کمزور اور تعصب رکھنے کے باوجود اس معاملے پر بہت حقیقت پسند ہو کر اسے اپنی رائے دے رہا تھا۔

”غنی، جواد سے میری مگنی ختم ہو چکی ہے۔“ اس نے اس کی اس گفتگو کے جواب میں کہا۔ وہ کچھ دیر کے لیے بھونچکا رہ گیا۔

”کب؟..... کیوں؟“

”آٹھ دس دن پہلے۔ اس کی فیملی کچھ ناخوش تھی اس رشتے سے۔“ اس نے شیردل کے حوالے سے جواد کے الزامات غنی سے شیر نہیں کیے۔

”اس کی فیملی ناخوش تھی تو یہ مسئلہ تو رشتہ ہونے سے پہلے اٹھنا چاہیے تھا۔ اب شای کی تاریخ طے ہونے کے بعد۔“ وہ یک دم سے بے حد خفا ہو گیا۔ ”میں اپنے کچھ رشتے داروں کے ذریعے ان کو اپروچ کرتا ہوں۔ ہمارے کچھ رشتے داران کے قریبی فیملی فرینڈز میں سے ہیں۔“

”نہیں غنی، میں اب اس رشتے کو دوبارہ جوڑنا نہیں چاہتی جو بھی ہوا اچھا ہوا اور ٹھیک وقت پر ہو گیا اور مجھے کوئی افسوس نہیں ہے اس حوالے سے۔“ اس نے غنی کو روک دیا۔ وہ واقعی نہیں چاہتی تھی کہ غنی اس کے اور جواد کے درمیان کسی بیچ آپ کی کوشش کرے اور اسے جواد سے یا اس کی فیملی سے عکس اور شیردل کے افیئر کے حوالے سے منزہ کے الزامات کے بارے میں پتا چلے۔ جواد وہ رشتہ ختم نہ بھی کرتا تو جو کچھ اس نے جواد کے منہ سے اپنے اور شیردل کے حوالے سے سنا تھا، اس کے بعد وہ کبھی اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش مند نہ ہوتی۔ وہ ایک تنگ نظر سوچ اور ذہنیت کے ساتھ جانتے بوجھتے ہوئے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ ایشو صرف شیردل کا نہیں تھا، ایشو کسی بھی مرد کا ہو سکتا تھا، سو اس نے اگر ایک طرفہ الزامات پر اسے صفائی کا موقع دیے بغیر اس پر فرد جرم لگا دی تھی تو یہ سب کچھ دوبارہ بھی ہو سکتا تھا۔ بار بار ہو سکتا تھا خاص طور پر اس لیے کیونکہ وہ ورکنگ وومن تھی اور ایک ایسے کیریئر میں تھی جس میں مردوں سے میل جول اس کا روزمرہ کا معمول تھا..... اور خاص طور پر اس لیے بھی کہ جواد کی خواہش تھی وہ اپنی جاب کو شادی کے بعد بھی جاری رکھے۔ وہ زندگی میں بہت سے جھیلیوں سے نبرد آزما رہی تھی لیکن وہ کھلی آنکھوں کے ساتھ جانتے بوجھتے صرف شادی شدہ کا لیبل لگوانے کے لیے کسی جہنم میں نہیں کود سکتی تھی۔

”میں جواد کو اتنا کمزور نہیں سمجھتا تھا کہ گھر والوں کے کہنے میں آکر وہ اس طرح کا قدم اٹھا لے۔ اگر اتنا ہی کمزور تھا وہ تو پہلے کس طرح اپنی فیملی کو منایا تھا اس نے؟“ غنی حمید چند بار مل چکا تھا جواد سے..... اور اب وہ حیران تھا جواد اور اس کی فیملی کی طرف سے کیے جانے والے اس فیصلے پر۔

”جو بھی ہوا..... ہم دونوں کے لیے بہت اچھا ہوا۔ میں اسے اس بڑیک اپ کے لیے الزام نہیں دینا چاہتی۔“ عکس نے سنجیدگی سے کہا۔

”غنی..... یہ سارے حساب کتاب اس کیس کو شروع کرنے سے پہلے میں کر چکی تھی۔ میں عورت ہوں..... یہ معاشرہ میرے لیے کتنا تعصب رکھتا ہے اور میرے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے مجھے اس کا فرسٹ ہینڈ ایکسپیرینس ہے۔“ اس نے کافی کا آخری سپ لیتے ہوئے کہا۔ ”اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ معاشرہ میرے لیے اپنے اصول اور ضابطے اور روایات نہیں بدلے گا لیکن میں پھر بھی انصاف کے لیے آواز اٹھاؤں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ میں کیس ہار جاؤں گی۔ یہ ہوگا کہ مجھے کیریئر میں نقصان پہنچے گا۔ جاب سے ہٹانا آسان نہیں ہے لیکن وہ مجھے OSD بنا دیں گے اور ایک لمبے عرصے تک مجھے پوسٹنگ ہی نہیں ملے گی۔ میرے بیچ میٹس کہیں کے کہیں پہنچ جائیں گے اور میں کہیں بھی نہیں..... کیریئر assassination کریں گے..... الزامات لگائیں گے..... میں ایک مشکوک کردار والی آفیسر کہلائی جاؤں گی..... بس..... اس سے بڑھ کر کیا ہوگا؟“ وہ بے حد سنجیدگی سے غنی سے پوچھ رہی تھی۔

سامنے دروازے کی طرف بھاگی۔ اس کی آواز پر شیردل نے بھی ان دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور اس نے بہت دور سے مثال کے لیے اپنے بازو پھیلا دیے تھے۔ شہر بانو نے اس سے نظریں نہیں ملائی تھیں۔ اس نے اپنی نظر کسی اور طرف کر لی۔ بختیار شیردل کے عملے کا ایک شخص امیگریشن کاؤنٹر پر پہلے ہی ان دونوں کی انٹری کروا کر ان دونوں کا بیج وصول کر کے ٹرائی میں سامان لیے ان کے ساتھ تھا۔ شہر بانو نے واپسی کی اطلاع اور فلائٹ کے ٹائم کے بارے میں صرف منزہ ہی کو بتایا تھا اور اسے یہ توقع نہیں تھی کہ ائرپورٹ پر شیردل اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہوگا۔ وہ فی الحال اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ایک عجیب سے رنج اور غصے نے ایک بار پھر اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ جب تک لاؤنج سے باہر آئی۔ مثال شیردل کی گود میں چڑھی ہوئی اس کی گردن کے گرد بازو ڈالے اس سے باتوں میں مصروف تھی۔ شیردل، مثال سے باتیں کرنے کے ساتھ ہمیشہ کی طرح اس کا چہرہ چوم رہا تھا لیکن ساتھ وقفے وقفے سے وہ دور سے آنے والی شہر بانو کے قریب آجانے کا بھی منتظر تھا۔ جسے اس نے ائرپورٹ کی Exit تک پہنچتے پہنچتے سن گلاسز پرس سے نکال کر آنکھوں پر چڑھاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ واضح طور پر اس سے eye contact سے بچنا چاہتی تھی۔ شیردل سے سن گلاسز کے بغیر نظر نہ ملانا تو آسان تھا لیکن آنکھوں میں اندتی نمی کو روک لینا بہت مشکل۔ وہ چلتے ہوئے بالآخر اس کے قریب آگئی۔ شیردل نے ہمیشہ کی طرح ایک بازو پر مثال کو اٹھائے ایک بازو خیر مقدمی انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف پھیلا یا تھا۔ اس کے پھیلے ہوئے بازو کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے یک دم اپنے عقب میں آتے پروٹوکول والے اس اہلکار سے اس سامان کے حوالے سے کچھ کہا اور چند منٹوں تک وہ وہاں کھڑی اس سے بات کرتی رہی۔ شیردل کو اندازہ ہو گیا تھا وہ کس موڈ میں تھی۔ اس کے ساتھ کھڑے اس کے ڈرائیور اور عملے کے ایک دوسرے شخص نے پروٹوکول اہلکار سے وہ سامان لے لیا تھا اور پارکنگ کی طرف جانے لگے۔ شہر بانو بھی اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے ان کے پیچھے چل پڑی۔

”فلائیٹ کیسی تھی؟“ مثال کو اٹھائے اس کے ساتھ چلتے ہوئے شیردل نے اس کے موڈ کو بحال کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

”ٹھیک تھی۔“ سرد مہری سے جواب آیا۔

”مثال نے تنگ تو نہیں کیا؟“ شیردل نے گفتگو کے سلسلے کو ایک اور سوال سے جوڑے رکھنے کی کوشش کی۔

”نہیں۔“ لہجے کی خنکی برقرار تھی۔ شیردل اس سے بات کرنے کی ایک اور کوشش کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی مثال نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

گاڑی سے گھر تک کے سفر میں دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ شیردل، مثال سے باتیں کرتا رہا۔ ڈرائیور اور گارڈ کی موجودگی میں وہ نہیں چاہتا تھا ان کے درمیان کسی قسم کا آرگومنٹ

”میں نے اور میرے نانا نے زندگی میں ہر چیز کے لیے بہت جدوجہد کی تھی۔ جدوجہد کا لفظ میرے لیے نیا نہیں ہے اور نہ ہی مجھے جدوجہد کرنے سے خوف آتا ہے۔ جنگ میں بھی ہر سپاہی کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ وہی جنگ جیتیں گے۔ صرف امید ہوتی ہے کہ وہ اگر پوری طاقت سے لڑیں تو جنگ جیت سکتے ہیں۔ میں بھی اسی امید کے ساتھ یہ کیس لڑ رہی ہوں۔“ وہ بول رہی تھی اور وہ اس کی بات کاٹے بغیر سن رہا تھا۔

”میں عورت ہوں اور میں کیا کر سکتی ہوں اور کیا نہیں، یہ معاشرہ اور مرد تھوڑی طے کریں گے میرے لیے۔ یہ تو میں طے کروں گی کہ میں کیا کر سکتی ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیے اور جب ایک دفعہ ایک عورت ایک ناممکن کام بھی کر لے گی تو پھر معاشرہ اور مرد نہ بھی بدلے۔ وہ سوچے گا ضرور۔ میں بس اتنا سافرق چاہتی ہوں اس معاشرے میں۔ اور اتنا سنا تو لا ہی سکتی ہوں۔ پہلا آدمی جو ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے نکلا تھا، اسے لوگوں نے پاگل کہا تھا۔ آج اس کا نام تاریخ کا حصہ ہے۔ انصاف کے لیے جدوجہد کرنا ”انسان“ کا حق ہے صرف ”مرد“ کا حق نہیں ہے۔ اور میں ایک انسان ہوں۔ اور ایک انسان کے طور پر اپنے حق کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے میں ہر طرح کے چیلنجز کا سامنا کرنے کو تیار ہوں۔“ غنی حمید نے اس عورت کو عجیب مرعوب مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا تھا وہ اس عورت کا احترام کرنے پر ایسے ہی مجبور نہیں ہو گیا تھا۔ اس نے کبھی ”نسوانیت“ کو اتنا ”نڈر“ نہیں دیکھا تھا۔ غیر متزلزل لہجے میں بڑی نرم آواز میں کہی گئی دو ٹوک بات۔ وہ اکیڈمی میں اپنے اسی انداز اور لب و لہجے کے لیے پہچانی جاتی تھی۔ اپنے اسی انداز سے کشتوں کے پتے لگاتی تھی۔ Come what may۔۔۔۔۔ والی بے جگری جو بہت سے مردوں میں بھی ناہید تھی۔

”As expected۔۔۔۔۔“ وہ مسکرا کر گہری سانس لیتے ہوئے بالآخر اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”مجھے پتا تھا تم سے میں یہی کچھ سننے والا ہوں Aks Murad اس نے اسے داد دی تھی۔ وہ مسکرا دی۔

”میں دیکھوں گا، کیا کر سکتا ہوں تمہارے لیے اس سلسلے میں۔“

”اس کی ضرورت نہیں پڑے گی غنی۔۔۔۔۔ میں اپنا ہوم ورک بہت اچھی طرح کر چکی ہوں اور میں اس کیس کو میرٹ پر جیتنا چاہتی ہوں تعلقات کے ذریعے نہیں۔۔۔۔۔“ عکس نے اسے دو ٹوک انداز میں کہا۔

☆☆☆

مثال نے شیردل کو بہت دور سے دیکھ لیا تھا۔ شہر بانو کے دیکھنے سے بھی پہلے۔۔۔۔۔ وہ اریول لاؤنج کے دروازے کے بالکل سامنے کھڑا تھا اور ان کا منتظر تھا۔ مثال یک دم بے حد خوشی کے عالم میں شہر بانو کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر پاپا، پاپا کہتے ائرپورٹ کی اندرونی عمارت کے



رہا تھا۔ وہ اس کا کندھا تھپتھپانے کے بعد خود سوئی ہوئی مثال کو کندھے سے لگائے ہوئے گاڑی سے نکل گیا۔ شہر بانو کچھ دیر کے لیے اسی طرح پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ وہ اس کا گھر تھا نہ اس کے اندر داخل ہونے والا شخص اس کا وہ شوہر جس پر وہ کبھی جان چھڑکتی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔ وہ عجیب دل گرفتگی سے بوجھل وجود کے ساتھ نیچے اتر آئی۔

شیردل بیڈروم میں نہیں تھا۔ وہ یقیناً مثال کے بیڈروم میں اس کے پاس تھا۔ شہر بانو کمرے میں داخل ہوتے ہی کپڑے تبدیل کیے بغیر بیڈ پر جا کر لیٹ گئی تھی۔ شیردل جب تک بیڈروم میں آیا وہ گہری نیند میں تھی..... ہمیشہ کی طرح بیڈ کے ایک کونے میں کسی ننھے بچے کی طرح سکڑی سمٹی ہوئی..... شیردل نے کمبل کھول کر اس پر پھیلا دیا پھر وہ بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر آئے ہوئے بالوں کو اس نے غیر محسوس انداز میں بہت آہستگی سے چہرے سے ہٹا دیا تھا۔ وہ نیند میں تھی لیکن اس حالت میں بھی تھکن اور اسٹریس اس کے چہرے پر چھلک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آرہے تھے۔ وہ بہت دیر تک اس کے قریب بیٹھا یہ طے کرتا رہا کہ اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو میں اسے کیا کہنا تھا۔ منزہ نے اپنے غصے اور جوش میں اسے بے حد مشکل میں پھنسا دیا تھا۔

☆☆☆

شہر بانو کی آنکھ کھلی تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ بیڈروم میں اندھیرا تھا۔ اس نے سائنڈ ٹیبل لیپ جلا کر گھڑی دیکھی پھر برابر والے بیڈ پر دیکھا، وہ خالی تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سات آٹھ گھنٹے سو لینے کے بعد بھی اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی لیکن اس کا سر بوجھل ہو رہا تھا اور اسے بھوک لگ رہی تھی۔ کپڑے تبدیل کرنے اور چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد وہ کچن میں آگئی۔ انٹرکام کے ذریعے کسی ملازم کو بلانے کے بجائے وہ ایک ہلکا سینڈوچ اور کافی تیار کر کے واپس بیڈروم میں لے آئی اور تب اس کا سامنا شیردل سے ہوا۔ وہ واش روم سے نائٹ سوٹ پہن کر نکلا تھا۔

”فریج میں کھانا تھا، تم ملازم کو کہتیں وہ کھانا لگا دیتا۔“ اس نے شہر بانو کے ہاتھوں میں سینڈوچ اور کافی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ جواب دینے کے بجائے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ شیردل نے بیڈ سائنڈ ٹیبل سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا اور چند لمحے کھڑے کھڑے چینل سرفنگ کرتا رہا۔ وہ شہر بانو کو دانستہ موقع دے رہا تھا کہ وہ اپنا سینڈوچ ختم کر چکی تھی۔ ٹی وی آف کرتے ہوئے ریموٹ واپس سائنڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ صوفے پر اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ وہ کافی کے سب لے رہی تھی۔

”تم کب تک ناراض رہنے کا ارادہ رکھتی ہو؟“ اس نے بڑی نرمی سے صلح جو انداز میں کہا۔

”عکس نے بابا کے خلاف کیوں کیس کیا ہے؟“ اس کے سوال کا جو جواب آیا تھا اس نے شیردل کو چند لمحوں کے لیے خاموش کر دیا تھا۔ وہ شہر بانو سے اتنے سیدھے سوال کی توقع نہیں کر رہا تھا چند لمحے جیسے وہ کچھ سوچتے ہوئے وہ لفظ ڈھونڈتا رہا جس میں وہ شہر بانو کو کچھ مناسب جواب دے سکے۔

”انگل شہباز اور اس کے نانا کے درمیان کچھ مسئلہ ہوا تھا۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ شاید

ہو۔ نہ ہی وہ شہر بانو کی سردمہری اور بگڑا ہوا موڈ ملازمین کے نوٹس میں لانا چاہتا تھا۔

وہ پہلا سفر تھا جس سے واپسی پر شہر بانو کو بالکل خوشی نہیں ہوئی تھی۔ وہ انٹرپورٹ سے GOR تک کے سفر میں باہر جھانکتی مسلسل ڈریسڈ رہی۔ شیردل اور مثال کے درمیان ہونے والی کسی گفتگو پر اس نے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ صرف کھڑکی سے باہر آس پاس کے ٹریفک کو دیکھتی رہی۔ شیردل، مثال سے باتوں کے دوران وقفے وقفے سے اس کو دیکھتا اور الجھتا رہا۔ ان کی شادی شدہ زندگی میں یہ پہلا بڑا کرائس آ یا تھا ورنہ اس سے پہلے شہر بانو کی خفگی کو اس نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ وہ منٹوں میں نہیں تو گھنٹوں میں مان جاتی تھی۔ کبھی اتنے دن نہیں گزرے تھے ان کی بات چیت ختم ہوئے..... اور اب اسے اپنے سامنے اس طرح کے موڈ میں دیکھ کر شیردل کو صورت حال کی سنگینی کا صحیح معنوں میں احساس ہوا تھا لیکن اچھی بات یہ تھی کہ وہ بہر حال پاکستان آچکی تھی اور وہ اس کو سامنے بٹھا کر اس سے بات کر سکتا تھا۔

دوپہر کا کھانا انہوں نے منزہ کے ساتھ کھایا تھا..... منزہ اور شہر بانو کے درمیان رسمی بات چیت کے سوا اور کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ شہر بانو کو منزہ بہت بھیجی بھیجی لگی تھی۔ اس کے اور شیردل کے درمیان موجود خاموشی کو بھی اس نے نوٹس کیا تھا۔ وہ منتظر تھی کہ کھانے کی میز پر شیردل کے سامنے نہیں تو کھانے کے بعد وہ اس سے کچھ بات چیت کرنے کی کوشش کرے گی۔ اسے صورت حال میں ہونے والی کسی نئی تبدیلی کے بارے میں آگاہ کرے گی لیکن منزہ نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

کھانے کے کچھ دیر بعد شیردل نے واپسی کا اعلان کر دیا تھا۔ شہر بانو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ وہ لوگ سہ پہر کو ہی گھر پہنچ گئے تھے۔ مثال راستے میں ہی شیردل کی گود میں سو گئی تھی اور شہر بانو بھی اتنی تھکی ہوئی تھی کہ وہ بھی گاڑی کی پشت سے ٹیک لگائے کھڑکی سے تقریباً چپکی ہوئی سو گئی تھی۔ شیردل نیند کی حالت میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ وہ سفر کے دوران اس کے ساتھ لگ کر سونے کے بجائے گاڑی کی سیٹ اور دروازے کے ساتھ ٹک کر سوئی تھی۔ شیردل اسے ہمیشہ کی طرح اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اپنے ساتھ لپٹا لینا چاہتا تھا۔ سڑک پر آنے والے ہر گڑھے کے دھچکے پر وہ بے اختیار شہر بانو کو دیکھتا تھا یوں جیسے اسے خدشہ ہو کہ اس کا سر دروازے سے زیادہ زور سے نہ ٹکرا جائے۔ وہ کئی دفعہ ان دھچکوں سے جاگتی رہی لیکن پھر سو جاتی۔ پتا نہیں وہ پورے راستے کون کون سی چیزیں خواب میں دیکھتی رہی تھی۔ سمندر کے زیر آب مچھلیاں اور عجیب عجیب سے پودے اور جانور..... عجیب شکل کے گھونگھے اور سپیاں..... وہ زیر آب پانی میں تیر نہیں رہی تھی قدم اٹھاتے ہوئے چل رہی تھی جیسے وہ چہل قدمی کر رہی ہو اور پھر اس نے سمندر کی تہ میں بہت سے حصوں والا اور رنگوں والا ایک عجیب و غریب آکٹوپس دیکھا جو بالکل ساکت تھا۔ وہ اس کے قریب چلتی گئی..... اور قریب..... پھر اس نے آکٹوپس کے سر پر موجود ایک آنکھ کو یک دم کھلتے دیکھا۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

”شبی گھر آ گیا ہے۔“ گاڑی ان کے پورچ میں کھڑی تھی اور شیردل اس کے کندھے کو تھپک

انکل شہباز نے اس کے نانا کو غلط سزا دی تھی کسی کو بھی جاب سے اس طرح نکالا نہیں جاسکتا جس طرح انہوں نے عکس کے نانا کو نکالا تھا۔ وہ اس punishment کو چیلنج کر رہی ہے اور اسے revoke کروانا چاہتی ہے۔“ اس نے بڑے بڑے تالے الفاظ میں شہربانو کو سمجھایا۔ وہ شہربانو کو خیر دین کے ساتھ ہونے والے اصل ظلم کی تفصیلات نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ منزہ نہیں تھی جسے یہ سب جتنا اور بتانا ضروری تھا۔

”اتنے سالوں بعد اسے یہ سب کیوں یاد آیا ہے؟“ وہ بے حد عجیب لہجے میں اس سے پوچھ رہی تھی۔

”کوئی کبھی بھی اپنی چیز کو کلیم کر سکتا ہے۔ اپنے ساتھ ہونے والی بے انصافی پر آواز اٹھا سکتا ہے۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ اس نے یہ وقت کیوں chose کیا ہے۔“ شیردل نے ایک بار پھر بڑے بڑے تالے لفظوں میں اس سے کہا۔

”پاپا کبھی کوئی غلط کام نہیں کر سکتے۔“ اس کی بات کے جواب میں شہربانو نے کافی کامگ سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے مستحکم اور دو ٹوک انداز میں کہا۔ شیردل خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ یہ جملہ نہ بھی بولتی وہ تب بھی جانتا تھا کہ وہ شہباز سے کس طرح کی وابستگی رکھتی تھی۔ اسے اس سے اسی طرح کے جملوں کی توقع تھی۔ ”میں کبھی یہ نہیں مان سکتی کہ انہوں نے کسی کے ساتھ کوئی نا انصافی کی ہوگی۔ انہوں نے جو بھی کیا ٹھیک کیا ہوگا۔“ اس نے اپنا جملہ مکمل کیا تو شیردل نے کہا۔

”ہر انسان غلطی کر سکتا ہے۔ error of judgement ہر ایک سے ہو سکتا ہے اور شہباز انکل بھی ایک انسان تھے۔“ شہربانو اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس کے چہرے پر ایک عجیب سی تلخ مسکراہٹ آئی۔

”اور تمہاری غلطی کیا ہے“ مجھ سے شادی؟“ شیردل ایک بار پھر اس کی بات کے جواب میں فوری طور پر نہیں بول سکا۔

”ایک بات بتاؤ شیردل..... تم عکس سے محبت کرتے ہو؟..... اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“



خیر دین لاٹھی کے سہارے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں بیٹھے مرد اور عورت میں سے مرد کھڑا ہو گیا تھا لیکن یہ صوفے پر بیٹھی ہوئی عورت تھی جس کے چہرے نے خیر دین کو فریز کیا تھا۔ اتنے سالوں کے بعد بھی اسے دقت نہیں ہوئی تھی اس عورت کو پہچاننے میں۔ وہ مصافحہ کرنے والے اس شخص کو ایک شیردل کے والد کے طور پر پہچانتا تھا اور اس کے ساتھ موجود وہ عورت اگر بختیار شیردل کی بیوی تھی تو پھر ایک شیردل..... وہ آگے کچھ نہیں سوچ سکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا آ گیا تھا۔

(باقی آئندہ)

## عکس

اس آئینے نے کئی سال پہلے کی طرح آج بھی شہر بانو کی نظر کو خود سے ہٹنے نہیں دیا..... گزر جانے نہیں دیا۔ وہ آئینے کے سامنے رک گئی، وقت نے اس آئینے پر اپنے نشانات بڑھادیے تھے..... ہلکی سی بوسیدگی، چند داغ، کئی نئی لکیریں، آب و تاب کھوئی ہوئی چمک، بجھی ہوئی رنگت..... وقت نے ایسے ہی بہت سے نشانات اس کے اپنے وجود اور اس چہرے پر بھی چھوڑے تھے جس کا عکس آئینے میں دیکھنے پر شناخت کرتے ہوئے اسے چند لمحے لگے تھے۔ وہ آئینے میں خود کو دن میں کئی بار دیکھتی تھی..... لیکن اس آئینے میں نظر آنے والا عکس اس نے کئی سال بعد دیکھا تھا..... ایک نظر اس نے خود کو دیکھا پھر اپنے عقب میں نمودار ہونے والے مرد کو..... شیردل کو..... آئینے میں دونوں کی نظریں لمحے بھر کے لیے ایک دوسرے سے ملی تھیں پھر دونوں نے ہی ایک دوسرے سے نظریں چڑالیں۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے ایک دوسرے سے اسی طرح نظریں چڑانے ہوئے ہی پھر رہے تھے۔ آئینے میں ایک لمحے کے لیے جیسے ان کی زندگی جھلکی تھی..... وہ زندگی جو وہ ایک دوسرے کے ساتھ گزار رہے تھے..... کئی سال سے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ..... اور ایک دوسرے سے کئی صدیوں کے فاصلے پر..... ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار..... اور اس محبت کو کائی کی طرح اپنے وجود سے نوجتے ہوئے۔

شیردل اس کے پاس سے گزر کر کھلے ہوئے اندرونی دروازے سے اندر چلا گیا تھا۔ شہر بانو نے سر اٹھا کر ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ایک بار پھر اس آئینے کو اور اس گھر کو دیکھا۔ زندگی میں اس گھر سے زیادہ نفرت اسے کبھی کسی دوسری جگہ سے نہیں ہوئی تھی..... نفرت شاید ایک بہت معمولی لفظ تھا اپنے ان احساسات کو بیان کرنے کے لیے جو وہ اس گھر کے لیے رکھتی تھی..... وہاں کی ایک ایک چیز کے لیے رکھتی تھی..... اگر کوئی اسے کبھی کہتا کہ دنیا میں وہ کون سی ایک جگہ تھی جسے وہ آگ لگا کر بھسم کر دینا چاہتی تھی تو شہر بانو اس گھر کا نام میتی..... اور اس تمام نفرت کے باوجود شہر بانو وہاں آنے اور وہاں رہنے پر مجبور تھی۔ کیونکہ وہ اس گھر کی ملکہ تھی۔



بختیار شیردل نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک لغافہ نکالا اور اسے خیر دین کے سامنے بڑی سینئر ٹیبل پر رکھ دیا۔ چند لمحوں کے لیے بات کا آغاز کرنے کے لیے لفظ ڈھونڈتے ہوئے انہیں بھی دانتوں پسینے آگئے تھے۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی کے پاس معذرت کرنے کے لیے پہنچے تھے اور جس چیز کی معذرت وہ کرنا چاہتے تھے اس کا ذکر بھی زبان پر لاتے ہوئے وہ منوں بوجھ کے نیچے دب رہے تھے۔ وہ طبقاتی فرق پر یقین رکھتے تھے لیکن بے ضمیری پر نہیں۔ ان کے برابر میں بیٹھی ہوئی منزہ نے ایک بار بھی خیر دین کی طرف نہیں دیکھا تھا وہ بس بے تاثر چہرے کے ساتھ نظریں جھکائے اپنی کلائی میں موجود روکس گھڑی پر انگلیاں پھیرتی رہی۔ بختیار شیردل کو اسے خیر دین کے پاس معذرت کے لیے چلنے پر تیار کرنے کے لیے زندگی میں پہلی بار بہت سخت لفظوں کا استعمال کرنا پڑا تھا اور ان لفظوں نے منزہ کی خفگی کو جیسے بڑھادیا تھا۔ شوہر کے غصے نے انہیں ہتھیار ڈالنے اور ان کی بات ماننے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ دل میں موجود کدورت کو ختم نہیں کر سکی تھی۔ بختیار شیردل جیسے ایک چور کو اس گھر میں اس مالک کے سامنے لے آئے تھے جس کے گھر میں ڈاکا ڈالا گیا تھا۔

”آپ کچھ لیں گے؟“ غیر متوقع طور پر گفتگو کا آغاز خیر دین نے کیا تھا۔ وہ شاید ان کی مشکل بھانپ گیا تھا۔

”نہیں کچھ نہیں..... thank you“۔ بختیار نے بڑی شائستگی کے ساتھ انکار کیا۔ خیر دین نے ان کے

انکار کے باوجود کارز ٹیبل پر پڑا انفرکام کار سیور اٹھا کر ملازم سے چائے کے لیے کہا اور پھر سیور رکھ دیا۔ ہنگ کی کوئی انتہا تھی جو منزہ اس وقت وہاں خیر دین کے سامنے بیٹھے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ وہ اسی گھر میں ایک مہینہ اس کی

کے چہرے سے نظریں ہٹائیں۔ شکست اس کے غصے کو عجیب طرح سے بھڑکانے لگی تھی۔  
”احتمقانہ باتوں اور سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے میرے پاس۔“ شیردل نے بالآخر جیسے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔

”احتمقانہ؟“ وہ نکی سے ہنس پڑی۔ ”شیردل تم اپنے دل سے پوچھو کہ تمہیں یہ سوال احتمقانہ لگا ہے؟“ اس نے عجیب چیلنج کرنے والے انداز میں اس سے کہا۔

”ہاں مجھے لگا ہے۔ اسی لیے کہا ہے تم سے۔“ شیردل نے بڑی فحاشی کے ساتھ اس سے کہا۔ ”ہم کیس کو ڈسکس کر رہے تھے۔ میرے اور عکس کے حوالے سے کوئی ڈسکشن نہیں ہو رہی تھی۔“

”یہ کیس تمہاری وجہ سے شروع ہوا ہے۔ تمہارے اور عکس کے اس تعلق کی وجہ سے شروع ہوا ہے جس پر تم بیعت نہیں کرنا چاہتے۔ اس ساری کہانی میں یہ تیسرا ایٹکل نہ ہوتا تو یہ کیس بھی کورٹ میں نہ ہوتا۔“ شہر بانو نے بے حد نکی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”شعی اس کیس کو تم بھول جاؤ تم اس میں فریق نہیں ہو۔ تم اس کی تفصیلات نہیں جانتیں۔۔۔۔۔ تم حقائق نہیں جانتیں۔۔۔۔۔ اس لیے تم سے کہہ رہا ہوں تم اس سارے معاملے سے الگ رہو۔“ شیردل نے اس کی بات کے جواب میں بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”میں الگ رہوں۔۔۔۔۔؟ میرے باپ کے خلاف ہے یہ کیس۔۔۔۔۔ میں کیسے الگ رہ سکتی ہوں۔“ وہ شیردل کی بات پر جیسے کچھ اور طیش میں آ گئی۔ ”وہ پاپا کو بدنام کرنا چاہتی ہے اور تم اس کا ساتھ دے رہے ہو اور میں اس سارے معاملے سے الگ رہوں کیونکہ تم کیس میں فریق ہو۔۔۔۔۔ میں نہیں۔۔۔۔۔ اور تم اس لیے فریق بنائے گئے ہو کیونکہ وہ جانتی ہے تم اس کو سپورٹ کرو گے۔۔۔۔۔ تم یہ کیس plead نہیں کرو گے۔۔۔۔۔ And she will walk away with the cake۔“ وہ بے حد تحش میں بول رہی تھی۔ ”اسے مجھے پارٹی بنانا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ میں شہباز حسین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ تم تو صرف بھانجے ہو۔“

”اس نے اگر تمہیں یا میری کو فریق بنانے کے بجائے مجھے فریق بنایا ہے تو یہ اس کی favour ہے۔ تم کو اندازہ ہی نہیں ہے پاکستان کے کورٹ سسٹم کا۔۔۔۔۔ تمہیں اگر پیشیاں بھگتانی پڑیں اور گواہوں اور شہوتوں کا انتظام کرنا پڑتا تو تمہاری عقل دو دن میں ٹھکانے آ جاتی وہ بھی اس صورت میں جب یہ کیس 26 سال پرانا ہے۔“ شیردل نے بنا لحاظ اسے کہا تھا۔ شہر بانو اس کی بات پر نکی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں پاپا کے لیے کچھ بھی کرتی۔ کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“ شیردل ذرا سا اس کی طرف جھکا اور اس نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔

”اب تم سمجھ سکتی ہو وہ کیوں 26 سال بعد بھی اپنے نانا کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔ صرف تم ہی تو محبت نہیں کرتیں اپنے پاپا سے۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ بھی اتنی ہی محبت کرتی ہو۔“ شہر بانو کچھ دیر کے لیے بول نہیں سکی تھی اور پھر جب وہ لفظ ڈھونڈ پائی تو وہ بری طرح اشتعال میں تھی۔

”تم اس سارے معاملے میں کس کے ساتھ کھڑے ہو؟ کس کو سپورٹ کر رہے ہو؟“ اس بار چپ ہونے کی باری شیردل کی تھی۔ سامنے پڑی نیبل پر سگریٹ کی ڈبیا سے سگریٹ نکال کر سگاتے ہوئے اس نے شہر بانو سے کہا۔ ”یہ میرا dilemma (دہری مشکل) ہے کہ میں کس کو سپورٹ کروں۔“ شہر بانو کو اس کے جملے سے زیادہ اس الجھن نے تکلیف دی جس کے ساتھ وہ یہ بات کہہ رہا تھا۔

”تمہارے لیے عکس مجھ سے زیادہ Important ہے؟“ وہ سوال کرتے ہوئے اس کی آواز میں آ جانے

اور اس کے بچوں کی خدمت کرتا رہا تھا۔ اس کے کپڑوں کو استری کرنے سے لے کر اس کے جوتے صاف کرنے تک۔۔۔۔۔ صبح اس کو بینڈی پہنچانے سے لے کر آدھی رات کو کسی بھی وقت طلب کیے جانے پر حاضر ہو جانے تک۔۔۔۔۔ اور اس کی کبھی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کے سامنے بیٹھ سکے۔۔۔۔۔ وہ ہاتھ باندھ کر آتا تھا، ہاتھ باندھ کر کھڑا رہتا تھا اور اسی طرح ہاتھ باندھے سر جھکائے چلا جایا کرتا تھا اور اب وہ ان کے لیے اس گھر کے اس صوفے پر بیٹھ کر چائے آرڈر کر رہا تھا جہاں پر میزبان بیٹھا کرتا تھا اور اب وہ ان کے ساتھ انہی برتنوں میں چائے پیے گا جن برتنوں میں وہ پچیس گے اور یہ سب اس کے اس حق شوہر کی وجہ سے ہو رہا تھا جو 21 گریڈ کا ایک سیکریٹری ہوتے ہوئے 18 گریڈ کی ایک ڈپٹی کمشنر کے گھر اپنے ضمیر کی چھین مٹانے آیا تھا۔

”idiot“ اس نے دل ہی دل میں اپنے شوہر کو کوسا۔ وہاں خیر دین کے برابر بیٹھنا منرہ کے لیے جیسے کوئلوں کی انگیٹھی پر بیٹھنے کے برابر تھا۔ اتنے سال اپنے بھائی کی جس عزت کو بچانے کے لیے وہ کامیاب جدوجہد کرتی آرہی تھی وہ آج بچ چورا ہے نیلام ہونے چلی تھی اور اس کا سارا کریڈٹ اس کے ”باضمیر“ شوہر اور الو کے پٹھے بیٹے کو جاتا تھا۔

”میں اپنی فیملی کی طرف سے شہباز حسین سے ہونے والی ساری غلطیوں کے لیے معذرت کرنے آیا ہوں۔“ بختیار نے بالآخر گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”شہباز اب اس دنیا میں نہیں ہے ورنہ میں اسے ساتھ لے کر آپ کے پاس آتا۔ اس نے جو کچھ بھی آپ کے اور آپ کی نواسی کے ساتھ کیا وہ کسی بھی لحاظ سے کسی اچھے انسان کا رویہ نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے طرز عمل کے لیے آپ سے کتنا شرمندہ ہوں آپ کو اندازہ بھی نہیں ہے۔“ آنسو خیر دین کی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح ایک لمحے میں اند آئے تھے۔ اسے بختیار شیردل سے اتنے کھلے لفظوں میں اس گفتگو کی امید نہیں تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آج کی ملاقات کس لیے ہو رہی تھی۔ ایک شیردل کے والدین اگر اس سے ملنے آرہے تھے تو کس لیے آرہے تھے۔۔۔۔۔ اس نے بہت سے اندازے لگانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے کسی اندازے میں شہباز حسین نہیں آیا تھا اور اب اتنے سالوں بعد منرہ کو دیکھنے پر اور بختیار کے منہ سے اسی قصے کا ذکر سننے پر وہ جیسے بُری طرح دل گرفتہ ہوا تھا۔ وہ بختیار شیردل سے اکیڈمی کی پاسنگ آؤٹ کی تقریب کے بعد بھی دو تین سرکاری فنکشنز میں ایک شیردل کے ساتھ مل چکا تھا لیکن وہ منرہ سے پہلی بار مل رہا تھا۔ بختیار کی گفتگو سننے ہوئے اس کا ذہن ابھی بھی یہ ماننے پر تیار نہیں ہو رہا تھا کہ چڑیا اس سے ایک شیردل کے بارے میں اتنا بڑا راز چھپا سکتی تھی۔۔۔۔۔ کیا وہ بھی اسی کی طرح اس خاندان کی شناخت سے بے خبر تھی؟ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور بھی بختیار نے اس کیس کا ذکر شروع کر دیا۔ خیر دین کو کرنٹ لگا تھا تو اس کا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہوا تھا وہ جانتی تھی ایک شیردل کون تھا اور اس نے پھر بھی خیر دین کو کبھی اس کے بارے میں نہیں بتایا۔۔۔۔۔ کیوں؟ خیر دین کو زندگی میں پہلی بار اپنی چڑیا سے جگہ ہوا تھا۔

☆☆☆

شیردل اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ وہ شہر بانو سے ان دو سوالوں کی ان الفاظ میں توقع نہیں کر رہا تھا۔ نہ وہ عکس کا ذکر اس انداز میں سننے کی امید رکھے ہوئے تھا۔

شہر بانو کو اس کی اس خاموشی سے خنجر کی کاٹ جیسی تکلیف ہوئی جو ان دو سوالوں کے جواب میں اسے شیردل سے ملی تھی۔ سارے خدشات، ساری بدگمانیوں، سارے گلے شکوؤں کے باوجود بھی کہیں نہ کہیں اسے بھی جیسے ایک عجیب سی امید تھی کہ وہ بے ساختہ انکار کرے گا، تردید کرے گا۔۔۔۔۔ اس نے ایسا تو کچھ نہیں پوچھا تھا اس سے کہ اس کے سامنے کھائی آ جاتی۔ شیردل کی خاموشی نے اس کے اندر کے شور کو یک دم اور بڑھا دیا تھا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جواب اتنا مشکل ہے تمہارے لیے۔“ شہر بانو نے عجیب شکست خوردگی کے ساتھ اس

”وہ suspend ہو چکی ہے اور اس کے باوجود وہ اتنی طاقتور ہے کہ تم اور پاپا اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے؟“ شہر بانو نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”وہ suspend تھی لیکن اب بحال ہو چکی ہے۔“ وہ شیردل کی اطلاع پر جیسے چونک گئی تھی۔  
”کیسے بحال ہو گئی؟ پاپا نے اسے suspend کروایا تھا پھر وہ کیسے بحال ہو گئی؟“ اس بار اس کی بات پر شیردل چونکا تھا۔

”تمہیں کس نے بتایا کہ پاپا نے اسے suspend کروایا تھا؟“

”مٹی نے بتایا تھا مجھے امریکا میں۔“ شہر بانو نے جوابا کہا۔

”اور یہ تمہارے مشورے پر ہوا ہوگا۔“ شیردل نے بے حد چستے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔ وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی پھر اس نے کہا۔

”ہاں میں نے مٹی سے کہا تھا۔“

”تو اب وہ دوبارہ آچکی ہے۔“ شیردل نے اسی برہمی سے کہا۔

”اور یہ تمہاری کوششوں سے ہوا ہوگا۔“ شہر بانو نے مٹی سے کہا۔

”شعی تم اپنے ذہن سے یہ بات نکال دو کہ مجھے عکس کے کام نشتانے کے علاوہ دنیا میں اور کوئی کام نہیں ہے اور اس کا ہر کام میری مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔“ وہ اس بار شہر بانو کی بات پر جھنجھلا یا تھا۔ شہر بانو پر اس کی خفگی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”اگر پاپا نے اسے suspend کروایا ہے اور وہ چند ہفتے بھی suspend نہیں رہ سکی اور دوبارہ اپنی پوسٹ پر واپس آگئی ہے تو یہ تمہاری مدد کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے؟..... یا وہ تم سے اور پاپا سے زیادہ powerful ہے؟“

”شعی یہ سوال تم پاپا سے کرنا مجھ سے نہیں۔“ شیردل نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ”اور شعی تم ایک بات اپنے دماغ سے نکال دو کہ اس طرح powers کا استعمال کر کے کوئی فائدہ ہوگا۔ پاپا یا میں اس کو ساری عمر suspend نہیں رکھ سکتے۔ وہ ایک سینئر آفیسر ہے ڈی ایم جی کی۔ ایک باورچی نہیں ہے کہ اس کو اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے۔ گورنمنٹ نے 60، 70 لاکھ روپیہ لکوا کر اسے ہارورڈ سے دو سال train کروایا ہے۔ تمہیں لگتا ہے کہ گورنمنٹ اسے کسی fake انکوائری میں سالوں suspend رکھ سکتی ہے۔ she is one of the best officers that we have وہ اگر آج جاب چھوڑ دے تو بھی اسے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ وہ ڈاکٹر ہے..... ہارورڈ گریجویٹ ہے۔ ڈی ایم جی میں دس سال کام کر چکی ہے..... شعی وہ پاکستان کے اندر اور باہر کسی بھی آرگنائزیشن میں اس سے بھی اچھی پوسٹ پر کام کر سکتی ہے۔ یہ پوسٹ اس کے لیے مجبوری نہیں ہے اور اس نوکری کو ہم اس کے لیے چھند نہیں بنا سکتے جو کم چاہتی ہو۔“

”تم یہ سب بتا کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو مجھ پر؟“

”کچھ ثابت نہیں کرنا چاہتا صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی آنکھوں پر لگی ہوئی تعصب کی اس عینک کو اتار کر اس سارے معاملے کو دیکھو..... عکس مراد علی جو بھی کر رہی ہے وہ کسی بھی لحاظ سے غلط نہیں ہے۔“ شیردل نے بات کرتے ہوئے نرمی سے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی جو شہر بانو نے انتہائی بے رخی کے ساتھ جھٹک دی۔

”شیردل تم اس عورت کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کس حد تک جاؤ گے؟“

”شعی تم بار بار یہ بات کیوں کر رہی ہو؟ تم بار بار اس عورت کو اپنے اور میرے بیچ کیوں لا رہی ہو؟“ اس بار

والی بھڑاہٹ نے خود شہر بانو کو جھنجھلایا۔ اسے لگا وہ خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔

”تم بات کو ایک بار پھر غلط ٹریک پر لے کر جا رہی ہو۔“ وہ پھر برہم ہوا تھا۔

”نہیں یہ بالکل صحیح ٹریک ہے۔ تمہیں یہ dilemma صرف اس لیے ہے کہ تمہیں عکس اور میرے درمیان چوائس کرنی پڑ رہی ہے اور اس عورت کے ساتھ تمہاری bonding اتنی strong ہے کہ تمہیں میں نظر نہیں آ رہی..... تمہیں اپنے انکل نظر نہیں آ رہے..... خونی رشتے نظر نہیں آ رہے..... تمہیں صرف عکس نظر آ رہی ہے..... اس کا نانا نظر آ رہا ہے..... اور تم مجھ سے کہہ رہے ہو کہ مجھے غلط فہمی ہے..... میں بات کو غلط ٹریک پر لے جا رہی ہوں۔“ وہ خفگی سے بولتی گئی۔ ”تم مجھے صرف ایک بات بتاؤ..... یہ عکس کا نانا نہ ہوتا اور ایسا کوئی کیس کسی اور نے میرے پاپا کے خلاف کیا ہوتا تو تم کیا کرتے؟“ شیردل سگریٹ پیتے ہوئے اس کی بات سنتا رہا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی اس کا dilemma صرف عکس ہی کی وجہ سے تھا اور اس سے بھی بڑھ کر اس لیے کیونکہ وہ اس ماضی کا چشم دید گواہ تھا جسے وہ شہر بانو کے ساتھ شہر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ شہر بانو کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کے باپ نے اسے عکس مراد علی کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

”تمہارے پاس جواب نہیں ہے نا؟ میں تمہیں بتاتی ہوں۔“ اس کو خاموش دیکھ کر شہر بانو نے چند لمحے کے بعد خود ہی کہنا شروع کیا۔ ”عکس کی جگہ کسی اور نے ایسا کوئی کیس کیا ہوتا تو تم اس کا حشر کر دیتے۔“

”اگر کیس غلط ہوتا تو!“ شیردل نے اسے ٹوکا تھا وہ اس کی بات پر اور برہم ہوئی تھی۔

”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ عکس کا نانا جھوٹ نہیں بول رہا اور بابا غلط ہیں۔ تم کیسے 26 سال پہلے ہونے والے ایک واقعے پر judgement دے سکتے ہو۔ صرف اس لیے کیونکہ عکس کہہ رہی ہے۔“ وہ شدید غصے میں تھی۔

”اب تم پاپا کو کیس چلنے اور اس کا کوئی فیصلہ ہونے سے پہلے ہی مجرم قرار دے رہے ہو۔“  
”شعی میں نے کیس کی details دیکھی ہیں۔ documents دیکھی ہیں۔ کسی بھی سرکاری ملازم کی ملازمت سے برخاستگی اس طرح نہیں کی جاتی..... انکل شہباز نے قواعد و ضوابط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے عکس کے نانا کو ملازمت سے نکالا تھا۔ کوئی جرم ثابت ہو یا نہ ہو وہ اسی بنیاد پر ہی اپنی پنشن اور مراعات بحال کروا سکتے ہیں کہ ان کو ملازمت سے نکالتے ہوئے مروجہ طریقہ کار کو اختیار نہیں کیا گیا۔“ شیردل اسے گل سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”بھائو میں جائیں تمام قواعد و ضوابط اور طریقہ کار..... I don't care..... میرے لیے اتنا کافی ہے کہ پاپا نے اس کے نانا کو کسی غلط بات پر سزا دی اور یہ بات ختم ہو گئی.....“ شیردل اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔

”کوئی بھی بات اس طرح ختم نہیں ہو جاتی شعی..... اگر انکل شہباز نے rules کو follow کیا ہوتا تو آج ان کے خلاف یہ کیس ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ غلط کام انہوں نے کیا۔“

”جو بھی ہوا ہو گیا۔“ شہر بانو نے اسی اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔ ”پاپا جا چکے ہیں اس دنیا سے اور میں تمہاری کسی گرل فرینڈ کو یہ تماشا کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔“ شیردل نے اس کے جملے میں موجود اس قابل اعتراض لفظ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے کہا۔

”تو میں کیا کروں؟ تم بتاؤ مجھے میں کیسے یہ ثابت کروں کہ انکل شہباز غلط نہیں تھے۔“ وہ کچھ جھنجھلا گیا تھا۔

”کچھ بھی کرو..... تمہارے اور پاپا کے لیے تو یہ مشکل نہیں ہے۔“ وہ صاف لفظوں میں شیردل کو جو کہہ رہی تھی اس نے شیردل کی برہمی میں اضافہ کیا تھا۔

”شعی وہ اس شہر میں اس سیٹ پر کام کر رہی اور ضلعی انتظامیہ کی ہیڈ کے طور پر وہ سب کچھ کر سکتی ہے اور کر رہی ہے..... وہ اس سیٹ پر نہ بھی ہوتی تب بھی اس کیس میں انکل شہباز کو defend کرنا مشکل ہوتا۔“



”شعی میرے لیے تم سب سے زیادہ Important ہو۔“ شیردل نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے کہا۔ شہر بانو نے شعی سے ہنس دی۔  
”لیکن وہ بھی Important ہے۔“

”شعی وہ ایک دوست ہے اور بس میرے اور اس کے درمیان اب ایسا کچھ نہیں ہے جس پر مجھے تمہارے سامنے شرمندگی ہو۔ نظریں چرائی پڑیں۔“ شیردل نے بے اختیار کہا۔  
”تم اس سے محبت نہیں کرتے؟“ شہر بانو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے یک دم کہا۔ ”کہو نہیں۔“ وہ اسے چیلنج کر رہی تھی۔

”میں تمہارے ہر سال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔“ شیردل نے جواباً اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔ اس کو پہلی بار اس مسئلے کی سنگینی کا احساس ہوا تھا جس میں وہ منزہ کی مہربانی کی وجہ سے پھنس گیا تھا۔ جس سے وہ آج مل رہا تھا وہ ایک نئی شہر بانو تھی۔

”تم کم از کم اس سوال کا جواب دینے کے پابند ہو، تم کہہ دو تم عکس سے محبت نہیں کرتے۔“ شہر بانو نے اصرار کیا۔

”شعی میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔“ شیردل نے جواباً اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔  
”لیکن تم اس سے ”بھی“ محبت کرتے ہو۔“ شہر بانو کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اٹھ آیا تھا۔ شیردل صرف اس کا نہیں تھا۔ کون سا غور کہاں مٹی ہوا تھا۔

”شعی.....“ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن شہر بانو اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے صوفے سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ وہ رات اس نے مثال کے بیڈروم میں جاگ کر گزاری تھی اور شیردل نے اپنے بیڈروم میں..... وہ دونوں پوری رات نہیں سوئے تھے۔ ان کی ازدواجی زندگی میں وہ پہلی رات تھی جب وہ ایک گھر میں ایک چھت کے نیچے ہوتے ہوئے بھی دو مختلف کمروں میں رہے تھے۔ وہ دونوں نہیں جانتے تھے وہ صرف پہلی رات تھی آخری نہیں۔

☆☆☆

عکس کو اس شام گھر آ کر خیر دین کے موڈ سے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ کسی بات پر اپ سیٹ تھا لیکن وہ کیا بات ہو سکتی تھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ ڈرنیمل پر کھانا کھاتے ہوئے اس نے پہلی بار خیر دین کو اپنے آپ کو بے حد عجیب نظروں سے دیکھتے پایا تھا اور عکس نے ان نظروں کو خود پر بجا ہوا پایا۔

”نانا کیا بات ہے؟ آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟“ اس نے بالآخر کھانے سے ہاتھ روکتے ہوئے خیر دین سے پوچھا۔ خیر دین نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے ٹیبل پر اپنی بائیں طرف پڑا ایک لفافہ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ عکس نے حیران ہو کر اس لفافے کو دیکھا پھر ہاتھ میں پکڑا لیٹ اور کاٹنا پلیٹ میں واپس رکھتے ہوئے اس نے لفافے کو اٹھاتے ہوئے خیر دین سے کہا۔

”یہ کیا ہے؟“ خیر دین نے جواب نہیں دیا تھا۔ عکس نے ڈرنیمل پر بیٹھے ہوئے وہ لفافہ ٹیبل کے ایک کونے میں دیکھا تھا لیکن اس نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ خیر دین کئی بار کسی نہ کسی جاننے والے کی کوئی درخواست اسی طرح ڈرنیمل پر لے کر بیٹھا ہوتا تھا اور ڈرنے کے بعد اس سے بات چیت کرتے ہوئے وہ اس درخواست پر بھی بات کر لیتے تھے۔ آج پہلا موقع تھا کہ ڈرنے کے دوران خیر دین نے اس کے سامنے کوئی لفافہ بڑھایا تھا۔

لفافے میں سے کاغذ نکال کر اس نے اسے کھول لیا۔ وہ سرو سز اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن (SAGAD) کی طرف سے الٹو ہونے والا ایک سرکاری نوٹیفکیشن تھا جس میں خیر دین کی طرف سے اپنی ملازمت کی برخاستگی کو غیر قانونی

شیردل نے بالآخر بہت فحاشی کے ساتھ اس سے کہا تھا۔  
”میں لا رہی ہوں؟ شیردل اسے ہم دونوں کے درمیان لا کر تم نے کھڑا کیا ہے۔“ شہر بانو نے جواباً فحاشی سے اس سے کہا تھا۔

”تم کیا چاہتی ہو مجھ سے؟ میں کیا کروں؟“ شیردل نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے یک دم اس سے پوچھا۔ وہ دونوں ایک بار پھر چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔  
”تم اسے کہو گے کہ کس واپس لے لے تو وہ لے لے گی۔“ شہر بانو نے بالآخر اس سے کہا۔  
”میں نہیں کہوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں وہ نہیں لے گی۔“ شیردل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”شیردل تم اس عورت کے لیے.....“ شیردل نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔  
”شعی وہ میری دوست ہے اور دوست کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اس لیے تم بار بار اس کے اور میرے حوالے سے کچھ ایسا مت کہو جسے سن کر مجھے تمہاری mentality پر افسوس ہو۔“ شہر بانو اس کی بات پر یک دم برہم ہو گئی۔  
”تم دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے تھے..... مر رہے تھے ایک دوسرے سے شادی کے لیے..... اور تم مجھ سے کہہ رہے ہو کہ میں تم دونوں کو صرف دوست سمجھوں۔“

”وہ ماضی کی بات ہے اور وہ سب گزر چکا ہے۔ میں happily married ہوں اور اس کی بھی شادی ہونے والی ہے تو تم بار بار وہ والا chapter مت کھولو جسے میں بند کر چکا ہوں۔“ شیردل نے اس بار بہت فحاشی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ وہ واقعی عکس اور اپنا اس پیرائے میں بار بار ذکر سن کر تنگ آ گیا تھا۔ شہر بانو اور اس کے درمیان زندگی میں پہلی بار اس طرح کی گفتگو ہو رہی تھی اور شیردل کے لیے شہر بانو کی زبان سے اس طرح کی باتیں سننا سخت تکلیف دہ تھا۔

”تم نے مجھ سے سبھی اپنی زندگی کا یہ chapter شیر نہیں کیا..... کبھی مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم عکس میں انٹرنلڈ تھے۔“ شہر بانو نے عجیب سی رنجیدگی کے ساتھ اس سے کہا تھا۔  
”شعی کوئی فائدہ ہوتا اس کا..... اور اب بھی اگر ہم یہ ڈسکس کر رہے ہیں تو کوئی فائدہ ہے اس کا۔“ شیردل نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اپنی تمام تر جھنجھلاہٹ اور میزاری کے باوجود وہ یہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس کی ماں سے عکس اور اس کے حوالے سے اس طرح کے انکشافات سن کر بہت اپ سیٹ ہوئی ہوگی۔ اس کی جگہ کوئی بھی عورت ہوتی تو وہ بھی اپ سیٹ ہو جاتی اور شیردل کم از کم اس حد تک وضاحت اور صفائی دینے کا پابند خود کو ضرور سمجھتا تھا کہ اس کی یہ غلط فہمی دور ہو جاتی اور وہ کسی عدم تحفظ کا شکار نہ رہتی۔

”ہم زندگی میں بہت ساری ایجنجس میں بہت سارے لوگوں میں انٹرنلڈ ہو جاتے ہیں پھر وقت اور حالات بدل جاتے ہیں، کچھ اور لوگ ہماری زندگی میں آ جاتے ہیں تو ان کی اہمیت بدل جاتی ہے۔“  
”تمہاری زندگی میں عکس کی اہمیت اور جگہ نہیں بدلی۔“ شہر بانو نے اسے ڈکا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی وہ جیسے اسے شیشہ دکھا رہی تھی۔

”وہ میرے لیے تم سے زیادہ اہم نہیں ہے شعی۔“ اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد شہر بانو سے کہا یہ جانے بغیر کہ اس کی ان چند لمحوں کی خاموشی نے شیردل کے منہ کھولنے سے بھی پہلے شہر بانو تک اس کا جواب پہنچا دیا تھا۔  
”میں تمہاری بیوی ہوں شیردل اس لیے اہم ہوں..... وہ کیا ہے؟ وہ کس حیثیت سے اہم ہے تمہارے لیے؟“  
اس نے عجیب رنج سے اس سے کہا تھا۔



کی آنکھوں کی نمی دیکھے۔ وہ اس نمی کو اپنے کی کوشش کر رہی تھی جیسے اس نے زندگی کی بہت ساری تلخی اور زہر کو پیا تھا لیکن اس کی آنکھیں جھلک پڑی تھیں۔ آنکھیں بھی کبھی پیاؤں کی طرح کم ظرفی اور چھوٹا پن دکھانے لگتی ہیں۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپتے ہوئے اس نے انگلیوں سے آنکھوں کو رگڑ کر جیسے ان کی نمی پی جانے کی ایک اور کوشش کی۔ یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ ہاتھ ہٹاتے ہی اس کی آنکھیں ایک بار پھر چھلکی تھیں اور پھر برستی ہی چلی گئیں۔ ایسی ہی برسات خیر دین کی آنکھوں سے بھی ہو رہی تھی۔ معذرت کا ایک چھوٹا سا لفظ ان کی زندگی میں کچھ بھی بدل نہیں سکتا تھا..... اذیت، رسوائی کا کوئی داغ دھبا ان کے دامن سے ہٹانے کی طاقت نہیں رکھتا تھا مگر وہ ان کے دلوں کے غبار کو نکل جانے کا موقع دے رہا تھا جیسے کسی بھرے ہوئے آبلے کو کوئی پھٹ کر بہہ جانے دے اور اندر سے نکلنے والا مواد سارا زہر اور ٹیس اپنے ساتھ ہی لے جائے۔

اتنے سالوں بعد وہ معذرت بے وقعت اور بے معنی تھی۔ ان کو اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دونوں یہ جنگ اس ایک معذرت سے بہت پہلے جیت چکے تھے لیکن اس کے باوجود ایک شیردل کے ماں باپ کا وہاں آکر معذرت کا اظہار عکس اور خیر دین کے لیے عجیب کتنا رُس کا باعث بنا تھا۔

”تم نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ ایک شیردل.....“ خیر دین نے خود پر قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ اب اپنے رومال سے اپنی آنکھیں صاف کر رہا تھا۔ جملہ ادھورا چھوڑا تھا اس نے لیکن وہ جملہ ادھورا سمجھ کر نہیں چھوڑا گیا تھا۔ عکس جانتی تھی وہ اس سے کیا کہنا چاہ رہا تھا لیکن اس کے پاس خیر دین کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ٹیبل پر پڑے ٹشو بانس سے ٹشو نکال کر وہ اب اپنی آنکھیں اور ناک اس سے رگڑ رہی تھی۔ کسی ملازم کے وہاں آنے اور اسے اس حالت میں دیکھنے سے پہلے وہ جیسے خود پر قابو پالینا چاہتی تھی۔ خیر دین چند لمحے اس کے جواب کے انتظار میں اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

”تم ایک شیردل کے خاندان کے بارے میں کب سے جانتی تھیں؟“

”انٹر سے..... آپ کو یاد ہوگا ایک debate ہماری تھی میں نے..... وہاں پہلی بار شیردل کو دیکھ کر پہچانا تھا میں نے۔“ وہ خیر دین سے نظریں ملائے بغیر اپنی پلیٹ میں کاٹا پھیرتے ہوئے اسے بتاتی رہی۔

”اور تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ عکس نے اس بار بھی خیر دین کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا..... اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس..... وہ خیر دین کو یہ کیسے بتا دیتی کہ وہ بھی شیردل کے اصلی تعارف کو اس کے سامنے پیش کرنے کی ہمت ہی اپنے اندر پیدا نہیں کر سکی۔ اسے ڈر تھا خیر دین اسے شیردل سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہ رکھنے پر مجبور کر دے گا۔ اسے خدشہ تھا خیر دین کو اتنے سالوں بعد یہ جان کر تکلیف ہوگی کہ وہ ایک بار پھر اس خاندان سے رابطے میں ہے جو ان کی تباہی کا ذمے دار تھا۔ وہ شیردل سے دوستی ہو جانے سے بھی پہلے اس بات سے خوف زدہ تھی کہ خیر دین سے اس خاندان کا دوبارہ ذکر کرے..... اس خاندان کا ذکر جیسے اس واقعے سے منسلک اس تکلیف اور بے عزتی کے احساس کو دوبارہ لے بیٹھنے کے مترادف تھا۔ خیر دین اور وہ بھی اس واقعے کے بارے میں بات نہیں کرتے تھے اور وہ جیسے عکس کے لیے ایک نوگوار یا بن گیا تھا جہاں سے وابستہ کوئی یاد وہ دُہرا نہیں چاہتی تھی..... وہاں سے منسلک کسی فرد کو وہ اس حوالے سے شناخت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ خیر دین کے ساتھ خدشات اور اندیشوں کے اس ڈھیر میں سے کون کون سا اندیشہ اور خدشہ نکال کر دیتی۔

”میں نے ضروری نہیں سمجھا۔“ وہ خیر دین کو یہ جواب نہیں دینا چاہ رہی تھی جو اس نے دیا تھا لیکن جیسے وہ اس کے لاشعور سے کہیں باہر آیا تھا۔ خیر دین نے اسے بے یقینی سے دیکھا وہ اس کے سامنے نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

”جڑیا تم نے ضروری نہیں سمجھا؟“ خیر دین نے جیسے اسی بے یقینی کے ساتھ اسی کا جواب دُہرایا۔ ندامت اور

اور بلا جواز قرار دینے کے اعتراضات کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی پشیمانی، واجبات اور مراعات کی بحالی کا اعلان تھا۔ وہ کوئی لمبا چوڑا خط نہیں تھا۔ ایک سرکاری کاغذ پر تحریر کچھ سطریں تھیں جنہیں رکی ہوئی سانس کے ساتھ لاشعوری طور پر اس نے کئی بار پڑھا تھا۔ بے یقینی کی ایک عجیب سی کیفیت میں..... یہ کام اتنی آسانی سے ہو جانے والا تو اس نے کبھی بھی نہیں سمجھا تھا لیکن وہ کام ہو گیا تھا۔

”یہی وہ دوسرا کام تھا نا جو تم کرنا چاہتی تھیں۔“ اس نے خیر دین کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھا۔ خیر دین کی آنکھوں میں جو خوشی اور فخر وہ دیکھنا چاہتی تھی وہ اسے نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے اس کاغذ کو دوبارہ اسی طرح تہ کر کے واپس لفافے میں ڈالتے ہوئے لفافہ اسی جگہ پر رکھ دیا جہاں سے خیر دین نے اٹھایا تھا اور پھر بڑے پرسکون انداز میں خیر دین سے کہا۔

”جی نا نا۔“

”تم نے مجھ سے پوچھا تک نہیں..... مجھ سے مشورہ کیے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔ میں تم سے اس طرح کی حماقت کی توقع نہیں رکھتا تھا۔“ وہ خیر دین سے یہ سارے جملے سننے کی توقع کر رہی تھی لیکن خیر دین نے اسے ایسا کچھ نہیں کہا۔ اس نے اسے کچھ اور کہہ کر اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین چھینی تھی۔

”آج ایک شیردل کے ماں باپ آئے تھے۔“ چچا کو دوبارہ تھامتا ہوا عکس کا ہاتھ ایک بار پھر فریز ہو گیا تھا۔ اس نے عجیب بے یقینی کے عالم میں خیر دین کو دیکھا تھا۔ اس نو فیملکیشن کا معما جیسے سیکنڈز میں حل ہوا تھا۔ وہ ایک شیردل کی مہربانی تھی۔

”کس لیے آئے تھے؟“ عکس نے اپنی آواز کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”معذرت کے لیے۔“ خیر دین نے مدہم آواز میں کہا۔ عکس ہمت نہیں کر سکی کہ اس سے پوچھ پاتی کہ کس چیز کی معذرت، بہت سارے زخم ایک بار پھر سے رہنے لگے تھے لیکن وہ انہیں ادھیڑنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

”انہیں شہباز حسین کے روتے پر شرمندگی اور افسوس تھا۔ تم سے بھی معذرت خواہ تھے وہ۔“ خیر دین نے رک کر اپنی آواز کی بھراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ عکس نے بھی خیر دین سے نظریں ہٹالیں۔ کئی سالوں کے بعد وہ دونوں آج اس ایک موضوع کو دوبارہ چھیڑ بیٹھے تھے جس پر وہ اتنے سالوں میں گونگے بن کر رہے تھے۔ لیکن زندگی خاموشی کو بھی خاموش کہاں رہنے دیتی ہے۔ درد کو بھی وقت بن کر کہاں گزر جانے دیتی ہے۔ عجیب طرح سے چُپ توڑنی ہے، عجیب طرح سے ٹیس بن کر اٹھتی ہے۔

معذرت کے وہ چند لفظ اس خاندان کی طرف سے 26 سال بعد آئے تھے اور اس معذرت نے مرہم بننے کے بجائے درد کو جیسے کچھ اور بڑھا دیا تھا۔ 26 سال بعد اس خاندان نے انہیں اس قابل سمجھا تھا کہ ان کے سامنے اپنی شرمساری کا اظہار کر کے ان سے معذرت کرتا۔ 26 سال بعد انہیں جیسے ”انسان“ اور ”برابر کے حقوق“ والے انسان سمجھ لیا گیا تھا اور یہ جس طرح بھی ہوا تھا اس ٹیبل پر بیٹھے ان دو لوگوں کے لیے راحت اور فخر کا باعث نہیں تھا۔ عکس کے لیے ایک شیردل کے خاندان کی طرف سے کی جانے والی معذرت شاکنگ تھی۔ وہ اس کی توقع ان سے نہیں رکھتی تھی۔ رکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے لیے میز پر پڑا وہ ایک خط بہت تھا جس کے لیے وہ جدوجہد کر رہی تھی۔ معذرت تو بہت غیر متوقع تھی۔

”آپ نے کیا کہا ان سے؟“ عکس نے خیر دین سے پوچھا۔

”میں نے انہیں معاف کر دیا۔“ خیر دین یہ بات نہ بھی کہتا عکس کو تب بھی اس کے جواب کا اندازہ تھا۔ ”تم بھی ان کو معاف کر دو جڑیا۔“ خیر دین نے اب اس سے کہا۔ عکس نے سر اٹھا کر خیر دین کو نہیں دیکھا وہ نہیں چاہتی تھی وہ اس

حوالے سے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن گھر شفٹ ہو جانے کے بعد خیر دین کو ملازموں سے اس چند روزہ معطلی کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ عکس سے پوچھنے پر اس نے بات کو ٹالتے ہوئے اس سے جھوٹ بولا تھا کہ کسی کیسی پر سیاسی مداخلت کو resist کرنے کی وجہ سے وقتی طور پر اسے معطل کیا گیا لیکن اب فکر والی کوئی بات نہیں تھی۔ خیر دین کو تشویش پھر بھی ہوئی تھی۔ اس کے دس سالہ کیریئر میں پہلی بار ایسا کچھ ہوا تھا۔ وہ بہت tactful آفیسر تھی۔ غلط اور ناجائز کام نہیں کیا کرتی تھی لیکن بھاری بھر کم دباؤ اور سفارشوں کو بڑے طریقے سے ٹالتی تھی۔

”نانا آپ tension مت لیا کریں اب میں سینئر آفیسر ہوں۔ زیادہ پاورز ہیں میرے پاس..... زیادہ پاورز کے ساتھ زیادہ پریشر آئے گا..... لیکن میں ہینڈل کر لوں گی..... آپ بس اپنی صحت کا خیال رکھیں۔“ اس نے خیر دین کو دلاسا دیا تھا۔ ”میں اسی لیے suspend ہوئی۔“ عکس نے اس بار جھوٹ بولنے کے بجائے بے حد اطمینان سے خیر دین سے کہا تھا۔ ”اور suspend ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے جو حالات اس ملک میں ہیں ان میں کوئی آفیسر suspend ہوئے بغیر اپنی مدت پوری کر لے تو وہ معجزہ ہوتا ہے۔“

”چڑیا وہ جنگیں لڑتا ہے وقتی ہوتی ہے جن میں ہونے والی جیت بھی ہماری زندگی کے لیے ضروری نہ ہو۔“ خیر دین نے اس کی بات کے جواب میں کہا تھا۔ ”یہ میرا کیس تھا میرا معاملہ تھا میں اسے چھوڑ چکا ہوں بھول چکا ہوں کیونکہ مجھے پنشن کے ان چند ہزار روپے اور ریٹائرڈ سرکاری ملازم ہونے کے لیبل کی اب ضرورت نہیں ہے..... وہ وقت بہت پیچھے رہ گیا جب یہ سب کچھ میرے لیے کچھ معنی رکھتا تھا۔“ خیر دین نے نرمی سے اس سے کہا تھا۔

”آپ کا کوئی معاملہ صرف آپ کا معاملہ نہیں ہے۔“ عکس نے اتنی ہی نرمی سے خیر دین سے کہا تھا۔ ”آپ کا ہر معاملہ میرا معاملہ ہے..... ہر مسئلہ میرا مسئلہ اور ہر پریشانی میری پریشانی ہے اور آپ مجھ سے یہ مت کہیں کہ آپ سب بھول چکے ہیں اور جب سے اس طرح کی برخاستگی آپ کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتی ہے اس نے بڑی سنجیدگی سے خیر دین کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

”ضروری نہیں ہوتا چڑیا کہ ہم جس چیز کو بھولے نہ ہوں ہمیں اس کی ضرورت بھی ہو..... تمہاری کامیابیوں نے میری زندگی کے سارے پچھتاوے، ساری حسرتیں ختم کر دی ہیں..... میں اگر اپنی اس نوکری کو یاد رکھے ہوئے ہوں تو اس کی وجہ وہ ذلت تھی جس کے ساتھ مجھے اس نوکری سے نکالا گیا..... اس نوکری کے چھوٹ جانے کی کوئی حسرت نہیں تھی جسے میں اپنے دل میں لیے پھرتا ہوں۔“ خیر دین نے اس سے کہا تھا۔

”وہ نوکری میری وجہ سے چھینی گئی تھی وہ ذلت بھی میری ہی وجہ سے اٹھانی پڑی تھی۔“ وہ بہت سالوں بعد پہلی بار اس واقعے کے حوالے سے اپنی اس شرمندگی کو خیر دین کے ساتھ بانٹ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے خیر دین کو وہ نو سالہ چڑیا یاد آئی جسے اس نے تھانے سے رہا ہونے کے بعد اس دن اس رشتے دار کی چھت پر کھاڑ خانے میں چھپا دیکھا تھا۔ اسے آج بھی ان معصوم آنکھوں کا خوف اور شرمندگی یاد تھی۔ وہ آنکھیں آج خوف اور شرمندگی نہیں لیکن درد کا وہی رنگ لیے اس کو دیکھ رہی تھیں۔

”نہیں چڑیا جو بھی ہوا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا اور میں نے اتنے سالوں میں یہ کبھی سوچا تک نہیں کہ میری زندگی میں آنے والی کسی تکلیف اور ذلت کا باعث تم بنی ہو..... تم میری زندگی کا واحد روشن باب ہو جس کے بارے میں ہر دفعہ سوچتے ہوئے خوشی اور فخر کے علاوہ مجھے اور کوئی احساس نہیں ہوتا۔“ وہ بہت دفعہ کی ڈہرائی ہوئی باتوں کو اس کے سامنے ایک بار پھر ڈہرائی دیا تھا۔ عکس مراد علی ہمیشہ کی طرح ایک مسراندہ سامع کی طرح اس کو سن رہی تھی۔ جیسے کوئی بچہ کسی بڑے سے پر یوں کی کوئی ایسا کہانی سن رہا ہو جو ناقابل یقین حد تک قابل رشک ہو یوں جیسے وہ کسی اور کی کہانی ہو۔

شرمساری کے ایک عجیب سے احساس نے عکس کو اپنی گرفت میں لیا تھا۔ وہ اپنے نانا سے کوئی بات راز میں نہیں رکھتی تھی لیکن یہ ”راز“ نہیں تھا یہ ان کی زندگی کا وہ mess تھا جس کو اس نے خیر دین کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کی تھی۔

”میں اس کی شناخت کے بارے میں آپ کو بتا کر آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی۔“ عکس نے بالآخر ایک توجیہ دینے کی کوشش کی۔ وہ اس سے اب بھی نظریں نہیں ملتا رہی تھی، اب بھی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ اس ضلع کی حاکم تھی۔ اس ضلع میں پتا بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں ملتا تھا۔ اس کے فیصلوں اور احکامات پر کوئی اعتراض کرنے والا نہیں ہوتا تھا۔ ایس اینڈ جی اے ڈی کے rules اور ریگولیشنز اس کی منکر نہیں پر ہوتی تھی اور پاکستان پینل کوڈ کی دفعات اسے طوطے کی طرح رٹی ہوئی تھیں..... وہ گورنمنٹ آف پاکستان کی Ace officer تھی جس کے سامنے اچھے اچھوں کو پسینہ آ جاتا تھا لیکن وہ خیر دین کی چڑیا تھی جو اس کی گودوں کھلائی ہوئی تھی اور جس کو وہ اندر باہر سے شیشے کی طرح دیکھ اور پہچانتا تھا۔ وہ اس کی چپ کو کتاب کی طرح پڑھتا تھا اور اس کے جھوٹ کی پیاز کی طرح پرتیں اتار لیتا تھا..... اور اس کے باوجود وہ حیران تھا چڑیا اتنی بڑی بات اس سے کیسے چھپا سکتی تھی۔ وہ خیر دین کو تکلیف سے بچانا چاہتی تھی یا وہ ایک شیردل کو خیر دین کے کسی متوقع شدید رد عمل سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

خیر دین کو آج بھی یاد تھا بچپن میں ایک شیردل کے ساتھ کھیلنے سے منع کرنے پر وہ کتنی ناخوش ہوئی تھی اور اس نے ہمیشہ کی طرح خیر دین کی بات اوکے کہہ کر مان لینے کے بجائے بہت ساری تاویلیں اور وضاحتیں دے دے کر خیر دین کو اسے ایک شیردل کے ساتھ کھیلنے کی اجازت دینے کے لیے منانے کی کوشش کی تھی۔ وہ ایک کے لیے اس کے بچپن کے انس سے واقف تھا۔ وہ شیردل کے لیے اس کی ماضی اور حال کی پسندیدگی اور دوستی سے بھی واقف تھا لیکن اسے اس رشتے کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا یا پھر شاید اسے ایک شیردل کے حوالے سے چڑیا کی فیلنگز کی صحیح نوعیت اور شدت کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا تھا۔

”آپ کو برا لگا؟“ وہ اب اس سے پوچھ رہی تھی عجیب سے جانچنے اور پرکھنے والے انداز میں..... بے حد محتاط سی۔

”یہ اتنا برا نہیں لگا جتنا یہ بُرا لگا کہ تم نے مجھ سے پوچھے بغیر یہ کیس کرنے کا فیصلہ کیا۔“ خیر دین نے اس سے کہا۔

”میں آپ سے پوچھتی تو آپ مجھے اجازت دے دیتے؟“ عکس نے خیر دین سے پوچھا۔

”نہیں۔“ خیر دین نے بناناٹل کہا۔

”میں نے اسی لیے نہیں پوچھا آپ سے۔“ عکس نے گہری سانس لے کر کہا۔

”تم اتنی سمجھ دار نہیں ہو چڑیا جتنا میں تمہیں سمجھتا تھا۔“ خیر دین نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔ وہ خیر دین کی بات پر مسکرا دی۔

”میرا بھی اپنے بارے میں یہی خیال ہے..... اس لیے میں آپ سے اتفاق کرتی ہوں۔“ خیر دین اس کے تبرے سے محظوظ نہیں ہوا تھا۔

”تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے اپنے لیے کتنی بڑی مصیبت کو کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی؟“ خیر دین اب اس سے کہہ رہا تھا۔

”نانا آپ ضرورت سے زیادہ ڈرتے ہیں۔“ عکس نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”تم اسی وجہ سے suspend ہوئی تھیں؟“ خیر دین کو اب اس پر غصہ آ رہا تھا۔ اسے عکس نے اپنی معطلی کے

شہر بانو اور اس کے درمیان آج صبح بھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ ناشتا نہیں کیا تھا۔ وہ مثال کے بیڈروم میں اس کے بیڈ پر جاگتے ہوئے بھی سو رہی تھی۔ وہ آفس کے لیے نکلنے سے پہلے مثال کو دیکھنے گیا تھا جو جاگ رہی تھی اور صبح سویرے جاگنے کے بعد اس کے پاس بیڈروم میں آگئی تھی۔ وہ فجر کے آس پاس کا ہی کوئی وقت تھا اور شیردل کچھ در پہلے ہی سونے کے لیے لیٹا تھا لیکن نیم تاریکی میں بھی مثال سیدھا باپ کے پاس جا کر اس کا کندھا ہلانے لگی تھی۔ اپنی نیند سے بوجھل آنکھیں کھولتے ہوئے شیردل نے لیٹے لیٹے ہی اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر کمر کے اندر اپنے سینے پر لٹا لیا تھا۔ وہ نیند میں بھی آنکھیں بند کیے لاشعوری طور پر اس کا سر چومنے لگا۔

"Papa you missed me?" مثال نے اس کے سینے پر اوندھے منہ لیٹے لیٹے پوچھا تھا۔

"I missed you a lot" شیردل نے ایک بار پھر اسی طرح آنکھیں بند کیے اس کا سر چومتے ہوئے کہا۔

"I missed you too" مثال نے باپا کے اس اعتراف سے بے حد مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

"I know" شیردل اب جیسے ہلکی غنودگی میں تھا۔

"پاپا آپ زیادہ بڑی ہیں؟" شیردل نے چند لمحوں بعد غنودگی میں مثال کی آواز سنی۔ اس نے نیند کو جھٹکتے ہوئے اسے جواب دینے کی کوشش کی۔

"Not for you honey" اس نے ایک بار پھر اس کے بالوں کو چوما تھا۔

"But Mummy said you are busy and you can't live with us in America." (لیکن مئی کہتی ہیں کہ آپ بہت مصروف ہیں اور ہمارے ساتھ امریکا میں نہیں رہ سکتے)۔

شیردل نے اسے جواباً کہتے سنا اور اس نے نیند میں ہی اس کا جملہ سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ نہیں سمجھ پایا۔

"Honey we don't have to live in America" (ہنی ہمیں امریکا میں نہیں رہنا ہے)۔ شیردل نے کہا۔

"But Mummy said we will live there" (مگر مئی کہتی ہیں کہ ہم وہیں رہیں گے)۔ مثال نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ شیردل غنودگی میں ہی اس کی باتیں سن رہا تھا۔

"Only Mummy and I not you because you are busy and you can't live with us in America" (صرف مئی اور میں، آپ نہیں کیونکہ آپ مصروف ہیں اور ہمارے ساتھ امریکا میں نہیں رہ سکتے)۔

شیردل کی آنکھوں سے نیند ایک دم اڑ گئی تھی۔ مثال اسی طرح اس کے سینے پر اوندھے منہ لیٹے بول رہی تھی۔

"But I have told Mummy I can't live without you Papa I really love America. Can you please come with us?" (لیکن میں نے مئی کو بتا دیا ہے کہ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پاپا مجھے امریکا بہت پسند ہے۔ پلیز ہمارے ساتھ چلیں)۔

شیردل کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح ری ایکٹ کرے۔ ان دونوں نے آج تک کبھی مثال کے سامنے کوئی argument نہیں کیا تھا کبھی اوپچی آواز سے بات نہیں کی تھی یہ جیسے ان دونوں کے درمیان طے پائے جانے والا ایک unsaid rule تھا کہ وہ مثال کو اپنے اختلافات سے دور رکھیں گے اور اب وہی بچی اسے شہر بانو کے ساتھ کی جانے والی گفتگو کا خلاصہ پیش کر رہی تھی جس کا سر ہر سمجھ میں نہ آنے کے باوجود شیردل کی آنکھیں

"تمہیں زندگی میں اس اسٹیج پر اگر میری وجہ سے کوئی نقصان پہنچتا تو میں برداشت نہ کر پاتا۔۔۔۔۔ تم نے یہ کیس کرتے ہوئے یہ سوچا تھا کہ تم اپنا سب کچھ میرے لیے داؤ پر لگا رہی ہو۔" خیر دین نے اب اسے ڈانٹا تھا۔

"زندگی میں آپ نے بہت بار اپنا سب کچھ میرے لیے داؤ پر لگایا ہے۔ ایک بار میں نے لگا دیا تو کیا ہوا؟"

اس نے خیر دین کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ "میں صرف ریکارڈ ٹھیک کرنا چاہتی تھی۔ ہم تاریخ اور ماضی نہیں بدل سکتے لیکن ان کا ریکارڈ ضرور بدل سکتے ہیں اور ہمیں بدل دینا چاہیے جب بھی ہم بدل سکیں۔۔۔۔۔ میرے نانا چور اور بددیانت نہیں ہیں اور میں ایک جھوٹ کو آپ کی سروس ریکارڈ کا حصہ رہنے نہیں دے سکتی تھی۔۔۔۔۔ اور نانا زندگی میں کسی بھی نقصان سے ڈرتا تو آپ نے ہی مجھے نہیں سکھایا۔۔۔۔۔ اب میں کسی نقصان سے ڈروں تو کس طرح؟" وہ بے حد اطمینان سے خیر دین سے پوچھ رہی تھی۔

"میں پھر بھی تمہیں بے خوف کہوں گا۔" خیر دین نے اس کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ وہ ہنس پڑی۔

"کہہ لیں۔۔۔۔۔ دنیا میں بس دو لوگ مجھے بے خوف کہتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں۔" اس نے عجیب روانی اور بے ساختگی سے کہا پھر ہاتھ میں پکڑے کانٹے سے پلیٹ میں پڑے کباب کو اٹھاتے اٹھاتے اسی بے ساختگی سے رکی۔

"دوسرا شخص شیردل ہوگا۔" خیر دین نے مدھم سکر اہٹ کے ساتھ گہری سانس لیتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ پہلا لمحہ تھا جب اس نے شیردل کے لیے حسد محسوس کیا تھا۔ اسے یہ حسد ایک سلطان سے نہیں ہوا تھا۔ غنی حمید سے نہیں ہوا تھا۔ جو ادنیٰ سے نہیں ہوا تھا لیکن ایک شیردل۔۔۔۔۔ خیر دین نے بے اختیار گہری سانس لی۔ کباب کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے عکس مراد علی نے نظریں اپنی پلیٹ پر جمائے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے خیر دین کا اندازہ سنا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

"Thank you" کے دو لفظ عکس کے نام کے ساتھ شیردل کے سیل فون کی اسکرین پر جگمگائے تھے۔ وہ اس وقت آفس میں بیٹھا فون ہاتھ میں لیے کسی کو کال کرنے ہی والا تھا جب عکس کا نام وہاں نمودار ہوا تھا۔ شیردل کال کرتے کرتے رک گیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس text کے جواب میں اسے کال کرتا لیکن فی الحال وہ جس ڈیٹی کیفیت میں تھا اس میں وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک ہی ڈویژن میں service کر رہے تھے۔ کتنی بھی کوشش کر لیتے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ دفتری معاملات کی وجہ سے بھی ایک دوسرے سے بات نہ کرتے لیکن پچھلی رات شہر بانو کے ساتھ ہونے والے جھگڑے کے بعد شیردل نے یہ طے کیا تھا کہ وہ عکس سے دور رہنے کی کوشش کرے گا۔ ان دونوں کا ایک دوسرے سے دور رہنا اب اس کی ازدواجی زندگی میں آنے والی ممکنہ بہتری کے لیے ضروری تھا۔ عکس نے جو فیصلہ کیا تھا وہ درست تھا۔ سیل فون پر ان دو لفظوں کو دیکھتے ہوئے وہ سیکنڈز میں ہٹا نہیں کیا کیا سوچ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ شکر یہ کس چیز کے لیے تھا لیکن اس وقت اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تختیار شیردل کے ساتھ بیٹھ کر کیے جانے والے اس فیصلے نے اس کے اپنے گھر کو داؤ پر لگا دیا تھا۔

"سب ٹھیک ہے؟" وہ اس کے text کا جواب ٹائپ کر رہا تھا جب اس کا ایک اور text آ گیا۔ وہ جانتا تھا وہ اس کے اور شہر بانو کے حوالے سے پوچھ رہی تھی۔

"Perfect" اس نے جواباً ایک جھوٹ بولا۔ وہ اپنا اور شہر بانو کا مسئلہ کسی اور سے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا تھا اور عکس سے اس معاملے کو ڈسکس کرنے کا مطلب مزید خرابی تھا۔

"Great" ایک smiley کے ساتھ عکس کا text اسے آیا تھا۔ شیردل نے کال کرنے کے بجائے سیل فون بڑی بے دلی کے عالم میں میز پر رکھ دیا۔

والی مصروفیات کے دوران جیسے relaxation دینے والے چند Invaluable لمحے تھے جن کا وہ خطرہ رہتا تھا اور آج سیل فون پر اس کے نام کی عدم موجودگی نے شیردل کے اسٹریس میں بغیر کسی وجہ کے اضافہ کیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے فرینڈز اور بیچ میٹس سے ستارہ ہوتا تھا کہ بیویوں کے ساتھ ہونے والے تنازعات کس طرح ان کی ذہنی اور کام کی استعداد کو متاثر کرتے تھے لیکن وہ خود پہلی بار اس کا سامنا کر رہا تھا۔

اس دن وہ آفس میں اتنا زیادہ ذہنی دباؤ کا شکار رہا تھا کہ شام کو خلاف معمول آفس سے جلدی گھر آ گیا تھا۔ شہر بانو مثال کے ساتھ لان میں تھی۔ شیردل ڈرائیوے میں اترنے کے بعد گھر کے اندر جانے کے بجائے سیدھا لان میں ہی چلا گیا تھا۔ شہر بانو لان میں بیٹھی چائے پی رہی تھی اور مثال سائیکل چلا رہی تھی۔ شیردل نے ملازم سے اپنے لیے بھی چائے وہیں لانے کو کہا تھا۔ مثال کچھ دیر اس کے ساتھ بات کرتی رہی اور اس دوران شہر بانو چائے پیتی رہی۔ جب تک شیردل کے لیے چائے آئی وہ اپنی چائے ختم کر چکی تھی۔ مثال اب دوبارہ اپنی سائیکل کے ساتھ مصروف ہو چکی تھی۔ شہر بانو کو بنا بات کیے اٹھتے دیکھ کر شیردل نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

”چائے بنا دو مجھے۔“

”ملازم کو بھیجتی ہوں وہ بنا دے گا۔“ وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔ اسے وہاں سے جاتے دیکھ کر شیردل کا دل کچھ عجیب انداز میں ہر چیز سے اچاٹ ہوا تھا۔ اس تنازعے کے حل ہونے کے کوئی امکانات نظر نہیں آرہے تھے سوائے اس کے کہ وہ اس سے جھوٹ بولتا اور وہ اب یہی کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔

☆☆☆

”یہ جو کچھ بھی ہوا ہے شیردل کی وجہ سے ہوا ہے۔“ منترہ نے فون پر شہر بانو سے کہا۔ ”تمہیں اس کے بارے میں اسی سے پوچھنا چاہیے۔“

”مٹی آپ مجھ سے پوچھے بغیر صرف شیردل کے کہنے پر اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتی ہیں؟“ شہر بانو نے شدید پرہیزی کے عالم میں منترہ سے کہا۔ منترہ نے اس کے فون کرنے پر اسے اطلاع دے دی تھی کہ وہ بختیار کے مجبور کرنے پر گھس کے گھر ان کے ساتھ گئی تھیں اور وہاں بختیار نے شہباز کی غلطی تسلیم کرتے ہوئے خیر دین کا دعویٰ درست قرار دیتے ہوئے اس کے واجبات اور مراعات کا نوٹیفکیشن جاری کروا دیا تھا۔ البتہ انہوں نے شہر بانو کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دونوں وہاں معذرت کے لیے گئے تھے نہ ہی انہوں نے اس معذرت کی اصل وجہ شہر بانو کو بتائی تھی۔ شہر بانو کو بتانے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ بختیار اور شیردل نے شہباز کو defend کرنے کے بجائے اس کی غلطی تسلیم کر لی تھی۔

”اگر میرے ہاتھ میں کچھ ہوتا تو تم دیکھتیں میں عکس اور خیر دین کا کیا حشر کرتی، میں انہیں مزہ چکھا دیتی اس قسم کا کیس کرنے پر..... لیکن شہر بانو میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا یہ سارا مسئلہ شیردل کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ اگر اس عورت کو اس طرح blindly سپورٹ نہ کرتا تو بختیار کبھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتے تھے لیکن شیردل کو ٹکس کے سامنے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ ماں نہیں..... بیوی نہیں..... وہ انکل نہیں جو سارا بچپن اسے سر پر اٹھائے پھرتا رہا۔“ شہر بانو کے ساتھ بات کرتے ہوئے منترہ کو وہ ہنک یاد آ رہی تھی جو انہوں نے شیردل کے انکشافات کی وجہ سے اپنے شوہر کے سامنے اٹھائی تھی۔ شیردل نے ان کے شوہر کے سامنے ان کے اپنے خاندان کی جیسے دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں اور منترہ کے لیے ہنک اور ہزیمت کے اس احساس کو بھلانا آسان نہیں تھا لیکن شیردل کے خلاف شہر بانو سے یہ ساری گفتگو کرتے ہوئے انہیں اندازہ تک نہیں تھا کہ وہ شہر بانو اور شیردل کے درمیان اختلافات کے جو بیج بوری تھیں وہ ان دونوں کا رشتہ تو زردینے کا باعث بنے گا۔

اپنے شوہر کی ماں کے منہ سے سننے والے آخری جملے شہر بانو کے لیے بے حد تکلیف دہ اور حوصلہ شکن تھے۔

ضرور اندازہ لگا سکتا تھا کہ شہر بانو نے اس سے کیا ڈسکس کیا تھا اور اسے شک اس بات پر لگا تھا کہ وہ سب کچھ پہلے ہی طے کر آئی تھی کہ اسے کس صورت حال میں کیا کرنا تھا۔ کیا ان دونوں کا رشتہ اس قدر کمزور تھا کہ وہ شہباز حسین کے مسئلے پر اسے بھی چھوڑ دینے کا تہیہ کیے ہوئے بیٹھی تھی۔ شیردل کے لیے یہ سب جیسے ناقابل یقین تھا۔

”Misal we are not going any where“ (مثال ہم کہیں نہیں جا رہے) شیردل نے بالآخر اس خفگی کو جھٹکتے ہوئے مثال سے دو ٹوک انداز میں کہا جو اس وقت وہ شہر بانو کے لیے محسوس کر رہا تھا۔

”But why Papa?“ (لیکن کیوں پاپا؟) مثال نے احتجاج کیا۔

”Because I want you to live with me“ (کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ رہو)۔ شیردل نے اس سے کہا تھا۔ مثال اگلا سوال کرنے کی تیاری میں تھی لیکن شیردل فی الحال سوال و جواب کے اس سلسلے کو آگے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مثال کو ٹوکتے ہوئے پیار سے کہا۔ ”Papa wants to sleep sweetie“

”oh ok“ مثال نے فوراً کہا۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔ شیردل نے آنکھیں بند کر لیں۔

”Papa do you want me to give you a Paarie“ (پاپا کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو پیار کروں) مثال نے چند لمحے بعد یک دم سر اٹھا کر شیردل سے کیا۔

”Oh yes honey how can I forget that?“ (او ہاں ہنی یہ میں کیسے بھول سکتا ہوں) شیردل نے جواباً کہا۔ مثال نے بڑی خوشی خوشی اس کے سینے پر ہی کچھ آگے کھسکتے ہوئے اس کے دونوں گال

باری باری چومے۔ یہ بھی ایک معمول تھا۔ وہ اگر شیردل کے پاس سو رہی ہوتی اور شیردل تھکا ہوا ہوتا اور سونا چاہتا تو مثال اس کے گال چومتی تھی اور شیردل ظاہر کرتا جیسے اس کے بعد اسے فوراً نیند آگئی تھی۔ مثال اس کے گال چومنے کے بعد ایک بار پھر اس کے سینے پر سر رکھ کر اطمینان سے لیٹ گئی تھی۔ اس کے وجود کے گرد اپنے بازو لپیٹے شیردل نے آنکھیں بند کر لیں۔ فی الحال دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے وہ سکون کی اس جنت سے بدلنا چاہتا تھا جو اس کے سینے پر اس وقت دھری تھی۔

وہ جس وقت الارم کی آواز پر دوبارہ جاگا تھا اس نے مثال کو اپنے پاس نہیں پایا۔ اسے اندازہ تھا وہ اٹھ کر باتو واپس شہر بانو کے پاس چلی گئی ہوگی یا پھر اس وقت صبح سویرے اپنے معمول کے مطابق گھر میں ادھر ادھر پھر رہی ہوگی اپنی کسی سائیکل پر یا کسی کھلونے کے ساتھ۔

گھر کا اندرونی دروازہ ملازموں کے لیے کھولنے کے بعد وہ آ کر آفس کے لیے تیار ہونے لگا تھا اور ناشتا کرنے کے بعد وہ آفس جانے سے پہلے مثال کے بیڈروم میں آیا تھا۔ شہر بانو جاگ رہی تھی لیکن اس کے کمرے میں داخل ہونے پر اس نے کمرے میں خود پر کھینچے ہوئے کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ شیردل نے ایک نظر اسے دیکھا تھا اگر اس نے صبح سویرے مثال کی وہ گفتگو نہ سنی ہوتی تو وہ اس سے بات کرنے کی ایک اور کوشش ضرور کرتا لیکن اس وقت اس نے بستر میں ایک ٹیڈی بیئر کے ساتھ لیٹی ہوئی مثال کے ساتھ چند باتیں کر کے اسے پیار کر کے خدا حافظ کہا اور آفس آ گیا تھا۔

آفس میں اس دن کام کے دوران وہ لاشعوری طور پر شہر بانو کی طرف سے کسی ٹیکسٹ میسج یا کال کا خطرہ رہا۔ اس نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ ان کی ازدواجی زندگی میں یہ بھی پہلی بار ہوا تھا کہ آفس میں پورے دن کے دوران ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا رابطہ نہ ہوا ہو۔ وہ دونوں دن میں ایک ادھ بار ضرور کال کر لیتے تھے چاہے چند منٹ ہی کے لیے..... شہر بانو اسے سارا دن text کرتی رہتی تھی اور وہ مصروف ہونے کے دوران بھی ان ٹیکسٹ میسجز کو reply کرتا نہیں بھولتا تھا۔ اس کے بھیجے ہوئے Jokes اور quotes بھی شیردل کے لیے آفس کی تھکا دینے

حد خفگی سے اس سے کہا۔

"I don't care" شہر بانو نے جواباً بے حد تلخی سے اسے کہا۔ "اگر تمہیں میرے باپ کی پروا نہیں ہے تو مجھے تمہاری بیٹی کی پروا نہیں ہے۔" شیردل اس کی شکل دیکھ کر رو گیا۔

"تم مجھے کیا سمجھتے ہو شیردل؟..... idiot..... تمہیں کیوں ساری دنیا میں ایک میں ہی عقل سے پیدا لگتی ہوں۔" وہ بے حد خفگی سے بول رہی تھی۔

"شہر بانو میں یہاں تم سے argument نہیں کروں گا کیونکہ میں نوکروں کو کوئی تماشائیں دکھانا چاہتا۔ تم بات کرنا چاہتی ہو کھانا کھانے کے بجائے تو چلو بات کر لیتے ہیں۔" شیردل بھی کچھ برہمی کے عالم میں کھانا چھوڑ کر ٹیبل سے اٹھ گیا تھا۔

آگے پیچھے چلتے وہ دونوں بیڈروم میں آگئے تھے اور بیڈروم کا دروازہ بند کرتے ہی شیردل نے اس سے بے حد خفگی سے کہا۔ "شہر بانو اب اس سارے تماشے کو ختم کر دو..... I have had enough of it مجھے تمہیں جتنی وضاحتیں دینی تھیں میں دے چکا، جتنی صفائیاں پیش کرنی تھیں میں نے کر لیں..... انکل شہباز کا کیس ختم ہو چکا تھا اور ہم اب اس معاملے پر بات نہیں کریں گے۔"

"کیس ختم نہیں ہوا تم نے کیس ختم کر دیا ہے۔ میرے باپ کو جھوٹا اور غلط ثابت کر کے اور اس پر تم مجھ سے جھوٹ بول رہے تھے کہ عکس نے کیس واپس لے لیا۔" شہر بانو پر اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"اگر می نے تمہیں ہر چیز کے بارے میں update کر دیا ہے تو ان سے یہ بھی پوچھ لینا چاہیے تھا تمہیں کہ ہم یہ کیس عکس کی terms پر حل کرنے پر کیوں تیار ہوئے۔" شیردل نے جیسے ہوئے انداز میں کہا۔

"عکس کی وجہ سے ہوا یہ سب کچھ۔" شہر بانو نے بے ساختہ کہا اور وہ بری طرح مشتعل ہو گیا۔

"تم نے اگر اب ایک بار بھی میرے اور اس کے حوالے سے کوئی بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ مجھے اگر افیئر چلانا ہوتا تو میں دس سال پہلے اس کے ساتھ شادی کر کے بیٹھا ہوتا۔ تم اتنے عرصے سے میرے ساتھ ہو تم مجھے نہیں جانتیں کیا؟" وہ بہت خفگی میں کہہ رہا تھا۔

"شیردل میں واقعی تمہیں نہیں جانتی۔ جس شیردل کو میں جانتی تھی وہ تم نہیں ہو۔" وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ شاید اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ شہباز حسین کے معاملے کو ڈسکس کر لینا چاہیے اس سے شہر بانو کو کتنی بھی تکلیف کیوں نہ ہوتی۔ شہر بانو کی بات سنتے ہوئے شیردل نے سوچا تھا اور اسے ایک بار پھر اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک اور غلط فیصلہ غلط وقت پر کر رہا تھا۔

"شہر بانو بیٹھو۔" شیردل نے بالآخر اس کو بازو سے پکڑ کر زبردستی صوفے پر بٹھا لیا تھا۔ شہر بانو پر بہت غصہ ہونے کے باوجود شیردل کو اس وقت سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اگر شہر بانو کو شہباز حسین کے حوالے سے تفصیلات بتائے تو کس طرح بتائے۔ اسے وہ بت توڑنا تھا جو شہر بانو ساری عمر پوچھتی رہی تھی اور اس بات کے ٹکڑے شہر بانو کو بھی بری طرح زخمی کرنے والے تھے۔ وہ خفگی بھرے انداز میں منتظر بھی اس کے کچھ بولنے کی۔

"میں تمہیں کبھی یہ سب بتانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ میں جانتا ہوں اس سے تمہیں بہت تکلیف پہنچے گی لیکن تم نے مجھے بہت مجبور کر دیا ہے۔ تم نے میرے پاس دوسرا کوئی آپشن چھوڑا ہی نہیں۔" شیردل نے بے حد سنجیدگی سے کہنا شروع کیا تھا۔ وہ ماتھے پر ہل لیے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

ایک گہری سانس لے کر شیردل نے کہا۔ "شہباز انکل نے عکس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ وہ اس وقت نو سال کی تھی اور خیر دین کو نوکری سے انکل شہباز نے صرف اپنے اس جرم کو چھپانے کے لیے نکالا تھا۔" شیردل نے

حد خفگی سے اس سے کہا۔

"Yes" اس نے بے شکل شیردل سے کہا اور پھر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بے حد عجلت کے عالم میں وہ کرسی سے اتر گئی۔ پھر وہ عجیب خوف کے عالم میں وہاں سے چلی گئی تھی یوں جیسے اسے اندازہ تھا کہ اب اسے ان دو بڑوں کے درمیان نہیں ہونا چاہیے تھا۔

"تم مثال کے سامنے کس طرح ثابت کر رہی تھیں؟" مثال کے وہاں سے چلے جانے کے بعد شیردل نے بے

منزہ نے جیسے اس کے ان خدشات پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی جو وہ عکس اور شیردل کے کسی تعلق کے حوالے سے رکھتی تھی۔ وہ یہ ساری باتیں کسی دوسرے شخص سے سن رہی ہوتی تو وہ بھی یقین نہ کرتی لیکن شیردل کی بد قسمتی یہ تھی کہ یہ ساری باتیں شہر بانو سے کہنے والی خود منزہ تھیں جو سازشی یقیناً نہیں تھیں لیکن فی الحال لا جواب بے وقوفی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

"آپ لوگ میرے باپ کے خلاف یہ نہیں کر سکتے..... You can't disgrace his name" شہر بانو بات کرتے کرتے رو پڑی تھی اور اس کے رونے پر منزہ کی آنکھیں بھی نم ہونے لگی تھیں۔

"بیٹا میں تمہاری فیملی کو بچھتی ہوں، میں تمہیں بتا چکی ہوں اختیار اور شیردل کے سامنے میں helpless ہوں۔" انہوں نے گلوگیر آواز میں اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

"آپ helpless ہوں گی می..... میں نہیں ہوں۔ اگر باپ کے خلاف کوئی فیصلہ ہوتا ہے تو پھر کورٹ میں ہو..... کیس چلے..... شیردل یا باپ کون ہوتے ہیں میرے باپ کے نام کو اس طرح خراب کرنے والے..... انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان الزامات کو مان لیں جو عکس اور اس کے نانا کی طرف سے لگائے گئے ہیں۔" شہر بانو اسی رنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

"میں شیردل سے خود بات کروں گی۔ وہ مجھے بتائے بغیر یہ سب کیسے کر سکتا ہے۔"

"تم اس سے اب بات مت کرو۔ اب بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" منزہ نے اسے ایک دم ٹوک کر کہا۔ انہیں پہلی بار ایک نیا خدشہ ہوا تھا۔

"می مجھے بات کرنی ہے اس سے..... کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو۔" شہر بانو نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"تم شیردل کے شہباز پر لگائے ہوئے کسی الزام پر یقین مت کرنا۔ وہ اس وقت وہی سب کچھ کہہ رہا ہے جو عکس کہہ رہی ہے۔" منزہ نے جیسے حفظہ مقدم کے تحت اس کو پہلے سے شیردل کے ممکنہ الزامات کے انکشاف پر ان سے بدظن کرنے کی کوشش کی۔ شہر بانو کو منزہ کی بات اور اس کا کوئی سیاق و سباق سمجھ آیا تھا نہ ہی اس نے سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ منزہ اسے کوئی وارننگ نہ بھی دیتی تب بھی وہ شیردل کی کسی بات پر یقین کرنے والی نہیں تھی۔

اس رات ان کا ایک اور شدید جھگڑا ہوا تھا اور وہ شیردل کے جھوٹ سے شروع ہوا تھا۔ اس نے مصالحت کی ایک اور کوشش کا آغاز کرتے ہوئے ڈز ٹیبل پر شہر بانو سے کہا تھا کہ عکس نے کیس واپس لے لیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اب اتنا جھوٹ بول دینے کا کوئی نقصان نہیں تھا۔ شہر بانو کو کبھی پتا نہیں مل سکتا تھا کہ کیس واپس لیا گیا تھا یا اسے نمٹایا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب عکس کے ساتھ معاملہ مصالحت آمیز انداز میں حل کر لینے کے بعد شہر بانو سے ایک چھوٹا سا جھوٹ بول لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا لیکن اسے اپنی بد قسمتی کا اندازہ نہیں تھا۔

"تم دنیا کے سب سے بڑے جھوٹے ہو شیردل۔" شہر بانو اس کے انکشاف پر یک دم جیسے آگ بگولا ہو گئی تھی اسے یوں لگا تھا جیسے وہ اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شیردل اس کی بات پر کچھ دیر کے لیے فریز ہو گیا تھا۔ وہ اس رد عمل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"بیٹا تم نے کھانا کھا لیا؟" شیردل نے شہر بانو کی بات کے جواب میں مثال سے کہا تھا جو بہت ہکا بکا سی ماں کو دیکھ رہی تھی۔

"Yes" اس نے بے شکل شیردل سے کہا اور پھر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بے حد عجلت کے عالم میں وہ کرسی سے اتر گئی۔ پھر وہ عجیب خوف کے عالم میں وہاں سے چلی گئی تھی یوں جیسے اسے اندازہ تھا کہ اب اسے ان دو بڑوں کے درمیان نہیں ہونا چاہیے تھا۔

"تم مثال کے سامنے کس طرح ثابت کر رہی تھیں؟" مثال کے وہاں سے چلے جانے کے بعد شیردل نے بے

پاس رہو۔ ٹھنڈے دل سے اس ساری صورت حال کے بارے میں سوچو جب تمہارا غصہ ختم ہو جائے اور تمہیں عقل آجائے تو تم واپس آ جانا۔“ شیردل نے سرد مہری سے کہا تھا۔  
 ”مثال کو میں ساتھ لے کر جاؤں گی۔ تم مثال کو کیسے روک سکتے ہو؟“ شہر بانو نے تلخی سے اس سے کہا تھا۔  
 ”میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں تم مجھے یہ دکھانے کے لیے challenge مت کرو۔ مثال تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔“ شیردل نے دونوں انداز میں اس سے کہا۔

”تم اسے روکنے کا کوئی حق نہیں رکھتے سنا تم نے۔“ شہر بانو نے ایک بار پھر چلا کر کہا تھا۔  
 ”چلانے کی ضرورت نہیں ہے شہر بانو۔“ چلانے سے تمہاری بات کی زیادہ سمجھ نہیں آرہی مجھے۔ میں مثال کو تمہارے ساتھ جانے نہیں دوں گا اور میں اس کا باپ ہوں اسے روک سکتا ہوں۔“ شیردل نے تحکمانہ انداز میں اسے بتایا۔

”شادی کے پیرز میں تم نے اولاد کی کسٹڈی مجھے دے دی تھی شیردل۔“ شیردل کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ وہ ایک جھگڑے پر نہ صرف طلاق تک جا پہنچی تھی بلکہ شادی کے پیرز میں لکھی ہوئی شرائط اور حقوق کو اس کے سامنے ڈھرا رہی تھی۔

”شہر بانو میں شہباز حسین نہیں ہوں کہ اپنی بیٹی تمہیں تمہا کر پھر ساری عمر اس کی شکل دیکھنے کے لیے ترسوں۔ تمہیں مجھ سے الگ ہونا ہے تو بھی تمہیں پاکستان میں ہی رہنا ہوگا اگر تم مثال کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہو تو۔۔۔۔۔ میں تمہیں اس کو امریکا ساتھ لے جانے نہیں دوں گا۔“ وہ بھی اب بالکل ہتھے سے اکڑ گیا تھا۔ وہ وارڈروب کے سامنے کھڑی بے بسی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے اسے دیکھتی رہی۔ وہ مثال کے بغیر وہاں سے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور وہ شیردل کے ساتھ مکر بھی اب رہنا نہیں چاہتی تھی۔

”تم میری بیٹی کو مجھ سے چھین نہیں سکتے۔“  
 ”وہ صرف تمہاری بیٹی نہیں ہے، تمہیں اگر اس کی اتنی پروا ہے تو تم رہو یہاں پر۔“ شیردل نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، میں اتنی گری ہوئی ذہنیت کے آدمی کے ساتھ کبھی نہیں رہوں گی۔“  
 شیردل ہونٹ بھینچے اس کی بات سنتا رہا۔

”Thank you very much میں ایسا ہی ہوں اور میں ایسا ہی رہوں گا اور مجھے تم پر اپنی اچھائی

شہر بانو کا چہرہ سفید ہوتے دیکھا۔ شاک، بے یقینی، خوف۔۔۔۔۔ کیا نہیں تھا اس چہرے پر۔۔۔۔۔ اسے شہر بانو پر ترس آیا تھا۔ وہ بات جاری رکھنا چاہتا تھا اور اس نے آگے بات شروع کرنے کی کوشش کی جب شہر بانو نے اس کے چہرے پر پوری قوت سے پھٹ پھٹ مارا۔ شیردل نے دوسرے تھپڑ سے پہلے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”Don't you dare do this again۔۔۔۔۔ ہاتھ اٹھانا مجھے بھی آتا ہے لیکن بہتر۔۔۔۔۔ ہم اس کا استعمال نہ کریں۔“ اس نے شہر بانو کی دونوں کلائیوں کو بہت طیش کے عالم میں جھٹکتے ہوئے کہا تھا۔

”تم اتنا کر سکتے ہو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی شیردل۔“ اس نے شہر بانو کو کہتے سنا۔ اس کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی اور اس کا چہرہ لال بھجھکا ہو رہا تھا۔

”اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو اپنی می سے پوچھو اور۔۔۔۔۔“ شیردل نے سرد مہری سے کہا لیکن شہر بانو نے تقریباً چلاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”میں کسی سے کچھ نہیں پوچھوں گی اور تم دوبارہ باپا کے بارے میں ایسی کوئی بات کرنے کی جرأت بھی مت کرنا۔“ شیردل نے اسے زندگی میں پہلی بار چلاتے سنا تھا یہ ناقابل یقین تھا وہ اس انکشاف پر اس سے اس رد عمل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

”تمہاری می نے کہا تھا مجھ سے کہ تم اب یہی کرو گے۔۔۔۔۔ اس عورت کے کہنے پر باپا پر الزامات لگاؤ گے لیکن میں کبھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ تم ایک دو نکلے کی عورت کے لیے اپنی فیملی اپنے خونی رشتے پر بھینچڑا چھال سکتے ہو۔“ وہ مزید کچھ کہے بغیر اس کے قریب سے اٹھ گئی تھی۔ شیردل کو زندگی میں کبھی منہ پر اتنا غصہ نہیں آیا تھا انہوں نے اپنے بھائی اور اپنے خاندان کی عزت بچانے کی کوشش میں اس کی زندگی تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

شہر بانو اب وارڈروب کھول کر اس میں سے اپنے کپڑے نکال نکال کر بیڈ پر پھینکنے لگی تھی۔ اس کا ذہن اس وقت صدمے اور غصے سے ماؤف ہو رہا تھا۔

”تم کیا کر رہی ہو؟“ شیردل نے اسے اپنے کپڑے نکالتے ہوئے دیکھ کر پوچھا مگر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔

”میں تمہارے جیسے آدمی کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ تم سے شادی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ می تمہارے بارے میں جو بھی کہتی تھیں وہ ٹھیک کہتی تھیں کہ تمہاری فیملی کے مرد۔۔۔۔۔“ وہ بے حد غصے میں بات کرتے کرتے رک گئی۔

”جملہ پورا کرو اپنا شہر بانو۔۔۔۔۔ رکومت۔“ شیردل نے اسے جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا۔  
 ”تمہاری می کے اس جملے میں جس مرد کا ذکر ہے وہ انکل شہباز ہیں اور اس جملے میں ان کا ذکر کیوں ہے میں تمہیں ابھی یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔“ شیردل نے سرد مہری سے اس سے کہا۔ وہ فی الحال شہر بانو کو سمجھا بجھایا مٹا کر روکنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کو سامان پیک کرتے ہوئے دیکھ کر اس کی عقل جیسے کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ شہر بانو جذباتی اور امپجور تھی اس کا اندازہ اسے اس سے شادی کرتے وقت بھی تھا لیکن اس سے شادی کے تمام سالوں میں آج پہلی بار اس کی وہ دو خامیاں اس کے لیے مسائل کھڑے کر رہی تھیں۔

”میں تمہاری زندگی سے جارہی ہوں شیردل تمہیں اب یہ سب کچھ اس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ ایک بار پھر اس پر چلائی تھی۔ شیردل کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

”ٹھیک ہے تمہیں جانا ہے تم جاؤ۔۔۔۔۔ مثال تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ تم امریکا جا کر چند ہفتے اپنی می کے



ثابت کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم اگر میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تو ٹھیک ہے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا لیکن مثال کو میں تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا۔“ شیردل نے جتنی انداز میں اس سے کہا۔

”میں legally entitled ہوں اسے اپنے پاس رکھنے کی۔“ وہ بات کرتے کرتے بے بسی سے رو پڑی۔ شیردل ایک لمحے کے لیے ہل نہیں سکا۔ ان کی شادی شدہ زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ شہر بانو کسی بات پر روئی ہو اور شیردل موم نہ ہو گیا ہو لیکن یہ مثال کا معاملہ تھا اور وہ اپنی بیٹی کے لیے ہر قسم کے جذبات کی قربانی دے سکتا تھا۔

”تم اسے امریکا میں رکھ کر اس کی برین واشنگ کرتی رہیں..... تم اسے یہ بتاتی رہیں کہ میں بہت بڑی ہوں تم لوگوں کے ساتھ وہاں نہیں رہ پاؤں گا اس لیے اسے تمہارے اور تمہاری مگی کے ساتھ ہی وہاں رہنا پڑے گا اور تم یہ چاہتی ہو کہ میں اسے تمہارے ساتھ بھیج دوں تاکہ سال چھ مہینے کے بعد وہ میری شکل تک دیکھنا نہ چاہے..... تم شہر بانو یہ سارا تماشا پہلے سے پلان کر کے آئی تھیں۔ تم طے کر کے آئی تھیں کہ تمہیں میرے ساتھ نہیں رہنا۔“ شیردل چاہنے کے باوجود اپنے لہجے کو نرم نہیں رکھ سکا تھا۔ چند دنوں میں ان دونوں کے بیچ میں اتنی دراڑیں اور دیواریں آگئی تھیں کہ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کو جانتے تک نہ ہوں۔

”شیردل میں تم سے کوئی مزید argument نہیں چاہتی، میں صرف اپنی بیٹی کو ساتھ لے جانا چاہتی ہوں یہاں سے۔“ شہر بانو نے اس کی بات کے جواب میں روتے ہوئے کہا۔

”تم مگی کے پاس لاہور چلی جاؤ وہاں چند ہفتے رہو اس کے بعد.....“ شیردل نے جیسے اس کے آنسوؤں سے مجبور ہوتے ہوئے کہا۔ شہر بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں تمہاری فیملی کے پاس نہیں اپنی فیملی کے پاس جانا چاہتی ہوں، تم لوگوں کی sincerity اور loyalties میرے ساتھ نہیں ہیں۔“ وہ اسی طرح روتے ہوئے تلخی سے بولتی جا رہی تھی۔ ”You all are a bunch of cheaters and liars“ (تم سب جھوٹوں اور دھوکے بازوں کا ٹولا ہو) اس کے جملے نے شیردل کو دوبارہ تپا دیا تھا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ..... تمہیں واقعی اپنی ہی فیملی کے پاس جانا چاہیے اور مثال اپنی فیملی کے پاس رہے گی۔ No more argument“ وہ بے حد غصے میں کہتا ہوا اپنے بیڈ روم سے اوپر اسٹڈی میں آ گیا تھا۔ وہ اس کی زندگی کی بدترین راتوں میں سے ایک تھی۔ آپ کو اپنا گھر ٹوٹا نظر آ رہا ہو اور آپ کچھ بھی نہ کر سکتے ہوں اور آپ اس گھر کو قائم رکھنے کی شدید خواہش رکھتے ہوں۔ ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگاتا ہوا وہ بیٹھا صرف یہ سوچتا رہا کہ وہ کیا کرنا تو اس صورت حال سے بچ سکتا تھا اور وہ کیا نہ کرتا تو یہ جھگڑا اتنا بڑھتا۔ اسے اپنی غلطیاں نظر آ رہی تھیں لیکن جو بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی وہ یہ بھی کہ وہ اب کیا کرے اس ساری صورت حال سے نکلنے کے لیے..... اپنے گھر کو بچانے کے لیے۔

☆☆☆

شہر بانو اگلی صبح دس بجے جاگئی تھی۔ بھاری سر اور بو جھل آنکھوں کے ساتھ اس نے مثال کو بتایا تھا کہ وہ لوگ دوبارہ امریکا جا رہے ہیں اور اس کے سوالوں کا جواب دیے بغیر اس نے فون اٹھا کر آپریٹر سے rent a car ایک گاڑی منگوانے کے لیے کہا تھا۔ جواب اس نے آپریٹر سے جوسنا تھا اس نے اس کے دماغ کا فوز اڑا دیا تھا۔

”سوری میڈم ڈی سی صاحب کا حکم ہے کہ یہاں کوئی گاڑی وغیرہ نہیں آئے گی اور ان کی اجازت کے بغیر آپ گھر سے کہیں نہیں جاسکتیں۔“ شہر بانو نے ایک لفظ بھی کہے بغیر ریسور رکھ دیا تھا۔ تذلیل کا ایسا احساس اسے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک ملازم اس کی بات ماننے سے انکار کر رہا تھا کیونکہ اس کے صاحب نے اس کے سامنے اس کی

ماہنامہ پاکیزہ - ستمبر 2012ء

عکس

کوئی عزت نہیں رکھتی تھی۔ شیردل کے خلاف اس کے دل میں لگنے والی گہریوں میں ایک اور گرہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی اور وہ یہ سلوک deserve نہیں کرتی تھی کہ وہ اسے اپنے ہی گھر میں ایک قیدی بنا دیتا۔ بے حد غم اور کھٹکی کے عالم میں اس نے اس لا کر میں سے اپنا اور مثال کا پاسپورٹ نکالنا چاہا تھا جہاں ان لوگوں کے travel documents رکھے ہوتے تھے۔ وہاں اس کا پاسپورٹ تھا لیکن مثال کا پاسپورٹ نہیں تھا۔ شیردل یقیناً حفظ ماتقدم کے طور پر صبح آفس جاتے ہوئے مثال کا پاسپورٹ وہاں سے لے گیا تھا۔ وہ کچھ دیر سائیکٹ اس لا کر کے سامنے کھڑی رہی تھی۔ شیردل نے جیسے ان دونوں کے رشتے کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔

☆☆☆

شیردل چار بجے کے قریب اپنے آفس میں مارکیٹ کمیٹی کی ایک میٹنگ کو چیئر کر رہا تھا جب اس کے آفس کا آپریٹر بہت گھبراہٹ کے عالم میں اندر آیا تھا۔ میٹنگ روم میں کالز دینے کی اجازت نہیں تھی۔ شاید وہ اس لیے خود آ گیا تھا۔

”سر، گھر میں ایمر جنسی ہو گئی ہے۔“ شیردل کے دل کی دھڑکن چند لمحوں کے لیے جیسے عجیب خوف کے عالم میں رکی تھی۔

”کیا ہوا؟“

”سر، گھر سے آپریٹر کا فون آیا ہے امریکن قونصلیٹ کے لوگ وزارت داخلہ کے چند آفیسرز کے ساتھ وہاں آئے ہیں۔“ آپریٹر نے بہت نپے تلے لفظوں میں ان لوگوں کی آمد کا مقصد بتائے بغیر شیردل کو آنے والی مصیبت سے خبردار کیا۔ زندگی میں پہلی بار شیردل کے قدموں کے نیچے سے زمین جیسے واقعی نکل گئی تھی۔ اسے کسی مزید سوال و جواب کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا امریکی قونصلیٹ کو مدد کی کال کس نے دی تھی اور وہ کس کو rescue کرنے وہاں آئے تھے مگر جس چیز پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا وہ یہ تھی کہ شہر بانو اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتی تھی۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر یک دم میٹنگ کو کنسل کرنے کا اعلان تک کیے بغیر وہاں سے نکل گیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو گھر چلنے کا کہہ کر اس نے مختیار شیردل کو فون کر کے اس معاملے کے بارے میں آگاہ کیا تھا۔ وہ بھی اس کی طرح شکا کڈ رہ گئے تھے۔

”آپ ان دونوں کا نام ECL میں ڈلوادیں ورنہ شہر بانو مثال کو لے کر چلی جائے گی۔ امریکن قونصلیٹ والے اس کے travel documents گھنٹوں میں تیار کر لیں گے۔“ وہ اب باب سے کہہ رہا تھا جواب

برہم تھا۔

”شہر بانو اس طرح کی حرکت کیسے کر سکتی ہے اس نے تمہاری عزت اور reputation کا خیال نہیں کیا۔“ فیملی کے نام کا خیال نہیں کیا۔ دو چار گھنٹوں میں ڈویژن میں اس چھاپے کا شور مچ جائے گا۔ Our wife is ..... an idiot۔“ بختیار اب شدید برہم تھے۔ ان کے خاندان کو پہلی بار ایسی سبکی اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

”پاپا میں وہ قصہ کاٹ رہا ہوں جو می نے میرے لیے تیار کیا ہے۔ می کی false pride اور جھوٹ میرا گھر توڑ دیا۔“ اس نے مزید کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا۔

اس کی رہائش گاہ پر بھاری بھر کم گاڑیوں کی ایک لمبی قطار موجود تھی اور گیٹ کھلے ہوئے تھے۔ وہ public humiliation تھی جس کا وہ اس وقت سامنا کر رہا تھا اور جو شہر بانو کی طرف سے اس کے لیے تھنہ تھی۔

وہ اس کی سرکاری رہائش گاہ تھی اور اس کا دروازہ اس کی اجازت کے بغیر نہ کوئی کھول سکتا تھا نہ وہاں کوئی آ سکتا

لیکن اس وقت اس کے لاؤنج میں دس بارہ مرد موجود تھے جن میں ایک سفید فام تھا۔ بے حد سرد مہری سے ہونے والے

چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد شیردل نے ان سے کہا کہ وہ شہر بانو کے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا۔ اس کی اس بات

اس سفید فام کے ساتھ آئے ہوئے امریکن قونصلیٹ کے ایک پاکستانی اہلکار نے بڑی بدتمیزی اور رکھائی کے ساتھ روک

تھا اور وزارت داخلہ کے ساتھ آئے ہوئے ان اہلکاروں نے اسے اپنے بیڈروم کی طرف جانے سے روک دیا۔

”میری بیوی جانا چاہتی ہے آپ اسے لے جائیں لیکن آپ لوگ میری بیٹی کو نہیں لے جاسکتے۔“ شیردل

برہمی کے ساتھ کہا۔ وہ اپنے غصے پر قابو رکھنے کی شدید کوشش کر رہا تھا کیونکہ اسے صورت حال کی سنگینی کا اچھی طرح

اندازہ تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی مزید جھگڑے کے نتیجے میں معاملہ مزید خراب ہو لیکن خود پر کنٹرول کرنا اس وقت

بالکل آسان نہیں تھا۔ وہ اس کا گھر تھا اور وہ اسے اس کے اپنے گھر میں اس کمرے سے نکلنے نہیں دے رہے تھے۔

سے بڑھ کر کوئی اس کی کیا بے عزتی کر سکتا تھا۔

پانچ منٹ گزرے تھے اسے ان لوگوں سے بحث کرتے جب قونصلیٹ کی ایک خاتون اہلکار کے ساتھ شہر بانو

مثال کو اٹھائے ہوئے وہاں آئی تھی اور اس کے آتے ہی وہاں موجود تمام لوگ جانے کے لیے کھڑے ہو گئے تھے

مثال نے باب کو دیکھتے ہی بہت خوشی کے عالم میں دونوں بازو اس کی طرف پھیلائے تھے۔ شیردل بے اختیار اس

طرف گیا تھا لیکن ایک اہلکار ان دونوں کے درمیان آ گیا۔

”شہر بانو میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں، ہم یہ مسئلہ خود حل کر سکتے ہیں۔“ شیردل نے اپنے سارے غصے سامنے

انا کو ایک طرف رکھتے ہوئے مصالحت کی ایک اور کوشش کی تھی۔

”میں تم سے کسی بھی قسم کی بات کرنا نہیں چاہتی۔ You are not worth it۔“ شہر بانو نے بے

چہرے کے ساتھ اسے کہہ کر ان تمام لوگوں کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

”پاپا..... پاپا..... I want to go to Papa.....“ مثال نے ایک دم ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے حوالہ

باختگی میں رونا شروع کر دیا تھا۔ اسے شاید پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ شہر بانو اسے شیردل سے دور لے جانے کی کوشش

کر رہی تھی۔ شیردل اس کے بلکنے پر بے قرار ہو کر اس کے پیچھے گیا تھا۔ وزارت داخلہ کے لوگوں نے اس کا راجہ

روک لیا تھا اور تب تک اسے وہیں رکھا جب تک شہر بانو قونصلیٹ کے افراد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے

نہیں گئی۔ ان کے وہاں سے جانے کے بعد وہ لوگ بھی شیردل سے کچھ معذرت خواہانہ انداز میں بات کرتے ہوئے

چلے گئے۔ شیردل جانتا تھا کہ وہ لوگ اب وہاں سے جا چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ میکانیکی انداز میں ڈرائیو میں

وہ ماؤف ذہن اور حواس کے ساتھ بے یقینی کے ایک عجیب عالم میں بہت دیر وہاں کھڑا بہت دیر بند گیٹ کو دیکھتا رہا جہاں سے وہ گاڑیاں گئی تھیں۔ اس کے کانوں میں مثال کے رونے کے علاوہ کسی کی آواز نہیں آ رہی تھی اور وہ جانتا تھا وہ گاڑی میں بھی اسی طرح رو اور چلا رہی ہوگی۔

☆☆☆

”ECL پر نام ہیں دونوں کے..... وہ کم از کم پاکستان سے باہر نہیں جاسکتے۔ میں امریکن قونسلٹ میں کسی جاننے والے کے ذریعے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ شہر بانو سے کسی طرح رابطہ ہو سکے۔“ بختیار نے شیردل کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ شیردل، شہر بانو کے وہاں سے جانے کے بعد فوری طور پر لاہور بختیار کے پاس چلا آیا تھا۔ منزہ تب تک اس سارے معاملے کے بارے میں جان چکی تھیں اور وہ بھی اسی طرح کے شاک میں تھیں جیسا شاک بختیار اور شیردل کو لگا تھا جو آخری چیز وہ شہر بانو سے expect کر سکتے تھے وہ ایسا کوئی قدم تھا۔ بختیار، شیردل کے لاہور پہنچنے سے پہلے منزہ پر بھی خاصا برس چکے تھے۔ کوئی عام حالات ہوتے تو منزہ، بختیار کی اس ڈانٹ ڈپٹ کو کبھی برداشت نہ کرتیں لیکن اب وہ بھی بے حد ندامت کے عالم میں یہ سب کچھ سنتی رہی تھیں اور وہ ندامت دو گھنٹے کے بعد شیردل کو اپنے گھر پر دیکھ کر بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے شیردل کو کبھی اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ صرف شہباز حسین تھا جسے شرمین کے شہر بانو کو لے جانے کے بعد وہ اس حال میں دیکھتی رہی تھیں اور شیردل اور شہباز میں نظر آنے والی اس مماثلت نے منزہ کو ہلادیا تھا۔

شیردل نے گھر آ کر منزہ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس نے منزہ کو دیکھنے کے باوجود انہیں مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے ملازم سے بختیار کا پوچھا تھا اور ان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ منزہ نے اسے روک کر اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن شیردل نے بے حد درشتی سے ان سے کہا تھا۔

”میں آپ سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی میں اور پاپا آپ کے سامنے کوئی بات کریں گے۔ آپ مت آئیں میرے پیچھے۔“ وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ منزہ وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئیں، وہ جیسے انہیں shut up کال دے کر گیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو منزہ شیردل کے ایسے جملوں پر اسے اپنے گھر میں کھڑے رہنے تک نہ دیتیں لیکن آج وہ اس کے ان توہین آمیز جملوں کے باوجود اس کے خلاف اپنے دل میں کچھ بُرا نہیں لاسکی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کی نظروں میں اپنی غلطیوں کی وجہ سے گری تھیں اور انہیں اس وقت پہلی بار بری طرح سے احساس جرم ہو رہا تھا۔ شہر بانو کا مثال کو اس طرح سے لے جانا ان سے بھی ہضم نہیں ہو پارہا تھا۔ تاریخ جیسے ایک ہی گھر میں اپنے آپ کو پھر سے دہرانے لگی تھی۔

شیردل کے منع کرنے کے باوجود وہ اس کمرے میں آنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکی تھیں جہاں وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں نے بات چیت کرتے کرتے منزہ کو اندر آتا... دیکھ کر کچھ دیر کے لیے خاموشی اختیار کی تھی لیکن اس کے بعد پھر بات کرنے لگے تھے۔ اس وقت منزہ سے زیادہ بڑا مسئلہ ان کے لیے شہر بانو اور مثال کو پاکستان سے چلے جانے سے روکنا تھا۔ منزہ کو لعنت ملامت بعد میں بھی ہو سکتی تھی۔

بختیار، شیردل کے ساتھ گفتگو کے دوران مسلسل مختلف جگہوں پر فون کرنے میں مصروف تھے اور شیردل نے لاہور آنے کے سفر کے دوران اپنے کچھ سینئر آفیسرز کی کالز ریسیو کر کے ان سے صورت حال کی وضاحت کی تھی جو اس کے گھر پر ہونے والے اس واقعے سے باخبر ہو چکے تھے۔ شیردل کو اندازہ تھا کہ صرف اس کے ڈویژن کے آفیسرز ہی نہیں اس وقت پورے پنجاب کی اسٹبلشمنٹ میں اس کے گھر پر ہونے والا یہ چھا پاپا ہی ڈسکس ہو رہا ہوگا۔ وہ جیسے صرف چند گھنٹوں میں ایک قابل آفیسر سے صرف ایک ”بڑا شوہر“ بن کر رہ گیا تھا جو اپنی امریکن بیوی پر اتنا بھی

میری طرح سے ہرٹ کیا تھا کہ وہ اپنے اور اس کے تعلق کے بارے میں سب بھول گئی تھی۔ اگر کوئی چیز اسے یاد رہی تھی تو صرف یہ کہ شیردل نے اس کے پاپا پر ایک عورت کی باتوں میں آکر گھناؤنا الزام لگایا تھا۔ اس کے آئیڈیل پاپا پر جو کچھ غلط کر ہی نہیں سکتے تھے۔ جن کو وہ سارا بچپن آئیڈیل بنا کر کرتی رہی تھی۔ وہ اس mode of denial (کسی بات سے انکاری ہونا) میں تھی جس میں ہم سب اپنے اپنے آئیڈیل کو defend کرنے کے لیے آخری حد تک جانے کو تیار رہتے ہیں۔ حقائق کو جھوٹ کہتے ہیں اور اس کے لیے دیے جانے والے دلائل کو بکواس۔ کیونکہ ہم اپنے بہت اندر نہیں نہ کہیں اس یقین کے جڑ پکڑنے سے ڈرتے ہیں جو ہمیں آئینے میں حقیقت کا اصل عکس دکھا رہا ہوتا ہے۔ آنکھیں اور کان بند کر کے کبوتر بن کر ہم اپنے آئیڈیل اور عزیز ترین شخص کے جوت کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو نقصان پہنچا لیتے ہیں۔ شہر بانو نے بھی یہی کیا تھا وہ اپنے ”آئیڈیل پاپا“ کے image (ساکھ) کو بچاتے بچاتے اپنی ”آئیڈیل زندگی“ کو گنوا بیٹھی تھی بالکل منہ کی طرح جو ایک ”آئیڈیل بھائی“ کے image کا دفاع کرتے کرتے اپنے شوہر اور اولاد کی نظروں میں گر گئی تھی۔

شہر بانو کے لیے ”حقیقت“ شاید اتنا بڑا مسئلہ نہ بنتی اگر اس نے حقیقت کو منہ یا شرمین کی کسی سرگوشی میں سنا ہوتا لیکن وہ حقیقت اس نے شیردل کے منہ سے علی الاعلان سنی تھی اور اس وقت سنی تھی جب خود شیردل کا image عکس کی وجہ سے اس کی نظروں میں مسخ ہو چکا تھا۔

امریکن تو نصیحت کو فون کرنے سے ان کی آمد، پھر شیردل کے گھر سے روانگی اور پھر پاکستان سے امریکا جانے والی فلائٹ پر چڑھنے تک وہ اشتعال میں تھی۔ ہوش و حواس کو کھانچا جانے والا اشتعال۔ شیردل ایک دم جیسے وہ punching bag (باکسروں کے بیچ مارنے کی پریکٹس کرنے والا بیگ) بن گیا تھا۔ جس کی شہر بانو کو ساری عمر ضرورت رہی تھی کوئی ایسا شخص جس پر وہ سارا غصہ نکال سکے جو اس نے شہباز حسین کو کھو دینے پر محسوس کیا تھا اپنے بچپن کی وہ ساری فرسٹریشن جو باپ کے ایک دم کسی وجہ کے بغیر زندگی سے غائب ہو جانے پر اس کے پورے بچپن کو مسخ کرتی رہی تھی۔ وہ شرمین پر بچپن میں بھی اپنا غصہ اس طرح سے نہیں نکال پائی تھی جس طرح وہ نکالنا چاہتی تھی کیونکہ لاشعوری طور پر اسے کہیں نہ کہیں یہ احساس تھا کہ اب اس کے علاوہ دنیا میں فیملی نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہیں تھی اور وہ مالی، جسمانی، جذباتی طور پر اس کی مدد اور سہارے کی محتاج تھی۔ فاروق سے شرمین کی شادی نے ماں کے حوالے سے اس کے عدم تحفظ کو جیسے اور بڑھا دیا تھا لیکن شیردل کے ساتھ معاملہ دوسرا تھا۔ اسے دشمن بنانا آسان تھا کیونکہ شہر بانو کی نظروں میں اب وہ ایک پیار کرنے والا جان چھڑکنے والا وفادار ساتھی اور شوہر نہیں تھا صرف ایک cheater (دھوکے باز) تھا جو اس کے ساتھ رہتے ہوئے ایک دوسری عورت کے ساتھ بھی افیئر چلا رہا تھا اور اس عورت کی محبت میں وہ اس کے باپ پر کچڑا چھال رہا تھا۔ اس کے پاس مثال کی شکل میں اب فیملی تھی وہ تنہا نہیں تھی۔ وہ شیردل کی محتاج نہیں تھی۔ وہ شیردل کو اتنا ہی ہرٹ کرنا چاہتی تھی جتنا وہ ہوئی تھی۔

مثال، شیردل کے گھر سے صرف لاہور کے سفر کے دوران ہی روتی نہیں رہی تھی، وہ امریکا کی فلائٹ میں بھی اسی طرح روتی رہی تھی۔ شہر بانو کی دھمکیوں، ڈانٹ ڈپٹ، پیار، تسلیوں اور کسی جھوٹ اور دلا سے اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی ماں اسے اس کے باپ سے بہت دور لے کر جا رہی تھی کیونکہ اس کے اور اس کے باپ کے درمیان اب ”فائنٹ“ ہو چکی تھی اور اس کی می اب کبھی بھی اس کو واپس شیردل کے پاس نہیں لے جانے والی تھی۔ وہ بے حد کم عمر تھی نہ مسائل سمجھ سکتی تھی نہ جو بات نہ نتائج لیکن وہ ”جدائی“ اور ”جھگڑنے“ کو سمجھ سکتی تھی۔ بچوں کی چھٹی جس ان دو چیزوں کو بڑوں سے بھی جلد بھانپتی ہے۔ اس کے مسلسل رونے اور سوالوں سے تنگ آتے ہوئے ایک اسٹیج پر آکر شہر بانو نے اس کو چپ کرانے کی ہر کوشش چھوڑ دی تھی۔ اس کے پاس مثال سے بولنے کے

کنٹرول نہیں رکھ سکا کہ اسے اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کر لیتا۔ شیردل نے چند ایک سینئر آفسرز کی کالز کے بعد دوسرے آفسرز اور اپنے بیچ میٹس کی طرف سے آنے والی کالیں لینا بند کر دیں۔ اس میں فی الحال بار بار اس سارے قصے اور شہر بانو اور اپنے اختلافات کو دہرانے کی ہمت نہیں اُٹھاتی اور نہ ہی اسے ان میں سے کسی کی solidarity اور سپورٹ کی ضرورت تھی۔ ان میں سے کسی کی سپورٹ اس کی زندگی کے اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتی تھی۔

بختیار اور شیردل شام تک بیٹھے مختلف جگہوں پر فون کرتے ہوئے شہر بانو سے رابطہ کی کوشش کرتے رہے۔ صرف اس اطمینان کے ساتھ کہ وہ پاکستان میں ہی تھی لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ امریکن تو نصیحت کی مدد کے ساتھ شیردل کے گھر سے آنے کے صرف چار گھنٹے کے بعد مثال کے وزارت داخلہ کی مدد سے بنوائے گئے ایمر جنسی ٹریول ڈاکومنٹس کے ساتھ پاکستان سے جا چکی تھی۔ یہ بختیار کی خوش فہمی تھی کہ اس کی ہدایات پر ان دونوں کا نام ECL پر ڈالا جا چکا تھا۔ ان دونوں کا نام ECL پر ڈالنے کے احکامات تو یقیناً ایٹھ ہو چکے تھے لیکن ان احکامات کو امریکی تو نصیحت کی مداخلت اور دباؤ کی وجہ سے تب تک مؤخر رکھا گیا جب تک شہر بانو اور مثال اپنی فلائٹ پر بیٹھ نہیں گئیں۔

شیردل اس تمام عرصے کے دوران پاگلوں کی طرح بار بار شہر بانو کے فون پر کال کرنے کی کوشش کرتا رہا، صرف اس امید پر کہ شاید اس کا بند فون کسی دوسرے سے بات کرنے کے لیے کھلا ملتا اور اس کی کال آنے پر شاید شہر بانو اس کی کال ریسیو کر لیتی۔ شاید تب تک اس کا غصہ ختم ہو چکا ہو۔ اس نے اسے درجنوں نہیں سیکڑوں text کیے تھے معذرت کے۔ ایک دفعہ بات کرنے کی request کی۔ اس کی ہر بات ماننے کے وعدے کے۔ اس کی تمام شکایات دور کرنے کے۔ اور ان میں سے ہر text کو ٹائپ کرتے اور بھیجتے ہوئے شیردل نے اپنی اتنا اور عزت نفس کو بار بار روندنا تھا۔ اسے شہر بانو پر جتنا غصہ تھا اس کے بعد وہ زندگی میں دوبارہ کبھی اس کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ رہنا دور کی بات تھی لیکن اس کے پاس مثال تھی۔ روتی ہوئی مثال۔ وہ طوطا جس میں جن کی جان تھی۔ اور شیردل اپنی بیٹی کی خاطر اس وقت اپنے غصے اور انا کو بھلا بیٹھا تھا۔

اس کے کسی text کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ شہر بانو کا فون مسلسل بند ہی رہا تھا۔ شام کو سات بجے بختیار کو بالآخر تو نصیحت کے کسی اہلکار نے شہر بانو اور مثال کے پاکستان سے چلے جانے کی اطلاع دی تھی۔ بختیار اور شیردل کے لیے یہ جیسے ایک اور بڑا سیٹ بیک تھا۔ ECL پر نام ہونے کے باوجود وہ دونوں کیسے چلی گئی تھیں یہ بھی بہت دیر تک راز نہیں رہا تھا۔ وہ لوگ جیسے جیسے میں چلے گئے تھے۔ ابھی تک جو امید شیردل کو جدوجہد کرتے رہنے پر اُکسا رہی تھی وہ یہی تھی کہ وہ دونوں پاکستان میں ہی تھیں اگر فوری طور پر نہیں تو چند دنوں میں اس مسئلے کا کوئی حل نکل آئے گا لیکن ان دونوں کا تمام رکاوٹوں کے باوجود پاکستان سے نکل جانا جیسے شیردل کے لیے پھانسی کے پھندے سے لٹک جانے کے مترادف تھا۔ بُری خبر صرف یہ نہیں تھی کہ وہ دونوں پاکستان سے چلی گئی تھیں۔ بری خبر یہ تھی کہ شیردل کی شہر بانو کے ساتھ شادی امریکا میں ہوئی تھی اور وہ نکاح نامے میں طلاق کا حق شادی کے وقت شہر بانو کو تفویض کر چکا تھا۔ شہر بانو کو اب اس سے طلاق کے لیے پاکستان واپس آنے کی ضرورت نہیں تھی۔

☆☆☆

پتا نہیں غصے کی وہ کون سی حالت ہوتی ہے جس میں انسان برسوں کے ساتھ اور ساتھی کو لمحوں میں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ پیار، محبت، اعتماد، دوستی کوئی چیز پاؤں کی زنجیر نہیں بن پاتی۔ شہر بانو، شیردل کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور اسے اس شخص کو زندگی سے نکال دینے کا فیصلہ کرنے میں چند منٹ لگے تھے۔ شہباز حسین کے بارے میں کیے جانے والے اس کے انکشاف نے شہر بانو کو کچھ اس

کی طرح حیران اور متفکر ہوا تھا۔ عکس کا دل بے اختیار جا ہا کہ وہ خیر دین کو یہ بتائے کہ شیر دل کی بیوی شہباز حسین کی بنی تھی..... وہی بار بی ڈول جس پر بچپن میں عکس کا بری طرح دل آ گیا تھا اور وہ جس کے گرد منڈلائی رہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں اس وقت وہ چاہتے ہوئے بھی خیر دین کو یہ بات نہیں بتا سکی۔

”تمہاری شیر دل سے بات ہوئی؟“ خیر دین نے اس سے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے بے اختیار کہا۔

”کیوں؟“ خیر دین جیسے کچھ حیران ہوا تھا۔  
 ”اس کا فون آف تھا میں نے کوشش کی رابطہ کرنے کی..... ایک دو دن تک بات کروں گی۔“ اس نے کچھ...  
 بے ربطی سے کہا۔ خیر دین اسے دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔

عکس نے شیردل کو آنے والے دنوں میں تبھی کال نہیں کیا تھا..... شدید خواہش رکھنے کے باوجود اور یہ احساس ہونے کے باوجود کہ وہ شدید پریشانی کی حالت میں ہوگا..... وہ چاہتی تھی کہ اگر یہ کرائس اس کی وجہ سے آیا ہے تو وہ اس کو اپنی کسی مداخلت سے مزید بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔

خیر دین اگلے چند دن اس سے شیر دِل کے بارے میں پوچھتا رہا تھا لیکن اس کی خاموشی اور عدم دلچسپی پر بالآخر اس نے بھی اس مسئلے پر بات کرنا چھوڑ دی تھی۔

حلیہ ان دنوں اپنے سسرال غمی ہوئی تھی اور جب وہ واپس آئی تو اس نے ایک بار پھر عکس کی شادی کے حوالے سے بات شروع کر دی تھی۔ وہ اس بار اپنے شوہر کے دور پار کے رشتے داروں میں کسی ڈاکٹر کے پروپوزل کے بارے میں خیر دین اور عکس سے بات کر رہی تھی جو دینی کے کسی ہاسپٹل میں کام کر رہا تھا اور ان دنوں پاکستان آیا ہوا تھا۔ جواد مہلی سے منگنی ختم ہونے کا خیر دین کو اتنا صدمہ نہیں ہوا تھا جتنا حلیہ کو ہوا تھا۔ اسے جواد مہلی سے بھی زیادہ اس کا خاندان پسند تھا اور اس کے لیے یہ بہت فخر کی بات تھی کہ اس کی بیٹی اتنے بڑے خاندان کا حصہ بننے والی تھی۔ وہ ایک سال سے عکس کے مستقبل کے حوالے سے نہ صرف مطمئن ہو گئی تھی بلکہ فخر یہ انداز میں اپنے سسرالی خاندان میں سب کو اس کے بارے میں بتاتی بھی رہی تھی اور اب خیر دین کی بیماری کے دوران اس طرح ان لوگوں کا رشتہ توڑ دینا نہ صرف اس کے لیے بہت صدمے اور سکی کا باعث تھا بلکہ پریشانی کا بھی اور وہ اسے عکس کی خوش قسمتی سمجھتی تھی کہ جواد سے رشتہ ختم ہونے کے چند دنوں کے اندر عکس کے لیے ایک اور رشتہ آ گیا تھا۔

نکس نے خیر دین اور حلیمہ کے اصرار کے باوجود انہیں جواد کے خاندان سے رابطہ کر کے ملگنی توڑنے کی وجوہات کے بارے میں پوچھنے نہیں دیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جواد یا اس کا خاندان شیردل کی ماں کے لگائے ہوئے الزامات ڈھرائے گا اور وہ خیر دین اور حلیمہ کو اس شاک اور ایک نئے تماشے سے بچانا چاہتی تھی لیکن بعض چیزیں لاکھ کوشش کے باوجود ہو کر رہتی ہیں۔ وہ بھی یہ نہیں سوچ سکتی تھی کہ شرمین خیر دین سے رابطہ کر کے اس سارے معاملے پر بات کر سکتی تھی۔

”بہت اچھا لڑکا ہے چڑیا وہ..... ایک بار مل لو اس سے..... ابھی پورا مہینہ یہاں ہے۔“ حلیمہ اس دن بھی صبح سویرے ناشتے کی میز پر اسے اس لڑکے سے ملنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ غلّس خاموشی سے ناشتا کر رہی تھی۔ ”اور وہ سنہیں جانتا بھی ہے تمہارے ساتھ پڑھا ہوا ہے..... کہہ رہا تھا تم بھی اسے جانتی ہو۔“ وہ ناشتا کرتے کرتے چونکی تھی۔

”میرے ساتھ پڑھا ہوا ہے..... کیا نام ہے اس کا؟“ اس نے کچھ دلچسپی لیتے ہوئے ماں سے پوچھا تھا۔  
(باقی آئندہ)

لیے اب کوئی جھوٹ نہیں رہا تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ بولنا نہیں چاہتی تھی۔

شرمین سے اس کی بات امریکن قونصلیٹ میں قیام کے دوران ہوئی تھی۔ اس نے شرمین کو بتا دیا تھا کہ وہ شیردل کا گھر چھوڑ آئی ہے تاہم اس نے وجوہات نہیں بتائی تھیں نہ ہی شرمین نے اس سے اس وقت کچھ بھی پوچھا تھا۔ لیکن اس کی امریکا روانگی سے پہلے شیردل نے ان سے رابطہ اور بات کرنے کی کوشش کی تھی جسے انہوں نے بہت جلدی کے عالم میں جھٹک دیا تھا لیکن بخیرار کی کال لینے سے وہ کوشش کے باوجود انکار نہیں کر سکی تھیں اور وہ کال لینے کے بعد وہ اس کال کو لینے پر بہت پچھتائی تھیں۔ ان کی دنیا دوسری دفعہ مل کر رہ گئی تھی۔ عکس نام کی بازگشت نے اس باران کی بیٹی کی پرسکون زندگی میں طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ شہباز حسین کے اس گناہ پر انہوں نے ساری عمر پردہ ڈالا تھا ساری عمر انہوں نے شہربانو سے اس کو چھپایا تھا۔ اس کی نظروں میں خود بُرا بن کر بھی انہوں نے شہباز حسین کے ”بت“ کو اس کے ذہن اور نظروں میں ٹوٹنے نہیں دیا تھا اور وہ بت کہاں اور کس عمر میں آکر ٹوٹا تھا۔ ماں باپ کے کیے ہوئے بعض گناہ صرف ان کی اپنی زندگی برباد نہیں کرتے وہ وراثت کی طرح چلتے ہوئے ان کی اولاد کے سامنے پاتال بن کر آجاتے ہیں اور کس طرح..... کہ انسان بھی تصور بھی نہیں کر سکتا.....

شرمین، بختیار شیردل کی بات صرف سنتی رہی تھیں، انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اپنا غصہ بھول گئی تھیں اور شہربانو کے اٹھائے ہوئے قدم پر کچھ کہنے کے لیے ان کے پاس کوئی الفاظ نہیں تھے۔ عکس مراد علی کا سایہ بھی بھوت بن سکتا تھا یہ انہیں اندازہ نہیں تھا۔ اگر انہوں نے رات کے اس پہر شیردل کے فون پر تب عکس سے بات نہ کی ہوتی تو آج وہ شہربانو کو ہی قصور وار سمجھ کر سمجھانے کی کوشش کرتیں مگر شرمین خود اسی غلط فہمی کا شکار تھیں کہ شیردل، عکس کے ساتھ نہ صرف افیئر چلا رہا تھا بلکہ وہ افیئر بہت غلط حدود تک جا پہنچا تھا۔ انہوں نے اس کے باوجود اس فون کال کو شہربانو سے چھپا کر جیسے اسے ایک بار پھر اپنا گھر بچانے اور بنائے رکھنے کا موقع دیا تھا لیکن اب وہ اس راز کو بھی شہربانو سے چھپانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھیں۔ اگر باقی سب کچھ چھپا نہیں رہ سکتا تھا تو پھر اس ایک راز کو چھپانے کا بھی کیا فائدہ تھا لیکن اس دن عکس مراد علی کے لیے اتنے سالوں سے ان کے دل میں موجود ہمدردی اور اس کے حوالے سے ان کا احساس جرم ختم ہو گیا تھا۔ انسان اپنی اولاد پر آنے والی تکلیف کو بھی justify نہیں کر سکتا نہ ان لوگوں سے ہمدردی رکھ سکتا ہے جو اس تکلیف کے ذمہ دار ہوں۔

☆☆☆

عکس کو اس سارے واقعے کے بارے میں چند گھنٹوں میں پتا چل گیا تھا۔ وہ لوگ ایک ہی ڈویژن میں کام کر رہے تھے یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ واقعہ اس سے زیادہ دیر تک چھپا رہتا۔ کچھ دیر کے لیے وہ بھی شاکڈ ہی رہ گئی تھی۔ وہ شیردل کو directly اور شہر بانو کو indirectly جانتی تھی اور وہ یہ سمجھ نہیں پاتی تھی کہ ان دونوں میں اچانک ایسا کیا ہوا تھا کہ شہر بانو کو امریکن تو فیصلیت والوں کی مدد ملتی پڑی تھی۔ صرف ایک دن پہلے تک شیردل اس کو سب "Perfect" بتا رہا تھا اور ایک دن بعد..... اس نے یقیناً اس سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ اس سے فون کر کے بات کرنا چاہتی تھی لیکن چاہتے ہوئے بھی اس نے شیردل کو فون نہیں کیا۔ وہ اس کے اوپر شہر بانو کے درمیان ہونے والے کسی مسئلے میں نہیں آنا چاہتی تھی لیکن اس کے باوجود اسے شیردل سے پوری ہمدردی تھی۔ وہ اس وقت اس کی ذہنی حالت کا بھی اندازہ کر سکتی تھی۔ جو چیز اسے رہ رہ کر پریشان کر رہی تھی وہ اس کا یہ شک تھا کہ اس سارے واقعے کی وجہ دو دن پہلے شہباز حسین کے معاملے پر شیردل کے خاندان کی خود اختیار کردہ پسپائی اور مصالحت نہ ہو۔ وہ اس دن عجیب ذہنی اضطراب کے عالم میں گھر آئی تھی اور وہ خیر دین سے یہ بات ڈسکس کے بغیر نہیں رہ سکی۔

”شیردل تو بہت اچھا لڑکا ہے..... ایسا کیا ہو گیا کہ اس کی بیوی کو اس طرح کا قدم اٹھانا پڑا؟“ خیردین بھی اسی

طغرل نے اس آئینے میں پہلے اپنے آپ کو دیکھا پھر اپنے عقب میں آئے شیردل اور عکس کو دیکھا۔ اسے وہاں رکے دیکھ کر شیردل بھی وہاں چند لمحوں کے لیے رک گیا تھا۔ عکس نے پلٹ کر ایک بار پھر باذل کا ہاتھ پکڑ لیا جس نے بڑی مہارت سے گاڑی سے نکل کر یہاں برآمدے میں آنے تک چند قدموں کے فاصلے میں دو بار اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا تھا۔ اس پر قابو پانا صرف اسی کا کمال تھا۔

”تمہیں پتا ہے میں نے تمہاری می کو پہلی بار کہاں دیکھا تھا؟“ عکس نے آئینے کے سامنے کھڑے شیردل کو طغرل سے کہتے سنا۔

”کہاں پایا؟“ طغرل نے بڑی دلچسپی سے گردن موڑ کر باپ کو دیکھا۔

”اسی گھر میں۔“ عکس کی نظریں آئینے میں شیردل سے ملی تھیں۔ ان آنکھوں میں شیردل کو حیرانی نظر آئی۔ وہ مسکرایا تھا اور وہ حیرانی بل بھر میں ایک کھلکھلاہٹ میں بدل گئی تھی۔ عکس ہنس پڑی تھی۔ اسے یاد آ گیا تھا شیردل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس نے پہلی بار اسے اسی آئینے میں دیکھا تھا جب وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ٹینس شٹس کی پریکٹس کرتا تھا اور وہ برآمدے کے ایک ستون کے پیچھے چھپی اسے دیکھتی رہتی تھی..... کسی میکا نیکی انداز میں اس نے بے اختیار گردن موڑ کر اس ستون کو دیکھا تھا۔ ستون اب بھی وہیں تھا لیکن اس کے گرد وہ بیل نہیں تھی شاید نمی کے اثرات کو روکنے کے لیے ان تمام بیلوں کو ستونوں اور دیواروں سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا تھا جو کئی سال پہلے اس گھر کی شناخت تھیں۔ عکس نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔ گھر بہت بدل گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کی ایک، ایک چیز کو آج بھی آنکھیں بند کیے چھو کر بھی پہچان سکتی تھی۔ وقت زندگی کو کس طرح بہا کر لے جاتا ہے کہ انسان خود بھی اسے روکنے بیٹھے تو روک نہ سکے..... گزر جانے والے لمحوں کو گننے بیٹھے تو گنتی بھول جائے۔

”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“ نو سالہ طغرل نے پہلے الجھ کر پھر ہنس کر اسی آئینے میں دیکھتے ہوئے شیردل سے کہا۔ اس کے تہرے نے عکس کی توجہ ایک بار پھر اپنی طرف کھینچ لی۔

”کیوں؟“ شیردل نے طغرل سے پوچھا۔

”ممی اس مرر میں کیسے ہو سکتی ہیں؟“ طغرل نے جیسے اپنی بے یقینی کی وضاحت کی۔

”دیکھو ابھی ہیں یا نہیں؟“ شیردل نے اس کی وضاحت کے جواب میں آئینے میں نظر آتی عکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اطمینان سے پوچھا۔ طغرل نے آئینے میں عکس کو دیکھا۔ باپ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی آئینے میں تھی۔ طغرل الجھا پھر ہنس پڑا۔

”بابا یہ تو ان کا reflection ہے۔“ اس نے جیسے شیردل کی کم علمی بتائی۔

”یعنی عکس ہے۔“ شیردل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عکس تب تک ان کے قریب آ چکی تھی۔ اس نے شیردل کے کندھے کو ہولے سے چھوتے ہوئے کہا۔ ”تم بس کر دو اب..... کب تک اس بے چارے کو تنگ کرتے رہو گے۔ ذرا اسے سنبھالو تو پھر پتا چلے۔“ اس نے باذل کا ہاتھ شیردل کے ہاتھ میں دے دیا۔

شیردل نے ایک نظر سات سالہ باذل کو دیکھا پھر جیسے کچھ احتجاجی انداز میں عکس سے کہا۔ ”تم ہمیشہ مجھے مشکل پہنچا دیتی ہو۔“

”تم ہر آسان چیلنج کو بھی مشکل بنا لیتے ہو اپنے لیے۔“ وہ اطمینان سے کہتے ہوئے آگے بڑھ آئی تھی۔ آج اس



پھر بڑی طرح یاد آنے لگے تھے۔ وہ آج ایک بار پھر اسے اس گھر میں کشن کے طور پر آتے دیکھتے تو بے حد خوش ہوتے۔ بہت سارے خواب صرف ان کے تھے اس کے حوالے سے..... جو صرف وہ دیکھتے تھے اور ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد عکس مراد علی کے نزدیک کامیابی کا مفہوم وہ نہیں رہا تھا جو نانا کی زندگی میں تھا۔

ہال کمرے میں کھڑی ان درود یوار کو اداسی سے دیکھتے ہوئے وہ یک دم چوکی تھی۔ شیردل نے اس کے کندھوں کے گرد اپنا بازو پھیلا دیا تھا۔ وہ اب اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ اس لمبے عجیب دلگیری تھی، کچھ کہے اور سنے بغیر بھی جیسے دنیا جہان کی گفتگو تھی..... ہر مرہم بننے والا پھایا محسوس ہونے والا لفظ.....

ساری عمر وہ دونوں ایک دوسرے کی خاموشی کو اسی طرح پڑھتے رہے..... لفظوں کے بغیر..... اداسی کو بیرونی طرح بھانپ لیتے تھے اور خطی کورڈار کی طرح..... اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

عکس مراد علی نے ایک شیردل کے چہرے کو گردن موڑ کر دیکھا۔ اس نے اس کی نظریں محسوس کرتے ہی جیسے بڑی حیرانی سے اس سے کہا۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ مسکرا دی۔ اس نے اس کے گال پر نظر آنے والے پلک کے ایک بال کو انگلیوں کی پوروں کی غیر محسوس حرکت سے ہٹایا تھا۔ زندگی میں ایسا جیون سا تھی بہت خوش قسمت عورتوں کے حصے میں آتا تھا۔ عکس مراد علی نے وہاں کھڑے چند لمحوں کے لیے جیسے عجیب تعجب سے سوچا۔ اس گھر میں اپنا بچپن گزارتے ہوئے اس نے جتنی بھی خواہشیں بھی کی تھیں وہ تمام پوری ہوئی تھیں اور اس بات کا ادراک اسے عجیب وقت پر ہوا تھا۔ یہ گھر خوش قسمتی اور بد قسمتی کا عجیب امتزاج لیے ہوئے تھا اس کے لیے۔

☆☆☆

شرمین اور فاروق نے شہر بانو کو ان پورٹ پر ریسو کیا تھا لیکن دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ شہر بانو نے بے حد تھکے ہوئے انداز میں مثال کو ماں کو پکڑا دیا تھا۔ وہ مثال کو بہلانے پھسلانے یا ڈرانے کسی بھی چیز میں پورا راستہ کامیاب نہیں ہوئی تھی اور اب شرمین کی صورت میں اسے جیسے کچھ دیر کے لیے اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے ایک اور کندھا مل گیا تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ مثال شرمین سے بھی پہلے والی نہیں تھی۔ ایک بچے کے طور پر بھی وہ صورت حال کی سنگینی کو بھانپ گئی تھی۔ وہ چند ہفتے پہلے والی مثال نہیں تھی جو خوشی خوشی امریکا اپنی نانی اور نانا کے پاس چھٹیاں گزارنے آئی تھی اور ان پورٹ سے لے کر گھر تک شرمین کو پتا نہیں کیا کیا قصے سناتی رہی تھی۔ اس بار مثال، شرمین کی بے تحاشا کوششوں کے باوجود صرف اس ایک جملے کے ہوا کچھ بولنے پر تیار نہیں تھی کہ اسے پاپا کے پاس جانا ہے۔ وہ پاپا کو بس کر رہی تھی۔ فاروق خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتے رہے تھے۔ شہر بانو ان کے برابر والی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے اس خوفناک خواب کے بارے میں سوچتی رہی تھی جو اس نے حقیقت میں دیکھا تھا۔ عقیب نشست پر شرمین، مثال کو لیے بیٹھی کسی طرح اس کو بہلانے کی کوششوں میں مصروف تھیں اور ہر بار اس کے منہ سے نکلنے والے جملے شہر بانو کے اعصاب پر جیسے ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔ وہ مثال کو اپنی ”ساری فیملی“ سمجھ کر سیٹ لائی تھی اور مثال کی ساری فیملی سمٹ کر جیسے شیردل کی ذات پر آکر ٹھہر گئی تھی..... تو وہ..... خود وہ شہر بانو کہاں کھڑی تھی۔

اگلے دو دن شہر بانو اور شرمین کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن شرمین اسے یہ ضرور بتاتی رہی تھیں کہ

آئینے کے سامنے کھڑے اس نے اس آئینے میں اپنے شوہر اور بچوں کے علاوہ کسی اور چیز کو کھوجنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تلاش کئی سال پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔

”پاپا! آپ کیا مجھے اٹھا سکتے ہیں؟“ شیردل کے ساتھ اندرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے باذل کے قدم تھمے اور اس نے بڑی معصومیت سے شیردل سے پوچھا۔

”میں اٹھا سکتا ہوں لیکن اٹھاؤں گا نہیں۔“ شیردل نے اُسے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”ممی اٹھا سکتی ہیں مجھے۔“ باذل نے جیسے باپ کی مردانگی کو چیلنج دیا جسے شیردل نے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ نظر انداز کیا۔ عکس بڑی خاموشی کے ساتھ باپ بیٹے کی گفتگو سنتے ہوئے اندر کی جانب بڑھتی رہی۔

”تمہاری ممی اس گھر میں dwarfs (بونے) دیکھا کرتی تھیں جب وہ چھوٹی تھیں۔“ شیردل نے چلتے چلتے ایک دم جیسے کچھ یاد آنے پر طفرل کو بتایا۔

”Really mummy?“ طفرل چلتے چلتے بے یقینی کے عالم میں رک کر عکس کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی ٹھک

گئی تھی اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا تھا۔

”dwarfs..... بونے..... آئینہ.....“ شیردل نے اسے کیا یاد دلایا تھا۔ اسے وہ سات ساتھی بونے بھی یاد آ گئے تھے۔ اس کے تصوراتی دوست..... لیکن جس برق رفتاری سے وہ یاد آئے تھے اسی برق رفتاری سے ان کے حلیے، حرکتیں اور نام یا نہیں آئے تھے..... اس میں وقت لگا تھا..... اس میں اگلے دو دن لگ گئے تھے۔

”پاپا مذاق کر رہے تھے۔“ عکس نے مدہم انداز میں طفرل کی حیران آنکھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ شیردل نے.... پلٹ کر جیسے پُر حیرت نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں مذاق کر رہا ہوں؟ تم نے خود ہی تو مجھے بتایا تھا ایک بار کہ تم نے یہاں.....“ عکس نے اس کی بات کاٹ

دی۔

”بچپن کی بات تھی وہ اور بچپن میں انسان کو پتا نہیں کیا کیا وہم ہوتے رہتے ہیں۔“ وہ بڑی سہولت سے کہہ کر آگے بڑھ گئی تھی۔ شیردل نے کچھ حیرانی سے اسے جاتے دیکھا۔

”پاپا، ممی نے really dwarfs دیکھے تھے یہاں؟“ طفرل کا تجسس کم نہیں ہوا تھا۔

”اپنی ممی سے پوچھنا، وہ آپ کو بتائیں گی۔“ شیردل بھی اسے ٹالتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

اس گھر میں عکس مراد علی کی وہ دوسری پوسٹنگ تھی۔ پورے دس سال کے بعد..... لیکن اس بار وہ وہاں کشن کی حیثیت سے آئی تھی۔ اس شہر کو ڈویژن کا درجہ حاصل ہو جانے کے بعد وہاں تعینات ہونے والی پہلی کشن..... کشن کی رہائش گاہ زیر تعمیر تھی اور اس کے زیر تعمیر ہونے کی وجہ سے ڈپٹی کشن کی سرکاری رہائش گاہ کو وقتی طور پر کشن ہاؤس کا سرکاری درجہ دے دیا گیا تھا۔ گھر میں سامان کی صفینگ کا کام پہلے ہی مکمل ہو چکا تھا لیکن یہ کام شیردل کی نگرانی میں ہوا تھا۔ وہ آج پوسٹ ہونے کے بعد پہلی بار اس گھر میں آئی تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ دس سال پہلے ہونے والی یہاں اپنی پہلی پوسٹنگ کی طرح وہ آج اس طرح جذباتی نہیں ہوئی تھی نہ ہی اتنی ایکساٹنڈ تھی..... شاید اس لیے کیونکہ اس کے نانا اس کے ساتھ نہیں تھے۔ اس بار وہ ایک قلعہ فتح کرنے وہاں نہیں آئی تھی۔

اس گھر کے ہال کمرے میں داخل ہوتے ہوئے عکس مراد علی نے عجیب سی اداسی محسوس کی۔ نانا اسے ایک بار

کے ساتھ انوالوڈ ہو۔“ کسی دوسرے کی زبان سے شیردل کی فرد جرم کا سن کر اسے نہ چاہنے کے باوجود عجیب سی تکلیف ہوئی تھی..... اب بھی ہوئی تھی اور شاید ساری عمر ہونے والی تھی..... یہ کاٹا دل میں گڑا تھا ایڑھی میں چبھا ہوتا تو نکل جاتا۔

”میں بھی نہیں رہ سکتی۔“ اس نے کافی کانگ کاؤنٹر پر گھماتے ہوئے شرمین سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ شیردل اور اس کی بے وفائی اور اس کا کردار ڈسکس کرنا ان دونوں کے لیے آسان تھا..... جو چیز دونوں کے لیے مشکل تھی وہ شہباز حسین کو ڈسکس کرنا تھا۔ وہ چڑیا کے ساتھ ہونے والے اس واقعے کو ڈسکس کرنا تھا۔ شیردل کی بے وفائی نے جیسے شہباز حسین کو مزید ذلیل و خوار ہونے اور اپنی اولاد کی نظروں میں گرنے سے بچا لیا تھا۔ وہ دونوں دن رات شہباز حسین اور عکس اور ان تمام الزامات کے بارے میں سوچتے رہنے کے باوجود اس پر بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ شرمین، شہربانو سے نہ شہربانو شرمین سے..... شہباز حسین بُرا تھا اور شیردل بھی بُرا ہی نکلا کیونکہ وہ بھی اسی خاندان کا مرد تھا..... شرمین کا نتیجہ اس کے اندیشوں کے مطابق ہی نکلا تھا لیکن وہ کوشش کرنے اور خواہش ہونے کے باوجود شہربانو کو یہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکی تھیں۔ شیردل اور عکس کے درمیان موجود غیر اخلاقی تعلقات کو ایک فون کال کی وجہ سے وہ بہت پہلے جان گئی تھیں۔ وہ شہربانو کی اذیت میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

دونوں میں سے کسی نے اس سلسلے میں مزید کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا..... بس خاموشی سے وہ دونوں اسی طرح کچن کاؤنٹر کے اطراف اسٹول پر بیٹھی چپ چاپ کافی چتی رہیں۔ اس کی کڑواہٹ زندگی کی کڑواہٹ کے مقابلے میں شیریں بن گئی تھی۔

☆☆☆

شیردل نے زندگی میں کبھی سونے کے لیے خواب آور ادویات کا استعمال نہیں کیا تھا لیکن شہربانو اور مثال کے اس طرح گھر سے چلے جانے کے بعد وہ دوراتیں نہیں سوسکا تھا۔ سگریٹ پھونکنے، کالز پر کالز ملانے کے علاوہ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ آہستہ آہستہ insomnia (بے خوابی) کا مریض بننے والا تھا۔ اس کی زندگی سے گھر اور سکون نام کی چیزیں جیسے منٹوں میں نکل گئی تھیں اور اس کی ذہن دار شہربانو تھی۔ اس کے اقدام سے ملنے والا ابتدائی شک اب شدید غصے میں تبدیل ہو چکا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس غصے کو شہربانو پر نکالنے کے لیے اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ شہربانو جلتی پر تیل چھڑکنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرنے والی تھی۔

بختیار شیردل نے شہربانو کے ساتھ رابطہ کرنے میں ناکام ہو جانے اور شرمین کے ساتھ بار بار ہونے والی بات چیت کا کوئی نتیجہ نہ نکلنے پر بالآخر امریکا جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس معاملے کو طویل دے کر اس کی سنگینی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے منترہ اور شیردل کے ساتھ اپنی سیٹ ایئر جنسی میں بیک کروائی تھی لیکن اس واقعے کے چوتھے دن وہ جب شام کو نیویارک کی فلائٹ لینے کے لیے ائر پورٹ پہنچے تو امیگریشن کاؤنٹر پر شیردل کے پاسپورٹ کو ہاتھ میں لیتے اور کمپیوٹر پر چند ثمن دہاتے ہی امیگریشن اہلکار نے شیردل کو امریکن ایجنسی کی طرف سے اس کے پانچ سالہ ملٹی پل ویزے کی مٹوئی کی اطلاع اسے دے کر پاسپورٹ واپس اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ شیردل کا رنگ سیکنڈز میں فٹ ہوا تھا۔ وہ پاسپورٹ پکڑے بغیر بے یقینی سے اس اہلکار کا چہرہ دیکھتا رہا۔ مثال سے ملنے اور اسے دیکھ پانے کی ایک آخری امید بھی پل میں غائب ہو گئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں آیا تھا کہ اس واقعے کے بعد اس کا ویزا کنسل کیا جاسکتا تھا اور وہ بھی انفارم کیے بغیر..... اس کا ذہن جیسے ایک عجیب سے بلیک آؤٹ کا شکار ہوا

پاکستان سے کس کس کا کتنی کتنی بار فون آیا تھا اور امریکا میں ان کے کس کس رشتے دار نے شیردل کی فیملی کے دباؤ پر ان سے رابطہ کیا تھا۔ شہربانو نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ جیسے عجیب گم صم سی حالت میں تھی۔ عجیب سوئی جاسکتی کیفیت جس میں وہ اپنی زندگی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو بار بار رکھ کر جوڑنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی جا رہی تھی کہ شاید کسی طرح وہ اس سارے معنی کا کوئی حل، کوئی شکل نکال پاتی..... ہر بار وہ ناکام رہی۔ مثال کی حالت اب بھی ویسی ہی تھی صرف اب اگر کوئی فرق پڑا تھا تو یہ کہ وہ ہر وقت روتی نہیں رہتی تھی لیکن وہ بھی شہربانو کی طرح کوئی کھلونا پکڑے کسی کونے میں بیٹھی رہتی پھر یک دم کسی بات پر ضد شروع کر دیتی اور پھر کتنی کتنی دیر بیٹھ کر روتی رہتی۔ شہربانو عجیب میکانیکی انداز میں اسے روتا دیکھتی رہتی۔ اسے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ مثال کے اس طرح رونے کو اتنی سرد مہری کے ساتھ نظر انداز کر سکتی تھی، اس کی چیخ و پکار کے سامنے اس طرح بے حس ہو سکتی تھی لیکن وہ ہو گئی تھی۔ انسان بعض دفعہ اپنی ذات کے بہت سے پہلوؤں سے اس وقت آگاہ ہوتا ہے جب دوسرے اسے دیکھ لیتے ہیں۔ ان کا اس سے واسطہ پڑ جاتا ہے وہ اس پر بات کرنے لگتے ہیں اور تب انسان جیسے شاک کے عالم میں اپنی ذات کے اس پہلو کو دیکھتا ہے۔ حیران ہوتا ہے..... میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟ میں ایسا کس طرح ہو سکتا ہوں؟ لیکن سارا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ سوال بہت سارے ہوتے ہیں جواب نہیں..... جواب بس ایک ہوتا ہے..... اور وہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا..... شہربانو کو بھی نہیں مل پارہا تھا۔

”اب تم کیا کرنا چاہتی ہو؟“ دونوں کے بعد بالآخر شرمین نے ایک رات اس سے اس موضوع پر بات کی۔ وہ کچن صاف کر رہی تھیں اور وہ کچن کاؤنٹر کے سامنے پڑے اسٹول پر کافی کانگ لیے بیٹھی تھی۔

”پتا نہیں۔“ شرمین کو پتا تھا وہ کیا کہے گی۔ وہ بھی اس کے قریب کاؤنٹر کے دوسری طرف اسٹول پر آ کر بیٹھ گئیں۔

”تم شیردل کے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟“ انہوں نے بالآخر ایک لمبی خاموشی کے بعد کہا۔

”نہیں۔“ جواب کسی توقف کے بغیر آیا تھا۔

”divorce چاہتی ہو؟“ شرمین نے اگلا سوال کیا۔

”شاید۔“ جواب اس بار بھی جلدی آیا تھا لیکن الجھن لیے ہوئے تھا اور الجھن کیوں تھی، شہربانو کے پاس اس بات کا بھی جواب نہیں تھا۔

”آپ کیا سمجھتی ہیں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ شہربانو نے یک دم ماں سے پوچھا۔ شرمین اس کے سوال پر جیسے کچھ حیران ہوئی تھیں۔ شہربانو نے زندگی میں بہت کم اہم فیصلے کرتے ہوئے ان سے پوچھا تھا۔ شیردل سے شادی کے وقت بھی اس نے ماں سے مشورہ نہیں کیا تھا صرف اپنی خواہش اور فیصلہ نہیں بتایا تھا اور پھر ان کے مخالف دلائل کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر قائم رہی تھی۔

”تمہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ تم کیا چاہتی ہو؟ مثال کے لیے کیا بہتر ہے؟“ شرمین نے بچے تلے انداز میں اس سے کہا۔

”آپ میری جگہ ہوتیں تو آپ کیا کرتیں؟“ اس نے ایک عجیب سوال کیا۔ شرمین اس کا چہرہ دیکھنے لگیں پھر انہوں نے کہا۔

”میرے لیے کسی بھی ایسے مرد کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہوتا جو مجھ سے وفادار نہیں جو ایک دوسری عورت

تھا۔ غصے، بے بسی اور نا اُمیدی کی ایک عجیب سی کیفیت..... ایک عجیب جنون خیز کیفیت..... اگر زندگی میں وہ کسی عورت کی دوبارہ شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا تو وہ شہر بانو بھی۔

خوش قسمتی سے بختیار اور منترہ کے ویزے کینسل نہیں ہوئے تھے اور شیردل کے ویزے کے کینسل ہونے پر بہت آپ سیٹ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے سفر کو ملتوی کرنے کے بجائے اسے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ منترہ اس ساری صورت حال میں بالکل چُپ سادھے ہوئے تھیں۔ وہ اس ساری صورت حال کا لمبا کسی کے سر ڈالنا چاہتی تھیں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہر بار ایسی کسی کوشش میں وہ کامیاب نہیں ہو پارتی تھیں۔ بختیار اور شیردل نہ بھی کہتے..... کوئی بھی نہ کہتا تو بھی وہ جانتی تھیں یہ ساری تباہی ان کی وجہ سے آئی تھی۔ شیردل کا گھر ان کے علاوہ کسی اور کی وجہ سے نہیں ٹوٹ رہا تھا۔ شرمین اور شہباز کا گھر بھی انہی کی ضد، جھوٹ اور شہباز کی بے جا اور بے وقت کی طرف داری سے ٹوٹا تھا لیکن وہ بھائی تھا ان کا گھر ٹوٹنے کے بعد انہوں نے کبھی ایسی صورت حال میں اپنے کردار کو analyze نہیں کیا تھا نہ ہی کسی نے ان کے اوپر انگلیاں اٹھائی تھیں۔ وہ ساری عمر اسی ایک بات پر غور کرتی رہی تھیں کہ ان سے جس حد تک ممکن تھا انہوں نے شہباز کی حمایت کی تھی اور اسے بچانے کی کوشش کی تھی۔

ایک شیردل کا معاملہ دوسرا تھا۔ اس میں دنوں میں ان کے جھوٹ کھل کر سامنے آ گئے تھے اور انہیں ایک اور شوہر کے ساتھ ساتھ اپنی دوسری اولاد کے سامنے بھی خفت اٹھانی پڑ رہی تھی۔ ان کی تنقید اور خفگی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ شیردل کی حالت دیکھ رہی تھیں اور ایک ماں کے طور پر ان کا دل اس کی حالت پر کٹ رہا تھا لیکن جو ندامت اور غصہ انہیں اپنے آپ پر آنا چاہیے تھا، وہ شہر بانو اور شرمین پر آ رہا تھا۔ شہر بانو سے بھی زیادہ شرمین پر کیونکہ کہیں نہ کہیں انہوں نے اپنے آپ کو یہ یقین دلایا تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا تھا شرمین کی وجہ سے ہو رہا تھا ان کی برین واشنگ کی وجہ سے..... وہ ان کے خاندان سے بدلہ لینا چاہ رہی تھیں اور وہ اتنے سالوں بعد کامیاب ہو گئی تھیں۔ وہ امریکا بھی انہی شکوک و شبہات، غلط فہمیوں کے ساتھ پہنچی تھیں اور ان کی خفگی اور غصے میں اس وقت اضافہ ہو گیا تھا جب شرمین نے انہیں اپنے گھر بلانے یا شہر بانو سے کہیں بھی ان کی ملاقات کروادینے سے انکار کر دیا تھا۔ بختیار شیردل ان کے ساتھ نہ ہوتے تو منترہ ایک بار پھر غصے میں کوئی مزید ہنگامہ کرتیں لیکن بختیار نے اس معاملے پر شرمین کے میاں فاروق سے بات کر کے انہیں کسی نہ کسی طرح شہر بانو کے ساتھ ایک ملاقات کروانے پر آمادہ کر لیا تھا۔ فاروق نے شرمین اور شہر بانو کو اس ملاقات پر کیسے تیار کیا تھا وہ ایک الگ کہانی تھی لیکن شہر بانو اور شرمین بالآخر ان لوگوں سے ملاقات پر آمادہ ہو گئی تھیں اور بختیار نے یہ خیر شیردل کو پاکستان میں بھی پہنچا دی تھی۔

☆☆☆

”سجاد قادر“ عکس نے حلیمہ کے نام بتانے پر وہ نام دُہرا کر جیسے اپنی یادداشت تازہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک دُبلے پتلے سانولے رنگ کے لڑکے کا تصور ابھرا تھا لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

”میں نام سے واقف ہوں لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی، مجھے شکل تک ٹھیک سے یاد نہیں اس کی۔“ اس نے حلیمہ سے کہا۔

”اچھا؟ لیکن اس کو تو بڑی اچھی طرح سے یاد ہوتی۔“ حلیمہ کو اس کی بات پر جیسے کچھ مایوسی ہوئی۔ ”لیکن خیر یہ تو ایسا کوئی بڑا مسئلہ نہیں، میں ان لوگوں سے بات کر کے ملاقات کروادیتی ہوں تم دونوں کی۔“ حلیمہ نے اس سے کہا۔

”امی وہ دینی میں کام کرتا ہے، میں یہاں پاکستان میں..... اور میرا اپنی جاب چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں۔“

عکس نے دو ٹوک انداز میں حلیمہ کو اپنی ترجیحات بتا دی تھیں۔

”میں نے یہ بھی بات کی تھی ان لوگوں سے..... سجاد نے ایک دو سال تک واپس پاکستان آ جانا ہے۔ یہاں بڑے اچھے ہاسٹل سے آفرز ہیں اسے..... لیکن وہ شاید اپنا ہاسٹل بنانا چاہتا ہے لاہور میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ مل کے..... وہ بھی ڈاکٹر ہے۔“ حلیمہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”ٹھیک ہے، آپ ملاقات کروادیں۔“ وہ کہہ کر حلیمہ کے پاس سے اٹھ گئی۔ شادی یک دم اسے ایک بوجھ محسوس ہونے لگی تھی۔ خاص طور پر ان اوپر نیچے بار بار ہونے والے حادثات کی وجہ سے..... ایک بار پھر سے کسی نئے آدمی سے ملنا کسی نئے آدمی کو جیون سا بھی کے طور پر دیکھنے کے لیے ملنا..... اپنے ذہن اور دل میں اس کے لیے گنجائش یا کوئی نرم جگہ نہ ہونے کے باوجود پیدا کرنے کی جدوجہد..... عکس مراد علی کہیں نہ کہیں اس ساری جدوجہد سے تنگ آ گئی تھی۔ اگر خریدین اور حلیمہ کا دباؤ نہ ہوتا تو وہ کم از کم اس وقت پھر سے کسی نئے شخص سے ملنے کی کوشش نہ کر رہی ہوتی۔

اگلی صبح آفس میں آتے ہی اسے شیردل کی چھٹی کی اطلاع ملی تھی۔ وہ ایک مہینے کے لیے چھٹی پر چلا گیا تھا۔ اسے یک دم اس کے حوالے سے مزید تشویش ہوئی تھی۔ بہت دیر تک وہ اس ابھٹن میں رہی تھی کہ اسے شیردل سے بات کرنی چاہیے یا نہیں اور پھر جیسے اس نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ اس کے موبائل پر کی جانے والی کال بے مقصد ثابت ہوئی تھی۔ اس کے دونوں نمبرز آف تھے۔ وہ کچھ دیر بیٹھی رہی پھر اس نے اپنے پی اے کو شیردل کی رہائش گاہ پر اس کی موجودگی چیک کرنے اور اس کے موجود ہونے پر اس سے رابطہ کرانے کی ہدایات دی تھیں۔ پی اے کے جواب کے انتظار میں وہ اپنی میز پر پڑے ہوئے وہ تمام Invitation دیکھنے لگی جو شہر کی مختلف تنظیموں اور اداروں کی طرف سے مختلف تقریبات کی صدارت کے لیے اس کے پاس آتے رہے تھے۔ ٹرے میں پڑا وہ چوتھا کارڈ تھا جس کو ہاتھ میں لیتے ہی وہ رک گئی تھی۔ وہ اس کے اپنے کاننٹ اسکول کی طرف سے تھا..... سالانہ اسپورٹس ڈے کے انعقاد اور اس تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر اس کی شرکت کی دعوت..... اس نے سیکنڈز میں کارڈ پر لکھی تحریر پڑھی تھی اور پھر ایک نام پر رک گئی تھی۔ وہ اسکول کی پرنسپل سسٹر ایکنس فرانس کا نام تھا۔ وہ خوشگوار حیرت کے ساتھ ان کا نام زیر لب دہرانے لگی۔ وہ ایک بار پھر اس کے اسکول کی پرنسپل کے طور پر وہاں موجود تھیں۔ اتنے سال گزر گئے تھے اور اتنے سالوں میں اس کاننٹ سے سسٹر ایکنس کے ٹرانسفر کے بعد اس کی دوبارہ ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی حالانکہ اسے بہت بار ان کا خیال آتا رہتا تھا۔ کئی بار خریدین اور وہ بیٹھے ماضی کو یاد کرتے تو وہ دونوں سسٹر ایکنس کا ذکر بھی کرتے۔ بہت دفعہ اس نے خواہش بھی کی تھی کہ وہ بھی کہیں ان سے ملاقات کر پاتی لیکن زندگی اتنی تیز رفتار رہی تھی کہ وہ خواہش کے باوجود ان کو ڈھونڈنے اور ان سے ملاقات کرنے کی کوشش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکی تھی۔ انٹرکام اٹھا کر اس نے پی اے کا نمبر ملا یا تھا۔ پی اے نے اس کی آواز سنتے ہی اسے شیردل کے اپنی رہائش گاہ پر نہ ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ لاہور میں تھا۔ اس نے پی اے کو لاہور میں اسے ٹریس کرنے کی ہدایات دینے کے بعد ہاتھ میں پکڑے کارڈ کے متعلق پوچھنا شروع کیا۔

”جی ان کا فون بھی آیا تھا دو بار اسی فنکشن کے حوالے سے آپ سے بات کرنا چاہتی تھیں لیکن آپ سیٹ پر نہیں تھیں۔“ پی اے نے اُسے سسٹر ایکنس کے حوالے سے بتایا۔ عکس نے اس فنکشن میں جانے کی بابت..... پی اے کو اسکول انتظامیہ کو آگاہ کرنے کی ہدایات دیں اور فون ایک بار پھر رکھ دیا۔ اس کا ذہن ایک بار پھر شیردل میں الجھ



”شیردل کا مسئلہ حل ہوا؟“ اس رات کھانے پر خیر دین نے ایک بار پھر وہ موضوع چھیڑ دیا تھا جو سارا دن اس کے ذہن پر سوار رہا تھا۔

”وہ ایک مہینے کی چٹختی پر چلا گیا ہے۔“ عکس نے کھانا کھاتے ہوئے خیر دین کو اطلاع دی۔

”اللہ خیر کرے..... تمہاری بات ہوئی اس سے؟“ خیر دین کو تشویش ہوئی۔

”دونوں موبائل نمبرز آف ہیں اس کے اور وہ لاہور میں ہے اپنے پیرنٹس کے گھر پر..... اس کے آپریٹر نے نمبر دیا ہے وہاں کا۔ میں نے پیغام چھوڑا ہے اس کے لیے..... اگر کل وہ کال نہیں کرتا تو پھر میں کروں گی اُسے کال۔“ عکس نے خیر دین کو تفصیل سے بتایا۔

”تم نے پہلے کبھی اس سے بات کرنے کے لیے اس کی کال کا انتظار نہیں کیا تھا۔“ وہ خیر دین کی طرف سے آنے والے اس غیر متوقع سوال پر کچھ گڑبگڑا گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ خیر دین اس کی اس تفصیلات میں سے کوئی ”حیران کن تجزیہ“ نکال سکتا ہے۔

”نانا یہ اس کا اور اس کی بیوی کا معاملہ ہے، ایک پرسنل ایٹو ہے، مجھے نہیں پتا کہ اسے اس مسئلے کو کسی دوسرے کے ساتھ ڈسکس کرنا اچھا لگے گا یا نہیں۔“ اس نے بالآخر خیر دین کے ساتھ اپنی ابھرنی شہر کی۔

”تم اس کے ساتھ کچھ ڈسکس کرو یا نہ کرو کم از کم اس پریشانی میں اس کو حوصلہ تو دلا سکتی ہونا۔ بیوی تو اچھی تھی اس کی تم ہی کہا کرتی تھیں پھر یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا۔“ خیر دین نے بات کرتے کرتے بات کا رخ بدل دیا اور جیسے عکس کو اس موضوع پر مزید کچھ کہنے سے بچالیا۔

”ماں تو بہت اچھی عورت تھی شیردل کی بیوی کی۔“ خیر دین اب شرمین کے بارے میں سوچتا ہوا بول رہا تھا۔ ”پتا نہیں ایسا کیا ہو گیا کہ اس طرح گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے اُس کی بیوی۔“ عکس کو خیر دین کی بات سننے ہوئے مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی ایک عجیب طرح کا احساسِ جرم ہونے لگا تھا۔ اگر خیر دین کو یہ پتا چل جاتا کہ وہ بھی کسی نہ کسی حد تک اس بگاڑ میں انوالو تھی تو پتا نہیں اس کا رد عمل کیا ہوتا۔

”نانا سسٹر ایکٹس دوبارہ اسی کانٹنٹ میں آگئی ہیں۔“ عکس نے یک دم خیر دین کو اس موضوع سے ہٹانے کی کوشش کی۔

سسٹر ایکٹس کو اپنے آفس میں آکر بیٹھے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی جب reception پر بیٹھے آفس اسٹنٹ نے انہیں ایک اولڈ اسٹوڈنٹ کے بارے میں بتایا جو اُن سے ملنا چاہتی تھی۔ سسٹر ایکٹس نے اپنے اسٹنٹ کو پہلے اُن وزیٹرز کو اندر بھیجنے کے لیے کہا جو ایڈمیشن اور اپنے بچوں کے حوالے سے مختلف ایڈیوڈ ڈسکس کرنے آئے تھے اور اس اولڈ اسٹوڈنٹ کو انتظار کرنے کے لیے کہا۔ اسکول کے اکثر اولڈ اسٹوڈنٹس کتنی بار ان سے ملنے وہاں آجایا کرتے تھے۔ یہ ہر روز نہیں ہوتا تھا لیکن یہ اکثر اوقات ہوتا تھا اور سسٹر ایکٹس ایسی ملاقاتوں کو اپنی اپائنٹمنٹس میں سب سے نیچے رکھتی تھیں کیونکہ ایسی ملاقاتوں میں زیادہ تر گپ شپ ہوتی تھی یا پھر بعض اولڈ اسٹوڈنٹس اسکول میں اپنے بچوں یا فیملی کے بچوں کے لیے کچھ favours لینے کی کوشش کرتے

تھے..... آج بھی ہمیشہ کی طرح سسٹر ایکٹس نے اس وزیٹر کو سب سے آخر میں رکھا تھا۔ بالآخر جب وہ اپنی باقی تمام ملاقاتوں سے فارغ ہو گئیں تو انہوں نے اسٹنٹ سے اس اولڈ اسٹوڈنٹ کے بارے میں پوچھا۔

”وہ مجھ سے پوچھ کر چلی گئی تھیں کہ سسٹر کب تک فری ہو کر ان سے ملیں گی؟ میں نے کہا ”بچ بریک کے بعد“ تو وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ تب دوبارہ آجائیں گی لیکن ابھی.....“ اسٹنٹ نے سسٹر ایکٹس سے بات کرتے کرتے عکس مراد علی کو دوبارہ آفس میں آتے دیکھ لیا۔ وہ بالکل اس وقت پر آئی تھی جس وقت کا اسٹنٹ نے اُسے بتایا تھا۔ اسٹنٹ نے سسٹر ایکٹس کو اس کی آمد کی اطلاع دی۔ ”ڈاکٹر عکس نام ہے۔“ اسٹنٹ نے سسٹر ایکٹس کے استفسار پر بتایا پھر عکس کو اندر جانے کے لیے کہا۔

”Good afternoon sister“ سسٹر ایکٹس نے سر اٹھا کر اسے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا اور پھر جیسے سیکنڈز میں اسے پہچان لیا۔

”عکس مراد علی۔“ انہوں نے اس کی greeting کا جواب دیتے ہوئے بے حد بے یقینی سے اس کا پورا نام لیا۔ عکس بے اختیار ہنس پڑی اسے کوئی زیادہ حیرانی نہیں ہوئی تھی۔ سسٹر ایکٹس اس کے بچپن میں بھی اسکول میں پڑھنے والے سیکڑوں بچوں کو اسی طرح ان کا پورا نام لے کر یاد رکھا کرتی تھیں لیکن اب اس عمر میں بھی ان کی یادداشت کا اسی طرح شاندار ہونا ایک عام آدمی کے لیے حیران کن تھا۔

”ڈاکٹر عکس مراد علی؟“ نیپل کے اوپر سے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اب انہوں نے دوسری بار ستائشی انداز میں اس کا نام لیا تھا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سسٹر ایکٹس کی اس ستائش آمیز حیرت پر مسکرا دی تھی۔ اس سے بڑی گرم جوشی سے باتیں کرتے ہوئے سسٹر ایکٹس نے جیسے بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ ایک سیاہ سوٹ کے اوپر ایک آف وائٹ ٹی کالرڈ جرسی پہنے اس ڈبلی پتلی سانولی لڑکی میں انہیں وہی تنک اور تمکنت نظر آئی تھی جو اس ننھی بچی کی بھی شناخت تھی جس کی ملائم ریشمی آواز پر وہ جان چھڑکتی تھیں۔ ان آنکھوں کی چمک آج بھی اس کی ذہانت کو عیاں کر رہی تھی۔ اس حادثے کا کوئی رنگ انہیں اس مسکراتے ہوئے پُر اعتماد چہرے میں کہیں نہیں دکھاتا تھا جس نے جب کئی مہینوں تک اس ننھے وجود کو گملائے رکھا تھا۔ سسٹر ایکٹس کو دلی خوشی ہوئی تھی۔ وہ اس ڈین لڑکی کو ایسا ہی دیکھنا چاہتی تھیں۔ مگر انہیں اندازہ نہیں تھا اس ڈین لڑکی نے اس سے زیادہ بڑے پہاڑ سر کر لیے تھے جن پر وہ اس کا نام دیکھنا چاہتی تھیں۔ نیپل پر پڑا اس کا فون وہاں رکھے جانے کے چند ہی منٹ بعد بجنے لگا تھا جسے عکس نے بہت معذرت کرتے ہوئے فوری طور پر silent کیا تھا لیکن silent ہونے کے باوجود سسٹر ایکٹس اس پوری گفتگو کے دوران بار بار اس فون پر چلتی بھرتی روشنیوں کا سیلاب دیکھتی رہیں وہ ہر چند منٹ بعد کسی میسج یا کال کا اعلان کر رہا تھا۔

”بہت busy ڈاکٹر ہو تم!“ سسٹر ایکٹس نے مسکراتے ہوئے اس کے فون کی طرف اشارہ کیا۔

”میں پریکٹس نہیں کرتی سسٹر۔“ عکس نے ان کی بات پر ایک لمحے کے لیے اپنے فون کو دیکھا پھر ان سے کہا۔

کے لیے بھونچکا رہ گئی تھیں۔ شہر میں تعینات ہونے والی پہلی خاتون DCO کے بارے میں وہ واقف تھیں، نام سے بھی واقف تھیں اور چند دن پہلے انہوں نے۔۔۔ اسے اسپورٹس ڈے۔۔۔ پر دعوت دینے کے لیے کارڈ بھیجا تھا لیکن انہیں بالکل شائبہ نہیں ہوا تھا کہ وہ یہ عکس مراد علی ہوگی۔۔۔ وہ جو ان کے بالمقابل میز کے دوسری طرف پڑی دو کرسیوں میں سے ایک پر بڑی تیز اور شائستگی سے کرسی کے ہتھوں پر بازو لگائے، گھٹنے جوڑے، پاؤں پلائے بالکل سیدھی پشت کے ساتھ بے حد مؤدب انداز میں بیٹھی تھی۔ وہ اس شہر کی DCO تھی جو اپنے آفس میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے ریوالونگ چیئر پر بے حد کرفور سے بیٹھتی تھی۔ کہیں پہنچنے پر لوگ اس کا باہر نکل کر استقبال کرتے تھے۔ وہ وزیر زروم میں بیٹھ کر انتظار کر کے اٹھ جانے کے بعد دوبارہ اسی طرح وہاں نہیں آ جاتی تھی۔

”میں اسپورٹس ڈے پر آنا چاہتی تھی اس لیے میں نے سوچا میں آ کر آپ کو بتا دوں اور آپ سے مل بھی لوں۔“ وہ اُسی انکسار سے سسٹر ایکٹس کو بتا رہی تھی۔ سسٹر ایکٹس کو چند لمحے واقعی کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ ان کے ایکس اسٹوڈنٹس میں سے بڑے عہدوں پر پہنچنے والوں کی کمی نہیں تھی مگر زندگی میں کامیابی کے اوپر والے زینے پر کھڑے ہو کر بھی چلا کر بات کرنے کے بجائے جھک کر مدہم آواز میں بات کرنے والے انہوں نے بھی بہت کم دیکھے تھے اگر خاندان، ذات برادری کو کہتے تھے تو پھر وہ کوئی خاندان نہیں رکھتی تھی اور اگر خاندان اخلاقی اقدار اور تمیز و تہذیب کو کہتے تھے تو پھر سسٹر ایکٹس نے ڈاکٹر عکس مراد علی سے بڑھ کر خاندانی کوئی نہیں دیکھا تھا۔

”بہت غلط فیصلہ تھا یہ!“ ابتدائی شاک سے نکل آنے کے بعد سسٹر ایکٹس نے ایک بار پھر اسے ڈانٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک جھپٹنی ہوئی زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ ان کی ڈانٹ ڈپٹ سنتی رہی اسے اندازہ تھا کہ وہ میڈیسن پریکٹس نہ کرنے پر اسے یہی گھنیں گی۔ خیر دین کے بعد وہ دوسری شخص تھیں جن کے لیے میڈیسن مسیحا تھی اور دنیا کا اور کوئی پروفیشن اس کے قریب بھی نہیں آ سکتا تھا۔

”اور جب تک میں یہاں ہوں اگر میں آپ کے لیے، اسکول کے لیے کچھ بھی کر سکی تو پلینز مجھے ضرور بتائیے گا۔“ چائے پیتے ہوئے اُٹھنے سے چند لمحے پہلے اس نے سسٹر ایکٹس سے کہا تھا۔ سسٹر ایکٹس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد اسکول کے عقب میں واقع ایک سرکاری پلاٹ کا ذکر کرنا شروع کیا جسے اسکول بہت عرصے سے اسکول کے گراؤنڈ میں توسیع کے لیے خریدنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ سسٹر ایکٹس کو اب امید تھی کہ عکس مراد علی کے اس سیٹ پر ہونے کی وجہ سے اسکول بالآخر وہ پلاٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اس پلاٹ کی شمولیت سے اسکول میں بچوں کے لیے گیمز کی بہتر سہولیات میسر آ سکیں گی۔ عکس نے خاموشی سے بغور سسٹر ایکٹس کی بات سنی۔ وہ مطالبہ اور درخواست کوئی نیا مطالبہ نہیں تھا۔ اسکولز اور کالجز اپنی تقریبات میں مدعو کرنے کے بہانے عام طور پر ضلعی انتظامیہ کے سامنے اس طرح کے مطالبے پیش کرتے تھے یا پھر مختلف گرانٹس کے لیے درخواستیں۔۔۔

”میں دیکھوں گی میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اس پلاٹ کے سلسلے میں، میں آپ کی کوئی مدد کر پاؤں گی۔“ عکس نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے متانت سے سسٹر ایکٹس کو بتایا۔ انہیں اس کے جواب نے حیران کر دیا تھا۔ وہ اپنی درخواست کے جواب میں ”انکار“ کی توقع عکس مراد علی کے

وہاں اس طرح آنے اور بیٹھنے کے بعد خواب میں بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

”لیکن تم کر سکتی ہو تمہیں authority ہے اس کی۔“ سسٹر ایکٹس نے اصرار کیا۔

”authority ہے لیکن rules کو violate کیے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ اسکول پرائیویٹ ہے۔ priviledged class کے لیے کام کر رہا ہے اور مالی طور پر بہت مستحکم ہے۔ کیتھولک بورڈ آف ایجوکیشن سے بہت زیادہ فنڈنگ بھی مل رہی ہے اسے۔۔۔ اور قواعد و ضوابط کے مطابق میں ایسے کسی ادارے کو سرکاری زمین الاٹ نہیں کر سکتی۔ یہ میں بھی کر سکتی ہوں جب میں تمام rules کو بائی پاس کر دوں اور وہ میں نہیں کر سکتی۔ وہ زمین ویسے بھی اس علاقے کے ایک چلڈرن پارک کے لیے مختص ہے اور ضلعی انتظامیہ نے اس سال بجٹ میں اس کے لیے فنڈز رکھے ہیں چند مہینوں تک اس پر کام شروع ہو جائے گا۔“ سسٹر ایکٹس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کی بات سننے کے بعد کہا۔

”You know Dr. Aks Murad Ali۔۔۔۔۔ اس اسکول کے بھی بہت سارے rules تھے لیکن میں نے تمہیں دوبارہ ایڈمیشن دلانے کے لیے اور پھر تمہاری تعلیم کو ہر طریقے سے جاری رکھوانے کے لیے بہت سے rules کو violate بھی کیا تھا اور بائی پاس بھی۔“ انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے بتایا۔ انہیں اس کا انکار کھلنا تھا۔

”اگر آپ سسٹر ایکٹس کی اسٹوڈنٹ رہی ہوتیں تو آپ کے لیے بھی rules کو violate کرنا میری طرح مشکل ہوتا۔“ جواب اسی متانت اور ذہانت سے آیا تھا۔ سسٹر ایکٹس بے اختیار لا جواب ہوتے ہوئے ہنس پڑیں۔ اس نے انہیں tribute نہیں کیا تھا لیکن ان کے لیے اپنے کیس کو argue کرنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑا تھا۔

”تمہاری گاڑی کہاں ہے؟“ اُسے باہر چھوڑنے کے لیے آتے ہوئے سسٹر ایکٹس نے اس سے پوچھا۔ ”وہ گیٹ سے باہر ہے سسٹر۔“ عکس نے کہا۔ ”میں گیٹ کھلواری ہوں تم گاڑی اندر منگوا لو۔“ سسٹر ایکٹس نے اس سے کہا۔

”Thank you sister۔۔۔۔۔ لیکن میں کبھی کسی اسکول یا کالج کے اندر گاڑی لے کر نہیں جاتی۔“ عکس نے جواباً ان سے کہا تھا۔

سسٹر ایکٹس اس کے منع کرنے کے باوجود اسے پارکنگ تک چھوڑنے آئی تھیں اور پارکنگ میں اسے رخصت کرتے ہوئے انہوں نے عکس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”I am very proud of you“ عکس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ وہ مؤدب انداز میں ان کی بات سننے لگی۔

”میری خواہش ہے کہ تم اپنے اصولوں اور ویلیوز کو ہمیشہ اسی طرح رکھنا That is your real strength“

”I will“ وہ کہہ کر مسکرائی اور اس نے سسٹر ایکٹس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ سسٹر ایکٹس نے اسے اپنی سیاہ اسٹاف کار کی طرف بڑھتے دیکھا۔ جس کا ڈرائیور اب اس کے لیے دروازہ کھولے مستعد انداز میں کھڑا تھا۔ اس کے اندر بیٹھتے ہی اس کے سیکورٹی گارڈ نے ڈرائیور کی طرح اس کے برابر والی سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس کی اسٹاف کار کے عقب میں موجود پولیس موبائل بھی حرکت میں آ گئی تھی۔ سسٹر ایکٹس وہیں کھڑی اس کی گاڑی کو

پارکنگ سے سڑک اور پھر سڑک سے موڑ مڑ کر غائب ہوتے دیکھتی رہیں۔ یہ وہ تعظیم تھی جو وہ ایک ڈپٹی کمشنر کی کار کو نہیں دے رہی تھیں، نہ DC عکس مراد علی کو..... یہ وہ تعظیم تھی جو وہ انسانی ہمت، حوصلے، ثابت قدمی کی اس چھوٹی سی کہانی کو دے رہی تھیں جس کی ایک چشم دید گواہ وہ بھی تھیں۔ ایک چھوٹا سا کردار اس کہانی میں ان کا بھی تھا اور انہیں فخر ہوا تھا، واقعی فخر ہوا تھا۔

انہوں نے جس سبک قدم، باوقار لڑکی کو سبز نمبر پلیٹ والی سرکاری گاڑی پر پولیس escort اور پروٹوکول کے ساتھ کچھ دیر پہلے وہاں سے جاتے دیکھا تھا اسے ایک ننھی بچی کے روپ میں اپنے نانا کی ایک پرانی سائیکل پر بیٹھے سردی، گرمی، برسات، خزاں، بہار کے ہر موسم میں وہاں اس سڑک پر آتے دیکھا تھا..... گئی بار..... اور بار بار..... چلچلاتی دھوپ میں پسینے میں شرابور سرخ چہرے کے ساتھ..... کہر آلود سردی میں خنکی سے بخ بستہ سرخ ناک اور سرخ گالوں کے ساتھ ٹھنڈے کانچے..... اس پرانی سائیکل سے اس سرکاری گاڑی کا سفر اس انتخاب کا نتیجہ تھا جو انسان مصائب کے پہاڑ کے سامنے کانچے پیروں پر کھڑے رہنے یا گھٹنوں پر گر جانے کی شکل میں کرتا ہے۔ سسٹریکٹس کے پاس آج اپنے لیکچرز میں quote کرنے والی ایک اور مثال آگئی تھی۔

☆☆☆

بختیار اور منترہ، شرمین اور شہر بانو کو کسی طرح واپس لے آنے پر تو کامیاب نہیں ہو سکے لیکن شہر بانو divorce کے لیے کیس فائل کرنے سے پہلے شیردل سے فون پر بات کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ شیردل کو تب تک شہر بانو کے حوالے سے کوئی خوش فہمی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اب اس سے بدترین سے بدترین حماقت کی بھی توقع کر رہا تھا اور بختیار سے یہ سن کر اسے اس موقع کے باوجود شاک لگا تھا کہ وہ divorce کے لیے کیس فائل کرنے کا طے کر چکی تھی۔ کسی بھی پرسکون شادی شدہ زندگی گزارنے والے مرد کو ان حالات میں اسی طرح کی کیفیات سے گزرنا پڑتا۔ شہر بانو سے وہ گفتگو اس کی شادی شدہ زندگی کو بچانے کا جیسے ایک آخری موقع تھا شیردل کے لیے اور اس نے اپنے دل و دماغ کو ایک عجیب حالت میں پایا تھا۔ اسے شہر بانو کو اپنی زندگی میں دوبارہ واپس لانے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ محبت اور اعتماد نام کا وہ رشتہ جس میں وہ اتنے سالوں سے جڑے ہوئے تھے وہ اتنی بڑی طرح سے اور اتنی جگہوں سے ٹوٹا تھا کہ اب کم از کم شیردل کو اس کو پھر سے جوڑ لینے کی کوئی خواہش نہیں تھی یا کم از کم فی الحال نہیں تھی لیکن اس کی مجبوری اور کمزوری وہ اولاد بھی جو شہر بانو کے پاس تھی۔ مثال اس کے پاس نہ ہوتی تو شیردل، شہر بانو سے لاکھ محبت رکھنے کے باوجود بھی اس طرح کے حالات میں اس سے علیحدگی اختیار کرنے میں چند دن بھی نہ لگاتا۔

”اس سے بہت نحل سے بات کرنا، وہ اس وقت عقل سے پیدل ہو رہی ہے لیکن تم سمجھ دار ہو، اس کا اتنا نقصان نہیں ہونا جتنا تمہارا ہوگا۔“ بختیار نے اسے شہر بانو سے بات کرنے سے پہلے بہت سمجھایا تھا۔ وہ شیردل کی ذہنی وجہ باقی کیفیت کو ایک باپ کے طور پر سمجھتے تھے۔ شیردل نے انہیں کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اس سے یہ سب نہ بھی کہہ رہے ہوتے تب بھی اسے پتا تھا نقصان کس کا ہو رہا تھا اور کس کا ہونے والا تھا۔

دوسرے دن بالآخر اس کی اور شہر بانو کی بات ہو گئی تھی۔ فون پر اس کی آواز سننے ہی شیردل کا خون کھولنے لگا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر غصہ کرنے والا مرد نہیں تھا، نہ ہی انا اور خود پرستی کا مارا ہوا تھا لیکن اس

کے باوجود شہر بانو کے سامنے اسے ایک عجیب سی تضحیک اور ذلت کا احساس ہو رہا تھا اور تضحیک کے اس احساس کے ساتھ اس کے ساتھ نارمل، خوشگوار انداز میں بات کرنا بے حد مشکل تھا..... ہیلو کے تبادلے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی تھی۔ دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے سے حال احوال نہیں پوچھا تھا۔ بات کہاں سے شروع کی جائے یہ شیردل کا مسئلہ تھا شہر بانو کا نہیں کیونکہ اسے شیردل سے کچھ نہیں کہنا تھا نہ ہی مصالحت کی کوشش کرنی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ اس فیصلے کو بدلنے کی کوشش کرنا شیردل کی ذمہ داری تھی۔ مرد کے لیے عورت کے سامنے جھکنا ایک بہت مشکل کام ہوتا ہے اور خاص طور پر تب جب غلطی عورت کی ہو اور جھکنا پھر بھی مرد کو پڑ رہا ہو۔ یہ جیسے اس کے لیے کٹ مرنے کا مقام ہوتا ہے اور شیردل کے سامنے آزمائش کا یہ پہاڑ لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

”شہر بانو میں patch up چاہتا ہوں جو بھی کچھ ہوا۔ Let's get over with it..... تم اگر چاہتی ہو کہ میں معذرت کروں..... تو میں، وہ کرنے پر بھی تیار ہوں لیکن واپس آ جاؤ، ہم ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر یہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔“ شیردل نے زندگی میں کبھی تھوک کر نہیں چاٹا تھا اور اب اسے چاٹنا پڑ رہا تھا۔ یہ چند جملے زبان سے ادا کرنے کے لیے اس نے جیسے اپنی انا اور عزت نفس نام کی چیزوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

”کون سا مسئلہ؟“ ریسپور پر اس نے شہر بانو کو بے حد سرد مہری سے کہتے سنا۔ اس کی آواز میں کوئی شناسائی تھی نہ کوئی چھپتاوا۔ وہ اس سے یوں بات کر رہی تھی جیسے زندگی میں پہلی بار ایک شیردل نام کے آدمی سے بات کر رہی ہو۔ ”تمہارے اور میرے بیچ کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں اور اگر کبھی تھا بھی تو ختم ہو چکا ہے۔ تم ایک اچھے لائف پارٹنر بننے کے قابل ہی نہیں تھے۔ میں نے تمہارا انتخاب کر کے غلطی کی اور اب وہ غلطی ٹھیک کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے شیردل کے کہنے کے لیے جیسے کچھ چھوڑا ہی نہیں تھا۔ ایک کے بعد ایک جوتا اس کے منہ پر مارا تھا۔ اس نے پھر بھی ڈھیٹ بن کر اس سے کہا۔

”میں جانتا ہوں تم مجھ سے خفا ہو اور.....“ شہر بانو نے بے حد تنگی سے اس کی بات کاٹ دی۔

”خفا؟..... میں تم سے خفا نہیں ہوں میں صرف اپنے آپ سے خفا ہوں، تمہارے ہاتھوں بے وقوف بننے کی وجہ سے..... اتنے سال تمہیں ایک وقادار شوہر سمجھنے کی وجہ سے۔“ شیردل نے اس کی بات یک دم کاٹ دی۔

”میں تم سے ہمیشہ وقادار رہا ہوں شہر بانو..... اور مجھے اس حوالے سے کوئی احساسِ جرم نہیں ہے۔“ شیردل نے دونوں کے انداز میں کہا۔

”ہاں، تمہیں کیوں کوئی احساسِ جرم ہوگا۔ عکس مراد علی جیسی عورتوں کے ساتھ افیئر چلاتے ہوئے احساسِ جرم تھوڑی رکھتے ہیں۔ وہ تو فخر اور اعزاز کی بات ہوتی ہے۔“

”شہر بانو، عکس میری زندگی کا حصہ نہیں ہے، بہتر ہے تم اس پر بات نہ کرو..... تم اور مثال میری زندگی کا حصہ ہو۔“ شیردل نے نحل کا مظاہرہ کیا۔

”ہم تھے، اب نہیں ہیں۔“ اس نے شیردل کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔ ”میں نے تمہارے لیے وہ انتخاب آسان کر دیا ہے جو تم خود نہیں کر پا رہے تھے۔ تم مجھ سے نہیں، عکس سے محبت کرتے ہو وہ matter



کرتی ہے تمہارے لیے..... اس لیے تمہیں اس کے ساتھ رہنا چاہیے۔“ شہر بانو کے موقف میں اب بھی ذرا برابر تبدیلی نہیں آئی۔ شیردل کو لگا وہ جیسے کسی پتھر سے سر پھوڑ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ ہونٹ بھیجنے بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے، تم اگر میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا لیکن تم مثال کو اس طرح باہر نہیں لے جاسکتیں۔“ اس کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ غصہ جھلکنے لگا تھا جو وہ اپنے اندر دبائے پھر رہا تھا۔

”میں مثال کو اپنے ساتھ لا چکی ہوں اور میرا اسے واپس لانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ شہر بانو نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”تم بچے کی کسٹڈی شادی کے وقت مجھے لکھ کر دے چکے ہو۔“

”میں نے کسٹڈی تمہیں دی ہے، یہ نہیں کہا تھا کہ تم اسے اس طرح لے جاؤ اور پھر اس سے ملنے کے لیے مجھے تنگ کرو۔“ شیردل نے دُر شکی سے کہا وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ شادی کے وقت ان دو شرائط کو ماننے پر اب بُری طرح پچھتا رہا تھا۔

”میں چاہتی ہوں تم ہم دونوں کے بوجھ سے آزاد ہو جاؤ اور عکس کے ساتھ خوشی خوشی زندگی گزارو۔“

”شہر بانو میں شہباز حسین نہیں ہوں، میں مثال کو اس طرح کہیں رہنے نہیں دوں گا۔“ شیردل نے ایک بار پھر اس کی گفتگو میں عکس کے حوالے سے کیے جانے والے طنز کو نظر انداز کیا تھا۔

”مثال تم سے نہیں ملنا چاہتی اور وہ تمہارے بغیر میرے ساتھ بہت خوش رہے گی۔“ شہر بانو نے بھی اسی سرد مہری سے کہا۔ وہ ایک موہوم آس جو اسے اس حوالے سے تھی کہ وہ محبت کی بات کرے گا اسے اپنے تعلق کے حوالے سے واپس بلائے گا۔ اس سے کہے گا کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا وہ پوری نہیں ہوئی تھی۔ شیردل کے لہجے میں کہیں وہ حلاوت، وہ محبت، وہ طلب نہیں تھی جس پر وہ قربان ہو جاتی تھی۔

بالکل اس لمحے جب شیردل اس سے کچھ کہنے لگا تھا اس نے شہر بانو کے ریسپور پر دور سے مثال کی آواز سنی وہ شہر بانو سے پوچھ رہی تھی کہ کیا وہ شیردل سے بات کر رہی تھی۔ اس کی آواز پر شیردل بے اختیار بے تابانی سے اپنا غصہ بھول کر بولا۔

”میری بات کرواؤ اس سے۔“

”نہیں، میں تمہارے پاپا سے بات نہیں کر رہی، تم باہر جا کر کھیلو۔“ شہر بانو نے شیردل کی بات کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اس سے کہا۔

”میں تم سے کہہ رہا ہوں اس سے میری بات کرواؤ۔“ شیردل اس بار اپنی آواز پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔

”میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں نہیں کرواؤں گی۔“ شہر بانو نے اُسی اکٹڑ انداز میں کہا تھا۔ شیردل اس کے انکار پر ہتھے سے اکٹڑ گیا۔ اس نے بلند آواز میں چلاتے ہوئے شہر بانو کو زندگی میں پہلی بار گالیاں دینا اور بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا..... شہر بانو ریسپور ہاتھ میں لیے فٹ چہرے کے ساتھ بے یقینی کے عالم میں شیردل کی گالیاں سنتی رہی۔ وہ اس مرد کو نہیں پہچانتی تھی جس کی آواز وہ فون پر اس وقت سن رہی تھی، گالی تو دور کی بات اس نے کبھی شیردل کی بلند آواز تک نہیں سنی تھی۔ ڈانٹ ڈپٹ، خفگی نام کی ہر چیز سے ایک شیردل نے اسے کبھی آشنا کیا ہی نہیں تھا اور اب وہ اس کے لیے وہ سارے الفاظ استعمال کر رہا تھا صرف اس لیے کیونکہ وہ

عکس

ایک عورت ہے..... بلکہ اسے اس وقت بھی عکس ہی کا خیال آیا تھا، وہ اب بھی یہ ماننے پر تیار نہیں تھی کہ وہ بہت جذباتی ہو کر سوچ رہی تھی اور شیردل کا ردِ عمل اس کی غلطیوں کا نتیجہ تھا۔ آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ اس نے فون بند کر دیا تھا۔ پھر شیردل کی بار بار آنے والی کالز کو بھی اس نے ریسپونڈ نہیں کیا تھا۔ اس کے اور شیردل کے بیچ اس دن کچھ باقی نہیں بچا تھا یا کم از کم شہر بانو کو یہی لگا تھا۔

☆☆☆

عکس بے یقینی سے خیر دین کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ یوں جیسے اس کو یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ یہ سب کچھ اس نے خیر دین کے منہ سے سنا تھا۔

”نانا یہ سب آپ سے شہر بانو کی می نے کہا؟“ اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ شرمین امریکا سے کال کر کے خیر دین سے اس کے اور شیردل کے حوالے سے بات کریں گی لیکن ایسا ہو چکا تھا۔ انہوں نے نمبر کہاں سے لیا تھا؟ اور یہ مشورہ کس کا تھا..... اس سے بھی بڑا سوال عکس کے لیے یہ تھا کہ انہوں نے اس کی ضرورت کیسے محسوس کی تھی۔ خیر دین بھی اسی کی طرح رنجیدگی اور صدمے کا شکار تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حواسِ باطنی کا بھی..... چڑیا پہلی بار ان کے لیے کسی کے سامنے رُسوائی اور ندامت کا باعث بنی تھی۔ وہ بھی کس کے سامنے شہباز حسین کی سابقہ بیوی کے سامنے..... اور کس چیز کے لیے..... بھرے بازار میں جیسے ایک بار پھر کسی نے اس کی ریڑھی اٹا دی تھی۔ اور کچھ دیکھی ہی حالت عکس کی ہو رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے نانا کے سامنے بھی کوئی اس کی ایسی شکایت کرے گا اور اسے صفائی دینی پڑے گی۔

”نانا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں شہر بانو کی می سے خود بات کر لوں گی۔ انہیں اور شہر بانو کو غلط فہمی ہو رہی ہے اور اس کی وجہ اس کیس پر شیردل کی حمایت ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے بالآخر خیر دین کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی لیکن اس وقت وہ مکمل طور پر حواسِ باختہ تھی۔

”جواد کے گھر والوں نے شیردل کی وجہ سے رشتہ ختم کیا تھا؟“ خیر دین نے اس کے سر پر جیسے ایک اور بم پھوڑا۔ پتا نہیں خیر دین آج کتنے انکشافات کرنے پر تڑپا ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر لفظ ڈھونڈنے کی جدوجہد کرنے لگی۔

”آپ سے کس نے کہا؟“ اس نے بہ مشکل خیر دین سے پوچھا۔

”شہر بانو کی می نے ہی بتایا۔“ عکس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ندامت سی ندامت تھی وہ امریکا میں بیٹھے ہوئے بھی سب کچھ جانتی تھیں۔

”نانا میں شیردل سے محبت کرتی ہوں، میں زندگی میں ایک شیردل سے زیادہ کسی کو نہیں چاہ سکتی لیکن مجھے اس کی زندگی کا سانس بننے کی تمنا نہیں ہے۔ یہ ایک خواب میں نے بھی نہیں دیکھا۔“ اس کی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بھرا گئی تھی۔ ”میں نے اس سے تب بھی شادی نہیں کی جب وہ غیر شادی شدہ تھا تو اب اس کا گھر توڑ کر اسے حاصل کرنے کی کوشش کیوں کروں گی میں.....؟ میں نے آپ سے یہ نہیں سیکھا..... میں شہباز کا کوئی بدلہ شہر بانو سے نہیں لوں گی، نہ ہی آپ ایسا سوچیں، اس نے اپنے اعتراف سے خیر دین کو ششدر کر دیا تھا۔ اسے عکس سے اس اعتراف کی توقع تھی نہ اس کے اس طرح کمزور پڑنے کی۔

”میں شیردل کو بلوا کر اس سے بات کروں گا۔“ خیر دین کو خود سمجھ نہیں آئی کہ اس کے منہ سے یہ جملہ کیوں

نکلا تھا۔ وہ آخر شیردل کو بلوا کر اس سے کیا بات کر سکتا تھا۔  
 ”نانا آپ اس سے کچھ بات نہیں کریں گے، نہ ہی اس سے کوئی شکایت کریں گے۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے۔ میں نہیں چاہتی اس کے لیے مزید شرمندگی کا کوئی ذریعہ بنے آپ کی کوئی شکایت یا بات.....“  
 عکس نے فوری طور پر خیر دین سے اختلاف کیا تھا۔

خیر دین بہت دیر چپ چاپ اسے دیکھتا رہا پھر اس نے جھکے ہوئے انداز میں کہا۔ ”تم پر بد اعتمادی یا بے یقینی کا کوئی سوال ہی نہیں ہے میرے لیے چڑیا..... میں تم پر اندھا اعتماد کرتا ہوں لیکن اندھا نہیں ہو سکتا۔ شہر بانو کی ماں ایک اچھی عورت ہے۔ بہت احسانات ہیں اس کے ہم پر۔“ عکس چپ چاپ خیر دین کی بات سننے لگی۔ اس نے ساری زندگی خیر دین کو لوگوں کے احسانات گنواتے دیکھا تھا اور احسان فراموشی کو چھپاتے۔ وہ اب بھی سننا چاہتی تھی کہ اس کے پاس شہر بانو کی ماں کے حوالے سے گنوانے کے لیے کون سے احسانات تھے۔

☆☆☆

شرمین کو بالکل توقع نہیں تھی کہ عکس انہیں خود کال کر سکتی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے عکس کو اس کی خیر دین کو کال کی توقع نہیں تھی۔ کہیں نہ کہیں انہیں بھی یہی توقع تھی کہ وہ کبھی اتنی ہمت نہیں کر پائے گی کہ اس ایٹو پر بات کرنے کے لیے انہیں بھی کال کرتی لیکن اس نے کر دی تھی۔

چند سیکنڈز کے لیے فون پر اس کا نام سننے پر انہیں سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ فون بند کریں اس کی بات سننے سے انکار کریں یا اپنی بیٹی کی ازدواجی زندگی تباہ کرنے پر اس پر چلائیں۔

”ہیلو۔“ عکس نے انہیں اس طرح خاموش پانے پر بے ساختہ ان کی لائن پر موجودگی چیک کی تھی۔  
 ”میں سن رہی ہوں۔“ شرمین نے بے حد سرد مہری کے ساتھ کہا۔ زندگی میں انہوں نے اپنے آپ کو اس سے زیادہ آکورڈ چویشن میں کبھی نہیں پایا تھا۔

”مسز فاروق آپ کو میرے اور شیردل کے حوالے سے جو غلط فہمی ہے، میں اسے کلیئر کرنا چاہتی ہوں۔“  
 عکس نے کسی تمہید کے بغیر کہا تھا۔ ”شیردل ایک دوست ہے اور بچ میٹ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔“ شرمین نے بے حد غلطی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

”کوئی اور بچ میٹ۔۔۔ آدمی رات کو ایک دوسرے کے بیڈروم میں نہیں پائے جاتے۔“ عکس سے بات نہیں ہو سکی۔ وہ اس پر بڑا سنگین الزام لگا رہی تھیں لیکن کس طرح۔

”میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔“ اس نے جیسے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ان سے کہا۔

”میں کیا کہہ رہی ہوں تم بہت اچھی طرح جانتی ہو۔ بچلی بار جب تم سے میری بات ہوئی تھی تو کہاں تھی تم؟ کس کے فون پر تم نے مجھ سے بات کی تھی اور رات کے کس وقت کی تھی؟ تم سنگاپور میں شیردل کے بیڈروم میں اس کے فون سے بات کر رہی تھیں اور تم مجھے کہہ رہی ہو کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے، تمہاری یادداشت کمزور ہو گئی میری نہیں۔“ ایک زلزلہ وہ تھا جو ریسور کے دوسری طرف موجود عکس نے اپنے گرد آتا محسوس کیا تھا اور دوسرا زلزلہ وہ تھا جو دروازے میں کھڑی شرمین کی باتیں سنتی ہوئی شہر بانو کے اندر آیا تھا۔ شرمین نے ایک بار بھی عکس کا نام نہیں لیا تھا لیکن وہ سیکنڈز میں ان کی مخاطب کو بوجھ گئی تھی اور گفتگو کی نوعیت سننے کے بعد اسے لگا

تھا کہ وہ وہیں گر جائے گی۔ اس کے پاؤں یک دم جیسے من من بھر کے ہو گئے تھے۔ وہ شیردل پر مسلسل عکس کے ساتھ انہیں الزام لگا رہی تھی۔ اس سے محبت کرنے پر اسے محبوب ٹھہرا رہی تھی لیکن وہ یہ بھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شیردل اور عکس کا رشتہ کبھی ان حدوں کو چھو سکتا تھا۔ شیردل اتنا گر سکتا تھا۔

شرمین کو آخری جملہ بولتے بولتے کمرے میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا تھا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ گردن موڑنے پر انہیں کھلے دروازے میں کھڑی شہر بانو نظر آئی تھی جس کا چہرہ اس طرح فق تھا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے شرمین بھی فریز ہو گئیں پھر انہوں نے عکس سے کچھ بھی کہے بغیر لائن ڈسکنٹ کر کے فون آف کر دیا تھا۔ انہوں نے شہر بانو کو سہارا لے کر کمرے کے دروازے کے ساتھ والی دیوار کے پاس پڑے صوفے پر بیٹھتے دیکھا۔ وہ جیسے خود کو گرنے سے بچا رہی تھی۔ شرمین سب کچھ چھوڑ کر بے اختیار لپک کر اس کے پاس آئی تھیں۔ اس کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا، وہ بے حد سرد ہو رہا تھا۔

”تم ٹھیک ہو؟“ شرمین نے بے ساختہ اس کے سرد پڑتے ہوئے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

”آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا یہ؟“ اس نے جواباً جیسے بہ مشکل شرمین سے کہا تھا اس کی آواز جیسے کسی کھائی سے آرہی تھی۔ وہ ماں کی طرف دیکھنے بھی نہیں پارہی تھی۔

”میں تمہیں اس تکلیف سے بچانا چاہتی تھی۔“ شرمین نے رنج کے عالم میں اس سے کہا۔ ”میں تمہارا وہ گھر بچانا چاہتی تھی جو تم نے بنایا تھا جس پر تمہیں اتنا ناز تھا۔“ وہ اس کا مذاق نہیں اڑا رہی تھیں لیکن شہر بانو کو یونہی لگا تھا جیسے شرمین نے ہنستے ہوئے اس کا مذاق اڑایا تھا، جیسے ساری دنیا ہنستے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔  
 ”میں تمہارا وہ گھر بچانا چاہتی تھی جو تم نے بنایا تھا۔ جس پر تمہیں اتنا مان تھا۔“ گھر..... کون سا گھر؟.....  
 مان..... کون سا مان؟..... رشتہ کون سا رشتہ.....؟ اعتبار..... کون سا اعتبار۔

کھلے دروازے سے مثال اندر آئی تھی۔ ایک ٹیڈی بیئر ہاتھ میں پکڑے..... ماں اور شرمین کی کیفیت سے بے خبر..... اور اس نے اندر آتے ہی ہمیشہ کی طرح وہی ایک بات کہی تھی جو وہ صبح شام سیکڑوں بار دہراتی تھی۔

”مئی مجھے پاپا کے پاس جانا ہے، میں ان کو مس کر رہی ہوں۔“ شہر بانو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر اس نے کہا۔

”تمہارے پاپا مر چکے ہیں۔“ مثال نے عجیب خوف اور بے یقینی سے ماں کو دیکھا تھا۔ پھر شرمین کو.....

☆☆☆

ایک زلزلے کی لپیٹ میں آئے ہوئے شخص کی طرح عکس نے شرمین کے فون بند کر دینے کے بعد بھی کئی بار اسے کال ملانے کی کوشش کی تھی۔ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ اسے پہلی بار اب ہوا تھا اور ساتھ شیردل کی پریشانی کا بھی..... وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کسی بھی طرح سے کسی کی ازدواجی زندگی میں آنے والے بھونچال کا ذمے دار قرار دی جاسکتی تھی اور وہ بھی شیردل کی زندگی میں.....

اسے اندازہ نہیں تھا کہ شرمین نے خیر دین سے کیا کہا تھا..... کیا یہ سنگین اور گھٹیا الزام انہوں نے نانا کے

نہیں لگتیں۔

اگلے چند دنوں میں خیر دین نے سجاد کی فیملی کو بلوا کر عکس کے نہ چاہنے کے باوجود اس کی اور سجاد کی ملاقات کروادی تھی۔ وہ ایک مناسب شکل صورت کا ایک اچھا قابل ڈاکٹر تھا اور اچھا بیک گراؤڈ تھا اس کا..... عکس اور اسے دونوں کو اپنے پانچ سالہ دورِ تعلیم کے دوران کسی آنے والے کی کوئی یادیں نہیں تھیں لیکن سجاد پھر بھی کلاس کی بہترین اسٹوڈنٹ کے طور پر اسے بہت اچھی طرح یاد رکھے ہوئے تھا اور اس حوالے سے اس کے لیے اچھی فیڈبک رکھتا تھا..... ایک اور مشکل مرحلہ آیا تھا اور ایک اور مشکل مرحلہ طے کر لیا تھا اس نے۔ اس بار مگنی کی کوئی باقاعدہ رسم نہیں کی گئی تھی صرف بات طے کر کے چند مہینوں بعد سجاد کے پاکستان کے اگلے وزٹ پر شادی کی تاریخ طے کر دی گئی تھی۔

وہ جو اسے رشتہ طے ہوتے ہوئے خوش تھی لیکن سجاد سے نسبت طے ہوتے ہوئے اس نے ایک عجیب سی بے بسی محسوس کی تھی یوں جیسے یہ کوئی آفیشل ورک تھا..... اس کی زندگی کا اہم ترین فیصلہ نہیں تھا۔ وہ ناخوش نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ سب کچھ اس کی مرضی سے ہو رہا تھا لیکن وہ خوش بھی نہیں تھی یا کم از کم خوشی نام کی اس شے کو محسوس نہیں کر پارہی تھی جسے وہ محسوس کرنا چاہتی تھی۔ اور وہ اس کی ”وجہ“ جانتی تھی لیکن وہ اس وجہ کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی.....

اگلے چند ہفتوں میں اسے شیردل کی چھٹی بڑھ جانے کا پتا چل گیا تھا۔ وہ اب چھ ماہ کے لیے چھٹی پر چلا گیا تھا اور اس کی سپٹ پر کسی اور کو تعینات کر دیا گیا تھا۔ وہ اس سے بے نیاز رہنے کی کوشش کرنے کے باوجود بے نیاز نہیں رہ سکی تھی..... بے چینی اور اضطراب میں اس نے ایک بار پھر اس سے رابطے کی کوششیں شروع کر دی تھیں اور ایک بار پھر نا کام رہی تھی۔ اس کے سیل فونز آف تھے اور یہ ایک تشویشناک بات تھی..... کوئی بھی مہینوں اپنے سیل فون آف نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے کسی بیچ میٹ سے رابطے میں نہیں تھا۔ اس نے چند بار اس کے والدین کے گھر پر خود فون کیا تھا لیکن ہر بار اسے یہی پتا چلا کہ وہ گھر پر نہیں ہے لیکن وہ کہاں ہے کب آئے گا اس کا اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ وہ دونوں اس سے پہلے بھی مہینوں ایک دوسرے سے رابطے میں نہیں رہتے تھے لیکن اس نے ایسا اضطراب اور وحشت کبھی محسوس نہیں کی تھی کیونکہ اسے شیردل کی خبر ملتی رہتی تھی، وہ کہاں

سامنے بھی ڈھرایا تھا؟ اسے جیسے شرم آئی تھی لیکن اگر خیر دین سے شرمین نے ایسی کوئی بات کی ہوتی تو وہ اس کے بارے میں بھی پوچھتا۔ وہ جیسے مڑی کے جالے کے تار میں الجھی لنگ رہی تھی، زندگی میں پہلی بار اس نے کسی سے اس طرح کی مدد لی تھی اور وہ مدد اب اس کے حلق میں ہڈی بن کر انگ گئی تھی۔ وہ اب بُری طرح پچھتا رہی تھی کہ اس نے شیردل کا فون استعمال کیوں کیا..... کر لیا تھا تو شرمین کی کال کیوں لی..... لیکن بعض دفعہ بد قسمتی انسان سے وہ کام کروا رہی ہوتی ہے جو وہ عام حالات میں کبھی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

اس دن اس نے ایک بار پھر شیردل سے رابطہ کرنے کی سر توڑ کوشش کی تھی اور ایک بار پھر نا کام رہی تھی۔ اس کا سیل فون ہمیشہ کی طرح بند تھا اور اس کے والدین کی لاہور کی رہائش گاہ سے اس کے ”غیر موجود“ ہونے کی خبر کے علاوہ کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ عکس کو اب اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ اسے نظر انداز کر رہا تھا اور اسے ہی نہیں شاید ساری دنیا کو نظر انداز کر رہا تھا کیونکہ اس کی ازدواجی زندگی میں ہونے والے سارے مسئلے اس کی وجہ سے ہوئے تھے۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا ہو کہ اس سے رابطہ مستقل طور پر منقطع رکھ کر وہ اس مسئلے کا حل نکال سکتا تھا۔

وہ ایک کے بعد ایک توجہ پیش کرتی اور اسے رد کرتی رہی پھر اس نے جیسے خود بھی یہی طے کیا تھا کہ وہ شیردل سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ اگر اس کو لگتا تھا کہ وہ اس کی مدد کے بغیر اس مسئلے کا حل نکال سکتا تھا تو پھر اسے شیردل کو یہ کام کرنے دینا چاہیے تھا۔

”نانا آپ سجاد سے میری شادی طے کر دیں۔“ شرمین سے ہونے والی گفتگو کے تیسرے دن رات کے کھانے کے بعد اس نے خیر دین سے کہا تھا۔ حلیمہ اگلے ویک اینڈ پر پاکستان سے واپس جا رہی تھی اور اس نے اپنی سسرال سے فون کر کے اس صبح عکس سے سجاد کے سلسلے میں دوبارہ بات کی تھی۔ خیر دین اس کی بات پر حیران ہو گیا تھا۔

”لیکن تم تو پہلے ملنا چاہتی تھیں اس سے۔“

”ہاں لیکن اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ امی مل چکی ہیں اس سے..... آپ بھی مل لیں۔ اس کی فیملی ایک فنکشن میں مجھ سے مل چکی ہے۔ ہم دونوں کی ایک ملاقات کی اب زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ کو وہ ٹھیک لگتا ہے تو بس کافی ہے۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی اور اس کی یہ سنجیدگی خیر دین کو جیسے ہنسنے نہیں ہو رہی تھی۔ شادی کے لیے اس طرح فوری طور پر مان جانا..... اور وہ بھی لڑکے سے بڑے بغیر جبکہ اس سے پہلے وہ ہمیشہ بڑے بغیر کسی بھی لڑکے سے شادی کے خلاف تھی اور خیر دین کو بھی ہمیشہ یہی مناسب لگا تھا کہ وہ لڑکے سے خود مل لے اگر اسے مناسب لگتا پھر ہی وہ لوگ بات آگے بڑھاتے۔

خیر دین نے اس سے وجہ پوچھنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ انہیں لگا تھا وہ شیردل کے معاملے کی وجہ سے شادی میں جلدی کرنا چاہتی تھی۔ شرمین کے حوالے سے بھی ان دونوں کے درمیان اس ایک گفتگو کے علاوہ کوئی اور گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ عکس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خیر دین سے شرمین کے ساتھ ہونے والی گفتگو کی تفصیلات جاننے پر اصرار کرتی، نہ ہی شرمین کے ساتھ ہونے والی اپنی گفتگو کو وہ خیر دین کے سامنے ڈھرایا سکتی تھی لیکن اسے یہ احساس ہوا تھا کہ شرمین نے شاید خیر دین سے اس واقعے کا ذکر کیے بغیر اس پر الزامات لگائے تھے اور اگر انہوں نے ایسا کیا تھا تو وہ اس کے لیے شرمین کی بہت احسان مند تھی اور احسان مندی کی بعض شکلیں مذاق سے کم



اور اس نے وہاں جانے میں دیر نہیں کی تھی، وہ دوسرے دن آفس سے جلدی فارغ ہونے کے بعد لاہور چلی آئی تھی۔ منترہ نے خلاف توقع بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا تھا ان سے گفتگو کے دوران عکس کی تشویش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ منترہ خود بھی شیردل کی وجہ سے بہت زیادہ ڈپریمڈ تھیں۔ شیردل کی وجہ سے ان کی سوشل سرگرمیاں تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ سائے کی طرح ہر وقت شیردل کے ساتھ رہتی تھیں۔ انہوں نے شہباز حسین کو اسی Phase سے اسی تکلیف دہ انداز میں گزرتے دیکھا تھا اور وہ اپنی اولاد کو ویسے انجام سے بچانے کے لیے ہلکان ہو رہی تھیں۔ وہ رعونت اور غرور یک دم جیسے کہیں اڑ گیا تھا جو منترہ مختیار کی پہچان تھا۔ اس سے گفتگو کے دوران وہ کئی بار بات کرتے کرتے رو پڑی تھیں۔ شیردل کی بیماری اُن کے اپنے اعصاب کو مفلوج کر رہی تھی اور اس پر ان کی اپنی فیملی کا اس سارے مسئلے کے لئے انہیں مورد الزام ٹھہرانا اور وہ احساسِ جرم سے فرار کے لیے ڈوبتے کی طرح تنکے ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ عکس مراد علی بھی ایسا ہی ایک تنکا تھا جس سے وہ اپنے بیٹے کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ان سے بات چیت کے دوران ہی عکس کو یہ پتا چلا کہ شیربانو اور شیردل کی طلاق ہو گئی تھی، دونوں فیملیز کے کچھ مشترکہ دوستوں اور رشتے داروں کی لاکھ کوششوں کے باوجود شہر بانو نے طلاق کے لیے کیس فائل کر دیا تھا۔ نکاح نامے میں طلاق کا حق اور بچے کی کسٹڈی کا حق پہلے ہی اسے تفویض کیے جا چکے تھے اس لیے کیس کو اس کے حق میں ختم ہونے میں چند ہفتے لگے تھے۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ منترہ سے یہ سب سنتی رہی۔ تبھی وہ ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا اور اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی عکس کا دل مزید بوجھل ہو گیا تھا۔ منترہ نے اس کی بیماری اور تکلیف کے بارے میں کوئی مبالغہ نہیں کیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں اور کم و بیش پندرہ کلو وزن کی کمی کے بعد کوئی بھی اسے دیکھ کر صحت مند نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے گھنے سیاہ بالوں میں اب جگہ جگہ سفید بال دکھ رہے تھے۔

”تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ تم آرہی ہو۔“ اس نے اندر آتے ہی بڑے معمول کے انداز میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود جواباً مسکرا نہیں سکی۔

”کیسے اطلاع دی، تم نے تو فون ہی بند کیے ہوئے ہیں سارے۔“ اس نے عکس کی اس بات کا جواب

تھا کیا کر رہا تھا پتا چل جاتا تھا لیکن اب جیسے وہ صفحہ ہستی سے ہی غائب ہو گیا تھا۔ تقریباً دو ماہ کے بعد بالآخر جیسے اس کی پریشانی دور ہو گئی تھی۔ وہ اس دن بھی شیردل کے گھر کال کر رہی تھی لیکن ہمیشہ کی طرح فون آپریٹر نے ہی اٹھایا تھا۔ وہ نیا آپریٹر تھا اور اس نے اس کا تعارف لینے کے بعد شیردل سے اس کی بات کروانے کے بجائے منترہ کے ساتھ لائن ملا دی تھی۔ وہ منترہ کی آواز سننے پر چند سیکنڈز عجیب گونگو کے عالم میں رہی جیسے طے نہ کر پا رہی ہو کہ اسے ان سے بات کرنی چاہیے یا نہیں اور پھر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ ایک نیا پنڈورا باکس نہیں کھولنا چاہتی تھی۔

چند ہی منٹوں بعد اس کا فون بجنے لگا تھا۔ اس نے فون اٹھا کر دیکھا اور اس کا دل یک دم جیسے خوشی سے اچھلا تھا۔ وہ شیردل کے گھر کا نمبر تھا وہاں سے کال بیک ہو رہی تھی یقیناً آپریٹر نے شیردل کو اس کی کال کے بارے میں اطلاع دی تھی۔

اس نے بہت ایکساٹمنٹ کے عالم میں فون اٹھایا، آپریٹر نے اسے اطلاع دی تھی کہ منترہ اس سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ وہ شش و پنج میں پڑی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ اُن سے بات کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتی اس نے دوسری طرف سے ان کی آواز سن لی وہ اس بار اس کا نام لے کر اسے مخاطب کر رہی تھیں۔ یعنی وہ جانتی تھیں کہ وہ کس کو کال بیک کروا رہی تھیں۔ اس نے بڑے محتاط سے انداز میں منترہ سے علیک سلیک کی۔

”میں شیردل کی خیریت دریافت کرنا چاہتی تھی۔ بہت دنوں سے اس سے بات نہیں ہوئی تھی کچھ آفیشل کام بھی تھا۔“ اس نے چھوٹے ہی منترہ کو بتایا اور ساتھ ہی جھوٹ بولنا بھی ضروری سمجھا۔

”شیردل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ دوسری طرف سے اسے منترہ کی آواز بے حد ہنسی ہوئی لگی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اسے یک دم تشویش ہوئی۔

”نروس بریک ڈاؤن..... بہت زیادہ ڈپریمڈ ہے وہ..... ڈاکٹر نے ریٹ کے لیے کہا تھا..... بار بار بیمار ہو رہا ہے وہ؟“

عکس تشویش سے سنتی رہی۔

”آپ اس سے میری بات کروادیں۔“ اس نے اُن کی بات سننے کے بعد کہا۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے انہوں نے کہا۔

”میں نے شیردل سے کتنی بار کہا ہے کہ تم سے بات کرے یا مل لے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ کسی سے بھی بات نہیں کرتا..... کسی دوست سے نہیں ملتا۔ گھر سے نکلتا ہی نہیں۔ میں پورا ایک مہینہ اس کو ساتھ لے کے مری گزار کر آئی ہوں کہ کچھ بہتر ہو جائے گا لیکن چند دن ٹھیک رہتا ہے پھر دور سے پڑنا شروع ہو جاتے ہیں تم اس سے ملنے کے لیے آؤ..... آکر سمجھاؤ اُسے۔ تم سے تو بہت کلوڑ تھا۔“

عکس نے ان کی آواز میں اُتری بے بسی محسوس کی۔ وہ عام حالات میں کبھی اس سے مدد نہیں مانگ سکتی تھیں، کبھی اس سے یہ ساری گفتگو نہیں کر سکتی تھیں لیکن شیردل کی حالت نے منترہ کو جیسے عجیب خوف اور وسوسوں کا شکار کر دیا تھا۔

”میں آؤں گی اسے دیکھنے۔“ عکس نے ایک لمحے کے تذبذب کے بغیر کہا، کوئی دوسرا جواب اس کے پاس ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

نہیں دیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا سگریٹ کا پیکٹ میز پر رکھتے ہوئے وہ خود اس کے ساتھ والے صوفے کے کونے میں بیٹھ گیا تھا۔

”تم لوگ باتیں کرو میں چائے بھجواتی ہوں۔“ منترہ واضح طور پر انہیں اکیلے باتیں کرنے کا موقع دینا چاہتی تھیں۔

”میرا خیال ہے ہم لوگ باہر کا چکر لگا کر آتے ہیں، مجھے ایک دو کام بھی ہیں وہ بھی کر لوں گی۔“ عکس نے ایک دم اٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں ضرور بلکہ اچھا ہے شیردل بھی بہت دنوں سے باہر نہیں نکلا، اسی بہانے اس کی بھی تھوڑی آؤٹنگ ہو جائے گی۔“ منترہ نے ایک لمحے کا تامل بھی نہیں کیا تھا۔ شیردل نے حیران اور ابھری نظروں سے ان دونوں کو دیکھا پھر جیسے بادل ناخواستہ وہ اٹھ گیا تھا۔

”کیا کام ہیں تمہیں؟“ اس نے گاڑی سڑک پر لاتے ہی عکس سے پوچھا تھا وہ گاڑی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔

”تمہیں میری کالز اور میسجز مل رہے تھے نا؟“ عکس نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”ہاں۔“ شیردل نے کوئی بہانہ بنائے بغیر کہا۔

”اور تم نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔“

”فائدہ کیا تھا؟“ وہ سڑک کو دیکھتے ہوئے عجیب بے بسی سے بولا۔

”تم نے حالت دیکھی ہے اپنی؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے عکس کی بات کا ٹی اور گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔

”کیا ہوا؟“ عکس نے کچھ حیران ہو کر اس سے پوچھا۔

”تم ڈرائیو کرو، میں مین روڈ پر ڈرائیو نہیں کر سکتا۔“

”کیوں؟“

”میرا سر چکرانے لگتا ہے بہت ساری گاڑیاں اور ان کی اسپید دیکھ کر دو دفعہ گاڑی مار چکا ہوں اور تم

guest ہو میں نہیں چاہتا تمہیں ایسبولینس کی ضرورت پڑے۔“ وہ بات کو خوش دلی سے کرنے کی کوشش کر رہا

تھا اور اس نے ساتھ ہی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ عکس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔

”مین روڈ پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس کسی چھوٹے موٹے پارک میں چلو۔“

”شام ہو رہی ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ چند لمحوں کے لیے ٹھٹکا تھا پھر دروازہ بند کر کے دوبارہ گاڑی اشارت کر دی۔

اگلا موڑ مڑتے ہی بچوں کے ایک پلے ایریا کے سامنے اس نے گاڑی روک دی تھی۔

”آئی نے مجھے بتایا کہ تمہاری divorce.....“ پارک کی ایک بیچ پر آ کر بیٹھنے اور چند ادھر ادھر کی باتوں

کے بعد اس نے شیردل سے کہنے کی کوشش کی۔ شیردل نے اسے ٹوک دیا۔

”بس اب اس ایشو کے بارے میں بات مت کرنا..... کوئی اور بات کرو۔“ وہ جیسے تکلیف میں کرا رہا تھا

یوں جیسے اس کے ہاتھ سے اس کا کوئی کھرٹڈ کھرچا گیا تھا۔ عکس کا دل بُری طرح دکھا۔

”جواب پہ واپس کیوں نہیں آرہے؟“ اس نے بات بدل دی۔  
 ”آ جاؤں گا۔“ اس نے اسی بیڑاری سے کہا۔ وہ اب سگریٹ سلگارہا تھا۔  
 ”ٹینس ایسی چل رہی ہے تمہاری۔“ اسے پہلی بار شیردل کے لیے سوال ڈھونڈتے ہوئے دقت ہو رہی تھی۔  
 ”چھوڑ دی۔“ وہ ایک کس لیتے ہوئے ایک جھولے پر جھولتی پچی کو دیکھنے لگا، عکس نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔

”تم اتنے کمزور تو نہیں تھے شیردل۔“ عکس نے اس کی توجہ بٹائی۔  
 ”میں سوچ رہا تھا اب تک تمہاری شادی ہو چکی ہوگی..... کافی مہینے گزر چکے ہیں۔“ شیردل نے اس کے سوال کے جواب میں اس سے بات بدل کر کہا۔ ”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے، کیسا ہے جواد؟“  
 ”اگر تم میرے بھی سوالوں کا جواب نہیں دو گے تو میں بھی نہیں دوں گی۔“  
 ”یہ تو بہت اچھا ہے سوال جواب کر کے کیا کرنا ہے ہم نے..... ایسے ہی خاموش بیٹھتے ہیں۔“ وہ دوسرا سگریٹ نکالنے کے لیے پیک اٹھانے لگا جب عکس نے ہاتھ بڑھا کر اس سے پہلے پیک اٹھا لیا۔  
 ”مشکل وقت ہے لیکن گزر جائے گا شیردل۔“ وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا پھر اس نے پیچ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”ہاں گزر جائے گا لیکن فی الحال نہیں گزر رہا۔“  
 ”اس طرح گزارنے سے نہیں گزرے گا، تم جاب پر واپس آؤ۔“  
 ”آ جاؤں گا، ساری زندگی گھر میں بیٹھ کے تو نہیں گزار سکتا میں۔“ اس نے بیڑاری سے کہتے ہوئے عکس کے ہاتھ سے سگریٹ کا پیک لینے کی کوشش کی۔  
 ”مجھے استھما ہے تم اگر پھر بھی میرے پاس بیٹھ کر اسموکنگ کرنا چاہتے ہو تو لو کرو۔“ عکس نے نرمی سے وہ پیک اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ جیسے کچھ دیر پیک ہاتھ میں لیے الجھتا رہا پھر اس نے پیک رکھتے ہوئے کہا۔  
 ”تم جانتی تھیں میرے ساتھ کیا ہوا لیکن تم نے ایک بار بھی مجھے کال کر کے میرا حال پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔“ وہ بالآخر اپنے دل کا غبار نکالنے لگا تھا۔

”مجھے بہت دیر سے پتا چلا کئی دن بعد۔“  
 ”جھوٹ مت بولو۔“ شیردل نے اسے ٹوکا۔  
 ”تمہارا ذاتی معاملہ تھا یہ اور میں کیسے.....“  
 ”shut up“ شیردل نے اس بار پھر اس کی بات کاٹی۔  
 ”تم اس وجہ سے خفا تھے مجھ سے؟“ عکس نے بالآخر ایک گہری سانس لے کر کہا۔  
 ”تم نے بھی مجھے چھوڑ دیا تھا..... تمہیں کم از کم مجھ سے پوچھنا تو چاہیے تھا۔“  
 ”میں نے تمہیں کالز اور میسج کیے تھے۔“

”کئی دن بعد آئے تھے وہ میسج۔“ اس نے پھر بات کاٹ کر کہا۔  
 ”اور پھر کئی مہینے میں جو کالز اور میسج تمہیں کرتی رہی وہ.....“ وہ اب ایک دوسرے سے اسی طرح بات کرنے لگے تھے جیسے ہمیشہ کرتے تھے۔ وہ دقت، دشواری آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی تھی۔



”وہ اگلے ماہ شادی کر رہی ہے۔“ مذہم آواز میں کہے ہوئے جملے پر عکس نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اسے اس ”وہ“ کے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کس کی بات کر رہا تھا۔ وہ اسے یہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکی کہ وہ بھی اگلے مہینے شادی کر رہی تھی۔

”کس سے؟“

”کزن ہے ایک اس کا..... داؤد۔“

”میں جانتی ہوں تمہارے لیے بہت تکلیف دہ ہے یہ۔“ شیردل نے اس کی بات کاٹ دی۔

”نہیں، میرے لیے یہ سب تکلیف دہ نہیں ہے، مجھے اس عورت میں دلچسپی نہیں ہے اب..... لیکن میرے لیے تکلیف دہ بات صرف یہ ہے کہ میں مثال سے الگ ہوں اسے دیکھ نہیں پا رہا، اس سے بات نہیں کر سکتا مجھے اس کا خیال آتا ہے تو میں سو نہیں پاتا۔“ وہ بے بسی اور تکلیف سے کہہ رہا تھا۔

”وہ کب تک ایسا کر سکتی ہے..... ابھی غصے میں ہے..... تھوڑا ناظم دوا سے..... چند مہینے..... پھر سب کچھ نارمل ہونا شروع ہو جائے گا، پھر وہ اپنی زندگی میں بڑی ہو جائے گی پھر اسے احساس ہوگا کہ وہ مثال کو ساری زندگی کے لیے تم سے دور نہیں رکھ سکتی۔“ عکس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

”تب تک مثال مجھے بھول جائے گی۔“ شیردل نے ہونٹ کاٹتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

”تم امریکا جا کر اس سے مل آؤ۔“

”میرا ویزا کینسل کر دیا ہے امریکن ایمبیسی نے..... شہر بانو نے میرے خلاف رپورٹ کی ہے کہ میرے امریکا آنے سے اسے اور مثال کو جان کا خطرہ ہو سکتا ہے۔“ وہ تلخی سے ہنسا۔ عکس کچھ دیر بول نہیں سکی۔ وہ اب سمجھ پار ہی تھی کہ اس کا اگر نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا تو بلاوجہ نہیں ہو گیا تھا، شہر بانو کی جذباتیت نے اسے دیوار سے لگا دیا تھا۔

”شہر بانو ایسی نہیں تھی۔ میں حیران ہوں اس نے.....“ شیردل نے اس کی بات کاٹ دی۔

”شہر بانو ایسی ہی تھی اور تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو۔ میں نے تمہیں بہت شروع میں بتا دیا تھا کہ وہ بہت جذباتی ہے۔ وہ بہت ناپختہ کار ہے، میری اور اس کی شخصیت میں بہت فرق ہے لیکن تم مجھے مجبور کرتی رہی تھیں۔ وہ کم عمر ہے اس لیے ایسی ہے، وہ ٹھیک ہو جائے گی صرف سپورٹ ملنے کی دیر ہے..... وہ تم سے پاگلوں جیسی محبت کرتی ہے تمہارے ساتھ رہے گی تو یہ چھوٹی موٹی خامیاں چلی جائیں گی۔ اس شادی میں تم نے مجھے پھنسا دیا۔“ وہ اس پر برسنے لگا تھا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ شہر بانو نے اس کے سارے اندازے اور توقعات غلط ثابت کر دی تھیں۔

☆☆☆

اس رات وہ بہت دیر سے واپس گھر پہنچی تھی۔ خیر دین ہمیشہ کی طرح اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔

”بہت دیر ہو گئی۔“

”جی نانا۔“

”کیا کام تھا لاہور میں؟“ وہ اس غیر متوقع سوال پر خیر دین کی شکل دیکھنے لگی۔ لاہور جانا اس کا معمول تھا اور خیر دین کبھی وہاں کام کی نوعیت اور اس کی مصروفیات کے بارے میں نہیں پوچھتا تھا۔

”شیردل کی عیادت کے لیے گئی تھی، وہ بیمار ہے۔“ اس نے بھی یک دم جیسے خیر دین سے جھوٹ بولنے کا

ارادہ ترک کرتے ہوئے اسے صاف صاف بتایا۔

”کیا ہوا اسے؟“ خیر دین چونک گیا تھا۔

”ڈپریشن ہے بہت زیادہ..... بہت کمزور ہو گیا ہے۔“ وہ مذہم آواز میں کہہ کر اندر چلی گئی۔ خیر دین وہیں کھڑا رہا۔

اپنے بیڈ روم میں آ کر اس نے ابھی اپنا بیگ رکھا ہی تھا کہ اس کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے بیگ میں سے سیل فون نکال کر اسے دیکھا، اس پر شیردل کا نام چمک رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

”تم گھر پہنچ گئی ہو؟“ علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

”ہاں، ابھی ابھی پہنچی ہوں۔“ وہ فون پر بات کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر اپنے جوتے اتارنے لگی۔

”آج بہت دیر ہو گئی تمہیں لاہور سے نکلتے ہوئے، مجھے تمہارے جانے کے بعد وقت کا اندازہ ہوا اس لیے فون کر کے پوچھ لیا۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی کافی دیر سے لاہور سے نکلی تھی۔ وہ دونوں اسی طرح بے مقصد باتیں کرتے رہے۔ وہیں یارک میں بیٹھے پھر شیردل ایک قریبی ریستورانٹ میں اس کے منع کرنے کے باوجود اسے کھانا کھلانے لے گیا۔ عکس کو اندازہ تھا کہ کھانا کھاتے ہوئے مزید دیر ہو جائے گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔

”اینڈ آئی ایم سوری۔“ وہ اس کے اگلے جملے پر حیران ہو گئی تھی۔

”یہ کس لیے؟“

”ابھی بیٹھ کے سوچ رہا تھا تو مجھے احساس ہوا تم سے بہت ساری الٹی سیدھی باتیں کہہ دیں میں نے.....

جو نہیں کہنی چاہیے تھیں جو کچھ ہوا اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں تھا۔“ وہ اب کچھ نادم سا کہہ رہا تھا۔

”لیکن آج کل بس اسی طرح کی باتیں کرتا پھر رہا ہوں کچھ سمجھ نہیں آتا کون سی بات کس سے کہنی چاہیے اور کس سے نہیں۔ صرف اس لیے میں کسی سے بھی بات نہیں کر رہا۔“ وہ جیسے بڑی بے بسی کے عالم میں اس سے اپنی شرمندگی کا اظہار کر رہا تھا۔

”تم مجھ سے تو بات کر سکتے ہو اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر دو..... ساری عمر تم نے اس بات کی پروا نہیں کی تو اب تمہیں یک دم گفتگو کے آداب کیسے یاد آ گئے؟“ شیردل اس کی بات پر ہولے سے ہنس پڑا۔ وہ اس کا طنز سمجھ گیا تھا۔

”نہیں، اتنی الٹی سیدھی باتیں بھی نہیں کی ہیں تم سے..... صرف تمہیں الٹی سیدھی لگتی رہی ہیں۔“

”اسی لیے کہہ رہی ہوں مجھ سے بات کر سکتے ہو تم..... تمہاری الٹی سیدھی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالنے میں مہارت ہے مجھے۔“ وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

”اچھا چلو بس میں نے یہی پوچھا تھا پھر بات کریں گے۔“ شیردل نے یکدم بڑے abrupt انداز میں فون بند کر دیا تھا۔

وہ فون ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔ وہ clinically depressed تھا اور اسے شیردل کو اس طرح دیکھ کر بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً پانچ گھنٹے اکٹھے بیٹھے رہے تھے اور وہ تقریباً چار گھنٹے مثال کی باتیں کرتا رہا تھا۔ اس کا ہر دوسرا جملہ اس بات پر ختم ہو رہا تھا۔ ”شہر بانو میرے ساتھ اس طرح کیسے کر سکتی ہے..... What have I done to deserve all this“ (میں نے ایسا کیا برا کیا ہے جس کی سزا مجھے ملے)

اور اس ایک سوال کا جواب کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا لیکن ہر بار اس کا یہ جملہ عکس کو عجیب سے احساس جرم کا شکار کر دیتا تھا شیردل کی زندگی کے اس میس کا آغاز اس کی کوششوں سے ہوا تھا جو اس نے اپنی زندگی کے میس کو صاف کرنے کے لیے کی تھیں کہیں نہ کہیں وہی اس سارے مسئلے اور خرابی کی ذمے دار تھی اور وہ اس حقیقت سے نظریں نہیں چڑا پا رہی تھی۔ شیردل کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ کندھے جھٹک کر آگے بڑھ جاتی پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک نہ کرتی کہ اس کے کسی اقدام سے کسی دوسرے کی زندگی پر کیا اثر پڑا تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں جب خود وہ کبھی اس طرح ایسی کسی فیملی کے ہاتھوں مسائل کا شکار ہو چکی ہوتی..... لیکن یہاں سارا فرق اس کے لیے شیردل ڈال رہا تھا۔ ضمیر کی یہ ساری چھین اسے اس ایک شخص کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ جسے وہ بری طرح چاہتی تھی اور جسے وہ کبھی تکلیف میں نہ دیکھنے کی خواہش کے باوجود تکلیف میں دیکھ رہی تھی۔

شیردل نے اس سے شہر بانو کے اس کے ساتھ فیئر کے حوالے سے کوئی الزام نہیں دہرایا تھا وہ بھی اس کو یہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکی تھی کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی ان کے بریک اپ کی وجہ کون سے الزامات بنے تھے۔ اس رات عکس مراد علی سو نہیں سکی تھی۔ زندگی میں بہت سے درست سمجھے جانے والے فیصلے بہت غلط نتائج لے کر آتے ہیں اس کیس کو فائل کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے عکس نے اسے بہت درست اور ضروری سمجھا تھا لیکن اس رات بیٹھ کر اس نے پہلی بار بہت غیر جانب داری اور حقیقت پسندی سے اس کیس کو فائل کرنے کے فیصلے پر دوبارہ غور کیا تھا بہت ساری زندگیاں متاثر ہوئی تھیں اور کس حد تک متاثر ہوئی تھیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ فائدہ کیا ہوا تھا؟..... صرف ایک..... خیر دین پر سے وہ الزام ہٹ گیا تھا جس کی اب اسے پروا تک نہیں تھی جس کو کوئی یاد تک نہیں رکھے ہوئے تھا سوائے چڑیا کے..... کیونکہ وہ اس کے بچپن کا ناقابل فراموش زخم تھا۔ ”ان جنگلوں کو لڑنا بے وقوفی ہوتی ہے چڑیا جن میں ہونے والی جیت بھی ہماری زندگی کے لیے ضروری نہ ہو۔“ اسے خیر دین کی بات یاد آئی تھی۔ اپنے ماضی کی تباہی کو ٹھیک کرنے کی کوشش میں اس نے کسی دوسرے کا مستقبل تباہ کر دیا تھا..... جو بھی کچھ ہوا تھا جان بوجھ کر نہیں ہوا تھا لیکن ہو گیا تھا۔

وہ ساری رات اپنے کمرے میں شہلتی رہی تھی، صبح ناشتے کی میز پر خیر دین نے اس کی سرخ سوجی ہوئی آنکھیں دیکھی تھیں۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے چڑیا؟“ انہیں تشویش ہوئی۔

”جی ٹھیک ہے۔“ اس نے نظریں ملائے بغیر کہا۔ وہ چاہتی تھی خیر دین اس سے شیردل کے بارے میں پوچھے..... کوئی بات کرے..... خیر دین نے جو کہا تھا اس نے عکس مراد علی کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔

”تم سے ایک بات میں نے بھی چھپائی تھی چڑیا..... بہت بار بتانا چاہا لیکن بتانے کی ہمت نہیں کر سکا۔“ وہ خیر دین کے جملے پر حیران رہ گئی تھی۔ اسے ایک دم کون سا راز شیردل کرنا یاد آیا تھا۔ اس وقت تو وہ کچھ اور بات کر رہے تھے۔

”کون سا راز ہے نانا! جو آپ نے کبھی مجھے نہیں بتایا؟“ خیر دین چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

”شہر بانو کی ماں کئی سال پہلے ایک بار مجھ سے ملنے آئی تھی۔“

”میں جانتی ہوں نانا، آپ نے مجھے بتایا تھا۔“ عکس نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں لیکن میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ.....“ وہ بات کرتے کرتے رکا اور اس کے اگلے جملے نے ڈاکٹر

عکس مراد علی کو مٹی کر کے رکھ دیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ)

اس اسٹینڈنگ مرمر میں اپنے عکس پر پہلی نظر پڑتے ہی شہر بانو نے اپنی یادداشت کے سارے خانوں کو جسم سے اترے ہوئے لباس کی جیروں کی طرح کھٹکھٹانا اور جھڑنا شروع کر دیا تھا۔ کتنے سال بعد اس نے اس مرمر کو دیکھا تھا اور اس مرمر میں کیا کیا دیکھا تھا۔

آئینہ اتنے سالوں کے بعد آج بھی وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ کمر آب و تاب کے ساتھ لیکن اسی وقار کے ساتھ جس کے ساتھ شہر بانو نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ مگر کاکسیکٹر پر مکمل طور پر بدل چکا تھا۔ وہ آئینہ جیسے کسی شہزادی کا وہ دیوال تھا جسے وہ پہاڑ کے پھننے اور اس کے اندر غائب ہو جانے سے پہلے شہزادے کی رہنمائی کے لیے باہر چھوڑ گئی تھی۔ واحد سراغ..... ہر بھید تک لے جانے اور اسے پانے والا..... چند لمحوں کے لیے اس آئینے کو دیکھتے ہوئے شہر بانو کو یوں لگا تھا جیسے وہ تب ہی وہاں سے بٹے گا، غائب ہو گا جب اسے کھڑے کھڑے دیکھ لگ جائے گی پھر ایک دن وہ لکڑی کے فریم سے بڑا دے کے ایک ڈھیر اور اس آئینے سے شیشے کے ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر وہاں سے ہٹا دیا جاتا۔ پتا نہیں وہاں کھڑا وہ کس کس کا عکس دیکھتا اور دکھاتا رہا تھا۔ شہر بانو نم آنکھوں کے ساتھ اس آئینے میں نظر آنے والی عمارت کے بیرونی حصے کے عکس کو دیکھنے لگی۔ انگلیوں کی پوروں پر اس نے جیسے دو سال گئے تھے جب وہ آخری بار اس گھر سے گئی تھی۔ وہ گھر جو اس کی زندگی کا خوب صورت ترین اور بد صورت ترین باب تھا۔ وہ گھر جس سے زیادہ محبت اور نفرت اسے کبھی کسی جگہ سے نہیں ہوئی تھی لیکن وہ گھر جو وہاں آکر بسنے والے انسانوں کے تمام احساسات سے بے نیاز آج بھی اسی تمکنت سے وہاں کھڑا تھا۔

پھر آئینے میں اپنے اور اس گھر کے عکس کے درمیان اس نے ایک دم باؤل کو نمودار ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ نرم آنکھوں کے ساتھ بے اختیار مسکرائی۔ اس نے زندگی میں اس مرد کے علاوہ صرف ایک مرد کو..... وہ آگے کچھ سوچ نہیں پائی۔

باؤل اب اس کے عقب میں کھڑا اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے اس کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "You look lovely"۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ اسے ایسی باتیں کرنے کی عادت تھی۔ "Thank you for flattering me"۔ شہر بانو نے جواباً کہا۔ باؤل اس کے عکس پر نظر جمائے ہوئے بے اختیار مسکرایا۔ گہری، گرم جوش، بہت کچھ یاد دلانے والی آنکھیں..... بے حد پارک ہوٹلوں پر آنے اور کھیلنے والی بے ساختہ اور خیرار مسکراہٹ..... اور بے مسکراہٹ کیا، کیا طوفان نہیں اٹھا دیتی تھی..... کون کون سی قیامت بھی جو برپا نہیں کر دیتی تھی..... اسے اپنی بہوروشن کی شکایتیں یاد آئیں۔

"You are more than welcome"۔ باؤل نے ذرا سا ہنس کر جیسے کسی ندامت کے بغیر بے حد دھڑلے سے کہا۔

"تھیں پتا ہے میں پہلی بار اس گھر میں کب آئی تھی؟" شہر بانو نے آئینے میں باؤل کے عکس کے عقب میں موجود عمارت پر ایک نظر ڈالتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔

وہ اب بھی اس کے کندھے پر اسی طرح دونوں ہاتھ جمائے کھڑا تھا۔ شہر بانو اس کے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کر رہی تھی..... نرم، سہارا دیتا ہوا دباؤ۔ چند لمحوں کے لیے جیسے اس کا دل باؤل سے لپٹ جانے کو چاہا۔

"جب....." اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق سے نہیں نکل سکی۔ آنسوؤں کے ایک ریلے نے اس کی



”نانا آپ نے جو کیا، ٹھیک کیا آپ کو مجھے کوئی بھی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں ہے نہ ہی اس ایک لاکھ روپے کی وجہ سے میری نظر میں آپ کی قدر و قیمت میں کوئی کمی ہوئی ہے۔“ عکس نے خیر دین کو بیچ میں ہی ٹوک دیا تھا۔ صبح سے اس کے سینے پر دھرا بوجھ پل بھر میں سرک گیا تھا۔ خیر دین نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔

”کھانا کھاتے ہیں۔“ وہ مزید کچھ کہنے کے بجائے ایک بار پھر وہاں سے چلی گئی تھی۔

☆☆☆

شیردل نے بے یقینی سے منظرہ کو دیکھا اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ اس سے اس طرح کی بات کر سکتی تھیں۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی رات کا کھانا کھانے کے لیے آیا تھا۔ بختیار شہر سے باہر تھے اور ڈرنجیل پروہ اور منظرہ ہی تھے۔

”آپ کس کی شادی کی بات کر رہی ہیں؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑا کاٹنا دیس پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔

”تمہاری شادی کی بات کر رہی ہوں شیردل۔“ منظرہ نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”ممی آپ ایسی بات سوچ بھی کیسے سکتی ہیں؟“ شیردل اب بھی جیسے اس شاک سے سنبھل نہیں پایا تھا۔ عکس مراد علی گل اس سے ملنے آئی تھی اور آج منظرہ اس سے اس کی شادی کے حوالے سے بات کر رہی تھیں۔

”تم اسے ہمیشہ سے پسند کرتے تھے..... محبت کرتے تھے..... شادی کرنا چاہتے تھے اس سے..... تمہیں یاد ہے؟“ وہ بہت معمول کے انداز میں اس سے اس طرح بات کر رہی تھیں جیسے اس کی یادداشت بحال کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

”میں بے وقوف تھی کہ میں نے اتنی اچھی لڑکی کے ساتھ تمہیں شادی کرنے نہیں دی، میری غلطی تھی وہ۔“

شیردل نے ان کی بات کو بے حد غلطی کے ساتھ کاٹا۔

”ممی وہ بہت بڑا بندہ ہو چکا ہے۔ وہ انگیجڈ ہے اور مجھے شادی نام کی کسی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ اس نے دونوں انداز میں ماں سے کہا۔

”اس کی انک..... ختم ہو چکی ہے۔“ منظرہ نے بے اختیار کہا اور جیسے کہہ کر پچھتا نہیں۔

”آپ سے کس نے کہا؟“ وہ حیران ہوا۔ پچھلی رات وہ دونوں بہت دیر بات کرتے رہے تھے لیکن عکس نے اپنے حوالے سے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی اور اب وہ ایک دم منظرہ کے منہ سے اس کی سنگینی کے ختم ہونے کی بات سن رہا تھا۔

”تم جانتے ہو اس کے منگیتری فیملی کو میں اچھی طرح جانتی ہوں..... میں نے کسی فنکشن میں ان کی فیملی کے کسی ممبر سے یہ بات سنی تھی۔“ انہوں نے حتی الامکان اپنے لہجہ اور چہرے کو بے تاثر رکھا تھا۔ وہ شیردل کو کوئی اور اندازہ لگانے کا موقع دینا فوراً نہیں کر سکتی تھیں۔

وہ چند لمحوں خاموش رہا، اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ منظرہ کی بات پر کس طرح ری ایکٹ کرے۔

”اگر اس کی انجمن ختم ہو گئی ہے تو بھی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ میرے ساتھ اس کی شادی کا سوچنے لگیں۔“ اس نے چند لمحوں بعد منظرہ سے کہا۔ ”اس کے پاس مجھ سے بہتر آپشنز ہیں اور میں چاہتا ہوں وہ ان میں سے کسی کا استعمال کرے۔“ شیردل نے دونوں انداز میں ماں سے کہا۔

”وہ تم میں انٹرنلڈ ہے، نہ ہوتی تو یہاں بھی نہ آتی۔“ منظرہ نے بے اختیار کہا۔

”ممی مجھے شادی میں انٹرنس نہیں ہے اور میں جس فیز سے گزر رہا ہوں اس میں، میں کسی بھی صورت سے شادی کر کے اس کی زندگی غذا میں نہیں ڈالوں گا..... خاص طور پر عکس کی۔“ اس نے منظرہ کو بات مکمل کرنے سے پہلے ٹوک دیا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم بالکل ٹھیک ہو۔ نروس بریک ڈاؤن ہو جانے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ.....“ شیردل نے ایک بار پھر بڑی اور غصے سے ماں کی بات کاٹی۔

”ممی میری چھ سال پرانی شادی ختم ہوئے ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے، میرے پاس میری بیٹی کی کھڑی نہیں ہے اور نہ مجھے کوئی امید نظر آ رہی ہے اس سے ملنے کی..... میں اس بریک اپ سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا ہوں اور آپ مجھے دوسری شادی کا مشورہ دے رہی ہیں۔ آپ کو لگتا ہے یہ اتنا آسان ہے میرے لیے ایک گھر نوٹنے کے بعد دوسرا گھر بنالینے اتنا آسان ہے، وہ وہ بری طرح خفا ہو رہا تھا۔ منظرہ نے عکس سے ملاقات کے بعد اس میں آنے والی تمام خوشگوار تبدیلیوں کو منٹوں میں غائب ہوتے دیکھا تھا۔

”تم اسی سے تو شادی کرنا چاہتے تھے۔ سب سے پہلے..... عکس سے ہی تو.....“ منظرہ نے جیسے بڑی بے چارگی سے کہا۔

”ہاں کرنا چاہتا تھا دس سال پہلے..... اب نہیں۔“ شیردل نے اسی غلطی کے ساتھ ماں کی بات کاٹی۔

”میری غلطی تھی کہ میں نے اس وقت عکس کے ساتھ تمہاری شادی نہیں ہونے دی۔ کاش میں اس وقت مان جاتی۔“ منظرہ نے اداسی، رنجیدگی اور پچھتاوے کا بڑے کھلے الفاظ میں ادا کیا۔

”ممی میں فی الحال یہاں بیٹھ کر آپ کے پچھتاوے اور غلطیاں نہیں سننا چاہتا۔ I have had enough of it

اور کچھ نہ کریں..... اور عکس اور میں صرف دوست ہیں۔ میں اس کے بارے میں اس کے علاوہ کچھ سوچنا نہیں چاہتا۔ نہ ہی سوچوں گا۔“ وہ انا انا نے..... نے نیکل سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ منظرہ نے بے حد بے چارگی سے اسے جاتا دیکھا۔ وہ ان کی اگلی اولاد نہیں تھا لیکن وہ اس کے سامنے شرمساری کی وجہ سے بے حد تکلیف میں تھیں۔ اس کا گھرانہ کی وجہ سے ٹوٹا تھا۔ یہ سب جانتے تھے اور کوئی نہ بھی جانتا تھا۔ خود اچھی طرح جانتی تھیں۔

شیردل کے بریک اپ کی ساری ذمہ داری شہر بانو کے سر ڈالنے کی کوششوں کے باوجود انہیں یہ احساس جرم تھا کہ یہ جانی ان کی وجہ سے آئی تھی، اس سارے مسئلے میں وہ اگر شیردل اور اپنے شوہر کو سپورٹ کرتیں تو یہ مسئلہ اتنا خراب نہ ہوتا۔

عکس مراد علی کو انہوں نے خود اپنے لیے ایک ”بھوت“ بنایا تھا وہ بھوت نہیں تھی۔ جموٹی انا، ضد، خاندانی تقاضا، دوبارہ ان کے خاندان میں تباہی لایا تھا اور انہیں اس کا احساس پہلی بار ہو رہا تھا۔ خود غرضی تھی جواب بھی ویسے ہی ان کے وجود پر پڑ پھیلائے بیٹھی تھی..... انہیں اپنے بڑے بیٹے کی زندگی میں ایک بار پھر سے سکون اور استحکام چاہیے تھا اور انہیں یہ سکون اور استحکام عکس مراد علی کی شکل میں نظر آ رہا تھا تو وہ ایک دم سب کچھ بالائے طاقت رکھتے ہوئے اس سے رشتہ جوڑنے پر تیار ہو گئی تھیں۔

شیردل کے اس طرح کے رویے کے بعد بھی انہوں نے عکس اور خیر دین سے اس سلسلے میں بات کرنے کا ارادہ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اور بختیار، شیردل کے حوالے سے بہت مشکوک تھے اور چاہتے تھے کہ فوری طور پر اسے بھی اپنی زندگی دوبارہ کسی کے ساتھ گزارنے پر آمادہ کریں لیکن یہ کام آسان نہیں تھا۔ شہر بانو سے طلاق کے بعد

ماہنامہ پاکیزہ۔ نومبر 2012ء

ماہنامہ پاکیزہ۔ نومبر 2012ء

ماہنامہ پاکیزہ۔ نومبر 2012ء

ماہنامہ پاکیزہ۔ نومبر 2012ء

ماہنامہ پاکیزہ۔ نومبر 2012ء

ماہنامہ پاکیزہ۔ نومبر 2012ء

ماہنامہ پاکیزہ۔ نومبر 2012ء

ابتدائی چند دنوں میں شیردل سے اس حوالے سے کچھ بات کرنے پر وہ مجھے سے اکڑ گیا تھا۔ وہ پہلے ہی sedates (مسکن ادویہ) پر تھا اور اس المیہ کے زیر بحث آنے کے بعد اس کے panic attacks (ذہنی دورے) بڑھ گئے تھے۔ بختیار نے منزہ کو دوبارہ اس سے ایسے کسی معاملے پر بات کرنے سے روک دیا تھا لیکن وہ خود شیردل کے حوالے سے منزہ ہی کی طرح فکر مند تھے۔ منزہ کے سامنے اس بات کا اظہار نہ کرنے کے باوجود وہ شیردل کے لیے خائف تھے۔ انہوں نے شہباز کو بھی ایسی ہی حالت سے گزرتے دیکھا تھا اور اس نے ایسے ہی ذہنی پریشانی میں خودکشی کر لی تھی اور بہت بہادر اور دلیر ہونے کے باوجود بختیار کو اس بات کا خدشہ تھا کہ شیردل anxiety (بیگانہ) میں ایسا کوئی قدم نہ اٹھالے۔ اسے مستقل طور پر گھر میں اپنی نگرانی میں رکھے رہتا کوئی حل نہیں تھا۔ بختیار کی اپنی بہت ساری مصروفیات تھیں اور وہ ان پر فٹنل مصروفیات کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ منزہ کی بھی ذہنی رویوں میں گھبراہٹیں تھیں لیکن وہ اتنے کمزور نہیں تھے کہ شیردل کے لیے سب کچھ چھوڑ کر بیٹھی تھیں اور اب کئی بار ایسا ہونے لگا تھا کہ منزہ کو بھی اسٹریس کی وجہ سے سونے میں دقت ہونے لگی تھی۔ وہ بھی سونے کے لیے اکثر اوقات خواب آور ادویات کا سہارا لینے لگی تھیں اور ان کی یہ حالت بختیار کی تشویش میں اضافہ کر رہی تھی۔ شیردل کے بریک اپ نے پوری فیملی کو ہر طرح سے ہلا کر رکھ دیا تھا اور ان حالات میں عکس کی صورت میں منزہ کو پیسے روشنی کی ایک کرن دکھائی تھی اور ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اس کی طرف نہ جاتیں..... اپنے گھر کو گھپ اندھیرے میں ڈوب رہے دیتیں۔

☆☆☆

”سوری یار میں کچھ لیٹ ہو گیا۔“ داؤد نے نیمل کی دوسری طرف اس کے بالمقابل اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ شہباز بانو نے مسکرانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ جانتی تھی اس کی مسکراہٹ بہت پھینکی ہوئی۔ اس ریسٹورنٹ میں اس ریزرو ڈینیبل پر بیٹھے وہ قدر آدم کھڑکی کے شیشے سے باہر سڑک اور سڑک پر چلتے پھرتے لوگوں کو پچھلے ایک گھنٹے سے دیکھ رہی تھی۔ وہ داؤد کی برتھ ڈے سیلبریشن کرنے کے لیے وہاں آئے تھے۔ داؤد نے ایک دن پہلے اسے یہاں ڈنر پر لانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اسے چھ بیجے شہباز بانو کو گھر سے پک کر تا تھا لیکن پانچ بیجے کے قریب اس نے شہباز بانو کو کال کر کے وہاں پہنچنے کے لیے کہا تھا کیونکہ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ٹائم پر اس کے پاس پہنچ نہیں پائے گا اور وہ اگر اپنی مصروفیات سے فارغ ہو کر اسے پک کرنے کے بعد ریسٹورنٹ لایا تو وہ دونوں بہت لیٹ ہو جائیں گے کیونکہ شرمین کا گھر داؤد کے گھر کے بالکل مخالف سمت میں تھا اور وہ ریسٹورنٹ ان دونوں کے گھروں کے درمیان کسی جگہ پر تھا۔

”بس زارا آئی ہوئی تھی یہاں کوئی سیمینار اینڈ کرنے..... اس نے کال کر لیا۔ کافی پر چلے گئے تو تھوڑا ٹائم لگ گیا۔ تم کیا لوگی؟“ داؤد نے سیمینار کا ڈانٹا اٹھاتے ہوئے اس سے کہا۔ زارا کا نام سن کر شہباز بانو کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آیا تھا۔ داؤد ہمیشہ اس طرح اس کی بات کرتا تھا جیسے وہ اس کی زندگی سے کہیں بھی بی تہ ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا ان دونوں کے بیچ..... کوئی بریک اپ نہیں..... کوئی divorce نہیں..... کوئی گھٹی نہیں..... ایک عجیب سے احساس نے اس کے طبع کو کڑوا کیا تھا۔ بھوک پہلے بھی نہیں تھی، اب بالکل ختم ہو گئی تھی۔ وہ ایک گھنٹے سے وہاں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی..... مثال کو گھر پر چھوڑے..... اور وہ اپنی سابقہ بیوی کے ساتھ بیٹھا کافی پیتے ہوئے گپ شپ کر رہا تھا۔ وہ اس سے یہ کہنا چاہتی تھی..... خفا ہونا چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں اسے لگا یہ موقع مناسب نہیں تھا، وہ اس کا اپنا دل دن تھا وہ کوئی جھگڑا نہیں کر سکتی تھی تم ازم اس

شام کو.....

اس کے کانوں میں شرمین کی آواز گونجنے لگی تھی۔ ”اپنے اندر کچھ تبدیلی لاؤ شہباز بانو..... تم بہت زیادہ temperamental (عصبانی) ہو گئی ہو..... اتنی rudeness (بے اعتنائی، بے رخی) خفک نہیں..... داؤد نے بھی ایک دوبارہ شکایت کی ہے تمہاری..... کہہ رہا تھا۔“ آخری شہباز بانو کو سمجھا میں..... زارا کے ساتھ بھی یہی پرالیم تھا وہ بھی اپنے پروفیشن کی وجہ سے اتنی مصروف اور stressed (ذہنی تناؤ میں) رہتی تھی کہ بات بات پر میرا اور اس کا جھگڑا ہوتا تھا..... میں نہیں چاہتا شہباز بانو اور میرا ریلیشن شپ بھی ویسا ہی ہو جائے..... میں جانتا ہوں وہ اپنے بریک اپ کی وجہ سے اپ بیٹ ہے لیکن..... she should move on..... اتنا bitter (کڑوا) نہ ہونی کی کیا ضرورت ہے۔“ میں اسی لیے تم سے کہہ رہی ہوں کہ تم خود کو بدلو..... تم دونوں کی دوسری شادی ہے۔ زیادہ برداشت اور انڈر اسٹینڈنگ دکھانے کی ضرورت ہے مجھیں۔“ وہ چاہتے ہوئے بھی ذہن سے نہیں جھٹک پارہی تھی کیونکہ وہ مسلسل داؤد کے حوالے سے ان کی ہدایات سننے کی عادی ہو گئی تھی۔

اپنے بیگ سے ایک چھوٹا سا گفٹ باکس نکال کر اس نے داؤد کے سامنے رکھ دیا لیکن وہ ایکساٹمنٹ جو اس گفٹ کو خریدتے وقت تھی وہ اسے اب نہیں تھی۔

”اوہ، thank you..... کیا ہے اس میں؟“ داؤد نے مسکراتے ہوئے وہ گفٹ باکس لے لیا۔ ”تم خود دیکھ لینا۔“ شہباز بانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ داؤد نے باکس کو کھولے بغیر بس اسے ہلا کر جیسے کچھ اندازہ کرنے کی کوشش کی۔

”پرفیوم؟“ داؤد نے بالکل ٹھیک guess کیا۔ شہباز بانو کچھ حیرانی کے عالم میں ہنسی۔ ”مجھیں کیسے اندازہ ہوا؟“

”یار! ساری عمر پرفیوم ہی ملنے رہے ہیں مجھے زارا سے..... اب تو پرفیوم نہ بھی ہو کسی گفٹ میں تو مجھے لگتا ہے پرفیوم ہی ہو گا۔ زارا نے مجھے دنیا کا ہر پرفیوم گفٹ کر ڈالا ہے۔ کر بڑی ہے وہ پرفیومز کے معاملے میں۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ باکس اس نے نیمل پر رکھ دیا تھا۔ وہ مسکراہٹ جو شہباز بانو نے بڑی مشکل سے چہرے پر سجائی تھی وہ ایک بار پھر عائب ہو گئی تھی اور اس بار شہباز بانو نے اسے واپس لانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ڈنر تک دم ہی ایک بے حد بے مقصدی چیز بن گیا تھا..... بیکار..... غیر ضروری..... اضافی..... وہ دونوں وہاں نہ بھی آتے تو بھی کیا تھا..... شہباز بانو نے سوچا۔

وہ زارا کا ذکر اسی طرح کیا کرتا تھا..... روائی میں..... لاشعوری طور پر..... اور بے تحاشا..... جیسے اس کا معمول تھا..... شکایتی انداز سے کہتا لیکن داؤد کی گفتگو زارا کے ذکر سے اب بھی خالی نہیں تھی اور اگر گفتگو خالی نہیں تھی تو اس کا دل اور زندگی کیسے خالی ہو سکتی تھی اور اس نے یہ بات داؤد سے ایک بار پوچھ لی تھی جب فون پر اس کی دوسری یا تیسری بار بات ہوئی تھی اور شہباز بانو، زارا کے بار بار کے ذکر سے بری طرح چڑی تھی اور داؤد جواباً اس کے اس طرح چڑنے پر حیران ہوا تھا۔

”میری کلاس فیلو ہی ہے وہ..... کورٹ شپ رہی پھر شادی رہی..... اتنے سال ساتھ گزارنے کے بعد یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری باتوں میں اس کا ذکر ہی نہ آئے یا وہ مجھے یاد نہ آئے..... مجھیں شیردل یا وہ نہیں آتا کیا؟“ وہ اس کے سوال پر بہت دیر کچھ بول ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ عام سے انداز میں کیا جانے والا ایک سوال



تھا۔ داؤد کے لہجے میں کوئی جھین، کوئی طنز نہیں تھا پھر بھی اس کی بات شہر بانو کو بری طرح چبھی تھی۔  
 ”باؤ آتا بھی ہو جب بھی میں بات، بات پر اس کا ذکر تو نہیں کرتی۔“ اس نے بہت دیر کے بعد جیسے خود کو  
 سنبھال کر لیکن پہلے سے زیادہ جڑ کر کہا۔

”تو تم کر لیا کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ داؤد نے بے ساختہ کہا۔  
 ”مجھے اگر بات، بات پر اس کا ذکر کرنا ہوتا تو میں اسے چھوڑتی کیوں؟“ اس نے جواباً کہا اور داؤد جیسے  
 کچھ مزید حیران ہوا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔ دو لوگ اتنا عرصہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں اور پھر ایک دوسرے کو مکمل  
 طور پر بھول جائیں بھی ایک دوسرے کا ذکر بھی نہ کریں۔ یہ نارمل نہیں ہے۔“

”کیا سوچ رہی ہو؟“ وہ داؤد کی بات پر ایک دم چوکی تھی۔ وہ بہت talkative (باتونی) تھا بہت  
 دیر باتیں کرتے رہنے کے بعد اس کو یک دم احساس ہوا تھا کہ شہر بانو کی توجہ کس اور تھی۔

”کچھ نہیں۔“ شہر بانو نے اپنی توجہ اس پر مرکوز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی اور وہ  
 نا کام رہی۔۔۔ اس کو یقین تھا۔ داؤد کو وہ جھین سے جانتی تھی۔ وہ ایک عی ہانی اسکول میں پڑھتے تھے۔ یونیورسٹی  
 تک ان کی بہت گہری دوستی رہی تھی۔۔۔ انڈر اسٹینڈنگ اور دوستی میں بعض دفعہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور  
 پھر آہستہ آہستہ داؤد کی گفتگو میں زار اور شہر بانو کی گفتگو میں شیردل آنے لگا تھا پھر ان دونوں کی زندگیوں میں  
 زار اور شیردل نے وہ جگہ لے لی تھی جو ان دونوں کے نہ آنے پر شاید وہ ایک دوسرے کی زندگی میں لیتے۔

اور اب جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ ایک نیا رشتہ جوڑنے کی کوشش کر رہے تھے تو عجیب وقت ہو رہی  
 تھی۔ وہ انڈر اسٹینڈنگ اور compatability جو دونوں کو گھنٹوں ایک دوسرے سے مصروف نگہداشت  
 تھی ایک دم پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی تھی۔ شہر بانو اس کا موازنہ شیردل سے نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ نہ چاہتے  
 ہوئے بھی سارا وقت یہی کرتی رہتی تھی۔ داؤد دمر تھا مکمل کر اس عورت کا ذکر کرتا تھا جس کے بارے میں سوچنا  
 تھا۔ شہر بانو عورت تھی، وہ اپنے آپ کو دھوکا اور فریب دینے میں لگی رہتی کہ وہ شیردل کو بھول چکی تھی، زندگی  
 سے نکال چکی تھی۔

زندگی میں سائن بورڈ زار اور روڈ سائنز کو بھولنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر زندگی میں آنے والے انسانوں کو  
 کیسے بھلایا جاسکتا ہے۔۔۔ جس راستے سے ایک بار گزر رہو جائے وہاں کی نشانیاں ذہن میں بیٹھ جاتی ہیں اور  
 سالوں بعد بھی دوبارہ اسی راستے پر گزرتے ہوئے انسان پہچان، شناخت، تلاش اور دریافت کے جذباتی  
 مراحل سے گزرتا ہے تو زندگی میں ساتھ چلنے والے انسان کیسے ہمارے ذہن پر اپنے نقوش اور یادیں نہ چھوڑ  
 جائیں۔ آواز، انداز، نقش، نظر، لفظ، لمس، عادت، آہٹ یہ کیسے ممکن ہے انسان کو بھولنے کے ساتھ ساتھ یہ  
 سب بھی بھول جائے۔۔۔ بھی وہ نہ ہو، کبھی شاید سنا نہ گزرے، کبھی یادوں کی پرچھائیاں فریب نہ دیں۔ داؤد  
 ٹھیک کہتا تھا اگر ایسا نہیں ہوتا تھا تو یہ نارمل بات نہیں تھی لیکن نارمل تو شہر بانو بھی نہیں رہی تھی۔ وہ صرف تب تک  
 نارمل رہی تھی جب تک شہباز اور شرمین کے ساتھ ایک خوش و خرم گھر اور خاندان کا حصہ رہی تھی۔  
 ”کچھ نہیں۔“ اس نے گہری سانس لے کر داؤد سے کہا۔

”ویسے تمہاری یہ عادت پسند ہے مجھے۔ تم بہت زیادہ باتیں نہیں کرتیں۔۔۔ آج کل یہ عادت بہت کم  
 ہوتی ہے عورتوں میں۔۔۔ جب میں زار کے ساتھ ہوتا تھا تو صرف زار بولا کرتی تھی اور۔۔۔“ داؤد بات کر رہا

تھا۔۔۔ اسے سنا ہے سنا ہے پھر اسے زار یاد آتی تھی۔ شہر بانو پھر کہیں چلی گئی تھی۔ شہر بانو کو یاد آیا وہ  
 شیردل کے ساتھ بہت باتیں کرتی تھی۔۔۔ اتنی باتیں۔۔۔ اتنی باتیں۔۔۔ جتنی اس نے شاید کبھی جھین میں شہباز  
 حشیں سے کی ہوں گی۔۔۔ شیردل بھی بولتا تھا لیکن اس کے ساتھ وہ صرف اسی کی سنتا تھا، اس کی گفتگو سے وہ  
 جیسے محفوظ ہوتا تھا۔۔۔ آفس کا کام کرتے ہوئے وہ روز رات کو اس کے کندھے پر مر رہے اسے کچھ نہ کچھ ستانی  
 رہتی تھی اور وہ کام کرتے ہوئے سنتا جاتا تھا۔۔۔ شہباز حسین کے بعد صرف وہی ایک تھا جس سے اس نے کبھی  
 باتیں کرنا چاہی تھیں اور باتیں کی تھیں۔۔۔ کسی اور کو کچھ بتانے یا کسی اور سے کچھ شیئر کرنے کے لیے اب اس  
 کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔۔۔ وہ گھنٹوں داؤد کی باتیں ایک خاموش تماشائی کی طرح سن سکتی تھی اگر داؤد چاہتا۔۔۔  
 لیکن ظم از ظم اس میں ایک دوسری عورت کا ذکر نہ آنا خاص طور پر اس عورت کا جسے وہ چھوڑ چکا تھا۔

”تم پھر کہیں اور پہنچی ہو گی؟“ داؤد نے پھر بہت دیر بعد اس کی عدم توجہی اس وقت محسوس کی جب  
 وہ کھانا سرو کرنے آیا تھا۔

”ٹھیک ہے یا زکیم باتیں کیا کرو لیکن اب اتنی بھی کم نہیں کہ بوریٹ ہونے لگے۔“ اس نے بالآخر کچھ اکتا  
 کر کہا۔ شہر بانو چاہتے ہوئے بھی اسے کہہ نہیں پائی کہ وہ اس بوریٹ کو ختم کرنے کی پچھلے دو گھنٹے سے کوشش  
 کر رہی تھی اور کامیاب نہیں ہو پائی تھی۔ وہ نگلشن اور وہ اسپارک جو ہمیشہ سے ان دونوں کے بیچ تھا اب یک دم  
 ہی کہیں غائب ہو گیا تھا۔ داؤد کے لیے کسی بھی عورت کے ساتھ گپ شپ لگا لینا آسان تھا شہر بانو کے لیے یہی  
 سب سے مشکل کام تھا۔

”کیسا ہاؤز؟“ گیارہ بجے کے قریب بالآخر گھر واپس آنے پر شرمین نے اس سے پوچھا تھا۔ حالانکہ  
 شہر بانو کا چہرہ اسے بتا رہا تھا کہ ڈر کیا تھا۔

”مثال سوچی؟“ اس نے جواب دینے کے بجائے اندر آتے ہوئے ماں سے پوچھا۔  
 ”بڑی مشکل سے سلا یا ہے، کتنی دیر تو فاروق اسے لے کر باہر پھرتے رہے۔“ شرمین نے جواباً کہا۔  
 شہر بانو مزید کچھ بولے بغیر اپنے کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے اندر چلی گئی۔ اس کا چہرہ اتنا سستا ہوا تھا کہ شرمین  
 جیسے تشویش کے عالم میں اس کے پیچھے اس کے بیڈروم میں چلی آئیں وہ کم صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔  
 ”کیا ہوا؟“ شرمین نے شہر بانو کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”Mummy it won't work“ شہر بانو نے اسی تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ شرمین کو  
 اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ وہ پہلا موقع نہیں تھا جب وہ داؤد کے حوالے سے اس طرح کی  
 رائے دے رہی تھی۔ شرمین کا خیال تھا مسئلہ اس کے ساتھ تھا داؤد کے ساتھ نہیں۔  
 ”اب کیا ہوا؟“ شرمین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”مئی اس کے ذہن پر اب بھی زار اسی سوار ہے۔ وہ آج بھی آدھا وقت اسی کی باتیں کرتا رہا۔ وہ آئی  
 ہوئی تھی یہاں کسی سیمینار کے لیے۔۔۔ لیکن مجھے لگتا ہے وہ اس کی برتھ ڈے ہی کے لیے یہاں آئی ہوئی تھی۔ وہ  
 اسے کافی پر لے گیا اس بات کی پروا کیے بغیر کہ میں رٹیرنرٹ میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ میری سمجھ میں  
 نہیں آتا کہ جب انہیں چھٹی گھنٹے ایک دوسرے سے رابطے میں رہنا ہے تو پھر غلطی کی کیا ضرورت تھی۔“ شہر بانو  
 بہت جھجھلائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ فوری طور پر شرمین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے کیا کہیں۔

”میں داؤد سے بات کروں گی۔“ انہوں نے بالآخر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔ ”لیکن بیٹا مجھے نہیں  
 ملے گا۔“

لگتا ہے کوئی بہت معیوب بات ہے یہاں لوگ divorce کے بعد بھی سابقہ بیوی یا شوہر سے ملنے رہتے ہیں۔  
 ایسے تعلقات رکھتے ہیں آپس میں..... بعض دفعہ بچوں کی وجہ سے..... داؤد اور زارا بہت پرانے فیملی  
 فرینڈز ہیں۔ ساتھ ملے بڑھے ہیں، بڑی حد تک امریکن سوچ ہے ان کی..... لیکن پتا نہیں میں نہیں کیوں  
 سمجھا رہی ہوں یہ سب کچھ..... تمہیں تو خود پتا ہونا چاہیے..... تم نے زندگی گزاری ہے یہاں..... کوئی اور چکر  
 ہوتا تو داؤد ٹھیک پتا تم سے..... جیسے شیردل چھپا رہا تھا..... اس طرح ہر بات سامنے نہ کر رہا ہوتا۔" شرمین نے  
 بہت غلط موقع پر شیردل کی مثال دی تھی۔ شہر بانو بڑی طرح ہرٹ ہوئی۔  
 "ممی! آپ اس کی مثال مت دیں مجھے۔" اس نے بے حد خفا ہو کر ماں سے کہا تھا۔ "ہم اس وقت  
 داؤد کی بات کر رہے ہیں۔"

"داؤد بہت اچھا لڑکا ہے..... پر ذہنی بہت برا مت ہے..... بہت اچھی نچر کا ہے، یہاں امریکا میں رہ  
 کر بھی کوئی خراب عادتیں نہیں اس میں..... اتنا اچھا رشتہ کہاں ملے گا تمہارے لیے امریکا میں۔" شرمین نے  
 ہمیشہ کی طرح اسے داؤد کی خوبیاں گونانی شروع کر دی تھیں۔  
 "وہ بہت اچھا ہے مئی لیکن مجھے ہر بار اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے اسے میری  
 ضرورت نہیں ہے....." شرمین نے اس کی بات کاٹ دی۔  
 "ضرورت نہ ہوتی تو شادی کیوں کرنا چاہتا وہ تم سے؟"

"شادی تو انسان کسی سے بھی کر لیتا ہے۔" شہر بانو نے کہا اسے پتا نہیں کیا، کیا یاد آیا تھا۔  
 "کسی سے بھی نہیں کر لیتا انسان شادی..... کسی کی قدر اور ویلیو ہوتی ہے جیسی انسان اس سے شادی  
 کا سوچتا ہے..... کسی کے لیے کچھ محسوس کرتا ہے جیسی اس کے ساتھ وہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتا ہے۔"  
 شرمین ہمیشہ کی طرح اسے داؤد کے حوالے سے سمجھا رہی تھیں۔ شہر بانو ان کی گفتگو کو کسی "اور" کے حوالے  
 سے سن رہی تھی۔

"کوئی دوسرا بھی مثال کو اس طرح پیار اور توجہ نہیں دے سکتا جس طرح داؤد دے گا۔ فاروق کی فیملی کا  
 ہے وہ۔ تم کو یاد ہے فاروق نے ہمیشہ تمہیں کتنی توجہ دی ہے۔" وہ اس دلیل پر آ کر ہمیشہ کمزور پڑ جاتی تھی.....  
 مثال..... بس مثال کو کوئی اس طرح سنبھال لیتا جیسے شیردل سنبھالتا تھا اور داؤد یہ کر سکتا تھا کیونکہ وہ داؤد کو  
 شروع سے جانتی تھی۔ اس کی زندگی میں آنے والا کوئی اور مرد مثال کے لیے بالکل اجنبی ہوتا اور مثال ہر ایک  
 کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو سکتی تھی۔

اتنے مہینے گزر جانے کے بعد بھی وہ اسی طرح شیردل کے لیے روتی اور چلاتی تھی اور ہر دفعہ جب وہ  
 باپ کے لیے رونا شروع کرتی پھر وہ کئی گھنٹے اسی طرح روتی رہتی، اسے اس وقت کسی بھی چیز کے ساتھ بہلانا  
 مشکل ہو جاتا تھا۔ شہر بانو تب اسے صرف بے بسی کے عالم میں چپ چاپ دیکھتی رہتی تھی۔ مثال میں بھی اس  
 طرح کا aggression نہیں تھا جو وہ اب دیکھتی تھی۔ وہ چیزیں اور کھلونے توڑنے میں سیکند نہیں لگاتی  
 تھی۔ بعض دفعہ شہر بانو پر چلاتی، اس کی بات ماننے سے انکار کرتی۔

شہر بانو کے لیے سب سے تکلیف دہ بات جب ہوتی تھی جب عدت کے دوران مثال اسکول جانے لگی تھی  
 تو ایک دن اسکول سے آنے کے بعد کسی بات پر ضد کرتے ہوئے اس نے شہر بانو سے کہا۔

"Mummy you are a bad woman" شہر بانو اس کے الفاظ پر شا کڈ رہ

گئی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ اس سے یہ سوال نہیں کرنا چاہتی تھی جو کر رہی تھی لیکن اس کی سوچنے سمجھنے کی  
 صلاحیتیں ایک دم مفقود ہو گئی تھیں۔ اپنی اولاد کے منہ سے اپنے بارے میں ایسا جملہ سن کر کسی بھی ماں کا یہی  
 حال ہو سکتا تھا۔

شہر بانو اس پوری رات سو نہیں سکی تھی۔ اس نے زندگی میں ایسی خود رسی اور احساس کمتری کا سامنا نہیں  
 کیا تھا جتنا مثال کے اس ایک جملے نے اسے کروایا تھا۔  
 اگلے کئی دن وہ چاہنے کے باوجود مثال سے کچھ نہ کہتی تھی۔ مثال نے ماں کی اس غلطی یا بے مہری کو محسوس  
 کیا یا نہیں کیا لیکن وہ بھی جواباً شہر بانو سے اور کچھ نہ کہتی تھی۔ شیردل ان دونوں کے درمیان جیسے ایک عجیب سی  
 دیوار بن گیا تھا اور صرف شرمین تھیں جو اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ مثال کی ذہنی کیفیت کو بھی سمجھ پارہی تھیں۔

انہی دنوں میں داؤد نے فاروق کے ذریعے شہر بانو میں اپنی وجہی کا اظہار اور شادی کا پیمانہ بھجوا دیا  
 تھا اور شرمین کے لیے جیسے صحرا میں ٹھکانا والا معاملہ ہوا تھا۔ شہر بانو کی فوری شادی ان تمام مسائل  
 کا حل لگی تھی۔ جن کا شہر بانو سامنا کر رہی تھی، وہ ان کے سامنے بڑے بڑے حوصلے کا مظاہرہ  
 کرتی رہی تھی اس نے شیردل کا نام تک لینا چھوڑ دیا تھا لیکن شرمین کو اس کے اندر ہونے والی توڑ پھوڑ کا  
 اندازہ تھا۔ وہ آگ کے اس دریا سے گزرتے ہوئے اپنے وجود کو جلا چکی تھیں..... شہر بانو کتنی تکلیف کا  
 سامنا کر رہی تھی انہیں اندازہ تھا۔

ان کی اپنی زندگی میں فاروق کے آجانے نے بہت حد تک ان کی تکلیف ختم کر کے ٹھہراؤ پیدا کر دیا تھا اور  
 انہیں یقین تھا شہر بانو کو داؤد کی صورت میں دیہائی ساتھی مل جاتا تو وہ بھی اس تکلیف سے بہت جلدی گزر  
 جاتی۔

شہر بانو نے غیر متوقع طور پر داؤد کے پروپوزل پر کسی شدید رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا حالانکہ شرمین کو اس  
 کی توقع تھی لیکن وہ فوری طور پر شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ چند سال اس گرداب سے نکلنے کے لیے چاہتی تھی  
 جس میں وہ پھنس گئی تھی۔

"جلدی کسی سے شادی ہوگئی تو مثال بھی بہت جلد تمہارے اس نئے رشتے کو بھی accept کر لے گی  
 اور اس آدمی کے ساتھ بچ بھی ہو جائے گی۔ چند سالوں کے بعد تمہارے لیے دوسری شادی کرنا زیادہ آسان  
 ہو گا لیکن مثال کے لیے اس نئے رشتے کو قبول کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ وہ اب بھی تمہارے لیے کئی پریشانی  
 کا باعث بن رہی ہے۔ تب تو بالکل ہی....." شرمین کے پاس شہر بانو کو اس وقت فیصلے پر تیار کر لینے کے لیے  
 جیسے ٹپ کا پتا مثال تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ شہر بانو ماں کی اس بات کو نہ مانے اس کے سامنے اپنا بچپن تھا.....  
 اپنے بچپن کا mess تھا اور وہ مثال کو ایسی کسی بھی صورت حال سے بچانا چاہتی تھی۔

لیکن اب جب وہ ذہنی طور پر داؤد سے شادی کے لیے اپنے آپ کو تیار کر چکی تھی..... اسے بار بار شیردل  
 کا خیال آتا تھا اور انہیں اور اضطراب تھا کہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا..... رابطہ نہیں تھا..... یہ فاصلہ بہت زیادہ  
 تھا..... جدائی ہو چکی تھی۔ واپسی ناممکن تھی..... پر خیال اور یاد کے دل کا دامن چھوڑنے پر تیار ہی نہیں تھے۔

☆☆☆

زندگی میں ایک گولی ایسی بھی ہونی چاہیے جسے کھانے کے بعد انسان اس شخص، چیز اور یاد کو فوری طور پر

بھول جائے جسے وہ بھولنا چاہتا ہے..... آپ اسے کھا کر سوسائیں اور جاگیں تو آپ کے پورے وجود اور ذہن کے سسٹم میں سے صرف وہ شخص وہ چیز وہ یاد نکل چکی جو جس سے آپ جان بوجھ کر چاہتے ہیں۔ جو آپ کے لیے تکلیف کا باعث ہو۔

ہر روز صبح بستر میں آنکھیں کھولنے کے بعد جو پہلا خیال اور پہلا تصور شیردل کے ذہن اور آنکھوں میں آتا تھا وہ مثال اور شہر بانو کا ہوتا تھا۔ اتنے مہینوں کے بعد بھی کوئی ایک دن ایسا نہیں تھا جب اس کے دن کا آغاز کسی اور خیال سے ہوا ہو..... ہزیمت، ذلت، تکلیف اور صدمے کی ایک عجیب سی کیفیت تھی جس سے وہ صبح سویرے گزر رہا تھا۔

وہ کمزور اعصاب کا مالک نہیں تھا۔ وہ کبھی کمزور اعصاب کا مالک نہیں رہا تھا لیکن جو کچھ ہوا تھا اس نے اسے عجیب انداز میں traumatized کیا تھا۔ وہ پچھلے کتنے سالوں سے اپنی زندگی شہر بانو اور مثال کے ساتھ گزار رہا تھا وہ دونوں اس کے شعور اور لا شعور دونوں کا حصہ تھیں اور ان کا اس طرح غائب ہو جانا.....

وہ ہر روز بیٹھ کر اپنے آپ کو ان تمام واقعات کی توجیہات دیا کرتا تھا..... کیا چیز کیوں ہوئی اور پھر یہ سوچتا تھا کہ وہ کون سی چیز گرتا یا نہ گرتا تو یہ سب نہ ہوتا..... شہر بانو سے اسے محبت تھی..... اب کیا تھا؟ وہ نہیں جانتا تھا..... نفرت وہ اس سے نہیں کر سکتا تھا..... محبت کرنے کے قابل وہ اب اسے سمجھتا نہیں تھا..... خاصا اسے اس پر بے تحاشا آتا تھا اور اس کے ساتھ وہ خود بھی یاد آتی تھی..... رات اور دن کے بہت سے پہروں میں..... اپنی بہت ساری باتوں اور عادتوں کی وجہ سے..... ان اوقات میں جب مثال اسے وقتی طور پر بھولتی.....

شک شہر بانو کے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔ کم از کم شیردل کو اس سے یہ شکایت بھی نہیں رہی تھی..... بے اعتمادی اور بدگمانی کی عادت بھی اسے نہیں تھی..... وہ بد مزاج اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ کرنے اور لڑنے جھگڑنے کی بھی عادی نہیں تھی..... شادی سے پہلے اگر اس کی چند چھوٹی موٹی عادتوں پر شیردل کو خفگی محسوس ہوتی تھی تو شادی کے ان پانچ چھ سالوں میں شہر بانو میں وہ عادتیں بھی نہیں رہی تھیں۔ وہ کاغذ پسل لے کر بیٹھتا تو اسے شہر بانو کی خامیاں اور عیب ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا..... بالکل اسی طرح جس طرح شہر بانو کے لیے شیردل میں عیب ڈھونڈنا مشکل تھا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو اس سے پہلے بھی تکلیف نہیں پہنچائی تھی..... کبھی ہرٹ نہیں کیا تھا اور شاید اسی وجہ سے پچھنے والی تکلیف کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

شہر بانو حساس تھی ضرورت سے زیادہ حساس تھی صرف یہ ایک چیز تھی جسے شیردل کبھی اس کی personality میں سے دور نہیں کر سکا تھا..... لیکن اس نے شہر بانو کو اس کی اس خامی اور عادت کے ساتھ قبول کیا تھا..... وہ اس کے ماضی کی تلخ یادوں سے واقف تھا اور اسے یقین تھا وہ اپنی محبت اور ساتھ سے اس کے اندر موجود عدم تحفظ کا ہر احساس نکال دے گا..... لیکن جو کچھ ہوا تھا..... ایک مرد کے طور پر وہ یہ حلیم کرنے پر تیار نہیں تھا کہ اس کے اور شہر بانو کے بیچ میں عکس کے لیے اس کے جذبات اور محبت مسئلہ بنی تھی۔

عکس وہ پہلی اور واحد عورت نہیں تھی جس کے بارے میں وہ شہر بانو سے بات کرتا تھا۔ اس کا حلقہ احباب عورتوں سے بھرا ہوا تھا..... اس کی اندرون ملک اور بیرون ملک کزنز، کالج یونیورسٹی فرینڈز، کوئٹیز..... اس کے حلقہ احباب میں بہت پرانی فرینڈز بھی تھیں۔ شہر بانو کو کبھی کسی کے ساتھ مسئلہ نہیں ہوا تھا..... صرف عکس کے لیے پسندیدگی رکھتا..... اور وہ اس پسندیدگی اور محبت کا کچھ نہیں کر سکتا تھا..... کر سکتا تو کر لیتا..... وہ عکس کے لیے اپنے جذبات کے سامنے بے بس تھا بالکل اسی طرح جس طرح وہ یہ سب ہو جانے کے باوجود بھی شہر بانو

سے نفرت کرنے اور اسے یاد نہ کرنے میں بے بس تھا۔ شہر بانو کا خیال تھا کہ عکس اس کی ازدواجی زندگی تباہ کرنے کا باعث بنی تھی اور شیردل کا خیال تھا یہ کام شہباز حسین اور اس کی اپنی ماں نے اس کے لیے کیا تھا اور اب منزہ اس کے سامنے وہ option لے کر آئی تھی جس کے بارے میں وہ سوچنا تک نہیں چاہتا تھا۔ بعض دفعہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ منزہ پر غصہ کرے، ترس کھائے یا آنسوؤں کرے۔ وہ اپنی خود غرضی میں اسے بار بار کچوکے دے رہی تھیں اور خود بھی ورد سے بے حال ہو رہی تھیں۔ خود غرضی کا اس سے زیادہ گھٹا ناچہرہ ایک شیردل نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

منزہ کی اس گفتگو کا اس پر ان کی تو قحاحات کے برعکس اثر ہوا تھا۔ اس نے عکس کو اگلے تین چار دن کوئی میٹج اور کال نہیں کی وہ جیسے یہ طے کر بیٹھا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے اس mess کو عکس مراد لکھی تک نہیں چھینچے دے گا۔

☆☆☆

عکس نے بھی اسے کوئی کال نہیں کی تھی..... خیر دین کے الفاظ اور ان میں چھپی سنجیدہ سے زیادہ ان کی بے اعتمادی نے اسے اس قدر ڈسٹرب کیا تھا کہ اس نے شیردل سے دوبارہ رابطہ نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن یہ کام بہت مشکل تھا خاص طور پر اب جب کہ وہ شیردل کی حالت دیکھ آئی تھی۔ وہ چند دن تک خود پر پھرے بٹھائی رہی تھی لیکن اس کے بعد اسے تنہا کیے بغیر نہیں رہ سکی۔ اس میٹج کا جواب نہیں آیا تھا۔ ایک لمبے انتظار کے بعد اس نے ایک اور میٹج کیا پھر ایک اور..... دوسری طرف مکمل خاموشی تھی اور اس خاموشی نے عکس کو عجیب انداز میں مضطرب کیا۔ اس نے اس بار شیردل کو کال کی تھی۔ سیل فون ایک بار پھر آف تھا۔ اس نے اگلی کال اس کے گھر کی لینڈ لائن پر کی تھی۔ آبر بڑے اسے پہلی بار والا جواب دیا۔ اس نے شیردل کے علاوہ گھر میں موجود کسی دوسرے شخص سے بات کروانے کے لیے کہا اور ایک بار پھر لائن پر منزہ ہی آئی تھیں اور ایک بار پھر عکس ہلکا سا پچھتائی، اس کے باوجود کہ وہ پچھلی بار ان کے غیر معمولی اور غیر متوقع اچھے سلوک سے حیران رہ گئی تھی۔

”ویسا ہی ہے کچھ بہتری نہیں آئی۔ تمہارے جانے کے بعد ایک دن کچھ بہتر رہا لیکن کل پھر panic attack کے بعد سارا دن کراہندے بیٹھا رہا ہے۔“ منزہ نے سلام دعا کے بعد شیردل کا حال پوچھنے پر اسے بتایا۔ بات کرتے کرتے ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

”بیٹا! میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اس سے بات کیا کرو..... اسے سمجھاؤ..... تمہاری بات کو تو بڑی ویلیو دیتا ہے..... اس کی زندگی میں تمہاری بڑی importance ہے۔“ عکس نے ان کے ان تمام جملوں کو غور انداز کر دیا تھا۔ وہ بہت بے معنی اور کھوکھلا خراج تحسین تھا جو وہ اس کے اور شیردل کے تعلق کو بالآخر پیش کر رہی تھیں۔ عکس کو اب ایسے کسی اعتراف کی ضرورت نہیں تھی۔

”بات میں تب کر سکتی ہوں آئی جب وہ فون آن رکھے اور فون اٹھائے۔“ اس نے مدہم آواز میں منزہ کو اپنا مسئلہ بتایا۔

”چنانچہ اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا ہے پہلے سے بہتر ہے وہ، اس نے میڈیسن بھی کم کر دی ہے اس کی..... لیکن وہ اب بھی فون پر کسی سے بات نہیں کرتا..... سوڈ ہوگا بات کرنے کا پھر کسی نہ کسی بات پر خفا

ہو کر بات کرنا بند کر دیتا ہے۔ میری تو بالکل کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ وہ واقعی بہت بے بسی کی حالت میں تھیں۔  
 ”آپ کو شش کریں وہ دوبارہ آفس جوائن کرے۔۔۔۔۔ اس کا ذہن کام کی وجہ سے بٹے گا۔“ عکس نے  
 چند لمبے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ وہ اس صورت حال کو کچھ پار ہی تھی جس میں منزه بھنس گئی تھیں۔  
 لیکن منزه کی طرح خود اسے بھی اس مسئلے کا حل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ منزه ماں تھیں اور شیردل کے قریب  
 تھیں پھر بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتی تھیں اس کے لیے یہ دونوں ہی آسانیاں نہیں تھیں۔  
 اس شام وہ پھر ابھی ہوئی واپس گھر آئی تھی اور خیر دین سے اس کا اضطراب چھپا نہیں رہا تھا۔ اس کے  
 سوال و جواب کو وہ ٹال گئی۔ وہ اس رات بھی دیر تک جاگتی شیردل کے لیے فکر مند ہوئی رہی اس کی تکلیف اور  
 پریشانی اب آہستہ آہستہ جیسے اس کے اپنے اعصاب کو مضطرب کرنے لگی تھی۔۔۔۔۔ اور صبح۔۔۔۔۔ جل کہیں نہیں تھا کسی  
 کے پاس نہیں تھا۔۔۔۔۔ کم از کم کل وہ نہیں تھا جو منزه نے چند دن بعد خیر دین کو فون کر کے کالافٹا۔۔۔۔۔ اور جس نے  
 خیر دین کو بری طرح سے برا ہیئت کیا تھا۔

”شیردل کی ماں نے فون کیا تھا آج مجھے۔“ منزه سے ہونے والی اس گفتگو کے تین یا چار دن بعد کی  
 بات تھی جب وہ ویک اینڈ پر صبح بہت دیر سے اٹھ کر آئی تھی۔ پچھلی ساری رات وہ چیف فکسٹر کے کسی ڈزٹ کی  
 وجہ سے مصروف رہی تھی اور اس کی گھر واپسی بھی جبر سے کچھ پہلے ہوئی تھی۔  
 چائے کا کپ اٹھاتے اٹھاتے وہ رک گئی۔ خیر دین سے اس کی ملاقات پچھلی رات نہیں ہوئی تھی۔ ابھی  
 ابھی ہوئی تھی۔ اسے فوری طور پر سمجھ نہیں آیا۔ منزه نے خیر دین کو پچھلی رات کال کی تھی یا آج صبح۔ وہ سوالیہ  
 نظروں سے خیر دین کو دیکھنے لگی۔  
 ”تم نے مجھے بتایا نہیں کہ شیردل اور شیر بانو کی طلاق ہو گئی ہے؟“ خیر دین نے اس سے بے حد سنجیدگی  
 سے پوچھا۔

”شاید مجھے خیال نہیں رہا۔“ مدہم آواز میں کہتے ہوئے اس نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ خیر دین نے  
 ابھی نظروں سے اسے دیکھا وہ اپنی عام سی بات نہیں تھی کہ اسے خیال نہ رہتا۔  
 ”شیردل سے تمہارے رشتے کی بات کی ہے انہوں نے مجھ سے۔“ چائے کا پہلا سپ لیتے ہوئے۔  
 خیر دین کے نکلے جملے پر اس کا ہاتھ بری طرح لرزتا تھا لیکن اس نے اپنی لڑش پر قابو پالیا، وہ چند لمحوں کے لیے  
 اندر باہر سے مکمل طور پر مل کر رہ گئی تھی۔ وہ بھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ منزه ایسی کوئی بات خیر دین سے کر سکتی  
 تھیں۔۔۔۔۔ ان کے بدلے ہوئے رویے کے باوجود وہ منزه سے اس چیز کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔

”میں نے صاف انکار کر دیا۔“ خیر دین نے رکے بغیر اگلا جملہ ادا کیا۔ وہ جملہ متوقع ہونے کے  
 باوجود اس نے بھی اسے ہلایا تھا پر اس بار زلزلے کی شدت کم تھی۔ ”میں نے انہیں بتا دیا کہ تمہاری شادی  
 کی تاریخ طے ہو چکی ہے اور تیاریاں ہو رہی ہیں۔“ خیر دین بتا رہا تھا لیکن وہ چائے پیتے ہوئے چپ  
 چاپ خیر دین کی بات سنی رہی۔۔۔۔۔ اس کے لہجے میں ایک خطی جھلکنے لگی تھی۔ ”اتنا سب کچھ کرنے کے بعد  
 انہیں مجھ سے اس طرح کی بات کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ انہیں خود احساس ہونا چاہیے تھا کہ وہ تم پر کیسے  
 کیسے الزامات لگا چکی ہیں۔ تمہارا رشتہ نزو چکی ہیں اور پھر آج دوبارہ اپنے بیٹے سے رشتے کی بات  
 کرنے بیٹھ گئیں۔ وہ بھی فون پر۔۔۔۔۔ جیسے ہم ایسے ہی گرے پڑے اور مگے گزر رہے ہیں کہ وہ ایک فون  
 کریں گی اور میں تمہاری شادی ان کے بیٹے سے کر دوں گا۔“ خیر دین کی آواز کی خطی اب جیسے کچھ اور

بڑھ چکی تھی۔ عکس نے ایک لفظ نہیں کہا تھا لیکن اس نے چائے کا آدھ بھرا کپ بھیل پر رکھ دیا تھا، وہ گھر کے  
 برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خیر دین کی کرسی کے عقب میں نظر آنے والے لان میں بھاگتی دوڑتی  
 بلیوں کو دیکھنے لگی۔۔۔۔۔ توجہ بھٹکانا بے حد ضروری تھا۔

”سجاد بہت اچھا لڑکا ہے اور میں زبان دے چکا ہوں۔۔۔۔۔ اتنے اچھے رشتے کے ہوتے ہوئے مجھے ان  
 کے بیٹے کے بارے میں سوچنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔“ خیر دین دونوں انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ چپ  
 سنی رہی، پتا نہیں اسے یہ کیوں لگ رہا تھا کہ منزه کی اس گفتگو کے بارے میں شیردل بالکل لاعلم ہوگا۔  
 ”ہمارے اور ان کے درمیان بہت فرق ہے۔۔۔۔۔ اور یہ فرق ساری عمر رہے گا۔ تم سجاد کے ساتھ خوش  
 رہو گی جڑیا۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں تم کسی کے ساتھ بھی خوش رہو سکتی ہو۔ شیردل تمہاری ضرورت نہیں ہے۔“  
 وہ خاموشی سے خیر دین کو دیکھتی رہی اس کی خاموشی کو انہوں نے ایک بار پھر اپنی مرضی کا مقبوم دے کر جیسے  
 اپنے فیصلے کی توجیہ اسے دینے کی کوشش کی تھی۔

”شیردل بہت اچھا ہے لیکن سجاد۔۔۔۔۔“ عکس نے مدہم آواز میں ان کی بات کا ٹکڑی۔  
 ”نانا آپ نے جو کیا ٹھیک کیا، آپ نے جو فیصلہ کیا مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔“ اس نے کہتے  
 ہوئے خیر دین کا ہاتھ پکڑ لیا پھر چند لمبے اس ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لیے بیٹھی رہی یوں جیسے  
 اپنے گفتگوں کے بجائے ہاتھ کے اس لمس سے خیر دین کو یقین دہانی کرانے کی کوشش کر رہی ہو۔۔۔۔۔ پھر وہ کچھ  
 کہے بغیر خیر دین کا ہاتھ چھوڑ کر وہاں سے اندر چلی گئی۔ خیر دین بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا تھا۔ خوشی اور اطمینان ہونا  
 چاہیے تھا۔۔۔۔۔ نہیں ہوا تھا۔ سکون ملنا چاہیے تھا، وہ بھی نہیں ملا تھا۔ فخر کی بات تھی اس کے لیے۔ لیکن پتا  
 نہیں اسے کیوں نہیں لگی۔

اسے کئی سال پہلے چڑیا کا بچپن یاد آ گیا تھا جب وہ اس کے پاس شکایت لے کر آئی تھی۔ آنسوؤں سے  
 بھری آنکھیں لیے ایک اس کے ساتھ بیٹھ کر کھیل رہا تھا۔ نہ ہی اسے اپنا ریکٹ دے رہا تھا۔۔۔۔۔ اور  
 خیر دین نے بڑی سنجیدگی سے دونوں انداز میں اسے دوبارہ ایک کے ساتھ کھیلنے سے منع کیا تھا۔ پھر ایک  
 اسے منانے آ گیا تھا اور وہ خیر دین کے حکم اور ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اس کے ساتھ کھیلنے تو نہیں گئی تھی لیکن  
 کم کم ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ اسے آج بھی وہ ویسی ہی کم کم گئی تھی لیکن وہ کیا کرتا۔ وہ ایک شیردل کو اس کا جیون  
 ساتھی چاہتے ہوئے بھی نہیں بنانا چاہتا تھا، وہ اپنی چڑیا کو اس خاندان کا حصہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جس  
 نے۔۔۔۔۔ اور پھر وہ سجاد کے خاندان کو زبان دے چکا تھا۔ زبان دے کر اور شادی کی تاریخ طے کر کے کیسے کر  
 جاتا۔ خیر دین نے اپنی زبان کا پاس تو ساری عمر کیا تھا پھر اب کیسے نہ کرتا۔

☆☆☆

عکس مراد علی نے زندگی میں بہت ساری بے خواب راتیں گزاری تھیں۔ وہ رات بھی انہی راتوں میں  
 سے ایک تھی۔ بہت سی چیزیں بھی اس وقت آپ کو ملنے کا امکان پیدا ہوتا ہے جب آپ کو ان کی خواہش اور  
 ضرورت دونوں نہیں رہتیں لیکن ان کے ساتھ منسلک محبت اور حلق دیسے ہی رہتے ہیں۔

عکس مراد علی نے زندگی میں بھی ایک شیردل کے نام کو اپنے نام کا حصہ بنانے کا نہیں سوچا تھا۔  
 خواب میں بھی نہیں۔۔۔۔۔ اور جو چیز اس کے خوابوں یا خیالوں میں بھی نہیں آئی وہ option بن کر کیسے آگئی تھی۔  
 وہ اپنی اداسی کی وجہ خود بھی سمجھ نہیں پار ہی تھی۔ کس چیز نے بے چین کر رکھا تھا اسے۔۔۔۔۔ اس پر پوچھنا

کے آنے یا اس پر پوزل کے ریجیکٹ ہو جانے نے.....  
 ”بس مٹی نہیں مانتیں..... وہ مان جائیں ناں تو تم سے شادی کا پہاڑ بھی سر ہو جائے۔“ کئی سال پہلے  
 ایک بار ایک شیردل نے اس کے سامنے منہ کو منانے میں بار بار ناکام ہونے کے بعد اعتراف کرتے ہوئے  
 کہا تھا۔

”تم مٹی کو منانے کی کوشش کر رہی کیوں رہے ہو..... وہ مان بھی جائیں تو نکاح نا سے پران کے نہیں،  
 میرے دستخط چاہیے ہوں گے تمہیں شادی کے لیے۔“ عکس نے اس کی بات سے ہونے والی تکلیف کو  
 مسکراہٹ کے بہت سارے پردوں میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

”تم تو مان جاؤ گی.....“ شیردل نے عجیب بے پروائی سے کہا تھا۔  
 ”خوش فہمی ہے تمہاری..... مجھے تم سے شادی میں دلچسپی نہیں ہے..... تمہا سے مٹی، پاپا مان بھی جائیں تو  
 بھی..... اس لیے بہتر ہے کہ تم ان کی نظروں میں اپنا بیچ خراب مت کرو..... تمہاری کزن شیر بانو زیادہ سوٹ  
 اہل ہے تمہارے لیے..... تم اس کے بارے میں سوچو۔“ اس نے شیردل سے دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔  
 ”اب اگر میں نے تمہیں یہ بتا دیا ہے کہ صدیوں بعد ایک کزن دریافت کر لی ہے میں نے امریکا میں تو  
 اس کا یہ مطلب نہیں تم اس سے میرا رشتہ جوڑنے بیٹھ جاؤ۔“ شیردل فون پر اس سے بات کرتے ہوئے برا مان  
 گیا تھا۔

”تم جو ہیں سمجھئے اس کے ساتھ بھرتے ہو اور.....“ شیردل نے عکس کی بات کاٹی۔  
 ”جو ہیں سمجھئے؟ ہم ایک اپارٹمنٹ شیئر کر رہے ہیں یار..... اور تم کیا چلیس ہو رہی ہو؟“  
 ”کس بات سے چلیس ہوتا ہے میں نے۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”شیر بانو سے..... I really like her Sherdil“

”کیوں.....؟“ ایک لمحے کے لیے اس اچانک آ جانے والے سوال کا جواب اسے نہیں آیا۔  
 ”وجہ ضروری تو نہیں ہوتی کسی کو پسند کرنے کے لیے۔“ اس نے بالآخر سنبھل کر کہا۔  
 ”تم شیر بانو میں بہت Interest لیتی ہو۔“ شیردل نے اگلے تھرے سے ایک بار پھر اسے  
 لا جواب کیا۔

”تم interest نہیں لے رہے اس میں کیا؟“ عکس نے جوابا کہا۔  
 ”میں ہر لڑکی میں لیتا ہوں۔“ شیردل نے ڈھٹائی سے کہا۔  
 ”صرف اسی وجہ سے میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ عکس نے اسی انداز میں کہا۔  
 ”تم سے شادی کے بعد کسی میں نہیں لوں گا۔“ شیردل نے بے ساختہ کہا۔  
 ”میں نہیں چاہتی تم اتنی پورنگ لائف گزارو۔ شیر بانو.....“ شیردل نے اس کی بات کاٹ دی۔  
 ”یار میں اس کا اتنا ذرا نہیں کرتا جتنا تم کرنے لگی ہو..... آخر تم کیوں چاہتی ہو کہ میں اس سے شادی  
 کر لوں اگر تمہارے علاوہ ہی کسی سے شادی کرتی ہے تو پھر میرے پاس بھی کچھ اور options ہیں۔“  
 ”ان options میں کوئی آپشن شیر بانو جیسا اچھا نہیں ہے۔“

پتا نہیں اسے آج وہ سب کچھ کیوں یاد آنے لگا تھا۔ باری ڈول اب بھی اس کے دل کے کسی کونے میں  
 ساٹی ہوئی تھی جیسے ایک شیردل..... چڑیا کے لیے ان دونوں کی محبت سے دامن چھڑانا بہت مشکل تھا۔

وہ اور شیردل امریکا میں اس کے قیام کے دوران آپس میں رابطے میں تھے۔ شیر بانو سے تعارف  
 ہونے سے لے کر شیر بانو کے ساتھ گزارے جانے والا کوئی ایسا وقت اور سرگرمی نہیں تھی جس کا ذکر اس  
 نے عکس سے نہ کیا ہو۔ یہ راز بھی اس نے اپنی فیملی سے بھی پہلے عکس ہی کے ساتھ شیئر کیا تھا کہ شیر بانو اس  
 کے اگلوٹے ناموں شہباز حسین کی بیٹی تھی جس سے وہ ایک طویل مدت کے بعد شتارقب ہوا تھا..... اور  
 وہ پہلا موقع تھا جب عکس نے شیردل سے شیر بانو کی تصویر ای میل کرنے کے لیے کہا تھا..... وہ باری  
 ڈول کو دیکھنا چاہتی تھی..... اتنے سالوں کے بعد..... یہ بھی اسے یاد تھا وہ کس طرح بے قراری سے صرف  
 اس سے بات کرنے کے لیے اس کی کلاس کے چکر لگاتی رہی تھی..... بچپن کی اچھی اور بری کوئی یاد عکس  
 کے ذہن سے کبھی نہیں ہوتی تھی۔

شیردل نے اسے شیر بانو کی صرف ایک تصویر ای میل نہیں کی تھی بہت ساری کردی تھیں۔ چڑیا اتنے  
 سالوں بعد بھی باری ڈول کو دیکھ کر اس سے نظر نہیں ہٹا سکی تھی..... وہ آج بھی محرومہ کرنے والے حسن کی  
 مالک تھی اور چڑیا آج بھی اس پر اسی طرح دل و جان سے فدا ہوئی تھی جس طرح بچپن میں۔ وہ بہت سی  
 تصویروں میں شیردل کے بہت قریب تھی..... کسی میں اس کا بازو تھا، کسی میں ہاتھ..... کسی میں شیردل کے  
 برابر بالکل ساتھ بیٹھی ہوئی..... کوئی بھی ان تصویروں پر نظر ڈالتے ہی یہ جان جاتا کہ تصویروں میں نظر آنے  
 والے جوڑے کے درمیان صرف دو کی نہیں تھی۔ شیردل نے جان بوجھ کر اسے اپنی اور شیر بانو کی ایسی تصاویر  
 بھیجی تھیں جنہیں دیکھ کر عکس کو تھوڑا بہت حسد تو ضرور ہو جاتا مگر اس پر الٹا اثر ہوا تھا۔ شیردل اب جیسے اس کے  
 لیے وہ candy بن گیا تھا جو باری ڈول کو پسند تھی اور چڑیا وہ candy باری ڈول کو ہر قیمت پر دلا نا چاہتی  
 تھی اور اس نے دلا دیا تھی۔

☆☆☆

منزلہ اس وقت گھر سے کہیں جانے کے لیے نکل رہی تھیں جب آپ بٹر نے انہیں عکس کی کال کے بارے  
 میں بتایا۔ ایک دن پہلے خیر دین کے صاف اور دو ٹوک انکار کے بعد بھی وہ عکس کی کال پر ایک دم ایکسٹنڈ  
 ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اسی ایکسٹنڈ میں آپ بٹر کو کال بند کرنے کا کہا اور اپنے بیڈ روم میں جا کر اپنے سہل  
 فون سے عکس کو کال کی۔

”بیٹا تم اگر کال نہ کرتیں تو میں ہی تمہیں کال کرنے والی تھی۔“ عکس کی آواز سنتے ہی انہوں نے چھوٹے  
 ہی اس سے کہا تھا۔

”تمہارے ماما نے تمہیں بتایا بیٹا کہ میں نے ان سے تمہارے اور شیردل کے رشتے کی بات کی ہے۔“  
 ”میں شیردل سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ اس نے منزلہ کا پہلا جملہ سنتے ہی سنجیدہ آواز میں انہیں ٹوک  
 دیا۔ ”اور میں چاہتی ہوں آپ میرے ماما سے اس سلسلے میں دوبارہ بات نہ کریں۔“ انہیں چند لمحے سمجھ نہیں آیا  
 کہ وہ اس کی بات کے جواب میں کیا کہیں۔ انہوں نے خیر دین سے انکار سنا تھا لیکن انہیں عکس سے انکار کی  
 توقع نہیں تھی۔

”میں بہت غلوں سے تمہیں اچھی فیملی کا حصہ بنا کر شیردل کی زندگی میں لانا چاہتی ہوں۔“ منزلہ نے  
 بالآخر کہا۔ ”شیردل اس وقت بہت مشکل وقت سے گزر رہا ہے تمہارا ساتھ اسے مل جائے گا تو.....“ عکس نے  
 ایک بار پھر ان کی بات کاٹ دی۔

”اوہ تو وہ مجھے ہر جگہ بدنام کرتا پھر رہا ہے اور میں سمجھتی تھی کہ وہ ایک ذاتی ایٹھو کو لوگوں کے ساتھ دلس نہیں کرے گا۔“ آملہ اس کے زعم پر حیران ہوئی۔ وہ پہلی بار شہر بانو کو اس طرح ری ایکٹ کرتے دیکھ رہی تھی اور وہ جیسے کچھ غلط ہو گئی تھی۔

”نہیں، شیردل کچھ اپ سیٹ تھا اسی لیے یوسف نے پوچھا ہوگا تو اس نے ذکر کیا لیکن اس نے details نہیں بتائی تھیں۔ یوسف کو رس کرنے کے بعد واپس آیا۔ تب اس نے مجھ سے ذکر کیا کہ شیردل بہت اپ سیٹ رہا ہے پورے کورس کے دوران..... اس کے اور شہر بانو کے درمیان کوئی جھگڑا چل رہا ہے شاید..... میں نے تب بھی سوچا تھا کہ تم سے بات کروں لیکن یوسف نے منع کر دیا کہ یہ مناسب بات نہیں ہے۔“ آملہ نے اس بار جیسے اسے تھیلات دینے کی کوشش کی..... وہ لا شعوری طور پر شیردل کی پوزیشن بھی کلیئر کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور شہر بانو..... یہ نوٹس کر رہی تھی۔

”شیردل میری وجہ سے اپ سیٹ نہیں ہوگا وہ اگر اپ سیٹ ہوگا تو عکس کی وجہ سے ہوگا۔“ وہ عکس کا نام نہیں لینا چاہتی تھی اور اب تو بالکل بھی نہیں..... جو ہونا تھا..... ہو گیا تھا..... گزر چکا تھا..... اب ایسے ذکر اور الزام تراشی کا کیا فائدہ ہونا تھا..... وہ کسی پر کچڑا چھلنا نہیں چاہتی تھی جس کے جھینے اس کے اپنے دامن تک آتے لیکن پھر بھی پتا نہیں کیوں وہ عکس کا نام لیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

”عکس.....؟ عکس مراد علی؟“ آملہ نے جیسے کچھ حیران ہو کر اس سے پوچھا۔ ”اس کی فیملی میں ہونے والی ایمر جنسی کی وجہ سے وہ کورس چھوڑ کر چلی گئی تھی!“ آملہ کو اب بھی شہر بانو کی بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس نے اس پینل کو بوجھنے کے لیے ایک اندازہ لگا یا جو شہر بانو نے اس کو بوجھنے کے لیے دی تھی۔ شہر بانو نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔ ”عکس کورس چھوڑ کر چلی گئی تھی؟“ آملہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں اس نے کورس نہیں کیا۔ شاید دوسرے یا تیسرے دن ہی وہ واپس چلی گئی تھی۔ شیردل کا اس کی فیملی میں ہونے والی ایمر جنسی سے کیا تعلق ہے؟ وہ اس کی وجہ سے کیوں اپ سیٹ ہوگا؟“ آملہ اب اس سے پوچھ رہی تھی لیکن وہ اسی طرح بھونچکا اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ عکس کے پاس شیردل کا فون تھا لیکن وہ سنگاپور میں نہیں تھی..... شیردل کا فون..... شیردل کا فون..... اس نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی کہ شیردل نے اسے

”آئی میں ایک دوست کے طور پر شیردل کی مدد کر سکتی ہوں۔ اس کے لیے مجھے اور اسے آپس میں کوئی تیار شدہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے اور اس کے درمیان محبت والا رشتہ اور تعلق نہیں ہے۔ ہم بہت اچھے دوست ہیں اور میں اس رشتے کو بس یہیں تک رکھنا چاہتی ہوں۔ آپ تانا سے دوبارہ اس سلسلے میں بات مت کریں کیونکہ وہ میرے لیے بہت upsetting ہے۔“ اس کے لہجے میں اتنی قطعیت تھی کہ مندرجہ بالا کچھ نہیں کہہ سکیں..... زندگی واقعی بڑی عجیب اور بے رحم چیز ہوتی ہے انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی ایسے کسی خاندان کی لڑکی کے ساتھ اپنے بیٹے کی شادی کے لیے گزرتا کریں گی اور وہ انکار کر دے گی۔ انکار تو ہمیشہ ان کا اور ان کے خاندان کا استحقاق رہا تھا..... کسی کٹر خاندان والے کو کیسے مل جاتا۔

”تم شیردل سے اس کا ذکر مت کرنا۔“ مندرجہ نے ایک دم بے قراری سے کہا۔ انہیں اچانک ہی یاد آ گیا تھا کہ کچھ ایسی ہی گفتگو چند دن پہلے شیردل نے بھی ان سے کی تھی لیکن انہوں نے اس کی گفتگو کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے خیر دین سے بات کی تھی۔ ہاں البتہ انہیں اگر اس دفعہ فینشن کم تھی تو صرف اس وجہ سے کم تھی کیونکہ انہوں نے خیر دین سے بات کرنے سے پہلے بختیار سے بات کر لی تھی اور بختیار کی اجازت ملنے کے بعد ہی انہوں نے خیر دین سے رابطہ کیا تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں، میں شیردل سے اس معاملے میں کوئی بات نہیں کروں گی۔“ ان کے جملے نے عکس کے اس اندازے کی تصدیق کی تھی جو اس نے پہلی رات لگایا تھا۔ شیردل اس سارے معاملے سے بالکل بے خبر تھا۔ مندرجہ نے اس سے مزید بات نہیں کی تھی۔ اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے وہ اتنی بد دل ہوئی تھی کہ انہوں نے چند اختتامی کلمات کے ساتھ فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

”مجھے بڑا فوس ہوا تم لوگوں کی seperation کا سن کر..... آئیڈیل کیل تھا تم لوگوں کا..... آخر ایسا کیا ہوا کہ اس طرح امتوں میں divorce ہو گئی۔“ آملہ کو واقعی بہت افسوس ہوا تھا لیکن شہر بانو کے لیے وہ سب کچھ سنا ایک عجیب تکلیف کا باعث بن گیا تھا۔

آملہ، شیردل کے ایک بچ سیٹ یوسف کی بیوی تھی۔ وہ ان چند عورتوں میں سے تھی جن کے ساتھ شہر بانو کی بہت اچھی علیک سلک ہی نہیں تھی بلکہ کسی حد تک بے تکلفی بھی تھی اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آملہ خود بھی امریکا میں ہی پڑی تھی۔ شہر بانو اور اس کے درمیان اسی ایک common connection (باہمی تعلق) نے بے تکلفی پیدا کر دی تھی۔

وہ اب اپنے ایک بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے امریکا آئی تھی تو شہر بانو سے فون پر بات کرنے کے بعد وہ اس سے ملنے بھی چلی آئی۔

”میں نے تم سے اس سارے جھگڑے کا پتا چلنے پر بہت دفعہ رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن تم فون ہی نہیں لیتی تھیں۔“ آملہ کہہ رہی تھی۔

”ہاں، میں بہت اپ سیٹ تھی ان دنوں اس لیے۔“ شہر بانو نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ”یوسف سنگاپور میں شیردل کے ساتھ کورس کر رہا تھا، اسی نے وہاں سے واپس آنے کے بعد مجھے بتایا کہ شیردل اور تمہارا کوئی جھگڑا ہوا ہے۔ شیردل وہاں بھی اب اپ سیٹ تھا اس نے یوسف سے کسی بات پر ذکر کیا تھا تم نے شاید تب اس سے بات کرنا بند کر دی تھی۔“ آملہ کی بات پر شہر بانو کو غصہ آیا۔



دیکھ کر اس کے کسی بھی سوال سے پہلے کہا۔ وہ چاہتی بھی تو اس تاریخ کو بھلا نہیں سکتی تھی۔ شہر بانو کو وہاں آنے ابھی چند دن ہی تو ہوئے تھے۔ شہر بانو نے جواب میں کچھ نہیں کہا اس کی چھٹی جس بار بار جیسے کسی خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔

سنگ ایریا میں چپ چاپ جسموں کی طرح بیٹھی وہ دونوں اس وقت صرف ایک دعا کر رہی تھیں کہ ان کی غلط فہمی غلط نہ ہو۔

پندرہ منٹ بعد آٹک نے فون کیا تھا شہر بانو چند لمبے سفید چہرے کے ساتھ فون سنتی رہی پھر فون رکھتے ہوئے اس نے سنے چہرے کے ساتھ شرمین کو دیکھا۔ اس کی نظروں اور چہرے کے تاثرات سے شرمین کا دل جیسے ڈوبا تھا۔

”وہ 14 کو پاکستان چلی گئی تھی۔“ زندگی میں ایسی چپ شرمین کو دوسری بار لگی تھی شہر بانو نے فون رکھ دیا تھا۔ بہت دیر تک وہ دونوں کم صم بیٹھی رہیں پھر شرمین نے جیسے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

”تم شیر دل کو صرف ایک کال کی وجہ سے تو چھوڑ کر نہیں آئی تھیں شہر بانو۔“ شرمین نے جیسے اسے یاد دلایا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

”لیکن میں نے اس سے طلاق صرف اسی ایک کال کی وجہ سے لی تھی۔“ اس کے حلق سے ایک سرسراہٹ ہوئی آواز نکلی تھی۔

☆☆☆

”چہ؟“ وہ خیر دین کی آواز پر ہڑبڑا کر چوکی تھی۔ ”تم ابھی تک سوئی نہیں؟“ خیر دین تہجد کے لیے جاگا تھا جب گھر میں ہونے والی آہٹوں پر اپنے کمرے سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ وہ عکس تھی جو رات کے پچھلے پہر راہداری کی کھڑکیوں سے باہر جھانکتے ہوئے وہاں اہل رہی تھی اور کسی گہری سوچ میں کم تھی اس نے نہ خیر دین کے کمرے کے دروازے کے ٹھٹھنے کی آواز سنی تھی نہ ان کے باہر نکلتے کی۔ وہ راہداری کے چکر لگاتے ہوئے میکا کی انداز میں وقفے وقفے سے تیز آدم کھڑکیوں سے باہر لان میں چلتی لائٹ میں نظر آنے والے پودوں کو دیکھ رہی تھی۔

سنگ پور سے کس نمبر سے کال کی تھی۔ اس نے سنگ پور جا کر اسے اپنے ہی فون سے کال کی تھی۔ دونوں نے دل سے اپنے ہی فون سے کال کرتا رہا تھا پھر اس نے دوسرے نمبر زادہ کالنگ کارڈ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے یہ بات اس لیے یاد تھی کیونکہ وہ بعض دفعہ شیر دل سے بات نہ کرنے کے فیصلے پر جے رہے تھے کے باوجود اس کا فون اس وقت غلطی سے اٹھا لیتی تھی جب وہ فون پر کوئی اور نمبر دیکھتی تھی پھر شیر دل کی آواز سن کر وہ فوری طور پر فون بند کر دیتی اور اس وقت وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ شیر دل شاید صرف اس سے بات کرنے کے لیے یہ نمبر استعمال کر رہا تھا اور جان بوجھ کر کالنگ کارڈ استعمال کرنا شروع ہو گیا تھا۔ پھر اسے شیر دل کی اسی میل یاد آئی جس میں اس نے شہر بانو کو کہا تھا کہ اس کا فون کام نہیں کر رہا سو فی الحال وہ فون پر اس سے رابطہ نہ کرے۔

”تو فون کام کر رہا تھا لیکن عکس پاکستان میں تھی اور اگر وہ پاکستان میں تھی تو۔“ وہ آگے کچھ نہیں سوچ سکی اس کے دماغ میں ایک دم جیسے کوئی جھٹکڑ چلتے لگا تھا۔ شرمین اور عکس کی بات کب ہوئی تھی؟ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب اسے اب ہر قیمت پر چاہیے تھا۔

آٹک سے ٹال مٹال کرنے کے بعد اس کے جاتے ہی اس نے شرمین سے جا کر یہی سوال کیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے شرمین بھی اسی طرح بھونچکا رہ گئی تھی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔؟ اگر وہ پاکستان میں تھی تو شیر دل کا فون اس کے پاس کیسے ہو سکتا تھا۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے بھی ویسی ہی بے یقینی کے عالم میں اس سے کہا۔

”ہو سکتا ہے شیر دل نے اسے دے دیا ہو۔۔۔۔۔ وہ ایمر جنسی میں پاکستان جا رہی تھی شاید اس کی ضرورت تھی یا کوئی بھی اور وجہ ہو سکتی ہے۔“ وہ بہت ابھی ہوئی شرمین کے پاس بیٹھی یہ معاملہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”لیکن پھر شیر دل نے تم سے جھوٹ کیوں بولا تھا کہ فون خراب ہو گیا۔“ شرمین کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ممی وہ کبھی مجھے ان حالات میں نہیں بتا سکتا تھا کہ اس نے اپنا فون استعمال کے لیے عکس کو دیا تھا۔۔۔۔۔ وہ“ شہر بانو بات کرتے کرتے رک گئی اس کی آواز کا پسینہ لگی تھی she had committed the blunder of her life (اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی) اور اسے اب احساس ہوا تھا۔ غلطی کسی سے بھی ہو سکتی تھی اور غلط فہمی بھی۔ شرمین کو بھی۔

اس نے شیر دل کو اپنی زندگی سے فوری طور پر نکال دینے کا فیصلہ اس ایک فون کال کی وجہ سے کیا تھا۔ شیر دل کے کسی دوسری عورت کے ساتھ ناجائز تعلقات۔۔۔۔۔ یہ وہ غلطی تھی جس کے لیے وہ شیر دل کو بھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ اور اب یوں لگ رہا تھا جیسے اس سے جلد بازی ہو گئی تھی۔

شرمین سے مزید کچھ کہے بغیر شہر بانو نے فون اٹھا کر آٹک کا نمبر ملایا اور اسے یوسف سے عکس کے سنگ پور سے روانہ ہونے کی تاریخ اور وقت پوچھنے کو کہا۔ آٹک اس تعینات پر بے حد حیران ہوئی تھی اور حیرانی سے زیادہ الجھن تھی جس کا وہ شکار بھی لیکن اس نے شہر بانو سے سوال جواب نہیں کیے تھے اور تھوڑی دیر بعد دوبارہ کال کرنے کو کہا۔

”میں نے اسے 15 تاریخ کو کال کی تھی سنگ پور میں رات تھی اس وقت۔“ شرمین نے شہر بانو کو فون رکھتے

”میں بس سونے جا رہی تھی۔“ اس نے خیر دین کے سوال کے جواب میں بے حد غلٹ سے کہا اور  
 رُکے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ خیر دین وہیں کھڑا رہا وہ پہلی رات نہیں تھی جب اس نے عکس کو راتوں کو اٹھ اٹھ  
 کر گھر میں پھرتے اور اس راہداری میں ٹپکتے دیکھا تھا۔ وہ پچھلے چند دنوں میں کئی بار عکس کو اسی طرح رات  
 کے پچھلے پہر گھر میں پھرتے دیکھ چکا تھا۔ وہ بے چین، مضطرب اور اداس تھی۔۔۔۔۔ اور اسے خیر دین کو یہ  
 بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔۔۔۔۔ خیر دین کے دل پر عجیب سا بوجھ ڈھرا تھا۔۔۔۔۔ بعض دفعہ اسے لگتا تھا کہ وہ اس  
 سے کچھ کہنے رات گئے وہاں آتی تھی اور پھر اس کے کمرے میں جا کر ہمت کیے بغیر وہیں ٹپکتی رہتی تھی۔  
 وہ ایسی ہی تھی۔ بچپن سے ہی ایسی تھی۔۔۔۔۔ اکیلی پھرتی۔۔۔۔۔ اکیلی بھینکتی۔۔۔۔۔ اکیلی جاگتی۔۔۔۔۔ خود سے باتیں  
 کرتی۔۔۔۔۔ پر وہ بچپن تھا اور بچپن کی تنہائی بڑوں کو تنگ نہیں کرتی۔

”تمہیں مجھ سے کچھ کہنا ہے کیا چیز؟“ صبح آفس جاتے ہوئے ناشتے کی میز پر خیر دین نے عکس سے  
 کہا، وہ چونک گئی۔

”مجھے؟ نہیں تو۔۔۔۔۔؟“

”ہاں نہیں مجھے کیوں ایسا لگتا ہے جیسے تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو اور اگر تم کچھ کہنا چاہتی ہو تو مجھ سے کہہ  
 دو چیز یا، میں تمہاری بات سنوں گا۔۔۔۔۔ میں تمہاری کوئی بات نہیں نالوں گا۔“ ہاتھیں وہ کون سا لمحہ تھا جس  
 میں خیر دین نے چیز یا کی خوشی کے سامنے ہار مان لی تھی لیکن وہ اپنی زبان سے یہ بات کہنے کی ہمت نہیں کر رہا  
 تھا کہ وہ شیر دل سے چیز یا کی شادی کرنے پر تیار ہے۔

”مجھے کچھ بھی نہیں کہنا نا۔۔۔۔۔ اور جو کہنا ہوتا ہے میں کہہ دیتی ہوں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں میں  
 کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھتی۔“ توس پر کھنکھاتے ہوئے اپنے ہی آخری جملے پر اس کی زبان لڑکھڑائی تھی۔  
 وہ مجھوٹ تھا اور یہ بات وہ دونوں جانتے تھے۔۔۔۔۔ عکس مراد علی سے زیادہ بہتر راز رکھنا کسی کو نہیں آتا تھا۔

”آپ مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہیں؟“ خیر دین کے پاس اس سوال کا جواب تھا لیکن بتا دینے کی ہمت  
 نہیں۔

☆☆☆

ساتواں آسمان ان کے سر پر آگرتا تو انہیں اتنا شاک نہ لگتا جتنا شیر دل کی بات پر لگتا تھا۔ وہ اس کا چہرہ  
 دیکھتی رہ گئیں۔ وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔۔۔۔۔ منزہ اور غمناک ابھی کچھ دیر پہلے ہی کسی ڈنر سے واپس آئے  
 تھے اور وہ ابھی لاؤنج میں بیٹھی اس کے ابھی تک گھر نہ آنے پر کچھ مضطرب سی ہو کر اسے کال کر رہی تھیں  
 جب وہ اندر آ گیا تھا۔

”تم صبح سے کہاں غائب ہو شیر دل؟“ منزہ کو یک دم جہاں اطمینان ہوا تھا وہاں ایک عجیب سی بے  
 چینی بھی۔

”آپ کو بتا کر گیا تھا مگر مجھے کہیں ضروری کام سے جانا ہے۔“ وہ کہتے ہوئے وہیں صوفے پر ان  
 کے پاس بیٹھ گیا اور پھر بغیر کسی تمہید کے اس نے جو بات منزہ سے کہا اب وہ اسی بات کو سن کر شاید اس کی  
 شکل دیکھ رہی تھیں۔

”تم نے کیا کہا؟“ انہیں یک دم احساس ہوا کہ انہیں غلطی بھی ہو سکتی تھی ضروری تھا کہ وہ اس سے ایک  
 بار پھر سوال کر لیتیں۔

”میں نے آپ سے کہا کہ آپ اور پاپا عکس کے ٹانا کے پاس جا کر اس سے میرے رشتے کی بات کریں۔“ شیردل نے اپنی بات دُبرادی۔ منزہ نے اب بھی وہی سنا تھا جو پہلے سنا تھا۔ ان کا دل یک دم جیسے ایک عجیب سی خوشی سے بھرا تھا۔ وہ بیٹھے بٹھائے اس بات پر کیسے مان گیا تھا۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھیں لیکن انہوں نے سارے سوالات کو فوری طور پر پالائے طاق رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

”تم کب چاہتے ہو کہ ہم عکس کے گھر جاویں؟“

”کل ہی چلے جائیں۔“ شیردل نے اسی انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے..... لیکن تم نے عکس سے بات کی ہے؟ اس سے پوچھ لیا ہے؟“ منزہ کو جیسے کسی خدشے

نے ستایا۔

”ضرورت پڑی تو پوچھ لوں گا..... فی الحال تو ضرورت نہیں ہے..... عکس کو کسی بات پر اعتراض ہوا

بھی تو اس کے ٹانا اسے منانگیاں گے..... میں بس چاہتا ہوں آپ کل جا کر اُن سے رشتے کی بات کریں۔“

شیردل اسی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”میں کرتو لوں گی لیکن شاید تمہیں یہ نہیں پتا کہ عکس کی جواد سے مگنی ٹوٹنے کے بعد ایک اور مگنی ہو چکی

ہے اور اس کی شادی کی تیاریاں شروع ہیں، ایسے میں وہ تمہارے رشتے پر کیسے رضامند ہوگی؟“ منزہ نے

اپنی تشویش جیسے اس کے ساتھ بائی۔

”آپ وہاں جا کر رشتے کی بات کریں، یہ سب کچھ بعد میں دیکھا جائے گا۔“ وہ اٹھ کر چلا گیا تھا۔ پتا

نہیں منزہ کو کیوں ایسا لگا کہ وہ عکس سے مل کر آیا تھا اور یقیناً اسے رشتے پر آمادہ کر آیا تھا..... لیکن چند دنوں

میں اس کی یہ کایا کلب کیسے ہو گئی تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھیں۔ لیکن وہ بے انتہا خوش تھیں اور خوش ہونے

سے بھی زیادہ وہ مطمئن تھیں۔ آج انہوں نے ایک بار پھر شیردل کو ایک نارمل انسان کی طرح ایک نارمل

زندگی کی بات کرتے دیکھا تھا اور کسی نے ان کے کندھوں سے جیسے منوں بوجھ اتار دیا تھا۔

☆☆☆

”کیا چاہیے تمہیں؟“

”کچھ نہیں.....“ شہر بانو نے ساتھ چلتی مثال کو دیکھا۔ مثال کا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت میں ضرور

تھا لیکن وہ مکمل طور پر اس سے بے نیاز سا مذاک پر دکاتوں کی کھڑکیوں میں بھی چیزیں دیکھتی اور کسی قسم کی

دلچسپی کا اظہار کیے بغیر چل رہی تھی۔ شہر بانو کو یاد تھا کہ وہ پہلے ایسی نہیں تھی، صرف کچھ مہینے پہلے جب وہ اور

شیردل اسے لیے کسی شاپنگ والی جگہ پر جاتے تو مثال کو جیسے کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا۔ اس کا بس نہیں چلتا

تھا کہ وہ شاپنگ اسٹورز میں پڑا ہر کھلونا اور ہر کھانے پینے کی چیز اٹھا کر گھر لے جائے۔ وہ ہر کھلونا اور ہر

کھانے پینے کی چیز اٹھا کر، شہر بانو اور شیردل کو باقاعدہ بحث سے قائل کرنے کی کوشش کرتی تھی کہ اسے اس

کھلونے اور چیز کی کتنی اشد ضرورت تھی۔ شہر بانو کو تب اس کے ساتھ دماغ کھانا نہیں پڑتا تھا، اس کام کے

لیجے شیردل تھا۔ مثال کو سنبھالنا اور اس کی بحث کو سننا اس کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ وہ پچھلے چند مہینوں میں

امریکا آنے کے بعد بالکل بدل گئی تھی۔ شہر بانو کو اب اسے زبردستی کھلونے یا کھانے پینے کی چیزوں کی

طرف متوجہ کرنا پڑتا..... زبردستی کھلونے خرید خرید کر تھامنے پڑتے جنہیں مثال عدم دلچسپی اور عجیب بے حسی

کے عالم میں بکڑنی اور چل پڑتی تھی، ایک بچے والی خوشی اور ایک اٹھٹ اس کے چہرے یا انداز میں بھی



میں نہیں آیا۔

”کیا انکار کر آئے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”شادی سے انکار کر آئے ہیں۔“ حلیمہ اسی انداز میں بولتی رہی۔ اس بار عکس بھونچکا ہو کر رہ گئی تھی  
”نانا نے سجاد سے رشتہ ختم کر دیا میرا؟“ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

”ہاں..... اور ایک شیردل کے ماں باپ آئے تھے آج! ابانے ایک کے ساتھ رشتہ طے کر دیا.....  
ذرا سوچو وہ طلاق یافتہ ایک بچی کا باپ ہی اب ان کو نظر آیا تمہارے لیے..... اور وہ بھی سجاد جیسا اچھا رشتہ چھوٹ کر.....  
اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اب کا دامخ خراب ہو گیا ہے۔“ حلیمہ بولتی جا رہی تھی اس بات کا اندازہ  
کیے بغیر کہ عکس پر کیا گزر رہی تھی۔

”نانا نے شیردل کے ساتھ میرا رشتہ طے کر دیا؟“ اس نے بے یقینی میں حلیمہ کی بات دہرائی پھر  
کہا۔ ”آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے امی۔ نانا ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ شیردل کے ماں باپ آئے ہوں گے  
لیکن نانا نے انہیں انکار کر دیا ہو گا۔“ اس نے ماں کو سمجھانے سے زیادہ خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”یہ کیسے  
ہو سکتا تھا..... یہ واقعی کیسے ہو سکتا تھا؟

”مجھے غلط فہمی..... ہ میرے سامنے ساری بات چیت ہوئی ہے اور میرے احتجاج کے باوجود ابانے رشتہ  
توڑ دیا اور ان لوگوں کو شادی کی وہی تاریخ دے دی۔“ حلیمہ بہت پریشانی کے عالم میں بول رہی تھی۔

عکس کچھ دیر ماں کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے بڑی بنیدگی سے کہا۔  
”اس شادی میں کچھ بھی honourable نہیں ہے۔ میں تو کبھی شیردل سے شادی نہیں کروں  
گی۔“ اس کا انداز دو ٹوک تھا۔

”ابھی تو..... اس لیے تو میں بھی ابابا سے کہتی رہی کہ ساری عمر جس خاندان کا لایا ہوا عذاب ہم  
اٹھا اٹھا کر پھرتے رہے کم از کم اب تو انہیں جانے دیں۔ رہنے دو۔ میری بیٹی کے لیے ایک سے بڑھ  
کر ایک رشتہ موجود ہے تو ہم کیوں کسی طلاق یافتہ سے رشتہ کرتے پھریں۔“ حلیمہ کا پارا شاید اب بھی  
نچے نہیں آیا تھا۔

”اسی لیے کہہ رہی ہوں تم ابابا سے بات کرو..... صاف انکار کر دو انہیں۔ تمہاری بات ابانہیں ٹالیں  
گے تم ضد پر اڑ جاؤ۔ سجاد کے ماں باپ سے میں بات کر لوں گی۔“ حلیمہ نے جیسے اسے پوری پلاننگ بتائی۔  
”امی میں نانا سے بات کر لوں گی کسی ضد اور پلاننگ کی ضرورت نہیں ہے، نانا میرے ساتھ زبردستی  
نہیں کریں گے۔“ وہ کہتے ہوئے وہاں سے اندر چلی گئی تھی۔ یک دم اس کا دامخ جیسے آنسو کی لپیٹ  
میں آیا تھا۔

☆☆☆

شیردل کچھ دیر کے لیے سانس بھی نہیں لے سکا تھا۔ اس کے تل فون پر شہر بانو کا نام چمک رہا تھا۔  
اسے لگا اسے دھوکا ہوا ہے۔

(آخری قسط انشاء اللہ اگلے ماہ)





”بہت ساری باتیں کہہ رہے ہیں ملازم لیکن سب سے عجیب و غریب بات یہ ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ اس گھر میں جو کچل بھی رہتا ہے ان کا break up ہو جاتا ہے..... کتنی خوفناک بات ہے ناں مہی..... میں تو ذرا ہی کتنی یہ سن کے لیکن ابراہیم کو بالکل یقین نہیں ہے ایسی باتوں پہ..... آپ یقین کرتی ہیں ایسی باتوں پہ؟“ اس نے عکس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ عکس نے ہلاتو تف کہا۔ مثال نے ایک کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ عکس کو دیکھا۔

”اس گھر میں اور زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے..... کم از کم میرے نزدیک..... اس گھر میں داخل ہونا جیسے دنیا میں آنے کے برابر ہے..... دنیا میں کچھ اچھے لوگ ملتے ہیں، کچھ برے لوگ..... اچھوں کی اچھائی بھی زندگی بدل سکتی ہے، بُروں کی بُرائی بھی..... پر جنگوں میں کچھ نہیں ہوتا۔ جو بھی کچھ ہوتا ہے وہاں بسنے والے انسانوں کی وجہ سے ہوتا ہے..... تمہیں سمجھ آ رہی ہے میری بات؟“ عکس نے گردن موڑ کے براہِ کمری مثال کو دیکھا۔ وہ جواباً مسکرا دی۔

”سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“ عکس بھی اس کی بات پر مسکرائی۔ پھر وہ دوبارہ گھر کو دیکھنے لگی۔

”گمروں میں کچھ نہیں ہوتا، وہ انسانوں کو جوڑنے یا توڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، وہ بس اینٹوں، سینٹ، سرے اور لکڑی کی ایک عمارت کے علاوہ کچھ نہیں ہوتے..... ان کے اندر آکر رہنے والے انسان اپنی سوچ، عمل اور روٹیوں سے اپنی زندگی بناتے یا بگاڑتے ہیں۔“ مثال بہت سنجیدگی سے عکس کی بات سن رہی تھی وہ ہمیشہ اس کی بات اسی سنجیدگی اور انتہاک سے سنا کرتی تھی، عکس مراد علی اس کا آئیڈیل تھی۔ وہ ہمیشہ اس جیسا بننا چاہتی تھی۔ لیکن ہر بار وہ یہ اعتراف کرتی تھی کہ ان جیسا بننا بہت مشکل کام تھا۔ کم از کم مثال شیردل کے لیے..... یا کسی کے لیے بھی۔ مثال نے زندگی میں عکس مراد علی جیسی کوئی شخصیت نہیں دیکھی تھی اور اسے فخر تھا وہ ”شخصیت“ اس کی زندگی کا حصہ تھی، اس کی ماں تھی۔

”میں اس گھر کے ایک کوارٹر میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ کوارٹر اب وہاں ہے بھی نہیں۔“ عکس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ”میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کوارٹر سے باہر نکل کے میں کبھی اس گھر میں آ کے رہوں گی..... اس گھر میں اپنی ماں اور نانا کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ وہ دونوں کام کرتے تھے یہاں..... یہاں پوسٹ ہونے والے آفیسر اور ان کی فیملیز کی خدمت کیا کرتے تھے..... میں اس back ground کے ساتھ اس گھر میں آئی تھی پھر اس گھر میں رہنے والے ایک کپل نے مجھے اچھی تعلیم دلوانے کے میرے نانا کے خواب کو پورا کرنے میں ان کی مدد کی۔ اس گھر میں میری زندگی کی بنیادیں ہیں۔ وہ بنیادیں جن پر آج میری زندگی کی عمارت کھڑی ہے..... یہاں پر میں اپنے بہترین دوست اور جیون ساھی سے ملی۔ یہاں میری پہلی اولاد ہوئی..... میری زندگی کے بہت سارے Milestones اس گھر سے وابستہ ہیں۔“

”آپ کے لیے تو یہ گمراہ Lucky رہا ہے پھر۔“ مثال نے مرعوب انداز میں کہا۔ ٹکس اس کی بات پہ ہنس پڑی اور اس نے اس طرح مسکراتے ہوئے اس گمراہ کو دوبارہ دیکھا پھر کہا۔

”اس گھر میں، میں نے اپنے باپ کو کھویا، اپنی زندگی کے سب سے قیمتی اثاثے، اپنے نانا کو کھویا..... یہاں میں اپنے بہن میں Child abuse کا شکار ہوئی..... بہت ذلت اور بے عزتی کی حالت میں اپنی فیملی کے ساتھ دھکے دے کے

”کیا دیکھ رہی ہیں آپ اس آئینے میں؟“ مثال نے کچھ تجسس آمیز انداز میں عکس سے پوچھا جو اس Cheval mirror کے سامنے کھڑی اس آئینے کے فریم کو اپنی انگلیوں سے غیر محسوس انداز میں پوں چھوری تھی جیسے اس کے ہونے کا احساس چاہتی ہو..... فریم پر موجود بار بار کی جانے والی پالش بھی اب اس کی بوسیدگی اور خشکی کو چھپانے میں ناکام ہو رہی تھی۔

فریم کو چھوتے ہوئے اس پر موجود گرد کو اپنی پوروں کو آپس میں رگڑ کر محسوس کرتے ہوئے وہ مثال کی بات پر مسکرائی تھی۔

”میں اس آئینے میں تاریخ دیکھ رہی ہوں۔“

”کیسی تاریخ؟“ مثال کا تجسس کچھ اور بڑھا۔

”اپنی زندگی کی تاریخ..... اپنا ماضی..... اس ماضی سے جڑے چہرے.....“ اس نے فریم سے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے آئینے میں جھنکے۔ اپنے عکس کو ایک بار پھر دیکھا پھر اپنے برابر میں کھڑی مثال پر ایک مسکراتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”اچھا..... ممی بھی اس آئینے کے سامنے اسی طرح فریز ہو گئی تھیں جس طرح آپ ہوئی ہیں..... میں نے ان سے بھی پوچھا تھا کہ وہ اس میں کیا دیکھ رہی ہیں؟“ مثال نے اسی دلچسپی سے اس آئینے پر نظر دوڑاتے ہوئے آئینے میں نظر آتی ہوئی عکس سے نظریں ملاتے ہوئے کہا۔

”کیا کہا انہوں نے؟“ عکس نے اس بار پلٹ کر مثال کو دیکھا۔

”انہوں نے کہا وہ اس آئینے میں مستقبل کو دیکھ رہی ہیں۔ آنے والے دنوں کا عکس جو اس میں کہیں چھپا ہے..... عجیب بات ہے ناں..... آپ اس میں ماضی کو دیکھ رہی ہیں..... مجھے کیا دیکھنا چاہیے..... حال؟“ مثال نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ عکس اس کی بات پر مسکرا دی پھر اس نے پلٹ کر دوبارہ آئینے کو دیکھا۔

”میرا بچپن اس آئینے کے ساتھ گزرا ہے۔۔۔۔۔ میرا، شہر بانو اور شیر دل تینوں کا بچپن دیکھا ہے اس نے۔“  
 ”مُمی آپ بھول رہی ہیں۔ میرا، طفلِ دل اور باؤل کا بچپن بھی تو دیکھا ہے اس نے۔“ مثال نے اسے ٹوکا۔  
 ”ہاں اور تم بھول رہی ہو کہ توران کا بچپن بھی تو دیکھ رہا ہے یہ۔“ اس نے مثال کو جیسے پاؤں دلا دیا۔  
 ”اوہ ہاں۔۔۔۔۔ یہ آئینہ تو واقعی ہماری فیملی heritage کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اسے یہاں نہیں ہمارے خاندانی گھر میں ہونا چاہیے۔“

”آئیڈیا برا نہیں ہے لیکن سرکاری ملکیت ہے یہ۔“ عکس نے کہا۔  
 ”مئی میں اور ابراہیم گھر کو renovate کرنے والے ہیں..... فرنیچر بھی بدلا جائے گا اور کاٹھ کباڑ میں یہ آئینہ بھی نکالنے والے ہیں ہم..... بہت زیادہ پرانا اور outdated ہو گیا ہے یہ۔“ مثال نے اس کے ساتھ جیسے اپنا پلان شیئر کیا۔  
 ”کیوں..... ابھی تو ٹھیک ہے یہ۔“ عکس نے اعتراض کیا۔

”مٹی ٹھیک نہیں ہے..... ستم از ستم سو سال پرانا ہو گیا ہے یہ..... میں اور ابراہیم تو حیران تھے اس بات پر کہ آخر اب تک بڑکا کیسے ہوا ہے یہ..... کسی آفیسر یا اس کی وائف نے ہٹایا کیوں نہیں اسے یہاں سے..... تاتا، تانی سے لے کر آپ اور پاپا تک کسی کو بھی اسے یہاں سے ہٹانے کا خیال نہیں آیا۔“ وہ کچھ حیرانی سے کہہ رہی تھی۔ عکس نے ایک پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”میں نے تمہیں بتایا ہے ناں یہ ہماری زندگیوں کا حصہ رہا ہے..... اس میں ہم لوگ اپنا، اپنا عکس دیکھتے رہے ہیں..... اپنی اپنی زندگیاں بنانے یا بگاڑنے والے چہروں کا عکس۔“ مثال کو لگا عکس بات کرتے کرتے جیسے کچھ سنجیدہ ہوئی تھی۔

”آپ نے اس میں کوئی ایسا چہرہ دیکھا جس نے آپ کی زندگی بگاڑی ہو؟“ مثال نے دلچسپی سے کچھ سوچے سمجھے بغیر اپنی طرف سے ایک معمول کا سوال کیا تھا۔ اس سوال نے نکس کو کچھ دیر کے لیے ہلے نہیں دیا۔ اس کے لیے اس سوال کا جواب بہت مشکل تھا۔ وہ ہاں کہتی اور مثال اس سے اس شخص کا نام پوچھتی..... وہ جموٹ جو اسے بعد میں بولنا تھا وہ شاید پہلے ہی بول دینا چاہتے تھا۔

”آپ کیا سوچ رہی ہیں؟“ مثال نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔ عکس نے چونک کر اسے دیکھا۔  
 ”میں نے اس چہرے کو اپنی زندگی بگاڑنے نہیں دی۔“ وہ عکس کی بات پر تجسس آمیز انداز میں مسکرائی۔  
 ”یعنی آپ نے بھی اس آئینے میں کوئی ایسا چہرہ دیکھا تھا؟“ وہ اب جیسے زور دینے والے انداز میں بولی تھی۔ ”آپ کو پتا ہے ہم لوگوں نے اس گھر کے بارے میں بھی ملازموں سے بہت عجیب و غریب باتیں سنی ہیں۔ پاپا اور آپ یہاں نہ رہ چکے

طرف تھا۔ اس نے عجیب قلی دینے والے انداز میں کچھ بے قرار ہو کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ ٹکس نے جواباً مسکرا کر اسے دیکھا۔  
.....نیم آنکھوں والی مسکراہٹ کے ساتھ.....

”زندگی میں انسانوں کے شر سے بڑھ کر خوفناک چیز کوئی نہیں، کوئی بھوت، بلا یا یو تا برالی میں انسان کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور زندگی میں انسانوں کی ہمت اور دلیری کے سامنے کوئی آسیب نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ لوگ بے وقوف اور بزدل ہوتے ہیں جو گھروں اور جگہوں میں جن، بھوت، بونے و دھونڈتے رہتے ہیں اور پھر ان کے ہونے یا نہ ہونے پر اپنی زندگی کی خوش قسمتی یا بد قسمتی کو طے کرتے ہیں۔“ مثال نے عکس مراد علی کو کہتے سنا۔ وہ فصاحت نہیں بھی، تجربہ تھا اور اسے..... وکیل کی مار نہیں ماری جاسکتی تھی۔

”اس گھر کے بونوں سے مجھے بھی تکلیف نہیں پہنچی لیکن انسانوں کی شکل میں ملنے والے بہت سے بونوں سے مجھے بہت تکلیف پہنچی۔“ وہ اب بھی دم آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”اور پتا ہے میں نے ایسے ہر بونے سے ملنے کے بعد کبھی اس جیسا نہ بننے کا سوچا اور ہر بونے سے ملنے کے بعد میں نے سوچا میں اپنی ذات سے ایسی تکلیف ایسا نقصان..... کبھی کسی دوسرے انسان کو نہیں پہنچاؤں گی میں کبھی دوسرے کسی انسان کے لیے بونا نہیں بنوں گی..... میں اس کے لیے انسان ہی رہوں گی..... وہ روپ جو اللہ نے ہمارے لیے پسند کیا ہے اور جس میں ہمیں زمین پر بھیجا ہے۔“ مثال پلکیں جھپکائے بغیر کسی معمولی طرح پاکستان پورو کر لیں گی اس قابل ترین خاتون پورو کر یت کے الفاظ سن رہی تھی۔ 22 گریڈ میں پہنچنے والی اس پہلی خاتون DMG آفیسر کے غفلتوں میں اسے جو پرکار و امان کی دھمتی تھی وہ میراث تھی، حاصل نہیں تھی..... وہ خیر دین کی نوا سی تھی اور اس کی گفتگو میں اب اتنی دہا ہیوں کے بعد خیر دین کے حوالے نہیں ہوتے تھے..... وہ خود بولنے لگا تھا۔

☆☆☆

”نانا مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے؟“ خیر وین اس وقت ابھی مغرب کی نماز سے فارغ ہی ہوا تھا جب عکس اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس نے ڈنکا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ خیر وین کو اس کی آمد کی توقع تھی اور اس سے اس جیلے کی بھی تسبیح لے کر لیتے ہوئے وہ مصلے سے اٹھ گیا اور اس صوفے پر جا کر بیٹھ گیا جس کے دوسرے کنارے پر چند لمبے پہلے وہ آکر بیٹھی تھی۔

”مجھے بھی تم سے بات کرنی تھی۔ اچھا ہوا تم خود آگئیں.....“ خیر دین نے مدح آمیز میں بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔  
 ”یہ ٹھیک نہیں ہے نا۔“ عکس نے تشہید نہیں باندھی تھی..... تشہیدوں کا وقت گزر چکا تھا۔

”کیا برائی ہے اس میں؟“ خیر دین نے جواباً محل سے پوچھا۔ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟“ عکس نے انہیں بتایا۔

”ہاں، تمہارے پاس مجھ سے بہتر جواب ہونے لگے ہیں اب۔“ انہوں نے مدھم شکراہٹ کے ساتھ اسے جیسے خراج تحسین نہیں پیش کیا تھا اپنی کمزوری کا اعتراف کیا تھا۔

”پر جو سوال اس بار آپ مجھ سے کر رہے ہیں اس کا کوئی جواب ہی نہیں ہے میرے پاس۔“ اس نے خیر دین کی ستائش کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”اس رشتے سے جو خرابی ہو سکتی ہے، آپ جانتے ہیں..... مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔“ وہ سنجیدہ تھی اور وہ ان چند مواقع میں سے ایک تھا جب وہ خیر دین سے بالکل متفق نہیں تھی۔ وہ ان کا فیصلہ بدلنے کی نیت سے آئی تھی۔

”بر فیعلے میں کچھ اچھائی اور کچھ برائی ہوتی ہے، برائی کا اندازہ اگر پہلے سے ہو جائے تو انسان اپنے آپ کو نقصان سے بھی بچا سکتا ہے اور تکلیف سے بھی۔“ خیر دین نے اس سے کہا۔

”آنکھوں دیکھی کبھی ننگے کے لیے جس حماقت انگیز دلیری کی ضرورت ہے وہ مجھ میں نہیں ہے۔“ عکس نے ان سے جواباً کہا۔

”میں صرف تمہاری خوشی چاہتا ہوں چڑیا..... زندگی میں آج تک تمہاری خوشی سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں رہی میرے لیے۔“ خیر دین نے اپنی لالچ کی جڑ نکال کر اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ وہ یہ نہیں بھی کہتا تو بھی عکس جانتی تھی۔

”شیر دل میری خواہش نہیں رہا تا نا..... اس سے شادی میری زندگی کے مقاصد یا حسرتوں میں کبھی شامل نہیں رہی۔“ اس نے مدھم آواز میں خیر دین سے کہا۔ اس آدمی کی منظر ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے کندھوں کے بوجھ کو بڑھانے لگی تھی۔

”لیکن تم اس کے لیے میرے سامنے روئیں۔“ اس نے نظریں اٹھا کر خیردین کے چہرے اور اس معصوم سے رنج کو اس

ماہنامہ پاکیزہ — دسمبر 2012ء 23

لکائی گئی۔ میرے کیریئر میں واحد معطلی بھی اسی گھر میں ہوئی۔“ عکس نے مسکراتے ہوئے مثال کو دیکھا۔ وہ اب ابھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”اب تم سوچ رہی ہو گی کہ نہیں، یہ گھر تو میرے لیے بہت Unlucky ثابت ہوا۔“ مثال کچھ بے بسی سے مسکرائی تھی۔ ”میں نے تم سے کہا ناں، گھروں میں کچھ نہیں ہوتا۔ انسان نے چوٹ کھا کے گرنا ہے یا تکلیف سہتے ہوئے بھی کھڑے رہتا ہے؟ یہ فیصلہ اس کی ہمت کرتی ہے، گھر نہیں۔“ عکس نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

”لیکن نمی اس گھر کے ملازم کہتے ہیں کہ یہاں انہوں نے بونے دیکھے ہیں، اور ہم نے بھی کچھ عجیب عجیب آوازیں اور چیزیں experience کی ہیں۔“ مثال کی بات یہ عکس مسکرا کی اور اس نے کہا۔

”میں بھی بچپن میں یہاں بہت عجیب چیزیں دیکھتی تھی۔“ مثال اس کے اس غیر متوقع جملے پر کچھ حیران ہوئی پھر اسی حیرانی سے کہا۔

”اوہ، ریلی مہی۔“ عکس مثال کو دیکھنے لگی۔

”ہاں۔“ پھر اس نے مدھم آواز میں کہا۔

”آپ نے بھی یہاں بونے دیکھے؟“ مثال نے بڑے تجسس سے پوچھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے عکس کی آنکھوں کے سامنے پتا نہیں کیا کچھ گزر کر چلا گیا تھا۔ وہ سارے Mental Block چند لمحوں کے لیے جیسے بالکل بیکار ہو کے رہ گئے تھے، جس سے اس نے اپنی زندگی کی اس سیاہ ترین رات کو چھپایا ہوا تھا۔

”آپ خاموش کیوں ہیں می؟“ مثال نے اسے خاموش دیکھ کے جیسے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی کوشش کی، عکس نے چونک کر اسے دیکھا۔

”بتائیں ناں، آپ نے کبھی اس گھر میں بونے دیکھے؟“

”ہاں۔“ عکس نے مدھم آواز میں کہا۔ مثالی یکدم excited ہوئی۔

”Oh my God..... آپ نے واقعی بونے دیکھے؟“ عکس نے سر ہلایا۔ اس نے اسی انداز میں عکس سے پوچھا۔  
”کتے بونے دیکھے؟“

”ایک“ عکس نے مدھم آواز میں کہا۔ مثال نے ایک بار پھر excited انداز میں کہا۔ ”wow! وہ تو دیکھنے میں کیسا تھا؟ آپ کو ڈر لگا اس سے؟ اس نے آپ سے کچھ کہا.....؟ کچھ کیا؟“ مثال نے جیسے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔

اتنے بہت سارے سوالوں کا جواب اور وہ بھی اس کے بچپن کے اس تکلیف دہ واقعے کے بارے میں جس کو سوچنا زخموں پر پاؤں رکھ کر گزرنے جیسا تھا۔

”آپ کو اس کی شکل یاد نہیں آ رہی؟“ مثال نے اسے خاموش دیکھ کر کُرکُریدا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھ کر مسکرا دی۔ وہ جیسے اسے سوال کا جواب نہ دینے کا موقع دے رہی تھی۔

”بعض چہرے انسان چاہے تو بھی نہیں بھول سکتا۔“ اس نے مدھم آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”وہ ہونا بہت خوب صورت تھا..... اچھی شکل صورت کا..... انسانی شکل صورت اور وجود..... بہت دراز قدر.....“

”مکی میں ”بونے“ کی بات کر رہی ہوں.....“ مثال نے عکس کو ٹوکا۔ مافوق الفطرت، خونخوار چیز..... آسیب ثانیہ کی۔“ اس نے عکس کو اپنے ذہن میں آنے والی ہر مثال دے کر سمجھانے کی کوشش کی۔ اسے لگا تھا کہ عکس بونے کے بارے میں بتاتے بتاتے کسی اور چیز کے بارے میں بتانے لگی تھی۔

”ہاں، بونے ہی کے بارے میں بتا رہی ہوں تمہیں..... خوفناک، مافوق الفطرت، آسب و اُیپ کی چیز.....“ عکس نے  
 اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”لیکن بونوں کے قد لمبے کیسے ہو سکتے ہیں؟“ مثال اس کے بیان سے الجھ گئی تھی۔

”بعض بونوں کے قد لمبے ہوتے ہیں، خوب صورت ہونے کے باوجود ان سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔ انسانی شکل

سورت میں ہونے کے باوجود ان سے خوف آتا ہے۔ مافوق الفطرت نہ ہونے کے باوجود ان سے خوف آتا ہے۔ مافوق الفطرت نہ ہونے کے باوجود وہ دوسروں کی زندگی کو آسیب زدہ کر دیتے ہیں۔ "مثال کو مک دم احساس ہوگا تھا عکس کا اشارہ کس

22 ماہنامہ پاکیزہ - دسمبر 2012ء

واقف ہوں..... جانتی ہوں کہ دوسری بار گھر بنا کر مرد اور عورت دونوں کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ وہ جو پہلا جیون ساتھی ہوتا ہے وہ اچھا ہو یا برا اگر وہ زندگی سے جاتا بھی نہیں..... ساری عمر مقابلوں اور موازنوں کا حصہ بنا رہتا ہے۔ ”وہ اب خیر دین کو اس دریا کی گہرائی اور اس کے اندر موجود خطرات و مشکلات کے بارے میں آگاہ کر رہی تھی۔ جس میں اس نے چڑیا کو سوچے سمجھے بغیر اتارا تھا۔

”میں جانتا ہوں چڑیا لیکن زندگی موازنوں اور مقابلوں کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں..... تمہیں لگتا ہے مرد یا عورت اپنے پہلے جیون ساتھی کا موازنہ کسی سے نہیں کرتے..... کرتے ہیں، پریشانی کی بات تب ہے جب ہم ان موازنوں میں بدتر ثابت ہونے لگیں اور ہوتے ہی رہیں..... تب تشویش بھی ہونی چاہیے اور تکلیف بھی لیکن اگر ہم اس موازنے کو اپنے حق میں کر لیں تب تو وہ تشویش کا باعث نہیں رہتا۔“ خیر دین اسے کہہ رہا تھا۔

”یہ آسان کام نہیں ہوتا نا..... یہ اتنا آسان کام نہیں ہے نا جتنا آپ کہہ رہے ہیں۔“ وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

”تم نے زندگی میں آسان کام کب کیے ہیں چڑیا.....؟ سارے امتحان مشکل آئے..... سارے کام مشکل ہی تھے جو تم نے کیے۔“ خیر دین نے عجیب فخر سے ہنس کر کہا۔

”ہاں لیکن کبھی گھبراہٹ انسان آسانیاں بھی چاہتا ہے۔“ اس نے کسی ننھے بچے کی طرح خیر دین سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”چڑیا تم جس مرد کی زندگی کا حصہ بنو گی وہ بڑا خوش قسمت ہوگا..... تم کہیں بھی کسی کے ساتھ بھی ایک اچھا گھر بنا سکتی ہو ایک اچھی زندگی گزار سکتی ہو..... کیونکہ تم اچھی لڑکی ہو اور شیر دل بھی اچھا لڑکا ہے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں یہ فیصلہ چاہتے ہوئے بھی نہ کر پاتا لیکن شیر دل تمہاری قدر کرے گا..... ویسی ہی قدر جیسی میں کرتا ہوں۔“ عکس کی آنکھوں میں آنسو جھلکے تھے۔

”آپ جیسی قدر میری کوئی نہیں کر سکتا۔ شیر دل بھی نہیں..... آپ جیسا تو کوئی نہیں اور کبھی نہیں ہو سکتا۔“ اس نے خیر دین کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں لیکن میری خواہش اور دعا ہے شیر دل مجھ سے بڑھ کے تمہاری قدر کرے اور کرے گا۔“ خیر دین نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

وہ اس دن عجیب بوجھ لیے خیر دین کے پاس سے آئی تھی۔ نانا اسے وہ کھلونا دے بیٹھے تھے جو اس کے لیے خطرناک تھا اور وہ اپنی محبت اور جوش میں اس بات کا اندازہ ہی نہیں کر سکے تھے۔ شیر دل سے ان حالات میں عکس کی شادی دونوں کو بڑی طرح اکیلندہ لگنے والی تھی۔ خاص طور پر تب، جب وہ ایک ہی ڈویژن میں کام کر رہے تھے اور دو قریبی شہروں میں پوسٹر رہے تھے۔ شیر دل اور شہر بانو کے درمیان ہونے والا جھگڑا ان کے تمام سوشل سرکل میں ہر ایک کی زبان پر تھا لیکن ابھی تک اس سارے جھگڑے میں کوئی شیر دل پر انگلی نہیں اٹھا سکا تھا لیکن اب چند مہینوں کے اندر ہی عکس کے ساتھ شادی کی صورت میں صرف شیر دل ہی نہیں بلکہ خود اس کی ساکھ اور نام بھی بری طرح خراب ہونے والا تھا اور الزامات و تبصروں کا یہ طوفان کتنا شدید ہو سکتا تھا۔ خیر دین کو اس کا اندازہ نہیں تھا، عکس کو اندازہ تھا۔ خیر دین کا فیصلہ اس کے لیے ایک بہت غلط اور خطرناک فیصلہ تھا اور اپنے کمرے میں آنے کے بعد وہ بیٹھی اس کے معزات کو ہی سوچتی رہی تھی۔ وہ اپنے لیے خود بھی وہ فیصلہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی جو خیر دین نے کر دیا تھا اور وہ خیر دین کو let down نہیں کر سکتی تھی اس کے آگے کتنا اور پیچھے کھائی آگئے تھے اور اسے اگر اس وقت کسی سے شکلی محسوس ہوئی تھی تو وہ شیر دل تھا۔ وہ اگر خیر دین کے پاس نہ آتا تو یہ مسئلہ کھڑا نہ ہوتا یا کم از کم وہ آنے سے پہلے اس سے بات کر لیتا تو وہ اسے وہ سب کچھ سمجھا اور دکھا پاتی جو وہ یقیناً کیڑی طرح آنکھیں بند کر کے نظر انداز کر رہا تھا۔

☆☆☆

”مجھے حیرت ہے عکس کا نانا اس رشتے پر کس طرح تیار ہو گیا؟“ منزہ نے عکس کے گھر نسبت طے کر کے واپس آنے کے بعد لاؤنج میں بیٹھ کر کہا۔ وہ اور بختیار ابھی کچھ دیر پہلے واپس آئے تھے اور شیر دل بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔

کی آنکھوں میں دیکھا جسے اس کے آنسوؤں نے خیر دین کے اندر پیدا کیا تھا۔ بہت دیر وہ خیر دین کے سامنے اسی دل شکستہ انداز میں کوئی ایک لفظ کہے بغیر بیٹھی رہی۔ کیا سمجھائے اور کیا نہ سمجھائے۔ کیا بتائے اور کیا نہ بتائے..... خیر دین کے ایک جملے نے جیسے اسے کچھ دیر کے لیے اس مرد کے سامنے گونگا کر دیا تھا جس نے اسے پالا تھا۔

”میرے رونے کو جانے دیں آپ..... وہ آنسو کی خواہش کا اظہار نہیں تھے.....“ اس نے بالآخر لفظوں کو ڈھونڈ لیا تھا بات شروع کرنے کے لیے۔

”میں نے تمہیں اس کے لیے جتنا پریشان دیکھا ہے اس سے پہلے صرف تب دیکھا تھا جب ایک یاد ہے تمہارا میڈیکل کالج والا کلاس فیلو.....“ عکس نے خیر دین کو بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

”اس کا ذکر رہنے ہی دیں۔ اس پریشانی اور اس پریشانی کا آپس میں کوئی تعلق نہیں..... میں پریشان ہوں شیر دل کے لیے اور اسے نظر انداز کرنا بھی میرے لیے مشکل ہے لیکن وہ ٹھیک ہو رہا ہے..... ٹھیک ہو جائے گا اور میری پریشانی بھی ختم ہو جائے گی۔“ اسے اندازہ تھا اس کی ساری باتیں جھوٹ کا پلندہ لگ رہی تھیں اس کے صبح کے باوجود.....

”میں نے شیر دل سے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔“ خیر دین نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ عکس نے عجیب حیرت سے... خیر دین کو دیکھا۔ وہ اس سے لمبی بات کرنا چاہتی تھی لیکن خیر دین جیسے اس سے اس معاملے پر بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ”میں بس یہ نہیں چاہتا چڑیا کہ میں زندگی میں کوئی پچھتاوا سمیٹوں صرف اپنی انا اور ضد کی وجہ سے اور مجھے لگا تمہاری شیر دل سے شادی سے انکار وہ واحد معاملہ ہو سکتا ہے میرے لیے پچھتاوے کا۔“ خیر دین کہہ رہا تھا۔ ”میں نہیں چاہتا کسی اور سے شادی کرنے کے بعد راتوں کو اس طرح سے بے چین پھر دو جس طرح تم آج کل پھر رہی ہو۔ اولاد کی خوشی کے سامنے انسان انا کا جھنڈا گاڑ کے تو نہیں بیٹھ سکتا..... بیٹھ جائے تو نقصان دونوں کا ہوتا ہے۔ میری بس اب یہی خواہش ہے کہ تم خیر خیریت سے اپنے گھریلو کی ہو جاؤ اور خوش رہو..... اور میں جانتا ہوں تم شیر دل کے ساتھ بہت خوش رہو گی..... وہ اچھا لڑکا ہے۔“ خیر دین صبح کے دانے گھماتا ہوا کہتا گیا تھا۔ عکس اسے صرف دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اس سے بحث کر کے اس کا فیصلہ تبدیل کر دینے آئی تھی مگر وہ اس سے بحث نہیں کر سکی۔

”شیر دل کے ماں، باپ بہت مشکور ہو کر گئے ہیں یہاں سے..... آج بھی ماضی میں ہونے والی اپنی تمام کوتاہیوں کے لیے معذرت کر کے گئے ہیں..... بہت وعدے دے کر گئے ہیں تمہارے لیے کہ تمہیں بہت خوش رکھیں گے۔ اپنے خاندان میں بہت عزت دیں گے..... اب اس طرح زبان دینے کے بعد میں اپنی زبان سے کیسے پھر جاؤں اور کہوں چڑیا نہیں مان رہی۔“ خیر دین نے کہا..... عجیب معصوم اور سادہ انداز تھا اس کا..... چڑیا کے لیے انکار کو ناممکن کر دیا تھا اس نے..... وہ کسی سے بھی شادی کا کہتا اس طرح تو وہ کر لیتی یہ تو پھر شیر دل تھا..... جس سے وہ محبت کرتی تھی۔

”تمہیں اب بھی اعتراض ہے؟“ خیر دین نے اس سے گفتگو کے آخر میں پوچھا۔

”نہیں، ٹھیک ہے اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو میں اعتراض کیسے کر سکتی ہوں۔“ اس نے خیر دین کو دم آواز میں جواب دیا۔

وہ کڑوی گولی خیر دین نے اس کے لیے نگلی تھی۔ اپنے کندھوں کا بوجھ اس کے لیے بڑھایا تھا ایک بار پھر اور اس احساس نے عکس کو سرائی کے قائل تک نہیں چھوڑا تھا۔ وہ تشکر یا احسان مندی نہیں تھی صرف شرمندگی تھی۔

”وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا، وہ کہہ کے گیا ہے۔“ خیر دین نے وعدے والے انداز میں بہت محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

”شیر دل آیا تھا؟“ عکس نے کچھ حیرانی سے خیر دین کو دیکھا۔

”نہیں آیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”بہت پریشان لگ رہا تھا وہ۔“ خیر دین کی آواز میں تنفر جھلکا تھا۔ ”اللہ کسی کو بھی اولاد کی پریشانی نہ دکھائے۔“ پتا نہیں اس نے کس کے لیے دعا کی تھی۔ شیر دل کے لیے..... یا اپنے لیے.....؟ ”گھر ٹوٹا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی..... پرندے کا گھونسلہ بھی ٹوٹ جائے تو وہ کتنے دن وہیں اڑتا..... گر لاتا ہے انسان کی تکلیف تو جانور کی تکلیف سے زیادہ ہوتی ہے۔“ وہ اب کہہ رہا تھا۔ ”تم اس کے ساتھ بہت اچھا گھر بنانا۔“ خیر دین جیسے اسے نصیحت کر رہا تھا۔

”بڑا مشکل کام دے رہے ہیں آپ مجھے نا۔“ وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ ”میں پرندہ نہیں ہوں اور میں یہ نہیں جانتی کہ پرندہ جب دوسری بار گھر بناتا ہے تو اس کے احساسات کیا ہوتے ہیں لیکن میں انسانوں کے جذبات اور احساسات سے ضرور

اسے جواباً کچھ نہیں کہا تھا۔ محسن کا ایک عجیب سا احساس تھا جو پہلے سے اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ خوشی کی کوئی رمت اسے کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہی تھی۔ وہ سجاد سے شادی کی تیاری میں بھی بہت زیادہ ایکساٹڈ نہیں تھی لیکن کم از کم اس کے ساتھ شادی ملے پانے نے اسے اس طرح کی کیفیت سے دو چار نہیں کیا تھا جس طرح کی کیفیت کا شکار وہ اب ہو رہی تھی۔

علیہ اب خیر دین کے ساتھ ساتھ اس سے بھی بری طرح خفا تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ خیر دین کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی خراب ہو گیا تھا کہ وہ خیر دین کو کچھ سمجھانے یا قائل کرنے کے بجائے اس کے کہنے پر ایک طلاق یافتہ ایک بچے کے باپ سے شادی پر تیار ہو گئی تھی اور وہ بھی اس خاندان میں جس نے ان کی زندگی میں تکلیف اور تباہی لانے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ دودن سے مسلسل خیر دین اور عکس کے ساتھ بحث و مباحثے میں مصروف تھی اور اب دودن کے بعد ان میں سے کسی کو بھی قائل کرنے میں ناکام ہونے کے بعد اس نے اپنی کوششوں کو بالآخر ترک کر دیا تھا لیکن اس کی خفگی اپنے عروج پر تھی۔ اسے اپنی سسرال میں شدید قسم کی خفگی اور تنقید کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس رشتے کے اس طرح اچانک بغیر کسی وجہ کے کارڈ زبانی کے بعد ختم کرنے پر..... اور وہ نہ صرف نام اور شرمندہ تھی بلکہ اس معاملے پر اس تنقید اور مخالفت کو بالکل جائز بھی سمجھ رہی تھی۔ خیر دین پر ایک دم پورے خاندان میں تنقید اور الزامات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی تھی۔ نہ صرف علیہ کے سسرالی رشتے دار بلکہ خیر دین کا اپنا خاندان بھی اس تنقید میں پیش پیش تھا۔

ان کے خاندان میں شادی کے کارڈ بھی تقسیم ہو جانے کے بعد کسی لڑکی کی شادی رک جانے کا یہ پہلا واقعہ ہوا تھا اور ہر ایک کے پاس کہنے اور اندازے لگانے کے لیے بہت کچھ تھا اور یہ ساری باتیں علیہ، خیر دین تک بھی پہنچا رہی تھی۔ وہ تنقید اور مخالفت کے اس طوفان کی توقع رکھنے کے باوجود کسی نہ کسی حد تک ان باتوں سے ہرٹ ہوا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا جب اسے کسی پر غصہ اور کسی سے رنج نہ ہو تھا۔ اپنے فیصلے پر پچھتے رہنے کے باوجود اسے احساس تھا کہ جو کچھ اس نے کیا تھا وہ غلط کیا تھا۔ سجاد کی فیملی کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی اس سارے معاملے میں اور خیر دین کو اگر کسی بات پر شدید رنج اور شرمندگی تھی تو وہ یہی ایک بات تھی..... ورنہ وہ اپنے خلاف جو کچھ سن رہا تھا اسے اس سب کی پروا نہیں تھی۔ اس کے لیے اتنا کافی تھا کہ وہ چڑیا کی ایک اور خواہش پوری کرنے جا رہا تھا۔ اسے وہ دے رہا تھا جو اس کے دل کی خواہش تھی۔

اور عکس اس سارے معاملے میں ایک خاموش تماشا کی طرح ماں اور نانا کے درمیان میں ہونے والی اس جنگ کو دیکھ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے علیہ اور خیر دین کے درمیان کوئی اختلاف دیکھا تھا اور وہ بھی اپنی وجہ سے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ خیر دین نے اس کی خوشی کی خاطر خود کو ہیرو سے ولن کر لیا تھا لیکن وہ خود اس سے کم از کم اس فیصلے پر متفق نہیں تھی اس کے باوجود علیہ کی حمایت بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ماں بھی جواسٹینڈ لے رہی تھی وہ اس کی محبت میں ہی لے رہی تھی۔

اور ان تمام خاندانی جنگوں کے درمیان اسے ایک لمحے کے لیے بھی شیردل کا خیال نہیں آیا تھا۔ نہ اس کا خیال آیا تھا نہ اس سے بات کرنے کی خواہش ہوئی تھی..... حالانکہ ہونی چاہیے تھی، خیال بھی آنا چاہیے تھا لیکن پتا نہیں شیردل ایک دم جیسے ایک اجنبی کی صورت میں اس کے سامنے آنے لگا تھا..... وہ کچھ دیر کے لیے جیسے اس کا بہترین دوست بھی نہیں رہا تھا۔ اس سے بات کرنا ضروری تھا لیکن موضوع صرف ایک رہ گیا تھا اور وہ صرف اسی ایک موضوع پر اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ زندگی میں کبھی اسے شیردل سے ایسی بیزاری نہیں ہوئی تھی جیسی ان چند دنوں میں ہوئی تھی۔

زندگی میں ہر انسان سے ہر فیصلہ صحیح نہیں ہو سکتا تھا بعض فیصلے انسان غصے اور جلد بازی میں کرتا ہے اور بعض جذبات میں مجبور ہو کر..... اور کہیں نہ کہیں عقل و ہوش کچھ دیر کے لیے انسان کا ساتھ ضرور چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی حماقت، عقل پر قبضہ ضرور کر لیتی ہے چاہے وہ چند لمحوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔

وہ آفس میں سارا دن بیٹھے دفتری کام انجام دیتے ہوئے خیر دین کے اس فیصلے سے ممکنہ نقصانات کے بارے میں سوچتی رہتی تھی اور damage control کے طریقے بھی..... نقصان تو ہوتا تھا لیکن کم سے کم کیسے کیا جاسکتا تھا ساکھ اور نام بہت بڑی چیزیں تھیں اور اب وہ دونوں چیزیں داؤ پر لگنے والی تھیں۔ شیردل مرد تھا بہت سی چیزیں اس کے لیے matter تھیں نہیں کرتی تھیں جس کے پیچھے بختیار شیردل کا خاندان تھا جہاں وہ خود نہج سکتا وہاں اس کا خاندان اسے بحالیت..... کوئی اس کے اسکیٹڈ لائز ہونے پر اس کے خاندان کے بارے میں سوال کرنے اور اٹھانے والا نہیں تھا۔ وہ ایک فرد کی غلطی تھی اور error of judgement (فیصلے کی غلطی) سمجھ کر معاف کر دی جاتی۔

”تمہیں وجہ جان کر کیا کرتا ہے؟“ بختیار نے ٹوک دیا تھا۔

”حیران ہوں بہت اس لیے پوچھ رہی ہوں۔“ منزہ نے کہا۔

”حالانکہ تمہیں حیران ہونے کے بجائے خوش ہونا چاہیے۔“ بختیار نے ان سے کہا۔

”اتنی خوش ہوں میں کہ مجھ سے بڑھ کر تو شاید آپ کا بیٹا بھی خوش نہیں ہے۔“ منزہ نے فوراً کہا۔ شیردل نے ماں کے اس تبصرے پر بے حد سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔

”پہلی شادی نہیں بنے میری..... نہ ہی بہت خوشگوار حالات میں ہو رہی ہے..... میں نہیں جانتا کوئی ایسی شادی پر کس طرح بہت خوش ہو سکتا ہے یا آپ سمجھتی ہیں میں انسانی صفات نہیں رکھتا۔“ وہ اتنا bitter (کڑا) نہیں بنایا جتنا ہو گیا تھا۔ منزہ نامدم سی ہو گئیں۔

”میں نے ویسے ہی ایک بات کہی ہے کوئی غلط معنی مت لو۔ تمہاری مرضی سے ہو رہا ہے جو بھی ہو رہا ہے کوئی زبردستی تو نہیں ہو رہی..... تم نے خود فیصلہ کیا ہے عکس سے شادی کا..... خود ہمیں اس کے گھر جانے کا کہا۔“ منزہ نے جیسے مدافعتانہ انداز میں کہا۔ وہ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے یک دم وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

”کیا ضرورت تھی تمہیں اس طرح ڈسکشن دوبارہ شروع کرنے کی.....؟ وہ اپنا گھر دوبارہ آباد کرنے پر تیار ہو گیا..... یہ کافی نہیں ہے کیا تمہارے لیے.....؟ یا یہ ضروری ہے کہ تم ایک بار پھر سے کیوں اور کیسے کے چکروں میں پڑو۔“ بختیار نے شیردل کے اس طرح وہاں سے اٹھ کر جاتے ہی بہت ناگواری اور خفگی سے منزہ کو تفریبا ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”اور اب عکس سے بھی کسی طرح کی کوئی بحث نہ کرنا، وہ ہمارے خاندان کا حصہ بننے جا رہی ہے، تمہاری کسی بات سے اس کی دل بھنی نہیں ہونی چاہیے ابھی..... نہ ان دونوں کی شادی کے بعد..... ان لوگوں کی اتنی favour بہت ہے کہ انہوں نے ماضی کو بنیاد بنا کر کسی اور تنازعے کو کھڑا کرنے کے بجائے ہماری بات مان لی۔ ہمارے divorced اور بچے والے بیٹے کے ساتھ وہ اپنی بیٹی کی شادی کرنے پر تیار ہو گئے..... ہمیں اس کے لیے ان کا شکر گزار ہونا چاہیے اور بس۔“ بختیار نے بھی جیسے بات ہی ختم کر دی تھی اور وہ بھی وہاں سے اٹھ گئے تھے۔

منزہ بہت دیر وہیں بے مقصد بیٹھی رہیں۔ شادی کا یہ سلسلہ انہوں نے شروع کیا تھا اور وہ خوش اور مطمئن بھی تھیں کہ شیردل کا گھر دوبارہ آباد ہو جائے گا لیکن اس احساس کے باوجود عکس مراد علی سے انہیں عجیب سے خدشات تھے اور وہ ان خدشات کو کوئی نام نہیں دے پا رہی تھیں۔ کوئی دوسرا کوشش کرتا تو یہ کام بڑی آسانی سے کر لیتا..... وہ گلست خوردگی کے احساس سے دو چار ہو رہی تھیں یا آسان لفظوں میں انہیں اپنا تھوکا چاٹنا پڑ رہا تھا۔ حسب نسب کی وہ اونچی دیواریں جنہیں اپنے گرد کھڑا کر کے وہ فخر محسوس کرتی تھیں ان پر بہت بری طرح چوٹ پڑی تھی..... ایسی زوردار چوٹ کہ ان دیواروں میں آجانے والی دراڑیں زمین تک پہنچ گئی تھیں۔

انسان تقدیر کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔ اپنی تقدیر کے سامنے بھی اور دوسرے کی تقدیر کے سامنے بھی..... وہ نہ اپنی..... جیتتی کو خوش قسمتی میں بدل سکتا ہے نہ دوسرے کی خوش قسمتی کو بد قسمتی میں..... اور نہ ہی اس بے بسی کے احساس کو ختم کر سکتا ہے جو اسے اس صورت حال میں ہوتا ہے۔

☆☆☆

”شیردل سے بات ہوئی تمہاری؟“ نانا نے دودن بعد صبح ناشتے کے بعد پورچ میں اسے آفس کے لیے رخصت کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

”نہیں نانا.....“ وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی پھر اس نے خیر دین کو جواب دیا۔ ”لیکن میں کرلوں گی، ابھی مصروف ہوں۔“ اس نے خیر دین کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی وضاحت اور جواب دیا تھا۔

”اس کا مجھے فون آیا تھا کل..... تمہارا پوچھ رہا تھا۔“ خیر دین نے اسے بتایا اس نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ اسے اگر واقعی عکس سے بات کرنی ہوتی تو خیر دین کے فون پر کال کر کے اس کا پوچھنے کے بجائے سیدھا سیدھا وہ اس کے فون پر کال کر سکتا تھا مگر وہ بھی اس سے بات کرنے میں متائل تھا، وہ محسوس کر سکتی تھی۔

”میں اس سے ایک دودن میں بات کرلوں گی۔“ عکس نے گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے خیر دین سے کہا۔ خیر دین نے

شیردل اس وقت نہا کر نکلا تھا اور ابھی اپنے بیڈروم میں آیا ہی تھا جب اس کا سٹل فون بجنے لگا تھا۔ caller ID نظر نہیں آ رہی تھی یعنی کار کسی سرکاری نمبر سے کال کر رہا تھا اس نے تو لیا کرسی پر رکھتے ہوئے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف عکس کے آفس کا آپریٹر تھا جس نے اسے ایمر جنسی کی اطلاع دیتے ہوئے فوری طور پر عکس سے connect کیا تھا۔ وہ بھی کچھ تشویش میں جھلا ہو گیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اتنی صبح، صبح کیا ایمر جنسی آگئی تھی۔

”تم نے کسی سینٹری ورکر کو معطل کیا تھا؟“ عکس نے اس کی آواز سنتے ہی علیک سلیک اور تمہید کے بغیر پوچھا۔

”ہاں.....“

”شاید..... کیوں، کیا ہوا؟“ شیردل کو فوری طور پر کوئی معطلی یاد نہیں آئی لیکن اس نے انکار بھی نہیں کیا تھا۔

”وہ میرے آفس کی چھت پر چڑھا ہوا ہے اور خودکشی کی دھمکی دے رہا ہے۔“ عکس نے جوابا کہا۔ ”شیردل نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔

”الو کا بچھا..... جبک صبح.....“ اسے نہ صرف وہ سینٹری ورکر یاد آ گیا تھا بلکہ اس کا نام بھی.....

”جبک صبح نام ہے..... اوکے..... کیا کیس تھا اس کا؟“ عکس کے لہجے میں غلٹ تھی۔

”کیا کیس ہوتا ہے؟ دو دفعہ کوڑے کے ڈرم اکھاڑ کر لے جاتے ہوئے پکڑا گیا، میں نے وارننگ دے کر چھوڑ دیا، تیسری بار میرے آفس کے ہاتھروم میں فننگ کے لیے آیا ہوا کچھ سامان غائب کر دیا اس نے..... انکواری میں اس پر الزام ثابت ہو گیا تو بھی میں نے معطل نہیں کیا اسے..... pay ضبط کی اس کی۔“ شیردل اسے کچھ غلطی کے عالم میں بتا رہا تھا۔

”لیکن سب تو کہہ رہے ہیں وہ suspend (معطل) ہونے کی وجہ سے یہ سب کر رہا ہے۔“ عکس نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”suspend (معطل) میں نے اسے ڈی سی آفس کی چھت پر چڑھ کر خودکشی کی دھمکی دینے پر کیا تھا۔ pay کاٹے جانے پر چھت پر چڑھ گیا تھا اور پتا نہیں کہاں سے تقریر لکھوا کر لایا تھا۔ کوئی دس منٹوں کی، وہ پڑھنا شروع کر دی تھی۔“

شیردل نے بتایا۔ ”تو میں نے اس جرم میں suspend (معطل) کیا تھا اسے۔“

”اب بھی یہی کر رہا ہے وہ..... لیکن زبانی کر رہا ہے تقریر۔“ وہ صورت حال معطلہ خیز تھی لیکن اب گلے لگی تھی۔

”تم کیا کر رہی ہو؟“ شیردل نے جوابا پوچھا۔

”میں نے فائر بریگیڈ والوں کو بلایا ہے، سیڑھی اور نیٹ لانے کے لیے..... ایسیو لنس کو بھی بلوایا ہے۔ میرا اسسٹنٹ کمشنر میگا فون پر اس سے دروازہ کھولنے اور نیچے آ جانے کے لیے کہہ رہا ہے اور اب میں سوچ رہی ہوں کہ اس کی suspension (معطل) ختم کر دوں کہ وہ نیچے تو آئے..... ابھی کوئی میڈیا ٹیم یہاں آگئی تو اور مسئلہ ہو جائے گا..... تم نے کیا کیا تھا جب وہ اس طرح چھت پر چڑھ گیا تھا۔“ عکس نے تشویش کے عالم میں تفصیلات بتاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”میں نے اسے کہا تھا کہ کوڈ جاؤ اور اگر پھر بھی بچ گئے تو میں تمہیں suspend (معطل) کروں گا کم از کم ایک سال کے لیے اور پھر میں اندر چلا گیا تھا۔“ عکس کو لگا وہ مذاق کر رہا ہے۔

”تم بکواس کر رہے ہو۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔ ”یہاں مجھے معصیت پڑی ہوئی ہے تمہاری وجہ سے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی خفا ہوئی تھی۔

”میں نے وہی کہا تھا جو میں نے تمہیں بتایا ہے۔ جو تم کر رہی ہو اس کے بعد تو وہ سارا دن چھت پر بیٹھا ہے گا اور نیچے کراؤ بڑھتا چلا جائے گا اور میڈیا والوں کو دیر نہیں لگے گی وہاں پہنچنے میں۔“ شیردل نے سنجیدگی سے اس سے کہا۔

”تم نے اسے کہا کہ کوڈ جاؤ اور وہ نیچے آ گیا؟“ عکس کو اب بھی یقین نہیں آیا۔

”ہاں..... پندرہ منٹ میں نیچے آ گیا تھا، اس کے بعد میں نے اسے دو دن تھانے میں رکھوایا پھر suspend کر کے گھر بھجوا دیا۔ تمہاری طرح اسے چھت پر چڑھ کر تماشا کی اکٹے نہیں کرنے دیے..... تم عورتوں نے شہر سنبھالنا ہے.....؟ ایک جبک صبح تو کنٹرول ہوتا نہیں تم سے۔“ شیردل کے آخری جملے میں موجودہ نظر کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ پہلا موقع نہیں تھا جب وہ اس طرح شہر شاد و نرم دکھا رہا تھا۔

عکس مراد علی عورت تھی، سیلف میڈ تھی اور ایک کٹر خاندان سے تعلق رکھتی تھی اس کی غلطی پر اس کے بجائے اس کے خاندان کے بارے میں سوال جواب اور تبصرے ہوتے..... اپنے کیریئر کے اتنے سالوں میں بھی اس کا کوئی اسکینڈل نہیں آیا تھا اور اس ایک اسکینڈل کے بعد ڈاکٹر عکس مراد علی کا نام جہاں بھی آتا اسی حوالے سے آتا۔ وہ عزت اور احترام جس کے ساتھ سب اس کا نام لیتے تھے وہ تفحیک آمیز لہجے اور تبصروں میں تبدیل ہونے والی تھی اور یہ بہت بڑی قیمت تھی جو اسے شیردل کے ساتھ کے بدلے میں ادا کرتی تھی..... خیر دین نے جذبات میں یہ نہیں سوچا تھا اس نے صرف ایک نانا بن کر اپنی نواسی کی خوشی کا سوچا تھا لیکن نواسی یہ سب سوچ رہی تھی کیونکہ وہ عورت ہوتے ہوئے بھی جذباتی نہیں رہی تھی۔ جذبات سے فیملے وہ پہلے بھی کم ہی کرتی تھی لیکن اس پرویشن میں آنے کے بعد اس نے جذبات کو سائیکلڈ دے کر سلا دیا تھا۔ وہ اب چاہتی بھی تو جذبات کو معطل پر ترجیح نہیں دے سکتی تھی اور اب اسے یہی کرنا پڑ رہا تھا..... خیر دین کی محبت میں آنکھوں دیکھی وہ بھی لگتا بڑھ رہی تھی جس سے اسے کم از کم بدھنسی تو ضرور ہوتی اگر کوئی بڑی بیماری نہ بھی ہوتی تو..... وہ اس دن بھی اسی کش مکش میں جنسی آفس پہنچی تھی جب بی بربیک کے دوران اسے آفس کے باہر شور کی آواز آئی تھی اس نے انٹرکام اٹھا کر PA کو اس شور کی وجہ معلوم کرنے کو کہا، وہ پانچ دس منٹوں کے بعد بے حد بوکھلایا ہوا آفس میں آیا تھا۔

”میڈم وہ ایک آدمی خودکشی کرنے کے لیے آپ کے آفس کی چھت پر چڑھ گیا ہے اس نے چھت کا دروازہ اندر سے بند کر لیا ہے اور اب وہ کہہ رہا ہے کہ وہ وہاں سے کوڈ کر جان وے دے گا۔“ عکس کو چند لمحوں کے لیے جیسے بات کی سمجھ نہیں آئی تھی اور جب سمجھ میں آئی تو وہ بہت panicked ہو کر فوری طور پر آفس سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کے آفس کے ارد گرد موجود جگہ میں اب ایک مجمع تھا جو چھت پر موجود کسی آدمی سے بڑا آواز بلند بات چیت کرنے میں مصروف تھا۔ اسے آتے دیکھ کر اس کا اپنا اشاف اور گارڈ بھی پہنچ گئے تھے۔ باہر موجود لوگوں کے جھوم کو انہوں نے ہٹانا شروع کر دیا تھا جو زیادہ تر ان افراد پر مشتمل تھا جو DC آفس اور اس کے آس پاس موجود دوسرے انتظامی عہدے داران کے آفسز میں اپنے کاموں کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے یا پھر درجہ چہارم کے ملازمین جو ان دفاتروں میں کام کرتے تھے اور انہیں صبح صبح ہی سسٹنی خیر تفریح میر آگئی تھی۔

وہ آفس سے برآمدے اور برآمدے سے باہر نکل آئی تھی..... دو منزلہ عمارت کی چھت پر اس وقت ایک آدمی موجود تھا جو چھت کے بالکل برے پر تھا۔ صرف عکس نے اس آدمی کو نہیں دیکھا تھا، اس آدمی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور وہ چلا چلا کر کچھ کہنے لگا تھا جو شاید اسے سمجھ میں آ جاتا اگر نیچے کھڑا مجمع بھی بھانت بھانت کی بولیاں نہ بول رہا ہوتا۔

”میڈم کوئی سینٹری ورکر ہے پہلے بھی ایک بار اسی طرح اوپر چڑھ گیا تھا بڑی مشکل سے اتارا تھا اسے۔ پچھلے ڈی سی صاحب نے معطل کیا ہوا ہے اسے اور کئی مہینوں سے اس کی pay بھی رکی ہوئی ہے۔“ اس کے اسٹنٹ کمشنر نے اسے دیکھتے ہی ہٹانا شروع کر دیا تھا، وہ اس کے پیچھے سے پہلے ہی وہاں موجود تھا اور صورت حال کے بارے میں معلومات اور اس آدمی کے کوائف حاصل کر چکا تھا۔

”میگا فون پر اسے بتاؤ کہ وہ نیچے اترے اور آکر بات کرے..... اس کے دونوں مسئلے حل ہو جائیں گے لیکن اس طرح نہیں۔“ اس نے ایک نظر اس مجمع پر ڈالی جس میں سے اب آدھے اس کی طرف متوجہ تھے اور آدھے اس آدمی کی طرف جو چھت پر چڑھا ہوا تھا۔

عکس اسٹنٹ کمشنر کو ہدایات دے کر وہاں رکی نہیں تھی۔ یہ جیسے اپنے آپ کو تماشا بنانے والی بات تھی۔ چھت پر چڑھا ہوا آدمی اسے اپنے اشاف کے ساتھ وہاں سے غائب ہوتے دیکھ کر جیسے مزید جوش میں آ گیا تھا۔ اس نے کچھ اور بلند آواز میں وہ تقریر جاری رکھی جو وہ اس سسٹم اور اسے چلانے والے آفیسروں کے خلاف کر رہا تھا جو سب حکومت کے آلہ کار بن کر غریبوں کا خون چوس رہے تھے اور ان پر ظلم کر رہے تھے۔

عکس کے لیے یہ صورت حال سنگین ہونے سے زیادہ معطلہ خیز تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ کسی خاتون آفیسر کے ساتھ اس طرح کی صورت حال پیش آنے پر اس کی انتظامی ملا جلیوں پر سوالات اٹھنے کے ساتھ ساتھ اس پر پھپھیاں کسنے کا بھی ایک اچھا موقع ہاتھ میں آ جاتا ہے اور جو یقیناً آ گیا تھا۔

☆☆☆

انوالو کر کے تم نے شیردل اور ہماری فیملی کو سوشل اور پروفیشنل سرکلو میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ شیردل نروس بریک ڈاؤن کی وجہ سے مرتے مرتے بچا ہے..... کوئی چھوٹا mess تو create نہیں کیا تم نے ہمارے لیے۔“ شہر بانو کو عجیب سا اضطراب ہوا۔

”نروس بریک ڈاؤن.....“ شیردل اتنا کمزور تو نہیں تھا یا شاید اس نے اسے ضرورت سے زیادہ مضبوط سمجھ لیا تھا۔

”اب وہ ٹھیک ہے؟“ اس نے ایک دم منزہ کو نوک کر پوچھا۔

”ہاں ٹھیک ہے لیکن جو مہینے میں نے اسے سنبھالتے گزارے ہیں، وہ میں ہی جانتی ہوں اور خدا نہ کرے کسی ماں کو اپنی اولاد کو اس طرح تکلیف میں دیکھنا پڑے۔“

”میں نے جو بھی کیا میں اس کے لیے بہت شرمندہ ہوں اور مجھے افسوس ہے۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں مجھے اتنی جلد بازی میں اتنے بڑے بڑے فیصلے نہیں کرنے چاہیے تھے لیکن بس غصے میں بعض دفعہ انسان کو کچھ سمجھ نہیں آتا۔“ شہر بانو نے جیسے کچھ بے بس انداز میں اعتراف برداشت کیا تھا۔ اسے کم از کم اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں تھی کہ اس نے شیردل کو ہر طرح سے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اس بات کی پروا نہیں کی تھی کہ وہ جس طرح اس کا گھر چھوڑ کر جا رہی ہے اس سے شیردل کو لوگوں کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے گا اور اب جب وہ اپنے لاسے ہوئے طوفان کے گزر جانے کے بعد ہونے والی تباہی دیکھ رہی تھی تو وہ پہلی بار ندامت کا شکار ہو رہی تھی۔ وہ چیختا زخم جس پر اس نے اتنا بڑا طوفان اٹھایا تھا اب اتنی infuriating (طیش میں لانے والی بات) نہیں لگ رہی تھی بلکہ بچکانہ لگ رہی تھی۔

”اچھی بات ہے تم شرمندہ ہو لیکن اب کچھ ہو نہیں سکتا۔ شیردل کی شادی طے کر دی ہے میں نے..... اگلے مہینے ایک سادہ سی تقریب میں نکاح ہے اس کا۔“ شہر بانو کو توقع ہوئی چاہیے تھی کہ اگر وہ move on کر رہی تھی تو یہ کام شیردل بھی کر سکتا تھا..... وہ اس کی زندگی سے نکل رہی تھی تو وہ اس جگہ کو کسی دوسری عورت سے پر کر دیتا..... وہ پھر بھی چند سینکڑوں کے لیے جیسے سانس لینا ہی بھول گئی تھی۔ شیردل اپنی زندگی میں کسی اور عورت کو لا رہا تھا۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا۔ عجیب بچکانہ جذباتیت کا شکار ہوئی تھی وہ..... شیردل وہ کھلوتا تھا جسے اس نے پھینک دیا تھا لیکن اب (محض خیال ہی میں) کسی دوسرے کو اس کھلونے سے کھیلتے ہوئے دیکھ کر اسے ایک دم وہی کھلونا اچھا لگنے لگا تھا..... وہی کھلونا چاہیے تھا۔ منزہ نے دانستہ اس کے سامنے یہ انکشاف کرتے ہوئے عکس کا نام نہیں لیا تھا اور شاید زندگی میں پہلی بار عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔

”میں پھر بھی یہ کہوں گی کہ تم شیردل کو فون کرو..... اس سے بات کرو..... اگر کوئی ایسا حل نکل آتا ہے کہ تم اور وہ دونوں اکٹھے رہ سکو تو یہ مثال کے لیے بہت اچھا ہے لیکن ایسا کوئی حل شیردل ہی نکال سکتا ہے، میں کچھ نہیں کر سکتی..... تم پاکستان آ جاؤ تو شاید یہ مسئلہ جلد اور زیادہ بہتر طریقے سے حل ہو جائے..... شیردل، مثال کو دیکھے گا تو اس کا دل بھی نرم پڑے گا۔“ منزہ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی امیدیں دلا رہی تھیں اور لاشعوری طور پر جیسے وہ، وہ کہنا شروع ہو گئی تھیں جو وہ چاہتی تھیں۔ ایک سانس میں شیردل کی شادی کی اطلاع اور دوسری سانس میں یہ دہی ہوئی خواہش کہ ایسا نہ ہو..... اور شیردل، شہر بانو کی طرف لوٹ جائے اور اس لاشعوری سوچ کے پس منظر میں عکس کے حوالے سے ان کی ازلی ناپسندیدگی کا رفرما تھی۔ اگر ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنا لینے کا کوئی عملی مظاہرہ کرنا ہوتا تو منزہ وہ بلا مقابلہ جیت جاتیں۔ شہر بانو پر انہیں غصہ تھا، خفگی تھی..... شرمین سے انہیں نفرت تھی لیکن اس کے باوجود شہر بانو ان کے خاندان کا حصہ تھی..... ان جیسا حسب نسب رکھنے والی..... ان کا اپنا خون..... عکس ساری زندگی ان کے لیے احساس شکست کے سوا کچھ نہیں رہتی..... انہوں نے شیردل کی زندگی کی خاطر اس کے سامنے جھکنا قبول کیا تھا اور اب اگر انہیں دوبارہ اس کے سامنے کھڑا ہونے کا موقع مل رہا تھا تو وہ ہر قیمت پر اس موقع کو استعمال کرنا چاہتی تھیں۔

”شیردل کس سے شادی کر رہا ہے؟“ وہ جواب جو انہوں نے خود شہر بانو کو دینے سے گریز کیا تھا وہ اس نے خود پوچھ لیا تھا۔

☆☆☆

”تم شیردل سے شادی کر رہی ہو؟“ عکس کو فنی کے غیر متوقع سوال پر کرنٹ لگا۔ اس نے کچھ دیر پہلے ہی فون کیا تھا اور دو چار ادھر ادھر کی باتوں کے فوراً بعد اس نے عکس سے ایک دم یہ سوال کر دیا تھا۔

”یعنی میں اسے کہہ دوں کہ وہ کوڈ جائے تو وہ نیچے اتر آئے گا؟“ عکس نے جیسے اس سے یقین دہانی چاہی تھی۔

”ہاں..... لیکن اس سے پہلے نیچے موجود اس سارے کراؤڈ کو ہٹا دو وہاں سے۔“ شیردل نے کہا اور چند اور جملے کہہ کر عکس نے فون بند کر دیا۔ فون بند ہونے کے بعد بھی شیردل مسلسل اسی صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ تقریباً بیس منٹ بعد اس نے کچھ اضطراب اور تجسس کے عالم میں updates لینے کے لیے عکس کو دوبارہ فون کیا تھا۔ چند لمحے فون بچتا رہا لیکن اس نے کال ریسیو نہیں کی اس سے پہلے کہ وہ ایک بار پھر نمبر ٹرائی کرتا اسے عکس کا ٹیکسٹ آرہا تھا اور ٹیکسٹ پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔

”مدد کا شکریہ..... جیکب کو دیا۔“

☆☆☆

منزہ کو شہر بانو کی آواز سن کر جتنا شاک لگا تھا اتنا ہی شاک انہیں اس کا وہ جملہ سن کر لگا تھا جو اس نے ابتدائی رسمی جملوں کے بعد یکدم منزہ سے کہا تھا۔

”میں شیردل سے reconciliation مصالحت چاہتی ہوں، واپس آنا چاہتی ہوں۔“ منزہ کچھ دیر کے لیے جیسے کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں رہی تھیں۔ وہ اتنے مہینوں سے ان سے بات کرنے پر تیار نہیں تھی۔ مثال کی آواز تک انہیں سنانے کو تیار نہیں تھی..... اور اب طلاق کا اپنا حق استعمال کر لینے کے بعد وہ شیردل سے مصالحت چاہتی تھی۔ آخر بیٹھے بٹھائے ایسا کیا ہو گیا تھا کہ داؤد کے ساتھ شادی کرنے کے بجائے وہ واپس شیردل کی طرف آنا چاہتی تھی۔ وہ طلاق کا تقویض شدہ حق استعمال کرنے کے بعد اگر واپس شیردل کے ساتھ مصالحت کرنا چاہتی تو کر سکتی تھی کیونکہ ان کے درمیان طلاق کی تقویض شدہ طلاق کے ساتھ ہوئی تھی اور وہ بھی ایک طلاق کے ساتھ..... مرد کی طرف سے تین بار دے دی جانے والی تین طلاقیوں کے ساتھ نہیں۔ شہر بانو چاہتی تو اس طلاق کو واپس لے کر حلالہ کے بغیر شیردل کے ساتھ دوبارہ صرف نکاح کر کے رہ سکتی تھی اور ان دونوں کی طلاق ہو جانے کے بعد بھی منزہ کچھ عرصہ یہ کوشش کرتی رہی تھیں کہ شہر بانو اس طلاق کو واپس لے لے اور شیردل کے ساتھ مصالحت کر لے۔ یہ صرف شرمین کا اعلان تھا کہ وہ داؤد کے ساتھ شہر بانو کی شادی کرنے والی تھیں۔ جس کے بعد منزہ نے مصالحت کی کوششوں کو بالآخر بے حد مایوسی کے عالم میں ترک کر دیا تھا۔

اور اب اتنے مہینوں کے بعد جب وہ عکس اور شیردل کی شادی طے کر آئی تھیں تو شہر بانو ایک بار پھر ان کے خاندان میں لوٹنے پر تیار ہو گئی تھی اور اس کی آفر نے منزہ کو یک دم بہت مشکل میں ڈال دیا تھا۔

”شرمین نے بتایا تھا کہ تم داؤد کے ساتھ شادی کرنے والی تھیں؟“ منزہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

”اب نہیں کر رہی۔“ اس نے جواباً کہا۔ منزہ کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ اس سے مزید کیا کہیں۔ شہباز حسین کی اکلوتی اولاد اور نشانی ہونے کی وجہ سے شہر بانو انہیں ہمیشہ عزیز تھی۔ شیردل کے ساتھ اس کی شادی پر وہ اس سے زیادہ وہ خوش تھیں اور ان دونوں کے درمیان ہمیشہ سے بہت (قربت) closeness رہی تھی۔ شہر بانو ایک بار پاکستان آ جانے کے بعد شرمین کے بجائے منزہ پر زیادہ rely (انحصار) کرنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مصالحت کا فیصلہ کرنے کے بعد شیردل کو فون کرنے کے بجائے اس نے منزہ کو فون کیا تھا۔

”تمہیں میں نے کتنا سمجھانے کی کوشش کی تھی، کتنا منع کیا تھا کہ چلو ناراضی ٹھیک ہے، میاں بیوی میں ہو جاتی ہے تم کچھ وقت گزرنے دو لیکن اتنا بڑا قدم نہ اٹھاؤ..... تم نے میری کسی بات کی پروا نہیں کی۔ شرمین کی طرح سوچے سمجھے بغیر جودل میں آیا کرتی چلی گئیں۔ اس نے بھی شہباز سے اختلافات کے بعد اپنا ابارش کر دیا تھا۔ divorce تو چلو جو ہوتی تھی ہوئی لیکن اس بچے کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ تم نے بھی یہی کیا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ شیردل مثال کے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ اس سے بڑی طرح انجھڑ ہے تم بیٹی کو لے گئیں اور وہ بھی اس طرح کہ تم نے نہ ہمیں، نہ شیردل کو اس سے ملنے دیا، شکل تک دیکھنے کے لیے ترس دیا تم نے۔“ شہر بانو خاموشی سے منزہ کے جھگے شکوے سنتی رہی اسے اندازہ تھا کہ یہ ساری گفتگو اور باتیں اسے سنی پڑیں گی۔ بعض دفعہ ہم کسی کی ایک بات سننے پر تیار نہیں ہوتے اور پھر ہمیں زندگی کبھی اتنا مجبور کر دیتی ہے کہ ہم اسی شخص کی ہزار باتیں سننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

”تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہاری اس جذباتیت سے شیردل کی زندگی کس طرح متاثر ہوگی امریکن ایسیسی کو اس طرح



”تو کیا فرق پڑتا ہے؟ تمہیں کیا لگتا ہے کہ انو ہیں صرف تب پہلٹی ہیں جب واقعی کچھ ہو رہا ہو؟ ایسا نہیں ہے۔ کوئی بات نہ ہو تب بھی بہت باتیں کی جاسکتی ہیں اور بہت باتیں بنائی جاسکتی ہیں۔ یہ انسانوں کی پسندیدہ activity ہے۔ ویسے بھی جو قوم جتنی فارغ ہو، اس کے پاس بات کرنے کے لیے اتنا ہی زیادہ فالتو وقت ہوتا ہے تمہیں پروا کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔“ غنی نے بے پروائی سے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”تم مجھے سپورٹ کیوں کر رہے ہو؟ اس مسئلے پر؟“ عکس تھوڑا سا مسکرائی۔  
 ”تمہیں، غلط فہمی بالکل نہیں ہونی چاہیے کہ میں تمہیں سپورٹ کر رہا ہوں۔ تم نے کون سا مجھ سے پوچھ کے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ تم تو سب کچھ مجھ سے اس طرح چھپائے ہوئے تھیں جیسے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں چلے گا لیکن دیکھ لو، میں جانتا ہوں اور بہت دیر سے جانتا ہوں۔“

”تم جانتے ہو، تو اور لوگ بھی جانتے ہوں گے، ہمارے batch mates میں سے؟“ عکس نے اس کی بات غور سے سننے ہوئے اس سے کہا۔

”یقیناً جانتے ہوں گے تو کیا ہوا؟ تم خائف کیوں ہو اس بات سے؟“ غنی ایک لمحے کے لیے رکا، پھر اس نے کہا۔  
 ”خائف ہونے والی بات ہے، اس لیے خائف ہوں۔“ اس کی بات سن کر عکس نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

”تم سول سروس میں جس سے بھی شادی کرتیں، تمہارے بارے میں کچھ نہ کچھ انو ہیں جتنی۔ کہیں باہر کرتیں تو شاید بیچ جائیں۔ اب شیردل کے ساتھ کر رہی ہو تو بھی تھوڑی بہت باتیں تو ضرور ہوں گی۔ ہم فرشتے نہیں ہیں، جن کے بارے میں لوگ بات نہ کریں اور اگر کریں تو ہمیشہ اچھی بات ہی کریں۔ شیردل کی شادی ختم ہونے کی جو بھی وجوہات ہوں لیکن وہ ختم ہوگئی ہے۔ اس لیے تم شہر بانو اور شیردل کے بریک اپ کو اپنے اعصاب پر سوار کیے بغیر اس رشتے کو شروع کرو۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے اسے نادانستگی میں بہت ساری ایسی چیزیں سمجھا گیا تھا جو عکس کو کسی دوسرے سے کبھی نہ آتیں۔

”تمہیں شادی کی خبر کس نے دی ہے؟“ عکس نے پوچھا۔  
 ”شیردل نے ایک دو batch mates سے ڈک کیلے کل۔ مجھے انہی میں سے ایک سے پتا چلا تو میں نے ٹپ کے تمہیں فون کیا۔ آخر تم میرے ساتھ بے وفائی کیسے کر سکتی ہو؟“

”اس طرح کی باتیں کسی دوسرے کے سامنے کی ناں تم نے تو شیردل تک بھی پہنچیں گی۔ اس کے بعد تم خود اندازہ لگا سکتے ہو، کہ وہ کیا کرے گا تمہارے ساتھ۔“ وہ اس کے آخری جملے پر غصے سے بڑی تھی۔

”میں اپنے جذبات کا اظہار بھی نہیں کر سکتا کیا؟ اور شیردل کی دھمکیاں دینا بند کرو۔“ غنی نے مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

”تم اپنے جذبات کا اظہار اپنی بیوی سے جا کے کیا کرو یا پھر میں خود تانیہ کو فون کر کے تمہارے جذبات پہنچاؤں اس تک؟“ عکس نے جوابا کہا۔

”تم اب مجھے میری بیوی سے جوتے پڑانا چاہتی ہو۔ اسے پہلے ہی تم سے شدید قسم کی insecurity ہے۔“ غنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس insecurity کی وجہ تم خود ہو اور دوس دفعہ تو تمہاری بیوی خود مجھ سے کہہ چکی ہے کہ میں بڑی سمجھدار اور خوش قسمت تھی کہ غنی کی کوشش کے باوجود اس سے شادی نہیں کی۔ کاش وہ بھی ایسی عقل مند کی کامظاہرہ وقت پر کر دیتی۔“ غنی نے اس کی بات سے ذرہ برابر بھی متاثر ہوئے بغیر کہا۔

”وہ ہر اس لڑکی سے ایسی ہی باتیں کرتی رہتی ہے جس کے بارے میں اسے تھوڑا سا بھی یہ شک ہو کہ میں کبھی اس کو پسند کرتا تھا۔ عورتوں کی عادت ہوتی ہے ایک دوسرے کے سامنے اس طرح کی باتیں کرنے کی۔“

”تانیہ کے سامنے تمہاری بولتی بند ہو جاتی ہے یہ مثالیں اس کے سامنے بھی نہیں سنیں تمہارے منہ سے۔“ عکس نے اسے tease کیا تھا۔

”میں بے وقوف نہیں ہوں صرف شوہر ہوں۔“ غنی نے مسکراتے ہوئے کہا ساتھ ہی اس سے پوچھا۔ ”اس کی فیملی تمہیں قبول کر لے گی؟“

”تم سے کس نے کہا؟“ وہ جواب دینے سے ہچکچائی تھی۔ پی اسے اس کی فیملی پر اس کے دستخط لینے کے لیے کچھ کاغذ رکھ رہا تھا۔ اس نے فون کان سے لگاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کے لیے کہا۔ اس وقت جبکہ صبح کے ساتھ معاملے کو نبھانے میں سارا دن کھپانے کے بعد غنی کے اس سوال نے اس کے جیسے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ وہ خبر اگر اسلام آباد میں بیٹھے غنی تک پہنچ گئی تھی تو وہ خبر اس سے کہیں زیادہ برق رفتاری سے سر کر رہی تھی جتنا اس نے سوچا تھا۔  
 ”یقینی تم کر رہی ہو؟“ غنی نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

”ہاں۔“ اس بار عکس نے بالآخر تمہید اور کسی جھجک کے بغیر کہا۔ غنی کے سامنے تمہیدوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔  
 ”اچھا فیصلہ ہے۔“ اس کے اگلے جملے نے عکس کو حیران کر دیا تھا۔ وہ کم از کم غنی سے اس جملے کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔  
 ”اوہ۔۔۔۔۔ تمہیں واقعی لگتا ہے اچھا فیصلہ ہے یا تم صرف طفر کر رہے ہو؟“

”طفر کیوں کروں گا میں۔۔۔۔۔ تمہاری زندگی ہے تمہیں حق ہے اپنے بارے میں بہتر فیصلہ کرنے کا۔۔۔۔۔ اور شیردل مجھے برا لگتا ہے لیکن تمہارے لیے اچھا ہے وہ۔“ غنی کا لہجہ بے تاثر تھا، وہ کوشش کے باوجود کسی قسم کا طفر یا گلہ نہیں ڈھونڈ نہ سکی تھی۔  
 ”میں ویسے بھی بہت عرصے سے اس خبر کی توقع کر رہا تھا تم سے لیکن میں اگر حیران تھا تو صرف اس بات پر کہ شہر بانو کے ہوتے ہوئے۔۔۔۔۔ تم شیردل سے شادی کرنے پر تیار ہوگی لیکن۔۔۔۔۔“ غنی نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا عکس نے بے اختیار گہری سانس لی۔ بالآخر وہ کاغذ دیکھنے لگا تھا جو چھپا ہوا تھا۔

”تم کیوں اس خبر کی توقع کر رہے تھے؟“ اس نے بڑی سنجیدگی سے غنی سے پوچھا۔  
 ”مجھے جو ادے تم دونوں کے بارے میں ایسی کچھ باتیں کئی تھیں جس کے بعد مجھے توقع تھی تمہاری طرف سے ایسی کسی خبر کے آنے کی۔ میں نے جو ادے تب صرف اس لیے بات کی تھی کہ اگر ممکن ہو سکے تو میں تم دونوں کے درمیان Patchup کر اسکوں۔ تمہیں تو پتا ہے ناں، اس کی فیملی کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن جو ادے جو اب کچھ بتا یا اس کے بعد مجھے لگا کہ اس کے ساتھ ملنے ختم کرنا تمہاری خواہش تھی، اس کی نہیں۔“ عکس خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی وہ اگرچہ کچھ تلخ باتیں کہہ رہا تھا لیکن اس کا انداز دوستانہ تھا۔ غنی نام کی کوئی شے اس میں نہیں تھی۔ عکس نے اس کی بات ختم ہونے پر بڑی مسامت سے اس سے کہا۔

”میں جو اد کی کسی بات پر Comment نہیں کروں گی کیونکہ جو اد کی بات پہ تہرہ کرنا بیکار ہے۔ لیکن میں اس بات پر ضرور حیران ہوں کہ تم دوست ہوتے ہوئے بھی جو اد کی یہ ساری باتیں سن کے مجھ سے بات کرنے کے بجائے خاموش رہے۔ کم از کم تمہیں اس وقت مجھ سے پوچھنا تو چاہیے تھا کہ میں نے تمہارے بارے میں یہ سنا ہے۔ بیٹھے بٹھائے خود سے کچھ بھی assume کر لینا کم از کم مجھے تم سے اس چیز کی توقع نہیں تھی۔“ غنی نے بھی اس کی بات اسی خاموشی سے سنی تھی جس طرح وہ اس کی بات سنتی رہی تھی۔

”تمہارا ذاتی مسئلہ تھا اور میں اگر حیران تھا تو صرف اس بات پہ کہ بیٹھے بٹھائے تمہیں شیردل سے شادی کرنے کا شوق کیسے پیدا ہو گیا۔ اگر ایسا کچھ تھا تو تمہیں بہت پہلے اس سے شادی کر لینی چاہیے تھی جب ابھی وہ غیر شادی شدہ تھا۔“ جب عکس نے اپنی بات ختم کر لی تو غنی نے کہا۔

”اس کی شادی میری وجہ سے ختم نہیں ہوئی تھی۔“ عکس نے بڑی سنجیدگی سے اس سے کہا۔ ”کم از کم میرے اور شیردل کے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں تھا جسے بنیاد بنا کر اس کی بیوی اس سے علیحدہ ہوتی۔ لیکن میں یہ مانتی ہوں کہ شہر بانو میرے حوالے سے کچھ خدشات کا شکار ہوئی، یا شاید مجھے یہ کہنا چاہیے کہ وہ کچھ غلط فہمیوں کا شکار ہوئی۔۔۔۔۔ میں directly نہ سہی لیکن Indirectly ان دونوں کی شادی ختم ہونے کا باعث بن گئی اور مجھے اس کا افسوس بھی ہے۔۔۔۔۔“ غنی نے اس کی بات کاٹی۔

”یار! چھوڑو اب اس سارے افسوس وغیرہ کو، ان دونوں کی طلاق ہوگئی، بات ختم ہوگئی۔“  
 ”بات ختم نہیں ہوئی، ختم ہو بھی جائے، تو بھی اس کی بازگشت بہت دیر تک گونجتی رہتی ہے۔ جس طرح تم نے منہ اٹھا کے کہہ دیا کہ تم شیردل اور میرے بارے میں بہت دیر سے جانتے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ہم دونوں عتقرب شادی کر لیں گے۔ اس طرح اور بھی ڈھیروں لوگ یہاں اسی طرح کی باتیں سوچ اور کر رہے ہوں گے۔“ عکس نے اس سے کہا۔

تم شیردل سے چاہتے ہو۔“ وہ کہتی گئی تھی۔ ”تم دونوں کے خاندان کے درمیان ماضی میں کیسے اختلافات رہے ہیں اور تم اور شیردل ایک دوسرے کو کیوں پسند نہیں کرتے مجھے اس سب کی تاریخ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی میں جانتا چاہتی ہوں۔“ اس نے بات ختم کی۔

”تم سیریس ہو گئیں میں مذاق کر رہا تھا۔“ غنی نے ایک دم اس سے کہا۔

”میں چاہتی ہوں اب تم اپنے تمام jokes میں سے شیردل کو نکال دو۔۔۔۔۔ دنیا میں اور بہت سی چیزیں ہیں اور لوگ اس سے funny ہیں تم چاہو تو میں کچھ لوگوں کے نام تمہیں بتا سکتی ہوں۔“ وہ بہت سہولت سے گفتگو کو اس موضوع سے ہٹا لے گئی تھی جس پر وہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ غنی نے بھی موضوع بدلنے دیا تھا۔ وہ شیردل کا خیر خواہ مر کے بھی نہیں ہو سکتا تھا لیکن وہ عکس کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا اور یہ بات عکس چاہتی تھی عجیب بات تھی، لیکن زندگی میں اس کی ساری دوستیاں ہمیشہ لوگوں سے ہی ہوتی رہی تھیں۔۔۔۔۔ کم دوستیاں لیکن بہت مضبوط اور قابلِ بھروسہ تعلقات۔۔۔۔۔ اسکول میں پھر بھی کسی حد تک اس کی کچھ چھوٹی موٹی دوستیاں لڑکیوں سے رہی تھیں لیکن میڈیکل کالج، اکیڈمی اور پھر جاب میں آنے کے بعد اس کے دوستوں کا سب سے قریبی سرکل مردوں پر مشتمل رہا تھا۔ کئی بار اس نے بیٹھ کر اس چیز analyse بھی کیا تھا اور ہر بار اسے اس کی ایک ہی وجہ سمجھ آتی تھی۔۔۔۔۔ خیر دین۔۔۔۔۔ اس کی زندگی پر حلیہ کے بجائے خیر دین کا اثر رہا تھا۔ اس کا پورا بچپن ایک مرد کے گرد گھومتا رہا تھا۔ جو اس کے ساتھ صرف ایک خونی رشتہ نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کا بہترین دوست اور استاد بھی تھا اور جس نے اسے زندگی میں کبھی انسانوں کو صنف کی بنیاد پر تعصب کا شکار ہونے نہیں دیا تھا جس نے اچھائی اور برائی کے بارے میں بات کرتے وقت اس کے سامنے ہمیشہ انسانوں کی اچھائی اور برائی کی بات کی تھی مردوں یا عورتوں کی نہیں، اپنی زندگی میں مردوں سے ہونے والے تمام خراب تجربات کے باوجود اگر عکس مراد علی کے لیے کوئی رول ماڈل رکھ رہے تھے تو مرد ہی رہے تھے۔۔۔۔۔ خیر دین کی شکل میں، میڈیکل کالج کے پروفیسرز کی شکل میں۔۔۔۔۔ اکیڈمی میں انسٹرکٹرز اور پروفیشنل لائف میں سینئر آفیسرز کی شکل میں۔۔۔۔۔ شیردل اور غنی کی شکل میں، چند عزیز ترین دوستوں کی شکل میں جن کے مشوروں اور رائے کو وہ ہمیشہ بہت اہمیت دیتی رہی تھی لیکن اپنی زندگی میں مردوں کی اتنی نمایاں اہمیت اور اثر ہونے کے باوجود ایک عورت کے طور پر اس نے نہ اپنی شخصیت پر صنف مخالف کی کوئی چھاپ لی تھی نہ وہ صنف نازک ہونے کی وجہ سے ذہنی طور پر کسی عدم تحفظ اور کمپلیکس کا شکار تھی۔ وہ ایک عورت اور ایک انسان کے طور پر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے تھی۔۔۔۔۔ اور وہ کتنا مشکل کام کر رہی تھی خود اسے بھی بھی اس کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

کسی کی زندگی سے خود نکل جانا اور بات ہے لیکن اپنی جگہ کو بڑی آسانی سے پُر ہوتے دیکھنا اور بات۔۔۔۔۔ کسی سے نفرت ہو تو بھی تکلیف ہوتی ہے اور وہ شخص جو اپنی زندگی میں آپ کو replace کر رہا ہو وہ آپ کی پہلی اور آخری محبت ہو تو پھر صرف تکلیف نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ انسان سولی پر لٹک جاتا ہے، نہ بھول سکتا ہے نہ نظر انداز کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ صبر کر لینا تو ناممکنات میں سے ہوتا ہے۔

شیر بانو بھی عکس اور شیردل کی شادی کی خبر سن کر کچھ ایسی ہی تکلیف سے گزر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ عکس کی جگہ شیر دل کی زندگی میں کوئی اور عورت آتی تو اس کا رد عمل کیسا ہوتا۔۔۔۔۔ تکلیف تو اسے یقیناً تب بھی ہوتی لیکن یہ غصہ اور غم جو وہ اپنی چیز اس شخص کی ہوتی دیکھ کر محسوس کر رہی تھی جس سے اس نے زندگی میں سب سے زیادہ نفرت کی تھی۔۔۔۔۔ یہ غصہ شاید وہ تب محسوس نہ کرتی وہ شیردل کو چھوڑتے ہوئے اسے option دے آئی تھی کہ وہ عکس سے شادی کر لے کیونکہ وہ اس سے نہیں عکس ہی سے محبت کرتا تھا لیکن اب جب وہ ہونے جا رہا تھا تو وہ عجیب مددے اور بے بسی کی کیفیت سے دوچار تھی۔۔۔۔۔ کہیں نہ کہیں اسے امید تھی کہ اس ایٹو پر اس کی طلاق ہونے کے بعد شیردل کسی سے بھی شادی کرتا لیکن عکس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ کہیں نہ کہیں اسے یقین تھا منزہ اور بختیار کبھی عکس کو اپنی بیوی بنانے پر رضامند نہیں ہو سکتے تھے خاص طور پر اس بیک گراؤنڈ اور اس ٹری بیکڈ کے بعد جس کا ایک کردار اگر عکس تھی تو دوسرا کردار شہباز حسین تھا۔۔۔۔۔ اس کا باپ۔۔۔۔۔ منزہ کا اکلوتا بھائی۔۔۔۔۔ اس خاندان کو چھوڑ آنے کے باوجود وہ یہ توقع کر رہی تھی کہ وہ اپنوں اور غیروں میں فرق رکھیں گے۔۔۔۔۔ جنہیں وہ ناپسند کرتی تھی وہ سب بھی ان کے لیے اتنی ہی ناپسندیدگی اور بے مہری رکھیں گے۔۔۔۔۔ اور اب جب سب کچھ اس کی توقعات اور

”اس کی فیملی ہی نے initiate کیا ہے یہ جو کچھ بھی ہوا ہے۔“ عکس بھی سنجیدہ ہو گئی۔

”یہ سب کچھ ویسے بہت ناقابلِ یقین ہے۔“ غنی نے کہا۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ وہ غنی کی بات کے جواب میں کہنا چاہتی تھی کہ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن وہ جواب سوال کر بیٹھی تھی۔

”are you sure“ کہ اس شادی کے پیچھے کوئی اور مقصد نہیں ہے؟“ غنی اگر ایسا سوچ رہا تھا تو اتنا غلط نہیں سوچ رہا تھا۔ جو خاندان اپنی ناک پر کبھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا ہو وہ ایک دم آنکھوں دیکھی کبھی نکلنے پر تیار ہو جائے تو یہ بات کسی کو بھی شک و شبہ اور الجھنے میں ڈال سکتی ہے۔

”قسمت میں ہے اس لیے ہو رہا ہے یہ سب کچھ۔۔۔۔۔ ان کی نیت اور ارادے پر تو مجھے کوئی شک نہیں۔“ عکس نے اپنی ہونے والی سسرال کی حمایت کی۔

”شیردل کا بہت بڑا ہاتھ ہوگا انہیں قائل کرنے میں۔“ غنی نے ایک دم کہا۔

”ہاں یقیناً شیردل نے ہی قائل کیا ہوگا انہیں۔“ وہ چاہتے ہوئے بھی یہ نہیں کہہ سکی کہ یہ محبت سے زیادہ ضرورت تھی جو اس رشتے اور تعلق کے پیچھے محرکات میں سے ایک تھی۔ اسے شیردل کی اپنے لیے فیملی کوئی شبہ نہیں رہا تھا لیکن اسے شیر دل کے ماں، باپ کے حوالے سے کوئی خوش فہمی بھی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی شیردل اگر اس طرح بیمار نہ پڑتا تو اس کے والدین کبھی اس رشتے پر رضامند نہیں ہوتے۔ غنی سے اس کی بہت دوستی تھی لیکن وہ غنی سے یہ سب شہساز نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ باتیں انسان اپنے آپ سے بھی نہیں کہہ پاتا خود بھی جھٹلاتا رہتا ہے وہ بھی ایسی ہی بے قدری کی ایک بات تھی جو وہ کسی دوسرے سے نہیں کہنا چاہتی تھی خاص طور پر اس خاندان کے ایک شخص سے جو شیردل اور اس کے خاندان کا rival تھا۔

”شیردل سے شادی کے ساتھ ہی یقیناً تمہاری اور میری دوستی کا خاتمہ بھی ہو جائے گا۔“ غنی نے بالآخر اس خدشے کا اظہار کیا جسے ڈسکس کرنے کے لیے اس نے اسے فون کیا تھا۔

”کیوں۔۔۔۔۔ بیٹھے بٹھائے یہ دوستی کا کیا مسئلہ ہو گیا تمہیں؟“ عکس ہنس دی تھی اسے اچانک احساس ہوا غنی کے خدشات کچھ ایسے غلط بھی نہیں تھے۔

”مجھے بیٹھے بٹھائے کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔۔۔۔۔ تمہیں ہونے والا ہے بلکہ تمہیں نہیں، تمہارے ہونے والے شوہر کو ہونے والا ہے۔“ غنی نے بہت جتانے والے انداز میں کہا۔

”شیردل پیچور ہے۔“ عکس نے بہت گھما کر بات کی تھی۔ غنی جواباً تہقیر مار کر ہنسا۔

”تم ایک انتہائی خبیث آدمی ہو۔“ وہ بھی کچھ شرمندہ انداز میں ہنس دی۔

”شیردل سے بہت کم۔“ غنی نے ترکی بہ ترکی کہا۔

”تم جسے خبیث کہہ رہے ہو وہ میرا ہونے والا شوہر ہے۔“ وہ خفا ہوئی تھی۔

”اور میں تمہارے ہونے والے شوہر کو تب سے جانتا ہوں جب اسے جوتے کے laces تک ٹھیک سے باندھنے نہیں آتے تھے خیر وہ تو شاید اب بھی ٹھیک سے نہ باندھ سکے اگر laces والے شوز پہننے پڑ جائیں تو۔۔۔۔۔“ غنی نے بے حد اطمینان سے کہا تھا۔

”تم اگر اس طرح کی باتیں کیا کرو گے اب میرے ساتھ تو تمہاری اور میری دوستی واقعی نہیں رہے گی۔“ اس بار عکس اس کے مذاق سے محفوظ نہیں ہوئی تھی۔

”مجھے اسی بات کا خدشہ ہے کہ اب تم شاہ سے زیادہ شاہ کی وفادار بننے کی کوشش نہ کرنے لگو۔“ غنی نے اسی انداز میں کہا تھا۔

”غنی تم میرے اچھے دوست ہو اور میں کبھی تم جیسے دوست کو کھونا نہیں چاہوں گی، تمہیں خائف ہونے یا خدشات کا شکار ہونے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شیردل سے شادی ہو جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مجھے ہر اس شخص سے بات کرنے سے منع کر دے گا جسے وہ پسند نہیں کرتا۔“ اس نے بہت نرمی اور متانت سے غنی کی بات کے جواب میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جہاں تک وفاداری کا سوال ہے تو ظاہر ہے شوہر کے طور پر اس کے ساتھ میری وفاداری کی نوعیت کسی دوست کے ساتھ وفاداری کی نوعیت سے مختلف ہو جائے گی اور میں چاہتی ہوں تم بھی اس معاملے پر اتنی ہی سمجھداری کا مظاہرہ کرو جتنا

اندازوں کے برعکس ہوا تھا تو وہ سکتے سے زیادہ صدمے میں بیٹھی تھی۔

کہتا تو وہ کبھی نہ کو دتا لیکن..... تم نے کہا تو اس کے لیے یہ عزت کا مسئلہ بن گیا۔“ شیردل نے سنجیدہ لہجے میں مذاق کیا تھا۔  
”مجھے تم سے اسی طرح کے نتیجے کی امید تھی۔“ عکس نے اسی قہقہے سے کہا۔  
”یہ مذاق کر رہا ہوں میں۔“ شیردل فوراً سنبھلا تھا اسے احساس ہوا شاید یہ کوئی زیادہ مناسب موقع نہیں تھا ایسی بات کے کہنے کا۔

”دیے for you kind information میں نے تمہارے مشورے پر عمل نہیں کیا تھا۔“  
”اوہ اچھا تو میں خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہا ہوں۔“ شیردل ایک دم مطمئن ہوا تھا۔ ”لیکن پھر کیوں کو اوہ؟“  
”کیونکہ وہ کو نے ہی آیا تھا.....“ سچ اس لیے گیا کیونکہ سچے فائر بریگیڈ والوں نے net لگایا ہوا تھا۔ they  
”scooped him in time“ وہ اب اسے بتا رہی تھی۔ ”لیکن میں نے بہر حال اسے جاب پر بحال کر دیا ہے۔“  
”ویری گڈ..... اب تم دیکھنا جس کے خلاف بھی کوئی disciplinary action (تادیبی کارروائی) ہوگی وہ سیدھا تمہارے آفس کی چھت پر اسی کام کے لیے بھیجے جائے گا۔“ شیردل نے ناپسندیدگی سے کہا۔  
”اب تم کہہ دو poor woman, poor management“ عکس نے بے ساختہ کہا۔ وہ جوابا ہنس دیا۔

”تم ہر بات کو اب زیادہ ہی دل پر لینے لگی ہو۔“ وہ اب ہلکی ہلکی گفتگو کرنے لگا تھا۔  
”ہاں دماغ نے کام کرنا چھوڑا ہوا ہے میرے آج کل..... اس لیے دل پر بوجھ ڈال دیا ہے سارا۔“ اس نے جوابا کہا۔  
”ویسے بھی تم ہوتاں دماغ استعمال کرنے کے لیے..... آج کل بہت سارے نئے نئے کاموں میں دماغ لگا رکھا ہے تم نے۔“ عکس نے دوسرے جیلے میں اسے چوٹ کی تھی۔ شیردل کو ریفرنس بوجھنے میں سیکنڈز لگے۔  
”بعض ”نئے کام“ بہت پہلے ہو جاتے تو نہ تمہارا دماغ کام کرنا چھوڑتا نہ میرا دل۔“  
”ساری عمر تم مجھے اسی ایک بات کے طعنے دو گے۔“ وہ ہنس پڑی تھی۔  
”میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔“

”نانا کے پاس آنے سے پہلے تمہیں مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔ مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا..... تم نے میرے لیے بہت مشکل صورت حال پیدا کر دی ہے۔“ شیردل اس کی بات کے جواب میں کچھ دیر خاموش رہا۔  
”اب کوئی فائدہ ہے ان باتوں کا..... دوبارہ زیرو سے بات شروع کریں کیا؟“ پھر ایک گہری سانس لے کر شیردل نے کہا۔

”ہاں، اب کوئی فائدہ نہیں ہے ان باتوں کا نانا نے ہاں کی ہے میں ان کی بات بھلاؤں گی۔“ اس نے جوابا کہا۔  
”اوہ..... صرف نانا کی بات بھلاؤ گی..... ورنہ تو تمہیں مجھ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے..... نہ پہلے تھی..... نہ اب ہے..... نہ آئندہ ہوگی۔“ شیردل کے لہجے میں شکوہ نہیں تھا کتنی تھی اور عکس حیران رہ گئی تھی، وہ چھوٹی سی بات پر رخ ہو جانے کا عادی نہیں تھا یہ ایک نئی عادت تھی اس کی یا حالات کا نتیجہ..... چند لمحوں کے لیے عکس کو واقعی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔  
”تم اظہار محبت چاہتے ہو مجھ سے؟“ اس نے چند لمحوں کے بعد..... مدغم آواز میں کہا۔  
”تمہیں اعتراض ہے کیا؟“ اس نے جوابا کہا۔ عکس نے جواب نہیں دیا۔ کہنے کو بہت الفاظ تھے عکس کے پاس پر کہہ دینے کی ہمت نہیں تھی۔

”تم بہت بڑی قربانی دے رہی ہو میرے لیے۔“ شیردل نے چند لمحوں بعد کہا شروع کیا۔ ”زندگی میں ایک بہت مشکل موڑ پر میرا سانس بننے کا فیصلہ کیا ہے، وہ بھی میرے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود..... ایک بہتر آپشن کو چھوڑ کر تم میری طرف آ رہی ہو اور میں اس کی بہت قدر کرتا ہوں۔“ وہ خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی، اس کے لہجے میں ممکن تھی یا شاید اوداسی تھی اور عکس کو حیرت نہیں ہوئی تھی۔ زندگی کا ساتھی دوسری بار چننا اور اس طرح چننا کسی کے لیے بھی بہت خوشگوار فیصلہ نہیں ہوتا۔

اس کائنات محبت میں ہم مثل شمس و قمر کے ہیں

غلط تو تھا، غلط اندازے، غلط فیصلے اور حیلہ بازی ہی شہر بانو کی زندگی کو define کرتے تھے۔ ضرورت زیادہ حساسیت اور اتنا پرستی وہ دوسرے مسائل تھے جن سے وہ دو چار تھی اور وہ ان میں سے کسی ایک خامی کو بدلنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی کیونکہ وہ اپنی شخصیت میں ان خامیوں کی بھی نشاندہی کر ہی نہیں پاتی تھی۔ سب سے آسان کام وہ تھا جو وہ بچے بے وقوف کی طرح کرتی تھی۔ اپنی زندگی میں پیدا ہونے والے ہر مسئلے کی ذمے داری دوسروں کے سر تھوپ دینا..... خوش ترس کھانا اور کھاتے ہی چلے جانا..... اور وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی..... کہانی کی پرفیکٹ ہیروئن..... بے پناہ حسین، نازک، خاندانی، کمزور، بات بات پر گھبرا کر رو دینے والی، مصیبتوں میں گہری ہوگی..... اور ہمیشہ کسی ایسے شہزادے کی خنجر جواں اس کی زندگی کے ہر مسئلے اور مصیبت سے بچا کر اپنے ساتھ اپنے گل میں لے جاتا جہاں وہ دونوں ہمیشہ ملی خوشی گزارتے..... اور پڑھنے والے ایک اطمینان بھری سانس اور مسکراہٹ کے ساتھ کہانی کا آخری صفحہ پلٹ کر کتاب کرتے..... اور ناظرین اپنی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے تالیاں پیٹ پیٹ کر اور اپنی سیٹوں سے کھڑے ہو کر سینما اسکرین پر ابھرنے والے اس خوش و خرم جوڑے کے آخری shot پر داد دیتے جس میں وہ اپنے گل کی بالکونی سے ایک دوسرے کا ہاتھوں میں بالکونی کے نیچے موجود لوگوں کی طرف ہاتھ ہلاتے۔

زندگی کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ کہانی کے آخری صفحے سے شروع ہوتی ہے اس میں بعض دفعہ شہزادے کی آمد بھی ہیروئن کا مسئلہ حل نہیں کر سکتی..... مگر کئی بار گل میں پہنچ جانے کے بعد بھی ہیروئن اپنے لیے مصیبت کا انبار کھڑا کر لیتی ہے۔ شہر بانو نے بھی یہی کیا تھا اور اب وہ بچھتا رہی تھی لیکن شہزادے کی دوبارہ آمد کہیں سے ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔  
”تو تم اب کیا کرنا چاہتی ہو؟“ شرمین نے یہ سب کچھ جاننے کے بعد اس سے پوچھا تھا۔ شہر بانو کو کم از کم ماں کو اپنا mental anguish (ذہنی اذیت) کے بارے میں بتانے کے لیے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا چہرہ اظہار پورا وجود یہ بتا رہا تھا۔

”میں شیردل سے پھر بھی رابطہ کر دوں گی شادی کے لیے نہیں..... لیکن میں چاہتی ہوں مثال اس سے ملتی رہے۔“ زندگی میں شاید پہلی بار اس نے کوئی صحیح فیصلہ کیا تھا اور شرمین نے اسے ٹوکا نہیں تھا اس نے بس ایک سوال کیا تھا۔  
”مثال سے کیسے ملے گا وہ؟ وہ یہاں آ نہیں سکتا..... تو کیا تم وہاں جاؤ گی؟ اور اگر جاؤ گی تو پھر داؤد اعتراض کر سکتا ہے۔“

☆☆☆

”am so sorry“ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح کی حرکت کر سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے میں یہ سمجھ نہیں پا رہا کہ اتنی جرات کیسے آگئی اس میں، صبح سے اسی ایک بات کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ ایک شیردل بہت معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ گل سے اس کی بات سنتی رہی وہ اس وقت ڈنر کرنے کے بعد اپنے بیڈروم میں آئی تھی جب شیردل نے اسے کال کیا تھا۔ اس نے آفس میں بھی کئی بار اسے فون کیا تھا لیکن عکس اس قدر مصروف اور ابھی ہوئی تھی کہ اس نے شیردل کی کال نہیں لی۔ شیردل کو لگا کال نہ لینے کی وجہ اس کا وہ مشورہ تھا جو عکس کو مہنگا پڑ گیا تھا۔ وہ اس لیے بھی کچھ panicked پریشان تھا کہ اس نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ کو نے کے بعد جب تک صبح کا بیٹا کیا..... اس کے بہت دفعہ کے text کے بعد بھی عکس نے اسے جواب نہیں دیا تھا اور اس کی خاموشی نے شیردل کو کچھ پریشان کر دیا تھا۔ ڈی کی آفس کی چھت سے کود کر کسی کامر جانا اس صورت میں اور بھی سنگین معاملہ تھا اگر یہ رد عمل ڈی کی کے کوڈ جاؤ..... کے اعلان کے بعد ہوا تھا..... اور خاص طور پر ایک خاتون آفسر کی طرف..... عکس کے جواب نہ دینے کے باوجود اس نے اپنے اسٹاف کے ذریعے یہ معلوم کر لیا تھا کہ جب تک صبح خود کشی کی اس کوشش کے باوجود زندہ سلامت تھا اور شیردل نے اس خبر کے ملنے کے بعد جیسے سکون کی سانس لی تھی لیکن اس کے باوجود عکس سے بات کر کے معذرت کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

”تو کیا نتیجہ اخذ کیا تم نے اتنی لمبی سوچ بچار کے بعد؟“ اس کا لب و لہجہ طرہ یہ نہیں تھا لیکن شیردل جانتا تھا کہ وہ طرہ یہ تھا۔

”میرا خیال ہے وہ کسی عورت کی طرف سے کہے ہوئے اس چیلنج کو برداشت نہیں کر سکا اگر تمہاری جگہ کوئی مرد اسے یہ



یقین دہانی کی تھی کہ وہ اسی کا نام تھا اور پھر وہ الجھتا تھا..... کال لے نہ لے..... اور پھر اسے مثال کا خیال آیا تھا اور اس نے ایک میکائی انداز میں برق رفتاری سے کال ریسیو کی تھی۔

”ہیلو!“ اس کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف بہت دیر خاموشی رہی۔ شیردل کو لگا جیسے لائن ڈس کنکٹ ہو گئی اس نے دوبارہ ہیلو کہا اور اس بار اس نے دوسری طرف شہر بانو کی آواز سنی تھی۔

”ہیلو.....“ اس ہیلو کے بعد اگلے چند سیکنڈز دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

”مثال کیسی ہے؟“ خاموشی بالآخر شیردل نے توڑی تھی اور شہر بانو کو توقع تھی کہ وہ اس کا حال نہیں پوچھے گا۔

”وہ ٹھیک ہے۔“ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اس نے شیردل سے کہا۔ ”تم کیسے ہو؟“ اسے سوال پوچھنے کے اندازہ ہوا اس نے غلط سوال کیا تھا۔

”اس سے میری بات کراؤ۔“ شیردل نے اس غلط سوال کا جواب دینے کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔

”اسکول میں ہے وہ اس وقت..... لیکن میں تمہاری بات کراؤں گی۔“ شہر بانو نے اس سے کہا تھا۔

”کب.....؟“ شیردل نے بے تابی سے پوچھا۔

”جب وہ اسکول سے واپس آئے گی لیکن تب تک تم سوچکے ہو گے..... میں دیکھ اینڈ پر کروادوں گی۔“ شہر بانو کو خیال آیا کہ پاکستان میں کچھ گھنٹوں کے بعد رات کا پچھلا پہر شروع ہو جاتا۔

”میں جاگ لوں گا، میں ویسے بھی جاگتا رہتا ہوں اس وقت۔“ شیردل نے فوری طور پر کہا۔ شہر بانو چپ سی ہو گئی تھی

”ممی نے بتایا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اب کیسے ہو تم؟“ شیردل کو فوری طور پر سمجھ نہیں آیا کہ وہ کس ممی کی بات کر رہی تھی..... یقیناً منزہ کی ورنہ شرمین کو اس کی طبیعت کی خرابی کا پتا کیسے چل سکتا تھا۔ وہ منزہ سے بھی بات کر چکی تھی۔ شیردل کو اچنبھا ہوا۔

”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ وہ جانتا چاہتا تھا اس کال کی وجہ کیا تھی، وہ بیٹھے بیٹھے پوچھ اسے اور منزہ کو کال کیوں کر رہی تھی۔ مثال سے بات کرانے پر تیار کیوں ہو گئی تھی۔

”کیا ممی نے تمہیں کال کی تھی؟“ شیردل کو ایک دفعہ خدشہ ہوا۔

”نہیں، انہوں نے نہیں کی تھی میں نے انہیں کی تھی۔“ شہر بانو نے اسی مدغم آواز میں کہا۔

”کیوں؟“ شیردل کے سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اس سے معذرت کرنا چاہتی تھی..... اب وقت گزر گیا تھا، شرمندگی کا اظہار کرنا چاہتی تھی..... اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا وہ واپس آنا چاہتی تھی..... وہ سمجھ نہیں سکا تھا.....

اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ عکس کو کیوں اپنی زندگی میں لارہا تھا..... اور ایسے سوالوں کا حق نہیں رہا تھا..... گفتگو پھر ہوتی اس موضوع پر ہوتی..... شہر بانو نے ایک دم بڑے بوجھل دل کے ساتھ فون رکھ دیا۔ شیردل بہت دیر تک فون پکڑے ہوا طرح بیٹھا رہا۔ وہ ایک فون کال سے اس کے سارے ذہن اور چیز گئی تھی۔ وہ اگلے کئی گھنٹے اسی طرح فون ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا.....

ایک بار پھر ان چند تکلیف دہ ہفتوں کو دوبارہ زندہ کرتا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا تھا کہ گھر لوٹنے کے بعد وہ دوبارہ بھی مثال کو نہیں دیکھ سکے گا اور اگر بھی دیکھ پایا بھی تو جب تک وہ اس کا چہرہ تک بھول چکی ہوگی..... اور اب..... امکان کا کمر کی ایسے کھلی تھی کہ اسے اندر آنے والی روشنی کو روشنی سمجھنا مشکل ہو رہا تھا۔

ٹھیک ساڑھے تین گھنٹے کے بعد اس کے فون پر ایک بار پھر شہر بانو کا نمبر چمکا تھا، اس بار فون اٹھانے پر کان میں پڑنے والی آواز سن کر وہ جیسے لمحوں بعد موم کی طرح پگھلا تھا۔ مثال نے ہیلو کہنے کے بعد ہاپ کی آواز سننے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو شروع کر دیا تھا۔ اس کے پاس کھڑی شہر بانو مل کر رہ گئی تھی۔ درود اور تکلیف کا اس سے کل کر اظہار ایک بچہ اور کیا کرتا دوسری طرف اس کی آواز سننا شیردل بھی رو پڑا تھا۔ وہ اس کی اولاد تھی اور وہ اس سے اتنی دور تھی کہ وہ اسے سینے سے لپٹا کر تھپک کر اس کے آنسو تک نہیں پونچھ سکتا تھا، پونچھ سکتا تو اسے بھی اس طرح رونے نہ دیتا..... شہر بانو نے اس کے اور اس کی اولاد کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔ اپنی بیٹی کو یوں جلتے دیکھ کر شیردل کے اندر شہر بانو کے لیے نفرت اور بڑھ چکی تھی۔ اس کی جذباتیت اور بے وقوفی نے اس کا ہنسا بستا گھر لمحوں میں تباہ کر دیا تھا۔

”Papa I want to come back“ مثال روتے ہوئے شیردل سے بار بار کہہ رہی تھی

اور شہر بانو نے عجیب رنج کے عالم میں اسے دیکھا۔ بچے خوش قسمت ہوتے ہیں ان میں کوئی اتان نہیں ہوتی..... وہ کبھی کبھی کہتے ہوئے یہ نہیں سوچتے کہ ان کی بات سے ان کی عزت میں کمی آئے گی وہ بھی یہی جملہ شیردل سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ واپس آنا چاہتی تھی لیکن وہ نہیں کہہ سکتی تھی کبھی کبھار بڑا ہونا آپ کا سب سے بڑا عیب بن جاتا ہے۔

اس رات مثال کو بہ مشکل سنانے کے بعد شہر بانو پہلی کئی راتوں کی طرح جاگتی اپنی زندگی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ شاید پہلی بار اس نے اس mess کا حقیقت پسندی اور غیر جانبداری سے جائزہ لیا تھا جو اس نے اپنے شیردل اور مثال کے لیے پیدا کر لیا تھا۔ تھوڑی سی برداشت، تھوڑی سی اعلیٰ ظرفی، تھوڑا سا حوصلہ..... کچھ زیادہ تو نہیں چاہیے تھا اسے اس سارے مسئلے سے بچنے کے لیے جو مٹی کا ایک ٹیلا تھا پروہ اسے اپنے لیے ماؤنٹ ایورسٹ بنا بیٹھی تھی۔

”شہر بانو، مثال کو لے کر آ رہی ہے 27 کو۔“ شیردل نے اگلی صبح ناشتے کی میز پر بختیار اور منزہ کو بتایا۔ وہ آج خلاف معمول ناشتے کی میز پر موجود تھا ورنہ وہ ہر روز بہت دیر سے سوکھتا تھا۔ منزہ کو حیرت نہیں ہوئی لیکن بختیار آٹلیٹ کو کانٹے اور چھری سے کانٹے کاٹنے چوبک گئے تھے۔

”شہر بانو نے تمہیں فون کیا ہے؟“ انہوں نے تعجب سے شیردل سے پوچھا۔ شیردل نے سر ہلا دیا اور منزہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ممی کو بھی کیا تھا but I am surprised ممی نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا۔“ اس نے جیسے کچھ کھوجنے اور کریدنے والی نظروں سے منزہ کو دیکھا تھا۔

”میں نے صرف اس لیے نہیں بتایا کہ وہ خود تمہیں فون کرے اور بات کرے تو بہتر ہے، میں تم سے کوئی بات کرتی تو تمہیں غصہ آتا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں بھی فون کرے گی اس لیے میں انتظار میں تھی کہ وہ فون کرے لے اور تم خود ہی بات کر دو تو بہتر ہے۔“ منزہ نے اطمینان سے کہتے ہوئے شیردل کو غور سے دیکھا، اس کی آنکھیں رات بھر جاگنے کی وجہ سے بے حد سرخ ہو رہی تھیں لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے پر وہ اضطراب اور حشمت نہیں تھی جو اتنے مہینوں سے وہ ہر روز دیکھنے کی عادی تھیں۔ عجیب سا سکون اترتا تھا منزہ کے دل میں..... چیزیں بالآخر ٹھیک ہونے لگی تھیں۔

”بیٹھے بیٹھے اٹھائے اسے فون کرنے کا خیال کیسے آ گیا؟ اور اب یہ سب کچھ کرنے کے بعد؟“ بختیار کے ماتھے پر ہل چھے۔ ”کیا دادو سے شادی ہو گئی اس کی؟“

”میں نے پوچھا نہیں۔“ شیردل نے بختیار کے سوال کا جواب دیا۔

”نہیں ہوئی۔“ منزہ نے شیردل کے مزید کچھ کہنے سے پہلے کہا۔ شیردل اور بختیار نے چوبک کر منزہ کو دیکھا تھا۔ ”اور میں تو خوش ہوں کہ نہیں ہوئی..... اب اگر وہ مثال کو لے کر واپس آ رہی ہے تو یقیناً مصالحت کا بھی کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ بہت شرمندہ تھی وہ اور اس نے اس کا اظہار بھی کیا تھا..... ہونا بھی چاہیے تھا اسے شرمندہ۔“ منزہ چائے پیتے پیتے کہتی گئی تھیں لیکن شیردل صرف ایک لفظ مصالحت پر ٹھک گیا تھا۔

”کیسی مصالحت.....؟“ اس نے منزہ کی بات ختم ہونے کے بعد اسے بے حد خشک لہجے میں کہا۔ منزہ ایک لمحے کے

لیے اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئیں۔ شہر بانو نے کیا شیردل سے مصالحت کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ انہوں نے پہلا الجھ کر سوچا۔

میز پر چند لمبے خاموشی رہی پھر منظرہ نے بے حد سنبھل کر اس سے کہا۔

”اب وہ واپس آرہی ہے تو ہو سکتا ہے تمہارا اور اس کا patch up ہو جائے بلکہ میں چاہتی ہوں ایسا ہو ہی جائے۔ تم لوگوں کے ساتھ ساتھ مثال کی زندگی پر بھی اثر پڑ رہا ہے۔“

”آپ نے اسے میری اور عکس کی شادی کے بارے میں بتایا؟“ شیردل نے ان کی بات کے جواب میں ان سے پوچھا۔

”نہیں، میں نے نہیں بتایا..... لیکن مجھے لگا اس کی ضرورت نہیں تھی اگر تمہاری اور شہر بانو کی مصالحت ہو جائے تو..... شیردل نے ماں کی بات بے حد درگھکی سے کاٹی۔

”میری اور شہر بانو کی divorce ہو چکی ہے اور میری اور عکس کی شادی بھی طے ہو چکی ہے۔ آپ کون سی مصالحت کی بات کر رہی ہیں؟“ منظرہ نے بختیار کو دیکھا ان کے ماتھے پر بھی ویسے ہی مل تھے جیسے شیردل کے ماتھے پر تھے۔

”شہر بانو بہت شرمندہ ہے، اس نے مجھ سے معافی مانگی ہے۔ وہ سب کچھ بھول کر واپس آنا چاہتی ہے۔ تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہے..... تم بھی جانتے ہو، تم دونوں اگر چاہو تو صرف نکاح کر کے دوبارہ اپنا گھر آباد کر سکتے ہو۔“ منظرہ نے بالآخر ہمت کر کے وہ بات کہہ دی جو وہ کہنا چاہتی تھیں۔ شیردل ساکت بیٹھا ماں کو دیکھتا رہا..... بے حس و حرکت بالکیں جھپکائے بغیر اس کے دماغ نے جیسے کچھ دیر کے لیے کام ہی کرنا چھوڑ دیا تھا۔

”اور میں ایسا نہیں چاہتا، آپ کو لگتا ہے کہ میں ایک ایسی عورت کو دوبارہ اپنے گھر میں لا کر آباد کروں گا جس نے گھر چھوڑتے ہوئے پورے شہر میں میرے اشتہار لگا کر مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔“ اس نے بے حد جھکی سے ماں سے کہا تھا۔

”وہ بہت شرمندہ ہے بیٹا۔“ اس نے ماں کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔

”اس کو میری اور عکس کی شادی کے بارے میں پتا چل گیا ہوگا اور اس نے سوچا ہوگا یہ بہت پرفیکٹ موقع ہے ایک بار پھر مجھے ایووشلی بلیک میل کرنے کا..... اولاد کا ہتھیار استعمال کر کے۔“

”تم غلط سمجھ رہے ہو شیردل اسے تو.....“ منظرہ نے شہر بانو کی صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔ شیردل نے غصے سے ایک ہاتھ پھران کی بات کاٹی۔

”مئی میں عکس کے ساتھ شادی کرنے والا ہوں آپ لوگ اس کی فیملی کے ساتھ تاریخ طے کر کے آئے ہیں اور میں اپنے وعدے کو dishonour کبھی نہیں کر سکتا۔“ اس نے دونوں انداز میں ماں سے کہا۔

”تم مثال کا سوچو.....“ شیردل نے ایک بار پھر بہت تندہ لہجے میں ماں کی بات کاٹی۔

”مئی وہ میری اولاد ہے اور آپ اسے اولاد نہ بنے دیں، مجھے بلیک میل کرنے کا ہتھیار مست بنائیں، شہر بانو اور میری شادی ختم ہو چکی ہے وہ چھوڑا اب دوبارہ بھی نہیں کھل سکتا۔“ وہ کہتا ہوا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

”آپ ہی کچھ سمجھاتے اسے۔“ منظرہ نے اس کے جانے کے بعد قدرے بے بسی سے بختیار سے کہا۔

”سمجھانے کی ضرورت اسے نہیں تھیں ہے..... تم نے اور تمہاری فیملی کی عورتوں نے شادی کو کیا سمجھ رکھا ہے..... مذاق.....؟“ بختیار نے بہت سخت الفاظ میں انہیں سرزنش کی تھی۔ ”مجھ ماہ جس طرح پوری فیملی شہر بانو کے پیچھے خوار ہوئی رہی ہے وہ تمہیں یاد نہیں ہے؟ اور اب اگر وہ دوبارہ اپنا گھر بنانے کی کوشش کر رہا ہے تو تمہیں ایک بار پھر اپنی بیٹی یا داؤ گئی ہے اور تم نے یہ سوچا ہے کہ ہم لوگ عکس کی فیملی سے کیا کہیں گے؟ کیا apology (معذرت) دے کر رشتہ ختم کریں گے؟“ بختیار شیردل ہی کی طرح برہم تھے۔

”میں عکس کے تاتا سے پہلے ہی بات کر آئی ہوں۔“ منظرہ نے یک دم کہا۔ ”شاید وہ خود ہی رشتہ ختم کر دیں..... مجھے لگتا ہے۔“ بختیار نے بے یقینی سے اپنی بیوی کا چہرہ دیکھا۔ وہ منظرہ بختیار کا چہرہ نہیں تھا..... وہ خود غرضی اور طبقاتی تقسیم کو پتھر کی لکیر ماننے والے ایک موقع پرست کا چہرہ تھا۔



☆☆☆

”ہانا آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟“ عکس نے خیر دین سے پوچھا۔

”نہیں۔“ خیر دین نے نظریں ملائے بغیر انکار کیا۔

”شیر دل یہاں آتا ہے آپ مجھے نہیں بتاتے، اس کی می آتی ہیں آپ مجھے نہیں بتاتے..... میں شیر دل سے پوچھتی ہوں وہ کچھ نہیں بتاتا..... ان بے مقصد ملاقاتوں کی کوئی وجہ نہیں ہے؟“ عکس کو خیر دین کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ اسے پچھلے دو تین دنوں میں وہاں آنے والے لوگوں کی تفصیلات آج ملی تھیں اور وہ حیرت زدہ تھی۔

”شادی کے ہزار انتظامات ہوتے ہیں اب اگر ان کے لیے وہ لوگ یہاں آ جا رہے ہیں تو اس میں ایسی کیا بات ہے۔“ خیر دین نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

”لیکن آپ پریشان کیوں لگ رہے ہیں پچھلے چند دن سے؟“ عکس نے کریدا۔

”تمہارا وہم ہے۔“

”میں آپ کا چہرہ پڑھ سکتی ہوں۔“ وہ نہیں مانی تھی۔

”تمہاری شادی کا سوچ کر اداس ہوں۔“ خیر دین نے کہا اس نے یقین نہ آنے والے انداز میں خیر دین کو دیکھا۔

”میں شادی کے بعد بھی آپ کو اپنے ساتھ ہی رکھوں گی۔ میں شیر دل سے یہ بات کر چکی ہوں۔“ عکس نے کہا۔

”نہیں چڑیا میں اب.....“ عکس نے خیر دین کو بات مکمل کرنے نہیں دی اس نے بہت مستحکم آواز میں خیر دین سے کہا۔

”ہانا مجھ سے وہ روایتی باتیں مت کہیں گے کہ بیٹیوں کے گھر رہنا مناسب نہیں۔ وغیرہ وغیرہ..... نہ میں روایتی ہوں نہ میں ایسی روایات پر یقین رکھتی ہوں جو انسانیت اور اخلاقی قدروں کے بجائے تعصبات پر بنائی گئی ہوں۔ میں اس عمر میں آپ کو خجائی کے کسی عذاب کو اکیلا جھیلنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتی خاص طور پر اس صورت میں جب آپ بیمار بھی ہیں اور شیر دل روایتی مرد نہیں ہے، اس کو کوئی اعتراض نہیں ہے آپ کے ہمارے ساتھ رہنے پر..... ہو گا بھی تو میں دور کر سکتی ہوں۔“ عکس نے دو ٹوک انداز میں خیر دین سے کہا اور خیر دین چاہتے ہوئے بھی اس سے بحث نہیں کر پایا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑے گی وہ لاکھ کوشش کرتا تب بھی نہیں۔

☆☆☆

لاہور کے علامہ اقبال انٹرنیشنل arrival lounge ایر پورٹ کے باہر نکلنے سے بھی پہلے مثال نے شیر دل کو دور سے دیکھ لیا تھا..... ہمیشہ کی طرح اس نے شہر بانو سے اپنا ہاتھ چھڑانے اور باہر نکلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اگر کوئی شیر دل کو پہلی نظر میں نہیں پہچان سکا تھا تو وہ شہر بانو تھی۔ وہ پہلے سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی رنگت زرد، آنکھوں کے گرد حلقے اور سر میں جا بجا سفید بال تھے۔ وہ بازو مثال کے استقبال کے لیے پھیلائے گھٹنوں کے بل عجیب بے اختیاری کے عالم میں لاؤنج کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔ مثال لپکتی ہوئی اس کی گود میں سما گئی تھی۔ شیر دل زندگی میں پہلی بار آتے جاتے لوگوں کے ہجوم میں اپنے جذبات پر قابو نہیں پاسکا تھا۔ مثال کو اپنے بازوؤں میں بٹھینچے وہ رو پڑا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے ہر روز فون پر مثال سے بات کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اسے اپنے سامنے دیکھ کر اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ شہر بانو اپنا بیگ سنبھالے ہوئے باہر اس کے نزدیک آ گئی تھی۔ شیر دل نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ وہ مثال کو اپنے بازوؤں میں سیٹھ اسی طرح اٹھ کر کھڑا ہو گیا نہ اس نے شہر بانو سے علیک سلیک کی، نہ اس کا حال پوچھا، نہ اس کا سامان پکڑا۔ مثال کو اٹھائے وہ پلٹ گیا تھا۔ شہر بانو جیسے ڈھیوں کی طرح اس کے پیچھے چلنے لگی تھی..... ایک وقت وہ تھاجب وہ اس کے پیچھے پیچھے آتا تھا اور وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر تنفر سے چلتی رہتی تھی اور ایک وقت یہ تھاجب وہ یہ دیکھنے کی زحمت تک نہیں کر رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بھی جائیں۔

گاڑی کے پاس پہنچ کر ڈرائیور نے اس سے سامان لے لیا تھا۔ شیر دل ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ پیچھے نہیں بیٹھا تھا۔ وہ مثال کو لیے اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ پورا راستہ صرف مثال بولتی رہی تھی۔ اتنے مہینوں میں شہر بانو نے اسے پہلی بار اس طرح خوش ہو کر باتیں کرتے دیکھا تھا..... بالکل اسی طرح جیسے وہ ہمیشہ کرتی تھی۔ پچھتاوا کچھ اور گہرا ہوا تھا۔

گھر پہنچنے پر منزہ نے اس کا استقبال کیا تھا۔ گرم جوشی دکھانے کی شدید کوشش کے باوجود شہر بانو کو ان کے انداز میں ٹھنڈک نظر آئی تھی۔ وہ گھر کچھ عرصے پہلے اس کی سسرال تھا، وہ وہاں ملکیت کے احساس کے ساتھ آئی تھی آج وہ وہاں صرف

”تم کوئی جاب کیوں نہیں کرتیں..... اتنی اچھی ڈگری ہے تمہارے پاس اور یہاں تو اس ڈگری کی بہت ویلے ہے۔“  
داؤد نے شادی کے چند ہفتے بعد ہی اس سے ایک رات کہا تھا۔ وہ ابھی نئی مومن سے واپس آئے تھے اور شہر بانو، مثال کو شرمین کے گھر سے اپنے گھر لے کر آئی تھی۔  
”جواب؟“ شہر بانو نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا۔ ان کی اتنے مہینوں کے میل ملاپ میں کبھی جاب کا تذکرہ نہیں ہوا تھا۔ داؤد نے کیا تھا نہ ہی اس نے کیا تھا۔  
”ہاں۔“ داؤد نے کہا۔

”میں نے تو انٹرن شپ کے بعد کبھی جاب کی ہی نہیں۔“  
”ہاں لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ تم شادی کر کے پاکستان چلی گئی تھیں اگر امریکا میں رہ رہی ہوتیں تو یقیناً کرتیں۔“ داؤد نے اس کا جملہ اچکا۔

”گھر اور جاب دونوں کو اکٹھے چلانا بہت مشکل ہے۔“ اس نے اپنی عدم دلچسپی کا اظہار کیا۔  
”اسی (80) فیصد عورتیں جو یہاں رہتی ہیں وہ یہ مشکل کام بڑی آسانی اور مہارت سے کرتی ہیں تم کرنا شروع کرو گی تو تمہیں بھی آسان لگنے لگے گا۔“ داؤد اپنی بات پر جڑا ہوا تھا۔ ”ویسے بھی یہاں صرف ایک پارٹنر کے کام کرنے سے گزارہ نہیں ہوتا۔ میں نے نیا نیا گھر mortgage کیا ہے اس کی بہت heavy instalments دے رہا ہوں ابھی نئی گاڑی لی ہے اس کا بھی قرض ہے میرے سر پر..... صرف میرے کام کرنے سے یہ گھر نہیں چل سکے گا۔“ وہ پلٹیں بھپکائے بغیر اس کی بات سنتی رہی۔ وہ بچے تلے لفظوں میں اسے کیا بات صاف صاف بتا رہا تھا وہ سمجھ سکتی تھی..... کہ اسے بھی اس کے ساتھ کام کر کے گھر میں contribute کرنا پڑے گا ورنہ وہ اس کے اور اس کی بیٹی کے اخراجات نہیں اٹھائے گا۔ وہ امریکا تھا اور وہاں داؤد کا وہ مطالبہ غلط نہیں تھا مگر وہ کچھ دیر کے لیے سکتے میں ضرور آگئی تھی۔ سالوں گھر بیٹھے رہنے کے بعد اگر ایک دم کوئی نوکری تلاش کرنے کے لیے کہتا تو کوئی بھی اس کی طرح پریشان ہوتا بعد میں اس نے سوچا اسے کام کرنا ہی چاہیے۔ شیردل، مثال کے اخراجات کے لیے اسے رقم دے رہا تھا مگر وہ نہیں جانتی تھی اب شادی کر لینے کے بعد کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد وہ اسے کچھ دیتا یا نہیں، اس وقت اس کا ذہن شیردل کو اچھی طرح جاننے کے باوجود اس کی جانب سے شکوک و شبہات کا شکار تھا۔

داؤد اور مثال کے درمیان بھی اس طرح کا کوئی رشتہ نہیں بن سکا تھا جس خواہش اور امید میں شہر بانو نے داؤد کے ساتھ شادی کی تھی۔ داؤد کے پاس بیوی کی سابقہ شوہر سے ہونے والی اولاد کے ساتھ وقت گزارنے یا اس کے ساتھ اچھے تعلقات بنانے کی کوشش سے زیادہ دلچسپ اور اہم کام تھے۔ مثال اس کے نزدیک ایک unfriendly چائلڈ تھی جس کو بگاڑنے کا سارا کریڈٹ وہ شہر بانو کے ناز و نعم کو دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا اسے مثال کے پیچھے ہر وقت بھاگتے رہنے کے بجائے اسے وہ سب کرنے کی آزادی دے دینی چاہیے تھی جو وہ کرنا چاہتی تھی..... شہر بانو، مثال کے حوالے سے اس کے مشوروں اور رائے پر کان بھی نہیں دھرتی تھی۔ وہ اس کی اولاد نہیں تھی اور وہ نہ اولاد کی اہمیت کو سمجھتا تھا، نہ ہی اپنی اولاد پیدا کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا اور یہ ایک اور مسئلہ تھا جو شہر بانو کو اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ داؤد کو زارا کے ساتھ بھی یہی مسائل تھے جب وہ اولاد چاہتی تھی اس وقت داؤد کو اس میں دلچسپی نہیں تھی اور جب داؤد کو اس کا خیال آیا، اس وقت زارا کو اپنے کیریئر کے علاوہ کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہی تھی اور زارا کے ساتھ ہونے والے بریک اپ کے بعد داؤد کو اب اگر کسی چیز میں دلچسپی تھی تو وہ اپنی ذات، اپنی خوشی، اپنی خواہشات تھیں۔ شادی سے پہلے وہ جس طرح شہر بانو کو شادی پر آمادہ کرنے کے لیے اس کے آگے پیچھے پھرتا، اس کی ناز برداریاں کرتا پھرتا، شادی کے بعد سب سے پہلے غائب ہونے والی چیز وہ ناز برداریاں ہی تھیں۔ وہ اب جیسے ایک بار پھر سے اپنی زندگی جینے لگا تھا جو میں، مجھے، میرا شروع ہو کر وہیں ختم ہوتی تھی۔ زندگی میں آنے والا وہ دوسرا مرد کسی بھی طرح سے شہر بانو کے لیے دلا سے کا باعث نہیں بناتا تھا..... صرف اس کے بچھتاوے میں اضافے کا باعث بن گیا تھا پہلے بچھتاوے اور شیردل کو چھوڑنے کا تھا..... اب بچھتاوے اتنی جلد بازی میں داؤد کو اپنی زندگی میں شامل کر لینے کا بھی تھا۔

☆☆☆

ایک مہمان کے طور پر آئی تھی..... ایک ہفتے کے لیے۔  
عکس، شیردل کی زندگی میں آچکی تھی اس کا اندازہ اسے گاڑی میں ہی ہو گیا تھا جب اس نے عکس کی کال ریسیو کی اور اسے فلائٹ کے آنے اور گھر کی طرف روانگی کے بارے میں بتاتے ہوئے اس سے کچھ اور باتیں کی گئیں۔ ایک وقت جب وہ سوچتی تھی شیردل کی زندگی میں کوئی اور عورت آگئی تو وہ جیسے مرے جانے کی، وہ سانس بھی نہیں لے سکے گی شیردل نام کسی اور عورت کے نام کے ساتھ دیکھ کر..... اور اب..... وہ زندہ بیٹھی ان دونوں کی چند منٹ کی وہ گفتگو سنتی رہی تھی اور بھی رہی تھی اور سانس بھی لیتی رہی تھی..... آسمان بھی نہیں ٹوٹا تھا..... زمین بھی نہیں پھٹی تھی..... شہر بانو، شیردل سے وہ بار پھر شہر بانو شہباز ہو چکی تھی اور وہ نام کسی اور کے نام کے ساتھ لگ چکا تھا۔

اسے اس بار گیسٹ روم میں رکھا گیا تھا اور ایک گیسٹ والے پردوں کو ل اور فارمیٹی کے ساتھ..... شیردل کو وہ پوسٹنگ نہیں ملی تھی وہ یقیناً اس کی وجہ سے وہاں مقیم تھا ورنہ یقیناً عکس کے ساتھ ہی رہ رہا تھا..... وہ ایک ہفتہ وہاں رہی تھی اس ایک ہفتے میں مثال اس کے پاس دن رات کے کسی وقت نہیں آئی تھی، وہ شیردل کے پاس ہی سوئی جاتی رہی تھی۔ شیردل کے ساتھ ہی سارا سارا دن گھومتی پھرتی رہتی۔ شہر بانو کا ہونا یا نہ ہونا جیسے فیملی کے دوسرے لوگوں کی طرح اس کے بھی میٹرنس نہیں کرنے لگا تھا خود شیردل سے اس کا آتنا سا منا کھانے کی میز پر بھی نہیں ہوتا تھا، وہ جان بوجھ کر اس کا سامنا کر کے سے کتر ہا تھا اور اس سمیت گھر کے باقی لوگ بھی..... نند اور دیور سے بھی صرف ایک بار اس کی ملاقات ہوئی جب وہ کسی فنکشن میں شرکت کے لیے لاہور آئے تھے اور تب اسے احساس ہوا اس فیملی فنکشن میں عکس بھی لاہور آ کر شریک ہوئی تھی لیکن وہ اس گھر میں نہیں آئی تھی..... یقیناً اس کی وجہ سے..... وہ ایک اضافی اور غیر ضروری چیز بن گئی تھی اس فیملی کی زندگی میں..... جہاں اس سے مشورہ کیے بغیر کچھ نہیں ہوتا تھا..... ان سب کی زندگی سے نکل جانے کا فیصلہ اس کا اپنا فیصلہ تھا اس کے باوجود شہر بانو کو وہ سب دیکھتے ہوئے تکلیف ہو رہی تھی۔

منزلہ اور اس کے درمیان ایک ہفتے کے قیام کے دوران کسی قسم کا کوئی ڈسکشن نہیں ہوا اور یقیناً منزلہ کو اس کے لیے خاص طور پر ہدایات دی گئی تھیں ورنہ وہ کچھ نہ کچھ کہنے سے باز رہنے والی نہیں تھیں۔  
اپنی زندگی کا ایک اور مشکل ہفتہ وہاں گزار کر وہ برونی دھوتی مثال کو لے کر واپس امریکا آگئی تھی اور واپس آنے کے بعد ایک بار پھر سے مثال اسی رویے کا مظاہرہ کرنے لگی تھی جو وہ یہاں آنے کے بعد کرتی تھی، شیردل سے فون پر ہر روز بات کرنے نے بھی اس کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی..... وہ شہر بانو کی اکلوتی اولاد تھی اور وہ شہر بانو سے بے حد ناخوش تھی..... وہ ”پاپا“ کے پاس رہنا چاہتی تھی۔ محی کے پاس نہیں اور اسے محی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اس کی ناخوشی اور عدم دلچسپی میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا تھا جب اس کی ”ممی“ نے داؤد کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا اور انہیں نانوکا گھر چھوڑ کر ایک نئے گھر میں شفٹ ہونا تھا۔ وہ عکس سے نہیں ملی تھی نہ ہی شیردل نے اس سے ”نئی محی“ اور اپنی شادی کا ذکر کیا تھا اس لیے سالہ اس بچی کی نظروں میں باپ اچھا تھا صرف ماں بری تھی جو اسے ہر اس جگہ اور شخص سے توڑنے اور الگ کرنے کا باعث بنی تھی جس سے وہ پیار کرتی تھی۔

داؤد کے ساتھ شادی ایک مشکل فیصلہ تھا خاص طور پر اب جب شہر بانو کو اپنی بہت سی غلطیوں کا احساس ہو رہا تھا لیکن اب اس کے پاس چوائس نہیں رہی تھی۔ شیردل نئی زندگی کا آغاز کر چکا تھا اور وہ کسی کہانی کی ہیروئن ہوتی تو اکیلے زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیتی لیکن وہ حقیقی زندگی میں شرمین کے گھر پر اکیلے نہیں رہ سکتی تھی خاص طور پر شادی کے لیے شرمین کے دباؤ کی وجہ سے بھی۔

اس کی زندگی داؤد سے شادی کے بعد بھی سنبھل نہیں سکی تھی بس اس کی زندگی اور ذات میں ایک اور خانے کا اضافہ ہو گیا تھا جس میں وہ ایک بیوی تھی کچھ ذمے دار یوں کا بھی اضافہ ہو گیا تھا اور بس..... اور کچھ نہیں ہوا تھا۔ نہ داؤد، شیردل جیسے ساتھی تھا، نہ اسے داؤد سے محبت ہو سکتی تھی اور نہ داؤد شیردل کی جگہ لے پایا تھا۔ وہ شہر بانو سے صرف شادی کے لیے ایکساں تھا، شادی ہو جانے اور اسے اپنے گھر لے آنے کے بعد وہ یک دم ہی اس کے لیے ایک بہت جانوی سی چیز بن گئی تھی۔ یہ داؤد بھی نہیں تھا جسے وہ اتنے سالوں سے جانتی تھی، اس داؤد اور اس داؤد کی زندگی، ترجیحات اور دلچسپیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا اور اس رشتے میں زمین شہر بانو تھی۔

قہارہ اسے ملامت کر رہی تھی، شرم دلارہی تھی، عقل دے رہی تھی اور شیردل کو انہی چیزوں کی ضرورت تھی۔  
”وہ مجھے مثال سے دوبارہ ملے نہیں دے گی اگر اس بار وہ اسے لے گئی تو.....“ اس نے بالآخر جیسے ایک توجہ دینے کی کوشش کی تھی اپنے ان اقدامات کے لیے۔

”یہ تمہاری assumption ہے اور ایک وہم کی بنیاد پر تم اپنی بچی اور سابقہ بیوی کو کورٹس کے دھکے نہیں کھلوا سکتے۔ تم تو کورٹس میں جاتے ہو وہاں کا سسٹم اور حال دیکھا ہے تم نے..... تم شہر بانو کو وہاں کے چکر لگوانا چاہتے ہو؟“ وہ اب پچھتائیں بول سکتا تھا۔

”جب وہ نہیں ملے دے گی تو دیکھا جائے گا ابھی تو وہ اچھے طریقے سے اسے ہمیں لائی ہے، یہاں رہ رہی ہے اگر اس نے تم سے مثال کو دور رکھنا ہوتا تو وہ اب بھی اسے یہاں نہ لے کر آتی۔“ عکس نے کہا۔

”وہ یہاں اس لیے آئی ہے تاکہ اگر میرے ساتھ patch up ہو سکتا ہے تو کر لے..... اسے پتا نہیں تھا کہ میں نے تم سے شادی کر لی ہے اگر اسے امریکا میں پہنچا جاتا تو وہ بھی مثال کو یہاں لے کر نہیں آتی..... میں نے صرف ایسی کسی صورت حال سے بچنے کے لیے تم سے ایمر جنسی میں نکاح اور رخصتی کی۔“ عکس حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی اسے دل کی بات کی سمجھ نہیں آتی تھی۔

”patch up کیا مطلب.....؟ تم دونوں کی divorce ہو چکی ہے پھر patch up کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس نے کہا۔

”طلاق کا حق تفویض کیا تھا میں نے اسے اور وہ ایک طلاق کے ساتھ غلطی کی شرط کے ساتھ تھا۔ ہم دونوں چاہیں تو دوبارہ نکاح کر کے رہ سکتے ہیں۔“ اس نے می سے بات کی تھی اس بارے میں اور می نے مجھے پریشاں نہ کیا تھا، تمہارے مانا سے بھی بات کی تھی، عکس کا دماغ جیسے گھوم کر رہ گیا تھا۔

”انہوں نے مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا۔“ عکس نے کہا۔

”ہاں لیکن انہوں نے مجھے بلوا کر بات کی تھی۔“ وہ خاموش اسے دیکھتی رہی وہ اس شادی کے حوالے سے جو خدشات لے کر بخشی وہ غلط نہیں تھے..... اور وہ سارے مسائل اب آہستہ آہستہ اس کے سامنے آنے لگے تھے۔

شہر بانو کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ پاکستان میں اس کے ایک ہفتے کے قیام کے دوران وہ عکس کی وجہ سے مصیبتوں کے کس پہاڑ سے بچتی تھی۔ وہ ایک بلا تھی جو عکس نے اس دن شیردل کو مجبور کر کے شہر بانو کے سر پر آنے سے ٹالی تھی۔

شیردل مثال کے پاکستان سے چلے جانے کے کئی دن بعد تک بہت اپ سیٹ رہا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ نارمل ہونے لگا تھا۔ مثال امریکا جانے کے بعد بھی اس سے رابطے میں تھی اور اس کے ذہنی سکون کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ اس کی پوسٹنگ انہی دنوں NWFP ہو گئی تھی اور وہ جو پہلے عکس کے ساتھ لاہور یا کراچی میں ایک ہی شہر میں پوسٹنگ کروانے کا خواہش مند تھا اسے ایمر جنسی میں وہاں جانا پڑا تھا۔ عکس نے بھی اس کی پوسٹنگ والی جگہ پر اپنی پوسٹنگ کروانے کے لیے کوششیں ترک کر دی تھیں کیونکہ شیردل NWFP میں جہاں پوسٹنگ تھا وہ فیملی کے لیے کچھ زیادہ محفوظ علاقہ نہیں تھا اور نہ ہی وہاں چھی میڈیکل سہولیات تھیں عکس ان دنوں امید سے بھی اور وہ کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔

”آپ نے مجھے یہ سب کیوں نہیں بتایا؟“ شہر بانو اور شیردل کی مصالحت کے حوالے سے ہونے والے انکشاف کے رد عکس نے خیر دین سے بات کی تھی اور اس سے شکایت کیا تھا۔

”اگر تمہیں بتا دیتا تو تم شیردل کو چھوڑ دیتیں۔“ خیر دین نے کہا اور ٹھیک کہا تھا اگر اسے یہ پتا چلتا کہ شہر بانو نے شیردل کے درمیان اب بھی مصالحت کی کوئی گنجائش تھی تو وہ ان دنوں کے درمیان سے ہٹ جانے میں ایک لمحے کا بھی تاثر نہ کرتی بلکہ شاید وہ خود شیردل کو اس مصالحت پر مجبور بھی کرتی۔

”اور اگر ایسا ہو جاتا تو ہم سب کے لیے ٹھیک ہوتا..... میرے لیے..... شیردل کے لیے..... شہر بانو اور مثال کے لیے.....“ اس نے خیر دین سے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”آپ نے بہت خود غرضی دکھائی مانا..... اور زندگی میں پہلی بار خود غرضی دکھائی۔“ اس نے مدہم آواز میں خیر دین کو بتایا تھا۔

”تم ایسا نہیں کرو گے شیردل۔“ عکس نے دونوں کے انداز میں اسے جیسے خبردار کیا تھا۔ ان کی شادی کو ابھی کچھ گزرے تھے اور شہر بانو، مثال کو لے کر پاکستان آئی تھی اور اس کے آنے کے فوراً بعد شیردل نے مثال کی کسٹڈی کے حوالے سے کورٹ میں کیس کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کسی بھی صورت میں اسے دوبارہ شہر بانو کے ساتھ واپس بھیجنا نہیں چاہتا تھا۔ نے مختیار اور منزہ سے بھی یہ معاملہ ڈسکس کر لیا تھا اور ان دونوں کی بھی رائے یہی تھی کہ انہیں مثال کو شہر بانو سے لے کر اپنے کام اس لیے بھی ضروری تھا کہ شہر بانو واپس جا کر داؤد سے شادی کرنے والی تھی اور مثال جس طرح شیردل اپنچھڑ گئی، شیردل کو بالکل نہیں لگتا تھا کہ اسے اس کی پرورش کرنے میں کوئی مسئلہ ہو سکتا تھا۔ لیکن عکس کے ساتھ یہ مسئلہ ڈسکس کرتے ہی وہ ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔ ”تم اب ایک ماں سے اس کی بچی چھینو گے..... وہ تم پر اعتبار کرتے ہوئے اسے لے کر آئی ہے۔“ اس نے شیردل کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”اس نے بھی تو مجھ سے میری بیٹی کو چھینا تھا۔ میں نے بھی تو اس پر اعتبار کرتے ہوئے اسے marriage nuptials (ازدواجی بندھن کے تاتے) میں چائلڈ کسٹڈی دی تھی لیکن اس نے اسی ایک اجازت کو میرے خلاف استعمال کرتے ہوئے مجھے اپنی ہی بیٹی کی شکل دیکھنے کے لیے ترسا دیا تھا۔“ شیردل کے انداز میں بے حد سرد مہری تھی۔

”اس نے غلط کیا اور اب تم اس کی غلطی کو اپنی ایک بڑی غلطی سے بدلنا چاہتے ہو۔“ عکس نے کہا۔  
”I dont care“  
”You have to..... یہ ایک چھ سالہ بچی کی زندگی کا سوال ہے، تم دونوں اپنی جنگیں اس پر لڑنا بند کر دو تمہیں کیا لگتا ہے تم اسے شہر بانو سے لے لو گے تو وہ آرام سے چلی جائے گی؟ وہ ایک کے بعد دوسری اپیل کرے گی اور وہ امریکن ایمرجنسی کی سپورٹ کے ساتھ..... تم چاہتے ہو جیسا سین پہلے ہوا ہے ویسا ہی دوبارہ ہو..... مزید شرمندگی اور ذلّت اٹھاؤ تم۔“ وہ اسے اس کے فیصلے کے مضمرات بتا رہی تھی۔

”تب میں دھوکے میں مارا گیا تھا۔ ضرورت سے زیادہ اعتماد کرنے کی وجہ سے..... لیکن اب وہ لے آئے جس کو، اپنی سپورٹ کے لیے لانا چاہتی ہے، میں دیکھوں گا وہ میری بیٹی کو پاکستان سے باہر کیسے لے کر جاتی ہے۔“ عکس اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی۔ شیردل کو اس نے بھی اس طرح کی scheming کرتے نہیں دیکھا تھا نہ وہ اسے بھی بے وقوفانہ حد تک انا پرست لگا تھا لیکن اس وقت وہ اسے صرف ایک مرد لگ رہا تھا جس کے لیے سب سے اہم بات صرف اس pride بحال کرنا تھا جو اس سے اس کی بیوی چھین کر لے گئی تھی۔

”تم نے سوچا ہے مثال کیسی زندگی گزارے گی۔ اس طرح کی قانونی جنگ کا اس پر کیا اثر ہو گا؟“ شیردل نے اس بات کا ٹوہن دیا۔

”وہ میرے اور تمہارے ساتھ ایڈجسٹ کر لے گی..... وہ بہت خوش رہے گی یہاں۔“  
”تم اس equation میں سے مجھے اور میرے گھر کو نکال دو..... میں اسے اپنے ساتھ نہیں رکھوں گی۔“ عکس نے دونوں کے انداز میں کہا۔ شیردل کو جیسے یقین نہیں آیا۔

”تم میری اولاد کو نہیں پالو گی؟“ اس نے جیسے عکس کو جتانے والے انداز میں کہا۔

”میں تمہاری صرف وہ اولاد پالوں گی جو میں پیدا کروں گی میں کسی دوسری عورت کی اولاد چھین کر اس کی ماں بننے کا خواہش مند نہیں ہوں اور تمہیں اگر یہ کام کروانا ہے تو پھر تمہیں ایک تیسری شادی کرنی پڑے گی۔ I would not support you۔“ عکس نے بہت صاف لفظوں میں اسے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

”میں تم سے ایسی بات کی توقع نہیں کر سکتا۔“ شیردل کو یقیناً شک لگا تھا۔  
”میں بھی تم سے اس طرح کے غلط کام کی توقع نہیں کر سکتی جو تم کرنے جا رہے ہو۔ تم نے شادی کر لی ہے لیکن تم شہر بانو کو punish کرنا چاہ رہے ہو کہ وہ شادی کر کے اپنی زندگی میں سبٹل ہونے کے بجائے یہاں کورٹس میں خوار ہوئی پھر تم تم ایسا کیسے کر سکتے ہو شیردل..... تم مرد ہو، تعلیم یافتہ ہو..... ایک باشعور انسان سے ایک جاہل اجڑ جانور کیوں بننا چاہتے ہو اس عورت کے ساتھ تم نے اتنے اچھے سال گزارے ہیں اور کچھ نہیں تو تمہیں انہی سالوں کی پروا کرنی چاہیے۔ غلط ہو چاہے اس ایک رشتے کا جو کبھی تمہارے اور اس کے درمیان تھا۔“ وہ اس کی باتوں سے سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھتا جا رہا تھا۔

”تمہاری اولاد ہے..... بیٹی ہے پھر تمہیں کیا ٹینشن ہے اگر کوئی ٹینشن ہونی چاہیے تو وہ مجھے ہونی چاہیے۔“ اس کے پاس ہر وقت اس ایٹو پر بحث کے دوران ایک ہی جواب ہوتا تھا۔

وہ چھوٹے دل کی اور کم طرف نہیں تھی لیکن بس وہ ایک چیز کے معاملے میں اپنا دل بڑا کر کے شیردل یا عکس کو مبارک باد بھی نہیں دے سکتی تھی نہ خود نہ ہی مثال کے ذریعے..... اس نے اس خبر کے ملنے کے بعد اگلے کئی دن مثال سے بھی بات نہیں کی تھی وہ اس سے اس بچے کے بارے میں مزید کچھ نہیں سننا چاہتی تھی..... اور مثال نے جیسے اس کی کال کے آنے نہ آنے کو محسوس تک نہیں کیا تھا..... وہ بھی طفرل کے ساتھ اس طرح مصروف تھی کہ اسے کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ جتنی اچھڑ وہ اس بچے کے ساتھ ہو گئی تھی اتنی ہی ایچڈ وہ عکس سے بھی ہو رہی تھی..... وہ ڈھٹائی جو وہ شہر بانو کو دکھاتی تھی وہ عکس کے سامنے ایک بار بھی نہیں جھلکی تھی۔ وہ ایک ماہ شیردل اور عکس کے پاس رہی تھی اور شیردل واپس پشاور جاتے ہوئے اس کی ضد پر اسے عکس اور طفرل کے پاس ہی چھوڑ گیا تھا اور اس ایک ماہ میں وہ طفرل سے زیادہ عکس کی پرچھائیں بن کر رہی تھی، وہ relationship جو اس نے کبھی شہر بانو کے ساتھ جانے کے بعد بد اعتمادی میں کھویا تھا وہ اس نے ایک اور جگہ دریافت کیا تھا۔ مثال کے اپنے ساتھ بہت اچھے ہونے کے باوجود شیردل کو ان مسائل کا کسی نہ کسی حد تک اندازہ تھا جو مثال کے رونے اور عادتوں میں تھے اور پشاور جانے کے بعد بھی وہ اس حوالے سے بار بار اسے اور عکس کو فون کرتا تھا لیکن اسے حیرت ہو گئی تھی جو ضد اور بد تمیزی وہ اسے دکھاتی تھی عکس نے اس کی شکایت نہیں کی تھی۔ اسے لگا تھا شاید وہ لحاظ میں اس کی شکایت سے اجتناب کر رہی تھی مگر چند دن بعد دوبارہ عکس کے پاس اس کے گھر آنے پر اس نے مثال کو ویسا ہی فرمانبردار اور باتنیز پایا تھا جیسا عکس اسے فون پر بتاتی تھی۔ وہ شیردل کے آنے پر اس سے ضد کرنے لگی تھی لیکن عکس کے ایک بار منع کرنے پر وہ فوراً مان جاتی تھی اور اس اطاعت میں خوف اور سختی کا کوئی element نہیں تھا۔ وہ طفرل نے جان چھڑکتی تھی مگر وہ عکس کی توجہ پانے کے لیے ہر وقت اس کے ارد گرد ہی منزل لاتی رہتی تھی۔ وہ پہلا موقع تھا جب وہ دونوں ملی تھیں یا انہوں نے بات کی تھی اور وہ عجیب طرح سے ایک دوسرے سے connect ہوئی تھیں۔

ایک مہینہ گزر جانے کے بعد مثال بہت مشکل سے واپس امریکا جانے پر تیار ہوئی تھی۔ شہر بانو کے پاس واپس جانا جیسے اس کی زندگی کا ایک بھیانک خواب تھا جسے وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ شہر بانو کے پاس وہی مثال واپس پہنچی تھی جو وہاں سے گئی تھی۔ خاموش، بد تمیز، خفا، Irritated اور کئی فوژ جو عکس اور شیردل کے پاس 24 گھنٹے چپکتی رہتی تھی اس کے پاس شہر بانو سے کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس کی آواز میں وہ کھٹک اور خوشی تک نہیں تھی جو شہر بانو اس سے پاکستان میں بات کرتے ہوئے محسوس کرتی تھی ہاں البتہ اس کی بھی کبھار کی جانے والی باتوں میں دو نام آ گئے تھے۔ طفرل اور عکس آنٹی، اسے پہلے نام نے نہیں توڑا تھا۔ دوسرے نام نے کسی شے کی طرح کاٹا تھا، مثال جتنی بار طفرل کا ذکر کرتی تھی عکس کا بھی ذکر کرتی تھی، اور بعض دفعہ شہر بانو کو لگتا طفرل کا ذکر نہ کرنا ہوتا تھا عکس کا ذکر خصوصاً..... اس صورت میں کوئی witch کی..... کو الٹی تھی جو وہ سب کو اپنی منہمی میں کر لیتی تھی لوگ جس کے پاس بھی ہوتے ان کا دل و دماغ عکس مراد علی کے قبضے میں رہتا۔ اس نے شیردل کے ساتھ یہی کیا تھا اور اب وہ مثال کے ساتھ بھی یہی کر رہی تھی۔ کیوں؟ وہ اب کیا چاہتی تھی؟ اس کی بیٹی؟ شہر بانو بے وجہ خفا ہوئی، بے وجہ خوف زدہ ہوئی۔

”مئی، عکس آنٹی نے کہا ہے جب میں next ٹائم ان کے پاس جاؤں گی تو وہ طفرل کے ساتھ ساتھ میرا بھی ایک بہت اچھا سا روم بنا دیں گی پھر میں اپنے روم میں رہوں گی۔“ وہ اس دن اسے صبح اسکول جانے کے لیے تیار کر رہی تھی جب مثال کو یک دم پتا نہیں کیا یا د آیا تھا، اس نے بڑے ایکساٹڈ انداز میں ماں سے کہا۔

”وہ کبھی تمہارے لیے کچھ نہیں بنائیں گے، اب ان کے پاس اپنا baby ہے تمہارے پاپا اور طفرل کی مئی کو تم میں دلچسپی نہیں ہے، ان کے لیے اپنا baby کافی ہے۔ وہ تم سے جموٹ بول رہے ہیں۔“ اس نے مثال کا سفید پڑتا چہرہ بھی نہیں دیکھا تھا وہ بس غصے کے عالم میں اس کے اس محل کو اپنے پیروں تلے روندتی چلی گئی تھی جو اس بچی نے بنایا تھا۔ وہ ان پڑت، جاہل عورتوں کی طرح یہ باتیں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اپنی اکلوتی بیٹی کو صحت مندانہ سوچ اور رویت ہی دینا چاہتی تھی مگر حسد اور غصے نے کچھ دیر کے لیے جیسے اس کا ذہن ماؤف کر دیا تھا۔ اس کے پاس صرف مثال رہ گئی اور وہ کم از کم اس کی محبت عکس کے ساتھ نہیں بانٹ سکتی تھی۔ وہ پورا دن مثال کم مہم رہی تھی۔ رات کو اس نے شیردل سے Skype پر بات کرنے کی ضد کی۔

”تم ٹھیک کہتی ہو لیکن بڑھاپا اور اولاد انسان کو مجبور کر دیتے ہیں..... میں کتنی بار تمہیں تکلیف میں پڑتے دیکھا..... سے رشتہ ختم نہ ہو چکا ہوتا تو اور بات تھی لیکن رشتہ ختم ہونے کے بعد..... اور وہ بھی میری جلد بازی کی وجہ سے..... میں نے تمہیں سمجھا کہ تمہاری شادی شیردل کے ساتھ ہو جانی چاہیے۔“ خیر دین کی آواز میں غدا مت تھی۔ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح کسی بڑے کے سامنے خود سے ہونے والی کسی غلطی کا اعتراف کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔

”جو بھی تمہیں نہیں تھا نا..... میں آپ کو اتنا کمزور نہیں سمجھتی تھی۔“ اس نے کچھ تاپسندیدگی سے کہا۔

”جب تمہاری اپنی اولاد ہو جائے گی تو تمہیں اعزاز ہوگا کہ اولاد انسان کو کس طرح کمزور کرتی ہے۔ اس کے اصول اور اخلاقیات کو کس طرح بدل کر رکھ دیتی ہے۔“ خیر دین نے سراٹھا کر اسے دیکھا پھر بد م مسکراہٹ نے ساتھ کہا وہ کچھ سر ہوتے چہرے کے ساتھ بے اختیار ہنس پڑی۔ اسے خیر دین سے ایسی مثال کی توقع نہیں تھی۔

☆☆☆

شیردل کے ساتھ ان دو دائمی زندگی کا آغاز ایک آسان آغاز نہیں تھا..... یہ وہ شیردل نہیں تھا جسے عکس اسنے سالوں پہلے جانتی تھی۔ وہ خوش مزاج، محل مزاج شخص اب بہت چھوٹی سی بات پر غصے میں آ جاتا تھا..... فطرتاً اچھا ہونے کے باوجود شہر بانو اور مثال سے علیحدگی نے اس کے مزاج کو بہت بری طرح بدلا تھا۔ وہ پہلے کی نسبت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اگر بات نہ کرتا تو کوئی دن بات نہیں کرتا تھا..... فون نہیں کرتا تھا..... اور اگر فون کرنے پر آتا تو دن میں کئی کئی بار اسے فون کرتا..... وہ مملوک مزاج ہو گیا تھا اور وہ پہلے ایسا نہیں تھا عکس کو اس کے mood swing بری طرح پریشان کرتے تھے لیکن اس کے باوجود شیردل کے ساتھ شروع کے چھ ماہ اس نے بڑے محل کے ساتھ گزارے تھے پھر آہستہ آہستہ بچے کی آمد کا وقت نزدیک آتا گیا تھا اور شیردل کا مزاج بدلتا گیا۔ وہ پرانا شیردل لوٹنے لگا تھا اس کی توجہ، محبت اور خیال بڑھ گیا تھا، اس کی مملوک مزاجی میں کچھ کمی آنے لگی تھی۔ شاید اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ عکس کے ساتھ اتنا اچھا شوہر بن کر نہیں رہا تھا جتنا وہ شہر بانو کے ساتھ ہمیشہ رہا تھا۔

☆☆☆

شہر بانو کو طفرل کی پیدائش کا پتا مثال سے چلا تھا۔ وہ اپنی چھٹیوں میں پاکستان شیردل سے ملنے گئی تھی اور اس بار شہر بانو نے اسے اکیلے بھجوا دیا تھا۔ وہ اپنی جانب کی وجہ سے چھٹی نہیں لے سکتی تھی اور نہ ہی اب وہ ایک بار پھر شیردل کا سامنا کرنا چاہتی تھی۔ جب زندگی بدل نہیں سکتی تھی تو پھر حقیقت سے کمزور کی طرح آنکھیں بند کر کے فرار بہتر تھا وہ بھی اب یہی کرنا چاہتی تھی، نو سے پانچ بجے کی ایک تھکا دینے والی نوکری، ایک شوہر جو اسے بیوی سے زیادہ ایک ہاؤس کیپر سمجھتا تھا اور ایک بیٹی جو اس کے کسی فیور کی خدمت سے خوش نہیں ہوتی تھی..... شہر بانو کے پاس اس ”baggage“ کے ساتھ زندگی ویسے ہی ایک ہی دائرے میں گھومنے لگی تھی جس میں وہ کلبو کے تیل کی طرح کچھ سوچے سمجھے بغیر چکر کاٹتی جا رہی تھی۔ شیردل کے ساتھ گزارے ہوئی زندگی، اس کی محبت، وہ ناز و مداریاں وہ آرام و آسائش خواب ہو چکے تھے۔ جو اب باقی تھا وہ ایک مشکل زندگی تھی جس میں obligations نہیں options تھے اور اس گھبرے ہوئے پانی میں مثال نے جیسے ایک تلامح پیدا کر دیا تھا۔

وہ پاکستان جانے کے پانچویں دن اس سے فون پر بات کر رہی تھی جب مثال نے اسے بے حد ایکساٹڈ انداز میں ایک چھوٹا اور پیارا سا بھائی آنے کی اطلاع دی تھی۔ شہر بانو ٹل بھی نہیں سکی تھی، یہ غیر متوقع نہیں ہونا چاہیے تھا اس کے لیے..... پھر بھی غیر متوقع تھا..... تکلیف نہیں ہونی چاہیے تھی اسے پھر بھی ہوئی تھی، سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ وہ مثال سے کہا کبھی یا کسی سے بھی کیا کہتی..... مثال دوسری طرف سے بڑے نرجوش انداز میں اسے بھائی کے طے کی تفصیلات دے رہی تھی۔ اس نے عجیب کم ہمتی کے عالم میں فون رکھ دیا تھا۔ محکم اتنی تھی کہ اسے لگا وہ اب بھی اٹھ نہیں سکتی۔ ایک بیٹا اس کی اولاد شیردل کی خواہش تھی۔ وہ پلان کر رہے تھے اگر یہ سب ان کی زندگی میں نہ ہوتا تو شاید اس سال وہ بیٹا اس کا بیٹا ہوتا۔ وقت اس سے سب کچھ چھین کر لے گیا تھا اور جو چھین کر لے گیا تھا وہ دوسروں کو دے رہا تھا۔ داؤد کے ساتھ اس کی شادی کو بھی ایک سال ہونے والا تھا لیکن وہ اولاد نہیں چاہتا تھا اور کم از کم چند سال تو اس کے لاکھ سر جھٹنے کے باوجود وہ اس ایک بات پر اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔

وہ اسے laptop دے کر خود چلی گئی تھی۔ وہ دو گھنٹے کے بعد کچن کا کام نہنا کر اس کے کمرے میں آئی تھی۔ مثال بس laptop کے پاس ہی سوچتی تھی۔ اس نے laptop میں skype کی ونڈو آف کرنا چاہی اور رک گئی، شیردل کی ڈنک میں طغزل کی تصویر تھی۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے میں شیردل کی واضح شباهت تھی۔ سرخ و سفید رنگ بڑی بڑی آنکھوں اور معصوم مسکراہٹ والا ایک گول مثل چہرہ..... وہ نم آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر کے غصہ پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ laptop بند کر کے کمرے سے چلی گئی۔

”عکس آنٹی نے کہا ہے طوخی کے آنے سے میری importance میں کوئی کمی نہیں آئی، پاپا نے بھی یہی کہا۔“ اگلی صبح وہ اسے اسکول چھوڑنے جا رہی تھی جب مثال نے ایک دم اس سے کہا تھا۔ وہ بری طرح جوگی۔

”عکس سے بات کب ہوئی تمہاری؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ کچھ خشک ہو گیا تھا۔

”پاپا نے رات کو skype پر بات کر دائی ہے میں نے طوخی کو بھی دیکھا۔“ مثال نے بے حد خوشی سے اسے بتایا۔

شہر بانو کا پارہ ایک دم چڑھ گیا تھا۔

”تم نے اگر دوبارہ طغزل کی مٹی سے بات کی تو میں تمہیں دوبارہ کبھی تمہارے پاپا سے بات نہیں کرنے دوں گی۔“

نے بلا جھجک اسے دھمکایا تھا۔

”لیکن کیوں، عکس آنٹی بہت اچھی ہیں..... I really like her۔“

”Stop it..... تمہیں ضرورت نہیں ہے مجھے بتانے کی کہ تمہیں کون پسند ہے اور کون نہیں، میں نے تمہیں کہہ دیا۔“

عکس سے بات نہیں کر دے گی تو تم نہیں کرو گی۔“ اس نے بری طرح اسے جھڑکا تھا۔ مثال کچھ دیر ابھی نظروں سے ماں کو دیکھتا رہی۔ پھر وہ ایک دم کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ شہر بانو کچھ دیر خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی پھر اس نے جیسے کچھ بے چینی کر مثال کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے کی کوشش کی جسے اس نے جھٹک دیا۔

”وہ تمہیں مجھ سے چھین لینا چاہتی ہے۔ اس لیے وہ تمہیں پیار کر رہی ہے۔ وہ تمہیں genuinely (خلوص۔ میری طرح پیار نہیں کرتی۔“ شہر بانو نے عجیب بے چینی سے اس سے کہا۔ مثال نے اس پر ایک اور ابھی نگاہ ڈالی اور کہا۔

”مٹی میں پاپا اور عکس آنٹی کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، میں طوخی کو miss کرتی ہوں۔“ اس نے اسٹن گھلے ڈالے۔

الفاظ میں اس سے کہا تھا کہ چند لمحوں کے لیے شہر بانو کچھ بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

”میں تمہیں کبھی وہاں نہیں بھیج سکتی، تم میری اکلوتی بیٹی ہو تم مجھے چھوڑ کر اس کے پاس کیسے رہ سکتی ہو۔“

loved them more than me? (تم انہیں مجھ سے زیادہ پیار کرتی ہو؟)۔ بات کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”yes۔“ ایک لفظی جواب نے اس کی ہمت ختم کر دی تھی۔

وہ باقی کا سارا راستہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی تھی۔ مثال بے حد سرد مہری اور بے نیافانہ کے عالم میں پورا راستہ گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

بعض دفعہ اولاد انسان کے لیے نعمت سے زیادہ ایک نارچہ بن جاتی ہے۔ نووے نارچہ..... وہ آپ کو کچھ کہیں تو آپ پر تکلیف ہوتی ہے، آپ ان کو کچھ کہیں تو بھی آپ ہی کو تکلیف ہوتی ہے..... اور وجہ صرف یہ ہے کہ آپ نے انہیں پیدا کیا ہے۔

ہے انہوں نے آپ کو نہیں..... وہ آپ کو چھوڑ سکتے ہیں آپ ان کو نہیں۔

مثال کے ساتھ ہونے والے یہ بار بار کے arguments (مکالمے جیسے شہر بانو کے دل میں ایک اور اولاد کی خواہش شدت سے پیدا کر رہے تھے وہ ایک سیکنڈ چانس لینا چاہتی تھی شاید ایک اور تجربہ جو اس کے اور داؤد کے کھوکھلے رعب کی بنیاد بدل دے اور اگر نہیں بھی ہوتا تو وہ بچہ مثال اور اس کے درمیان communication (تعلق) کے کرتے ہوئے پہل کو تو سہارا دے سکتا تھا۔ اس نے مثال کی طغزل کے لیے دیوانہ وار محبت دیکھی تھی اور اسے یوں لگتا تھا کہ وہ یہ محبت اس کے اور داؤد کے بچے کے ساتھ بھی کر سکتی تھی۔

اگلا سال اس کی زندگی کا ایک اور مشکل سال تھا۔ داؤد، شرمین اور فاروق کے مجبور کرنے پر اس فیملی کا آغاز کرنے پر تیار ہو گیا تھا لیکن ان دونوں کے باہمی تعلقات پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئے تھے اور تعلقات کی یہ خرابی اس وقت اور

بڑھ گئی جب داؤد کو چانک اسی کہنی سے Lay off (نو کری سے نکالنا) کر دیا گیا جہاں وہ کئی سالوں سے کام کر رہا تھا۔ شہر بانو پہلے جاب سے اپنے اخراجات پورے کرتی تھی اور گھر میں تھوڑا بہت کنٹریشن کرتی تھی اب ایک دم گھر کے سارے اخراجات اس کے سر آ گئے تھے۔ گھر mortgage ہونے کی وجہ سے ان دونوں پر شدید فنانس پریش تھا۔ ایک اور بچہ ان حالات میں پیدا کرنا اس گلے میں پھنساؤ لے کے برابر تھا جس میں پہلے ہی بہت سے پھندے بڑے ہوئے تھے۔ ان حالات میں مثال کے لیے ہر ماہ شیردل کی طرف سے بھیجی جانے والی رقم ایک نعمت غیر ترقیہ سے کم نہیں تھی۔ وہ رقم جو پہلے کچھ سستی نہیں رکھتی تھی۔ اب ایک دم بہت جگہوں پر کام آنے لگی تھی۔

سال ختم ہونے پر ایک بار پھر چھٹیوں میں مثال پاکستان گئی تھی، وہ اس بار بھی اکیلی تھی شہر بانو کو اس سال بھائی کی ایسی جنگ لڑنی پڑی تھی کہ اس کے دل سے مثال اور عکس کے حوالے سے سارے خدشات اور دوسرے نکل گئے تھے اور وہ ہوں اور دوسروں کو پالنے کے لیے وقت کا ہونا ضروری تھا اور اس کے پاس.... آفس، گھر اور باہر کے کاموں کے بعد صرف اتنا وقت بچتا تھا کہ وہ چند گھنٹے سو کر اگلے دن دوبارہ اسی جنگ کے لیے تیار ہوئی اور ایسے حالات میں جب اس کے پاس مثال سے بات تک کرنے کے لیے وقت نہیں تھا وہ اس کے بارے میں داپے پالنے کیسے بیٹھ جاتی۔

مثال اس بار شیردل اور عکس دونوں کو پچھلے دو سالوں کی نسبت کم صدم اور بدلی ہوئی لگی تھی۔ وہ اب بھی طغزل کے آگے پیچھے پھرتی رہی مگر انہوں نے ویسے اسے بہت خاموش اور فکر مند پایا۔ شیردل اور عکس کے بہت زیادہ کریدنے کے باوجود بھی وہ کچھ جاننے اور سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

عکس کو مثال بہت اچھی لگتی تھی، وہ ہمیشہ اسے باری ڈول کی یاد دلاتی تھی وہ شکل صورت میں اسی کا بچپن تھی۔ اسے لڑکیاں ہمیشہ اچھی لگتی تھیں اور اس کی وجہ اسے کبھی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ طغزل کو accept کرتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں ایک بیٹی کی خواہش اپنے دل میں پالے ہوئے تھی اور وہ پوری نہیں ہوئی تھی لیکن مثال کے اپنے پاس قیام کے دوران مزید بڑھ ضرور گئی تھی۔ مثال ڈسٹر بڈ بھی اس کا اندازہ اسے پہلی دفعہ بھی ہو چکا تھا لیکن اس کو ہینڈل کرنا اتنا مشکل ثابت نہیں ہوا تھا، وہ اس کی بات سنتی بھی تھی اور مانتی بھی تھی کسی اور کی بات سنتی نہ سنتی اور وہ اس کی توجہ کی بھی خواہش مند رہتی تھی۔ عکس کی سٹائش جیسے اس کے لیے ایک certification تھی وہ پاکستان سے جانے کے بعد بھی عکس سے رابطے میں رہی تھی۔ ہر دفعہ شیردل کے اس کے گھر پر ہوتے ہوئے وہ عکس کی بھی بات اس سے ضرور کر داتا تھا۔

”آنٹی کیا آپ مٹی کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتیں؟“ اس نے ایک دن لان میں طغزل کے ساتھ کھیلتے کھیلتے اچانک عکس سے کہا تھا، وہ حیران ہوئی تھی اس غیر متوقع اور عجیب و غریب فرمائش کو سن کر سوال کا جواب کمال مشکل تھا۔

”تمہاری مٹی آکر رہنا چاہیں تو most welcome لیکن مجھے نہیں لگتا وہ یہاں آکر رہنا چاہیں گی وہ امریکا میں جاب کرتی ہیں، وہاں ان کا اپنا گھر ہے، ان کے husband ہیں..... وہ کیوں یہ سب کچھ چھوڑ کر یہاں آنا چاہیں گی؟“

اس نے بڑی نرمی سے مثال کو آسان لفظوں میں جواب دینے کی کوشش کی تھی۔

”وہ آ بھی سکتی ہیں۔“ مثال نے جیسے کسی گہری سوچ میں الجھتے ہوئے اس سے کہا، عکس کو اب بھی اس کی بات کی سمجھ میں نہیں آئی۔

”ان کے لیے یہاں آنا مشکل ہے، میں نے تمہیں بتایا کہ وہ اپنے گھر اور شوہر کو چھوڑ کر کہیں اور تو نہیں جاسکتیں۔ وہ وہاں بہت خوش ہیں۔“

”No she is not“ اس نے مثال کو کہتے سنا عکس نے بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھا، یہ مناسب نہیں تھا لیکن وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

”وہ خوش نہیں ہیں؟“

”no“ مثال نے یک لفظی جواب دیا، وہ اب ایک بچے کی اس الجھن کا شکار ہو رہی تھی جو اسے راز رکھنے نہ رکھنے کے درمیان فیصلہ نہ کر پانے والی صورت حال میں رکھے ہوئے تھی۔ اس ایک لفظی جواب نے عکس کو مزید سوالوں پر مجبور کر دیا تھا۔

”کیوں خوش نہیں ہیں؟“ مثال اس کے سوال کے جواب میں کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے جیسے کچھ پریشان سے انداز میں مدھم آواز میں کہا۔

نیاز ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ وہ کتابوں میں محبت کے بارے میں لکھی باتوں پر یقین نہیں کرتی تھی لیکن محبت پر کرتی تھی اور اس کا یہ یقین اس شام بری طرح ڈنگا یا تھا۔

☆☆☆

رات کے پچھلے پہر کا کوئی وقت تھا جب اس کی آنکھ کھلی تھی چند لمحوں کے لیے اسے لگا جیسے طفل جاگا ہوا تھا اور اس کی آنکھ طفل کے ہلنے سے کھلی ہوئی۔ کر دٹ لینے پر اسے طفل تو اسی طرح گہری نیند میں نظر آیا لیکن شیردل اپنے بستر پر نظر نہیں آتا تھا۔ ہاتھ روم کی لائٹ بھی آف تھی۔ عکس کچھ تشویش اور حیرانی سے اٹھ کر بیڈ روم سے باہر آئی تھی وہ باہر کارڈز کی نیم تاریکی میں قدم کھڑکیوں کے پاس پڑی ایک کرسی پر بیٹھا سرکٹ پی رہا تھا۔۔۔۔۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے نیم تاریکی میں عکس کو دیکھنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ عکس نے کارڈز کی ایک فنی لائٹ آن کر دی۔ وہ اسی طرح سرکٹ پیتا رہا، وہ آکر اس کے برابر میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

”نیند نہیں آرہی تھی مجھے۔“ شیردل نے سرکٹ کو منہ سے نکالتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔  
 ”میں جانتی تھی آئے گی بھی نہیں۔“ اس نے مدھم آواز میں کہا۔ شیردل نے اس کا چہرہ دیکھا پھر نظر چرائی۔  
 ”اس سے بات کرو۔۔۔۔۔ آخر وہ مصیبت میں ہے تو ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے، تم اس کے کزن بھی ہو۔۔۔۔۔ خون کا رشتہ ہے تمہارا اس سے۔۔۔۔۔ محبت کا رشتہ نہیں بھی بھاتے تو۔۔۔۔۔“ عکس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆

”سب کچھ بالکل ٹھیک ہے۔“ شہر بانو نے کچھ دیر کے لیے ماں کو دیکھتے رہنے کے بعد نظریں ہٹائی تھیں۔ شرمین کا وہ سوال اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا لیکن شرمین کا اس طرح ایک دوسرے شہر سے اچانک اس کے پاس آنا غیر متوقع تھا۔ داؤد اور اس کے درمیان شروع سے ہی اختلافات ابھرتا شروع ہو گئے تھے اور شرمین ان اختلافات سے واقف تھی اس لیے شہر بانو نے اس کے اس سوال کو ہمیشہ کی طرح ایک روشن سوال کا سوال سمجھا تھا وہ دونوں ابھی رات کے کھانے کے بعد کافی کے گگ لے کر بیٹھی تھیں جب شرمین نے یہ سوال کیا تھا۔

”داؤد تم پر ہاتھ اٹھاتا ہے کیا؟“ شرمین کے اگلے سوال نے کافی کاسپ لیتی شہر بانو کو بخند کر دیا تھا۔ اس کا رنگ اڑا تھا اور شرمین نے بے حد تکلیف سے اپنی اولاد کے تاثرات ٹوٹس کیے تھے۔ ان کا دل اس کے تاثرات دیکھ کر جیسے ڈوبا تھا۔  
 ”آپ سے کس نے کہا؟“ شہر بانو نے ہاں یا نہ کہنے کے بجائے کافی کا کپ نیچے رکھ کر کچھ اضطراب کے عالم میں شرمین سے پوچھا۔

”شیردل نے“ شہر بانو کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔ ”اس نے پرسوں فون کیا تھا مجھے۔۔۔۔۔ مثال نے اسے تمہارے اور داؤد کے حوالے سے کچھ بتایا ہے وہ بہت اپ سیٹ تھا۔ میں بھی بہت اپ سیٹ ہوئی، جھگڑوں کا تو میں جانتی تھی لیکن تم نے بھی یہ نہیں بتایا کہ معاملات اس حد تک بگڑ چکے ہیں۔“ شرمین بے حد اضطراب کے عالم میں کہتی رہیں اور شہر بانو اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ عجیب صدمے کی کیفیت میں بیٹھی رہی۔ وہ بھی شیردل کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ بھی داؤد کے ساتھ اچھی زندگی گزار رہی تھی ویسی ہی اچھی زندگی جیسی وہ عکس کے ساتھ گزار رہا تھا لیکن اس کا بھانڈا بچ چورا ہے پر پھوٹا تھا اور مثال وہ کیسے جانتی تھی۔۔۔۔۔ وہ بل بھر میں بہت سے لوگوں کے سامنے نظریں اٹھانے اور نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی تھی۔

”اس نے مثال کو واپس لینے کے حوالے سے کچھ کہا ہے کیا؟“ شہر بانو نے بے حد اضطراب کے عالم میں کہا۔  
 ”نہیں اس نے مثال کے حوالے سے کچھ نہیں کہا۔ صرف تمہارے حوالے سے بات کی۔“ شرمین نے کہا۔  
 ”لیکن پھر کس لیے اسے آپ سے بات کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔“ شہر بانو نے جین تھی وہ یہ ماننے پر تیار ہی نہیں تھی کہ شیردل اس کے اور صرف اس کے حوالے سے متکثر ہوا تھا۔ وہ یہ سوچ کر بوکھلائی ہوئی تھی کہ وہ مثال کی کسڈی کے حوالے سے اب ضرور اس سے بات کرے گا۔

”اس نے مجھ سے صرف یہ کہا کہ مجھے تمہارے بارے میں پتا ہونا چاہیے۔“ شرمین نے کہا۔ ”اگر داؤد اور تمہارے درمیان کوئی اختلافات ہیں تو مجھے ان کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، شرمین اسے بتا رہی تھی۔“ لیکن اسے کیا کہتی۔۔۔۔۔  
 ”آپ نے اسے میرے اور داؤد کے جھگڑوں کے بارے میں بتایا؟“ شہر بانو کچھ اور اپ سیٹ ہوئی تھی۔

”because he hit him“ (کیونکہ وہ انہیں مارتے ہیں) مدھم آواز میں کہے ہوئے اس جملے نے عکس کو کچھ دیر کے لیے فریز کر دیا تھا۔  
 ”only sometimes.....I mean not always“

مثال نے ایک دم خود ہی جیسے کچھ سمجھ کی یوں جیسے اپنی غماست میں وہ معاملے کی سنگینی کو کم کرنا چاہتی ہو۔  
 بعض انکشاف انسان کی سمجھ میں نہیں آتے عکس کو بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اس راز کو جاننے کے بعد کیا کرے۔۔۔۔۔  
 مثال کو مزید کریدے یا اس کی طرح خاموش ہو جائے یا داؤد کو ملامت کرے یا شہر بانو سے ہمدردی۔۔۔۔۔ مثال سر جھکائے اسکرینل کے چمرو جوڑنے میں مصروف تھی یوں جیسے وہ اس راز کو اس کے ساتھ شیئر کر لینے کے بعد اب نام تھی۔ عکس شاک کے عالم میں اس کے پاس بیٹھی رہی۔۔۔۔۔ اتنے عرصے میں اسے یہ اندازہ تھا کہ مثال اور شہر بانو کے درمیان بہت مسئلے ہیں مگر شہر بانو اور داؤد کے درمیان بھی سب کچھ ٹھیک نہیں تھا یہ اسے اندازہ نہیں ہوا تھا۔ وہ بھی کیسے سکتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ یہ بات شیردل سے شیئر کرے یا نہ کرے۔۔۔۔۔ اور وہ مثال کے پورے قیام کے دوران اس ایک آنکھیں کا شکار رہی تھی۔

”شرمین آئی کو یہ سب پتا ہے؟“ اس نے اس دن مثال کے انکشافات کے بعد مثال سے پوچھا تھا۔  
 ”I dont know“ جواب پھر مختصر تھا۔ عکس نے جیسے کوئی راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی جو ناکام ہوئی تھی۔  
 مثال کے واپس جانے کے بعد بھی عکس اس انکشاف کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکی اور اس نے بالآخر شیردل سے جب ڈیک اینڈریریہ بات شیئر کی تو وہ بھی کچھ دیر کے لیے اسی کی طرح ہکا بکارہ گیا تھا۔  
 ”تمہیں مجھے اسی وقت بتانا چاہیے تھا اس نے کہا تھا اور وہ اب بے حد متکثر نظر آنے لگا تھا۔

”میں بتانا چاہتی تھی لیکن ڈیل مائنڈ ڈھونڈ رہی تھی۔“  
 ”داؤد ایسا آدمی تو نہیں ہے کہ مار پیٹ کرے۔“ شیردل بہت الجھ گیا تھا، وہ داؤد کو بہت اچھی طرح جانتا تھا اور اس سے بہت بار مل بھی چکا تھا۔

”لیکن کچھ نہ کچھ تو ہو رہا ہے ان کے گھر میں جو مثال کو ڈسٹرب کر رہا ہے۔“ عکس نے کہا تھا۔  
 ”اگر وہاں یہ سب ہو رہا ہے تو پھر مثال کو وہاں نہیں ہونا چاہیے، میں اپنی بیٹی کو وہاں سے لے آؤں گا۔“ شیردل کو بات کرنے کے بعد احساس ہوا، وہ اسے بہت عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”کیا ہوا؟“  
 ”تم صرف مثال کے بارے میں فکر مند ہو، شہر بانو کے بارے میں نہیں۔۔۔۔۔؟“ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کچھ دیر کے لیے بے حد خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر شیردل نے اس سے نظریں ہٹائیں۔  
 ”نہیں۔“ اس کے لہجے میں عجیب سی سرد مہری تھی۔

”مجھے یقین نہیں آرہا شیردل۔“ عکس نے جیسے اسے ملامت کرنے والے انداز میں کہا۔  
 ”مجھے کیوں پروا ہونی چاہیے؟ میرا اور اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔“ شیردل نے کچھ اکھڑے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

”وہ تمہاری بیوی رہ چکی ہے۔ تمہاری بیٹی کی ماں ہے، کبھی تم اس سے بہت محبت کرتے تھے۔“ عکس نے جیسے اسے یاد دلایا۔  
 ”تو۔۔۔۔۔؟“ اس نے بات کاٹتے ہوئے اسی انداز میں اس سے پوچھا۔

”تو تمہیں اس کی پروا ہونی چاہیے۔ بہت زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت۔۔۔۔۔ کم از کم اتنی جتنی ایک انسان کو کسی دوسرے انسان کے لیے ہوتی ہے۔“ شیردل کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

”میرے پروا کرنے سے کیا ہوگا، میں کچھ نہیں کر سکتا اس کے لیے۔۔۔۔۔ داؤد اس کا اپنا انتخاب تھا، اب اگر وہ انتخاب اس کے لیے ٹھیک نہیں نکلا تو میں کیا کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔ افسوس کرنے کے علاوہ۔۔۔۔۔“ وہ کہتا ہوا اٹھ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ عکس وہیں بیٹھی رہی۔ شیردل نے جو بھی کہا تھا بالکل ٹھیک کہا تھا کوئی بھی سمجھدار آدمی یہی کہتا۔ اس کے باوجود اسے جیسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ شہر بانو سے اس حد تک لا تعلق ہو سکتا تھا اور کیسے ہو سکتا تھا اس نے اس کا اور شہر بانو کا تعلق ان کی شادی دیکھی تھی۔۔۔۔۔ وہ شہر بانو کے بارے میں شیردل کی فیلنگو سے بھی واقف تھی۔ وہ کبھی اس کی گفتگو کے ہر دوسرے جملے میں آتی تھی اور وہ اب اس بات سے بھی بے حس تھا کہ وہ تکلیف میں تھی۔ انسان کسی کو اتنی آسانی سے بھلا سکتا ہے؟ اتنی آسانی سے اس سے بے



☆ ☆ ☆  
 ”تم اپنے پاپا سے میرے بارے میں بھی کبھی کوئی بات نہیں کرو گی۔“ شرمین دوسرے دن داؤد سے بات کیے بغیر چلی گئی تھیں اور ان کے جانے کے بعد شہر بانو نے مثال کو پاس بٹھالیا تھا۔  
 ”میں نے پاپا سے آپ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔“ مثال نے جوابا کہا۔  
 ”stop lieing“ (جھوٹ بولنا) شہر بانو نے چاہتے ہوئے بھی rude ہو گئی تھی۔  
 ”I am not lieing“ مثال بھی ماں کے اس طرح بات کرنے پر irritate ہوئی تھی۔

”تم نے پاپا سے کیوں کہا کہ.....“ شہر بانو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس جملے کو کس طرح مکمل کرے۔ مثال اس پر نظر سے جمائے ہوئے تھی۔ ”میرے اور داؤد کے درمیان جو کچھ بھی ہوا وہ تمہارے پاپا کا مسئلہ نہیں ہے۔ تمہیں ان کو کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے، تم نے شیردل سے کیوں کہا کہ داؤد مجھے مارتا ہے۔“

”میں نے پاپا کو نہیں بتایا عکس آنٹی کو بتایا تھا۔“ اس کے جواب نے شہر بانو کی رہی سہی عزت نفس بھی اتار کر رکھ دی تھی۔ وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔ وہ جیسے تماشا بن گئی تھی۔ ایک کے بعد ایک شکست عکس شیردل کے سامنے اس کی زندگی کی بساط پر موجود مردوں میں سے کوئی چل نہیں پار تھا۔

”آئندہ بھی ان لوگوں سے میرے بارے میں کچھ مت کہنا..... I am warning you“ اس نے حلق کے بل چلا کر مثال سے کہا اور پھر روتے ہوئے کمرے نکل گئی۔ مثال سہم گئی تھی۔ مٹی اب ویسے کیوں نہیں رہتی تھیں جیسے پہلے رہتی تھیں..... خوش..... مسکراتے ہوئے..... مجھ سے ڈھیروں باتیں کرنے والی..... مٹی، عکس آنٹی جیسی کیوں نہیں ہو سکتیں..... وہ غصہ نہیں کرتیں..... وہ shout نہیں کرتیں..... وہ تو طوٹی کے ساتھ اس طرح بات نہیں کرتیں جیسے مٹی میرے ساتھ..... آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ مثال نہیں جانتی تھی وہ ایک ایسا سوازنہ کر رہی تھی جو اگر شہر بانو جان جاتی تو اس کی اذیت میں اور اضافہ ہو جاتا۔

☆ ☆ ☆  
 خیر دین کی موت نے کچھ مہینوں کے لیے عکس اور شیردل کی توجہ شہر بانو سے ہٹا دی تھی۔ وہ عکس مراد علی کی زندگی کا ایک اور تکلیف دہ دور تھا۔ شیردل جیسا ساتھی اگر اس کی زندگی میں نہ ہوتا تو اس تکلیف سے گزرنے اور سنبھلنے میں اسے بہت وقت لگ جاتا لیکن شیردل نے اسے سنبھال لیا تھا، وہ جانتی تھی خیر دین دنیا سے بہت مطمئن اور پرسکون ہو کر گیا تھا اور اس کی ایک وجہ شیردل اور طغرل بھی تھے اور اس دوسرے بچے کی خبر بھی جو اسے خیر دین کی اس آخری علالت سے کچھ دن پہلے ملی تھی۔  
 خیر دین کے انتقال کے تین ماہ بعد عکس کو ایک دن مثال سے بات کرتے ہوئے اس مسئلے کا خیال آیا تھا۔ جو مثال نے اس سے شیئر کیا تھا۔

”وہ expect کر رہی ہے اور وہ داؤد کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔“ skype پر بات ختم کرنے کے بعد اس نے شہر بانو کے متعلق شیردل سے پوچھا تھا اور اس نے مدہم آواز میں اسے بتایا۔ وہ مزید سوال نہیں کر سکی۔ فیصلہ صحیح تھا یا غلط شہر بانو کا فیصلہ تھا اور ان حالات میں کیا گیا تھا جب اس کے پاس آپشن نہ ہونے کے برابر تھے۔ بات وہیں ختم ہو گئی تھی اور شاید یہ موضوع دوبارہ زیر بحث نہ آتا اگر چند ماہ کے بعد انہیں شہر بانو کے miscarriage کا پتا نہ چلتا، وجوہات کیا تھیں، شرمین یا مثال شیردل کو یہ نہیں بتا سکے تھے..... مگر وہ اور عکس دونوں ہی اس خبر کو سن کر اپ سیٹ ہوئے تھے۔ عکس شہر بانو کی تکلیف اور ذہنی کیفیت کا اندازہ شیردل سے زیادہ اچھی طرح لگا سکتی تھی، خاص طور پر تب جب وہ خود ایسی حالت میں تھی..... وہ پہلا موقع تھا جب وہ شہر بانو کو کونوں کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی، تب شہر بانو کے miscarriage کو دو ہفتے گزر چکے تھے۔ عکس مراد علی کے تعارف سے پہلے ہی صرف اس کی آواز سننے پر بھی وہ اسے پہچان گئی تھی۔ کچھ دیر کے لیے اس کے حواس نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ کال اتنی ہی unexpected تھی۔

”مجھے آپ کے miscarriage کا پتا چلا..... بہت افسوس ہوا ہے۔ صرف اس لیے بات کرنا چاہتی تھی میں۔“ اس نے شہر بانو سے علیک سلیک کے بعد کہا تھا پھر اس کے جواب کا انتظار کیا۔ شہر بانو اسی طرح چپ رہی..... عکس نے چند اور جملے بولے تھے۔ شہر بانو نے اس کا بھی جواب نہیں دیا۔ وہ ہمیشہ سوچتی تھی کہ وہ اگر کبھی عکس مراد علی سے بات کرے گی تو اسے

”تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ داؤد تم پر ہاتھ اٹھاتا ہے؟“ شرمین نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا۔  
 ”پہلے ہاتھ نہیں اٹھاتا تھا..... جب سے (بے روزگار) ہوا تھا بات بات پر بہت اگے ریو ہو جاتا ہے.....“ اس نے چند لمحوں کے بعد عجیب سی ندامت کے ساتھ شرمین کو بتایا۔  
 ”تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا ہمیں اور فاروق تو دماغ درست کر دیتے اس کا..... ایک بار پولیس کو کال کر دیتیں چار دن پولیس اسٹیشن رہ کر آتا تو دوبارہ تم پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے سو بار سوچتا۔“ شرمین بہت غصہ ناک ہو کر اس سے کہہ رہی تھیں وہ نو کے بغیر ان کی بات سنتی رہی۔  
 ”پھر اس کے بعد کیا ہوتا ایک بار پھر بریک اپ..... مٹی میں بار بار گھر توڑ اور بنا نہیں سکتی۔“ وہ بات کرتے کرتے آبدیدہ ہو گئی تھی۔

”but you don't deserve this life“ شرمین بھی رنجیدہ ہو گئی تھیں۔  
 ”پتا نہیں میں کیا deserve کرتی ہوں کیا نہیں..... لیکن بس ایک گھر بنائے رکھنا چاہتی ہوں میں اب..... کچھ عرصے میں جا ب ہو جائے گی تو اس کا یہ ڈپریشن وغیرہ بھی ختم ہونا شروع ہو جائے گا۔“ وہ پتا نہیں کیا تو جیہد دے رہی تھی اور کس کو دے رہی تھی۔

”اور اگر نہ ہوئے تو؟“ شرمین نے اس سے پوچھا۔  
 ”آپ صرف میرے لیے دعا کریں۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں ماں سے کہا۔  
 ”میں داؤد کا دماغ درست کر دوں گی۔“  
 ”مٹی آپ اس سے اس ایٹو پر کوئی بات نہیں کریں گی..... میں گھر میں کوئی ہنگامہ نہیں چاہتی..... آپ چلی جائیں گی لیکن مجھے تو یہیں رہنا ہے۔“ اس نے ماں کو دیکھا تھا۔

”تم ایک abusive relationship میں رہنا چاہتی ہو..... کیوں؟“ اس نے بہت دیر تک خاموش رہنے کے بعد چکی ہوئی آواز میں کہا۔

”مٹی میں expect کر رہی ہوں۔“ چند لمحوں تک شرمین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔  
 ”لیکن تم نے تو فیملی اشارت کرنے کا ارادہ ابھی ترک کر دیا تھا۔“ وہ ابھی تھیں۔  
 ”ہاں..... لیکن بعض چیزیں unexpected ہوتی ہیں۔“ اس نے مدہم آواز میں کہا۔  
 ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تم abort کروا سکتی ہو اس بچے کو..... اس mess میں پڑے رہنے کے لیے یہ بچہ زنجیر نہیں ہونا چاہیے تمہارے ہیروں میں۔“ شرمین نے چند لمحوں کے بعد کہا۔

”جیسے آپ نے abort کروایا تھا۔“ اس کے سوال نے شرمین کو چند لمحوں کے لیے گونگا کر دیا تھا۔ ”میں یہ نہیں کر سکتی..... میں اس بچے کو کسی چیز کی سزا نہیں دے سکتی.....“ وہ رنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ ”آپ اس بچے کو abort نہ کروائیں تو میرا کوئی بہن، بھائی ہوتا، کسی سے اپنی تکلیف شیئر کر سکتی میں۔“  
 حماد اور اسد.....

”وہ دونوں میرے بھائی نہیں ہیں۔ وہ آپ کے اور انکل فاروق کے بیٹے ہیں لیکن میرے بھائی نہیں ہیں۔“ شہر بانو نے اسے بات کرنے سے روک دیا۔

”تم نے ہمیشہ اپنے آپ کو دوسروں سے الگ تھلک رکھا، گھلنے پلنے کی کوشش کرتیں تو ان کے ساتھ بھی تمہارا کوئی ریلیشن شپ بن ہی جاتا۔“ شرمین نے اس کو blame کیا تھا اس بات کا احساس کیے بغیر کہ وہ ذہنی طور پر کس اذیت اور خود ترسی کا شکار تھی۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں..... سارے flaws (خامیاں) مجھ میں ہی ہیں..... ساری غلطیاں صرف میری ہیں۔ ساری قیمت بھی تو میں ہی ادا کر رہی ہوں اور میں ہی ادا کروں گی۔“ وہ رنجیدگی سے کہتے ہوئے کافی کا کپ وہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

ان کے ساتھ کچھ بھی شیئر کرنے کو تیار نہیں تھی۔  
وہ اس سے اگلے سال پاکستان نہیں آسکی تھی۔ شہر بانو اس کے اور شرمین کے ساتھ چھٹیوں میں آسٹریلیا چلی گئی تھی۔  
شیردل اپنی پروفیشنل مصروفیات میں اتنا مصروف ہو گیا تھا کہ اس کی امریکا کی جانے والی کالز میں بھی وقفہ آنے لگا تھا صرف  
عکس بھی جو آپ بھی Skype کے ذریعے ہر دوسرے تیسرے دن فونل اور باڈل کے ساتھ مثال کی بات کروانے کی کوشش  
کرتی رہتی۔

☆☆☆

جواب بہتر ہو گئی تھی لیکن جاب اور جاب سے متعلقہ مصروفیات بھی بہت زیادہ ہو گئی تھیں اور شہر بانو بالآخر اس زندگی اور اس  
مصروفیت کی عادی ہونے لگی تھی، مصروفیت اچھی تھی کم از کم یہ اسے بار بار پچھتاؤوں کے لیے وقت اور موقع نہیں دیتی تھی۔  
میکانیک زندگی تھی لیکن پھر بھی بہتر تھی۔

وہ مثال کی گیارہویں سالگرہ کے چند دن بعد کی بات تھی جب وہ آفس میں تھی اور اسے لنگ ٹائم کے قریب مثال کے  
اسکول سے فون آیا تھا۔ انہوں نے اسے تفصیلات نہیں بتائی تھیں لیکن اسے فوری طور پر اسکول پہنچنے کا کہا تھا۔ شہر بانو بے حد  
غیر اہم اور بدحواسی میں اسکول پہنچی تھی اور جو کچھ اسے وہاں جا کر بتا چلا تھا اسے لگا تھا جیسے آسمان اس کے سر پر گر پڑا تھا۔  
مثال کا ایروے اسٹرکشن میں کسی دوسرے نیچر کی نظر میں آیا تھا اور پکڑا گیا تھا۔ خوش قسمتی صرف یہ  
ہوئی تھی کہ مثال بروقت لنگ لگی تھی۔

اسکول ہیڈ مسٹر ایس اس واقعے کی تفصیلات بتاتے ہوئے اس سے معذرت کر رہی تھی اور شہر بانو کنگ کچھ نہ سمجھتے ہوئے  
اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی، یہ کیسے ہو سکتا تھا اور پھر اس ہی کی بیٹی کے ساتھ۔ زندگی میں ابھی مصیبتیں کم تھیں۔ اس نے اپنے ٹھنڈے  
ہوتے ہوئے وجود کے ساتھ سوچا، پھر جیسے وہ شدید غم و غصے کا شکار ہو کر پرنسپل پر برستی رہی تھی جو اس کی باتیں سنتی ہوئی اسے  
وضاحتیں دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا اگر بس چلتا تو وہ اس کے انسٹرکٹر کو جا کر ابھی شوٹ کر دیتی۔ یہ کیسے ہوا کہ اس نے  
اس کی مثال کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا۔ پرنسپل نے اسے مثال کے رویے کے بارے میں کچھ بتانے کی کوشش کی تھی مگر وہ  
تشویش کے عالم میں اس آفس سے نکل کر مثال کے پاس آگئی تھی وہ ایک دوسرے آفس میں بیٹھی تھی، اس نے ماں کو ایک نظر  
دیکھا تھا لیکن پھر اسی طرح سر جھکا لیا جیسے اس نے پہلے جھکا یا ہوا تھا۔ وہ اس کے قریب آئی اور اس نے اسے گلے لگایا تھا مثال  
نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ کم صدم تھی، شہر بانو کو لگا وہ شاک میں تھی وہ اسے لے کر گھر آئی۔

ایرک چند مہینے پہلے ہی اس کے اسکول میں آیا تھا اور مثال مسلسل اس سے اس کا ذکر کر رہی تھی اور یہ بے حد  
Unusual تھا کیونکہ مثال بہت کم اس طرح اسکول کے کسی نیچر کی تعریف یا باتیں کرتی تھی اور اب وہی ایرک اس کی  
زندگی تباہ کر دینے کا سبب بننے بننے رہ گیا تھا۔

وہ رات شہر بانو کی زندگی کی ایک اور مشکل راتوں میں سے ایک تھی۔ وہ ایک چیز جس کو اس نے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا وہ  
اس رات جا کر اس نے بالآخر تسلیم کر لی تھی۔ وہ بھی تب جب وہ ماں کے طور پر اس anguish سے گزری تھی، پہلی بار  
زندگی میں اس نے ماں لیا تھا کہ اس کے پاپا نے عکس مراد علی کے ساتھ زیادتی کی ہوئی تھی۔ وہ اس کی زندگی کے ہر دور فرشتے  
تھے۔ عکس مراد علی کی زندگی کے دن تھے۔ اور عکس مراد علی نے ان پر جو اثر ام لگایا تھا وہ ناقابل یقین کسی لیکن ناممکنات میں  
سے نہیں تھا۔ اس رات پہلی بار اس نے آئینے میں حقیقت اور سچ کا وہ چہرہ دیکھنے کی کوشش کی تھی جو وہ ہمیشہ جھٹلاتی رہی تھی۔  
شرمین کے انکشافات کے باوجود بھی۔۔۔۔۔ پہلی بار اس نے اپنے باپ کی بیٹی بن کر نہیں صرف غیر جانبداری سے سوچا تھا اور وہ  
اپنے آپ سے نظریں نہیں ملا سکی تھی اور شاید یہی وہ احساس تھا جس سے بچنے کے لیے وہ اتنے سالوں سے اپنے باپ کو مجرم  
ماننے سے انکار کر رہی تھی۔۔۔۔۔ وہ اسے مجرم مان لیتی تو وہ ایک شخص بھی اس کی زندگی کی اس فہرست سے غائب نہ ہو جاتا جسے  
اس نے آئیڈیل کا درجہ دیا ہوا تھا۔ اور زندگی میں ایک آئیڈیل کو انسانیت سے گرتے دیکھنا انسان کی ساری قدریں بھلا دیتا  
ہے خاص طور پر تب جب وہ آئیڈیل ایک خونی رشتہ بھی ہو۔

☆☆☆

”شہر بانو نے فون کیا تھا مجھے۔۔۔۔۔ وہ پاکستان آ رہی ہے۔“ شیردل ڈنڈر پر اس رات عکس کی بات سن کر حیران رہ گیا تھا۔

اس پر شدید غصہ آئے گا وہ اسے بہت برا بھلا کہے گی لیکن کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ غصہ بھر کر وقتے وقتے سے اس کے جواب کے  
انتظار میں بولتی رہی تھی اور شہر بانو رونی رہی تھی۔ اسے زندگی میں کم از کم اس عورت کی بھر دی نہیں چاہیے تھی لیکن اسی عورت  
کی بھر دی سے اس کے اندر کا غصہ اور خلی آنسو بن کر بہنے لگے تھے۔

”میں نے فونل کی تصویریں دیکھی ہیں وہ بہت خوب صورت ہے۔“ شہر بانو کو سمجھ میں نہیں آیا اس وقت فونل کیسے یاد  
آ گیا تھا اور اس کا ذکر وہ بھی تب۔۔۔۔۔ جب عکس اس سے کچھ اور بات کر رہی تھی۔  
عکس نے اس کی آواز کی بھراہٹ محسوس کی تھی پھر اس کے لفظوں کی بے ربطی بھی۔۔۔۔۔ وہ آنسو جوفون لائن کے ایک  
طرف تھے اب دوسری طرف بھی بہنے لگے تھے۔ اس نے شہر بانو سے مزید کچھ کہنے کی کوشش کی مگر شہر بانو نے فون بند کر دیا۔۔۔۔۔  
وہ عکس مراد علی کے سامنے ریت کی دیوار کی طرح ڈھسے نہیں جانا چاہتی تھی۔ اپنا کچھ مجرم رکھنا چاہتی تھی۔ عکس نے اس کے بعد  
کئی بار اسے فون کرنے کی کوشش کی تھی وہ یا تو کال ہی نہیں لیتی تھی اور اگر لیتی تو اس کی آواز سننے ہی فون بند کر دیتی۔۔۔۔۔

پانچویں مہینے میں ہونے والے اس miscarriage نے شہر بانو کی صرف ذہنی اور جذباتی کیفیت کو متاثر نہیں کیا  
تھا بلکہ اس کی شادی کو بھی بری طرح ہلا دیا تھا۔ شہر بانو اس ایک حادثے سے اتنی تباہ سیٹ نہیں ہوئی تھی جتنی اس پرگینسی کے  
دوران جس کیرج کے بعد داؤد کی سر دھری اور بے نیازی سے۔۔۔۔۔ اسے نہ اس کی پرگینسی کی ایکساٹمنٹ تھی نہ ہی بچے کے  
ضائع ہونے پر کسی طرح کی کوئی پریشانی یا افسوس۔ وہ اس کے مس کیرج کے دن اسے اسپتال میں اکبلا چھوڑ کر کسی جاب  
انٹرویو کے لیے چلا گیا تھا۔ فائنل کرائز اور روپے پیسے کی تنگی انسان کو صرف توڑتی ہے لیکن اپنے خونی رشتوں اور لائف  
پارٹنر کی خود غرضی اور بے حس انسان کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ شہر بانو کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

تقریباً چھ ماہ گزرنے کے بعد وہ بالآخر اس شادی کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی تھی۔ اسے تب تک یوں لگنے لگا تھا کہ  
وہ اگر چند ماہ اور اس شادی میں رہی تو پھر شاید وہ اس کے بعد ذہنی امراض کے کسی اسپتال میں پائی جائے گی۔

مثال ان دنوں ایک بار پھر چھٹیوں میں پاکستان تھی۔ جب شہر بانو اور داؤد کے درمیان طلاق ہوئی تھی۔ وہ اس طلاق  
کے بعد شرمین اور فاروق کی ہزار کوششوں کے باوجود ان کے پاس جا کر رہنے پر تیار نہیں ہوئی۔ وہ اب مثال کے ساتھ کوئی  
اپارٹمنٹ کرائے پر لے کر اکٹھے رہنا چاہتی تھی۔ جاب اس کی اچھی تھی اور وہ مثال کے ساتھ آرام سے رہ سکتی تھی۔ اسے اب  
شیردل کی اس مابانہ بھیجی جانے والی رقم کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

☆☆☆

”آئی میں می کے پاس نہیں جانا چاہتی آپ مجھے ہمیں رہنے دیں میں طوفی اور باڈل کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“  
چھٹیاں ختم ہونے کے قریب پہنچنے پر مثال نے ایک دن بہت اکتاہٹ آمیز انداز میں عکس سے کہا۔

”بیٹا تمہاری می کو اس وقت تمہاری بہت ضرورت ہے وہ وہاں اکیلی ہیں، عکس نے اسے سمجھایا تھا وہ شہر بانو اور داؤد کی  
طلاق کے بارے میں جان چکی تھی۔

”می کو میری ضرورت نہیں ہے۔ وہ میرے بغیر بھی بہت خوش ہیں۔ She can live without me“ وہ عکس کے سمجھانے پر جیسے بہت مایوس ہوئی تھی اور بہت دیر تک عکس سے امریکا نہ جانے کے لیے  
ضد کرتی رہی تھی۔ وہ پہلا موقع تھا جب اس نے عکس سے کسی بات پر ضد کی تھی، عکس حیران تھی وہ کیوں شہر بانو کے ساتھ رہنے  
پر تیار نہیں تھی۔

”وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ می کے پاس میرے لیے نام ہی نہیں۔ میں سارا دن اکیلے رہتی ہوں، اکیلے کمپیوٹر پر گیمز  
کھیل کھیل کر تھک جاتی ہوں۔“ اس آٹھ سالہ بچی نے عجیب بے بسی اور سبے چارگی سے عکس کے ساتھ اپنی تکلیف شیئر کی تھی وہ  
بہت دیر اسے بیٹھ کر سمجھاتی رہی تھی۔ مثال نے بالآخر ضد ختم کر دی تھی لیکن وہ بے حد مایوس اور دل گرفتہ لگی تھی۔

وہ پہلا موقع تھا جب اس کے پاکستان سے چلے جانے کے بعد بھی عکس کئی دن اس کے بارے میں سوچتی اور پریشان  
ہوتی رہی۔ ہمیشہ کی اس طرح امریکا جاتے ہی اس نے Skype پر ان سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ کئی ہفتوں کے بعد  
Skype پر آئی تھی اور اس پر ایک نظر ڈالتے ہی عکس اور شیردل کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی وجہ سے بہت اپ سیٹ ہے لیکن وہ

he did to you۔ (جو کچھ انہوں نے کیا میں اس پر معافی چاہتی ہوں) زندگی عجیب شے ہے بعض دفعہ وہ باتیں ان سے کہلاتی ہے جن سے آپ کو بھی وہ سننے کی توقع تک نہیں ہوتی۔ عکس اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی جس کی آنکھیں اس وقت آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک ایک کر زبان سے کی گئی معذرت سے زیادہ مؤثر اس کی آنکھوں اور چہرے پر تحریر شرمندگی اور عذامت کا احساس تھا۔

عکس نے خود پر قابو پایا تھا وہ یہاں لان میں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا نہیں چاہتی تھی بہت نرمی سے اس نے شہر بانو کے کمرے کے آگے پر دھرے ہاتھ کو تھپکا۔

”وہ سب گزر گیا..... بہت عرصہ ہو گیا۔ میں نے اب اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے نہ ہی کسی معذرت کی۔ اس سب میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔“

”ہاں لیکن میں اس فیملی کا حصہ ہوں اور اس حوالے سے اپنے رول پر شرمندہ ہوں۔ صرف پاپا نے تمہیں تکلیف نہیں پہنچائی میں نے بھی.....“ شہر بانو بات کرتے کرتے رک گئی تھی۔

”تمہاری فیملی نے مجھے بہت تکلیف پہنچائی لیکن تمہاری کمی نے میرے نانا کی مالی مدد بھی کی تھی اس وقت جب ہم مالی طور پر بالکل تباہ ہو چکے تھے۔“ اس نے جیسے شہر بانو کا احساس جرم کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

”ایک لاکھ کی وہ رقم جو انہوں نے میرے نانا کو دی تھی۔ انہوں نے اسی رقم سے اپنی اور میری زندگی دوبارہ بنائی تھی۔“ شہر بانو نے کچھ الجھتے ہوئے اسے بات جاری رکھنے سے ٹوک دیا۔

”میں نے تمہارے نانا کو کوئی رقم نہیں دی تھی۔ وہ چیک لے کر گئی تھیں اور انہوں نے تمہارے نانا کو وہ رقم لینے پر مجبور کیا تھا لیکن انہوں نے وہ رقم نہیں لی تھی۔ میں نے مجھے خود بتایا تھا۔“ عکس چند لمبے پلکیں جھپکائے بغیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ خیر دین کی زندگی کا پہلا جھوٹ تھا اس سے اور وہ جھوٹ بھی کس جگہ آ کر کھلا تھا۔ وہ اسے شہر بانو کی ماں کا احسان مند کر کے شہر بانو کا گھر توڑنے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنی چڑیا کے گرد احسان کی لکشمیں دیکھا کھینچی تھی کیونکہ اسے یقین تھا وہ احسان فراموشی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس شخص کی بیٹی کا گھر اور زندگی بچانے کی کوشش کر رہا تھا جس نے خود اس کی اور اس کی چڑیا کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ وہ کیسا انسان تھا۔ عکس بہت دیر تک چپ رہی، کبھی لکھانے میں اسے چند سیکنڈز لگے تھے لیکن اس کیفیت سے نکلنے کے لیے بہت دیر..... وہ جو ایک بوجھ اس کے نانا نے اس کے کندھوں پر رکھا اسے جھکایا تھا وہ اس انکشاف نے اٹھالیا تھا۔ کیسا سکون اور اطمینان تھا جو عکس مراد علی نے محسوس کیا تھا۔

”Thank you۔“ اس نے شہر بانو سے کہا۔

”کس چیز کے لیے؟“ وہ الجھی۔

”ایک بوجھ ہٹانے کے لیے۔“

☆☆☆

شیردل کو لگا عکس کا دماغ خراب تھا۔

”اب تم یہ مت کہنا کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ اس نے شیردل کو جیسے کسی کتاب کی طرح پڑھا تھا۔ مثال کو پاکستان میں دو ہفتے ہو چکے تھے۔ شیردل اتنے سالوں بعد اپنی بیٹی کے اپنے پاس آ جانے پر بے حد خوش اور پرسکون تھا۔ اسے لگا تھا زندگی ایک بار پھر سے مکمل ہو گئی تھی اور اب اچانک اس رات عکس نے اس سے یہ بات کہہ دی تھی۔

”اگر یہ مذاق ہے تو یہ وہ مذاق ہے۔“ شیردل نے کچھ ہنسا ہوا اس سے کہا تھا۔

”میرا سٹینس آف ہیومر برا ہے لیکن اتنا برا بھی نہیں کہ میں اس طرح کی باتیں مذاق میں کرنے لگوں۔“ عکس نے جواباً بہت سنجیدگی سے کہا۔

”میں شہر بانو سے شادی کر لوں؟“ شیردل نے بے یقینی سے اس کے جملے کو دہرایا۔

”ہاں۔“ اس کے انداز میں اطمینان تھا جس نے شیردل کو ہلا دیا۔

”میں ساری زندگی بس یہی کرتا رہوں کہ ہر چار پانچ سال بعد شادی..... تم سمجھتی ہو شادی کے علاوہ میرے پاس کرنے کے لیے اور کوئی کام نہیں ہے۔ مجھے نہیں پتا تمہیں بیٹھے بیٹھے شہر بانو سے ہمدردی کا دورہ پڑا ہے یا کوئی اور وجہ ہے

”تمہیں فون کیا تھا.....؟ کیلی آ رہی ہے؟“

”ہاں..... مثال کو لے کر آ رہی ہے، مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔“

”کس لیے.....؟“

”پتا نہیں..... مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی.....“ وہ دونوں ہی کچھ حیران اور الجھے ہوئے تھے۔ عکس نے شیردل سے یہ بات شہر بانو کی لیکن پتا نہیں کیوں اسے یہ لگا تھا جیسے شہر بانو، مثال کو اس کے پاس چھوڑنے کے لیے آ رہی تھی۔ شاید وہ دوبارہ شادی کرنا چاہتی تھی اور مثال کی وجہ سے اسے کسی پریشانی کا سامنا تھا اس لیے اس نے اسے شیردل کو دے دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ عکس سوچ رہی تھی اور وہ تب تک یہ سارے اندازے لگاتی رہی جب تک شہر بانو ان کے گھر آئیں گئی۔

پہلی نظر شہر بانو پر ڈالتے ہی اس کو شاک لگا تھا۔ دس بیس سال نہیں گزرے تھے بس پانچ سال ہی تو گزرے تھے مگر وہ اپنی عمر سے کئی سال بڑی لگنے لگی تھی۔ حسن اور شکستگی جیسے اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ عکس کو اسے دیکھ کر تکلیف ہوئی تھی۔

”تم نہیں ملو گے اس سے؟“ اس نے پچھلی رات شیردل سے پوچھا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے جواباً کہا۔

”ملنا چاہیے۔“

”کیا کروں گا؟“ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اور ٹھیک کر رہا تھا کہ اس سے ملنے کے لیے وہاں نہیں تھا۔ عکس نے سوچا تھا شہر بانو کے لیے اس گھر میں اسے اور شیردل کو ایک جوڑے کے طور پر دیکھنا بہت تکلیف دہ ہوتا۔ کسی کے لیے بھی ہوتا..... اور شیردل کے لیے ان دونوں عورتوں کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھنا بہت آکڑ ہو جاتا۔

عکس کا اندازہ ٹھیک تھا وہ مثال کو مستقل طور پر وہاں چھوڑنے آئی تھی اور وہاں آنے کے چند منٹوں بعد ہی اس نے عکس کو یہ بتا دیا تھا۔

”کل واپسی کی فلائٹ ہے میری..... بس رک نہیں سکتی، میں چاہتی تھی کہ مثال کو خود یہاں چھوڑ جاؤں۔“ عکس نے اسے رکنے کے لیے کہا تھا اور اس نے جواباً کہا تھا۔ وہ دونوں اس وقت لان میں بیٹھی ہوئی تھیں اور ان سے کچھ فاصلے پر مثال، طفرل اور باڈل کے ساتھ بڑے جوش و خروش کے عالم میں کھیل رہی تھی۔ وہ ایک happy family تھی جس کا شہر بانو حصہ نہیں تھی۔ شہر بانو نے ایک لمحے کے لیے ان سب کو دیکھتے ہوئے سوچا اور کم از کم اب اس کی زندگی اس تنہائی میں نہیں گزرے گی جس میں اس کا اپنا بچپن گزرا تھا۔

”کل رات کی فلائٹ ہے..... تم اگر کل دوپہر کو بھی نکلو تو بہت آرام سے پہنچ سکتی ہو..... لاہور زیادہ دور تو نہیں ہے یہاں سے۔“ عکس نے اس کے آج ہی واپس جانے کے ارادے کو جان کر کہا۔ ایک عجیب سے آکڑ کیفیت کا شکار تھیں وہ دونوں اس وقت..... بات کرنے میں جھجک ہو رہی تھی۔ خاموش بیٹھے رہنے میں شرمندگی۔

”مثال یہاں رہے گی تو تم اکیلے امریکا میں کیسے رہو گی؟“ عکس نے اس سے پوچھا۔ یہ اندازہ کر لینے کے باوجود کہ وہ مثال کو اس کے پاس چھوڑ دینے کے ارادے سے آ رہی تھی۔ حیران تھی کہ شہر بانو نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا تھا۔

”میں اور مثال ایک ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ ہم دونوں ساتھ رہتے ہوئے بھی اکیلے ہیں۔ مجھے اس زندگی کی عادت ہو گئی ہے لیکن میں نہیں چاہتی مثال کو اس زندگی کی عادت ہو۔ میں چاہتی ہوں وہ شیردل کے پاس رہے۔ اس کے پاس بڑے بڑے۔“ شہر بانو نے مدھم آواز میں کہا۔ وہ اب بھی اسے وہ وجہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی جس نے اسے اتنا بڑا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس نے اسے یہ احساس دلایا تھا کہ وہ ایک غیر ذمے دار ماں ہے جو ایک بچی کی بھی حفاظت نہیں کر سکتی..... اور مثال کے ساتھ آئندہ کچھ برائے ہو اس خوف نے اسے مثال کو شیردل کے پاس لانے مجبور کر دیا تھا۔

”میں تم سے معافی بھی مانگنا چاہتی تھی۔“ عکس اس کی بات سننے سننے اس کے جملے پر چوبک پڑی۔

”مجھ سے معافی..... کس چیز کی؟“ وہ واقعی نہیں سمجھتی تھی۔

بہت دیر خاموش رہنے اور کچھ کہنے کی ہمت جمع کرنے کے بعد اس نے بالآخر عکس سے کہا۔

”پاپا نے جو کچھ کیا تھا بہت غلط کیا تھا..... بہت غلط..... am sorry for what

اسے باپ جیسی محبت دیں گے اور اس کی مٹی کے ساتھ مل کر رہ بھی سکتے ہیں لیکن اس کے بدلے وہ اس سے یہ چاہتے تھے کہ وہ..... عکس بہت ساری ای میلز مکمل پڑھ بھی نہیں سکتی تھی، اسے لگا وہ غلاطی اور گندگی کے ڈھیر پر بیٹھی تھی۔ باپ کی کوئی غلاطی اور تعفن انسان کے ذہن کے اندر موجود غلاطی اور تعفن کا مقابلہ نہیں کر سکتا، عکس کو بھی یہی لگا تھا وہ بھی غلاطی کے ایسے ہی تعفن زدہ ڈھیروں کو دیکھ رہی تھی جو معاشرے کے اچھے اور خالص شہریوں کے طور پر بہ ظاہر اپنی اپنی زندگیوں دوسروں کی زندگیوں کے پرچے اڑا کر گزار رہے تھے۔ digital کیمرے سے بنائی ہوئی وہ تصویریں اس نے پتے کی طرح لرزتے وجود کے ساتھ ان ای میلز سے delete کر دی تھیں جو ان میں سے چند لوگوں کے مطالبے پر گیارہ سال کی اس بچی نے ان کو بھیجی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی شیردل ان تصویروں کو دیکھے، ایک باپ کے طور پر وہ ان تصویروں کو دیکھ کر شاید دوبارہ کبھی سر بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ انہی ای میلز میں سے ایک ای میل میں ایرک کے ساتھ ہونے والے اس واقعے کی تفصیلات بھی تھیں جو مثال نے انہی میں سے کسی دوسرے مرد سے شیئر کی تھیں۔ وہ ایڈ گرتا می اس دوسرے شخص کی جوابی ای میل پوری نہیں پڑھ سکتی تھی۔ وہ بچی اور اس کی تکلیف ان سب مردوں کے لیے فٹ بال کا کام کر رہی تھی..... یا شاید ایک رولنگ اسٹون.....

مثال کی زندگی میں چڑیا کی طرح سات دوست بوئے نہیں تھے جن کے لیے وہ اسنووائٹ تھی۔ اس کی زندگی میں چند گدھے تھے جن کے سامنے وہ ایک مردار سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔

عکس نے ای میلز پڑھنی بند کر دیں۔ وہ اس جہنم سے گزری تھی، اس درد سے واقف تھی جس جہنم کی لپیٹ میں اس نے مثال کو دیکھا تھا..... اور اسے لگا اس کا وجود ایک بار پھر جلنے لگا تھا۔ وہ بھی تو شہباز حسین کی طرف اسی لیے جاتی تھی کیونکہ وہ اس کی، شرین اور شہر بانو کی زندگی کا حصہ بننا چاہتی تھی۔ اس پرفیکٹ لائف کا حصہ جسے وہ ہر روز لان میں اور اس گھر میں دیکھتی تھی..... وہ بھی کہیں نہ کہیں شہباز حسین میں وہ باپ دیکھتی تھی جو اگر اس کے اور حلیمہ کے ساتھ ہوتا تو وہ

لیکن مجھے اس طرح کی مصیبت اپنے گلے میں ڈالنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ تمہیں شہر بانو نے ایسا کچھ کہا ہے؟“ شیردل اس کی بات پر بری طرح ہتھے سے اکھڑا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ پاکستان سے جانے کے بعد کبھی شہر بانو اور عکس آپس میں رابطے میں نہیں رہیں اور یہ روز روز کا رابطہ اس کے لیے غیر متوقع یا حیران کن تھا۔ لیکن اس کا خیال تھا اس کی وجہ صرف مثال تھی اور کچھ نہیں۔

”مجھے شہر بانو نے کچھ نہیں کہا۔“ عکس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”پھر؟“

”میں صرف تمہاری بیٹی کی زندگی بچانا چاہتی ہوں۔“ وہ اس کی بات پر بری طرح ٹھنکا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ مثال کو کیا ہوا ہے؟ وہ میرے پاس ہے..... بہت خوش اور مطمئن ہے۔“ وہ عکس کی بات سمجھ نہیں سکا تھا۔

عکس کچھ کہنے کے بجائے کمرے میں پڑا ہوا اپنا لپ ٹاپ اٹھا لائی تھی۔ اس نے فیس بک کھولی، وہ مثال کی آئی ڈی تھی وہ عکس کا لپ ٹاپ استعمال کرنے کے بعد سائن آؤٹ کرنا بھول گئی تھی۔ عکس نے اس کی سینٹ ای میل کھولی۔ وہ بہت ساری میلز سے بھرا ہوا تھا۔ جن میں سے زیادہ بڑی تعداد ایرک ٹیوی کے نام تھیں اور کچھ دوسرے مردوں کے نام جو سب بڑی عمر کے مرد تھے، انہیں پڑھتے ہوئے اس نے لپ ٹاپ شیردل کی گود میں رکھ دیا، وہ اچھے ہوئے انداز میں ان ای میلز کو دیکھنے لگا۔

وہ ایک گیارہ سالہ لڑکی کی زندگی کے demons تھے۔ سوشل نیٹ ورک اور اپنے آس پاس کے لوگوں میں اپنے لیے ایک باپ جیسے شخص کی تلاش کی کوشش..... اس بے لوث پدری محبت کی تلاش کی کوشش جس کے لیے وہ کچھ بھی کرنے پر تیار تھی۔ کسی بھی حد تک جانے پر تیار تھی۔ وہ محبت باپ کی محبت اور exploitation میں فرق نہیں کر پاتی تھی۔ ان مردوں کو لکھی ہوئی ہر ای میل کے نوٹے پھوٹے جملوں میں صرف ایک ہی پکار تھی۔ ”مے ڈے..... مجھے بچالیں۔“ وہ ان تمام بڑی عمر کے مردوں کو بتا رہی تھی کہ وہ اپنے باپ سے بہت پیار کرتی تھی اور وہ ان کی سوٹ ہارٹ، مٹی، ڈارلنگ کے القابات میں چھپی ہوئی ہوس کو بھی شیردل کی اپنے لیے محبت کے برابر لا کر کھڑا کر رہی تھی۔ وہ انہیں بتا رہی تھی کہ اس سے کوئی محبت نہیں کرتا..... وہ اپنی مٹی کے پاس رہتی ہے جس کے پاس اس کے لیے وقت نہیں اور وہ اس سے نفرت کرتی تھی..... اور اس طرح اس کی پاپا کی زندگی میں آنے والی ایک witch (چڑیل) نے ان کا خوب صورت گھر توڑ دیا تھا۔ وہ اب شیردل سے بھی نفرت کرتی تھی کیونکہ وہ طغزل اور ہاڈل سے اس سے زیادہ محبت کرتا تھا اور اس نے اس کی مٹی کو چھوڑ دیا تھا۔ ان ای میل میں یہ بھی لکھا تھا کہ وہ کئی بار شہر بانو کو کورا توں کو روٹے دیکھتی تھی اور وہ اس گھر سے بھاگ جانا چاہتی تھی کیونکہ وہ مٹی کے لیے کچھ نہیں کر سکتی لیکن وہ مٹی کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی اور وہ سوچتی تھی probably اگر مٹی کو ایک اچھا آدمی مل جائے جو مٹی اور اس سے دونوں سے پیار کرے تو وہ بھی ایک اچھا گھر بنا سکتے ہیں..... جیسے شیردل اور عکس اور طغزل اور ہاڈل کا تھا۔

عکس نے اس دن مثال کے laptop استعمال کرنے کے بعد اتفاقاً ای میل کرنے کے لیے laptop اٹھایا تھا اور وہ facebook id سامنے آ جانے پر غیر ارادی طور پر اس کی ای میل پڑھنے لگی تھیں۔ وہ ای میل نہیں تھیں، مثال کی زندگی کا جہنم تھا جسے اسے دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ ایک گیارہ سالہ بچی جو اپنے ماں باپ کی طلاق کے بعد ان دونوں سے love-hate ریلیشن شپ میں تھی اور جو ان لوگوں سے اپنی تکلیف شیئر کر رہی تھی جو اسے fatherly, loving and kind لگ رہے تھے اور وہ ان کی توجہ اور محبت پانے کے لیے ان کے ساتھ رہنے کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھی جو وہ چاہتے تھے۔ عکس کسی بت کی طرح موقوف ذہن کے ساتھ ان مردوں کی ای میلز پڑھ رہی تھی..... گویا گدھوں کی ای میلز جو ایک گیارہ سالہ بچی کے ذہن، شخصیت اور زندگی کو اپنی شہوت اور ہوس بھرے الفاظ اور ذہنی گندگی کے نوکیلے پنوں سے نوج نوج کر رہے تھے جو اس بچی کو بتا رہے تھے کہ وہ

کے باوجود چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔  
برآمدے کی قد آدم کھڑکی کے سامنے کھڑے شیردل نے لان میں ایک پتنگ کو بلند سے بلند کرنے کی سرتوڑ  
جدوجہد میں مصروف اپنے تینوں بچوں کو مدھم سکر امیٹ کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں شیردل کی پوسٹنگ  
کے دوران وہاں آئے تھے۔ عکس اسلام آباد میں کسی کانفرنس میں مصروف تھی اور اسے ایک ہفتے کے بعد وہاں سے فارغ  
ہونا تھا ابھی کچھ دیر پہلے وہ فون پر اس سے بات کر رہا تھا اور وہ چند منٹ پہلے ہی فون رکھ کر باہر آیا تھا جب شام کو ٹینس  
کھیلنے کے لیے جاتے جاتے وہ ان لوگوں کو دیکھ کر رک گیا تھا۔  
”تم نے جانا نہیں؟“ شہر بانو کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا، وہ شاید لان میں بچوں کے پاس جانے کے لیے نکلی  
تھی۔

”جار ہا تھا بچوں کو دیکھ کر رک گیا۔“ اس نے پلٹ کر شہر بانو کو مسکرا کر دیکھا۔ وہ بھی اس کے قریب آگئی اور باہر  
دیکھنے لگی۔

”طفل کاٹ فلائنگ میں ایکسپٹ ہوتا جا رہا ہے۔“ اس نے فضا میں بلند اس پتنگ کو مہارت سے اڑاتے  
ہوئے طفل کو دیکھ کر ستائشی انداز میں شیردل سے کہا۔

”ہاں بیٹا کس کا ہے۔“ شہر بانو اس کی بات پر مسکرا دی۔  
”عکس کا۔“ وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنس پڑا تھا۔

”میں ذرا باہر جا رہی ہوں، باڈل کو کیوں نہیں پکڑا رہے یہ دونوں پتنگ۔“ وہ بے چارہ کس طرح بار بار کہہ رہا  
ہے۔۔۔۔۔ یہ ہمیشہ اس کے ساتھ اسی طرح کرتے ہیں۔“ وہ کھڑکی سے باہر پتنگ پکڑنے کے لیے ان دونوں کے پیچھے  
بھاگتے باڈل کو دیکھ کر پھر بے چین ہوئی تھی۔ شیردل کے کچھ کہنے سے پہلے وہ تیز قدموں سے باہر نکل گئی تھی۔ وہ تب بھی  
وہیں کھڑا رہا۔

کئی سالوں کے بعد بالآخر ان سب کی زندگی میں وہ مدو جزر اور مدو طم ختم ہو گیا تھا جو انہیں گرداب کی گردش بنائے  
ہوئے تھا۔ باڈل، شہر بانو کو باہر آتے دیکھ کر اس کی طرف شکایت کرنے کے لیے بھاگ پڑا تھا۔ وہ اب ان کے درمیان  
صحیح صفائی کروانے میں مصروف تھی۔ پتا نہیں کس بے دھیانی میں پتنگ طفل کے ہاتھ سے چھوٹی تھی یا ڈور کہیں سے  
ڈٹ گئی تھی شیردل نے ان سب کو پتنگ کو دوبارہ پکڑنے کی کوشش میں بھاگتے دیکھا صرف شہر بانو تھی جو باڈل کو اس بار  
سے کودنے سے بچا رہی تھی جس پر سے اگر وہ کودتا تو بری طرح گرتا۔

پتنگ کو بالآخر انہوں نے لان میں سے باہر جانے سے پہلے ہی دوبارہ پکڑ لیا تھا۔ کیونکہ وہ ابھی بہت بلند نہیں تھی۔  
زندگی اور پتنگ بعض دفعہ انسان کو ایک ہی طرح خوار کرتے ہیں۔ ایک ہی طرح fantacise کرتے  
ہیں۔۔۔۔۔ ایک ہی طرح اپنے پیچھے دوڑاتے ہیں۔۔۔۔۔ ایک ہی طرح خوشی سے پاگل کرتے ہیں اور ایک ہی طرح مایوس  
کرتے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن نہ پتنگ کو کوئی آسمان میں اڑنے سے روک سکتا ہے نہ زندگی کو چلنے سے۔

شیردل نے اپنے سیل فون پر لان میں ہونے والی اس اچھل کود کو capture کیا اور اسے عکس مراد علی کو  
MMS کر دیا۔۔۔۔۔

ایک smiley کے ساتھ جواب فوراً آیا تھا۔ ”My clan“  
شیردل ایکسٹ پڑھتے ہوئے مسکرایا اور باہر نکل گیا۔

(ختم شد)

معزز قارئین! عمیرہ احمد کے اس ناول کے بارے میں اگر آپ کے ذہن میں کوئی سوال ہو یا آپ کوئی بات  
جاننا چاہیں تو بذریعہ خطوط پوچھ سکتے ہیں۔ ہمیں آپ کی آرا کا انتظار رہے گا۔

(مدیرہ)

اسے بھی بہت پیار کرتا۔ ویسے ہی ہوا میں اچھالتا جیسے شہباز باری ڈول کو اچھالتا تھا ویسے ہی اٹھائے پھرتا جیسے وہ اس کو  
اٹھائے پھرتا تھا اس کی امی کے لیے ویسی ہی چیزیں لاتا جیسی وہ شرمین کے لیے لاتا تھا۔ خیر دین نے بہت ساری کہیاں  
پوری کی تھیں لیکن وہ بہت ساری خواہشوں کو حسرت میں بدلنے سے نہیں روک سکا تھا۔  
ہر بار جب شہباز حسین اسے ذرا سی بھی توجہ دیتا تو چڑیا خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھی اور خیر دین کو اس کا احساس  
تھا لیکن وہ یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ شہباز حسین، چڑیا کے لیے کیا ہوتا جا رہا تھا۔

اس رات بھی یہی ہوا تھا شہباز کے سبج کی نرمی اور اس کی توجہ کو وہ ویسی ہی محبت سمجھتی تھی جیسی وہ شہر بانو سے کرتا  
تھا۔ وہ وہاں سے وقت پر بھاگ سکتی تھی اگر وہ اس کو باپ جیسا نہ سمجھ رہی ہوتی۔ اگر اسے یہ یقین نہ ہوتا کہ وہ اسے کوئی  
نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔۔۔۔۔ عکس بلک بلک کر روئی تھی۔ یہ کام اس نے پہلی بار کیا تھا۔ وہ دام جس میں وہ آئی تھی، اس  
میں کسی اور کو آتے دیکھ کر وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کی زندگی میں خیر دین آگیا تھا، وہ بچ گئی تھی۔۔۔۔۔ لیکن مثال  
کی زندگی میں کوئی خیر دین نہیں تھا، وہ اس کے لیے شہباز کی نواسی نہیں تھی، شیردل کی بیٹی تھی۔ جس کی بساط پر موجود  
بادشاہ جس کی طاقت محدود تھی اور وہ کمزور تھا لیکن کوئین کمزور نہیں تھی اور وہ بہت طاقتور تھی۔۔۔۔۔ وہ بادشاہ کو چیک میٹ  
ہونے سے بچانے کے لیے ہر چال چل سکتی تھی۔

”شہر بانو سے کچھ مت کہنا اس سب کے بارے میں۔۔۔۔۔ میں اور تم پہلے بھی الگ الگ جگہوں پر پوسٹڈ ہیں اب بھی  
الگ رہ سکتے ہیں تم شہر بانو کو اپنے پاس رکھ لو تب تک جب تک مثال بڑی نہیں ہو جاتی اس عمر سے گزر جائے پھر دیکھیں  
گے کیا کرتا ہے۔“

دوباب بت بنے شیردل کے بازو پر ہاتھ رکھے اس سے کہہ رہی تھی۔ وہ شیردل کی تکلیف کو سمجھ پا رہی تھی۔ اس کے  
چہرے پر آج اسے خیر دین کا چہرہ نظر آیا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ خیر دین کے چہرے پر اسے کبھی شکست نظر نہیں آئی تھی جو  
شیردل کے چہرے پر نظر آئی تھی۔

”ابھی سب کچھ بچ گیا ہے شیری۔۔۔۔۔ ابھی کچھ بھی نہیں گیا۔“ اس نے شیردل کا بازو دبایا تھا، شیردل نے اس ملکہ کو  
دیکھا جو بادشاہ کو بچانے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ رہی تھی۔

”کوئین ہر جگہ جاسکتی ہے، ہر چال چل سکتی ہے، اس لیے کوئین میرا فیورٹ جیس ہیں۔“  
اسے یاد آیا تھا اس نے گرمیوں کی ان چھٹیوں میں پہلی بار چڑیا کے ساتھ جیس کھیلنے کے لیے جیس بورڈ سیٹ کرتے  
ہوئے کہا تھا۔

”کوئین کی طرح کوئی نہیں، کوئین، کوئین ہوتی ہے اور اس کو knight کی طرح کا کوئی کام نہیں کرنا  
پڑتا۔۔۔۔۔ but she is still powerful کیونکہ وہ کنگ کی وائف ہوتی ہے اور بادشاہ  
اس سے محبت کرتا ہے۔“

”لیکن میں ایک ایسی گیم بناؤں گی بڑی ہو کر جس میں کوئین ہی کنگ ہوگی جب وہ زیادہ powerful ہے تو  
بورڈ بھی کوئین کا ہونا چاہیے کنگ کا نہیں۔“ چڑیا نے جواباً اس سے کہا تھا اور اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ وہ زندگی کے  
اس کھیل میں کوئین ہوتے ہوئے بھی بادشاہ بن گئی تھی۔۔۔۔۔ بورڈ بھی اس کا تھا، مہرے بھی، پاور بھی۔۔۔۔۔ نام بھی۔۔۔۔۔  
وہ خیر دین کی نسل میں سے تھی اور اس کے جینز میں خیر کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا۔  
ایک شیردل نے زندگی میں بھی اس عورت کی برتری کو تسلیم نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ وہ آج کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

☆☆☆

طفل نے ہاتھ میں پکڑی ڈور کو جھٹکا دیا۔ مثال نے دونوں ہاتھوں میں پکڑی اس پتنگ کو اچھل کر ہوا میں چھوڑا۔  
باڈل نے بے حد خوشی سے ایک چیخ مارتے ہوئے جیسے اپنے بڑے بہن، بھائی کی مہارت کو داد تحسین دیتے ہوئے فضا  
میں بلند ہوتی ہوئی پتنگ کو فخریہ انداز میں دیکھا، اس کے ہاتھ میں ڈور والی چرخہ بھی جو وہ ان دونوں کے لاکھ منع کرنے